PDFBOOKSFREE.PK

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شہباز

2

اظہر کلیم

ناشر
مکتبہ القریش سرکلر روڈ
اردو بازار، لاہور۲۔ فون: ۷۶۶۸۹۵۸

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جملہ حقوق محفوظ ہیں۔

بار اول : ۱۹۹۹ء
قیمت : ۵۴/- روپے

ناشر محمد علی قریشی نے نیر اسد پریس سے چھپوا کر
مکتبہ القریش لاہور سے شائع کی۔

میں نے اپنی زندگی میں بے پناہ اذیت برداشت کی تھی اور بہت سے خوف ناک مناظر دیکھے تھے لیکن کسی اذیت یا منظر کی دہشت نے مجھے کانپ جانے پر مجبور نہیں کیا تھا جب کہ اس کٹی پھٹی لاش کو دیکھ کر میں یوں محسوس کر رہا تھا جیسے، میرا سینہ غم سے پھٹ جائے گا۔

"گل۔۔" میں نے دھیمی آواز میں اُسے پکارا۔

لیکن وہ میری سرگوشی نہ سُن سکی۔ وہ اس انجام کو پہنچ چکی تھی جہاں دُنیا کی چیخ و پکار ہرگز سنائی نہیں دیتی ایسے میں وہ میری سرگوشی کیسے سُن سکتی تھی۔

لاش پر لباس کے نام پر صرف چند دھجیاں ہی باقی رہ گئی تھیں۔۔ اور یہ دھجیاں بھی زخموں سے چپکی ہوئی تھیں جس جگہ گل کی لاش پڑی تھی، وہاں سے ہوا کے سرکش جھونکوں کا گزر نہیں تھا ورنہ یہ چند دھجیاں بھی اُڑ گئی ہوتیں۔

میں نے یہ سارا دن جس اذیت میں گزارا تھا، اس کا اندازہ صرف مجھے ہی ہو سکتا ہے۔ میں نے اُسی جگہ سے زمین کو کھودنا شروع کر دیا، جہاں گل کی لاش ملی تھی۔

اُسے دفن کرنے کے بعد میں اُوپر آ گیا۔

اوپر چٹانوں کے درمیان گل کا جھونپڑا جل کر راکھ کا ڈھیر بن چکا تھا اور اس ملبے میں غالباً گل کے بوڑھے باپ کی لاش دفن ہو کر جھلسنے کے بعد راکھ ہی کا ایک حصہ بن چکی تھی۔

اچانک میرے کانوں سے مدھم سی پھڑپھڑاہٹ ٹکرائی۔

میں نے آواز کی طرف دیکھا۔

رنگین کپڑے کی ایک دھجی ایک خاردار جھاڑی میں اُلجھی ہوئی کسی زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑا رہی تھی۔ غم سے بوجھل سینے میں مجھے ایک لاوا سا دہکتا محسوس ہو رہا تھا۔۔ ایک ایسی آگ جل اُٹھی تھی جسے دُنیا کے سارے سمندر مل کر بھی بجھا نہیں سکتے تھے۔ یہ نفرت اور انتقام کی آگ تھی جسے صرف خون ہی سے بجھایا جا سکتا تھا۔۔ ان لوگوں کے خون سے جو اس حادثے کے ذمے دار تھے۔

میرے ذہن میں وہ گھڑسوار گھوم گئے جو میرے قریب سے گزرے تھے اور ان کے ایک جملے نے مجھے پریشان کر کے یہاں تک پہنچنے کے لیے مجبور کر دیا تھا۔

"لڑکی تھی خطرناک۔۔" یہ الفاظ بار بار میرے ذہن میں گونج رہے تھے۔

وہ چار گھڑسوار تھے۔ میں نے ان کی صرف ایک ہی جھلک دیکھی تھی لیکن نہ جانے کیوں اُن کے چہرے میرے ذہن پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نقش ہو کر رہ گئے تھے۔

"گل۔۔" میں نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

اس نازک اندام گل نے مجھے موت کے مُنہ سے نکال کر نئی زندگی دی تھی اور میں اس کا بے حد شکر گزار اور ممنون تھا۔۔۔ وہ میری بہن تھی۔ وہ شہباز کی بہن تھی۔ ایک ایسے شہباز کی بہن جو فرنگیوں سے لڑتا ہوا شہید ہو گیا تھا۔ اُسے فرنگیوں نے گہرا زخم لگایا تھا لیکن خود اس کے اپنے بھائیوں نے جو کچھ کیا تھا، وہ فرنگیوں کے اس گہرے زخم سے بھی کہیں زیادہ سنگین تھا۔۔ ایک ایسا جرم جس پر دُنیا بھر کے سارے خبیث۔۔۔ لوگوں کو بھی قربان کر دیا جائے تو اس کا ازالہ نہیں ہو سکتا تھا۔

گل کا گول گول اور سُرخ و سپید چہرہ بار بار میری آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا تھا۔ مجھے اس کے بوڑھے باپ کا بھی خیال آ رہا تھا جس کے سینے پر ابھی اپنے بیٹے کی موت کا زخم تازہ تھا اور ذہن اس کی جُدائی کے صدمے سے ابھی سنبھلا بھی نہیں تھا کہ

حالات کے بے رحم تیروں نے اس سے بھی بھیانک زخم اس کے سینے پر لگا دیے تھے۔ میں نے اس کی لاش کو تلاش کرنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ نہ مل سکی۔ غالباً میرا اندازہ درست ہی تھا۔ وہ ملبے کے ڈھیر میں دب کر دفن ہو چکا تھا۔

میں نے اس جلے ہوئے جھونپڑے کے آس پاس بھی بوڑھے کی لاش کو تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن وہ نہ ملنا تھی، نہ ملی، البتہ ایک اور لاش مجھے مل گئی۔ . . یہ لاش ابھی زندہ تھی۔

میں نے اس کے ہانپنے کی تیز آوازیں سنیں تو بری طرح چونک پڑا اور پھر جب میں آواز کی سمت کا تعین کر کے وہاں پہنچا تو وہ جانکنی میں مبتلا شخص نظر آ گیا۔ میں ہر ممکن تیزی سے اس کے قریب پہنچا تھا لیکن اس کی آخری سانس شاید میرے ہی انتظار میں اٹکی ہوئی تھی۔ میں جیسے ہی اس کے قریب پہنچا، وہ موت کا ایک جھٹکا کھا کر بے جان ہو گیا۔

پہلی بار میں نے جسم میں ایک ہیجانی لہر کو دوڑتے ہوئے محسوس کیا۔ میں نے ٹھوکر مار کر لاش کو سیدھا کیا۔

اس کی گردن پر ایک گول سوراخ تھا اور ایسا ہی ایک سوراخ اس کے نرخرے پر بھی دکھائی دیا۔ اس کے چہرے پر بڑی خراشیں تھیں، یوں لگتا تھا جیسے کسی شیرنی نے غضب ناک ہو کر اس کے چہرے پر پنجہ دے مارا ہو۔ اس کی ایک آنکھ کے نیچے بھی خراش تھی کہ آنکھ کا نچلا حصہ کٹ کر لٹکا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ میرے ذہن میں گل کا دایاں پنجہ گھوم گیا۔

اس کے دائیں ہاتھ کی انگلیوں میں خون جما ہوا تھا۔ یقیناً اسی نے اس شخص کو نوچا ہو گا۔ مجھے اس درندے کے انجام اور اس کی عبرت ناک حالت پر بے حد خوشی کا احساس ہو رہا تھا۔ کاش گل کا پنجہ باقی لوگوں کو بھی اس طرح ادھیڑ کر رکھ دیتا اور اس کی رائفل ان سب کو بھی اسی طرح ٹھکانے لگانے میں کامیاب ہو جاتی۔ . . لیکن گل کا نشانہ بہت اچھا ہونے کے باوجود ہستی کے نشانے پر سبقت نہ لے جا سکا اور اس کا پنجہ کسی شیرنی کی طرح مضبوط ہونے کے باوجود مقدر کے پنجے سے زیادہ طاقتور ثابت نہ ہو سکا اور وہ قسمت کی بازی ہار گئی۔ . . نہ صرف قسمت بلکہ زندگی کی بازی میں بھی اسے مات ہو گئی۔

میں اس کی لاش پر جھک گیا۔

اس کے نرخرے سے بہنے والے خون نے اس کے سینے کے کپڑے کو بھی سرخ کر دیا تھا اور اس کی صورت اتنی بھیانک ہو گئی تھی کہ عام آدمی اسے اس ویرانے میں یوں تنہائی کے عالم میں دیکھ لیتا تو شاید دہشت کے مارے اس کی حرکتِ قلب ہی بند ہو جاتی۔

میں نے لاش کی تلاشی لی۔

اس کی جیبوں سے چند طلائی سکے، ایک شکاری چاقو، چند فالتو کارتوس اور ایک رومال ملا۔ اس رومال پر سرخ تاگے سے کوئی نام کاڑھا گیا تھا جو دھلائی کی مار کھا کر اپنا حلیہ مکمل نہیں رکھ سکا تھا۔ غالباً تاگا کچا تھا اور اس کا رنگ بھی پختہ نہیں تھا اس لیے وہ دھلنے کے بعد یوں پھیل گیا تھا کہ اسے پڑھا نہیں جا سکتا تھا۔

میں نے یہ رومال جیب میں رکھ لیا۔

میرا ذہن بغاوت کے خیالوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا اور میری سوچیں پاگل ہوتی جا رہی تھیں۔ کاش میں کوئی روشن ضمیر ہوتا تو ان قاتلوں کا پتہ چلا کر کسی شہباز ہی کی طرح ان کے سروں پر پہنچ گیا ہوتا۔ . . لیکن انہیں تلاش کرنا ایک تحقیقی کام تھا جس کے لیے صبر کے ساتھ ساتھ تحمل اور وقت کی بھی ضرورت تھی۔

میں نے گل کی لاش دفناتے وقت قسم کھائی تھی کہ اس وقت تک واپس گوری نہیں جاؤں گا جب تک اس کے قاتلوں کے جسم میں خون کا ایک بھی قطرہ موجود رہے گا۔ اس قسم کو کھاتے وقت تو وہ چند سردار بھی میرے ذہن سے نکل گئے تھے جنہیں وصول کر کے مجھے گوری بھجوانا تھے۔

گل کی معصومیت کو جس انداز میں درندگی کی بھینٹ چڑھا دیا گیا تھا، اسے دیکھنے کے بعد تو مجھے دنیا ہی سے نفرت محسوس ہونے لگی تھی۔ آج پہلی بار مجھے احساس ہوا تھا کہ میری ماں ریشم جان نے مجھے اتنی اذیتیں دے دے کر کیوں پروان چڑھانے کی کوشش کی تھی۔ یہ دنیا ایک ایسا جہنم ہے جہاں انسان کو ہر لمحے کوئی نیا زخم سہنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ . . پھر اس علاقے میں جہاں سات سمندر پار سے آنے والی سیاست کا دور دورہ تھا اور جس نے مقامی لوگوں کو درندوں سے بھی بدتر بنا دیا تھا، اس میں یوں بھی جنت کا تصور کرنا ممکن نہیں تھا۔ فسادی ذہنیت نے پٹھانوں میں اتنے بڑے بڑے شگاف بنا ڈالے تھے کہ ان کا آپس میں یک جان دو قالب ہونا آسان دکھائی نہیں دیتا تھا۔

میری زندگی سیدھی سادی اور آسان تھی لیکن اب میرے کندھوں پر ایسے بار آ گئے تھے کہ میں نے ایک بار تو گھبرا کر آنکھیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہی بند کر لی تھیں۔ . . اور آنکھیں بند کرتے ہی مجھے ماں ریشم جان کی رعب دار آواز سنائی دی۔

"شہباز۔ . . ان آنکھوں کو ہمیشہ کھلی رکھنا چاہیے، تمہارے چہرے پر آگ کا بھڑکتا ہوا الاؤ ہی کیوں نہ رکھ دیا جائے۔ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا سیکھو میرے بچے۔ . . ورنہ موت تمہیں، چیونٹی کی موت کی طرح آسانی سے نصیب ہو جائے گی اور یہ مردوں کے لیے بڑی شرمناک موت ہوتی ہے۔ مرد کو کھلی آنکھوں موت سے ہمکنار ہونا چاہیے۔"

میں نے آنکھیں کھول دیں۔

مجھے اپنی آنکھوں میں اتنی حرارت محسوس ہو رہی تھی جیسے خون آنکھوں کے چراغوں میں جلنا شروع ہو گیا ہو۔

میں نے اپنے حالات پر نظرِ ثانی کی۔

میں شیر خان اور گل زمان کو ایک ہفتے کی مہلت دے چکا تھا اور ان سے وصول ہونے والی رقم میں نے ملک سکندر کے حوالے کر دی تھی۔ مجھے پہلے تو یہ جائزہ لینا تھا کہ اس نے وہ تمام رقم گوری بھجوا دی ہے یا نہیں۔ . . اس کے بعد شیر خان اور گل زمان سے باقی رقم وصول کرنے کا مرحلہ تھا۔ جب میں نے ان دونوں کو ایک ہفتے کی مہلت دی تھی تو مجھے نہ جانے کیوں یہ احساس ہوا تھا کہ وہ دونوں فرار ہو کر کہیں روپوش ہو جائیں گے۔ . . لیکن اس احساس کے ساتھ ہی ملک نواز کا نام میرے کانوں میں گونجنے لگا تھا۔ میں سمجھ چکا تھا کہ اب وہ ملک نواز کے گرگے بنے بغیر جان اور جسم کا رشتہ برقرار نہیں رکھ سکیں گے اس لیے اگر انہیں تلاش کرنا پڑا تو وہ مجھے ملک نواز کی پناہ میں مل جائیں گے۔ مسئلہ صرف ملک نواز اور اس کے گروہ تک رسائی کا تھا جس کے لیے میرا دل مطمئن تھا۔ میں اس نامی گرامی شخص کا آسانی سے سراغ لگا سکتا تھا۔ میں نے ایک طویل سانس لی اور آہستہ آہستہ اس طرف چل دیا جہاں میں گھوڑے کی پشت سے کود کر اترا تھا۔

گھوڑا چرنے میں مصروف تھا۔

میرے قدموں کی آہٹ پا کر اس نے کان کھڑے کیے اور زور سے ہنہنایا۔ میں نے اس کی لگام تھام لی اور دور افق کی طرف دیکھا جہاں گل کے بے گناہ خون کی سرخی اب بھی موجود تھی۔ میں نے سوچا کہ اگر اس وقت واپس خوارز کی طرف جاتا ہوں تو تاریک رات میں راستے سے بھٹک جانے کا خطرہ ہے اور اگر شب بھر اسی ویرانے میں گزارتا ہوں تو وقت ضائع ہوتا ہے۔ . . راستے سے بھٹک جانے میں بھی وقت کا زیاں پیش نظر تھا اس لیے میں نے سوچا کہ یہ رات اسی ویرانے میں گزار دینی چاہیے۔

میں نے گھوڑے سے زین اتاری اور برتن لے کر ندی کی طرف روانہ ہو گیا تھا۔ اندھیرا پھیلنے تک میں پانی پی کر اور روکھی سوکھی کھانے کے بعد پانی کا برتن اٹھائے واپس آ گیا اور پھر اس جگہ سے چند قدم کے فاصلے پر گھاس کا بستر تیار کرنے لگا جہاں کبھی گل کا جھونپڑا ہوا کرتا تھا اور جہاں اس کے سریلے قہقہے گونجا کرتے تھے۔ میں تاروں بھری رات میں، ویرانیاں دل میں سمیٹے بیٹھ گیا اور آسمان کو گھورتا رہا۔

نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

دن بھر سورج کی تیز شعاعیں اور رات کو چاندنی کی ٹھنڈی روشنی مجھے سلگا رہی تھی۔ یادوں کے زہریلے افعی چاروں طرف سے مجھے ڈس رہے تھے اور میں بے چینی سے کروٹیں بدل رہا تھا۔

نہ جانے رات کے کس پہر میری آنکھ لگ گئی۔

میں سو گیا لیکن گل کی مسخ لاش میرے خوابوں میں آ گئی اور اس نے میری نیند کو اس قدر بے چین کر دیا کہ میں ہانپتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ میری پیشانی پسینے سے بھیگی ہوئی تھی اور میری سانس میں الجھی تھی۔

ادھر ادھر دیکھ کر میں نے ذہن کو ان زہریلے خیالوں سے نجات دلانے کی کوشش کی تو ایک سائے کو دیکھ کر چونک پڑا۔ یہ ایک متحرک سایہ تھا۔ میں ملگجی چاندنی میں اس سائے کو گھورنے لگا۔ جو آہستہ آہستہ ایک چٹان کی اوٹ میں غائب ہو رہا تھا۔

"نہ جانے کون ہے؟" میں نے سوچا۔

میں اس چٹان کی طرف دیکھتا رہا۔

اچانک مجھے اپنے آس پاس چند اور قدموں کی آہٹیں سنائی دیں تو میرا ہاتھ بے اختیار اپنی رائفل کی طرف رینگ گیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اپنے ریوالور کو بھی نکال لیا۔ اسے کھول کر گولیوں کی طرف سے مطمئن ہو کر میں نے پیٹی میں اڑس لیا اور رائفل کا گھوڑا چڑھا لیا۔

ایک سایہ پھر چٹان کی اوٹ سے نکلا۔

"کون ہے؟" میں نے دھاڑ کر پوچھا۔

کوئی جواب نہ ملا تو میں مزید چوکنا ہو گیا۔

"کون ہے؟" میں نے تیز آواز میں اپنا سوال دہرایا۔ "جواب دو ورنہ تمہاری موت کا میں ذمے دار نہیں ہوں گا۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس بار بھی جواب نہیں ملا تو میں سمجھ گیا کہ مجرم ذہن کے چند لوگ شاید مجھے لوٹنے کے ارادے سے میرے گرد گھیرا ڈال رہے ہیں۔ میں نے رائفل کو دائیں ہاتھ میں جکڑ لیا اور خود کو زمین پر گرا کر ایک طرف لڑھکنا شروع کر دیا۔ اس طرف میں نے ایک اُبھرا ہُوا پتھر دیکھ لیا تھا جس کے پیچھے پناہ لی جا سکتی تھی۔

گھوڑا ہنہنانے لگا۔

اچانک ایک اور گھوڑے کی ہنہناہٹ سُنائی دی۔

کسی نے پشتو میں گالی دی۔ غالباً وہ گھوڑے کے ہنہنانے پر برہم ہو گیا تھا۔ میں نے آواز کی سمت رائفل اُٹھا دی لیکن اُسی لمحے میری گُدی سے ایک ٹھنڈی ٹھنڈی نال چپک گئی۔

"خبردار... کوئی حرکت نہ کرنا!"

میں خاموش رہا۔

"کون ہو تم اور اس ویرانے میں کیا کر رہے ہو؟"

"یہی سوال تم سے بھی کیا جا سکتا ہے۔" میں نے پلٹے بغیر بے خوفی سے کہا۔ "یہ ایک کھلی اور آزاد جگہ ہے۔"

"شاید تم مرنا چاہتے ہو۔" اس کی غراہٹ میں درندگی تھی۔

"یہ بات تم کتنے ساتھیوں کی شہ پر کہہ رہے ہو؟"

"اُٹھ جاؤ۔" اس نے نال کا دباؤ میری گُدی پر بڑھا دیا۔ "اور

میں اُٹھ کھڑا ہُوا۔

"رائفل پھینک دو۔" اس نے حکم دیا۔

میں نے رائفل کو اُٹھتے وقت نال کی طرف سے پکڑ لیا تھا اس لیے جیسے ہی اس نے رائفل پھینک دینے کے لیے کہا، میں نے دایاں ہاتھ لہرایا اور پھر خود کو پھرتی سے زمین پر گرا دیا۔

رائفل کا کُندا پُوری قوت سے اس کی کلائی پر پڑا۔

اس کے حلق سے ایک دلدوز چیخ نکل گئی۔

غالباً اس کی اُنگلی ٹریگر پر تھی۔ کلائی پر میری رائفل کا کُندا ٹکرایا تو اس نے غیر ارادی طور پر لبلبی کو دبا دیا۔ ایک خوفناک دھماکا ہُوا اور چٹانوں میں دیر تک دھماکے کی بازگشت سُنائی دیتی رہی۔

وہ ابھی سنبھل نہیں پایا تھا کہ میری رائفل کا کُندا ایک بار پھر گھوم کر اس کی طرف گیا۔ اس مرتبہ نشانہ اس کی کھوپڑی تھی۔ ایسی آواز پیدا ہُوئی جیسے مٹی کی ہنڈیا پر کسی نے ڈھیلا مار کر اُسے ریزہ ریزہ کر ڈالا ہو۔ اس خفیف سے دھماکے میں ایک گھُٹی گھُٹی چیخ بھی شامل تھی۔

وہ کٹے ہُوئے شہتیر کی طرح دھڑام سے گرا۔

میں نے فوراً ہی جست لگائی اور ایک پتھر کی آڑ لے لی۔

آس پاس کئی سائے منڈلا رہے تھے۔

"کیا ہُوا... ابراہیم... کیا بات ہے؟" قریب ہی سے ایک سرگوشی سُنائی دی اور کوئی دبے قدموں میری طرف بڑھنے لگا۔ ملگجی سی چاندنی میں غالباً اس نے مجھے اپنا ساتھی ابراہیم سمجھ لیا تھا۔ میں اس کی طرف دیکھتا رہا حتیٰ کہ وہ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر آ کر رُک گیا۔

"ابراہیم..." اس نے دوبارہ سرگوشی کی۔

"جھک کر آگے آ جاؤ۔" میں نے بھی جواباً دھیمی آواز میں کہا۔ ہوا تیز تھی اس لیے وہ میری آواز یقیناً پہچان نہیں سکا تھا اس لیے وہ فوراً ہی جھکی جھکی حالت میں آگے بڑھنے لگا حتیٰ کہ وہ میری زد میں پہنچ گیا۔

"کیا تم نے اسے مار ڈالا؟"

"ہاں..." میں نے سرگوشی کی۔

"اوہ... تو اب یہاں کیوں چھپے بیٹھے ہو؟"

"تاکہ تمہیں بھی مار ڈالوں۔" میں نے جواب دیا اور تب اُسے احساس ہُوا کہ وہ کس غلط فہمی کا شکار ہُوا ہے اور کہاں تک پہنچ چکا ہے۔ اب اس کی واپسی مشکل تھی۔ میری رائفل کا کُندا پُوری قوت سے اس کی گردن پر پڑا۔ کسی کلہاڑے جیسی ضرب تھی اس کے حلق سے کراہ تک نہ نکل سکی۔

میں اُسی پتھر کی آڑ میں بیٹھا رہا۔

نہ جانے وہ تعداد میں کتنے تھے۔

اب تک دو آدمی میرے ہاتھوں جہنم رسید ہو چکے تھے۔ وہ شاید اس وجہ سے اتنے اہتمام میں مبتلا ہو گئے تھے کہ کہیں آس پاس میرے اور ساتھی موجود نہ ہوں... ورنہ وہ سب کے سب سیدھے میرے پاس آتے اور گھیرا ڈال کر مجھے بے بس کر سکتے تھے۔

میں نے پتھر کی اوٹ سے اِدھر اُدھر دیکھا۔

اطراف میں تین سائے متحرک تھے۔ وہ غالباً گھوڑے کے گرد اپنا گھیرا تنگ کر رہے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ وہ گھوڑے کو چرانا چاہتے ہیں اور پیشے کے اعتبار سے لٹیرے ہی ہیں۔ یہ یقین ہوتے ہی میں نے ان تینوں کو ٹھکانے لگا دینے کا ارادہ کر لیا۔

اچانک گھوڑا بڑے زور سے ہنہنایا۔

میں نے چونک کر اُدھر دیکھا۔

ایک سایہ اس تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ گھوڑے کو بھی شاید خطرے کا احساس ہو گیا تھا کہ وہ دفعتاً اُچھل پڑا۔ اس کی دولتی سائے سے ٹکرائی اور سایہ زمین سے بلند ہو کر دُور جا گرا۔ اس کی زبان سے گالیوں کا طوفان نکل رہا تھا۔ اسی لمحے دو اور سائے تیزی سے گھوڑے کی طرف لپکے۔ ایک سامنے سے آیا تھا۔ اس نے فوراً ہی گھوڑے کی لگام قابو میں کر لی تھی۔

گھوڑا ہنہناتا ہُوا اُچھلنے لگا لیکن لگام پر اس شخص کی گرفت خاصی مضبوط تھی۔

"نکل چلو..." ایک نے کہا۔

"ابراہیم اور دوسروں کو آواز دو۔"

پہلے نے اس سمت میں رُخ کر کے ابراہیم کو پکارا جہاں میں چھُپا بیٹھا تھا۔ غالباً وہ لوگ یہی سمجھے تھے کہ جو دھماکا ہُوا تھا، اس میں میرا ہی کام تمام ہُوا ہے۔ وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ کوئی تنہا شخص ان کے دو ساتھیوں پر بھاری بھی پڑ سکتا ہے۔

میں خاموش بیٹھا رہا۔

"ابراہیم..." اُسی شخص نے دوبارہ آواز لگائی۔

اس بار جواباً میں نے حلق سے ایک کراہ نکالی۔ یہ کراہ سُنتے ہی ان دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر ایک تو گھوڑے کی لگام تھامے اس کی گردن تھپ تھپانے میں مصروف ہو گیا جب کہ دوسرا تیزی سے اُس پتھر کی طرف دوڑ پڑا جہاں میں چھُپا بیٹھا تھا اور جہاں سے میں نے کراہ کر اُن کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی تھی۔

میں نے اُسے آتے دیکھا تو پتھر کی اوٹ میں یوں لیٹ گیا کہ میرا سَر اور کندھوں تک جسم پتھر کے سائے میں اور باقی دھڑ چاندنی میں تھا۔ میں بے حس و حرکت لیٹا ہُوا تھا۔ سائے میں ہونے کی وجہ سے میری کھُلی آنکھیں اس شخص کو اس وقت تک نظر نہیں آ سکتی تھیں جب تک وہ میرے چہرے پر جھُک نہ جاتا۔

اس کے دوڑتے قدموں کی آہٹ پتھر کی دوسری جانب رُک گئی۔ غالباً اسے کسی خطرے کا احساس ہو گیا تھا۔

"ابراہیم..." اس نے ایک بار پھر سرگوشی کی۔

میں نے جواباً کراہ کر بے معنی سے الفاظ حلق سے نکالے۔

وہ تیزی سے اس جانب آ گیا جہاں میں لیٹا ہُوا تھا۔ یہاں قریب ہی اس کے دونوں ساتھی بھی مُردہ حالت میں پڑے تھے۔ وہ تین آدمیوں کو یوں لیٹے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

میں بے حرکت لیٹا رہا۔

میری آنکھیں اس کی ایک ایک حرکت کا جائزہ لے رہی تھیں۔ وہ پہلے ایک شخص پر جھُک گیا۔ اس کی کھوپڑی کھُلی ہُوئی تھی اور شگاف میں سے ابھی تک خون بہہ رہا تھا۔ چاندنی میں خون کی چمک صاف دکھائی دے رہی تھی۔

پھر وہ دوسرے شخص کی طرف جھُک گیا۔

یہ وہ شخص تھا جس کی... گردن پر رائفل کا کُندا ٹکرایا تھا اور اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ وہ چند لمحوں تک اُسے ٹٹولتا رہا... پھر وہ ایک طویل سانس لے کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اُسی لمحے شاید اُسے میرا بھی خیال آیا تھا۔

وہ تیزی سے میری طرف لپکا۔

جیسے ہی وہ مجھ پر جھُکا، میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن جکڑ لی۔ وہ شاید مجھے مُردہ سمجھ کر مطمئن تھا... لیکن جب اس نے ایک مفروضہ مُردے کے دونوں ہاتھوں کو اپنی گردن پر محسوس کیا تو اس کی گھگھی بندھ گئی۔

میں نے اس کی گردن پر دباؤ بڑھانا شروع کر دیا اور اُسے جھٹکا مار کر نیچے پھینک دیا... پھر میں اس پر یوں سوار ہُوا کہ اس کی گردن ابھی تک میری اُنگلیوں کی گرفت میں تھی اور اس کا جسم میرے جسم کے بوجھ تلے آزاد ہونے کے لیے تڑپ رہا تھا۔

اس نے دونوں ہاتھ میری کلائیوں پر جما لیے تھے۔

وہ میرے ہاتھوں کو اپنی گردن سے الگ کرنے کی پُوری کوشش کر رہا تھا اور اس مقصد کے لیے اس کی پوری توانائی صرف ہو رہی تھی لیکن شہباز کی اُلجھی ہُوئی اُنگلیوں کو یوں آسانی سے کھولنا ممکن نہیں تھا۔ اچانک اس کے حلق سے ایک گھُٹی گھُٹی سی چیخ نکل گئی۔ میں نے ایک شدید جھٹکا مار کر اس چیخ کو ختم کر دیا۔

اس کی گردن ڈھلک گئی تو میں اُچھل کر کھڑا ہو گیا لیکن مجھے خاصی تاخیر ہو چکی تھی۔ جو شخص گھوڑے کی لگام تھامے کھڑا تھا، وہ بھی نہ جانے کس طرح دبے قدموں میرے پیچھے پہنچ چکا تھا... اچانک مجھے اپنی کھوپڑی کے عقبی حصے پر ایک دھماکا ہوتا محسوس ہُوا۔

الف لیلہ ڈائجسٹ کا مقبول سلسلہ
انسان اور شیطان
مصنف محمد فراز
امیر علی خان کی خوفناک آپ بیتی
مکتبہ القریش مرکز روڈ اردو بازار لاہور
فون 7668958

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میرے ہاتھ جس لٹیرے کی گردن پر تھے، وہ وہاں سے ہٹ گئے اور میں نے بچنے کی پوری کوشش کی تھی لیکن میری کھوپڑی سے ٹکرانے والا رائفل کا کُندا اپنا کام کر چکا تھا۔ مجھے اپنی آنکھوں میں تاریکی اُترتی محسوس ہونے لگی۔

. . . پھر میرا ذہن تاریک ہوتا چلا گیا۔

میں بے ہوش ہو چکا تھا۔

یہ بے ہوشی نہ جانے کتنی دیر بعد ختم ہوئی۔ جب میری آنکھ کھلی تو مجھے اپنے سامنے نیلی پیلی چنگاریاں سی اُڑتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے سر کو جھٹکا لیکن سر بُری طرح بھاری ہو رہا تھا جیسے اس میں سیسہ بھرا ہوا ہو۔

سر چکرانے لگا تو میں نے آنکھوں کو سختی سے بھینچ بھینچ کر کھولنا شروع کر دیا۔ دونوں ہاتھوں سے کنپٹیوں کو دباتے ہوئے میں نے حواس کو ٹھکانے پر لانے میں، جلد ہی کامیابی حاصل کر لی۔

. . . کچھ دیر بعد مجھے اپنے رُخساروں پر تپش کا احساس ہوا تو میں سمجھ گیا کہ رات بیت چکی ہے اور سورج نکل آیا ہے۔ میں نے کروٹ بدلی اور اس بار آنکھیں کھولنے پر وہ نیلی پیلی سی چنگاریاں نظر نہیں آئیں۔ گویا جب میں چت لیٹا ہوا تھا تو سورج کی کرنیں براہِ راست میری آنکھوں میں پڑ رہی تھیں اور انہی کی وجہ سے میری بینائی متاثر ہو رہی تھی۔

کھوپڑی کا عقبی حصہ اب بھی دُکھ رہا تھا۔

میں نے ٹٹول کر اس حصے کو دیکھا جس پر چوٹ لگائی گئی تھی۔ وہاں ایک بڑا سا گومڑ محسوس ہو رہا تھا۔

میں ہلکی سی کراہ کے ساتھ اُٹھ بیٹھا۔

چوٹ کافی شدید تھی۔

اگر یہ چوٹ کسی عام آدمی کو لگتی تو شاید اس کی کھوپڑی کھل گئی ہوتی لیکن میں چوٹوں کے معاملے میں بہرحال کوئی عام آدمی ہرگز نہیں تھا۔ میں نے اطراف کا جائزہ لیا۔

رفتہ رفتہ میرا ذہن کام کرنے لگا۔

وہ تمام مناظر آہستہ آہستہ میری نظروں کے سامنے گھوم گئے جنہیں میں نے چاندنی میں کھلی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ آس پاس تین لاشیں پڑی تھیں۔ میں نے ان میں سے ہر ایک تلاشی لی لیکن ان کی جیبیں خالی تھیں۔

غالباً ان کا وہ ساتھی جو میری کھوپڑی پر قیامت ڈھانے میں کامیاب ہو گیا تھا جاتے وقت سب کچھ سمیٹ لے گیا تھا۔

میں نے گھوڑے کی تلاش میں اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی تو وہ کہیں نظر نہ آیا۔

میں اُٹھ کھڑا ہوا۔

سر میں تکلیف اب بھی خاصی شدید تھی۔

میں سر کو دونوں ہاتھوں میں تھامے اِدھر اُدھر گھومتا رہا لیکن مجھے دُور دُور تک صبح کی زرد زرد دھوپ اور چٹانوں کے علاوہ کچھ دکھائی نہ دیا۔ میں نے گھاس کے اُس بستر کی طرف دیکھا جہاں میں نے گہری نیند میں ڈوب جانے کی کوشش کی تھی لیکن جس میں گل کی اُدھڑی ہوئی لاش نے مجھے ایک لمحے کے لیے کامیاب نہیں ہونے دیا تھا۔ . . وہ بستر جل کر راکھ ہو چکا تھا۔ میری کوئی بھی چیز وہاں موجود نہیں تھی۔ میرا ریوالور، میری رائفل حتیٰ کہ شکاری چاقو تک غائب تھا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ میرے جسم پر زیادہ قیمتی لباس نہیں تھا ورنہ شاید وہ شخص جاتے وقت اسے بھی اُتار کر لے جاتا۔

میرے قریب جو تین لاشیں تھیں، ان میں سے ایک کے جسم پر لباس دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ شاید اس کا لباس قدرے قیمتی تھا، اور بھاگتے ہوئے لٹیرے نے اسے اُتار لیا تھا۔

اب میں بے دست و پا ایک ویرانے میں کھڑا تھا۔ بھوک بھی چمک رہی تھی اور جسم میں نفرت اور غصے کی چنگاریاں بھی ہر گزرتے ہوئے لمحے کے ساتھ زیادہ تیزی سے دوڑنے لگی تھیں۔

میں نے ندی کی طرف دیکھا۔

ندی کی طرف آہستہ آہستہ چلتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ اب میرا آئندہ کا لائحہ عمل کیا ہو سکتا ہے۔ ندی کے ٹھنڈے پانی میں منہ ہاتھ دھونے اور پانی پینے کے بعد میں نے بیروں کی جھاڑیوں میں پہنچ کر سُرخ سُرخ بیروں ہی سے پیٹ بھرنا شروع کر دیا۔

دھوپ اب خاصی تیز ہو گئی تھی لیکن میں اس ویرانے میں نہیں رُک سکتا تھا۔ میں نے اندازے ہی سے خوارزم کی طرف سفر شروع کر دیا۔ اس علاقے میں پیدل چلنا خاصا مشکل، مشقت طلب اور تاخیر کا باعث ہوتا ہے . . . لیکن اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی تو نہ تھا کہ جتنی جلدی بھی ممکن ہو کسی ایسی جگہ تک رسائی حاصل کر لوں جہاں سے مجھے کھانے کے لیے کچھ مل جائے اور میں اپنی مہم کو جاری رکھنے کا سامان پیدا کر سکوں۔

ہر طرف پُرسکون اور خاموش چٹانیں پھیلی ہوئی تھیں۔ بظاہر یہ علاقہ کس قدر پُرسکون اور چُپ چاپ لگتا تھا لیکن میری جو بھی حالت تھی، وہ اسی علاقے کی وجہ سے ہوئی تھی۔

ندی کے کنارے چلتے چلتے میں کافی دُور نکل آیا۔ تب میں نے پلٹ کر دیکھا۔ دُور چٹانوں پر چند گدھ منڈلا رہے تھے۔ میں دل ہی دل میں کلمۂ شکر بجا لایا۔ یہ گدھ میری لاش پر بھی منڈلا سکتے تھے اور میری بوٹی بوٹی ان کے پیٹ کا دوزخ بھرنے میں بھی استعمال ہو سکتی تھی۔ . . لیکن قدرت نے مجھے زندگی جیسی نعمت سے نوازا تھا تو اس کا یہی مطلب ہے کہ ابھی وہ میرے ہاتھوں چند کام کروانا چاہتی ہے۔

ایک جگہ میں بہت سی بھیڑوں اور بکریوں کو دیکھ کر رُک گیا۔ آس پاس کوئی چرواہا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ یہ ریوڑ کس کا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ ریوڑ خود ہی کہیں سے بھاگ کر اس طرف نکل آیا ہو اور مالک ریوڑ کی تلاش میں کہیں اور مارا مارا پھر رہا ہو؟

میں نے کچھ آگے بڑھ کر مزید توجہ سے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر میری نگاہ ایک چھوٹی سی بستی پر پڑ گئی۔ میں خوشی سے جھوم اُٹھا اور میری ٹانگیں یوں تیزی سے چلنے لگیں جیسے اچانک ہی ان میں زندگی کی نئی لہر دوڑ گئی ہو۔

یہ چند مکانوں پر مشتمل ایک چھوٹی سی بستی تھی جس کے کنارے ایک مسجد بنی ہوئی تھی۔ مسجد کا ایک مینار دُور ہی سے دکھائی دے رہا تھا۔ میں سیدھا اسی طرف بڑھتا چلا گیا۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ جس ریوڑ کو میں نے ابھی ابھی دیکھا تھا، وہ اسی بستی کے سردار کی ملکیت ہو گا۔

بستی کے قریب پہنچا تو ایک چٹان راہ میں حائل ہو گئی۔ میں رُک گیا اور اس بستی تک پہنچنے کا راستہ تلاش کرنے لگا۔ بائیں طرف سے ایک پتلی سی پگڈنڈی کسی سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی نیچے جا رہی تھی۔ میں اسی پگڈنڈی پر چلنے لگا۔

دُور بلندی سے چند مکانات پر مشتمل اس بستی کو دیکھ کر پہلے تو مجھے حیرت ہوئی تھی کہ آخر یہ چند مکین اب تک ویرانوں میں بسنے والے درندہ صفت ڈاکوؤں سے کیسے محفوظ ہیں۔ . . لیکن اس چٹان نے جب میری راہ روک لی تو میں سمجھ گیا کہ اس بستی کو صرف وہیں سے دیکھا جا سکتا تھا، جہاں سے یہ مجھے دکھائی دی تھی۔ . . اس کے علاوہ چاروں طرف سے اونچی اونچی چٹانوں نے اسے یوں گھیر رکھا تھا کہ بستی چھپ کر رہ گئی تھی۔

پگڈنڈی سے اُتر کر میں جیسے ہی نیچے پہنچا، اچانک ایک سرد سی نال میری پشت سے لگ گئی اور کسی نے دھاڑ کر مجھے ہاتھوں کو سر سے بلند کرنے کا حکم دے دیا۔

میں نے خاموشی سے ہاتھ اُٹھا دیے۔

"کون ہو تم؟" سوال کیا گیا۔

"ایک لُٹا ہوا مسافر۔"

"تمہارے پاس کوئی ہتھیار ہے تو اسے پھینک دو۔"

"اگر میرے پاس ہتھیار موجود ہوتا تو میں خود کو لُٹا ہوا مسافر کبھی نہ کہتا۔ میں بھوکا اور پیاسا ہوں۔ چلتے چلتے میرے پیروں میں چھالے پڑ گئے ہیں اور تھکن نے مجھے نڈھال کر رکھا ہے۔ کیا اس بستی کے لوگ مجھ جیسے مسافروں سے یہی سلوک کرتے ہیں؟"

رائفل کی نال میری پشت سے ہٹ گئی۔

. . . پھر وہ شخص میرے سامنے آ گیا۔

وہ ایک کڑیل جوان تھا۔ اس کا چہرہ مونچھوں کی وجہ سے خاصا رُعب دار لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے کی سختی اس کی طبیعت میں سفاکی کی مظہر تھی لیکن آنکھوں کی نرماہٹ سے احساس ہوتا تھا کہ اس کے پتھر جیسے سینے میں پتھر کا جو دل ہے وہ محبت کی تانوں پر دھڑکنا بھی جانتا ہے۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"شہباز . . ." میں نے مختصر سا جواب دیا۔

"کہاں کے رہنے والے ہو؟"

"سگونگی قصبے کا رہنے والا ہوں۔"

"تو . . . تم دُور سے آئے ہو اور اس حالت میں . . ." اس نے عجیب سے لہجے میں کہا جیسے اُسے میری بات پر یقین نہ آیا ہو۔

"میری کہانی بہت طویل ہے دوست!" میں نے بھاری آواز میں کہا۔ "تم چند لمحوں میں جو اطمینان چاہتے ہو، وہ تمہیں اتنی آسانی سے میسر نہیں ہو سکتا۔ بہتر ہے کہ تم مجھے بستی کے سردار کے پاس لے چلو۔ میں تمہیں مطمئن کر دوں گا۔"

"نہیں . . ." اس کے لہجے میں سختی آ گئی اور آنکھوں کی نرماہٹ بھی یکایک ختم ہو گئی۔ "تم مجھے مطمئن کیے بغیر ایک قدم بھی آگے نہیں جا سکتے۔"

"اور میرا خیال ہے کہ تم مجھے آگے بڑھنے سے روک نہیں سکتے۔" کہتے ہوئے میں نے کسی جوان چیتے کی طرح حرکت کی اور اگلے ہی لمحے نہ صرف اس کی رائفل میرے ہاتھ میں جکڑی گئی تھی بلکہ میں نے اسے گھما کر ایسی حالت اختیار کر لی کہ رائفل کا دستہ اس نوجوان کی گردن پر جم چکا تھا۔

"اگر تم نے ذرا سی بھی حرکت کی تو تمہاری گردن کی ہڈی

ٹ جائے گی۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔
"اوہ..." اس کے حلق سے ایک کراہ نکل گئی۔
میں نے اس کی کمر پر ہلکا سا جھٹکا مارا تو رائفل پر اس کے ہاتھوں کی رہی سہی گرفت بھی ختم ہو گئی اور وہ منہ کے بل گرنے لگا۔ نوجوان پھرتیلا اور ہوشیار تھا، خود کو گرنے سے بچا گیا اور اس کے ساتھ ہی اس نے میری طرف الٹی چھلانگ بھی لگا دی... لیکن اس وقت تک میں رائفل کی نال اس کی طرف گھما چکا تھا۔
"بس دوست!" میں نے نال اس کے سینے سے لگاتے ہوئے غرا کر کہا۔ "تم جس چیز پر اترے ہوئے تھے، وہ اب مجھے اگلنے پر مجبور کر رہی ہے۔ کیا تم نے کبھی اپنی ہی لاش کو خون میں ڈوبے ہوئے دیکھا ہے؟"
"کک... کیا مطلب؟" وہ کانپ گیا۔
"میرا مطلب ہے، خواب میں..."
اس نے سر کو منفی جنبش دے کر تردید کر دی۔
"تو پھر یہی بہتر ہے کہ اپنی رائفل سنبھالو اور مجھے سردار کے پاس لے چلو۔" میں نے رائفل اس کی طرف اچھالتے ہوئے کہا۔
اس نے رائفل کو اس انداز میں جھپٹ لیا جیسے اگر رائفل اس کے ہاتھ نہ آئی تو اس کی سانس کی ڈوری ٹوٹ جائے گی۔ رائفل ہاتھ میں لیتے ہی اس کے چہرے پر سکون کے تاثرات پیدا ہو گئے۔
وہ مجھے ایسی نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے میں انسان کی بجائے کوئی ایسی مخلوق ہوں جسے پہلی بار اپنے سامنے دیکھ کر وہ ششدر رہ گیا ہو۔
"تم نے وعدہ کیا تھا کہ اگر میں تمہیں مطمئن کرنے میں کامیاب ہو گیا تو مجھے سردار کے پاس لے چلو گے۔" میں نے مسکرا کر کہا۔
اس کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں کانپنے لگیں... بالوں میں سے بہتی ہوئی یہ بوندیں اس کی کنپٹیوں سے نیچے کی طرف بہنے لگیں۔ اس نے آستین سے پسینہ پونچھا اور کہنے لگا۔
"تم واقعی ایک بے جگر اور سچے انسان ہو۔" وہ بڑبڑایا۔
"میں نے بھی تو یہی کہا تھا۔"
وہ ہنس پڑا۔
"چلو دوست۔" اس نے رائفل والا ہاتھ جھکا لیا اور دوسرا میرے کندھے پر رکھ دیا۔ اس کے انداز میں دوستی تھی اور وہ میری طرف سے پوری طرح مطمئن نظر آ رہا تھا۔
وہ مجھے لے کر ایک ایسے راستے پر چل دیا جو چٹانوں سے اتر کر بستی کی طرف جاتا تھا۔ راستے میں ہمارے درمیان زیادہ باتیں نہیں ہوئیں۔ وہ بار بار نہ جانے ذہنی طور پر کیوں الجھ جاتا تھا۔ غالباً وہ اپنی شکست کے بارے میں سوچنے لگتا تھا، جو اسے خلافِ توقع ... میرے ہاتھوں برداشت کرنا پڑی تھی۔
اس کا نام حسن تھا۔ اس نے مجھے چٹان کی آڑ میں جس جگہ اپنی رائفل کی زد میں لیا تھا، وہ مقام دراصل اس بستی کی حفاظتی چوکی کے طور پر استعمال ہوتا تھا... اور حسن کے بقول وہاں ہر وقت کوئی نہ کوئی پہرے پر موجود رہتا ہے۔ اس بستی کا نام پارس تھا اور اس کے سردار کا نام پارس خان تھا۔ بستی غالباً اسی کے نام پر تھی۔
حسن نے مجھے بتایا کہ سردار پارس کی بیٹی بلبل کی شادی ہو رہی ہے۔ اس لیے بستی کے تمام مکین سردار کے ہاں موجود ہیں۔ جب ہم مسجد کے قریب پہنچے تو علاقائی موسیقی اور نغمے کی آواز سنائی دینے لگی۔
وہ مجھے مسجد میں بیٹھنے کا اشارہ کر کے خود آگے بڑھ گیا۔
مسجد میں اس وقت کوئی بھی نہیں تھا۔
میں نے مسجد کا جائزہ لیا۔ چھوٹی سی مسجد تھی جہاں ایک طرف وضو کے لیے پانی جمع تھا اور قریب ہی ایک غسل خانہ تھا۔ میں نے ایک صف پر بیٹھتے ہوئے دیوار سے ٹیک لگا لی۔
ابھی مجھے بیٹھے ہوئے کچھ دیر نہیں ہوئی تھی کہ قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں نے مسجد کے دروازے کی طرف دیکھا۔ چھ آدمی مسجد کی طرف آ رہے تھے۔ ان میں سب سے آگے حسن تھا۔ اس سے دو قدم ہٹ کر ایک ادھیڑ عمر کا بارعب آدمی چلا آ رہا تھا اور باقی چار آدمی کئی قدم پیچھے پیچھے چلے آ رہے تھے۔
مسجد کے قریب ہی ایک کنواں تھا۔
ادھیڑ عمر آدمی کے بارے میں میرا اندازہ تھا کہ وہی پارس خان ہے۔ باقی چار آدمی کنویں کے قریب رک گئے جبکہ پارس خان اور حسن مسجد میں داخل ہو کر میری طرف بڑھنے لگے۔
میں سردار کی پذیرائی کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔
سردار نے میرا حال دریافت کیا اور محبت سے میرا ہاتھ تھام لیا۔ اس کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں رقص کر رہی تھیں۔ میرا حلیہ کچھ ملیا میٹ تھا۔ وہ میری ظاہری حالت سے جو بھی اندازہ لگاتے، وہ ظاہر ہے کہ حقیقت سے دور ہی ہو سکتا تھا۔

میں نے اپنے ہونٹوں پر نرم سی مسکراہٹ طاری کر لی تاکہ وہ میرے بارے میں اپنے دل سے ہر خوف کو نکال دے۔
میں نے مختصر اپنے بارے میں اسے بتایا۔ وہ مگوری کے سردار کو جانتا تھا اور میرا نام بھی سن چکا تھا اس لیے جلد ہی میری طرف سے مطمئن ہو گیا اور میرے قریب ہی صف پر بیٹھ کر دوستانہ انداز میں باتیں کرنے لگا... پھر اس نے کنویں کے قریب کھڑے چاروں افراد کو ہاتھ سے کوئی اشارہ کیا اور وہ اثبات میں سر ہلا کر وہاں سے واپس چلے گئے۔
حسن بھی ہمارے قریب ہی بیٹھ گیا تھا۔
وہ انہماک سے میری اور سردار پارس کے مابین ہونے والی باتیں سن رہا تھا۔ یہ باتیں زیادہ تر اپنی اپنی ذات کے بارے میں تھیں اور انھیں رسمی اور تعارفی باتیں ہی کہا جا سکتا ہے۔
جب ہم ایک دوسرے کے بارے میں کافی حد تک جان گئے تو سردار پارس اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے حسن سے کہا کہ وہ میرے لیے صاف ستھرے کپڑوں کا ایک جوڑا لے آئے اور مجھے اشارہ کیا کہ میں نہا دھو کر خود کو محفل میں بیٹھنے کے قابل بنا کر اس مکان میں آ جاؤں جہاں مہمانوں کی نشست کا انتظام تھا۔
حسن چلا گیا تو سردار پارس بھی میرا ہاتھ تھپتھپا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ واپس جانے کے لیے مڑا تو میں نے اس کی آنکھوں میں ایک گہرے خوف کے سائے کو منڈلاتے ہوئے دیکھا تھا۔
میں بے ساختہ مسکرا دیا۔
سردار پارس میری ہیبت کذائی سے خوف زدہ تھے۔
میں مسجد میں تنہا رہ گیا تو سوچا کہ نہانے کے لیے کنویں سے پانی ہی بھر لیا جائے۔ کنویں سے پانی کا ڈول کھینچتے ہوئے اچانک میری نگاہ ایک لڑکی پر پڑی۔
یہ ایک چھوٹی سی لڑکی تھی جو کنویں کے پاس سے گزر کر غالباً شادی والے گھر کی طرف جا رہی تھی کہ اچانک مجھ پر نگاہ پڑی اور رک گئی۔ اس کی آنکھوں میں خوف کی جگہ تجسس دیکھ کر میں اس کی جرأت مندی کا قائل ہو گیا۔
"تم کون ہو؟" اس نے ٹھٹک کر کہا۔
"میں ایک مہمان ہوں۔"
اس نے سر سے پاؤں تک میرا جائزہ لیا جیسے تصدیق کر رہی ہو کہ میں واقعی ایک مہمان ہی ہوں یا اس سے غلط بیانی کر رہا ہوں... پھر شاید اسے میرے حلیے میں مہمان کا حلیہ دکھائی نہیں دیا تو اس کی آنکھوں سے بے اعتباری جھلکنے لگی۔
"سردار پارس نے مجھے نہا دھو کر تیار ہونے کے لیے یہاں چھوڑا ہے۔" میں نے اس کی بے اعتبار آنکھوں کو جواب دیا۔
"اور حسن میرے لیے صاف ستھرے کپڑے لینے گیا ہے۔"
"کیا تم شہر سے آئے ہو؟"
"نہیں تو..."
"تم جہاں کہیں سے بھی آئے ہو، یقیناً تمہارا پیشہ بھیڑ بکریوں کو ذبح کرنا ہی ہے۔" اس نے مجھے تنقیدی نگاہ سے دیکھتے ہوئے کہا۔
"یہ بات تم یقین سے کیسے کہہ سکتی ہو؟"
"تمہارے حلیے سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے۔"
"یہ خون کے چھینٹے بھیڑ بکریوں کے نہیں ہیں۔"
"پھر یقیناً تم کوئی چڑی مار ہو۔"
"چڑیوں میں اتنا خون نہیں ہوتا کہ کسی شخص کے کپڑے خون میں تر ہو جائیں۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ "میرا خیال ہے اب تمہیں فوراً ہی دلہن کے پاس چلی جانا چاہیے۔"
وہ خاموشی سے مجھے دیکھتی رہی اور میں پانی کے ڈول نکال نکال کر اس نالی میں انڈیلتا رہا جس میں سے پانی بہہ بہہ کر غسل خانے کی ٹنکی میں جمع ہوتا جا رہا تھا۔ جب ٹنکی بھر گئی تو میں غسل خانے کی طرف بڑھ گیا۔ لڑکی اب بھی کنویں کے قریب کھڑی کن انکھیوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔
میں غسل خانے میں نہانے لگا اور جب میں غسل سے فارغ ہو گیا تو اس وقت تک حسن میرے لیے کپڑوں کا ایک نیا جوڑا لے کر آ چکا تھا۔ اس نے کپڑے غسل خانے کی دیوار پر رکھ دیے اور مجھے تیار ہو کر اس احاطے میں آنے کے لیے کہہ دیا جہاں مہمانوں کے لیے کھانا لگا دیا گیا تھا۔
شام ڈھل رہی تھی اور سورج تیزی سے مغرب کی آغوش میں گر رہا تھا۔ نہانے کے بعد میری طبیعت خاصی سنبھل گئی۔ ذہن سے بوجھ اتر گیا اور جسم سے گرد و غبار ڈھل جانے سے یوں لگا جیسے میری روح تک نکھر گئی ہو۔ میں خود کو بے پناہ ہلکا پھلکا محسوس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کررہا تھا۔

میں نے کنوئیں کی طرف دیکھا۔

وہ حسین فاختہ نہ جانے کب کی اُڑ گئی تھی۔

میں غسل خانے سے باہر آیا تو اچانک ہی مجھے ٹھٹک جانا پڑا۔ ایک دھماکا سنائی دیا تھا۔ یہ بلاشبہ گولی ہی کی آواز تھی اور دھماکا اسی طرف سے سُنائی دیا تھا جدھر احاطے میں مہمان جمع تھے۔

اس دھماکے سے میں نے کوئی خاص تاثر نہیں لیا کیونکہ عموماً شادیوں پر شغل کے طور پر اس قسم کا شور شرابا ہوتا ہی رہتا ہے... ابھی اس دھماکے کی گونج ختم ہوئی تھی کہ ایک اور گولی چلی۔

اس بار ایک چیخ بھی سُنائی دی۔

میں مسجد سے نکل کر کنوئیں کی طرف آ گیا تھا۔

دھماکا اور چیخ سُن کر میں جہاں تھا، وہیں کھڑا ہو گیا۔ یہ ایک غیر فطری چیخ تھی۔ اس میں خوشی یا ہیجان کا کوئی تاثر نہیں تھا بلکہ یہ ایک دہشت آمیز اور ڈوبتی ہوئی زندگی کو ظاہر کرنے والی چیخ تھی۔ چیخ بھی مردانہ تھی اور گولی کا دھماکا سنائی دینے کے فوراً ہی بعد میری سماعت تک پہنچی تھی۔ اس لیے میں یہ سمجھنے پر مجبور ہو گیا کہ شادی کی خوشیوں میں کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔

میں ان چند مکانوں پر مشتمل بستی کے محلِ وقوع سے ناواقف تھا پھر بھی آوازوں سے میں نے اندازہ لگا لیا کہ گڑبڑ کس طرف ہے اور مجھے وہاں تک جا کر صورتِ حال معلوم کرنے کے لیے کون سی سمت اختیار کرنی چاہیے۔ میں مسجد کے عقبی حصے کی طرف دوڑ پڑا۔

اچانک ایک اور فائر ہوا۔

ایک اور دلدوز چیخ سُنائی دیا۔

... پھر تو دھماکوں اور چیخوں کا طوفان اُٹھ کھڑا ہوا۔ ہر دھماکا سماعت شکن تھا اور ہر چیخ دل پر لرزہ طاری کر رہی تھی۔ عورتوں اور مردوں کی ملی جلی چیخیں تھیں۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے شادی کی خوشگوار محفل میں اچانک ہی کسی وجہ سے کہرام برپا ہو گیا ہو۔

گولیاں یوں چل رہی تھیں جیسے بندوقیں چند دیوانوں کے ہاتھ لگ گئی ہوں اور وہ ان بندوقوں میں موجود آخری گولی تک چلا دینے پر تلے ہوئے ہوں۔ ان دھماکوں سے میرے کانوں کے پردے تک لرز گئے تھے۔

کچھ دیر قبل جو سکون اور خاموشی اس چھوٹی سی بستی کی خصوصیت لگ رہی تھی، اب ان دونوں کا یہاں نام و نشان تک باقی نہیں رہ گیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے بستی میں کوئی آتش فشاں پہاڑ پھوٹ پڑا ہو اور وہ بار بار دھماکے کر کے لاوا اُگل رہا ہو۔

شام ہو رہی تھی اور گولیوں کے شرارے ہر طرف اُٹھتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ میں مسجد کے عقبی حصے میں کود گیا اور پھر وہاں سے میں دیوار کے ساتھ جھکی جھکی حالت میں آگے بڑھنے لگا۔ میرا رُخ اسی جانب تھا جدھر سے فائرنگ کی آوازیں آ رہی تھیں۔

جیسے جیسے میں آگے بڑھ رہا تھا مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے پوری فوج یہاں گولیاں برسانے میں مصروف ہے۔ فضا میں شراروں کے ساتھ ساتھ دھواں بھی اُٹھنے لگا تھا اور بارود کی بو چاروں طرف پھیل گئی تھی۔

مسجد کے عقبی حصے سے میں جس جگہ پہنچا وہ ایک اصطبل تھا۔ میں اس کی دیوار سے اندر کود گیا۔ یہاں میں نے دیکھا کہ دھماکوں کی وجہ سے گھوڑے اور مویشی بھی بے حد بے چین ہیں۔

آوازیں... دم توڑتی ہوئی چیخیں... دم توڑنے والے زخمیوں کی کراہیں... اور خوف و دہشت جن کا عنوان تھا، وہ چیخیں سُن سُن کر میرا رواں رواں کانپ اُٹھا تھا۔

میں اصطبل میں گھوڑوں اور مویشیوں کے درمیان دوڑتا ہوا اگلی دیوار تک پہنچا اور وہاں سے جو میں نے جھانک کر دیکھا تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میری آنکھوں میں وہ منظر گھوم گیا جو میں نے بچپن میں دیکھا تھا... وہی منظر جب میرے قبیلے پر ڈاکوؤں نے حملہ کیا تھا اور ایک ایک فرد کو موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا۔ بالکل ویسا ہی منظر اس وقت بھی میرے سامنے تھا۔

سب سے پہلی لاش جو دکھائی دی، وہ سردار پارس کی لاش تھی۔ یہ منظر اس احاطے میں دکھائی دیا تھا، جہاں مہمانوں کے لیے کھانا لگا دیا گیا تھا۔ سردار پارس ایک میز پر یوں پڑا تھا کہ اس کی کھوپڑی کھلی ہوئی تھی اور اس میں سے خون بہہ بہہ کر زردے کی ایک بڑی سی تھالی میں گر رہا تھا۔

سردار کے قریب ہی ایک اور نوجوان کی لاش دکھائی دی۔ اس کے سر پر سہرا نظر آ رہا تھا۔ یہ غالباً وہی بدنصیب تھا جس کے سہرے کے پھول کھلنے سے پہلے ہی مُرجھا گئے تھے۔ اس کے سینے میں تین سوراخ تھے اور ہر سوراخ خون اُگل رہا تھا۔

وہ شخص جو شادی بیاہ کے نغمے سُناتا تھا، اس کی لاش اپنے سازوں کے درمیان مُڑی تُڑی حالت میں پڑی تھی۔ اس کے قریب ایک عورت کی لاش بھی تھی۔ یہ غالباً کوئی مُغنیہ تھی جسے شب کے لیے بُلایا گیا تھا۔ ایک گولی اس مغنیہ کے گردن اور دوسری اس کی کمر میں لگی تھی اور دونوں ہی سوراخ خون آلود تھے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مغنیہ کی لاش کے قریب ایک نوعمر لڑکا مُردہ حالت میں پڑا تھا۔ اس کی بائیں آنکھ کے نیچے ایک خون آلود نشان تھا۔ غالباً گولی وہاں سے داخل ہو کر کھوپڑی کو توڑتی ہوئی عقب سے نکل گئی تھی۔

چار عورتیں ایک ساتھ ایک جگہ پڑی تھیں اور ان کی لاشوں کی ترتیب بتاتی تھی کہ انہیں ایک ہی باڑ میں ہلاک کیا گیا ہے۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

"اُف... " میں نے زیرِ لب کہا۔ "انسان جب درندگی پر اُترتا ہے تو دُنیا کا سب سے بڑا اور خطرناک ترین درندہ بن جاتا ہے۔"

یہ لاشیں تو اس احاطے میں تھیں جہاں کھانے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ ہر شخص کھانے کے برتنوں کے قریب مُردہ پڑا تھا۔ کسی کا ہاتھ رکابی میں تھا اور کسی کا لقمہ منہ کے قریب گرا ہوا تھا۔ ان پر اب بھی گولیاں برس رہی تھیں۔

... ان لاشوں میں مجھے حسن کی لاش بھی دکھائی دی۔ اس کی ٹھوڑی پر گولی لگی تھی اور اس گولی نے اس کی ٹھوڑی کو اُڑا دیا تھا۔ اچانک مجھے ایک موٹی سی عورت نظر آئی۔ گولی غالباً اس کے پیٹ میں لگی تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنی توند کو سنبھالے اس احاطے میں ناچتی پھر رہی تھی۔ اس کی چیخوں سے دَر و دیوار کانپ رہے تھے۔

دفعتہً مجھے بیک وقت کئی قہقہے سُنائی دیے۔

میں نے ان آوازوں کی طرف دیکھا۔

وہ تعداد میں پندرہ تھے اور ان میں سے ہر ایک کے ہاتھ میں ریوالور یا رائفل دبی ہوئی تھی۔ وہ ایک قطار میں کھڑے تھے اور احاطے میں موجود ہر شخص پر گولیاں برسا رہے تھے۔

مجھے احاطے میں اب کوئی بھی زندہ ہستی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ موٹی سی عورت بھی گر کر دم توڑ چکی تھی... پھر بھی وہ لوگ اندھا دُھند گولیاں برسا رہے تھے۔

جو لوگ جانکنی میں مبتلا تھے ان کو گولی لگتی تو ان کا جسم پُرسکون ہو جاتا... میری آنکھیں ان لاشوں پر گھومتی رہیں حتیٰ کہ ایک جگہ رُک گئیں۔

مجھے بھر کے لیے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے میرے دل کو مٹھی میں لے لیا ہو۔ وہ لڑکی بھی ان لاشوں کے درمیان موجود تھی جس سے میں کنوئیں پر ملا تھا۔ وہ لڑکی مجھے بے پناہ پسند آئی تھی لیکن اس وقت وہ جس حالت کا شکار تھی اسے کوئی دیکھنا بھی پسند نہیں کر سکتا تھا۔

اس کا دُبلا پتلا جسم گولیوں سے چھلنی ہو چکا تھا۔ اس کے حسین اور پُرکشش چہرے میں کم و بیش سات سوراخ دکھائی دے رہے تھے۔ وہ ایک میز پر یوں گری ہوئی تھی کہ اس کے ہاتھ اور پاؤں چاروں طرف لٹکے جھول رہے تھے۔ اس کے دائیں بازو سے جو خون ٹپک رہا تھا، وہ نیچے فرش پر پڑے ہوئے ایک شخص کے چہرے پر گر رہا تھا۔

فرش پر کچھ لوگ شاید گر کر خود کو بچانے کے لیے لیٹ گئے تھے جب گولیوں کے دھماکے ختم نہ ہوئے تو وہ اپنے حواس کھو بیٹھے اور پھر اُٹھ کر دروازے کی طرف دوڑے... لیکن وہاں تو رائفل برداروں کی پوری ایک قطار موجود تھی۔

اچانک ہی فائرنگ شروع ہوئی اور ایسے تمام افراد گر کر تڑپنے لگے جنہوں نے زندگی کے لیے دوڑ لگا دی تھی۔ ان میں ایک عورت بھی شامل تھی۔ اس نے فرش سے اُٹھ کر چیختے ہوئے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔

بے طرح برسنے والی گولیوں میں سے دو ان ہاتھوں کو چھیدتی ہوئی چہرے میں گھس گئیں اور اُنہوں نے اس کا حسین چہرہ بھی مسخ کر دیا۔ اس کی ناک کے کئی ٹکڑے ہو کر اُڑ گئے تھے۔

میں جب ہوش میں آیا تو مجھے یوں لگا جیسے میں نے کوئی دہشت ناک خواب دیکھا ہو۔ اس معصوم سی فاختہ کی صورت بار بار میری آنکھوں کے سامنے گھوم جاتی تھی جس سے کنوئیں پر ملاقات ہوئی تھی۔ سردار پارس اور دُولہا کی صورتیں بھی بار بار میری آنکھوں کے سامنے آ جاتیں اور میں گھبرا کر نگاہ پھیر لیتا۔

معاً مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں بہرہ ہو گیا ہوں۔ اب مجھے فائرنگ کا کوئی دھماکا سنائی نہیں دے رہا تھا۔

میں اصطبل کی دیوار سے لگا بیٹھا رہا۔

اچانک باہر سے ان گنت گھوڑوں کے ہنہنانے کی آوازیں سنائی دیں۔ کئی قہقہے ایک ساتھ بلند ہوئے۔ ان میں فتح و کامرانی کا گہرا تاثر چھپا ہوا تھا۔ میں لاشوں کو دیکھنے میں اس قدر منہمک تھا کہ میں ان فائرنگ کرنے والوں کی قطار کو بھول ہی گیا تھا... اب جو میں نے نگاہ اُٹھائی تو ان میں سے ایک بھی دکھائی نہیں دیا۔

میرا دل خون کی تیز گردش کی وجہ سے شدید دھڑک رہا

شکار تھا اور میری آنکھیں بار بار بھیگ جاتی تھیں... لیکن یہ زندگی کی ایک تلخ حقیقت تھی جس نے اپنی کھلی آنکھوں سے صاف دیکھا تھا۔ یہ کوئی خواب نہیں تھا جو محض ایک بار چیخ کر بیدار ہو جانے سے ختم ہو جاتا ہے... یہ تو ان گنت چیخوں سے سجا ہوا ایک تلخ منظر تھا جو دل میں ہزاروں کانٹوں کی طرح پیوست ہو چکا تھا اور میں جانتا تھا کہ یہ کانٹے چننے میں مجھے شاید کئی روز بیت جائیں گے۔

اصطبل کے سامنے جو احاطہ تھا، وہاں اب لاشیں ہی لاشیں تھیں۔ میں دیوار پھاند کر اس احاطے میں پہنچا اور پھر میں نے ایک رائفل اور ریوالور پر قبضہ کر لیا۔ رائفل میں گولیاں موجود تھیں اور ریوالور بھرا ہوا تھا لیکن یہ دونوں ہتھیار جن کی بھی ملکیت تھے، ان بے چاروں کو انہیں استعمال کرنے کا موقع بھی نصیب نہیں ہوا تھا

میں نے فالتو کارتوسوں کے لیے کمرے میں ادھر اُدھر دیکھا اور پھر جو کچھ بھی ہاتھ لگا اُسے جیبوں میں ٹھونس لیا۔

اس بستی میں چند ہی مکانات تھے اور ان مکانوں کے مکین تعداد میں چالیس سے کسی طرح بھی زیادہ نہیں رہے ہوں گے... میں نے احاطے میں پڑی لاشوں کو دیکھنے کے بعد اندازہ لگایا کہ اب شاید ان مکینوں میں سے ایک بھی زندہ نہ بچا ہو گا۔

رائفل اور ریوالور حاصل کرنے کے بعد میں نے سکون کی ایک گہری سانس لی۔ غیر مسلح حالت میں، میں خود کو بے حد بے بس اور لاچار محسوس کر رہا تھا جب کہ اب میرا جی چاہ رہا تھا کہ باہر موجود پندرہ لیٹروں کو تنہا ہی للکاروں اور اس وقت تک آگ اور شعلے اُگلتا رہوں جب تک ان درندوں میں سے کوئی ایک بھی زندہ ہو... لیکن میں خود پر قابو رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اچانک مجھے باہر سے ایک قہقہہ اور سُنائی دیا۔

... پھر گھنگھروؤں کی جھنکار سُنائی دینے لگی۔

میں چونک کر آواز کی طرف دیکھتا ہُوا ایک بار پھر اصطبل کی طرف دوڑا اور دیوار پھاند کر اصطبل میں دُبک گیا۔ اب میں دیوار کی اُسی دراڑ سے جھانک رہا تھا جس سے میں نے انسان کو انسان سے درندگی کا کھیل کھیلتے ہُوئے پہلے بھی دیکھا تھا۔

وہ ایک لڑکی ہی تھی۔

وہ آہستہ آہستہ احاطے میں داخل ہُوئی۔

اس کی پازیبوں کی جھنکار میرے دل کو جھنجوڑ رہی تھی اور میرا رُواں رُواں کانپ رہا تھا لیکن میں خود کو بے قابو ہونے سے بچانے کے لیے مجبور تھا۔ میں نے دُلہن کی طرف دیکھا غالباً وہ تنہا ہی زندہ بچی تھی۔

وہ چھم چھم کرتی احاطے میں آئی اور اس جگہ رُک گئی جہاں سردار سپاریں اور دُلہا کی لاشیں پڑی تھیں۔ وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں وحشت سے پھٹی ہوئی تھیں اور ہانپنے کی وجہ سے اس کی سانسیں سانپ کی پھنکاروں کی طرح میری سماعت سے ٹکرا رہی تھیں۔

دُلہن جیسے ہی اندر آئی دروازے کی سمت سے مردانہ قہقہے سنائی دینے لگے۔ ان قہقہوں میں درندگی تھی، سفاکی اور درندگی سے بھرپور ان قہقہوں کے درمیان مجھے ایک فحش جملہ سنائی دیا جو غالباً کسی لیٹرے نے نئی نویلی دُلہن کے بارے میں کہا تھا۔ یہ جملہ سُن کر میرا خون میری کنپٹیوں پر ٹھوکریں مارنے لگا۔

درندے اب دروازے میں کھڑے بے بس دُلہن کو دیکھ رہے تھے جو خون میں ڈوبی ہوئی آنکھوں سے سردار پاریں اور دُلہا کو گھورنے میں مصروف تھی۔ اس کی مٹھیاں سختی سے بھنچی ہُوئی تھیں اور اس کے دانت اتنی سختی سے ایک دُوسرے پر بھنچے ہُوئے تھے کہ اس کے رخساروں کی ہڈیاں نمایاں ہو گئی تھیں۔ غصّے اور نفرت کی آگ اس کے جسم کو جھلسا رہی تھی لیکن ایک ناتواں سی نئی نویلی دُلہن ان بھیڑیوں کے نرغے میں بے بس تھی اور ان کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتی تھی۔

اُس نے اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا اور سسک سسک کر رونے لگی۔ میرا دل بھر آیا لیکن میں خود پر قابو پا کر جہاں تھا وہیں دُبکا رہا... صورت حال میرے لیے ناقابلِ فہم تھی اس لیے میں خود کو اس معاملے میں ملوث نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اچانک دروازہ ایک دھماکے سے بند ہو گیا۔

احاطے میں دُلہن تنہا رہ گئی۔

وہ دونوں ہاتھوں سے چہرے کو ڈھانپے سسک رہی تھی اور کوئی اُسے تسلّی دینے والا نہیں تھا۔ اچانک مجھے ایک لاش میں تھوڑی سی حرکت محسوس ہُوئی۔ میں چونک کر اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ یہ ایک ایسا نوجوان تھا جس کی ران زخمی ہُوئی تھی۔

وہ اُٹھا تو اس نے قریب پڑی ایک رائفل کو جھپٹ لیا اور پھر دروازے کی طرف دوڑا لیکن اس کی زخمی ٹانگ نے اُسے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دو قدم سے زیادہ بڑھنے کی مہلت نہیں دی۔

زخمی نوجوان لڑکھڑا کر گر گیا۔

اس نے گرتے گرتے دروازے کی طرف فائر کر دیا۔

اچانک دروازہ ایک دھماکے سے کھل گیا۔

میں نے دراڑ میں رائفل کی نال جما دی۔ دروازہ میری رائفل کی نال کی سیدھ میں تھا۔ ایک لیٹرا دروازے میں دکھائی دیا۔ وہ غالباً فائر کی آواز سُن کر دوڑا آیا تھا... پھر جب اس نے ایک زخمی نوجوان کو رائفل تھامے دروازے کی طرف تان کر بیٹھا دیکھا تو اس کے ہونٹوں پہ ایک زہریلی مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔

"تو تم ابھی زندہ ہو..." لیٹرا قہقہہ لگا کر بولا۔

جواباً نوجوان چیخ پڑا۔

اس نے جو کچھ بھی کہا، جذبات کی زیادتی اور ہیجانی کیفیت کی وجہ سے اس کا کوئی مفہوم ادا نہ ہو سکا... لیکن ایسے موقعوں پہ کہے گئے جملوں کا بس ایک ہی مقصد ہوتا ہے... اور وہ ہے نفرت کا اظہار... اور جب کوئی اپنے بارے میں نفرت کا اظہار سُنتا ہے تو وہ جواباً عملی نفرت کا مظاہرہ کرنے سے باز نہیں رہتا۔

لیٹرے نے رائفل اُٹھائی اور زخمی نوجوان کا نشانہ لیا۔

میں نے ٹرائیگر پر انگلی کا دباؤ بڑھا دیا۔

اس زخمی نوجوان کی ہمت نے مجبور کر دیا تھا کہ اگر اس کی خواہش اُدھوری رہ جائے تو میں اس کی تکمیل کر دوں... لیٹرے نے فائر کیا۔ گولی نوجوان کے سینے میں اُتر گئی۔

وہ ایک چیخ مار کر اُلٹ گیا۔

میں نے ٹرائیگر دبا دیا۔

ایک خوفناک دھماکا ہُوا۔

گولی لیٹرے کے سینے پر پڑی اور وہ جہاں تھا، چند لمحوں کے لیے وہیں ساکت و جامد کھڑا حیرت سے آنکھیں جھپکاتا رہا... پھر وہ مُنہ کے بل گر گیا۔

زخمی نوجوان دَم توڑ رہا تھا لیکن میں اس کے لبوں پہ اطمینان اور سکون بھری مُسکراہٹ دیکھ چکا تھا۔ اس نے لیٹرے کو مرتے دیکھ کر سکون سے اپنی موت کو گلے لگا لیا تھا۔

دُلہن اب بھی چہرہ چھپائے سسکیاں بھر رہی تھی۔

دروازے میں موجود لیٹرے کی دم توڑتی ہُوئی چیخ نے غالباً اس کے ساتھیوں کو متوجہ کر دیا تھا۔ وہ سب کے سب ایک بار پھر دروازے سے دندناتے ہُوئے اندر آ گئے۔

دروازے سے اندر قدم رکھنے کے بعد انھوں نے پھر قطار بنائی اور دُلہن کو گھورنے لگے۔ ان کی نگاہ اس دم توڑتے ہُوئے نوجوان پر نہیں پڑی جس نے رائفل کی نال اب بھی دروازے کی طرف تان رکھی تھی۔ وہ غالباً یہی سمجھے تھے کہ لیٹرے کو دُلہن نے قتل کیا ہے۔

وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگے۔

میں دراڑ میں سے ان کی ایک ایک حرکت پر نگاہ رکھے ہُوئے تھا لیکن ان درندوں سے نمٹنے کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ دُلہن کے لیے میرے دل میں ہمدردی کے گہرے جذبات تھے لیکن اس کے لیے اب زندگی بے معنی ہو گئی تھی۔ اس کا سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ موت اس کے پُورے خاندان کو چاٹ گئی تھی۔

درندے آہستہ آہستہ آگے بڑھتے رہے۔

وہ ایک قطار کی صورت میں قدم بڑھا رہے تھے۔

جیسے جیسے وہ دُلہن کے قریب ہوتے گئے، ان کی قطار آہستہ آہستہ گھوم کر دائرے کی شکل اختیار کرتی چلی گئی۔

یہ ڈاکوؤں کا گروہ ہر قسم کے آدمیوں پر مشتمل تھا۔ کوئی ناٹے قد کا آدمی تھا تو کوئی لمبے قد کا... کسی کا چہرہ پُرکشش تھا تو کسی کے چہرے کو دیکھ کر ہی جُھرجُھری سی آ جاتی تھی۔ کوئی پتلا تھا تو کوئی بے ترتیبی سے مٹاپے کا شکار تھا... لیکن ان ہر قسم کے چہروں پہ ایک ہی قسم کی خباثت تھی۔ وہ سب کے سب حرص آشام دکھائی دے رہے تھے۔

اچانک دُلہن نے چہرے سے ہاتھ ہٹا دیے۔

وہ اب ان لوگوں کو گھور رہی تھی۔

اس کے چہرے پہ خوف کا ہلکا سا بھی نشان نہیں تھا۔ وہ قہر و غضب کی جیتی جاگتی دیوی تھی۔ اس کا سہاگ لُٹ چکا تھا اور اس کے ہر عزیز کی لاش اُس کے قریب پڑی تھی لیکن وہ ان سب کے لیے کچھ بھی تو نہیں کر سکتی تھی... وہ ان کے لیے صرف مر سکتی تھی اور غالباً اُس نے ایسا ہی کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

"ملک نواز... وہ کسی زخمی شیرنی کی طرح دھاڑتی ہوئی

یہ نام سُن کر میں اُچھل ہی تو پڑا۔

میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اُس شخص کو گھورنے لگا جس کی طرف متوجہ ہو کر دُلہن نے یہ نام پکارا تھا... لیکن وہ کسی ایک شخص کو نہیں گھور رہی تھی۔ وہ اپنی شعلہ بار آنکھوں سے سب

کو گھیر رہی تھی اور وہاں موجود سارے ہی ڈاکوؤں سے مخاطب تھی۔ اس لیے میں یہ اندازہ نہ لگا سکا کہ ان میں سے ملک نواز کون ہے۔۔۔ لیکن مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ وہ ملک نواز کا گروہ تھا۔ اسی ملک نواز کا جس کے گروہ میں گل زمان اور شیر خان نے پناہ لی تھی۔ میں نے ڈاکوؤں کے دائرے میں دیکھا لیکن ان میں شیر خان اور گل زمان دکھائی نہیں دیے۔

"تم ایک جانور ہو۔۔۔" دلہن کہہ رہی تھی۔ "ایک ایسے جانور جو معصوم اور بے گناہ لوگوں کے خون پر زندہ رہتا ہے۔"

میں اس نوعمر لڑکی کے لب و لہجے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ بے حد مضبوط لہجے میں مخاطب ہوئی تھی۔ غالباً اس نے ہر صدمے کو دل پر سہہ لیا تھا اور اب اپنی زندگی کے خاتمے کا صدمہ سہنے کے لیے بھی تیار ہو چکی تھی۔ وہ ہسٹریائی کیفیت میں مبتلا تھی۔

میری نگاہ اب لٹیروں کے دائرے پر جمی ہوئی تھی اور میں یہ دیکھنے کے لیے بے چین تھا کہ ان میں سے کون لڑکی کی بات کا جواب دیتا ہے۔ جواب ملک نواز کے علاوہ کون دے سکتا تھا۔

اچانک میری نگاہ ایک شخص پر جم گئی۔

وہ ایک مضبوط جسم کا آدمی تھا۔ قد آور اور سفاک دی۔ اس کی پتلی پتلی مونچھوں کے نیچے ہونٹوں پر بڑی ہی درندگی آمیز مسکراہٹ رقصاں تھی۔

اس نے دلہن کی بات کے جواب میں کندھوں کو اچکایا تھا۔ جیسے اس الزام کی اسے کوئی پروا نہ ہو۔ وہ چھ فٹ سے نکلتے ہوئے جسم کا مالک تھا۔ اس کے کندھے کشادہ تھے اور بازو بے حد مضبوط نظر آ رہے تھے۔ اس نے دائیں ہاتھ میں رائفل دبا رکھی تھی۔ اس کی آنکھیں سیاہ تھیں اور ان میں بڑی ہی خطرناک چمک تھی۔

"اس دنیا میں مجھ سے بہتر کوئی مرد نہیں، بلبل۔۔۔" اس شخص نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"تمہیں اپنی ناپاک زبان سے میرا نام پکارنے کا کوئی حق نہیں۔" دلہن ہسٹریائی انداز میں چیخ پڑی۔

"ہاں۔۔۔ اب تمہارا نام نہیں پکارنا چاہیے کیوں کہ تم دلہن بننے سے پہلے ہی بیوہ ہو چکی ہو۔" ملک نواز نے قہقہہ لگا کر کہا۔ اس کے ساتھ ہی باقی لٹیرے بھی ہنس پڑے جیسے ملک نواز نے کوئی بے حد مزاحیہ بات کہی ہو۔

ملک نواز آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔

وہ دلہن سے دو قدم کے فاصلے پر رک گیا۔

"اب یہاں تمہارے سوا کوئی بھی زندہ نہیں بچا۔" ملک نواز نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "ایسے میں تمہاری اکڑ میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ تمہیں تو میرے قدموں پر جھک جانا چاہیے تھا۔"

"شاید تم بھول رہے ہو کہ بلبل نے اپنے بزرگوں اور اپنے خدا کے علاوہ کسی کے سامنے گردن نہیں جھکائی۔ تم اپنے قدموں پر جھکنے کی بات کر رہے ہو، شاید تم سمجھ رہے ہو کہ میں تم سے زندگی کی بھیک مانگوں گی۔ ناممکن ملک نواز۔۔۔ ناممکن۔"

"میں، تمہیں زندگی کی نہیں موت کی بھیک مانگنے پر بھی مجبور کر سکتا ہوں۔" ملک نواز لڑکی کی گستاخی پہ تلملا کر رائفل کے کندے پہ ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

اس نے رائفل کی نال سے بلبل کے بالوں کی ایک لٹ کو سنوارا اور قہقہہ لگایا۔ اس نے آسمان کی طرف منہ اٹھا لیا تھا اور احاطہ اس کے قہقہے سے گونج اٹھا تھا۔

"میں پوچھتی ہوں، تم نے ان لوگوں کو کیوں ہلاک کیا ہے؟" دلہن کی چیخ ملک نواز کے ہذیانی قہقہے سے بھی بلند تھی۔

ملک نواز کا قہقہہ دم توڑ گیا۔

وہ رک کر دلہن کو گھورنے لگا۔

"بلبل۔۔۔" ملک نواز کا لہجہ بے حد ناخوشگوار تھا۔ "تم مجھے بتاؤ گی کہ وہ چاندی کا ذخیرہ کہاں چھپا ہوا ہے۔"

دلہن کے چہرے پر کرب کے تاثرات ابھر آئے۔

"جواب دو۔" ملک نواز نے دھاڑ کر کہا۔

"تو تم نے محض تھوڑی سی چاندی کے لیے اتنی قیمتی انسانی جانیں ضائع کر دیں؟" دلہن کے لہجے میں کرب تھا۔ اس کی آنکھیں بھیگی بھیگی نظر آنے لگی تھیں۔

"تھوڑی سی چاندی!" ملک نواز کے لہجے میں طنز تھا۔ "اگر یہ ساری لاشیں ترازو میں ایک طرف اور چاندی کے ذخیرے کو دوسرے پلڑے میں رکھ دیا جائے تب بھی چاندی کا وزن کہیں زیادہ ہوگا۔"

میں چونک پڑا۔

میرے تجسس کی تسکین ہو گئی تھی۔

میں حیران تھا کہ آخر اس پرسکون آبادی کے چند لوگوں سے ملک نواز کو ایسی کیا دشمنی ہے جس کی وجہ سے انہیں یوں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بے زبان جانوروں کی طرح ہلاک کرنے کی ضرورت پیش آئی تھی۔۔۔ تو یہ چاندی کا چکر ہے۔ میں نے سوچا۔۔۔ اور تھوڑی بہت نہیں بلکہ چاندی کے ذخیرے کا معاملہ ہے۔ میں سنبھل کر بیٹھ گیا اور مزید توجہ سے ان لوگوں کی طرف دیکھنے لگا۔

"بتاؤ۔۔۔ چاندی کہاں ہے؟" ملک نواز گرجا۔

دلہن خاموش رہی۔

اچانک ایک چھوٹی سی بچی نہ جانے کدھر سے نکل کر سامنے آ گئی۔ اس نے احاطے میں بکھری ہوئی لاشوں کو دیکھا اور پھر سینہ تان کر ملک نواز کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اس بچی کو دیکھ کر دلہن حیران رہ گئی۔

"میری ماں کو کس نے مارا ہے؟" بچی نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔ اس کی آنکھیں باری باری ہر شخص کا جائزہ لے رہی تھیں۔

بچی کی عمر زیادہ دس سال رہی ہوگی۔

اس کے بال سنہرے اور گھنگھریالے تھے۔ وہ نئے کپڑے پہنے ہوئے تھی اور اس کے معصوم چہرے پر تاثرات منجمد سے ہو کر رہ گئے تھے۔ وہ ہچکیاں لے رہی تھی اور نہ ہی اس کی آواز بھرائی ہوئی لگتی تھی۔ اس کی آواز سن کر مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے وہ خواب میں بول رہی ہو۔

"تمہاری ماں کون تھی، پیاری بچی؟" ملک نواز نے مسکرا کر بچی سے دریافت کیا۔

بچی نے نیلے کپڑوں والی ایک ایسی عورت کی طرف انگلی اٹھا دی جس کی لاش دیوار کے ساتھ ٹکی ہوئی تھی اور جس کی گھورتی ہوئی بے جان آنکھوں میں کرب کی علامات منجمد تھیں۔

"کیا تم اپنی ماں کے پاس جانا چاہتی ہو؟" ملک نواز نے سرگوشی کی۔ یہ سرگوشی سانپ کی پھنکار جیسی تھی۔

میں کانپ گیا۔۔۔ میری انگلی رائفل کے ٹریگر پر جم گئی۔

مجھے ملک نواز سے شدید نفرت ہو گئی تھی۔

میں دل ہی دل میں فیصلہ کر چکا تھا کہ یہ شخص میرے ہاتھوں کسی خارش زدہ کتے کی موت مارا جائے گا۔ اس نے بچی سے جس انداز میں سوال کیا تھا، اس کی وجہ سے میرے جسم میں سنسنی کی لہری دوڑ گئی تھی اور شاید دلہن نے بھی یہی کچھ محسوس کیا تھا۔

"نہیں، ملک نواز۔۔۔" دلہن چیخ پڑی۔

اس کے لہجے میں استدعا تھی۔

وہ ہذیانی انداز میں چیخ پڑی تھی۔

جواباً ملک نواز نے درندگی سے بھرپور قہقہہ لگایا تھا اور اس کے ساتھی بھی ہنس پڑے تھے۔ ان میں سے ہر ایک تجسس میں مبتلا نظر آ رہا تھا۔ منظر اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ رہا تھا۔ زندگی کا تلخ اور حقیقی ڈراما تیزی سے اپنے انجام کی طرف بڑھ رہا تھا۔

"چاندی کہاں ہے دلہن۔۔۔ بتاؤ ورنہ۔۔۔" ملک نواز کسی بھیڑیے کی طرح دانت نکوس کر بولا۔ وہ بچی کے قریب جا کھڑا ہوا تھا۔ اور اس کا دایاں ہاتھ ریوالور۔۔۔ جکڑے آہستہ آہستہ بلند ہو رہا تھا۔ "کیا تم اپنی ماں کے پاس جانا چاہتی ہو؟"

اس بار وہ بچی سے مخاطب ہوا تھا جس نے اپنی گھورتی ہوئی آنکھوں کو قدرے جھکا کر اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

ملک نواز بچی کا ہاتھ تھام کر آہستہ آہستہ اس طرف بڑھا جدھر بچی نے اپنی معصوم سی انگلی سے اشارہ کیا تھا۔ اس نے بچی کو نیلے لباس والی لاش کے قریب کھڑا کر دیا۔

"نہیں۔۔۔ ملک نواز۔۔۔" دلہن ایک بار پھر چیخ پڑی۔ "تم نے اس پرسکون بستی میں خون کی ندیاں بہا دی ہیں۔ اس کے باوجود تمہیں سکون نہیں ملا۔ اب تم اس بچی سے کیا چاہتے ہو؟"

"میں صرف دو باتیں چاہتا ہوں۔"

دلہن نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ چاندی کا ذخیرہ کہاں ہے؟" ملک نواز نے کسی زہریلے سانپ کی طرح غضبناک ہو کر پھنکارتے ہوئے کہا۔ "اور دوسری بات یہ ہے کہ بچی اپنی ماں کے پاس جانا چاہتی ہے۔"

دلہن نے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا لیا۔

ملک نواز کے ریوالور والا ہاتھ ایک بار پھر بلند ہوا اور ریوالور کی نال معصوم بچی کی پیشانی پر رکھ دی۔۔۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ مجھے حیرت تھی کہ انسان اتنا بھی گر سکتا ہے کہ وہ ایک معصوم اور بے گناہ بچی کی زندگی سے کھیلنے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔

اچانک ایک دھماکا ہوا۔

میرا دل اچھل کر حلق میں اٹک گیا۔ مجھے گھٹن کی زیادتی سے اپنی سانس رکتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ میرے جبڑے سختی سے بھنچ گئے تھے اور میرے رخساروں کی ہڈیاں درد کرنے لگی تھیں۔

دھماکے کے ساتھ ہی ایک دلدوز چیخ سنائی دی تھی لیکن یہ بچی کی چیخ نہیں تھی۔ میں نے آنکھیں کھول دیں اور ایک جھرجھری سی لے کر رہ گیا۔ بچی کی لاش اپنی ماں کی لاش کے قریب خون میں لتھڑی پڑی تھی۔ وہ تو اپنی ماں کے پاس جا چکی تھی لیکن درندگی کو ابھی تک چین نہیں آیا تھا۔

ملک نواز اب دلہن کو گھور رہا تھا۔

اُس کی آنکھوں میں بے پناہ چمک تھی۔

"تم اس دُنیا کے سب سے ذلیل انسان ہو، ملک نواز!" دلہن نے نفرت سے کہا۔ اس کی مٹھیاں سختی سے بھنچی ہوئی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے اگر اس کا بس چلتا تو وہ اس درندے کو چیر پھاڑ کر رکھ دیتی۔

"ہر شخص اپنی ضرورتوں کا غلام ہے، لڑکی!" ملک نواز نے ڈھٹائی سے مسکرا کر کہا۔ "میری ضرورت وہ چاندی کا ذخیرہ ہے جو سردار پارس نے کہیں چھپا رکھا ہے۔ بتاؤ وہ کہاں ہے؟"

لڑکی خاموش رہی۔

اس کا جسم غصے کی زیادتی سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔

وہ قہر و غضب کی دیوی لگ رہی تھی لیکن یہ دیوی بے بس تھی اور اتنے بہت سے درندوں میں گھر کر کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ خود اس کی زندگی کے لمحے گنے جا چکے تھے اور ہر لمحہ بڑی اذیت کے ساتھ بیت رہا تھا۔ یہ گھڑیاں مجھ پر بہت بھاری بیت رہی تھیں لیکن میں اس کھیل کا انجام دیکھنا چاہتا تھا۔ سب کچھ میری مداخلت سے پہلے ہی ختم ہو چکا تھا اس لیے صرف ایک کردار کے انجام کو افسوسناک نہ بننے دینا، خود میرے لیے تباہ کن ہو سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں خاموشی سے اس دُکھ بھرے فسانے کا انجام دیکھنے کا انتظار کر رہا تھا۔

چاندی کا ذخیرہ میرے لیے بھی دلچسپی کا باعث بن گیا تھا اور میں جانتا تھا کہ ملک نواز اور اس کے پالتو بھیڑیے اس وقت تک دلہن کو اذیت دیتے رہیں گے، جب تک وہ اس ذخیرے کے بارے میں انہیں بتا نہیں دیتی۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ لڑکی کے چٹانی عزائم اس درندگی کے سامنے کس حد تک ٹھہرتے ہیں۔

وہ ایک چٹان تھی جو ان چودہ آدمیوں کے سامنے منجمد کھڑی تھی۔ اس کے جسم کی کپکپاہٹ بھی ختم ہو گئی تھی اور اس کی مٹھیاں بھی کھل گئی تھیں۔ میں اس کی خوبصورت انگلیوں کو اپنے لباس سے رگڑ کھاتے دیکھ رہا تھا۔ ملک نواز نہایت آہستہ مقبل کی طرف بڑھنے لگا اور پھر اس سے ایک قدم کے فاصلے پر رک گیا۔

"سنو لڑکی!" وہ حتمی لہجے میں بولا۔ "تمہارا باپ ایک ضدی آدمی تھا۔ اس نے اپنی ضد کا انجام دیکھ لیا۔ یہ ضد اتنے بہت سے آدمیوں کی موت کا باعث بنی۔ اب تم باقی ہو۔ کیا تم اپنی زندگی اور آبرو کو خریدنا چاہتی ہو؟"

لڑکی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"دُنیا میں ایسی خوش نصیب لڑکیاں بہت کم ہوتی ہیں جن کے پاس اپنا وقار اور اپنی عزت .... بچانے کے لیے اثاثہ موجود ہو... اور تم ایک ایسی لڑکی ہو۔ وہ چاندی کا ذخیرہ تمہاری زندگی اور عزت کا مول ہے۔ اسے ادا کر کے خود کو بچا لو۔"

"میرے لیے اب سب کچھ بے معنی ہو گیا ہے۔"

"کیا تمہیں زندگی نہیں چاہیے؟"

"ایسی زندگی بھی کوئی زندگی ہوتی ہے!" دلہن نے بڑے کرب سے کہا اور اس کا دایاں ہاتھ آس پاس بکھری ہوئی لاشوں کی طرف اشارہ کرتا ہوا پہلو میں یوں گر گیا جیسے یہ اشارہ کرتے کرتے بالکل ہی بے جان ہو گیا ہو۔

"اور اس آبرو کے بارے میں کیا خیال ہے جس کی حفاظت کر کے تم خود کو کسی کی بھی دُلہن بنا سکتی ہو؟"

"زندگی... آبرو... میرے لیے اب سب کچھ بے معنی ہو گیا ہے۔" وہ یوں بول رہی تھی جیسے خواب میں بڑبڑا رہی ہو۔ "کاش! خدا نے مجھے تم سے نمٹنے کا صرف ایک ہی موقع دے دیا ہوتا!"

ملک نواز کھلکھلا کر ہنس دیا۔

"چیونٹی پہاڑ کو مقابلے کی دعوت دے رہی ہے!" ایک لٹیرے نے ہنس کر لقمہ دیا۔

"بکواس مت کرو!" ملک نواز اپنے ساتھی پر اُلٹ پڑا... پھر اس نے اپنی خون آلود آنکھوں سے لڑکی کو دیکھتے ہوئے کہا، "دیکھو بلبل! تمہیں جلد یا بدیر اس ذخیرے کے بارے میں مجھے بتانا ہی پڑے گا۔ بہتر ہوگا کہ تم ابھی بتا دو۔"

"میں نہیں جانتی کہ وہ منحوس چاندی کہاں ہے!"

لڑکی نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔

میں نے لڑکی کی طرف دیکھا، وہ اب بھی خوف زدہ دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ اس کی عمر بیس سال کے لگ بھگ ہی ہوگی۔ اس کا جسم بے حد حسین اور پُرکشش تھا۔ اس کے ہاتھ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پاؤں مضبوط تھے۔ اس کے بال اپنی آنکھوں کی طرح سیاہ تھے اور ان میں بے پناہ چمک تھی۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی زردی تھی۔ اُن لڑکیوں جیسی جلد تھی جو زیادہ تر وقت گھر کی چار دیواری میں گزارنے کی عادی ہوتی ہیں۔

ملک نواز کے اشارے پر دو لٹیرے آگے بڑھے۔

انہوں نے اپنی اپنی رائفل تان لی۔

دونوں طرف سے ایک ایک رائفل کی نال لڑکی کی کنپٹی سے لگ گئی تھی لیکن لڑکی کی آنکھوں میں خوف کی ہلکی سی بھی پرچھائیں نہیں تھی۔ وہ کسی مضبوط چٹان کی طرح جمی کھڑی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ پتھر کا کوئی بھاری مجسمہ ہو... ایسا مجسمہ جس کے قدموں کو اکھاڑنا انسانوں کے بس سے باہر ہو۔

اُس نے اپنا وقار بلند رکھا تھا۔ وہ بے بس لڑکیوں کی طرح ان لٹیروں کے سامنے جھک نہیں گئی تھی۔ کاش! میں اس لڑکی کو بچا سکتا۔ میرے دل میں بے ساختہ خواہش پیدا ہوئی لیکن اگلے ہی لمحے میں نے اس آرزو کو سختی سے کچل دیا۔

ملک نواز کے چہرے پر غصے کی سرخی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ لڑکی کو ایسی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا جیسے اس کے انکار سے وہ قطعی متاثر نہ ہوا ہو۔ اور نہ ہی اُسے لڑکی کے انکار پر یقین آیا ہو۔

ملک نواز نے احاطے میں اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی اور پھر اس کی آنکھیں اصطبل کے اس حصے کی طرف جم گئیں جہاں دیوار کی ایک دراڑ سے میں لگا بیٹھا تھا۔ وہ دیر تک اس دراڑ کو گھورتا رہا تھا۔

اس کی یہ حرکت غیر ارادی تھی یا اُسے میری جھلک نظر آ گئی تھی۔ میں اس سلسلے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا البتہ میرا ہاتھ رائفل پر جم گیا تھا اور میں ہر صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لیے بالکل تیار ہو گیا تھا۔

...لیکن وہ شاید خیالوں میں ڈوب کر اس طرف دیکھنے لگا تھا اور پھر کسی خیال پر ذہن پر زور دیتے ہوئے اس کی نگاہ جم کر رہ گئی تھی۔ میں نے سکون کی ایک گہری سانس لی۔ اس نے مجھے دیکھا نہیں تھا۔

"کنویں پر لے چلو!" اس نے ان دو آدمیوں کو حکم دیا جو رائفلیں تان کر کھڑے تھے اور جن کے درمیان لڑکی استادہ تھی۔ ان دونوں نے رائفلیں لڑکی کی کنپٹیوں سے ہٹا لیں اور پھر دونوں نے اس کا ایک ایک بازو پکڑ لیا۔ لڑکی نے اپنے بازوؤں کو چھڑانے کی کوشش نہیں کی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ بالکل ہی بے حس ہو گئی ہو... بے خوف اور ہر احساس سے عاری وہ ان دونوں کے درمیان چلنے لگی۔

میں جہاں تھا، وہیں بیٹھا اُسے دیکھتا رہا۔

لڑکی کا پورا جسم منجمد سا لگ رہا تھا۔ اگر ہلکی سی گھبراہٹ تھی تو اس کا اظہار لڑکی کے نچلے ہونٹ کی خفیف سی کپکپاہٹ سے لگایا جا سکتا تھا۔ دروازے کے قریب کھڑے ڈاکوؤں نے ان تینوں کو گزر جانے کے لیے راستہ دیا۔ ملک نواز ان تینوں کے پیچھے پیچھے چلنے لگا اور اس سے چند قدم کا فاصلہ برقرار رکھتے ہوئے باقی لٹیرے بھی چل دیے۔

میں تیزی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

اصطبل سے نکل کر میں تیزی سے مسجد کی عقبی دیوار کی طرف دوڑا اور پھر جھکی ہوئی حالت میں اس دیوار کے ساتھ ساتھ دوڑتا ہوا میں ان لوگوں سے پہلے ہی مسجد کے غسل خانے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہاں رُک کر میں نے کنویں کی طرف دیکھا۔

وہ لوگ ابھی تک وہاں نہیں پہنچے تھے۔

میں اس راستے پر نگاہ گاڑے بیٹھا رہا جو گھوم کر کنویں کی طرف آتا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ لڑکی دکھائی دی۔ وہ گردن اکڑائے دو لٹیروں کے درمیان چل رہی تھی۔ اس کی ٹھوڑی اُٹھی ہوئی تھی جیسے وہ مقتل کی طرف جاتے وقت ذرا سا بھی خوف ظاہر کرنا چاہتی ہو۔ اس کی چال میں وقار تھا اور اس کے انداز سے بے خوفی جھلک رہی تھی۔

دو قدم کے فاصلے سے ملک نواز کسی ایسے درندے کی طرح چل رہا تھا جسے اپنے شکار پر حملہ کرنے اور کامیاب ہونے میں کئی بار ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا ہو۔ اس کے جبڑے سختی سے بھنچے ہوئے تھے اور اس کے رخساروں کی ہڈیاں فاصلے کے باوجود نمایاں نظر آ رہی تھیں۔

سورج تیزی سے مغرب کی آغوش میں گر رہا تھا اور شام ہو گئی تھی اس کے باوجود اتنا اُجالا تھا کہ میں اُن لوگوں کے چہرے ہی نہیں بلکہ ان پر چھائے ہوئے تاثرات بھی آسانی سے دیکھ رہا تھا۔

سورج غروب ہونے اور پوری طرح تاریکی چھانے میں اب زیادہ دیر نہیں تھی اور شاید ملک نواز بھی تاریکی چھا جانے سے پہلے پہلے اس معاملے سے نمٹ کر یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔

ملک نواز کو دیکھ کر اور اس کے مکروہ کارناموں کا جائزہ لینے کے بعد مجھے اس کی سوچوں کی پستی اور اخلاقی گراوٹ کا خوب اندازہ ہو گیا تھا۔ ملک سکندر اس سے کہیں بہتر اور ایک با اصول آدمی تھا۔ اس پر اعتماد کرنے کو جی چاہتا تھا شاید اسی لیے میں نے مکوری بھیجنے کے لیے ساری رقم اس کے حوالے کر دی تھی... لیکن یہ ملک نواز تو واقعی درندہ تھا۔ ایک ایسا درندہ جس کے منہ کو انسانی خون کی چاٹ لگ گئی ہو۔

اس نے چند لمحوں میں جتنے آدمیوں کو گولیوں سے بھون کر رکھ دیا تھا اس کی میں بھی توقع نہیں کر سکتا تھا... یہ سب کچھ بالکل اچانک ہی ہوا تھا اسی لیے میں ابتدا ہی سے اس معاملے میں مداخلت نہ کر سکا تھا اور پانی چونکہ سر سے گزر چکا تھا اس لیے اپنی زندگی کو بلاوجہ خطرے میں ڈالنے کی ضرورت نہیں رہ گئی تھی۔ اسی لیے میں محض خاموش تماشائی بن گیا تھا... لیکن میری اس خاموشی کے پیچھے انتقام کی چنگاریاں تھیں جو خود میری ہی روح کو جلانے میں مصروف تھیں۔

میری زندگی میں اتنا بڑا انقلاب پہلے نہیں آیا تھا جو گزشتہ دو تین روز کے اندر اندر پیدا ہو گیا تھا۔ معصوم قلی کی دردناک موت نے مجھے ایک ایسا شرارہ بنا دیا تھا جو ہر خشک چیز کو جلانے کے لیے بے قرار ہو جاتا ہے... میں نے بھی جذبات سے عاری اور سوکھے ہوئے دل کے مالکوں کو خاکستر کرنے کا عزم کر لیا تھا... اس حادثے نے مجھے اور بھی بھڑکا دیا تھا جو میں نے سردار پارس کی چھوٹی سی بستی میں اپنی آنکھوں کے سامنے ہوتا دیکھا تھا۔

ملک نواز اور اس کے ساتھی اپنی اپنی موت کے پروانے پر دستخط کر چکے تھے اور میری سوچ کے مطابق ان میں سے ہر ایک کی سانسیں گنی جا چکی تھیں... لیکن میں ان سب کو سسکا سسکا کر مارنا چاہتا تھا تاکہ میری بے چین روح کو قرار مل جائے۔

میں چونک کر کنوئیں کی طرف دیکھنے لگا۔

وہ لوگ کنوئیں کے قریب رک گئے تھے۔ ملک نواز نے اپنا خنجر نکالا اور کنوئیں میں لٹکی ہوئی رسی کو تھام کر اسے اپنی طرف کھینچنے لگا۔ ڈول کو باہر لا کر اس نے خنجر کی مدد سے کاٹ دیا اور رسی کے سرے کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ خنجر واپس میان میں جا چکا تھا اور وہ رسی کا سرا تھامے لڑکی کی طرف بڑھنے لگا۔

باقی سب کنوئیں کے دوسری طرف جا کھڑے ہوئے۔

ان کے چہروں پر عجیب عجیب مسکراہٹیں تھیں۔ درندگی اور تجسس بھری مسکراہٹیں چہرے پر سجائے وہ لڑکی اور اپنے سردار کی طرف دیکھ رہے تھے۔ غالباً وہ مظالم کی داستانوں میں ایک داستان کے اضافے کے خیال سے لطف اندوز ہو رہے تھے اور دیکھنا چاہتے تھے کہ ان کا سردار اس حسین لڑکی کو کیا سزا دیتا ہے جس نے اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا تھا۔

ملک نواز نے لڑکی کو گھورتے ہوئے کہا: "میں تمہیں ایک آخری موقع دینا چاہتا ہوں۔" اس کی آواز گرج دار تھی: "بتاؤ، چاندی کا وہ ذخیرہ کہاں ہے جسے سردار پارس نے حاصل کیا تھا؟"

"مجھے نہیں معلوم..."

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ سردار پارس تم سے اس بات کو ہرگز راز میں نہیں رکھ سکتا۔" وہ غرایا۔

"اس کا نام بھی اپنی ناپاک زبان پر مت لاؤ۔"

ملک نواز کا ہاتھ گھوم گیا۔

ایک آواز پیدا ہوئی۔ اس تھپڑ کی چوٹ سے لڑکی کو گر پڑنا چاہیے تھا۔ اگر کوئی عام لڑکی ہوتی تو شاید یہ چوٹ برداشت نہ کر پاتی اور بے ہوش ہو جاتی... لیکن وہ کوئی لڑکی نہیں بلکہ ایک چٹان تھی جو ظلم کے سامنے اپنی تمام تر سختی اور مضبوطی کے ساتھ جمی ہوئی تھی۔

"کیا تم مجھ سے زندگی کی بھیک نہیں مانگو گی؟"

"نہیں..."

"کیوں؟" ملک نواز کے لہجے میں طنز تھا۔

"اس لیے کہ مجھے تم سے نفرت ہے۔ شدید نفرت۔" اس نے ملک نواز کے منہ پر تھوک دیا: "اور تمہاری بخشی ہوئی زندگی بھی میرے لیے قابلِ نفرت ہی ہو گی۔"

لٹیروں نے اپنی اپنی سانس روک لی۔

ایک لمحے کو یوں محسوس ہوا جیسے ہر کوئی پتھر کا مجسمہ بن گیا ہو۔ کسی کے سانس تک لینے کی آواز بھی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ خود میں نے بھی سانس روک لی تھی۔ لڑکی نے ملک نواز کے منہ پر تھوک کر اپنی زندگی کے بچے کھچے لمحے بھی داؤ پر لگا دیے تھے... اور ہر شخص یہ دیکھنے کے لیے بے چین ہو گیا تھا کہ ملک نواز اپنی اس توہین کے جواب میں کیا کرتا ہے۔

میرا خیال تھا کہ وہ ریوالور نکال کر لڑکی کے جسم کو گولیوں سے چھلنی کر دے گا... لیکن اس موقع پر ملک نواز نے حیرت انگیز ٹھنڈے دماغ کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس نے لڑکی پر ہاتھ تک نہیں اٹھایا۔ وہ بس اسے ایسی نگاہوں سے گھورتا رہا جیسے اسے یقین نہ آ رہا ہو کہ کوئی ناتواں سی لڑکی اتنی جرأت مندی کا مظاہرہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بھی کر سکتی ہے۔

... پھر اس کے ہونٹوں پر سفاک مسکراہٹ آ گئی۔

اس کا دایاں ہاتھ آہستہ آہستہ لڑکی کی طرف بڑھا۔ میں نے نگاہ پھیر لی۔ ایسی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی جیسے کسی نے کپڑے کو چیر دیا ہو۔ میں نگاہ پھیرے ان لٹیروں کو دیکھتا رہا جو چمکدار آنکھوں سے کوئی بھیانک منظر دیکھ رہے تھے اور لطف اندوز ہو رہے تھے... پھر میں نے ملک نواز کی طرف دیکھا۔

وہ اس پھٹے ہوئے کپڑے سے چہرے کا وہ حصہ صاف کر رہا تھا جہاں لڑکی نے نفرت سے تھوک دیا تھا۔ اس نے سرخ رنگ کے اس کپڑے کو پھینک دیا۔ اب اس پر غالباً دیوانگی سوار ہو رہی تھی۔ اس نے ایک ہاتھ میں تھامی ہوئی رسی کو پھر سے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور اپنے دونوں آدمیوں کو لڑکی کے پاس سے ہٹ جانے کا حکم دیا۔

دونوں رائفل بردار آدمی لڑکی کے پاس سے ہٹ کر باقی ساتھیوں کے ساتھ جا کھڑے ہوئے۔ میں نے ملک نواز کو لڑکی کے پیروں کی طرف جھکتے ہوئے دیکھا اور پھر میں ایک جھرجھری سی لے کر رہ گیا۔

وہ درندہ اس کے ٹخنوں کو رسی کے سرے سے باندھ رہا تھا۔ دونوں ٹخنے مضبوطی سے باندھ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا... پھر اس نے کنوئیں پر لگی ہوئی چرخی کو گھمانا شروع کیا۔

کنوئیں میں گری ہوئی رسی تیزی سے چرخی پر لپٹنے لگی۔ رسی کا ایک سرا لڑکی کے ٹخنوں سے بندھا ہوا تھا اور دوسرا چرخی پر لپٹ رہا تھا... حتیٰ کہ رسی تن گئی... پھر لڑکی کی ٹانگوں کو ایک شدید جھٹکا لگا اور وہ الٹ کر زمین پر گر گئی۔

اگلے ہی لمحے چرخی تیزی سے گھومی اور لڑکی کا جسم زمین سے بلند ہونے لگا۔ وہ سر کے بل زمین سے اٹھ رہی تھی۔ اس کے دونوں پاؤں رسی کے سرے سے بندھے ہوئے تھے۔ ملک نواز نے اسے دھکیل کر کنوئیں کے اوپر پہنچا دیا۔

وہ کنوئیں میں الٹی لٹکی ہوئی تھی۔

لٹیروں میں ہیجان کی لہر دوڑ گئی اور میں نے سنا کہ ان میں سے ہر ایک ہانپنے لگا ہے۔ ملک نواز کا قہقہہ درندگی سے بھرپور تھا۔ اس نے لڑکی سے اپنی بے عزتی کا انتقام لینے کے لیے جو طریقہ اختیار کیا تھا، وہ بے حد ظالمانہ اور منفرد تھا اور وہ اپنی اس حرکت پر بے حد خوش اور دیوانہ نظر آ رہا تھا۔ اس کے قہقہوں کی گرج میرے اعصاب پر اثر انداز ہو رہی تھی اور میری رگوں میں خون کسی ایسی ندی کے پانی کی طرح دوڑنے لگا جو طوفان کی وجہ سے کناروں سے نکل جانے کی کوشش کر رہا ہو۔

میرا خیال تھا کہ اس نازک اندام لڑکی کے ضبط کا دامن چھوٹ جائے گا اور وہ بری طرح چیخنے لگے گی... لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وہ کنوئیں میں الٹی لٹک گئی تھی اور اب تک اس نے ایک بار بھی خود کو چھڑانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"بتاؤ... چاندی کا ذخیرہ کہاں ہے؟" ملک نواز غرایا۔

"میں نہیں جانتی۔"

"اگر تم بھول گئی ہو تو ابھی تمہاری یادداشت واپس آ جائے گی۔" ملک نواز نے زہریلے لہجے میں کہا۔

اس کا ایک ہاتھ چرخی پر تھا۔

میں بے حس و حرکت بیٹھا یہ دلدوز منظر دیکھتا رہا۔

چرخی آہستہ آہستہ گھومنے لگی اور لڑکی کا جسم میری نگاہوں سے اوجھل ہونے لگا۔ وہ آہستہ آہستہ کنوئیں میں گر رہی تھی۔

پھر ملک نواز نے چرخی کو چھوڑ دیا اور چرخی تیزی سے گھومنے لگی۔

میں رسی کو دیکھتا رہا۔

رسی کو ایک جھٹکا لگا اور وہ تن گئی۔

اس کے ساتھ ہی لڑکی کا جسم غالباً پانی میں ایک چھپاکے سے گر گیا تھا۔ ایسی آواز سنائی دی جیسے کنوئیں کی تہ میں کوئی جان بچانے کے لیے بری طرح ہاتھ پاؤں مار رہا ہو۔

پانی کے چھپاکے سنائی دیے اور گھٹی گھٹی آوازیں میری سماعت تک پہنچنے لگیں۔ میں تصور کی آنکھ سے لڑکی کو جدوجہد کرتے دیکھ رہا تھا۔

"کیا تم میری آواز سن سکتی ہو لڑکی؟" ملک نواز کنوئیں میں جھک کر چیخ پڑا: "جواب دو...؟"

کنوئیں کی تہ سے ایسی آوازیں آئیں جیسے کسی کے حلق میں پانی بھر گیا ہو اور وہ اسے نکالنے کی کوشش کر رہا ہو۔

ملک نواز نے فوری طور پر چرخی کو گھمانا شروع کر دیا۔

رسی تیزی سے چرخی پر لپٹنے لگی اور رسی کا تناؤ ایک بار پھر بڑھنے لگا۔ وہ لڑکی کو کنوئیں سے اوپر کھینچ رہا تھا۔ میں دیکھتا رہا حتیٰ کہ مجھے رسی کا وہ کنارا نظر آنے لگا جو لڑکی کے ٹخنوں سے بندھا ہوا تھا۔

اس کے بال پانی سے بھیگ کر لٹک گئے اور لڑکی کا چاند جیسا چہرہ ان بالوں میں چھپ گیا تھا۔ ملک نواز نے اس کے بالوں کو پکڑ لیا اور اس کے چہرے کو سامنے کر لیا۔

میں نے دیکھا کہ لڑکی کا چہرہ پانی میں بھیگا ہوا تھا اور پانی کی بوندیں ابھی تک اس کے رخساروں پر چمک رہی تھیں۔ اگرچہ اس کی آنکھیں بند تھیں اور چہرے پر کرب کے نشان تھے لیکن معلوم ہوتا تھا کہ اس نے ابھی تک شکست تسلیم نہیں کی ہے۔ میں اس لڑکی کی ہمت و شجاعت پر عش عش کر اٹھا۔ وہ چٹانوں کی بیٹی تھی اور اس کے اطوار و کردار کی سختی اتنی جلدی ملک نواز جیسے لٹیرے کے ہاتھوں شکست نہیں کھا سکتی تھی۔ میرے دل میں اس کی عزت اور اس کا احترام مزید بڑھ گیا۔

"بتاؤ... چاندی کا ذخیرہ کہاں ہے؟" ملک نواز غرایا۔

"مجھے کھول دو۔" لڑکی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"پہلے بتاؤ..."

"پہلے مجھے کھولو..." لڑکی نے ضد کی۔

"میں تمہیں اس وقت تک کنوئیں میں ڈبکیاں دیتا رہوں گا جب تک تم مجھے چاندی کے اس ذخیرے کے بارے میں بتا نہیں دیتیں۔"

"ٹھیک ہے۔ تم پہلے اپنا ہر ستم آزما لو۔"

"تم مجھے مجبور کر رہی ہو۔"

"مجھے کھولو... میں تم سے ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔" لڑکی نے یہ کہتے ہوئے عجیب سا لہجہ اختیار کر لیا تھا۔ میں چونکے بغیر نہ رہ سکا کیونکہ میں نے اس کے ہونٹوں پر تضحیک آمیز مسکراہٹ دیکھی تھی۔

نواز کے چہرے پر فاتحانہ تاثرات پیدا ہو گئے۔

اس نے بالوں سے پکڑ کر لڑکی کو کنوئیں کی منڈیر تک پہنچایا اور پھر اسے سیدھا ہونے میں مدد دی۔ وہ منڈیر پر بیٹھ گئی۔ رسی ڈھیلی ہو گئی تھی اور لڑکی کے پیروں سے نیچے تک جھول رہی تھی۔ نواز اس کی طرف جھک کر بولا: "جلدی بتاؤ..."

"کیا پوچھنا چاہتے ہو؟" لڑکی نے پوچھا۔

"وہ ذخیرہ کہاں ہے؟"

"میرا خیال ہے، میں اس سلسلے میں تمہیں پہلے بھی بتا چکی ہوں کہ مجھے چاندی کے اس ذخیرے کے بارے میں کوئی علم نہیں ہے... شاید تمہیں میری بات پر یقین نہیں آیا۔ میں دراصل تم سے دوسری بات کہنا چاہتی تھی۔"

"کیا بات؟" ملک نواز پاؤں پٹخ کر دھاڑا۔

"یہ بات میں پہلے تم سے کہہ چکی ہوں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ تم نے میری ہر بات پر یقین نہ کرنے کی قسم کھا رکھی ہے اس لئے تم سے کچھ کہنا بے کار ہے۔"

"لڑکی!" ملک نواز حلق کے بل چیخ پڑا۔

"بہرحال میں دوبارہ بتا رہی ہوں کہ مجھے تم سے نفرت ہے، شدید نفرت... اور تمہیں بالآخر جہنم رسید ہونا ہے۔" لڑکی نے عجیب سے لہجے میں بات جاری رکھی۔ "میرے قریب آؤ ملک نواز تاکہ میں جو بات تمہیں دوسری بات بتانا چاہتی ہوں وہ تمہیں اچھی طرح سمجھ میں آ جائے... میرے اور قریب آ جاؤ۔"

ملک نواز اس کی طرف جھک گیا۔

... لیکن اگلے ہی لمحے وہ ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹ گیا۔ لڑکی نے ایک بار پھر اس کے منہ پر تھوک دیا تھا۔

نواز تڑپ کر پیچھے ہٹا تو اس کا پاؤں اسی رسی میں الجھ گیا جس کا ایک سرا لڑکی کے پیروں سے کچھ اوپر بندھا ہوا تھا۔ اسی لمحے لڑکی نے الٹی چھلانگ لگا دی۔

وہ کنوئیں میں گر گئی... لیکن اسی رسی میں ملک نواز بھی الجھا ہوا تھا اس لیے وہ بھی ہاتھ پاؤں مارتا ہوا کنوئیں کی منڈیر سے ٹکرایا۔ اسی لمحے چرخی کھل گئی۔ لڑکی تیزی سے نیچے جا رہی تھی اور اس کا بوجھ ملک نواز کو کنوئیں میں کھینچ رہا تھا۔

لڑکی کا بوجھ اسے کھینچنے میں کامیاب ہو گیا اور ملک نواز منڈیر پر اپنے ہاتھ کی گرفت برقرار نہ رکھ سکا۔ اس سے پہلے کہ کوئی اس کی مدد کو پہنچتا، ملک نواز رسی سے ایک ٹانگ کے ساتھ الجھا ہوا کنوئیں میں لٹک گیا۔

وہ بری طرح چیخ پڑا تھا۔

اس کے ساتھی تیزی سے دوڑے اور انہوں نے چرخی کو تھام لیا۔ چرخی کو بمشکل جلدی میں گھمایا گیا۔ رفتہ رفتہ نواز کا جسم منڈیر تک آیا تو اس کے ساتھیوں نے اسے سنبھال لیا۔ ایک نے رسی کا بل اس کی ٹانگ سے کھول دیا اور رسی تن گئی۔ لڑکی رسی چھوٹ جانے کی وجہ سے ایک بار پھر سر کے بل پانی میں گر گئی۔

کنوئیں سے باہر آ کر نواز بری طرح ہانپنے لگا۔

اس کی حالت کسی باؤلے کتے جیسی ہو رہی تھی۔

قریب کھڑے ایک ساتھی نے کچھ کہا جس کے جواب میں نواز نے پلٹ کر پوری قوت سے اس کے رخسار پر ایک تھپڑ دے مارا۔ وہ شخص الٹ کر گرا۔ جب وہ دوبارہ کھڑا ہوا تو اس کے نچلے ہونٹ سے خون ٹپک رہا تھا۔

"میں اس لڑکی کو ایسی سزا دوں گا کہ اس کی روح تک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بلبلا اٹھے گی اور اس کے آباؤ اجداد تک کی روحیں قبر میں بے چین ہو جائیں گی۔" نواز نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سینہ پیٹتے ہوئے کہا۔ "میں اسے ایسی ہیبت ناک موت سے ہمکنار کروں گا۔"

ملک نواز کے تمام ساتھی غالباً اس کے غصے سے واقف تھے۔ وہ سب کے سب یوں کھڑے تھے جیسے انہیں سانپ سونگھ گیا ہو۔

میں نے اس صورت حال پر ایک بے ساختہ قہقہے کو بمشکل روکا تھا۔ لڑکی نے کمال ہمت کا مظاہرہ کر کے نواز کی درندگی پر ایک کاری ضرب لگائی تھی اور میں اس کا مقصد خوب اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ دراصل وہ اپنی موت کو جلد از جلد گلے لگا دینا چاہتی تھی اور اس سلسلے میں اس نے ایک بھرپور کوشش کی تھی۔

نواز نے چرخی کو تیزی سے گھما کر رسی کو بل دے کر اوپر لانے کی کوشش کی اور جب رسی کے چار پانچ بل چرخی پر لگ گئے تو اس نے چرخی کو گھومنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا۔

ایک چھپاکا سنائی دیا۔

شبل پانی میں گر گئی تھی۔

نواز نے چرخی کو ایک بار پھر گھمایا اور جیسے ہی لڑکی پانی کی سطح سے کچھ اوپر آئی، اس نے چرخی کو آزاد چھوڑ دیا۔ ایک بار پھر چھپاکا سنائی دیا۔ اس مرتبہ لڑکی کی گھٹی گھٹی سی چیخ بھی سنائی دی تھی۔

اس چیخ کو سن کر نواز وحشیانہ انداز میں ہنس پڑا۔

"تم مجھے اس چاندی کے ذخیرے کا پتہ بتا دو ورنہ میں تمہیں اسی طرح سسکا سسکا کر مار ڈالوں گا... لیکن نہیں... میں تمہیں اس وقت تک مرنے نہیں دوں گا جب تک تم مجھے ذخیرے کے بارے میں بتا نہیں دیتیں۔"

"نواز..." ایک جسیم لٹیرے نے کہا۔

"کیا بات ہے؟" وہ اس پر الٹ پڑا۔

"اس لڑکی کو جان سے مت مارو۔"

"کیوں... تم اس کی طرف داری کیوں کر رہے ہو؟"

"اب اس لڑکی کے علاوہ ذخیرے کے متعلق کوئی نہیں جانتا۔" جسیم لٹیرے نے لڑکی کی جان بچانے کے لیے پانسہ پھینکا۔

"بکواس مت کرو... میں خود بھی اس نکتے کو سمجھتا ہوں، مجھے اس سلسلے میں سمجھانے کی ضرورت نہیں۔"

"ٹھیک ہے جو تم مناسب سمجھو کرتے رہو۔" جسیم شخص نے بے پروائی سے کندھے اچکا کر کہا۔ "تمہیں چاہیے تھا کہ چند اور قبیلے والوں کو بھی زندہ رکھتے تاکہ کسی ایک کو اذیت دے کر توڑ دیا جاتا اور اس سے ذخیرے کے بارے میں معلوم کر لیا جاتا۔"

"اوہ... بکواس!" نواز جھلا گیا۔

اس پر تمام لٹیروں میں بے چینی کی لہر دوڑ گئی۔ دو ایک نے پھر آواز بلند کی لیکن اس مخالفت کا نواز پر الٹا اثر ہوا۔ اس سے قبل کہ کوئی اسے قائل کرنے میں کامیاب ہو جاتا، وہ باؤلے کتے کی طرح بھونکنے لگا۔ غصے کی زیادتی میں وہ جو کچھ بھی کہہ رہا تھا میں اس کا مفہوم سمجھنے سے قاصر تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ مکمل طور پر ہوش و حواس کھو بیٹھا ہو اور واہی تباہی بکنے لگا ہو۔

"ہمیں ٹھنڈے دماغ سے کام لینا چاہیے۔" ایک لٹیرا غرایا۔

نواز تیزی سے کنوئیں میں جھک گیا۔

اس نے رسی کی طرف دیکھا۔ میں بھی تنی ہوئی رسی پر نگاہ گاڑے ہوئے تھا۔ اس میں اب خفیف سی لرزش بھی نہیں تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ یا تو لڑکی پانی میں ڈوب کر دم توڑ چکی ہے... یا پھر بے ہوش ہو گئی ہے۔

نواز نے تیزی سے چرخی کو گھما کر لڑکی کو اوپر اٹھایا۔

وہ دکھائی دی تو بے حس و حرکت تھی۔

اس کے بالوں نے اس کے حسین چہرے کو ڈھانپ رکھا تھا۔ اس کے بال جس بے جان انداز میں لٹکے ہوئے تھے، لڑکی کے بازو بھی اسی طرح جھول رہے تھے۔ بالوں سے پانی ٹپک رہا تھا اور ہاتھوں کی انگلیوں سے بھی پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔

نواز نے اسے بالوں سے پکڑ کر کنوئیں کی منڈیر کی طرف گھسیٹ لیا اور پھر اس کے چہرے کا جائزہ لینے لگا۔

"یہ فریب کر رہی ہے۔" وہ ہنس کر بولا۔

اس نے پوری قوت سے ایک تھپڑ مارا لیکن لڑکی کے جسم میں ذرا سی بھی حرکت پیدا نہ ہوئی۔

"اسے ہوش میں لاؤ۔" وہ جھلا کر ایک طرف ہٹ گیا۔

دو لٹیرے تیزی سے آگے بڑھے۔

انہوں نے لڑکی کو ہوش میں لانے کی کوشش کی لیکن وہ یا تو ہوش میں آنا ہی نہیں چاہتی تھی یا پھر مر چکی تھی اور وہ محض اسے بے ہوش سمجھ کر بلاوجہ جتن کرنے میں مصروف تھے۔

کچھ دیر بعد میرے حلق سے ایک طویل سانس نکل گئی۔

لڑکی زندہ تھی۔

وہ ہوش میں آ رہی تھی اور اس کی کراہیں میں صاف سن سکتا تھا۔ وہ جیسے ہی ہوش میں آئی نواز اپنے دونوں ساتھیوں کو دھکیل کر پیچھے ہٹانے کے بعد اس پر جھک گیا۔ "بتاؤ... بولو..." وہ گرجا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کوئی مویشی تک باقی نہیں رہا تھا۔ لیٹرے جاتے وقت گھوڑے اور مویشی بھی لے گئے تھے۔

میں نے گھوڑے کا جائزہ لیا۔

یہ گھوڑا زیادہ دُور تک میرا ساتھ نہیں دے سکتا تھا لیکن اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔ میں اس پر زین کس کر اُسے آہستہ آہستہ چلاتا ہُوا اسی پگڈنڈی پر پہنچ گیا جس پر چل کر میں اس پُرسکون بستی میں اترا تھا۔

پلٹ کی بستی میں موت اور دہشت کے سائے منڈلا رہے تھے اور ہوا درختوں سے ٹکرا کر ایسی آوازیں پیدا کر رہی تھیں جیسے بن گنت انسان آہستہ آہستہ کراہ رہے ہوں۔

اُوپر چٹان پر آ کر میں نے گھوڑے کی لگام کھینچ لی۔ دُور بہت دُور سُورج ڈوب رہا تھا۔ اُوپر اُجالا ابھی باقی تھا جبکہ بستی چٹانوں میں گھری ہونے کی وجہ سے تاریک ہو چکی تھی۔ میں نے اُفق کی طرف دیکھا۔

کئی گھڑ سوار دکھائی دے رہے تھے۔

مویشیوں اور بھیڑ بکریوں کے سائے بھی ان میں شامل تھے۔ وہ جاتے وقت بارن بستی کی ہر چیز لُوٹ کر لے گئے تھے۔ میں نے اُن گھڑ سواروں کا رُخ دیکھا اور پھر اپنے گھوڑے کو اسی رُخ آگے بڑھا دیا۔

بیمار گھوڑا بڑی سُست رفتاری سے آگے بڑھ رہا تھا۔

میں اس کی گردن پر ہاتھ پھیرتا رہا اور اسے چمکار چمکار کر آگے بڑھاتا چلا رہا تھا۔ سُورج نے مغرب کی آغوش میں ڈبکی لگائی تو کائنات تاریکی میں ڈوب گئی۔

میرے ذہن میں ایک ننھی سی بچی کا چہرہ اُبھر آیا۔

وہی بچی جس نے ملک نواز سے درخواست کی تھی کہ وہ اُسے بھی اُس کی ماں کے پاس پہنچا دے۔ یہ جملہ میرے دل و دماغ میں ایک ایسے طوفان کو جنم دے چکا تھا جو میرے دل میں بھری ہوئی نفرت کی چنگاریوں کو مزید ہوا دینے لگا تھا۔

"تم نے خود ہی تو خواہش کی تھی میری بچی" میں بے خیالی میں بڑبڑا کر رہ گیا۔ "تم نے خود ہی تو اپنی ماں کے پاس جانے کی خواہش کی تھی"

میں نے اس چہرے کو ذہن سے نکال دینے کی کوشش کرتے ہُوئے گھوڑے کی گردن پر محبت سے ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا۔

خوارزم کی جانب میرا سفر جاری رہا۔

میں نے رات کی تاریکی میں مسلسل آگے بڑھتے ہوئے نصف شب کے قریب محسوس کیا کہ گھوڑا بری طرح ہانپ گیا ہے اور اب اسے مزید آگے بڑھانا خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے۔

گھوڑے سے اُتر کر میں نے اس کی لگام تھام لی۔

میں چاندنی پھیل جانے کا انتظار کر رہا تھا۔

چاند ان راتوں میں دیر سے نکلتا تھا اس لئے نصف شب سے کافی دیر بعد اُداس اُداس چاند نے جھانک کر دنیا کی طرف دیکھا تو اس کی چاندنی بھی بے حد سوگوار محسوس ہو رہی تھی۔

ایک جگہ رات کا باقی ماندہ حصہ گزارنے کے لیے مناسب دیکھ کر میں نے گھوڑے کو بٹھا دیا اور اس سے زین اتار لی...

پھر میں نے بستر بچھایا اور لیٹ گیا۔

اس جگہ سے ندی نہ جانے کتنی دور تھی۔ میرے پاس تو پانی کا ایک چھوٹا سا برتن موجود تھا جس سے چند گھونٹ لے کر میری پیاس بجھ سکتی تھی لیکن پسینے میں شرابور پیاسے گھوڑے کے لئے یہ پانی بے حد کم بلکہ نہ ہونے کے برابر تھا۔

میں نے اِدھر اُدھر سے خشک لکڑیاں اور سوکھی ہوئی

PVL
PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

"میں نہیں جانتی" لڑکی نے کراہ کر کہا۔

"میں تمہارا ریشہ ریشہ الگ کر دوں گا ورنہ اس ذخیرے کا پتہ بتا دو" نواز نے دیوانگی سے اُسے جھنجوڑ ڈالا۔

"میں قسم کھاتی ہوں کہ میں کچھ نہیں بتا سکتی" لڑکی منمنائی۔ اس کے لہجے اور انداز میں اب پہلے جیسا زور نہیں تھا۔ اس کے اعصاب تھک گئے تھے اور یہ تھکن اُس کی خود اعتمادی کو نگل رہی تھی۔

"وہ ذخیرہ کہاں ہے لڑکی؟"

"مجھے... مجھے مار ڈالو۔ ظالم... خدا کے لیے مجھے مار ڈالو" وہ بے بسی سے یہ بھی ضبط کا دامن اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا اور وہ سوہنت رو پڑی تھی۔

میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

لڑکی ہار گئی تھی۔ اس نے بالآخر اُس درندے سے موت کی بھیک مانگ لی تھی۔ وہ بار بار یہی بڑبڑانے لگی کہ اُسے مار ڈالا جائے لیکن ہر استدعا پر نواز کا خوفناک قہقہہ فضا میں گونج اُٹھتا تھا۔ اس کے ساتھی شاید اس طویل اذیتناکی سے بیزار ہو گئے تھے اور کوئی فوری فیصلہ چاہتے تھے اس لیے اُنھوں نے آپس میں سرگوشیاں شروع کر دی تھیں۔

"چُپ رہو..." ملک نواز دھاڑنے لگا۔ "تم سب چُپ رہو اور یہ سرگوشیاں بند کر دو ورنہ میں ایک ایک کو گولی مار دوں گا"

لیٹروں پر خاموشی کا گہرا تسلط ہو گیا۔

اچانک نواز نے اپنی جیب سے ایک سگار نکالا اور اُسے سُلگانے لگا۔ وہ سگار کے گہرے گہرے کش لگانے کے بعد اُسے ہاتھ میں تھامے لڑکی کی طرف متوجہ ہُوا... سگار کا جلتا ہُوا گوشہ لڑکی کے چہرے کی طرف بڑھنے لگا اُسی لمحے لڑکی نے چھلانگ لگائی۔

اس بار اُس نے حیرت انگیز پھرتی کا مظاہرہ کر کے رسّی کا پھندہ اپنی گردن میں ڈال لیا تھا۔

ایک لمحے کے لیے پھندے میں سختی دکھائی دی۔

اس کی آنکھیں اور زبان اُبل پڑی۔

...پھر رسّی کا بل کھل گیا اور وہ لڑھک کر اُلٹی ہُوئی اور پانی میں گرتی چلی گئی۔ چرخی تیزی سے گھومی اور پھر رسّی کو اتنا شدید جھٹکا لگا کہ وہ چرخی سے کھل گیا۔

رسّی بھی کنویں میں غائب ہو گئی۔

میں نے ایک طویل سانس لی۔ لڑکی بالآخر موت کی ابدی سکون والی آغوش میں ڈوب کر دُنیا کی اذیتوں اور درندگیوں سے نجات پا گئی تھی۔ ملک نواز کنویں کی منڈیر پر ہاتھ رکھے کھڑا تھا۔

اس کی آنکھیں کنویں میں گھور رہی تھیں۔

...لیکن سب کچھ اس کی دسترس سے بہت دُور جا چکا تھا۔

میں نے محسوس کیا کہ لڑکی نے آخری لمحوں میں اپنی ہاری ہُوئی بازی کو جیت لیا ہے۔ اس سانحے کا ملک نواز کے چہرے پر عجیب سا اثر تھا۔ وہ شکست خوردہ لگ رہا تھا۔

"ممکن ہے وہ ابھی زندہ ہو" ایک لیٹرے نے خیال ظاہر کیا۔

"نہیں... وہ مر چکی ہے" نواز بڑبڑایا۔

"اب اس ذخیرے کا پتہ کیسے معلوم ہو گا؟"

"دیکھا جائے گا" نواز دھاڑا "چلو... اپنے گھوڑے سنبھالو اور یہاں سے نکل چلو" یہ کہہ کر اس نے ریوالور نکال لیا اور پھر اس نے ریوالور کی نال کنویں میں جھکا کر پے در پے فائر کرنے شروع کر دیے۔

کنویں سے گولیوں کے دھماکوں کی بازگشت سنائی دیتی رہی... پھر تمام لیٹرے تیزی سے ایک طرف بڑھ گئے۔ چلتے چلتے نواز ایک لمحے کے لیے رُکا اور پلٹ کر کنویں کی طرف دیکھنے لگا... لیکن اب وہاں اس کی اذیت سہنے کے لیے کوئی بھی نہیں تھا۔

چند لمحوں تک وہ خالی خالی نظروں سے کنویں کی طرف دیکھتا رہا... پھر وہ بھی اُس طرف بڑھ گیا جدھر اس کے ساتھی گئے تھے۔ میں نے دیوار سے ٹیک لگا کر جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔

شدید اعصابی کھچاؤ کی وجہ سے مجھے تھکن محسوس ہو رہی تھی۔ چند لمحوں تک میں خود کو پُرسکون کرنے کی کوشش کرتا رہا... پھر ان گنت گھوڑوں کی ٹاپیں سن کر میں نے آنکھیں کھول دیں۔ جب گھوڑوں کی ٹاپیں معدوم ہو گئیں تو میں آہستہ آہستہ اُٹھ کھڑا ہُوا اور مسجد کے سامنے واقع کنویں کے کنارے آ کھڑا ہُوا۔

میں نے جھانک کر کنویں میں دیکھا۔

تاریکی کی وجہ سے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

کوئی آواز... کوئی کراہ... کوئی سسکاری تک سُنائی نہیں دے رہی تھی۔ میں رائفل سنبھالے اُس احاطے کی طرف چل دیا جہاں لاشیں ہی لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔

خوشیوں کا یہ گھر ماتم کدہ بن چکا تھا۔

میں نے ایک سرے سے گھروں کی تلاشی لینی شروع کی اور اپنی ضرورت کا سامان جمع کرتا رہا۔ ایک خنجر، ایک بہترین رائفل اور ایک ریوالور تلاش کرنے کے بعد میں نے تھیلے میں کچھ خشک غذا بھری اور اصطبل کی طرف آیا جہاں ایک بیمار گھوڑے کے علاوہ

جھاڑیاں جمع کر کے الاؤ بھڑکا دیا۔ اور پانی کے برتن سے گھوڑے کے مُنہ میں تھوڑا سا پانی ٹپکا دیا۔ وہ بے چین ہو گیا لیکن میں پورا برتن اُسے پلا کر خالی نہیں کر سکتا تھا کیونکہ میں آہستہ آہستہ بڑھنے والی سردی سے نجات حاصل کرنے کے لیے کچھ قہوہ بھی تیار کرنا چاہتا تھا۔

"بس دوست یہ" میں نے گھوڑے کی تھوتنی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "اس سے زیادہ کی گنجائش نہیں ہے"

گھوڑا ہجوا یا ہنہنایا جیسے پانی کے لیے درخواست کر رہا ہو لیکن میں اس سے زیادہ اُس کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

الاؤ کے قریب ہی میرا بستر تھا لیکن مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ میں نے اس سامان میں سے ایک برتن نکالا جو میں پارس بستی سے چلتے وقت ایک تھیلے میں بھر کر ساتھ لے آیا تھا اور قہوہ تیار کرنے لگا۔

انگارے دہک رہے تھے۔

دھواں اُٹھ رہا تھا۔

میرے سینے میں بے پناہ گھٹن تھی۔

میں سانس لینے میں دشواری محسوس کر رہا تھا۔ بار بار میرا دل بھر آتا تھا۔ ایک معصوم سی بچی اپنی ماں کو پکارتی ہوئی میرے خیالوں میں گھس آتی تھی اور میری سوچوں کو درہم برہم کر کے دوبارہ نہ جانے کہاں گم ہو جاتی تھی۔

اَن گنت مرتے ہوئے اور دم توڑتے چہرے میری نگاہوں میں گھومتے رہے۔۔۔ پھر ایک خوبصورت سی دُلہن میرے ذہن میں اتر آئی۔ میں الاؤ میں رقص کرتے ہوئے شعلوں کو دیکھتا رہا اور میری آنکھیں خود بخود بھیگنے لگیں۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔

یہ کائنات کتنی حسین ہے۔۔۔ لیکن اس میں بسنے والے بعض لوگ کتنے ظالم ہیں۔ انہوں نے اس کائنات کا حُسن خاک میں ملا دیا ہے۔۔۔ انہوں نے اس کائنات میں پھولوں کی خوشبو کی جگہ انسانی خون کی بُو پھیلا کر اسے جہنم بنانا شروع کر دیا ہے۔

تب مجھے یوں لگا جیسے الاؤ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں میں ایک ہیولا سا رقص کر رہا ہے۔ یہ ہیولا رفتہ رفتہ مجسم ہوتا چلا گیا اور میں نے حسرت سے اپنی ماں ریشم جان کو دیکھنے لگا۔

وہ مجھے گھور رہی تھی۔

اس کے چہرے پر غصے کے شعلے رقص کر رہے تھے

اس کی آنکھیں مجھ سے کچھ پوچھ رہی تھیں۔

۔۔ لیکن میرے پاس کسی بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔

میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ میں حقیقت سے آنکھیں نہیں چرا رہا تھا بلکہ میں نے حقیقت کے تقاضوں کو ملحوظ رکھا تھا۔

غوری کے سردار اور ساتھیوں کے بعد گُل کی دردناک موت اور اب پارس قبیلے کی تباہی کا منظر دیکھ کر میرا دل دُنیا سے اُچاٹ ہونے لگا تھا۔ شاید الاؤ کے شعلوں میں رقص کرتا ہوا ماں ریشم جان کا ہیولا بھی مجھے اس لیے دکھائی دیا تھا اور اس کی آنکھوں میں جو برہمی تھی وہ بھی شاید اسی کی وجہ سے تھی کہ میں ان حادثات سے دل برداشتہ ہو گیا تھا۔ اس نے مجھے ہمیشہ یہی تعلیم دی تھی کہ ہر حادثے کا مردانہ وار مقابلہ کیا جائے اور آخری دم تک اپنے مقصد کے لیے جدوجہد کی جائے۔

۔۔۔ پھر مجھے ایک اور پیکر دکھائی دیا۔

میرے بابا شالیار کا پیکر۔۔۔ وہ نہ جانے اس وقت کہاں اور کس حال میں ہوں گے؟ آخری اطلاع کے مطابق تو وہ فرنگیوں کی قید میں تھے۔ اب نہ جانے زندہ بھی ہیں یا نہیں۔

فرنگیوں اور بابا شالیار کے خیال نے مجھے چونکا دیا اور ایک چیز میرے ذہن میں بُری طرح کھٹکنے لگی۔

میں نے اپنی جیبوں کو ٹٹولا۔

وہ صداقت نامہ میرے پاس نہیں تھا جو چوکی کے نگران نے مجھے لکھ کر دیا تھا۔ اس صداقت نامے کو دکھا کر میں فرنگی سرکار سے پانچ ہزار روپے انعام حاصل کر سکتا تھا لیکن مجھے اس انعام سے زیادہ ایک اور معاملے میں دلچسپی تھی اور اسی وجہ سے میں نے صداقت نامہ قبول کر لیا تھا۔۔۔ میں فرنگیوں کے ہیڈکوارٹرز تک اس صداقت نامے سے بآسانی رسائی حاصل کر سکتا تھا اور وہاں سے بابا شالیار کو تلاش کرنے میں بھی مجھے آسانی ہو سکتی تھی لیکن وہ صداقت نامہ کہاں گیا؟

میں نے ذہن پر زور ڈالا۔

پارس بستی میں غسل کرنے کے بعد میں نے جب لباس تبدیل کیا تھا تو میں نے خوب اچھی طرح اطمینان کر لیا تھا کہ اِن پُرانے کپڑوں میں کوئی چیز رہ نہ جائے۔۔۔ پھر وہ صداقت نامہ کہاں غائب ہو گیا؟

میں سوچتا رہا اور اُلجھتا رہا۔

۔۔۔ اور پھر مجھے یاد آیا کہ وہ صداقت نامہ کہاں گیا اور کس نے میری جیب سے نکالا ہے۔ چند لٹیروں نے جب مجھ پر حملہ کر کے گزشتہ رات گھوڑا اور سامان چھیننے کی کوشش کی تھی تو میں زخمی ہو گیا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں سمجھ گیا کہ صداقت نامہ اُسی لٹیرے نے نکالا ہو گا جو مجھے زخمی کرنے کے بعد گھوڑے اور اپنے ساتھیوں کی ہر چیز لے کر فرار ہو گیا تھا۔ میں دانت پیس کر رہ گیا۔

ایک موقع میرے ہاتھ آ کر نکل گیا تھا۔

میں نے سوچا کہ مجھے فوری طور پر چوکی پہنچنا چاہیے اور نگران سے مل کر فرنگیوں کے ہیڈکوارٹرز تک رسائی حاصل کرنی چاہیے۔ وہاں اُس جھگوڑے ڈاکو سے بھی ملاقات ہو جانے گی کیونکہ وہ پانچ ہزار کی رقم حاصل کرنے ضرور جائے گا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ صداقت نامے کو میری جیب سے ہرگز نہ نکالتا۔

۔۔۔ لیکن میں جس نگران سے واقف تھا وہ تو چوکی سے رخصت ہو گیا تھا۔ اب اس سے اس کے گاؤں ہی میں ملاقات ہو سکتی تھی جبکہ اس بات کا بھی خدشہ تھا کہ مفرور ڈاکو اس صداقت نامے سے پہلے ہی فائدہ اُٹھا کر رقم حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ اُسے مجھ پر وقت کی برتری حاصل تھی اس لیے میں اُس سے پہلے فرنگیوں تک پہنچنے کے سلسلے میں زیادہ پُرامید نہیں تھا۔

میری مُٹھیاں بھنچ گئیں۔

ہوا میں تیزی آ جانے کی وجہ سے سردی بڑھ رہی تھی۔

گھوڑا اب بھی ہانپ رہا تھا لیکن الاؤ کے قریب لیٹے ہونے کی وجہ سے اس کی طبیعت خاصی سنبھل گئی تھی۔ اب اس کے ہانپنے کی وجہ سوائے پیاس کے اور کچھ نہیں ہو سکتی تھی۔

میں اس بے زبان کی طرف دیکھتا رہا اور سوچتا رہا۔

اچانک گھوڑے کے کان کھڑے ہو گئے۔

میں نے اپنی سماعت پر زور دیا اور کوئی آہٹ سننے کی کوشش کی لیکن کوئی آواز سنائی نہ دی۔ گھوڑے کے کان ابھی تک متحرک تھے اور وہ کوئی آواز سُن رہا تھا۔۔۔ ایسی آواز جسے کوئی انسان نہیں سُن سکتا تھا۔

میں چاروں طرف دیکھ کر مطمئن ہو گیا۔

کوئی بھی دُور دُور تک دکھائی نہیں دیتا تھا۔

میں نے کمبل اوڑھ لیا اور الاؤ کے قریب ہی بیٹھا رہا۔ بار بار میری نگاہ گھوڑے کی طرف اُٹھ جاتی تھی۔ وہ کبھی تو پُرسکون ہو جاتا۔۔۔ اور کبھی اس کے کان تیزی سے گھوم کر کسی غیر معمولی آواز کو سُننے لگتے۔۔۔ لیکن ابھی تک نہ تو آس پاس مجھے کوئی دکھائی دیا تھا اور نہ ہی میں نے کسی کی آواز سُنی تھی۔

میں سمجھ گیا کہ بیمار گھوڑا مرض کی اذیت سے دوچار ہے۔ الاؤ میں مزید لکڑیاں ڈال کر میں نے اُسے مزید بھڑکا دیا۔

قہوہ تیار ہو چکا تھا۔ میں نے اسے ایک برتن میں اُنڈیلا اور پھر اس کی تلخی کو چسکیوں کے ذریعے اپنے حلق سے نیچے اُتارنے لگا۔

گرم گرم قہوے نے میرے اعصاب کو خاصا سکون دیا۔

میں نے برتن خالی کر کے رکھ دیا اور لیٹنے کی تیاری ہی کر رہا تھا کہ اچانک گھوڑا بڑے زور سے ہنہنایا۔

وہ اچھل کر کھڑا ہونے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے خاموشی سے اس کی بے چینی کا اندازہ لگانے کی کوشش کی اور تبھی میرے کانوں سے ایک مدھم سی آواز ٹکرائی۔

کوئی دبے قدموں چل رہا تھا۔

میرا ہاتھ قریب پڑی رائفل کی طرف سرک گیا اور میں نے اسے گرفت میں لے لیا لیکن میں خیالوں میں اس قدر اُلجھا ہوا تھا کہ مجھے حقیقت کا احساس کرنے میں کافی دیر ہو گئی تھی۔۔۔ ایک سرد آواز میرے کانوں سے ٹکرائی تھی اور اس کے ساتھ ہی میری گردن پر کسی رائفل کا سوراخ چپک گیا تھا۔

میں نے ایک طویل سانس لے کر رائفل سے ہاتھ ہٹا لیا اور آہستہ آہستہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ میں بُری طرح گھر چکا تھا اور زندگی کے گرد ایک بار پھر موت کے بھیانک سایوں نے اپنا رقص شروع کر دیا تھا۔

موت میرے لیے ایک بے معنی سی چیز تھی کیوں کہ مجھے شروع ہی سے

موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرانا سکھایا گیا تھا۔۔۔ لیکن میں موت سے مذاق کرنا کبھی پسند نہیں کرتا۔۔۔ یہ بات دلیری اور بہادری کے خلاف سہی لیکن عقل و دانش کے عین مطابق ہے۔

ملگجی سی چاندنی میں زیادہ دُور تک دیکھنا ممکن نہیں تھا۔۔۔ پھر جس کسی نے مجھ پر رائفل تان رکھی تھی وہ عقب میں تھا۔ یہ بات یقین سے نہیں کہی جا سکتی تھی کہ وہ تنہا ہے یا آس پاس دوسرے ساتھی بھی چھپے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے حالات کا جائزہ لیے بغیر اندھا دُھند اپنی گردن پر رائفل رکھنے والے پر حملہ نہیں کیا۔ یوں بھی جب کوئی رائفل تان کر باتیں کرنے میں لگ

نواب حیدر علی
الماس ایم اے   قیمت:- 200/

جاتا ہے تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ چند سانسوں کی مہلت تو حاصل ہو ہی گئی ہے۔

"اُٹھنے کی ضرورت نہیں" غراہٹ سنائی دی۔ "بیٹھ جاؤ"

میں جہاں تھا، وہاں منجمد سا ہو کر رہ گیا۔

"کوئی حرکت نہ کرنا" عقب سے سرد آواز آئی۔

بولنے والا کوئی پٹھان ہی تھا اور لہجے کے اکھڑپن سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ جرم کی راہ کا کوئی پرانا کھلاڑی ہے۔

"تمہارے پاس حملہ کرنے کا موقع نہیں ہے" وہی ٹھہرا دینے والے تاثر سے بھرپور آواز دوبارہ میری سماعت سے ٹکرائی۔

"تم کیا چاہتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"سب سے پہلے تو قہوہ پیوں گا"

"رائفل کی نال مجھ پر تان کر قہوہ کیسے پی سکتے ہو۔ کوئی تیسرا ہاتھ ہی اس سلسلے میں تمہاری مدد کر سکتا ہے"

"تیسرا ہاتھ بھی میرے پاس موجود ہے"

میں نے یہ سن کر ایک طویل سانس لی۔ میرا اندازہ غلط نہیں تھا۔ رائفل تان کر مجھے ہاتھ اٹھانے پر مجبور کرنے والے کا کوئی ساتھی بھی موجود تھا اور یقیناً اس کا فاصلہ ہم سے زیادہ نہیں رہا ہو گا۔

میرے حساس کان اب پوری طرح کام کر رہے تھے ں نے بائیں طرف ہلکی سی آہٹ سن کر سمجھ لیا کہ رائفل بردار ص کا ساتھی اس جانب موجود ہے اور یقیناً اس کی ل بھی میری طرف اُٹھی ہوئی ہو گی۔

میں نے الاؤ کی طرف دیکھا۔

اس میں شعلے رقص کر رہے تھے۔

گھوڑا اب بھی الاؤ کے قریب بیٹھا تھا اور اس کے تیزی سے گھوم رہے تھے۔ میں نے گھوڑے کے کانوں کی حرکت کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی ورنہ میں اتنی آسانی سے کے نرغے میں کبھی نہ پھنستا۔

"ٹھیک ہے۔۔۔" میں نے بلند آواز میں کہا۔ "اگر ہ پینا چاہتے ہو تو ضرور پیو۔ میں ان معاملات میں کافی نواز ہوں۔ برتن میں دو آدمیوں کے لیے قہوہ موجود ہے"

"کیا تمہاری مہمان نوازی میں کچھ رقم بھی شامل ہو سکتی ی" بائیں سمت والے شخص نے سوال کیا تھا۔

"جن کے پاس رقم ہوتی ہے، وہ یوں ویرانوں میں مارے نہیں پھرا کرتے" میں نے ہنس کر کہا۔

"یہ تو کہتا ہے کہ اس کے پاس قہوے کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے، منصور خان" رائفل بردار شخص نے اپنے ساتھی سے گویا میری شکایت کر دی۔

"خاموش رہو" منصور خان غرایا۔ "کیا ہر شخص پہلے پہل یہی بات نہیں کہتا۔ تم بالکل ہی احمق ہو، افضل"

"میں جھوٹ نہیں کہتا" میں نے جلدی سے کہا۔ "اگر تم محض رقم کے لیے مجھ پر رائفلیں تانے کھڑے ہو تو تمہیں مایوسی ہو گی۔ تم نے ایک غلط آدمی کا انتخاب کیا ہے"

"میرا خیال ہے، یہ شخص ٹھیک ہی کہتا ہے" افضل نے تبصرہ کیا لیکن اس نے رائفل میری گردن سے اب بھی نہیں ہٹائی تھی۔

"اس کے پاس رقم موجود ہو گی" منصور خان غرایا۔

"تو پھر ٹھیک ہے" افضل نے جلدی سے کہا۔ "اس کے پاس جتنی بھی رقم نکلے، وہ تم لے لو اور میں الاؤ کے قریب پڑی اس کی رائفل لے لیتا ہوں"

"بکواس مت کرو، افضل" منصور خان کا لہجہ درشت تھا۔ "تمہیں جو کچھ بھی دینا ہے، اس کا انتخاب میں خود کروں گا"

"لیکن تم ہمیشہ ہی بہترین چیزوں پر قبضہ کر لیتے ہو" افضل نے دھیمی آواز میں کہا۔ یہ شخص شاید زیادہ سوجھ بوجھ کا مالک نہیں تھا اور منصور خان کو اس پر برتری حاصل تھی۔

"خاموش۔۔۔" منصور خان کے لہجے میں کسی پاگل کتے جیسی غراہٹ شامل ہو گئی۔ غالباً اس نے اپنے احمق ساتھی کی بڑبڑاہٹ کو سن لیا تھا۔ "سنو، خان۔۔۔ سنو۔۔۔" وہ شاید اب مجھ سے مخاطب تھا۔ "تم انتہائی آہستگی سے سیدھے کھڑے ہو جاؤ اور پھر الاؤ کی طرف پشت کر لو۔ میں اس بات کو کبھی پسند نہیں کروں گا کہ تمہاری پیٹھ میں گولی ماروں۔ سمجھ گئے؟"

میں خاصی دیر سے ایک ہی انداز نشست کی وجہ سے جسم میں ہلکی سی اکڑن محسوس کر رہا تھا۔ کمبل میرے کندھوں پر تھا۔ اور میں نے رائفل کا ٹھنڈا سوراخ اپنی گردن پر چبھتے ہی الاؤ کے قریب رکھی ہوئی اپنی رائفل سے ہاتھ ہٹا لیا تھا۔

آہستہ آہستہ جب میں اُٹھا تو میرے دونوں گھٹنوں کی ہڈیاں چٹخ پڑیں۔ خفیف سی آوازیں، ویران رات کے سناٹے میں خاصی نمایاں ہو گئی تھیں۔

میں جیسے ہی سیدھا کھڑا ہوا، ان دونوں کے قدموں کی آہٹیں گونجنے لگیں۔ پتھر ان کے پیروں تلے چرچرا رہے تھے۔ غالباً ایک قدرے پیچھے ہٹ رہا تھا اور دوسرا اپنی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں مصروف تھا۔ رائفل کی ٹھنڈی نال میری گُدّی سے ہٹ گئی تھی۔ کمبل ابھی تک میرے کندھوں پر پڑا ہوا تھا۔

"بس اسی طرح بے حرکت ہو جاؤ" منصور خان کی آواز سنائی دی۔ وہ اب مجھ سے غالباً صرف دو قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ "اور ہاں۔۔۔ یہ سیاہ کمال بھی شرافت سے نیچے گرا دو"

"سیاہ کمال؟" میں نے چونک کر کہا۔

"میرا اشارہ تمہارے کمبل کی طرف ہے"

"اوہ، منصور خان" افضل کی چہکار سنائی دی۔ اس نے تعریفی لہجے میں کہا۔ "تم واقعی ذہین ہو، دوست۔ ہو سکتا ہے اس نے کمبل میں کوئی توپ چھپا رکھی ہو"

کمبل میرے جسم پر یوں لپٹا ہوا تھا کہ اس کا ایک کنارہ میرے بائیں شانے کے اوپر سے عقب میں جھول رہا تھا اور دوسرا کنارہ میری پنڈلیوں کو چھو رہا تھا۔ کمبل کی وجہ سے میرا ریوالور اور اس کی پیٹی چھپ گئی تھی۔

"کمبل کو گرا دو" منصور خان نے تیز لہجے میں کہا۔

میں نے ہاتھوں کو حرکت دیئے بغیر کمبل کو کندھوں سے جھٹک کر زمین پر گرا دیا۔ مجھے یقین ہو چکا تھا کہ وہ تعداد میں دو ہیں۔ اب میں ان سے بہ آسانی نمٹ سکتا تھا۔

"اپنے ہاتھ گردن پر رکھ لو" منصور نے پھر حکم دیا۔

"اوہ، منصور خان" افضل نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔ "اس کے پاس تو واقعی ایک چھوٹی سی توپ موجود ہے۔ اگر تم اس کا کمبل نہ اترواتے تو یہ ہمیں نقصان بھی پہنچا سکتا تھا"

"میرے پاس آنکھیں ہیں اور میں دیکھ بھی سکتا ہوں" منصور خان نے کرخت لہجے میں اپنے ساتھی کو ڈانٹ دیا اور میری طرف متوجہ ہو کر بولا۔ "ٹھیک ہے، خان! اب تم آہستہ آہستہ گھوم کر ہمارا دیدار کر سکتے ہو۔ گھوم جاؤ تاکہ میں حلیہ بھی دیکھ سکوں"

میں نے اس کے کہنے پر دونوں ہاتھ اُٹھا کر اپنی گردن پر رکھ لیے تھے اور اس کے ساتھ ہی میرا انگوٹھا پھسل کر اس خنجر کے دستے کی طرف بڑھ گیا تھا جس کی میان میں نے قمیص کے نیچے سے پہن رکھی تھی اور خنجر کی یہ میان میری گردن سے نیچے ریڑھ کی ہڈی پر لٹکی ہوئی تھی۔

ان لٹیروں کی طرف گھومتے وقت میرا دایاں ہاتھ خنجر کے دستے پر جم چکا تھا۔۔۔ اور پھر میں نے ان دونوں کی طرف دیکھا جنہوں نے میرے آرام میں خلل ڈال دیا تھا اور کچھ دیر قبل مجھے زندگی اور موت کے درمیان خیالی سُولی پر لٹکا دیا تھا۔

میں نے دائیں بائیں کھڑے ان دونوں لٹیروں کا جائزہ لیا۔ وہ پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس تھے اور ان کی حالت سے پتہ چلتا تھا کہ انہیں کافی عرصے سے کہیں ہاتھ صاف کرنے کا موقع نہیں ملا۔ میں اب تک ان دونوں کی صرف آوازیں ہی سنتا رہا تھا لیکن اس وقت وہ دونوں میرے سامنے کھڑے تھے اور میں محض انہیں دیکھ کر ہی اندازہ لگا سکتا تھا کہ ان میں کون منصور خان ہے اور کس کا نام افضل ہے۔

میلگجی سی چاندنی میں جو درمیانے قد کا موٹا تازہ شخص تھا، وہ افضل خان تھا اور دوسرا منصور خان۔ افضل خان کا چہرہ بھی خاصا چوڑا اور بھرا بھرا سا تھا۔ اس کے بڑھے ہوئے پیٹ میں سانس کی آمد و رفت سے جو حرکت پیدا ہو رہی تھی، وہ بے حد مضحکہ خیز لگ رہی تھی۔

منصور خان کرخت چہرے اور چھوٹی چھوٹی کمینگی سے بھرپور آنکھوں کا مالک تھا۔ اس کے بائیں رخسار پر کسی پرانے زخم کی ایک لمبی سی خراش موجود تھی۔ ان کی عمریں تیس کے لگ بھگ رہی ہوں گی۔ ان کے ہاتھوں میں پرانی سی رائفلیں تھیں۔

افضل خان کی رائفل میرے سینے کی سیدھ میں اُٹھی ہوئی تھی اور میں رائفل کی نال میں خفیف سی لرزش کو محسوس کر رہا تھا۔ یہ کپکپاہٹ اس کی دلی گھبراہٹ کا مظہر تھی۔

"کافی تگڑا آدمی لگتا ہے۔۔۔ کیوں، منصور خان؟" افضل نے احمقانہ انداز میں اپنے ساتھی سے کہا۔

"ہاں۔۔۔ لیکن گھبرانے کی ضرورت نہیں" منصور خان نے بے رخی سے کہا۔ "تم اپنی رائفل سے میری حفاظت کرنا۔ میں اس کے قریب جا رہا ہوں۔ سمجھ گئے؟"

"اسے گولی کیوں نہ مار دی جائے" افضل خان کی آواز تک کانپنے لگی۔ غالباً وہ میرے چہرے اور جسم پر نگاہ پڑتے ہی خوف میں مبتلا ہو گیا تھا۔

منصور خان نے کوئی جواب نہیں دیا۔

اس کی آنکھیں مجھ پر جم کر رہ گئی تھیں۔

کچھ دیر وہ مجھے یوں ہی گھورتا رہا۔۔۔ پھر اس کی زبان اپنے منہ میں دانتوں کی قطار کے ساتھ ساتھ گھومی اور نسوار کو سمیٹ کر اس نے چٹانی زمین پر تھوک دیا۔ اس کے انداز سے خود اعتمادی جھلک رہی تھی۔

"اسے گولی مار کر میں اس کے جسم پر موجود خوبصورت چیتی کو کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتا۔" اس نے مجھ پر نگاہ جمائے ہوئے کہا۔

"جو کچھ بھی کرنا ہے، جلدی کرو۔" افضل نے سرد لہجے میں اپنے ساتھی کو مشورہ دیا۔ غالباً وہ اس ہیجانی صورت حال کو جلد از جلد ختم کر دینا چاہتا تھا جس نے اس کے ہاتھ پیروں پر کپکپی طاری کر رکھی تھی۔

وہ مجھ سے دس قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ چہرے مہرے اور اپنی باتوں سے اس نے مجھ پر یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ ایک انتہائی احمق شخص ہے لیکن رائفل تاننے کے انداز سے مہارت جھلکتی تھی۔ میں نے اس کی طرف دیکھ کر اپنے ہونٹوں پر وہ مسکراہٹ طاری کر لی جو ایسے لوگوں کو احساسِ کمتری میں مبتلا کرنے کے لیے کافی ثابت ہوتی رہی ہے۔

میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا کہ افضل کی بجائے اس کے ساتھی پر پہلے غلبہ پانا چاہیے۔

"یہ کوئی معمولی آدمی نہیں لگتا۔" پہلی بار منصور خان نے میرے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ "اسے ذرا سا بھی موقع مل گیا تو یہ ریوالور نکالنے میں دیر نہیں لگائے گا۔"

"تم نے کیسے اندازہ لگایا، منصور خان؟"

"میں اس کی آنکھوں میں آہنی عزم کی چمک دیکھ رہا ہوں۔" منصور خان نے اپنے ساتھی کو اس انداز میں بہلانے کی کوشش کی جیسے وہ ان معاملات میں اس کے زیرِ تربیت رہا ہو۔ "اس کے کھڑے ہونے کا انداز بتاتا ہے کہ یہ بے حد پھرتیلا جوان ہے۔ اس لیے افضل خان، میری حفاظت کے سلسلے میں بے پروائی کا مظاہرہ نہ کرنا۔ پلک تک نہ جھپکانا۔ سمجھ گئے؟"

منصور خان جو انداز اختیار کیے ہوئے تھا، وہ مجھے بے حد پسند آ رہا تھا۔ اگر اس کی بجائے افضل خان میری طرف بڑھتا تو شاید مجھے قدرے دشواری کا سامنا کرنا پڑ جاتا۔ ڈرا ہوا آدمی ہمیشہ خطرناک ہوتا ہے کیوں کہ وہ ایسے وقت میں گولی چلا دیتا ہے، جب اس سے اس حرکت کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی۔۔۔ اور ایسا وہ محض گھبراہٹ میں، لاشعوری طور پر کر گزرتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ افضل کی بجائے منصور کی میرے قریب آمد میرے حق میں تھی۔

وہ آہستہ آہستہ میری طرف بڑھنے لگا۔

میں خاموشی سے اس کا جائزہ لیتا رہا۔

غیر متحرک آنکھوں سے میں یہ دیکھ چکا تھا کہ منصور خان درحقیقت کیا کرنا چاہتا ہے۔ اس کی خواہش تھی کہ الاؤ کی طرف سے گھوم کر میری پشت پر پہنچ جائے اور پھر عقب سے ریوالور کو میرے ہولسٹر سے نکال لے۔ یہ ایک دانش مندانہ اقدام تھا اُسے کیا خبر تھی کہ اس ریوالور سے بھی زیادہ خوف ناک ہتھیار میرے ہاتھ میں موجود ہے۔

منصور خان گھوم کر میری پشت پر پہنچ گیا۔

میں اپنے حساس کانوں سے اس کے قدموں کی آہٹ سنتا رہا۔ اس کے ایک ہاتھ میں رائفل دبی ہوئی تھی اور وہ اپنے خالی ہاتھ سے میرا ریوالور نکالنا چاہتا تھا۔

وہ میرے قریب آ گیا۔

میرے جسم کا ایک ایک ریشہ تن چکا تھا اور میں عملی اقدام کے لیے ہر طرح سے تیار اس کا انتظار کر رہا تھا۔ میری خواہش تھی کہ جب تک وہ میرے ریوالور کے دستے پر اپنے خالی ہاتھ کی گرفت نہ ڈال لے، اس وقت تک میں کچھ نہ کروں۔ ریوالور کے دستے پر اس کی انگلیوں کی گرفت مضبوط ہونے کے بعد ایک طرح سے اُس کے دونوں ہاتھ معروف ہو جاتے۔ ایک میں میرے ریوالور کا دستہ اور دوسرے میں خود اس کی رائفل۔۔۔ یُوں میں جو کچھ کرنا چاہتا تھا، اس میں مجھے آسانی سے کامیابی ہو سکتی تھی۔

افضل خان رائفل میری طرف اُٹھائے دس قدم کے فاصلے پر سامنے کھڑا ہانپ رہا تھا۔

پراسرار اور خوفناک کہانیاں جنہیں
پڑھتے ہوئے آپ چونک اُٹھیں گے
انوار صدیقی کے پراسرار قلم سے
آسیب زدہ قیمت =/110
دستک قیمت =/100
مکتبہ القریش سرکلر روڈ اردو بازار لاہور
فون 7668958

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جیسے ہی میں نے محسوس کیا کہ منصور خان کے دائیں ہاتھ کی گرفت میرے ریوالور کے دستے پر مضبوط ہو گئی ہے، میں نے خود کو پھرتی سے بائیں طرف گرایا اور اپنی کمر کو عقب میں شدید جھٹکا دیا۔ وہ میرے اوپر سے ہوتا ہوا سامنے آیا اور اگلے ہی لمحے میرے خنجر کی تیز دھار اس کے نرخرے پر جم گئی۔ اس کے علاوہ منصور خان اب میرے اور افضل خان کے درمیان ایک دیوار کی طرح حائل تھا اس لیے افضل گولی نہیں چلا سکتا تھا۔

ریوالور میرے ہولسٹر سے گر گیا۔

جو رائفل منصور خان کے ہاتھ میں دبی ہوئی تھی، وہ بھی جھٹکے کی وجہ سے گر چکی تھی اور اب وہ میرے دائیں ہاتھ میں دبا ہوا تھا جب کہ خنجر کی تیز دھار اس کے نرخرے پر جم گئی تھی۔

منصور خان ہانپنے لگا۔

وہ میری طرف ایسی نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے اسے ابھی تک میری پھرتی پر یقین نہ آیا ہو۔ میں نے اسے یُوں طرح جکڑ رکھا تھا۔ اس کی پشت اپنے ساتھی کی طرف تھی۔

"او، میرے خدا!" افضل کی آواز سنائی دی۔ یہ ایک کراہ تھی۔ غالباً پلک جھپکنے کی دیر میں جو کچھ ہوا، اس نے اسے بھی حیرت میں ڈال دیا تھا۔

میں نے منصور خان کی کمر پر اپنے بازو کی گرفت کو مزید سخت کر لیا اور اس کے نرخرے پر خنجر کی دھار کا دباؤ کچھ اور بڑھا دیا۔ "کیا تم نے کبھی ذبح ہوتے ہوئے بکرے کو بھی دیکھا ہے، منصور خان؟" میں نے بھنکارتی ہوئی سرگوشی کی۔

وہ کانپ گیا۔

"مم۔۔۔ میں کیا کروں، منصور خان؟" افضل نے کانپتی ہوئی آواز میں بے بسی سے پوچھا۔ "مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

منصور خان بھلا کیا جواب دیتا۔ وہ تو نفرت بھری نگاہوں سے میری آنکھوں میں دیکھ رہا تھا اور اس کے پھیلتے سکڑتے ہوئے نتھنے بتا رہے تھے کہ اس کے دل کی دھڑکنیں بُری طرح بے ترتیب ہو چکی ہیں۔ سامنے کے الاؤ کے شعلوں کا عکس اس کی آنکھوں میں دکھائی دے رہا تھا اور شعلے رقص کرتے محسوس ہو رہے تھے۔ یُوں لگ رہا تھا جیسے اس کی آنکھوں میں نفرت کے تاثرات جل اُٹھے ہوں اور انہوں نے شعلوں کا رُوپ دھار کر قاتل رقص شروع کر دیا ہو۔

"میں تمہارے بولنے کا کتنی دیر تک انتظار کروں؟" میں نے اس کی نفرت بھری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سرد لہجے میں پوچھا۔

"رائفل پھینک دو، احمق!" وہ غرایا۔

"لل۔۔۔ لیکن۔۔۔" افضل خان کو شاید اس کے حکم پر یقین نہیں آیا تھا۔

"تمہارا ساتھی، تمہیں دوسری بار کوئی حکم دینے کے قابل نہیں رہے گا، افضل خان۔" میں نے بلند آواز میں کہا۔ "میں اس کا نرخرہ رنگین بنانے ہی والا ہوں۔"

"اوہ۔۔۔ میرے خدا۔۔۔ میں نے تو پہلے کہہ دیا تھا۔" افضل نے بے بسی سے کہا اور رائفل پھینک دی۔

رائفل اس نے جھلاہٹ اور خوف کے عالم میں اچھالی تھی، اس لیے اسے اندازہ نہ ہو سکا کہ اس نے اس سلسلے میں کتنی طاقت استعمال کر ڈالی ہے۔ رائفل ایک چٹان پر گری اور پھر وہاں سے نشیب میں پھسلتی ہوئی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔

"لعنت ہو!" وہ بڑبڑایا اور خود کو کوسنے لگا۔ "رائفل نشیب میں گر گئی ہے اور اسے وہاں سے تلاش کرنا ممکن نہیں ہو گا۔"

"پروا نہ کرو۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "تمہیں اب اس رائفل کی ضرورت بھی نہیں پڑے گی۔" یہ کہنے کے بعد میں اپنے شکار کی طرف متوجہ ہوا جو میرے بازو کی گرفت سے نکلنے کی ہر ممکن کوشش کرنے کے بعد ناکامی سے ہانپ چکا تھا۔ "اور اب تم بھی محبت بھرا یہ انداز ختم کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ بہت گلے مل لیے۔"

میں نے رفتہ رفتہ اس کے نرخرے سے خنجر کی تیز دھار ہٹائی اور اسے ایک جھٹکے سے دُور پھینک دیا۔ اس نے گرتے ہی سنبھل کر واپس میری طرف جست لگائی تھی لیکن مجھے اس کے ارادوں کا پہلے ہی سے علم تھا اس لیے میں نے ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر الاؤ کے قریب گرا ہوا اپنا ریوالور اُٹھا لیا تھا۔ ریوالور کی نال اپنے سینے کی طرف اُٹھی دیکھ کر اسے حیرت کا دُوسرا جھٹکا لگا۔ وہ رُک گیا اور یُوں ہانپنے لگا جیسے نہ جانے کتنی دُور سے دوڑتا ہوا یہاں تک پہنچا ہو۔

میں نے ریوالور کی زد میں لے کر اسے اُٹھنے کا اشارہ کیا اور پھر جھک کر رائفل بھی اُٹھالی۔ ریوالور کو ہولسٹر میں ڈال کر میں نے خنجر اُٹھا لیا جسے ریوالور اُٹھانے کے لیے میں نے پھرتی سے گرا دیا تھا۔ خنجر کو گردن اور ریڑھ کی ہڈی سے مس کرتی ہوئی

میان میں ڈال کر میں نے ان دونوں کو رائفل کی زد پہ لے لیا۔ دونوں کی آنکھیں حیرت اور خوف کی زیادتی ظاہر کر رہی تھیں۔

"ہم نے ابھی تک ایک دوسرے کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔" افضل خان نے ہانپتے ہوئے مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔

"میں تم سے متفق ہوں۔" میں نے زیرِ لب کہا۔

"یہ بے حد جذباتی آدمی ہے، اُسے مت مارنا۔ یہ شادی شدہ اور بچوں والا آدمی ہے۔" افضل خان نے بھرائی ہوئی آواز میں اپنے ساتھی کے لیے سفارش کی۔ اس کے لہجے سے اندازہ ہوتا تھا کہ منصور خان کی آڑ میں درحقیقت خود اپنی ہی زندگی کی بھیک مانگ رہا ہے۔

"بکواس مت کرو۔" منصور خان جھلّا کر بولا۔ وہ انتہائی کینہ پرور آدمی دکھائی دیتا تھا اور غالباً اپنی غیر متوقع شکست نے اس کی ذہنی حالت بگاڑ دی تھی۔

میں رائفل ہاتھ میں لیے اُن دونوں کو گھورتا رہا۔ اس دوران میں، میں کن انکھیوں سے جائزہ لے چکا تھا کہ ان کے گھوڑے کہیں آس پاس نظر نہیں آ رہے ہیں۔ وہ کافی فاصلے پر گھوڑوں سے اُتر گئے ہوں گے یہی وجہ تھی کہ میں ان کے گھوڑوں کی ٹاپیں نہیں سُن سکا تھا۔

"تم ہم دونوں کے ساتھ کیا سلوک کرو گے؟" منصور خان نے عجیب سے لہجے میں سوال کیا۔

"جو تم چاہو۔"

"کیا مطلب؟" وہ چونک پڑا۔

"اس کا انحصار تمہارے آئندہ رویے پر ہے۔"

منصور خان ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔

"تمہارے پاس گھوڑے موجود ہیں؟"

"ہاں . . . " افضل خان جلدی سے بول پڑا۔

"جاؤ، اُنہیں یہاں لے آؤ۔" میں نے لہجے کو قدرے نرم کرتے ہوئے کہا اور رائفل کی نال بدستور منصور خان کی طرف اُٹھائے رکھی۔

"کک . . . کیا مطلب؟" افضل خان ہکلا گیا۔ غالباً اُسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں اُسے کہیں جانے کی اجازت بھی دے سکتا ہوں۔

میں نے اپنے مطلب کی وضاحت کرنے کی بجائے منصور خان کی طرف دیکھا۔ میری آنکھوں میں جو بھی تاثر تھا، اس نے منصور خان کو چونکا دیا . . . پھر وہ میرا مقصد سمجھ کر جلدی سے چیخ پڑا۔ "جاؤ، جلدی سے گھوڑے لے آؤ۔"

"اور جلدی واپس آنا۔" میں نے مرتے ڈاکو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہر گھوڑے کے لیے میں، تمہیں ایک منٹ کی مہلت دے رہا ہوں۔ دو گھوڑوں کے لیے دو منٹ۔ اس کے بعد میں تمہارے ساتھی کے ٹکڑے کرنا شروع کر دوں گا . . . بہت بڑے بڑے ٹکڑے نہیں . . . بلکہ چھوٹے چھوٹے حصے الگ کر دوں گا۔ پہلے اس کا ایک کان کاٹوں گا . . . پھر ناک اور اس کے بعد گھٹنے کی ایک ہڈی نکال لوں گا۔ ممکن ہے دو تین انگلیاں بھی کاٹ ڈالوں . . . اس طرح یہ زندہ رہے گا اور جب بھی تم سے ملاقات ہوگی، یہ تمہیں گولی مارنے سے دریغ نہیں کرے گا۔ سمجھ گئے؟"

جیسم ڈاکو نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

وہ میرا مطلب بہت اچھی طرح سمجھ گیا تھا۔

میں نے منصور خان کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر زردی چھا گئی تھی اور اس کی آنکھیں خوف کے گہرے تاثرات ظاہر کرنے لگی تھیں۔ وہ افضل خان کی طرف ایسی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا جن میں فوراً ہی واپس آجانے کی استدعا تھی۔

افضل خان بت بنا کھڑا تھا۔

"جاؤ . . . یہ شخص جیسا کہہ رہا ہے، ویسا ہی کرو۔" اس نے سخت لیکن استدعا آمیز لہجے میں کہا۔ "میں اس شخص کو ابھی تک سمجھنے سے قاصر ہوں۔ یہ انسان کی بجائے کوئی درندہ لگتا ہے۔"

"اپنی تعریف سُن کر ہر شخص کو خوشی ہوتی ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "لیکن اس تعریف میں مجھے اپنی ذلت کا کوئی پہلو محسوس ہوتا ہے۔"

منصور خان نے جواباً میری طرف نہیں دیکھا۔

وہ اب بھی افضل خان ہی کو گھور رہا تھا۔

"میں، تمہیں مہلت کے وقت سے بھی کم وقفے میں یہاں دیکھنا چاہتا ہوں۔" منصور خان نے کہا۔ اس کے لہجے میں اب پہلے جیسا دم خم نہیں تھا۔

اس کے ساتھی نے تھوک نگل کر اثبات میں سر ہلایا اور دوڑتا ہوا ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ اس کے جیبوں سے بڑی خوفناک دھمک پیدا ہو رہی تھی۔ منصور خان نے ایک طویل سانس لی اور مجھ سے مخاطب ہوا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"تم دراصل چاہتے کیا ہو، دوست؟"

میں نے قہوے کا برتن الاؤ کے کنارے رکھ دیا۔ اس دوران میں، میں منصور کی طرف سے محتاط بھی رہا تھا۔ "میں دیکھ چکا ہوں کہ تم دونوں اس علاقے میں نئے نہیں ہو۔ تمہاری کارکردگی بھی خاصی بہتر تھی لیکن تم دونوں پیشہ ور ڈاکو نہیں لگتے میں سوچ رہا ہوں کہ تم دونوں کو کسی ایسی شخصیت کے حوالے کر کے مجھے پچاس روپے بھی مل سکتے ہیں، جسے تمہاری ضرورت ہے۔"

"اوہ . . . کیا تم بھگوڑے فوجیوں کے شکاری ہو؟" یہ کہتے ہوئے منصور خان کی آواز میں واضح کپکپاہٹ محسوس ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک نیا خوف در آیا۔ "مجھے پہلی نگاہ میں یہ اندازہ لگا لینا چاہیے تھا۔" اس کی آواز بھرا گئی۔

"اگر تم میری گردن سے رائفل کی نال چپکانے سے پہلے تعارف کے لیے کہتے تو تمہیں یقیناً مایوسی کا سامنا ہوتا۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ "تمہارا ساتھی ابھی تک نہیں آیا۔" میں نے آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ رائفل کی نال اس کے سینے کی طرف اُٹھی رہی جب کہ میرا بایاں ہاتھ اپنی گردن کی طرف گیا اور واپسی میں میان سے خنجر نکال لایا۔

ایک ہاتھ میں تیز دھار خنجر اور دوسرے ہاتھ میں رائفل تھامے میں آہستہ آہستہ اُس کی طرف بڑھتا رہا حتیٰ کہ ہمارے درمیان فاصلہ دس فٹ سے کم ہو کر محض تین قدم رہ گیا۔ آگے بڑھتے وقت میں نے دیکھ لیا تھا کہ منصور خان کے چہرے کی رنگت میرے ہر اُٹھتے ہوئے قدم کے ساتھ ساتھ سفید تر ہوتی جا رہی ہے۔

اس کی پیشانی پسینے سے بھیگ گئی تھی۔

دفعتہً گھوڑوں کی ٹاپیں سُنائی دینے لگیں۔

میں رُک گیا۔

ٹاپوں کی آواز تیزی سے قریب آتی جا رہی تھی اس کا مطلب تھا کہ افضل خان نے خوف زدہ ہو کر بھاگنے کی کوشش نہیں کی بلکہ وہ گھوڑے لے کر واپس آ رہا ہے۔ ان ٹاپوں کو منصور خان نے بھی سُن لیا تھا۔ اس نے ایک طویل سانس لی اور بائیں آستین سے ماتھے کا پسینہ پونچھنے لگا۔

میں نے خود کو ایک ایسی جگہ مستعد کر لیا جہاں میں ان دونوں پر آسانی سے نگاہ رکھ سکتا تھا۔ مثلاً افضل جس سمت میں گیا تھا، اُدھر سے دونوں گھوڑوں کو اپنے آگے آگے دوڑاتا ہوا سامنے آیا۔ اس کا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا اور اس کے ہانپنے کی آواز گھوڑوں کے ہانپنے سے کہیں زیادہ بلند اور نمایاں تھی۔

"تم ہمارے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہتے ہو؟" اس نے گھوڑوں کو روکتے ہوئے ہانپ کر دریافت کیا۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا کیوں کہ مجھے معلوم تھا کہ میری خاموشی پر منصور خان یقیناً اُسے کوئی نہ کوئی جواب دے گا . . . اور پھر ایسا ہی ہوا۔ اس نے لرزتی ہوئی آواز میں اپنے ساتھی کو بتایا۔ "یہ ہمیں جیل بھجوانا چاہتا ہے۔"

جیسم لٹیرے کی آنکھیں ایک نئے خوف کے تحت پھیل گئیں اور اُس نے مجھے اس انداز میں دیکھا جیسے میں کسی اور ہی دنیا کی مخلوق ہوں۔ "کک . . . کیا تمہارا تعلق فرنگی فوج سے ہے؟"

"تھوڑا بہت . . . " میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ "اب تم جلدی سے میرا بستر باندھو اور چلنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

افضل خان نے منصور کی طرف دیکھا جس نے بے بسی سے سر کو اثبات میں جنبش دے کر میری بات پر عمل کرنے کے لیے اشارہ کر دیا۔

"کیا ہم خاموشی سے اس کے ساتھ چلنے پر مجبور ہیں؟" اس نے مُنہ ہی مُنہ میں گھٹی ہوئی آواز میں اپنے ساتھی سے پوچھا۔

"اس کے علاوہ کیا صورت ہو سکتی ہے؟" منصور خان نے عجیب سے لہجے میں سوال کیا۔

"میں، تمہاری طرح ذہین نہیں ہوں کہ کوئی صورت نکال سکوں۔" افضل خان نے پلٹ کر کہا۔ وہ میرا بستر باندھ رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ اس انداز میں منصور خان کی طرف دیکھتا جا رہا تھا جیسے شکایت کر رہا ہو کہ وہ اُس کی وجہ سے پھنس گیا ہے۔

"میں، تمہاری حالت پر متحیر ہوں۔" میں نے کہا۔

"اس کے پاس رقم بھی کیسے سکتی ہے۔" وہ بڑبڑانے لگا۔ "ہمیں اس بات کا دُور ہی سے اندازہ ہو جانا چاہیے تھا۔" اس نے مایوسی سے سر کو جھٹک دیا۔ "لیکن جب اس نے کہا تھا کہ اس کے پاس رقم نہیں ہے تو اس وقت بھی سمجھا جا سکتا تھا۔"

"یہ بھگوڑے فوجیوں کا شکاری ہے، احمق اور ہمیں فرنگیوں کے حوالے کر کے انعام حاصل کرنا چاہتا ہے۔"

"اوہ . . . " افضل خان تھوک نگل کر رہ گیا۔

"تم دونوں کیوں فرار ہوئے تھے؟"

"ایک معمولی سی چوری کی سزا کے خوف سے . . . " افضل

خان نے دھیمی آواز میں کہا اور سختی سے ہونٹوں کو بھینچ لیا۔ جیسے یہ بات بالکل غیر ارادی طور پر اس کی زبان سے نکل گئی ہو۔

اس نے بستر باندھ دیا اور میرے گھوڑے کی طرف دیکھا۔ "بستر اس پہ زین ڈال کر باندھ دوں؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں ۔۔۔ یہ ایک بیمار گھوڑا ہے۔" میں نے کہا۔ "تم دونوں ایک گھوڑے پر بیٹھو گے جب کہ میں دوسرے گھوڑے پر تنہا بیٹھوں گا اور یہ گھوڑا یہیں رہے گا۔ چلو ۔۔۔ دونوں ایک گھوڑے پہ بیٹھ جاؤ۔"

تاریکی رفتہ رفتہ چھٹ رہی تھی۔

سپیدۂ سحر نمودار ہو رہا تھا۔

میں نے رائفل کی نال باری باری ان دونوں کی طرف گھمائی اور وہ میرے حکم کی تعمیل میں ایک ہی گھوڑے پر سوار ہو گئے۔ افضل خان منصور کے پیچھے بیٹھا تھا۔ میں نے اُسے آگے بیٹھنے کے لیے کہا اور خود دوسرے گھوڑے پر سوار ہو گیا۔

رائفل اب بھی میرے دائیں ہاتھ میں دبی ہوئی تھی۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ ان کے پاس چاقوؤں کے علاوہ کوئی ہتھیار موجود نہیں ہے۔ اس کے باوجود میں ان کی طرف سے غافل نہیں تھا۔

"چلو ۔۔۔" میں نے اسی جانب اشارہ کیا جس طرف میں سفر جاری رکھنے کا خواہش مند تھا۔ "اور اس بات کو ذہن نشین رکھنا کہ اگر مجھے گولی چلانے کی ضرورت پڑی تو تم دونوں کے لیے ایک ہی گولی کافی ہو گی۔ گھوڑے پر آگے پیچھے اس طرح بیٹھے ہوئے دو سواروں کو ہلاک کرنا بے حد آسان ثابت ہوتا ہے۔"

افضل خان اب بھی زیر لب کچھ کہہ رہا تھا۔

وہ غالباً اپنے آپ کو کوسنے میں مصروف تھا۔

چلتے وقت میں نے الاؤ بجھا دیا اور اپنے گھوڑے کو ان کے گھوڑے سے کچھ فاصلے پر رکھا تاکہ انہیں نگاہ میں رکھنے کے ساتھ ساتھ بوقتِ ضرورت نشانہ لے کر ان دونوں کو ٹھکانے لگا سکوں۔

دو گھنٹے تک ہمارے گھوڑے خاموشی سے دوڑتے رہے۔ اس دوران میں انہوں نے کوئی شرارت نہیں کی اور نہ ہمارے درمیان کسی قسم کی بات چیت کا موقع پیدا ہوا۔ صبح ہو گئی تھی لیکن بادلوں کی وجہ سے دھوپ کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی اور بادل بار بار گرج رہے تھے لیکن بارش ابھی تک شروع نہیں ہوئی تھی۔

بادلوں کی وجہ سے دن بھر سفر جاری رکھنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ راستے میں ایک ندی سے پانی پیا۔ میں نے اپنے تھیلے سے کچھ خشک غذا نکال کر کھائی۔ اس دوران میں افضل خان بار بار ہونٹوں پہ زبان پھیرتا رہا لیکن اُسے مجھ سے کھانے کے لیے کچھ مانگنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ وہ جانتا تھا کہ میں انہیں کسی بھی وقت ٹھکانے لگا سکتا ہوں اس لیے زندہ رہنا بہرحال پیٹ بھرنے سے زیادہ ضروری تھا۔

منصور خان البتہ بڑے دل گردے والا اور مضبوط قوت ارادی کا مالک تھا۔ اس نے ایک بار بھی نگاہ اُٹھا کر میری طرف نہیں دیکھا ۔۔۔ میں نے محسوس کیا کہ اس نے پانی بھی بہت کم پیا ہے جب کہ بھوک سے مجبور ہو کر افضل خان بار بار پیٹ پہ ہاتھ پھیرتا ہوا ندی کے کنارے گھٹنوں کے بل جھک کر پانی پینے لگتا تھا۔

ندی کے کنارے ہریالی تھی اس لیے گھوڑے پیٹ بھرنے میں مصروف ہو گئے تھے ۔۔۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد میں نے اپنے دونوں قیدیوں کو گھوڑے پر بیٹھنے کا حکم دیا اور خود دوسرے گھوڑے پہ سوار ہو گیا۔

ہمارے گھوڑے، درمیان تھوڑا سا فاصلہ رکھ کر ایک بار پھر دوڑنے لگے۔ رفتار زیادہ تیز نہیں تھی۔ میں حیران تھا کہ خوارزم تک پہنچنے میں ہمیں ابھی کتنی دیر اور لگے گی۔ چٹانوں کے پھیلے ہوئے سلسلے کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا تھا کہ ابھی کافی فاصلہ باقی ہے اور منزلِ مقصود تک پہنچنے میں کئی گھنٹے لگیں گے۔

راستے میں ایک جگہ چند پھل دار درخت دیکھ کر میں نے دونوں قیدیوں کو گھوڑا روکنے کا حکم دیا اور انہیں اجازت دے دی کہ وہ پھلوں سے اپنی بھوک مٹا لیں۔ افضل خان تو مربھکوں کی طرح پھل توڑ توڑ کر کھانے لگا تھا جب کہ منصور خان کے انداز میں بے چینی اور جلد بازی نہیں پائی جاتی تھی۔

شام کے سائے ڈھلنے لگے تو میں نے کسی مناسب جگہ کی تلاش میں نگاہ دوڑانی شروع کر دی۔ بادلوں کی وجہ سے رات بھی خاصی تاریک تھی اس لیے میں چاہتا تھا کہ شب بسری کے لیے کوئی محفوظ غار تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاؤں۔

ہمارا سفر جاری رہا۔

میرے دونوں قیدی حیران تھے کہ جب میں انہیں شہر کی طرف لے جا کر فرنگیوں کے حوالے نہیں کرنا چاہتا تو ان دونوں کو کہاں اور کیوں لیے جا رہا ہوں ۔۔۔ میں نے ان کی اُلجھن کو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رفع کرنا پسند نہ کیا کیوں کہ ان کی رفاقت بہرحال میرے لیے فائدے مند تھی۔ راستے میں ان کے بعض جانی بندوں سے ملاقات کا امکان تھا جن کے لیے انہیں اپنے ساتھ رکھنا ایک طرح سے میری مجبوری بھی تھی۔ یہ تاتا تو نیت کا علاقہ تھا جہاں کا قانون طاقت تھا ۔۔۔ اور ایک سے تین بہرحال مجموعی طور پر طاقت کی علامت ہو سکتے تھے۔

رات تیزی سے ڈھلی اور اندھیرا اتنی جلدی پھیلا کہ راستہ بھی ٹھیک سے دکھائی دینا مشکل ہو گیا۔

ہمارے گھوڑے اس وقت ایک ایسے راستے پر چل رہے تھے جس کے دونوں طرف بلند چٹانیں تھیں اور یہ راستہ اس قدر تنگ تھا کہ ایک وقت میں صرف ایک ہی گھوڑا وہاں چل سکتا تھا۔

وہ دونوں جس گھوڑے پر بیٹھے ہوئے تھے، اس کی ٹاپوں اور ایک دھندلے سے خاکے کو دیکھ کر ہی ان کی موجودگی کا احساس ہوتا تھا ورنہ چند قدم کا فاصلہ بھی زیادہ ہوتا تو شاید میں اُنہیں دیکھ بھی نہ پاتا ۔۔۔ لیکن وہ فرار نہیں ہو سکتے تھے۔

گزشتہ رات سے اب تک میں نے ان کے ساتھ جس قدر جارحانہ رویہ اختیار کیا تھا، اس سے اُنہیں میرے بارے میں خوب اندازہ ہو گیا تھا۔ وہ مجھ سے بے حد خوفزدہ تھے اور خود کو کسی حماقت کے باعث ہلاکت میں نہیں ڈالنا چاہتے تھے ۔۔۔ میں ان دونوں کو وہیں ٹھکانے لگا سکتا تھا اور اُنہیں ساتھ لانے کی بجائے میں چھوڑ بھی سکتا تھا ۔۔۔ لیکن ان کا مصرف میرے لاشعور میں محفوظ تھا۔

اچانک میں نے اپنے گھوڑے کی لگام کھینچ لی۔

آگے والا گھوڑا رُک گیا تھا اور اس کی ٹاپیں سنائی نہیں دے رہی تھیں۔ رائفل پہ میرے ہاتھ کی گرفت سخت ہو گئی۔

میں نے تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ان دونوں کی طرف دیکھا۔ وہ مجھ سے زیادہ دُور نہیں تھے اور ابھی گھوڑے کی پشت ہی پہ موجود تھے۔ ان کے تاریک ہیولے دیکھ کر میں نے ایک طویل سانس لی۔ اگر وہ مجھ سے اس بُری طرح خوفزدہ نہ ہوتے تو اس تاریکی سے فائدہ اٹھا کر مجھ پہ حملہ کر سکتے تھے یا پھر کم از کم فرار ضرور ہو سکتے تھے ۔۔۔ لیکن خوف کی زنجیریں انہیں بے بس کیے ہوئے تھیں۔

"کیا بات ہے، افضل خان؟" میں نے سخت لہجے میں کہا لیکن آواز دھیمی ہی رکھی کیوں کہ اُن کے رُکنے کی وجہ میرے لیے اُلجھن کا باعث بن گئی تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ خود کو خطرے میں محسوس کر رہے ہیں اس لیے کوئی حماقت کرنے کے لیے یقیناً نہیں رُکے ہوں گے۔

"آگے کچھ لوگ موجود ہیں۔" افضل خان کی ہانپتی ہوئی آواز سنائی دی۔ "میں ایک جلتا ہوا الاؤ دیکھ رہا ہوں۔"

"کیا تم ان لوگوں کو مدد کے لیے متوجہ کرنا چاہتے ہو؟"

"نن نہیں ۔۔۔ ہو سکتا ہے، وہ تم سے بھی زیادہ خطرناک آدمی ہوں۔" اس بار افضل خان کے لہجے میں کپکپاہٹ نمایاں تھی۔

"ہو سکتا ہے کہ یہ اچھے لوگ ہوں۔" منصور خان نے تبصرہ کیا۔

"ہاں ۔۔۔ اور اچھے لوگ ہمیشہ مہمان نواز ہوتے ہیں۔ ممکن ہے، وہ ہمیں رات گزارنے کے لیے الاؤ کے قریب لیٹنے کی اجازت دے دیں۔" افضل خان نے دھیمی آواز میں کہا۔

"زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ وہ ہمیں دیکھتے ہی گولیاں برسانا شروع کر دیں۔" میں نے دھیمی غراہٹ آمیز آواز میں حکم دیا۔ "خود کو تھوڑا سا جھکا لو ۔۔۔ میں آگے آ کر دیکھنا چاہتا ہوں کہ یہ کون لوگ ہو سکتے ہیں؟"

میں نے گھوڑے کو آگے بڑھایا۔

بار بار بادل گرج رہے تھے اور بجلی چمک رہی تھی اس لیے مجھے گھوڑوں کی ٹاپوں کے بارے میں کوئی خدشہ نہیں تھا۔ یہ آوازیں یقیناً ان لوگوں تک نہیں پہنچ سکتی تھیں۔

وہ دونوں گھوڑے کی پشت پہ جھک گئے اور گھوڑے کو کچھ آگے بڑھا لیا۔ وہاں دونوں طرف کی چٹانیں نیچی تھیں۔ میں نے بائیں طرف کچھ فاصلے پہ ایک بھڑکتا ہوا الاؤ دیکھا۔

میں اس موقعے پہ بے حد محتاط تھا۔

دونوں قیدیوں پہ نگاہ رکھنی بھی ضروری تھی۔ ایسے موقعوں پہ غفلت، موت کا دوسرا نام ثابت ہوتی ہے۔ میں نے گھوڑے کو راستے کے کنارے کر لیا اور رکابوں پہ کھڑا ہو گیا۔

سیاہ رات میں الاؤ کے بھڑکتے ہوئے شعلے گلابی گلابی دکھائی دے رہے تھے۔ آگ دیکھ کر سردی کا احساس بڑھ گیا۔ میں دیر تک اطراف کا جائزہ لیتا رہا ۔۔۔ اس علاقے میں وہی ایک ایسی جگہ تھی جہاں، سکون سے رات گزاری

جا سکتی تھی لیکن وہاں کچھ لوگ قابض تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ لوگ کون ہو سکتے ہیں؟

الاؤ خاصا بڑا تھا اور ایک خلا کے اندر بھڑک رہا تھا۔ اس سے غار روشن ہو گیا تھا اور میری آنکھیں اُسے دُور ہی سے دیکھ رہی تھیں... لیکن غار کے دہانے کی طرف سے ادھر جانا مہلک بھی ثابت ہو سکتا تھا اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ لمبا چکر لگا کر غار کے عقبی حصے کی طرف پہنچنا بہتر ثابت ہوگی۔

"دائیں طرف چلو..." میں نے قیدیوں کو حکم دیا۔

افضل خان نے گھوڑے کو نہایت آہستگی سے راستے سے دائیں طرف کے چھوٹے سے میدانی حصے پر چڑھایا... تو چند لمحوں کے بعد میرا گھوڑا بھی وہاں پہنچ گیا میں نے، انہیں سامنے کے نشیب میں اترنے کے لیے کہا اور خود اپنا گھوڑا بھی نشیب میں ڈال دیا۔

نشیب میں اترنے کے بعد کچھ ہموار جگہ مل گئی۔ یہ ایک برساتی ندی کا خشک پاٹ تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ خشک ندی اُس چٹان کے قریب ہی سے گزرتی ہو گی جس کے ایک غار میں کچھ لوگ الاؤ روشن کیے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔

میں سوچ رہا تھا کہ کہیں ملک نواز یا اس کے ساتھی تو اس غار میں شب بسری کے لیے نہیں رُک گئے؟

اس کا امکان قوی تھا۔

ملک نواز کی یاد آتے ہی میرے ذہن میں اَن گنت مناظر گھوم گئے۔ بے شمار کراہیں گونجنے لگیں اور سسکاریوں سے میرے کان جھنجھنا اٹھے۔ میری دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگیں۔ مجھے پارس قبیلہ یاد آ گیا تھا جس کا ایک ایک فرد ملک نواز اور اس کے گروہ کے ظلم و ستم کا نشانہ بن گیا تھا اور میں ان کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکا تھا۔

جس وقت میں مسجد ... تک پہنچا تھا، اس وقت تک وہ درندے چند ایک کے سوا ہر ایک کو ہلاک کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے اور جو باقی تھے انہیں ان لوگوں نے میرے سامنے قتل کر دیا تھا جس احاطے میں شادی کی دعوت کا اہتمام کیا گیا تھا، اس بستی میں اترنے والا واحد راستہ اس کے بالکل سامنے پڑتا تھا اس لیے میں وہاں جا کر ان کی تاک میں نہیں بیٹھ سکتا تھا... میری آنکھوں کو رونے کی اجازت نہیں تھی لیکن میں نے پارس قبیلے کی دُلہن پر جو ظلم و ستم ہوتے دیکھا تھا، اُس کی وجہ سے میری آنکھوں میں نمی پیدا ہو گئی تھی...

میں ان آنسوؤں کو فوراً ہی پی گیا تھا اور اب ان کے ایک ایک قطرے کا حساب چکانا چاہتا تھا۔

"اگر اس غار میں وہ پورا کا پورا گروہ موجود ہے!" میں نے سوچا "تو انہیں میرے ہاتھوں سے اب کوئی نہیں بچا سکتا۔"

پھر مجھے وہ چاندی کا ذخیرہ یاد آ گیا جس کے لیے پارس قبیلے کی دُلہن کو اذیت ناک سزا دے کر بالآخر ہلاک کر دیا گیا تھا۔

افضل خان اور منصور خان گھوڑے کی پشت پر بیٹھے تھے اور ان کا گھوڑا بے آواز چل رہا تھا۔

میرے گھوڑے کی ٹاپیں بھی نہیں ابھر رہی تھیں۔

غالباً گھوڑوں کو بھی خطرناک صورتِ حال کا احساس ہو گیا تھا اور وہ دبے قدموں چلنے لگے تھے۔ خشک ندی میں آگے بڑھتے ہوئے ہم بالآخر اس پہاڑ کی پشت پر پہنچ جانے میں کامیاب ہو گئے جس کے ایک غار میں الاؤ روشن تھا۔ یہ خشک ندی چٹانوں میں گھومتی ہوئی آگے تک چلی گئی تھی۔

میں نے اپنے قیدیوں کو رُکنے کا حکم دیا۔

میں نے اندازہ لگایا تھا کہ ہمیں اب کدھرسے اُوپر چڑھنا چاہیے۔ اس جانب سے پہاڑ کو پار کر کے بالآخر ہم ایک ایسی چٹان کی اوٹ میں جا پہنچے جہاں سے اس غار کے دہانے کو تو دیکھا جا سکتا تھا لیکن غار میں موجود لوگوں کی نگاہ ہم پہ نہیں پڑ سکتی تھی کیوں کہ اب اندھیرا مزید گہرا ہو گیا تھا۔

"اب تم دونوں گھوڑے سے اتر جاؤ۔" میں نے انہیں حکم دیا۔

وہ خاموشی سے اُتر گئے۔

"تم دونوں کے پاس چاقو موجود ہیں۔ انہیں نکال دو۔"

وہ چونک کر میری طرف گھوم گئے۔

"تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ ہمارے پاس شکاری چاقو بھی موجود ہیں؟" افضل خان کے لہجے میں شدید حیرت تھی۔

میں اُن کی پشت پہ تھا اور میرے ہاتھ میں رائفل دبی ہوئی تھی جس کا رُخ اِن دونوں کے سروں کی طرف تھا۔ میں نے ایک دھیما سا قہقہہ لگاتے ہوئے جواب دیا۔

"افضل خان... اس علاقے میں سفر کرنے والوں کو چاقو کی اسی طرح ضرورت رہتی ہے جیسے انسان کو زندہ رہنے کے لیے ہوا کی ضرورت ہوتی ہے۔"

"ہاں... لیکن تم نے..."

"میں نے ان چاقوؤں کو صرف اس لیے نہیں لیا تھا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کہ تم دونوں انہیں استعمال کرنے کی کوشش کرو گے تو مجھے تم سے نجات حاصل کرنے کا ایک معقول بہانہ مل جائے گا۔"

منصور خان کے ... سے ایک طویل سانس نکل گئی۔

"تمہارے پاس فرنگیوں جیسی ذہانت ہے۔" اس نے کہا۔ "تم کون ہو؟ خان اور کہاں کے رہنے والے ہو؟"

"ذہانت فرنگیوں کی میراث نہیں ہے۔" میں نے کرخت لہجے میں اس کی بات رَدّ کر دی۔

"تم نے بتایا نہیں کہ..."

میں نے اُسے خاموش رہنے کا حکم دیا اور خود اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑانے لگا۔ ابھی تک میں ان لوگوں کے گھوڑوں کو دیکھنے میں کامیاب نہیں ہوا تھا جو غار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ انسانوں سے زیادہ جانور آوازوں کے سلسلے میں حساس ہوتے ہیں۔

دفعتاً منصور نے اپنی جگہ سے کچھ حرکت کی لیکن میں غافل نہیں تھا۔ فوراً ہی رائفل کی نال اُس کی پسلیوں سے لگ گئی۔

"نہیں... تم کوئی حرکت نہیں کرو گے۔" میں نے دھیمے لیکن کرخت لہجے میں کہا۔

وہ ساکت ہو گیا۔

اس وقت ہم ایک ایسی جگہ کھڑے تھے، جہاں سے غار میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی آوازیں ہمارے کانوں تک پہنچ رہی تھیں... لیکن اب تک میں ان آوازوں سے کوئی مفہوم اخذ نہیں کر سکا تھا۔ میں حیران تھا کہ ان کی باتیں میری سمجھ میں کیوں نہیں آ رہی ہیں حالانکہ وہ جلتے ہوئے الاؤ کی دوسری جانب بیٹھے تھے۔

میں نے منصور اور افضل خان کو ایک بار پھر تنبیہ کی کہ وہ فرار ہونے کی کوشش میں اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے اس لیے بہتر ہو گا کہ وہ جہاں ہیں وہیں بے حس و حرکت کھڑے رہیں۔ تنبیہ کرتے وقت میں نے لہجے کو اس قدر سرد رکھا کہ اس بار میں نے منصور خان تک کو کانپتے دیکھ لیا تھا۔

میں آہستہ آہستہ ایک قریبی چٹان پر چڑھ گیا۔

اس دوران میں ایک لمحے کے لیے بھی میری نگاہ اِن دونوں سے نہیں ہٹی تھی۔ چٹان سے بھی میں انہیں بہ آسانی گولی کا نشانہ بنا سکتا تھا۔ میرے رویے سے وہ اندازہ لگا چکے تھے کہ میں ایسا کرتے وقت اس بات کی بھی پروا کرنے والا آدمی نہیں ہوں کہ غار میں بیٹھے ہوئے لوگ گولی کا دھماکا سُن

لیں گے... غالباً اسی سوچ نے انہیں فرار ہونے سے باز رکھا تھا۔

میں نے الاؤ کی طرف دیکھا۔

... اور پھر میں ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔

نیچے سے میں یہ دیکھنے میں ناکام رہا تھا کہ الاؤ جس دہانے سے نظر آ رہا ہے، درحقیقت اس کے دونوں طرف دو غاروں کے دہانے اور بھی موجود ہیں... اور یہ غار ہیں اندر جا کر غالباً ایک کمرے کی سی صورت اختیار کر گئی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ میں ان کی آوازیں سننے کے باوجود ان کا مفہوم سمجھنے سے قاصر رہا تھا۔ الفاظ کچھ عجیب سے بن کر میری سماعت تک پہنچ رہے تھے۔

اسی لمحے میری نگاہ ان کے گھوڑوں پہ پڑ گئی۔

وہ تعداد میں چار تھے۔

میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا اور یوں مجھے یہ پتہ چل گیا کہ ہر گھوڑے کی زین اس کی پشت سے غائب ہے۔ زین کے علاوہ بستر یا کوئی اور چیز بھی بار بار چمکنے والی بجلی کی روشنی میں وہاں دکھائی نہیں دی۔ گویا وہ رات بھر اسی غار میں قیام کرنے کے ارادے سے وہاں الاؤ بھڑکائے بیٹھے ہوئے تھے۔

"کتنی ٹھنڈک ہے۔" افضل خان نے دانتوں کو بجاتے ہوئے دھیمی آواز میں شکایت کی۔

میں نے ایک بار پھر تین دہانوں والے اس غار کا جائزہ لیا۔ ایک دہانے سے دھوئیں کا بادل سا نکلتا دکھائی دیا تو میں سمجھ گیا کہ اس غار کی ساخت قدرتی نہیں ہے بلکہ اسے کسی نے خاص طور سے اس انداز میں چٹانوں کو کاٹ کر بنایا ہے۔

میں نے اُس دہانے پہ نگاہ گاڑ دی جس میں الاؤ بھڑک رہا تھا۔ کچھ دیر بعد میں رقص کرتے ہوئے شعلوں میں سے یہ دیکھنے میں کامیاب ہو گیا کہ دو آدمی آگ کے قریب ہی بیٹھے ہیں۔ ان دونوں نے آتش پرستوں کی طرح ہتھیلیاں الاؤ کی طرف اُٹھا رکھی تھیں اور یوں وہ آگ سے حرارت وصول کر رہے تھے۔

"چلو... میرے قریب آ جاؤ۔" میں نے سرگوشی کی۔

وہ چٹان پر آ گئے۔

میں نے انہیں بائیں طرف کی ڈھلان سے نیچے اتارا

اور اُسی جانب واقع غار کے تیسرے دہانے کی طرف بڑھ گیا۔ اس دہانے سے دُھواں نکل رہا تھا اور دُھوئیں کی وجہ سے حدّت محسوس ہو رہی تھی۔ ہمارے لرزتے ہوئے جسموں کو کچھ حدّت ملی تو ہم نے سکون کی سانس لی لیکن یہاں زیادہ دیر تک کھڑے رہنا ممکن نہیں تھا کیوں کہ دُھواں آنکھوں اور ناک میں جلن پیدا کر رہا تھا۔

"یہاں کھڑے کھڑے تو ہمارا دم گھُٹ جائے گا۔" افضل خان نے بھرّائی ہوئی آواز میں شکایت کی۔

میں نے آگے بڑھ کر ریوالور نکال لیا اور رائفل کو کندھے پر لٹکا کر منصور کی طرف دیکھا جس کی آنکھوں میں مجھے خوف کی ایک نئی لہر کروٹیں بدلتی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ واقعی ایک ذہین آدمی تھا۔ غالباً یہ بات اس کی سمجھ میں آگئی تھی کہ میں کیا کرنے کا ارادہ کر رہا ہوں۔

"گھوم جاؤ۔" میں نے سفاک لہجے میں کہا۔

"ہم دوست ہیں۔۔۔" منصور خان نے ہانپ کر احتجاج کرنا چاہا لیکن میں نے ریوالور کی نال اس کے سینے پر رکھ دی اور یوں اس کا احتجاجی جملہ ادھورا ہی رہ گیا۔

میرے ہونٹوں پہ حریف کو جھنجھلاہٹ میں مبتلا کرنے والی مسکراہٹ طاری تھی اور میں اسے نیم وا آنکھوں سے گھور رہا تھا اس کے ساتھ ساتھ ٹریگر پہ میری انگلی کی گرفت بھی سخت ہوتی جا رہی تھی جسے اس نے چمکتی ہوئی بجلی سے پیدا ہونے والے روشن وقفے میں نمایاں طور پر دیکھ لیا تھا۔

اگلے ہی لمحے وہ گھوم کر کھڑا ہو گیا۔

میں نے دایاں ہاتھ بڑھایا اور اس کا نرخرہ میرے بازو کے نیچے دب گیا۔۔۔ پھر میں نے رائفل کو اپنے پیٹ اور اس کی پشت کے درمیان جا کر اس کے گلے پر کلائی جماتے ہوئے ہاتھ کی گرفت رائفل پر مضبوط کر لی۔

اب وہ اس گرفت میں میری مرضی کے بغیر کوئی حرکت نہیں کر سکتا تھا اور اس کا جسم میرے لیے بہترین ڈھال کا کام بھی دے سکتا تھا۔ میں نے مزید احتیاط کے طور پر ریوالور اُس کی بائیں پسلیوں پر رکھ کر ہاتھ کا دباؤ قدرے بڑھا دیا۔

"افضل خان۔" میں نے سنجیدگی سے بھرپور لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔

"اگر تمہارے حلق سے کوئی غیر ضروری آواز نکلی یا تم نے کوئی غلط حرکت کی تو وہ تمہارے دوست کے لیے مہلک ثابت ہوگی۔۔۔"

اس نے بے بسی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اب تم ہم دونوں سے آگے چلو گے۔" میں نے افضل خان سے کہا۔ "اور اندر قدم رکھنے سے پہلے اپنے پھیپھڑوں کو تازہ ہوا سے خوب بھر لو معلوم نہیں کتنی دیر تک دُھوئیں کی وجہ سے سانس لینے کی نوبت ہی نہ آسکے۔ سمجھ گئے؟"

اس نے تائید میں گردن ہلا دی۔

میں نے ایک طویل سانس لی اور منصور خان کو گرفت میں لیے افضل خان کے پیچھے دُھوئیں سے بھرے ہوئے غار میں داخل ہو گیا۔ اندر جاتے ہی یوں محسوس ہوا جیسے ہم سلیٹی رنگ کی کسی چادر کو چیرتے ہوئے آگے بڑھ رہے ہوں۔

"کئی ہزار روپے کی چاندی۔۔۔ دوستو۔۔۔" ایک آواز میری سماعت سے ٹکرائی اور میں نے محسوس کیا کہ اس آواز کو سُن کر افضل خان رُک گیا ہے۔

میں نے منصور پر گرفت مضبوط رکھتے ہوئے اُسے قدرے دھکیلا تو وہ افضل خان سے ٹکرایا۔۔۔ دھکا محسوس کرتے ہی وہ پھر چلنے لگا۔ غالباً چاندی کے بارے میں سُن کر وہ کچھ اُلجھن کا شکار ہو گیا تھا۔

اچانک اندر سے قہقہوں کی آوازیں سُنائی دیں۔

غار میں چار آدمیوں کے ان وحشیانہ قہقہوں کی وجہ سے اتنا خوفناک شور پیدا ہوا کہ میں نے اپنی گرفت میں منصور کو واضح طور پہ کانپتے محسوس کیا۔

میں نے اُسے ایک بار پھر دھکا دیا۔

وہ آگے چلتے ہوئے افضل خان سے جا ٹکرایا۔

افضل خان کی رفتار قدرے تیز ہو گئی۔ وہ احمق نجانے کیوں اس قدر سست رفتاری سے چل رہا تھا حالانکہ میں جانتا تھا کہ اب اُسے سانس لینے کی ضرورت شدت سے محسوس ہو رہی ہوگی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر اس احمق کو کھانسی آگئی تو اندر بیٹھے ملعون لوگوں کو ہماری موجودگی کا فوراً ہی پتہ چل جائے گا تب صورتِ حال میری سوچ سے مختلف ہو جانے کا خدشہ لاحق ہو جائے گا۔

اس چٹان کے اوپر سے گزرتے وقت میں نے چٹان کی لمبائی کا اندازہ لگایا تھا لیکن قدرے گھومتی ہوئی اس سُرنگ کی لمبائی میرے اندازے سے زیادہ نکلی جسے میں نے تیز رفتاری کی وجہ سے برابر کر لیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ملک نواز کس قدر خوش ہوگا۔۔۔" ایک اور آواز میرے کانوں تک پہنچی۔ "اور ہاشم خان تم تو بس اب شادی کی تیاری شروع کر دینا۔ دِل باز سے آخر کب تک چھپ چھپ کر ملتے رہو گے؟"

جواباً ایک قہقہہ سُنائی دیا۔

گرج دار قہقہہ تھا۔ غالباً ہاشم خان نے اپنے ساتھی کی بات کا یوں قہقہہ لگا کر جواب دیا تھا۔

ملک نواز کا نام اس غار میں سُن کر میرا ذہن تیزی سے کام کرنے لگا۔۔۔ پھر ان میں سے کسی نے چاندی کا بھی تذکرہ کیا تھا جس پہ میرے کان کھڑے ہو گئے۔

دُھوئیں کی چادر اب ہلکی ہو گئی تھی۔

آوازیں بھی صاف سُنائی دینے لگیں۔

میں ان چاروں کے چہرے بھی دیکھ سکتا تھا جو الاؤ کے قریب بیٹھے تھے۔ میں نے منصور کو آگے بڑھنے میں قدرے متذبذب پایا تو اس کے پہلو میں ریوالور کا دباؤ بڑھا دیا۔

افضل خان کے سانس لینے کی آواز سُنائی دی۔

وہ دُھوئیں کے حصار سے نکل گیا تھا اور ایک سُرنگ کے اس حصے میں کھڑا کھنکار رہا تھا جہاں دُھوئیں کے مرغولے نہیں پہنچ رہے تھے۔ اس کی کھنکارتی ہوئی سانسوں کی آواز سُن کر میں نے بھی سانس لی اور پھر میں نے منصور خان کو بھی ہانپتے ہوئے سُنا۔

میں نے غار کے اُس حصے کی طرف دیکھا جہاں مجھے کچھ دیر قبل دُھوئیں کی ہلکی سی تہہ سے چار چہرے دکھائی دیے تھے۔ اب میں ان سب کو صاف دیکھ رہا تھا۔ وہ تعداد میں چار ہی تھے ان میں سے دو بستروں پر اوندھے پڑے تھے جب کہ دو کو میں غار کے باہر سے الاؤ کے قریب آگ تاپتے دیکھ چکا تھا۔

اُسی لمحے مجھے ایک عجیب سا احساس ہُوا۔

میرے دونوں قیدیوں میں سے کوئی ایک ان لوگوں سے آشنا لگتا تھا شاید اسی لیے اُس کے حلق سے ایک دبی دبی سی آواز نکل گئی تھی۔۔۔ لیکن یہ آواز ان چاروں تک نہ پہنچ سکی کیوں کہ وہ کسی بات پہ ایک ساتھ ہنس پڑے تھے اور غار ان کے قہقہوں سے گونجنے لگا تھا۔ ان چاروں کے قریب ہی گھوڑے کی زین نظر آ رہی تھی۔۔۔ لیکن سب سے زیادہ دل چسپ چیز وہ بڑے بڑے تھیلے تھے جنہیں انہوں نے ایک دیوار سے لگا کر رکھ دیا تھا۔

"لیکن تم تو گل سے شادی کرنا چاہتے تھے۔" ایک کرخت آواز سُنائی دی اور مجھے یہ آواز سُن کر یوں محسوس ہُوا جیسے کسی نے میرے دل پہ براہِ راست ایک گھونسہ مار دیا ہو۔

"ہاں۔۔۔" وہ گلوگیر لہجے میں بڑبڑایا۔ "لیکن اس کا باپ شاید اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دینے پر آمادہ نہیں ہوگا۔"

میں سمجھ گیا کہ ان میں سے ایک گل کی چاہت میں مبتلا ہے اور ان باتوں سے یہ بھی اندازہ ہو گیا کہ ان لوگوں کو ابھی گل کی موت کا علم۔۔۔ پھر مجھے خود ہی اپنی اس احمقانہ سوچ پہ خفت محسوس ہونے لگی کیوں کہ ضروری نہیں تھا کہ وہ اُسی معصوم سی گل کے بارے میں باتیں کر رہے ہوں، جس کی اُدھڑی ہوئی لاش دیکھ کر مجھ جیسا غیر معمولی قوتِ برداشت کا آدمی بھی کانپ اُٹھا تھا اور میری آنکھیں بھی بھیگ گئی تھیں۔

میرے آنسوؤں پہ میری ماں ریشم جان کے قہر و غضب کا پہرہ تھا۔ ان آنسوؤں کو آنکھوں سے رُخساروں پر ڈھلکنے کی ہرگز اجازت نہیں تھی بلکہ میری تو پلکوں نے بھی کبھی آنسوؤں کا نمک نہیں چکھا ہوگا۔۔۔ لیکن گل کی لاش درندگی کا شاہکار تھی اور اُسے دیکھ کر میرے دل کا پانی آنکھوں میں تیرنے لگا تھا۔

"میرا خیال ہے تم گل کو اُٹھا لاؤ۔" ایک نے مشورہ دیا۔

"بہت بُری بات ہے۔" میں نے بلند آواز میں کہا۔

میری آواز سُنتے ہی غار میں لمحے بھر کے لیے سناٹا چھا گیا۔

اس ایک لمحے میں الاؤ کی جلتی ہوئی خشک لکڑیوں کے تڑخنے کی آوازیں ہی سُنائی دی تھیں۔۔۔ پھر اُن سب میں افراتفری مچ گئی۔

اُن میں سے تین نے اپنے اپنے ریوالور کی طرف ہاتھ بڑھائے جب کہ چوتھا اپنی رائفل کی طرف کود گیا۔ میں نے ایک جھٹکے سے منصور کو دُور پھینکا۔ اس دوران میں افضل خان نے خود کو زمین پر گرا دیا تھا۔ میرا ریوالور بھی شعلے اُگلنے لگا۔

ریوالور سے نکلنے والا دھماکا شدید تھا۔

غار میں دیر تک اس کی بازگشت گونجتی رہی۔

اُن چاروں میں سے ایک کی چیخ بھی گولی کے دھماکے کی بازگشت میں شامل ہو گئی۔ وہ اپنے سینے سے اُبلنے والے خون کے فوارے کو پھٹی پھٹی اور اُبلی اُبلی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا جیسے اُسے یقین نہ ہو رہا ہو کہ وہ کبھی اپنے خون کو اس انداز میں اُبلتے ہوئے بھی دیکھ سکتا ہے۔

دوسرا آدمی پھرتیلا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اُس نے ریوالور نکالنے میں کامیابی حاصل کرلی۔

وہ فائر کرنے میں بھی کامیاب ہوگیا لیکن اس معاملے میں اکثر عجلت بازی کارآمد ثابت نہیں ہوتی۔ میرے ریوالور کی ایک گولی اس کے اُٹھے ہوئے ہاتھ پر پڑی تھی اور اس کی دو انگلیاں کٹ کر ہتھیلی کی طرف جھولنے لگی تھیں۔

مارے تکلیف کے وہ بُری طرح چیخ پڑا۔

اس کی چیخ بڑی دلدوز تھی۔ اس نے خود کو اُچھالا اور یہاں بھی اس سے حماقت ہوگئی۔ وہ اُلٹ کر گرا تو اندازے کی غلطی اُسے سیدھی الاؤ میں لے گئی جہاں بھڑکتے ہوئے شعلوں نے لمحے بھر میں، اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

تیسرا آدمی ابھی تک اپنے ہولسٹر سے ریوالور نکالنے میں کامیاب نہیں ہوسکا تھا۔ وہ دیوانہ وار کوشش کر رہا تھا اور اس کی یہ حرکات رفتہ رفتہ خود ہی دم توڑ رہی تھیں کیوں کہ میرے ریوالور کی دو گولیاں اس کے پیٹ میں اُتر چکی تھیں اور وہ بُری طرح تڑپتے ہوئے بھی اپنا ریوالور نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔

چوتھے آدمی نے رائفل کی طرف چھلانگ لگائی تھی اور وہ ابھی رائفل سنبھال کر سیدھا ہی ہو رہا تھا کہ میرے ریوالور کی آخری گولی اپنا کام کرگئی۔ اس کے چہرے پر بیک وقت تین آنکھیں دکھائی دینے لگی تھیں۔

گولی اس کی پیشانی پر عین ناک کے اُوپر لگی تھی اور غالباً اس کی کھوپڑی کے عقبی حصے کو چاٹتی ہوئی نکل گئی تھی۔ وہ دھڑام سے گر گیا اور اس کے ہاتھ میں دبی ہوئی رائفل گرج اُٹھی۔

گولی شاید میرے قیدیوں میں سے کسی ایک کو لگ گئی تھی۔ اس کی چیخ اُبھری اور فوراً ہی معدوم ہوگئی۔ میں جھکی ہوئی حالت سے اُٹھا اور اس کے ساتھ ہی میں نے رائفل پھینک کر اپنی گردن کے عقب میں بندھی ہوئی میان سے خنجر نکال لیا...

لیکن دونوں قیدیوں میں سے کسی نے بھی مجھ پر حملہ آور ہونے کی کوشش نہیں کی حالانکہ اس وقت ہم تینوں، ہتھیاروں کے اعتبار سے ایک دوسرے کے ہم پلہ تھے۔ ان کے پاس شکاری چاقو تھے جب کہ ریوالور اور رائفل کی گولیاں ختم ہو جانے کے بعد میرے پاس صرف خنجر ہی باقی رہ گیا تھا۔

جو شخص الاؤ میں گرا تھا، اس کی حالت بے حد قابلِ رحم تھی۔ اس کی دل دوز چیخیں پر کسی بدرُوح کی کراہوں کا گمان ہوتا تھا۔ انسان کراہ رہا تھا اور جلتے ہوئے غار گونج رہا تھا۔

میں اپنے قیدیوں کی طرف متوجہ ہوگیا۔

افضل خان مُنہ کے بل لیٹا ہوا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ اپنی کھوپڑی پر کچھ اس طرح جمے ہوئے تھے جیسے وہ ان ہاتھوں کو کسی آہنی خود کی طرح استعمال کرنا چاہتا ہو۔ منصور خان البتہ میلے کچیلے کپڑوں کے ڈھیر کی طرح بے ترتیب نظر آرہا تھا۔ پہلی نظر میں تو یہی محسوس ہوا جیسے وہ کسی مڑی تڑی لاش ہو... لیکن بغور دیکھنے پر پتہ چلا کہ اس کا بایاں کندھا زخمی ہے۔

کندھے سے سُرخ سُرخ خون بہہ رہا تھا۔

گولی غالباً اس کے کندھے کو چھوتی ہوئی گزر گئی تھی۔

معاً مجھے غار کے دہانے پر ہلکی سی آہٹ سنائی دی۔

خنجر والے ہاتھ کی انگلیاں فوراً ہی دستے پر منجمد ہوگئیں اور میرا جسم کسی بھوکے تیندوے کی طرح، اپنے شکار پر جھپٹنے کے لیے تن گیا۔

... لیکن نووارد پر مجھے زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی۔ وہ اپنے ساتھیوں کو خون میں لت پت دیکھ کر سکتے کے عالم میں کھڑا کا کھڑا رہ گیا تھا... پھر اس کی نگاہ الاؤ میں گرے ہوئے شخص پر پڑی جس کی کراہیں تک دم توڑ چکی تھیں۔ اس کے کپڑے جل کر راکھ ہو چکے تھے اور اب گوشت جل رہا تھا۔ الاؤ کی دہکتی ہوئی اور لپکتی ہوئی زبانیں اس کی لاش کو تیزی سے چاٹ رہی تھیں۔

پھر وہ شخص میرے دونوں قیدیوں کی طرف متوجہ ہوگیا۔ افضل خان ابھی تک کھوپڑی کو دونوں ہاتھوں میں چھپائے اوندھا لیٹا ہوا تھا اور منصور خان کے بے ترتیب ہاتھ پیروں میں بھی کوئی قابلِ ذکر تبدیلی پیدا نہیں ہوئی تھی۔

"اُف میرے خدا!" آنے والا کانپ کر بولا۔ اس کے کندھے پر رائفل تھی جسے اُس نے فوراً ہی میرے سامنے پھینک دیا۔ "کیا ان سب لوگوں کو تم نے تنہا ہی ہلاک کیا ہے؟"

"نہیں..." میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"پھر...؟" اس نے حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھا۔

"انہیں ہلاک کرنے میں موت کے فرشتے نے میری مدد کی تھی۔"

نووارد نے میرے ہاتھ میں خنجر دیکھ کر رائفل پھینک دی تھی اس کا مطلب تھا کہ اُس نے خوب سوچ سمجھ کر ہی ایسا کیا تھا ورنہ کندھے سے رائفل اتار کر گولی چلانے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے۔ وہ آسانی سے ایسا کرسکتا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اُسے ناکامی ہوتی کیوں کہ ایک ہی لمحے میں خنجر میری انگلیوں کی گرفت سے نکل کر اُس کے نرخرے میں پیوست ہوگیا ہوتا۔

"تم نے انہیں کیوں قتل کیا ہے، خان؟"

"میں نہیں چاہتا کہ اس علاقے میں غداروں کی آبادی زیادہ ہو جائے اس لیے میں اکثر ایسے لوگوں کو ایک نظر دیکھتے ہی گولی مار دیا کرتا ہوں۔" میں نے لہجے کو بے حد سخت اور کھردرا رکھا۔

چند قدم آگے بڑھ کر میں نے اس شخص کی رائفل اٹھائی اور اس کی نال کا رُخ نووارد کی طرف کر دیا۔ غار میں بھڑکتے ہوئے الاؤ کی روشنی میں اس کا چہرہ یوں پسینے میں بھیگنے لگا جیسے خوف کی زیادتی سے اس نے پگھلنا شروع کر دیا ہو۔

"تک... کیا تم مجھے بھی قتل کر دو گے؟"

"اگر تم پسند کرو تو..."

اس کا چہرہ زرد پڑ گیا اور اس کے دونوں ہاتھوں میں نمایاں کپکپاہٹ نظر آنے لگی۔ میرے لہجے کی سفاکی نے غالباً اُسے آگاہ کر دیا تھا کہ عنقریب اس کی لاش بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہی پڑی ہوگی... لیکن میں اُسے فوری طور پر ہلاک کرنے سے زیادہ یہ معلوم کرنے میں دلچسپی رکھتا تھا کہ وہ یکایک نازل کہاں سے ہوا ہے؟ اگر وہ باہر پہرے پر تھا تو گولیوں کی آواز یقیناً اس کی سماعت تک پہنچی ہوں گی۔ ایسے میں وہ کبھی مُنہ اٹھائے اور رائفل کندھے سے لٹکائے، غار میں ہرگز داخل نہ ہوتا۔

"م... میں مرنا نہیں چاہتا۔" اس نے ہکلا کر کہا۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے پہلی بار اپنے ہونٹوں پر مُسکراہٹ پیدا کرتے ہوئے کہا۔ "اگر تمہیں زندہ رہنا پسند ہے تو میں تمہیں قتل نہیں کروں گا لیکن شرط یہ ہے کہ میرا سوال ختم ہوتے ہی تمہاری طرف سے جواب کا آغاز ہو جانا چاہیے۔"

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"کیا تم باہر پہرے پر تھے؟"

"نہیں... میں حوائجِ ضروریہ سے فراغت کے لیے یہاں سے نشیب میں اُتر گیا تھا اور پھر..."

"کیا تم نے گولیوں کے دھماکے نہیں سُنے تھے؟"

"باہر ہوا تیز ہے۔" اس نے فوراً ہی جواب دیا۔ "پھر کچھ بھی ہوا، اندر غار میں ہوا تھا اس لیے..."

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"گلزار... گلزار خان۔"

"ہاں تو گلزار خان!" میں نے لہجے کی سختی برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ "یہ چاندی کس کی ہے؟"

"یہ چاندی سردار پارس کی تھی جسے اس غار میں دفن کر دیا گیا تھا۔ ملک نواز اس ذخیرے کے سلسلے میں معلومات حاصل کرنے سردار پارس کے ڈیرے کی طرف گیا تھا تو ہاشم خان اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ بھٹکتا ہوا یہاں آپہنچا اور اچانک ہی غار میں کود کر اس کا جذبۂ تجسس اُبھرا۔ تھیلے ہمیں مل گئے لیکن رات زیادہ ہو جانے کے بعد ہم نے یہیں قیام کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔"

"سردار پارس کا کوئی ایسا رشتے دار بھی ہے جو قبیلے کے ساتھ نہ رہتا ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں... اس کا بڑا بھائی ہے۔"

"لیکن وہ شادی میں شرکت کرنے کے لیے کیوں نہیں گیا؟"

"اس لیے کہ وہ بیمار تھا اور اپنی بیٹی کے ساتھ تنہا رہتا ہے۔"

"یہ ہاشم خان کون تھا؟"

"ملک نواز کا اکلوتا بیٹا!" اس شخص نے جلدی سے جواب دیا۔ اب تک وہ میری ہر بات کا فوراً ہی جواب دیتا رہا تھا۔ گویا اس نے میری یہ بات پلّے باندھ لی تھی کہ میرا سوال ختم ہوتے ہی اس کا جواب شروع ہو جانا چاہیے...

ہاشم خان کا ملک نواز سے جو رشتہ میرے سامنے آیا، اس نے میرے جسم میں خوشی کی ایک لہر سی دوڑا دی۔ میں نے مقتول سردار پارس کے بھائی ولی خان کے بارے میں اس شخص سے پوچھا اور پھر اس کا پتہ معلوم کرکے چاندی کے ریلوں سے بھرے ہوئے تھیلے ولی خان تک پہنچانے کا ارادہ کرلیا۔

افضل خان نے دونوں ہاتھ زمین پر ٹیکے اور اپنے بھاری بھرکم جسم کو زمین سے اٹھا لیا... پھر اس نے منصور خان کو بھی اُٹھنے میں مدد دی اور دونوں پلکیں جھپکاتے ہوئے میری اور نووارد کی طرف دیکھنے لگے۔ میں نے گہری نگاہ سے منصور خان کا جائزہ لیا۔ اس کے زخمی کندھے سے خون بہہ کر بازو سے ہاتھ کی طرف سفر کرتے کرتے جم گیا تھا اور اس کی آنکھیں بے پناہ سُرخ نظر آرہی تھیں۔

"میں نے تم دونوں کے بارے میں جو اندازہ لگایا تھا، وہ درست ہی تھا، نا؟" میں نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ میرے لہجے میں نرمی تھی کیوں کہ ان دونوں نے اب تک کوئی شرارت نہیں کی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب ان دونوں کو آزاد کر دینا چاہیے۔ "تم جھگڑے فوجی ہو، نا؟" میں نے...

بلت مکمل کی۔
انہوں نے ایک ساتھ سرتائید میں ہلا دیے۔
" اور تمہاری گرفتاری پر فرنگی حکومت نے کتنا انعام مقرر کر رکھا ہے ؟" میں نے پوچھا۔
" پچھلے ہفتے تک شاید ایک سو روپے فی کس تھا۔" منصور خان نے ہونٹ کو دانتوں میں دباتے ہوئے کہا۔" لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اب تمہیں دو سو روپوں کی کوئی ضرورت نہیں ہوگی۔" یہ کہہ کر وہ غار کی دیوار کے قریب رکھے ہوئے ان دو تھیلوں کو دیکھنے لگا جن میں چاندی کے روپے بھرے ہوئے تھے۔
میں نے ایک طویل سانس لے کر رائفل والے ہاتھ کو لہرایا اور انہیں اشارہ کیا کہ وہ بھی نووارد کے قریب جا کر کھڑے ہو جائیں۔ انہوں نے فوراً ہی میرے حکم کی تعمیل کی۔
" کک ۔ ۔ کیا تم ہم تینوں کو بھی ۔ ۔ ۔ " افضل خان کی آواز کانپ گئی اور وہ جملہ مکمل نہ کر سکا۔
میں نے دونوں تھیلے اٹھا لیے اور پھر وہاں پڑی ایک چادر میں اپنی رائفل اور ریوالور کے علاوہ سارا اسلحہ ڈال کر ایک گٹھڑی سی بنالی۔ اس دوران میں، میں ان لوگوں کی طرف سے ذرا بھی بے خبر نہیں رہا تھا۔
" میں سوچ رہا ہوں کہ تم تینوں کو آزاد کر دوں۔" میں نے کہا۔" بلاوجہ کسی کو قتل کرنا میرا شیوہ نہیں ہے۔"
" لیکن خان ۔ ۔ ۔ " گلزار نے عجیب سے لہجے میں کہا۔
" کیا تمہیں میرے اس ارادے سے اختلاف ہے ؟"
" نن ۔ ۔ ۔ نہیں ۔ ۔ ۔ بالکل نہیں۔" وہ یکایک زرد پڑ گیا۔
" پھر کیا بات ہے ؟" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ مجھے حیرت تھی کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ اُسے جان کی اماں پاتے ہی وہاں سے نکل بھاگنے کی فکر ہونی چاہیے تھی۔
" میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ ملک نواز ایک بے حد خطرناک آدمی ہے اس کی فرنگیوں سے بھی سازباز ہے بلکہ علاقے کے لوگوں کو تو یہاں تک شبہ ہے کہ وہ فرنگیوں کو مقامی لوگوں کے بھیس میں اپنے ساتھ شریک کر چکا ہے۔"
" شاید وہ نہیں جانتا کہ فرنگیوں کے ساتھ اس قسم کی سازباز ایک ایسا جرم ہے جسے کوئی بھی غیرت مند پٹھان برداشت نہیں کر سکتا۔" میں نے خراتی ہوئی آواز میں کہا۔" لیکن میں تمہاری اس بات کا مطلب ابھی تک سمجھنے سے قاصر ہوں۔"
" میں اپنی جان بخشی کے احسان کا بدلہ چکا دوں گا۔" اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔" میں ملک نواز کو تمہارے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا لیکن ۔ ۔ ۔ " اس نے جملہ ادھورا ہی چھوڑ کر کن انکھیوں سے منصور خان اور افضل کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔
میرے حلق سے ایک بے ساختہ قہقہہ اُبل پڑا۔
وہ حیرت سے پلکیں جھپکانے لگا۔
" تم احمق ہو، گلزار خان۔" میں نے اسلحے کی گٹھڑی کو الاؤ میں پھینکتے ہوئے کہا۔" شاید تم اپنی جان بخشی اور رہائی کا مقصد نہیں سمجھ سکے ہو۔"
اس کی آنکھوں میں اس بار حیرت کا تاثر مزید گہرا ہو گیا تھا وہ یوں میری طرف دیکھنے لگا جیسے اُسے میری بات پر یقین نہ آ رہا ہو۔
" تمہیں آزاد کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ تم ملک نواز کو جا کر میرے بارے میں ضرور بتاؤ۔" میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔" اگر تم ایسا نہیں کر سکے تو تمہاری جان بخشی کا کوئی جواز نہیں

جاسوسی ڈائجسٹ کا مقبول سلسلہ

سرکش

محمود احمد مودی کے شہکار قلم سے

12 حصوں میں شائع ہو گیا ہے

قیمت فی حصہ =/50 روپے

مکمل سیٹ =/600 روپے

مکتبہ القریش سرکلر روڈ اردو بازار لاہور فون 7668958

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہو سکتا۔"
" اوہ ۔ ۔ ۔ میں معافی چاہتا ہوں، خان۔" اس نے پورے جسم سے کانپتے ہوئے کہا۔" میں اب تمہارا مقصد خوب اچھی طرح سے سمجھ چکا ہوں۔"
" اور جہاں تک ان دونوں کا تعلق ہے۔" میں نے دونوں جھونپڑے نوجوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔" انہوں نے جو قصور کیا تھا، اس کی انہیں کافی سزا مل گئی ہے اس لیے میں انہیں آزاد کر رہا ہوں۔"
افضل خان نے ایک طویل سانس لی۔
منصور خان کی آنکھوں میں البتہ کسی سانپ کی آنکھوں جیسی چمک پیدا ہو گئی تھی۔ اس کے بارے میں میرا اندازہ غلط نہیں تھا کینہ پروری اس کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی اور وہ آئندہ کسی بھی وقت میرے لیے ایک ایسا دشمن ثابت ہو سکتا تھا جس کی پیاس صرف خون ہی سے بجھا کرتی ہے۔
۔ ۔ ۔ لیکن میں مستقبل کی دشمنی کے خوف سے اس کی زندگی نہیں چھیننا چاہتا تھا۔ مجھے اپنی ذات پر اعتماد اور اپنے خدا پر مکمل ایمان تھا اس لیے ایسے لوگوں سے میں ہر وقت نمٹنے کی صلاحیت سے مالا مال تھا۔
" اور تم دونوں کان کھول کر سن لو۔" میں نے منصور خان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔" اگر تم میں سے کوئی بھی آئندہ میری راہ میں حائل ہوا تو میں اُسے ریت کی دیوار کی طرح ایک ہی ٹھوکر میں گرا دوں گا۔"
" تم بہت بہادر ہو دوست !" گلزار خان نے کہا۔" لیکن ملک نواز سے دشمنی مول لے کر تم نے خود کو ایک ایسی چلتی پھرتی لاش بنا لیا ہے جو کسی بھی لمحے گر سکتی ہے۔"
" یہ تم ملک نواز کی دھاک مجھ پر بٹھانے کے لیے کہہ رہے ہو یا مجھے تنبیہ کر رہے ہو ؟" اس بار میری آواز کسی سانپ کی پھنکار سے مشابہ تھی۔
" میں تمہیں ایک مخلصانہ مشورہ ۔ ۔ ۔ "
" بس ۔ ۔ ۔ " میں نے ہاتھ اُٹھا کر کہا۔
اُسی لمحے ان رائفلوں اور ریوالوروں میں بچی کھچی گولیوں کے دھماکے گونجنے لگے جنہیں میں نے ایک گٹھڑی بنا کر جلتے ہوئے الاؤ میں پھینک دیا تھا۔
میں نے اس طرف دیکھا جدھر سے اس غار میں داخل ہوا تھا۔ میں واپسی کے لیے بھی اسی راستے کو اختیار کرنا چاہتا تھا۔
چاندی کے روپوں کے تھیلے اُٹھا کر میں ریوالور ہاتھ میں تھامے اُدھر بڑھ گیا۔ اس ریوالور کو میں نے باتوں ہی باتوں میں دوبارہ بھر لیا تھا۔
چند قدم چل کر میں رُک گیا۔
میں نے پلٹ کر دیکھا۔
" پندرہ منٹ سے پہلے جس کسی نے بھی اس غار سے نکلنے کی کوشش کی، اس کی زندگی کی ضمانت واپس لے لی جائے گی۔" میں نے خونخوار لہجے میں کہا اور دھوئیں کے مرغولے میں داخل ہو کر ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔
میں تیزی سے غار کے دہانے کی طرف چلنے لگا۔
سانس رُکنے کی وجہ سے میرے نتھنوں میں دھوئیں سے کوئی تکلیف پیدا نہ ہوئی۔ میں عقب اور سامنے سے بھی ہوشیار تھا ۔ ۔ ۔ لیکن اب تک خفیف سی بھی آہٹ سنائی نہیں دی تھی۔ جب میں غار کے دہانے پر پہنچا تو دھوئیں کی وجہ سے میری آنکھوں میں پانی آ گیا تھا اور چند قطرے میرے رخساروں پر بھی ڈھلک گئے تھے۔
باہر آ کر میں نے خوب گہری گہری سانسیں لیں لیکن میں ایک لمحے سے زیادہ وہاں رُکا نہیں تھا۔ میں نے غار سے نکلتے ہی اس جانب دوڑ لگا دی تھی جہاں ہم آتے وقت گھوڑوں کو چھوڑ آئے تھے۔ اس دوران میں نے کئی بار غار کے اس حصے کی طرف بھی دیکھا تھا جہاں الاؤ کے شعلے رقص کر رہے تھے وہ تینوں ابھی تک وہیں تھے اور ان میں سے کسی نے بھی باہر آنے کی کوشش نہیں کی تھی۔
میں نے گھوڑے کی لگام تھام لی اور چاندی کے روپوں سے بھرے ہوئے دونوں تھیلے زین کے ساتھ باندھ کر گھوڑے کی پشت پر سوار ہو گیا۔
اگلے ہی لمحے میں تاریکی میں ایک طرف گھوڑا دوڑاتا ہوا وہاں سے دُور ہوتا چلا گیا۔

★★

شمال کی طرف سے چلنے والی ہوا کے جھونکے ایسی آوازیں پیدا کر رہے تھے جیسے کوئی بے چین رُوح دھیرے دھیرے سسک رہی ہو۔ میں تین دہانوں والے اس غار سے بہت دُور نکل آیا تھا اور تاریکی کے باوجود مجھے یقین تھا کہ دُور یا نزدیک کوئی اور متنفس موجود نہیں ہے۔
میرے پاس افغانی روپے تھے اتنی کثیر رقم اس سے

آپ نے بہت سے سفرنامے پڑھے ہوں گے۔۔۔۔۔۔۔
مگر ایسی لرزہ خیز کہانی آپ پہلی بار پڑھیں گے۔
جسے اردو کے صاحبِ طرز ادیب اور الفاظ کے جادوگر
قمراجنالوی نے اپنے مخصوص انداز میں تحریر کیا۔۔۔۔۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

پہلے کبھی میرے پاس نہیں آئی تھی۔ میں اسے پا کر بے حد خوش تھا لیکن یہ دولت میری نہیں تھی۔ یہ سردار پارس کی امانت تھی اور اس کا واحد حق دار اس کا بھائی ولی خان تھا۔ میں ان تھیلوں کو ولی خان تک پہنچا کر جلد از جلد خوارزم کی طرف روانہ ہو جانا چاہتا تھا۔

اس وقت میں جس علاقے میں تھا، اگرچہ یہ سرحد کا قبر علاقہ تھا لیکن یہاں تک فرنگیوں کے قدم پہنچ چکے تھے۔ اور آئے دن پٹھانوں اور فرنگی دستوں میں جھڑپیں ہوتی رہتی تھیں۔ سرما کے موسم میں فرنگی دستے اس علاقے میں دُور تک گھس آتے تھے کیونکہ انہی دنوں انہیں پیش قدمی کا موقع ملتا تھا جب مقامی لوگ برف باری کی وجہ سے یہاں سے نقلِ مکانی کر کے میدانی علاقوں کی طرف جانے پر مجبور ہو جاتے تھے۔

میں نے رات کا باقی ماندہ وقت سفر کرتے ہوئے گزارا اب تک کوئی ایسی آواز میرے کانوں تک نہیں پہنچی تھی جس پر میں کسی تشویش میں مبتلا ہوتا اس کے باوجود میں محتاط تھا رات بھر آسمان بادلوں سے گھرا رہا تھا اور بار بار بجلی چمکتی رہی تھی لیکن بوندا باندی نہیں ہوئی۔۔۔ پھر سپیدۂ سحر نمودار ہوا تو بادل بھی آسمان پر تیرتے ہوئے نہ جانے کس دلیس کی طرف نکل گئے اور چٹانیں سورج کی طلائی کرنوں سے جگمگا اٹھیں۔

میں نے سفر جاری رکھا۔ گھوڑا خاصا جان دار تھا اس لیے مجھے کوئی دشواری بھی پیش نہیں آ رہی تھی۔

رات بھر سرد ہواؤں میں سفر کرتے کرتے میں ٹھٹھر گیا تھا اس لیے دھوپ مجھے بے حد اچھی معلوم ہو رہی تھی۔ ابھی تک گھوڑا چٹانی علاقے ہی میں دوڑ رہا تھا اور سامنے مزید بلند پہاڑ تھے۔ ان پہاڑوں کے عقب میں میدانی علاقہ تھا اور میری منزلِ مقصود بھی وہیں تھی۔

میں سوچ رہا تھا کہ مجھے دھوپ تیز ہونے تک اس چٹانی علاقے سے نکل جانا چاہیے۔۔۔ پھر آخری درّے کو پار کرنے کے بعد میں رُک کر کافی دیر تک آرام کر سکتا تھا رات کو جتنی ٹھنڈک تھی، دن اتنا ہی گرم ہو جاتا تھا اس لیے میدانی علاقے میں دوپہر کے وقت سفر جاری رکھنے میں دشواری ہو سکتی تھی۔

اچانک ایک تنگ سی گھاٹی میرے سامنے آ گئی۔
گھوڑے کی رفتار خود بخود ہی کم ہو گئی۔
میں نے ادھر اُدھر دیکھا اور گھوڑے کو گھاٹی میں ڈال دیا۔ گھوڑے کی ٹاپوں سے چٹانیں گونج اٹھیں۔۔۔ میں نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

محسوس کیا کہ اس گھاٹی سے گزرتے وقت ٹاپوں کی آواز غیر معمولی حد تک بلند ہو گئی ہے۔ اس اعتبار سے یہ ایک خطرناک گھاٹی تھی ایسے میں اگر کوئی کسی کا تعاقب کر رہا ہو تو اس کے گھوڑے کی ٹاپوں کو شناخت کرنا ممکن نہیں تھا۔

رات بھر آسمانی بجلی کی چمک میں، میں گھوڑے کو ہر ممکن تیزی سے دوڑاتا رہا تھا اور گرد و پیش کے علاوہ عقب سے بھی پوری طرح ہوشیار رہا تھا۔ میں نے کوئی مشکوک سایہ تک نہیں دیکھا اس لیے مطمئن تھا کہ منصور خان اور اس کے ساتھی نے میرا تعاقب نہیں کیا۔

افضل خان ایک بزدل آدمی تھا جب کہ منصور کی فطرت میں خونخواری تھی مجھے توقع تو نہیں تھی کہ وہ میرا پیچھا کرنے کی کوشش کرے گا لیکن اس کی آنکھوں کی خوفناک چمک ابھی تک میرے ذہن میں تازہ تھی۔

۔۔۔ اور پھر اچانک ہی میرا ہاتھ اپنے ہولسٹر کی طرف لپک پڑا۔ ایک دھماکا سُنائی دیا تھا گولی سنسناتی ہوئی میرے کان کے قریب سے گزر گئی۔ گھوڑا زور سے ہنہنایا اور عقبی ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا۔

میں نے باگیں کھینچ لیں اور خود کو گھاٹی کے تنگ سے میدانی حصے میں گرا دیا۔

گھوڑا تیزی سے آگے دوڑنے لگا۔

بدکا ہوا گھوڑا لیکن بھی قابو میں نہیں آتا اور اپنے رستے میں آنے والی ہر شے کو روندتا ہوا گزر جاتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جب چٹان سے اس گھاٹی میں کُود کر اس جسیم شخص نے گھوڑے کو روکنے کی کوشش کی تو درحقیقت اس نے اپنی زندگی ہی داؤ پر لگا دی تھی۔

اس کے ہاتھ میں ایک رائفل دبی ہوئی تھی۔ اس نے گھوڑے کی طرف رُخ کر کے فائر کر دیا۔

گھوڑا ایک لمحے کے لیے ٹھٹکا اور زور سے ہنہنایا۔ اس کے ہنہنانے سے چٹانوں میں عجیب سا شور پیدا ہو گیا تھا۔۔۔ پھر اگلے ہی لمحے وہ دوبارہ بھاگ اٹھا۔ اس بار گھوڑے کی رفتار طوفانی تھی۔ وہ گولی سے محفوظ رہا تھا۔

میں نے چٹان سے گھاٹی میں کُودنے والے کی صرف ایک ہی جھلک دیکھی تھی۔ وہ افضل خان کے علاوہ کوئی اور نہیں تھا اُسے یوں اچانک ہی یہاں دیکھ کر میں حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ مجھ سے پہلے ہی کسی ایک ایسی جگہ پہنچ جائے گا۔

گھوڑے کی طرف رائفل اٹھا کر اس نے جو فائر کیا تھا، اس سے گھوڑا ٹھٹکا ضرور تھا لیکن وہ افضل خان کے منصوبے کے مطابق پلٹ کر نہیں دوڑا تھا۔ اگر ایسا ہو جاتا تو میرے لیے بڑی دشواری پیدا ہو جاتی کیوں کہ میں میدانی جگہ گرا تھا اور گھوڑا مجھے روند بھی سکتا تھا۔

۔۔۔ لیکن گھوڑا مسلسل آگے ہی بڑھتا رہا جس کی وجہ سے خود افضل خان کو اپنی جان کے لالے پڑ گئے تھے۔ میں اس کی طرف سے بے نیاز ہو گیا اور میری نگاہیں اُس کے ساتھی منصور خان کو تلاش کرنے لگیں۔

منصور خان کے بغیر وہ اس طرح کا حملہ کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔۔۔ اور پھر میرا اندازہ درست ہی نکلا۔ منصور خان عقب میں تھا اس نے قریبی چٹان سے مجھ پر چھلانگ لگائی تو میں اس اچانک حملے کے لیے تیار نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ٹریگر دب گیا اور گولی بھی چلی لیکن منصور خان کو کوئی نقصان پہنچائے بغیر فضا میں نہ جانے کہاں گم ہو گئی۔

اس کے دائیں ہاتھ میں شکاری چاقو دبا ہوا تھا۔
مجھ پر چھلانگ لگاتے وقت اس نے چاقو کا وار کیا اور دوسرا ہاتھ میرے ریوالور والے ہاتھ پر مارا جس سے ریوالور نکل گیا کیوں کہ میں نے پوری توجہ اس کے شکاری چاقو پر مرکوز کر دی تھی۔ چاقو والا ہاتھ تیزی سے میرے سینے کی طرف آیا لیکن اس ہاتھ پر نیچے سے میرے بائیں ہاتھ کی چوٹ لگی تو وہ قدرے بلند ہوا اور میں نے فوراً بائیں طرف سر جھکا لیا۔ اس کا چاقو والا ہاتھ میرے کندھے کے اُوپر سے عقب میں نکل گیا اور پھر میں نے اسے دوسرے ہاتھ سے اٹھا کر دور پھینک دیا۔

وہ کندھے کے بل پتھریلی زمین پر جا گرا۔
اس کے حلق سے ایک طویل کراہ نکل گئی۔
مجھ پر دیوانگی سی طاری ہو گئی تھی۔

اُدھر افضل خان گھوڑے سے ٹکرا کر گرا تھا اور گھوڑا اُسے روندتا ہوا نکل جانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ میں نے اس نامراد شخص کو گٹھری کی طرح گھاٹی کے راستے میں پڑے دیکھا اور پھر منصور خان کو گھورنے لگا۔

وہ غالباً اُسی کندھے کے بل گرا تھا جس پر غار میں زخم آیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اٹھنے میں تیزی نہ دکھا سکا اور میں اپنا ریوالور نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔

میں نے ایک بار پھر افضل خان کی طرف دیکھا۔

رائفل اس کے قریب ہی پڑی تھی لیکن وہ خود بے حس و بے حرکت پڑا تھا جیسے گھوڑے کی ٹاپوں نے اس کی آخری سانس تک روند ڈالی ہو۔

ریوالور ہاتھ میں لیتے ہی میں نے بے قرار نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ میں متوقع رہا تھا کہ شاید گلزار خان بھی ان کے ساتھ چلا آیا ہو . . . لیکن جہاں تک نگاہ کام کر سکتی تھی، وہاں تک کوئی انسانی سایہ نظر نہیں آ رہا تھا۔

گھوڑا دوڑتا ہوا کھائی سے نکل گیا۔

وہ اب میری نگاہوں سے اوجھل ہو چکا تھا۔

میں نے ایک طویل سانس لی، نہ جانے وہ دوڑتا ہوا کہاں نکل جائے۔ اس کی زین سے وہ دونوں تھیلے بھی بندھے ہوئے تھے جن میں چاندی کے روپے تھے۔

منصور خان اٹھ کھڑا ہوا۔

چاقو اب بھی اس کے ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔

اس کی سانسیں بے ترتیب تھیں اور وہ بری طرح ہانپ رہا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں دیوانگی کی جھلک تھی۔ وہ زندگی داؤ پر لگانے آیا تھا لیکن میری زندگی داؤ پر لگنے سے بال بال بچ گئی تھی۔ میں ایک ہی گولی سے اس کا کام تمام کر سکتا تھا لیکن میں نے چاقو کے مقابلے میں ریوالور کو استعمال کرنا مردانگی کے خلاف تصور کرتے ہوئے ریوالور کو ہولسٹر میں رکھ لیا اور ردن کے نیچے، ریڑھ کی ہڈی سے مس کرتی ہوئی میان سے خنجر نکال لیا۔

جیسے ہی میں نے ریوالور ہولسٹر میں رکھا، اس کی آنکھوں کی چمک میں اضافہ ہو گیا اور اس کے دانت نکل پڑے۔ وہ چاقو ہاتھ میں دبائے آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔

"تمہیں گلزار خان کو بھی ساتھ لانا چاہیے تھا۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"وہ ملک نواز کے پاس گیا ہے اور جلد ہی تمہاری لاش سے ملاقات کے لیے یہاں آ جائے گا۔" منصور خان نے دانت چباتے ہوئے کہا۔

میں اس کی طرف سے ہوشیار تھا اور میری نگاہ افضل خان کی طرف بھی تھی۔ وہ اب بھی کسی ڈھیر کی طرح پڑا نظر آ رہا تھا۔ شاید گھوڑے نے اسی سے ٹکراتے وقت اس کی ہڈیاں توڑ ڈالی تھیں۔

منصور خان مجھ سے دو قدم کے فاصلے پر رک گیا۔ اس کا دہانہ نوکیلے دانتوں کی نمائش کر رہا تھا اور اس کے نقش و نگار میں وحشت سی تھی۔ اس کا زخمی کندھا ایک بار پھر خون بہانے لگا تھا اور اس نے چاقو والے ہاتھ کو اس انداز میں لہرانا شروع کر دیا تھا کہ میں اس کے زخمی کندھے پر وار کرنے میں کامیاب نہ ہو سکوں۔

اس کا انداز جارحانہ تھا لیکن جلد بازی کے باوجود اس میں مہارت تھی۔ وہ شکاری چاقو کے استعمال سے بخوبی واقف تھا۔ اس نے میرے گرد گھومنا شروع کر دیا تو میرے پاؤں بھی دائرے میں حرکت کرنے لگے۔

ہم دونوں، ایسے درندوں کی طرح دائرے میں گھوم رہے تھے جو ایک دوسرے پر حملہ کرنے کے لیے موقعے کی تاک میں ہوں۔ اس کے حلق سے دھیمی دھیمی غراہٹیں نکل رہی تھیں۔

میں نے کن انکھیوں سے افضل خان کی طرف دیکھا۔ اس کے جسم کا ڈھیر اب متحرک ہو گیا تھا۔ میں اس کی طرف سے غافل نہیں رہنا چاہتا تھا اس لیے ضروری ہو گیا کہ منصور خان کا قصہ جلد از جلد پاک کر دیا جائے۔

"میں نے ایک بار تمہاری زندگی بخش دی تھی۔" میں نے کہا۔ "لیکن معلوم ہوتا ہے، تمہیں لالچ اور انتقام نے اندھا کر دیا ہے۔ اندھے پن نے ہی تمہیں احمق بھی بنا دیا ہے ورنہ تم میرا پیچھا نہ کرتے۔"

اس نے جواباً شکاری چاقو کا وار کیا۔

نشانہ میرا نرخرہ تھا لیکن میں شکاری چاقو کی زد سے باہر ہو کر تیزی سے پلٹا اور پھر میرے خنجر والے ہاتھ نے نصف دائرے کے انداز میں حرکت کی۔

اس نے خود کو پھرتی سے بچا لیا۔

سرزمین نیپال کا سچا واقعہ
درندہ
یعقوب جمیل کے ہوشربا قلم سے
دو جلدوں میں
مکمل سیٹ =/300 روپے
مکتبہ القریش سرکلر روڈ اردو بازار لاہور
فون 7668958

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اگر اسے ایک لمحے کی بھی تاخیر ہو جاتی تو خنجر کی نوک اس کی ناک کا کچھ حصہ ضرور کاٹ ڈالتی۔ میں اس کی پھرتی کو سراہے بغیر نہ رہ سکا۔ وار بچاتے ہی اس نے دوسرا حملہ کیا۔ اس بار میں نے اس کے بازو کو اپنے پہلو سے عقب میں گزر جانے دیا اور اس کے ساتھ ہی میرے دوسرے ہاتھ نے اس کے زخمی کندھے کو تھام لیا۔

میری انگلیاں سخت ہو کر زخم میں دھنسنے لگیں اور اس کا چہرہ اپنی رنگت کھونے لگا۔ اس نے بازو کو جھٹکا مارا۔ ایک بازو تو چھوٹ گیا لیکن شکاری چاقو والا ہاتھ اب بھی میرے بازو اور پسلیوں کے درمیان پھنسا ہوا تھا۔

اس سے پہلے کہ میں فیصلہ کن وار کر کے اس کا گلا کاٹ ڈالتا اس نے ایک بار پھر مہارت اور پھرتی دکھاتے ہوئے خود کو زمین پر گرا دیا۔ میں لڑکھڑا گیا۔

یہ لمحوں کا کھیل تھا۔

میں نے لڑکھڑاتے ہوئے اپنے اور منصور خان کے درمیان چند قدم کا فاصلہ پیدا کیا اور اسی لمحے میرا ریوالور ہولسٹر سے نکل کر میرے دائیں ہاتھ میں آ گیا جب کہ خنجر بائیں ہاتھ میں منتقل ہو گیا۔ میں نے افضل خان کی طرف ایک ہی جھلک دیکھی تھی۔

اس نے اپنی حالت پر قابو پا کر رائفل کی طرف چھلانگ لگائی تھی لیکن اسے لے کر کھڑا ہونے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ کھائی کی محدود سی فضا میرے ریوالور کے گرج دار دھماکے سے گونج اٹھی اور وہ رائفل ہاتھ میں دبوچے منہ کے بل گر گیا۔

میرے ریوالور سے نکلی ہوئی گولی اس کی کھوپڑی پر پڑی تھی اور اسے ٹھیکروں میں تبدیل کرتی ہوئی نکل گئی تھی۔ میں پھرتی سے پلٹا اور منصور خان کی طرف متوجہ ہوا۔

وہ ٹھٹھک گیا۔

ریوالور میرے ہاتھ میں دیکھ کر اس کے چہرے کی رنگت ایک بار پھر سفید ہونے لگی لیکن نقش و نگار کی کرختگی اور سفاکی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

"بہتر ہوتا کہ تم اس زندگی کی قدر کرتے۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "لیکن معلوم ہوتا ہے کہ تم ایک ایسے جواری ہو جو بالآخر اپنی زندگی ہی داؤ پر لگا دیتا ہے۔"

"زندگی تو تمہاری بھی داؤ پر لگی ہوئی ہے۔" اس نے لہجے میں کہا جو سراسر غیر انسانی تھا۔ "لیکن شاید قسمت اب بھی تم پر مہربان ہے۔"

"قسمت مجھ پر ہمیشہ مہربان رہتی ہے۔" میں نے ریوالور کو دائیں ہاتھ میں گھماتے ہوئے کہا۔ "کیوں کہ میں قسمت کو خود پر مہربان رکھنے کے لیے اس کے تمام تقاضے پورے کرتا ہوں۔"

اس نے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا لیا۔

میں نے افضل خان کی طرف دیکھا۔

گولی لگنے کے بعد وہ جس حالت میں گرا تھا، اب بھی وہ اسی طرح پڑا نظر آ رہا تھا۔

"اگر تم اس ریوالور کو اپنی خوش قسمتی کا باعث سمجھ رہے ہو تو یہ تمہاری بھول ہے۔ یہ دور سے موت کا شعلہ تو بن سکتا ہے لیکن کسی کی خوش قسمتی میں اضافہ نہیں کر سکتا۔"

میں ہنس پڑا۔

"تم احمق ہو، منصور خان، تمہیں جاں بخشی کے بعد اپنی بیوی اور بچوں کے پاس واپس چلے جانا چاہیے تھا۔" میں نے کہا۔ میرے ذہن میں افضل خان کا وہ جملہ گھوم گیا جو گزشتہ شب اس نے منصور خان کے بارے میں کہا تھا۔

"میں خالی ہاتھ ان کے پاس کبھی نہیں جاتا۔"

"کیا مطلب؟" میں چونک پڑا۔

"تم تنہا وہ چاندی کے روپے ہڑپ نہیں کر سکتے۔"

"اوہ . . . تو تم اس دولت کے پیچھے آئے ہو۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ "میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ شاید انتقام کی حرارت نے بے چین کر کے تمہیں میرے تعاقب پر مجبور کیا ہو گا۔"

وہ مجھے نفرت سے گھورتا رہا۔

اس نے ایک قدم بھی آگے بڑھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ بار بار اس کی نگاہ میرے ریوالور والے ہاتھ کی طرف جھک جاتی تھی۔

"تم قابلِ معافی نہیں ہو، منصور خان۔" میں نے ذہنی طور پر فیصلے پر پہنچتے ہوئے کہا۔ "افضل خان ایک احمق آدمی تھا۔ اس کی موت کی ذمے داری بھی تم پر عائد ہوتی ہے . . . اس لیے میں اس بار تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

"اگر میرے ہاتھ میں ریوالور ہوتا تو شاید اس وقت میں بھی بڑے فخر سے یہی بات کہتا۔"

"زیادہ طنز کرنے کی ضرورت نہیں۔" میں نے زہر آلود لہجے میں کہا۔ "ابھی ابھی تم نے جو بات کہی ہے، اس کے تحت تم نے اپنی پسند کی موت کا اعلان کیا ہے . . . اور میں تمہاری آخری خواہش ضرور پوری کروں گا۔" میں نے ریوالور کو دوبارہ

ہولسٹر میں رکھ لیا۔

وہ کسی زخمی تیندوے کی طرح اُچھل پڑا۔

تکاری چاقو کا پھل، سورج کی کرن میں منعکس ہونے کے باعث چمک اُٹھا۔ وہ کسی دیوپیکر پرندے کی طرح اُڑتا ہوا میری طرف آیا تھا۔ میں نے غوطہ لگایا اور اس کی ٹانگوں کے نیچے سے نکل گیا اور جب میں پلٹا تو وہ منہ کے بل زمین پر پڑا تھا۔

میرے پلٹتے ہی اس نے دُوسری زقند لگائی۔

اس بار بھی میں جُھکائی دے کر نکل گیا اور اس کے ساتھ ہی میرا خنجر والا ہاتھ اپنا کام کر گیا۔ فوری طور پر میں نے دوسرے ہاتھ سے اس کی کلائی تھام لی تھی۔ میرا خنجر اس کے پیٹ پر پڑا تھا اور اس کی تیز دھار نے پیٹ کی کھال کریں کاٹ دی تھی جیسے وہ موم کی بنی ہُوئی ہو۔

منصور خان کے حلق سے ایک دلدوز چیخ نکل گئی۔

میں نے اس کی کلائی کو مروڑ کر جھٹکا دیا۔

وہ منہ کے بل گر گیا۔

اگلے ہی لمحے میں اس کی پشت پر سوار ہو چکا تھا۔ وہ میرے نیچے تڑپا۔ اس نے جھٹکا مار کر مجھے گرانے کی کوشش کی تھی لیکن میرا خنجر اس کی گدی کی طرف سفر طے کر چکا تھا خنجر کی دھار تلے اس کی گردن کٹی تو دھار کی گزرگاہ خون کی ایک بہتی ہوئی ندی بن گئی۔

میں نے گھٹنوں کا زور لگا کر اُسے مزید جدوجہد کے سلسلے میں ناکارہ کر دیا۔ میرا ایک ہاتھ اس کے بالوں کی طرف بڑھا اور پھر میں نے اُسے بالوں سے پکڑ کر ایک زوردار جھٹکا دیا

خنجر کا دوسرا وار مہلک تھا۔

میں اُسے چھوڑ کر ہٹ گیا۔

قریب کی چٹان سے ٹیک لگا کر میں اس کے تڑپنے کا منظر دیکھتا رہا۔ اپنے کسی جانی دُشمن کو یوں تڑپتے ہوئے دیکھ کر لطف اندوز ہونا ہر فاتح کا حق ہوتا ہے لیکن مجھے دُکھ ہو رہا تھا کیوں کہ افضل خان کی آواز اَب بھی میرے ذہن میں گونج رہی تھی کہ یہ ایک بچوں والا آدمی ہے۔

اس کی گردن سے نکلنے والا خون اسی انداز میں اُبل پڑا تھا جیسے کسی ذبح کیے ہوئے بکرے کی شہ رگ کٹنے کے بعد بہنے لگتا ہے۔ اس کے دائیں ہاتھ میں اب تشنج کی سی کیفیت پیدا ہو گئی تھی اور اس کی اُنگلیاں پتھریلی زمین پر گرفت ڈالنے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں۔

شعلے کا سوامی
مصنف طارق اسمٰعیل ساگر
خوبصورت سرورق
دیدہ زیب پرنٹنگ و طباعت
قیمت =/150 روپے
مکتبہ القریش
سرکلر روڈ اردو بازار لاہور
فون 7668958

. . . پھر وہ ساکت ہو گیا۔

میں نے ٹھوکر مار کر اس کی لاش کو سیدھا کیا۔ اُس کی آنکھیں اب بھی کُھلی تھیں اور ان میں نفرت کے تاثرات منجمد ہو کر رہ گئے تھے۔ اس کا مُنہ بھی کُھلا ہُوا تھا۔ غالباً آخری بار اس نے سانس لینے کی کوشش کی تھی لیکن اس کے مقدر کی آخری سانس اپنا فرض پورا کر کے اُسے پہلے ہی الوداع کہہ چکی تھی۔

میری نگاہ افضل خان کی طرف اُٹھ گئی۔

اس احمق کی موت کا بھی مجھے دُکھ تھا۔

یہ دونوں بلاوجہ ہی میرے ہاتھوں مارے گئے تھے...

لیکن بلاوجہ نہیں بلکہ ان کی موت میرے ہاتھوں ہی واقع ہونا تھی۔ میں نے جُھک کر اس کی تلاشی لینی شروع کر دی۔

. . . اور پھر زندگی میں پہلی بار مجھے شدید جھٹکا لگا۔

لمحے بھر کے لیے تو مجھے یوں محسوس ہُوا جیسے زمین ہی گھوم گیا ہو۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا اُتر آیا تھا... بالکل ویسا ہی اندھیرا جو کھوپڑی شکن چوٹ لگنے کے بعد انسان کی آنکھوں کے سامنے چھا جاتا ہے۔

میں منصور خان کی جیب سے برآمد ہونے والی اشیا کو بے یقینی سے گھورتا رہا۔ اس کے پاس سے وہ ساری ہی چیزیں برآمد ہُوئی تھیں۔ جنہیں گل کے جلتے ہوئے جھونپڑے کے قریب مجھ پر حملہ کرنے کے بعد کسی نے اُڑا لیا تھا۔

میں نے اس صداقت نامے کو اُنگلیوں میں تھام لیا جو مجھے چوکی کے افسر نے دیا تھا۔ میں مُسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اگر یہ صداقت نامہ منصور خان کی بجائے کسی اور کے پاس ہوتا تو وہ اَب تک یقیناً اسے استعمال کرنے کے لیے پشاور چھاؤنی پہنچ چکا ہوتا۔ منصور خان یا افضل خان دونوں ہی اس صداقت نامے کو استعمال نہیں کر سکتے تھے کیوں کہ وہ تو خود فرنگیوں کو مطلوب تھے۔ وہ بھگوڑے فوجی تھے اور ان کی گرفتاری کے لیے فی کس سو روپے انعام مقرر ہو چکا تھا۔

غالباً رات کی تاریکی میں منصور خان مجھے اچھی طرح نہیں دیکھ سکا ہوگا اسی لیے اُس نے دوسری بار بھی مجھ پر حملہ کر دیا۔ ورنہ ایک ہی شخص کو دوبارہ لُوٹنے کا خیال کسی کے ذہن میں نہیں آتا ہے۔ میری جیبیں صاف کرنے کے بعد اُسے یقین ہو گیا ہوگا کہ اب میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے. . . لیکن اس کے باوجود دوسری بار افضل خان کے ساتھ مل کر مجھ پر حملہ کیا تھا اور مجھے بے بس کرنے کی کوشش کی تھی۔

. . . لیکن ان سب باتوں سے زیادہ خوف ناک بات یہ تھی کہ منصور خان ہی وہ شخص تھا جس نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے گل کے بوڑھے باپ کو ٹھکانے لگایا تھا اور گل کی بے حُرمتی کی تھی۔

میری مُٹھیاں بھینچ گئیں۔

"کاش! میں نے تمھیں ہلاک نہ کر دیا ہوتا۔" میں نے اس کی لاش کو گھورتے ہُوئے دیوانگی سے کہا۔ "اگر یہ حقیقت معلوم ہونے تک زندہ ہوتے تو تمھاری موت اتنی آسان نہ ہوتی۔ میں تمھیں سسکا سسکا کر رکھتا اور زندگی تمھارے لیے موت سے بھی بدتر ہو جاتی۔" میں نے اس کی لاش کو ٹھوکر ماری۔

ایک بار پھر میرے سامنے گل کا ہیولا آ گیا۔

"میں تم سے نادم ہُوں، میری بہن!" میں نے زیرلب کہا۔ "اگر مجھے معلوم ہوتا کہ منصور خان ہی تمھاری بربادی کا باعث ہے تو میں اسے عبرت ناک انداز میں زندہ رکھتا . . . اور یہ زندگی ایسی ہوتی کہ موت بھی اس کے قریب آنے سے کانپ جاتی . . . افسوس! یہ مر کر ہر بات سے آزاد ہو گیا ہے۔"

میں نے صداقت نامہ اپنی جیب میں رکھا اور افضل خان کی طرف بڑھ گیا۔ اس کی لاش بے ہنگم انداز میں پڑی تھی۔ میں نے پاؤں کے ٹھوکر سے اُسے سیدھا کیا۔

گھوڑا اُسے واقعی روندتا ہُوا گزرا تھا۔ اس کی پیشانی پر ایک گہرا زخم تھا۔ اس کی کئی پسلیاں ٹوٹ گئی تھیں۔ اس کے باوجود اُس نے رائفل کی طرف جست لگائی تھی اور پھر میری گولی کا نشانہ بن گیا تھا۔

میں نے ایک طویل سانس لی۔

گل اور اس کے بوڑھے باپ کو منصور خان اور اس کے ساتھیوں ہی نے ہلاک کیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اُس رات جن لوگوں نے مجھ پر حملہ کیا تھا، وہ سارے کے سارے بھگوڑے فوجی ہی تھے۔ ورنہ کسی مقامی شخص سے اپنے ہی علاقے کی کسی دوشیزہ کے ساتھ ایسی درندگی سے پیش آنا قابلِ فہم نہیں تھا۔ ملک نواز نے سردار پاریس کی بیٹی کے ساتھ ایسا ہی کیا تھا لیکن وہاں چاندی کا ایک بڑا خزانہ بُنیاد تھا۔ بیچاری گل اور اس کے بوڑھے باپ کے پاس کیا رکھا تھا؟

میں نے افضل خان کی گری ہُوئی رائفل اُٹھا لی۔

رائفل کا جائزہ لینے کے بعد صورتِ حال میری سمجھ میں آ گئی۔ یہ وہی رائفل تھی جسے میں نے باقی اسلحے کی ساتھ الاؤ میں پھینک دیا تھا۔ انھوں نے میرے وہاں سے نکلتے ہی رائفل الاؤ سے نکال لی ہوگی اور غالباً ہی سے انہیں چند گولیاں بھی مل گئی ہوں گی۔ مجھے چاہیے تھا کہ وہاں سے چلتے وقت گھوڑوں کی زینیں اور دوسری اشیا بھی جلا دیتا اور لاشوں کی خاص طور سے تلاشی لیتا۔ رائفل انہوں نے فوراً ہی نکال لی ہوگی، ورنہ بھڑکتے ہُوئے الاؤ میں زیادہ دیر تک پڑی رہنے کے بعد اسے استعمال کرنا ممکن نہ رہتا۔

رائفل کا کندا ایک طرف سے جلا ہُوا تھا اور اس کے آہنی حصے پر بھی جلنے کے نشانات موجود تھے لیکن رائفل بہرحال قابلِ استعمال تھی اور اسے اچھے انداز میں استعمال کیا گیا تھا۔

اب مجھے ان دونوں کی موت کا کوئی افسوس نہیں تھا۔

ان دونوں کو بہرحال میرے ہاتھوں عبرت ناک انجام کو پہنچنا ہی تھا۔ میں نے افضل خان کی بھی تلاشی لی لیکن اس کی جیبوں سے کوئی قابلِ ذکر شے برآمد نہ ہُوئی۔ اس احمق کو منصور خان بھلا دیتا بھی کیا ہوگا؟ وہ تو ایک قربانی کا بکرا تھا جو بالآخر منصور خان کی خاطر ہلاکت میں پڑ گیا . . .

میں نے قریبی چٹان پر چڑھ کر اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ مجھے اپنے گھوڑے کی تلاش تھی لیکن وہ دُور دُور تک کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ بدکا ہُوا گھوڑا بعض اوقات دوڑتا ہُوا میلوں دُور نکل جاتا ہے۔ اُسی لمحے میری نگاہ دو گھوڑوں پر پڑی۔

گھوڑے نشیب میں ایک درخت سے بندھے ہوئے تھے
اس چٹان پر کھڑے کھڑے مجھے ایک راستہ دکھائی دیا جو دائیں جانب سے اس گھاٹی کی طرف آتا تھا منصور خان اور اس کے ساتھی نے غالباً اندھیرے میں میرے گھوڑے کی ٹاپوں سے میری سمت کا اندازہ کر لیا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے مجھے اس گھاٹی میں گھیرنے کا منصوبہ بنایا ہوگا۔

واقعی یہ ایک ذہانت آمیز منصوبہ تھا اور یہ منصوبہ صرف وہی شخص بنا سکتا تھا جسے اس علاقے کے چپے چپے سے واقفیت رہی ہو۔ میں بھی حیران تھا کہ وہ گھاٹی تک مجھ سے پہلے ہی کس طرح پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ یہ راستہ یقیناً اس راستے سے کہیں مختصر رہا ہوگا جس پر چلتا ہوا میں اس گھاٹی تک پہنچا تھا۔

گھاٹی میں جیسے ہی میرے گھوڑے نے قدم رکھا، اس کی ٹاپوں کی آواز غیر معمولی حد تک بلند ہو گئی تھی۔ اس شور میں آس پاس موجود یا چلتے پھرتے کسی شخص کے بارے میں علم نہیں ہو سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں ان کے بارے میں اس وقت تک بے خبر رہا جب تک افضل خان چٹان سے گھاٹی میں کود نہیں گیا تھا۔

میں نشیب میں اترنے لگا۔

دو گھوڑے درخت سے بندھے ہوئے تھے اور یہ یقیناً انہی دونوں کے تھے جو مجھے ہلاک کر کے چاندی سے بھرے ہوئے تھیلے چھیننا چاہتے تھے۔ گھوڑوں نے مجھے اپنی طرف آتے دیکھ کر ٹاپیں ماریں اور ہنہنا کر غصّے کا اظہار کیا۔۔۔ لیکن میں نے جلد ہی ان کی اجنبیت کے احساس کو دُور کر دیا۔

ایک گھوڑے کی ٹانگ میں کوئی زخم تھا جس کی وجہ سے اس نے وہ ٹانگ اُٹھا رکھی تھی۔ میں نے دُوسرا گھوڑا کھولا اور اس پر سوار ہو کر ایک بار پھر اس راستے پر چل دیا جو گھاٹی سے گزرتا تھا۔ میں اسی سمت میں جانا چاہتا تھا جدھر میرا بدکا ہوا گھوڑا گیا تھا۔

گھاٹی سے گزرتے وقت میں نے گھوڑے کو ان لاشوں سے بچانے کی کوشش نہیں کی جو راستے میں پڑی تھیں بلکہ گھوڑا ان کو روندتا ہوا گزر گیا تھا۔ گھاٹی سے نکل کر میں قدرے بلند مقام پر پہنچ گیا۔

بلند پہاڑوں میں اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے میں ہر ممکن تیزی سے آگے بڑھتا رہا۔۔۔ میں ہر اُس راستے کو بھی نگاہ میں رکھنے کی کوشش کر رہا تھا جس پر مفرور گھوڑا گھوم سکتا تھا ابھی تک کوئی ایسا راستہ نظر نہیں آیا تھا اس کا مطلب تھا کہ بدکا ہوا گھوڑا اسی راستے پر دوڑتا چلا گیا ہوگا جس پر میں اس وقت جا رہا تھا۔

بلند پہاڑوں سے نکل کر میں نشیبی علاقے میں اُترنے لگا میدانی علاقہ دُور دُور تک چٹیل میدان کی طرح بے آب و گیاہ تھا دُور دُور تک ہریالی کا نام و نشان تک نہ ہونے کی وجہ سے اس میدانی علاقے میں بگولے سے رقص نظر آ رہے تھے۔

میں نے راستے سے اُتر کر گھوڑے کو بالکل سیدھا ہی دوڑانا شروع رکھا کیوں کہ بدکے ہوئے گھوڑے نے اس راستے سے اُتر کر ناک کی سیدھ میں دوڑنے کا عمل برقرار رکھا ہوگا۔

رفتہ رفتہ گرمی بڑھ رہی تھی۔

میں نے گھوڑے کو مزید تیزی سے دوڑانا شروع کر دیا۔

میدانی علاقہ پار کر کے جب میں ایسے حصّے میں پہنچا جہاں سے جھاڑیاں شروع ہوتی تھیں اور کہیں کہیں درخت بھی نظر آ رہے تھے تو میری بے چین آنکھوں نے کسی ندی نالے کی تلاش میں اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کر دیا۔

میں نے کوئی شہد کی مکھی تلاش کرنے کی کوشش کی کیوں کہ وہ پانی تک میری رہنمائی کر سکتی تھی۔ کوئی پرندہ یا کوئی شہد کی مکھی نظر نہ آئی۔ میں نے اسی سیدھ میں آگے بڑھتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھنا جاری رکھا لیکن دُور دُور تک کہیں پانی کا نشان تک نظر نہیں آ رہا تھا۔

جھاڑیوں کے درمیان گھوڑے کو دوڑاتے دوڑاتے بالآخر میں ایک ندی کے کنارے پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ میں نے گھوڑے سے اُتر کر اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر میرا دل خوشی سے جھوم اُٹھا۔

میں جس اندازے کے تحت یہاں تک پہنچا تھا، وہ ٹھیک ہی نکلا۔ بدکا ہوا گھوڑا ندی کے کنارے چرنے میں مصروف ہو گیا۔ وہ ندی کے اُس حصّے کے قریب تھا جہاں پانی کا بہاؤ زیادہ تیز نہیں تھا اور جگہ خاصی ہموار تھی۔ اس کے بعد ندی اچانک ہی نشیب میں پُرشور آواز کے ساتھ گرتی تھی۔

میں نے اس گھوڑے کو ایک درخت سے باندھ دیا جس پر سوار ہو کر یہاں تک پہنچا تھا اور اُس گھوڑے کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

طرف چل دیا جو کافی فاصلے پر چرنے میں مصروف تھا۔ غالباً ابھی تک اس کی دہشت ختم نہیں ہوئی تھی۔ وہ بار بار گردن اٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگتا تھا اور بار بار اس کے نتھنوں سے آوازیں نکلنے لگتی تھیں۔

ابھی تک شاید وہ میرے قدموں کی چاپ نہیں سن سکا تھا۔ اس کی پُشت میری جانب تھی۔۔۔ میں دبے قدموں آگے بڑھتا رہا۔۔۔ اور پھر اس کی حیوانی جبلت نے اُسے میری موجودگی سے آگاہ کر ہی دیا۔

وہ ایک بار پھر بدکا لیکن بھاگا نہیں۔

میں نے حلق سے ایسی آوازیں نکالنا شروع کر دی تھیں جو ایسے خوف زدہ گھوڑوں کو رام کر دیتی تھیں۔ یہ فن میں نے بچپن ہی میں سیکھا تھا۔ ان آوازوں کو سُنتے ہی اس کے کان تیزی سے گھومنے لگے۔

اس کی ہنہناہٹ میں بے چینی نہیں تھی۔

وہ اب میری طرف دیکھ کر سامنے والے پاؤں زمین پر مار رہا تھا اور اس کی پچھلی ٹانگیں اُسے آہستہ آہستہ عقب تک متحرک کیے ہوئے تھیں۔ میں حلق سے مانوس آوازیں۔۔۔ نکالتا اور مُنہ سے پُچکارتا ہوا آگے بڑھتا رہا لیکن اچانک ہی گھوڑا بے چین ہو گیا۔

میں رُک گیا۔

میرے حلق سے نکلنے والی آوازیں بھی بند ہو گئیں۔

اب تک میں اُسے جس انداز میں پُچکار رہا تھا، اس کے بعد گھوڑے کی بے چینی ناقابلِ فہم تھی۔ یقیناً کوئی وجہ تھی، جس سے میں اس وقت ناواقف تھا۔

قریب ہی ایک درخت تھا۔

میں اس درخت کی اوٹ میں ہو گیا۔

درخت کے پیچھے کھڑے ہو کر میں نے گھوڑے کی طرف دیکھا۔ گھوڑے کے کان کسی آواز پر لگے ہوئے تھے۔ یہ بات اس کے کانوں کی حرکت سے ظاہر تھی لیکن میں کوئی آواز سُننے سے قاصر تھا۔ میں نے پھر بھی اپنی سماعت پر زور ڈالنا جاری رکھا۔ یہ میری غیر معمولی سماعت ہی کا نتیجہ تھا کہ میں نے تھوڑی ہی دیر بعد کسی اور گھوڑے کی ٹاپیں سن لیں۔ آواز اُسی جانب سے آ رہی تھی، جدھر سے میں یہاں پہنچا تھا۔ کوئی گھوڑا دوڑتا ہوا ندی ہی کی جانب چلا آ رہا تھا۔

گھوڑا زور سے ہنہنایا اور زمین پر پاؤں مارنے لگا۔

مجھے یوں محسوس ہُوا جیسے وہ ایک بار پھر بھاگنے کا ارادہ کر رہا ہو۔ اس خدشے کے تحت میں نے فوراً ہی وہ مخصوص سیٹی بجانی شروع کر دی جو خوف زدہ گھوڑے کو اطمینان دلا سکتی تھی۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہُوئی کہ گھوڑا وہیں کھڑا رہا۔ گویا اس نے بھاگنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی۔

مجھے حیرت تھی کہ اس جانب سے کون آ رہا ہے۔ اگر یہ گھڑ سوار اسی راستے سے آ رہا ہے، جدھر سے میں آیا تھا تو میری نگاہوں سے کیسے محفوظ رہ گیا؟

میں نے گھوڑے کی طرف دیکھا۔

اس کی زین سے وہ دونوں تھیلے ابھی تک بندھے ہوئے تھے جن میں چاندی کے سکے تھے۔ میں درخت کی اوٹ سے نکل کر تیزی سے گھوڑے کی طرف بڑھا۔ ایک بار پھر میرے حلق سے گھوڑے کو مانوس کرنے والی آوازیں نکلنے لگی تھیں اس کے ساتھ ہی میں اس گھڑ سوار کی آوازیں بھی سُنتا جا رہا تھا جو ہر گزرتے ہوئے لمحے کے ساتھ قریب تر آتی جا رہی تھیں۔

میں نے ایک درخت کی اوٹ سے دوسرے درخت کے تنے کے پیچھے پہنچتے ہوئے گھوڑے تک اپنا فاصلہ کم کرنے کا عمل جاری رکھا اور پھر وہ مجھ سے صرف چند قدم کے فاصلے پر رہ گیا۔

اُسی لمحے مجھے یُوں محسوس ہُوا جیسے قریب ہی جھاڑیوں میں کوئی گھوڑا آ کر رُک گیا ہے۔ گھوڑے کے ہانپنے کی آوازیں صاف سُنائی دے رہی تھیں۔۔۔ پھر کوئی زمین پر کُود گیا۔ یہ آواز اگرچہ دھیمی تھی لیکن میں اسے سُن چکا تھا۔ میرا دایاں ہاتھ آہستہ آہستہ اپنے ریوالور کی طرف رینگنے لگا۔

جھاڑیوں میں اچانک ہی بھونچال سا آ گیا۔

گھوڑا زور سے ہنہنایا۔

اس کی آواز میں خوف کا عنصر نمایاں تھا۔

مَیں جہاں تھا، وہیں دُبکا دیکھتا رہا۔ گھوڑے نے پلٹ کر دولتی ماری اور پھر چند لمحوں تک اس کی عقبی ٹانگیں فضا میں بے مقصد ہی چلتی رہیں۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی اَن دیکھے دُشمن پر دولتیاں برسا رہا ہو۔

گھوڑے کے قریب ہی ایک جھاڑی تھی جس سے ایک لمبا تڑنگا شخص نکل آیا۔ گھوڑا ایک بار پھر بھاگ اُٹھا۔ وہ میرے قریب سے گزرا تو میں نے دوڑ کر نہ صرف اس کی ایال کو تھام

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تاریک وادی

مصنف
ایم اے

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

خط و کتابت کے لئے
مکتبہ القریش سرکلر روڈ، اُردو بازار، لاہور۔

یا بلکہ خود کو اُچھال کر میں اس کی پشت پر بھی جم گیا۔

اگلے ہی لمحے میں اُسے لگاموں سے تھامے دوڑا رہا تھا۔

اچانک عقب سے ایک دھاڑ سُنائی دی۔ یوں لگا جیسے کوئی دیوپیکر قوت سے چیخا ہو اور اس کے فوراً ہی بعد فضا ایک فائر کی آواز سے گونج اُٹھی۔

گولی سنسناتی ہوئی میرے سر پر سے گزر گئی۔

میں نے دوڑتے ہوئے گھوڑے کی پشت پر بیٹھے بیٹھے عقب میں دیکھا۔ وہ لمبا تڑنگا شخص ہاتھ میں رائفل لیے تیزی سے دوڑا چلا آ رہا تھا۔

اس قدر لمبا آدمی میں نے زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کے دوڑنے کی رفتار بھی خاصی تیز تھی۔ اگر میں اپنے پیدل پر دوڑ رہا ہوتا تو وہ فرلانگ بھر کا فاصلہ ہونے کے باوجود بھی آسانی سے مجھ تک پہنچ جانے میں کامیاب ہو جاتا۔ اس کے قدموں سے گزوں کے حساب سے فاصلہ طے ہو رہا تھا۔

میں گھوڑے کو دوڑاتا ہوا ندی کے ایسے حصّے تک پہنچ جانے میں کامیاب ہو گیا جہاں پانی کم تھا۔ میں نے ندی کے کنارے کنارے دُور تک دیکھا، وہ شخص اب بھی نظر آ رہا تھا لیکن اس بار وہ اپنی لمبی لمبی ٹانگوں کو زحمت دینے کی بجائے گھوڑے پر سوار تھا۔ وہ اسی گھوڑے پر سوار تھا جس پر میں نے گھاٹی سے ندی تک سفر کیا تھا۔

آتے وقت میں اس گھوڑے کے قریب سے گزر آیا تھا۔

میں نے اُسے ساتھ لینا مناسب نہیں سمجھا تھا اور نہ ہی میں نے قریب سے گزرتے وقت اُسے بھگانے کی کوشش کی تھی دوڑتے دوڑتے اس غیر معمولی قدوقامت کے شخص کو جب وہ گھوڑا نظر آیا ہو گا تو اس نے اسی پر میرا پیچھا کرنے کو ترجیح دی ہو گی کیوں کہ وہ پیدل میرے گھوڑے تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔

ندی پار کر کے میں رُک گیا۔

یوں آگے آگے بھاگنا میری فطرت کے خلاف تھا۔

میں گھوڑے کی پشت سے نہیں اُترا۔

ریوالور میرے دائیں ہاتھ کی پہنچ میں تھا اور رائفل بائیں جانب زین میں اُڑسی ہوئی تھی۔ دونوں تھیلے میری رانوں کے نیچے دبے ہوئے تھے۔

اس نے مجھ پر جو گولی چلائی تھی، اس سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ میرا خون نہیں بہانا چاہتا بلکہ اس نے گولی صرف مجھے دھمکانے کے لیے چلائی تھی ورنہ اتنے فاصلے سے نشانہ خطا جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جو گولی میرے سر کے اوپر سے گزر گئی تھی، وہ میری پُشت میں پیوست بھی ہو سکتی تھی۔ یہی وجہ ہوئی کہ میں نے پلٹ کر اس پر فائر نہیں کیا اور اسی باعث میں نے اب بھی کوئی ہتھیار نکالنے کی ضرورت نہیں محسوس کی تھی۔

وہ گھوڑے کو دوڑاتا ہوا ندی پار کر کے میرے قریب آ گیا۔ میں نے پہلی بار اُسے قریب سے دیکھا۔ وہ واقعی طاقت اور توانائی کا پیکر تھا۔ اس کی نس نس میں توانائی کی لہریں سی تڑپتی محسوس ہو رہی تھیں . . .

"نوجوان . . ." وہ بولا تو اس کی گونج دار آواز بھی مرعوب کُن تھی۔ اس نے جارحانہ انداز میں مجھے مخاطب کیا تھا لیکن اس کے لہجے میں میرے لیے حقارت نہیں تھی۔

میں خود بھی ایک مضبوط جسم کا مالک تھا اور عام آدمیوں کے مقابلے میں میرا جسم زیادہ ٹھوس اور قوتِ برداشت کا حامل تھا لیکن اس اجنبی کے مقابلے میں میری مثال جسامت کے اعتبار سے شیر کے سامنے بکرے جیسی تھی۔

میں اس کی طرف دیکھتا رہا۔

مجھے مخاطب کرنے کے بعد اس نے کوئی جملہ زبان سے ادا نہیں کیا بلکہ میری آنکھوں میں دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں بے پناہ چمک تھی اور اس کا چہرہ کرخت نقش و نگار کا حامل تھا۔ اس کے ہونٹوں کے خم سے سنگدلی کا اظہار ہوتا تھا لیکن چہرے کا مجموعی تاثر اس کے وفا شعار اور نرم دل ہونے کا مظہر تھا۔

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

ہم ایک دوسرے کو گھورتے رہے۔

اس کی پلکیں زیادہ دیر کھلی نہ رہ سکیں۔ میری بے پناہ قوتِ ارادی نے بالآخر اس پہاڑ جیسے آدمی کو پلکیں جھپکانے پر مجبور کر دیا تھا۔

"تم کون ہو . . ." اس نے پوچھا۔

اس کی آواز تیز سرگوشی سے ملتی جلتی تھی۔

"پہلے یہ بتاؤ کہ تمہیں مجھ سے میرے بارے میں معلوم کرنے کا کیا حق ہے؟" میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

اس کی پلکیں ایک بار پھر جھپک گئیں۔

غالباً وہ حیران ہو رہا تھا کہ میں اس کے مقابلے میں چھوٹا اور بظاہر کمزور ہونے کے باوجود اس سے مرعوب کیوں نہیں ہوا جب کہ اُسے خود اسی کو بار بار پلکیں جھپکانا پڑ رہی تھیں۔

"یہ بات تو کوئی بھی انسان، دوسرے انسان سے معلوم کرنے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کا حق رکھتا ہے۔" اس نے بھاری آواز میں کہا۔

"ہاں۔۔۔ لیکن فائر کرنے کے بعد یہ حق خود بخود ختم ہو جاتا ہے کیوں کہ گولی چلانے کا مطلب دشمنی کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہوتا۔"

"وہ تمہیں روکنے کے لیے ایک اشارہ تھا۔"

"جب میں اس اشارے پر نہیں رُکا تو تم نے میرا تعاقب کیوں کیا۔ تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

"میں تم سے کچھ حاصل کرنا چاہتا ہوں۔"

"کیا چیز؟" میں نے سخت لہجے میں کہا۔

"وہی جو تمہاری ملکیت نہیں ہے اور تم نے اُسے کسی کو ہلاک کر کے لُوٹا ہے۔"

اس بار میں نے جواب دینے میں جلد بازی کا مظاہرہ مناسب نہیں سمجھا بلکہ میں منتظر رہا کہ وہ خود ہی اپنے سوال کی وضاحت بھی کرے گا۔

غیر معمولی طویل قامت کے اس شخص نے زبانی تو وضاحت نہیں کی لیکن اس نے کن انکھیوں سے جس انداز میں میرے گھوڑے کی زین کی طرف دیکھا تھا اس سے مجھے فوراً ہی پتہ چل گیا کہ اس کا اشارہ درحقیقت کس چیز کی طرف ہے۔

وہ ترچھی نگاہ سے اس تھیلے کو دیکھ رہا تھا جو زین کے بائیں طرف بندھا ہُوا تھا۔ دائیں طرف والا تھیلا اس کی نگاہ سے اوجھل تھا۔۔۔ لیکن وہ شاید اس کی موجودگی سے بھی بے خبر نہیں تھا۔

"تم نے بتایا نہیں کہ وہ کون سی چیز ہے؟" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہُوئے کہا۔

"وہ چیز تمہارے گھوڑے کی زین سے بندھی ہُوئی ہے۔"

"سُنو۔۔۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "جو چیز جس کے قبضے میں ہوتی ہے، وہ اُسی کی ملکیت ہوتی ہے۔"

"حالانکہ تم نے اسے طاقت کے بل بوتے پر حاصل کیا ہے۔"

"یہ چیز مجھ سے پہلے بھی اسی طرح حاصل کی گئی تھی۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ "اس لیے اگر تم ان لٹیروں کے ساتھی ہو تو میں تمہیں واضح طور پر بتا دینا چاہتا ہُوں کہ اب یہ دولت اس وقت تک میری ملکیت ہے جب تک میں اسے خود اپنے ہاتھوں سے کسی کے حوالے نہیں کر دیتا۔"

"کیا اسے بالکل اسی طرح تم سے نہیں چھینا جا سکتا جیسے تم اسے چھین کر لائے ہو؟"

"کوشش کر کے دیکھ لو۔"

"کیا تم مجھے دھمکی دے رہے ہو؟ کیا یہ چیلنج ہے؟"

"یہ سمجھنا تمہارا کام ہے۔"

"میں دولت کی خاطر خون بہانا پسند نہیں کرتا۔"

"شاید اسی لیے تم نے اب تک مجھ پر حملہ نہیں کیا۔"

میری اس بات سے اس کے جبڑے بھینچ گئے۔ اس کی آنکھوں کی چمک میں سُرخی جھلک آئی اور اس کا دایاں ہاتھ گھوڑے کی لگام پر اتنی سختی سے جم گیا کہ میں اس کی اُنگلیوں کے جوڑوں کو سپید پڑتے دیکھ سکتا تھا۔

"اپنی موت کو آواز نہ دو۔" اس نے سرسراتی آواز میں کہا۔ "میں اس دولت کو حاصل کرنے آیا ہُوں اور اسے حاصل کر کے رہوں گا۔ اگر تم اس غار تک مجھ سے پہلے نہ پہنچ گئے ہوتے تو یہ دولت اس وقت میرے پاس ہوتی۔"

"حالانکہ تم خون بہانا بالکل پسند نہیں کرتے۔" میں نے طنزیہ قہقہہ لگاتے ہُوئے کہا۔

"میں اب بھی اپنے موقف کی حمایت میں ہُوں۔"

"لیکن تم اُن لوگوں کو ٹھکانے لگائے بغیر یہ تھیلے حاصل نہیں کر سکتے تھے۔" میں نے کہا۔ اس دوران میں میں اس کی طرف سے پوری طرح ہوشیار رہا تھا کیوں کہ اس کے چہرے کے بدلتے ہُوئے تاثرات اس بات کی چغلی کھا رہے تھے کہ اس کی کھوپڑی گرم ہو گئی ہے اور وہ مجھ پر حملہ کرنے کے لیے پَر تول رہا ہے۔

اس کے جبڑے اتنی سختی سے بھینچے ہُوئے تھے کہ اس کے رُخساروں کی ہڈیاں تک نمایاں ہو گئی تھیں۔ اس کا چہرہ بھی جسامت کے اعتبار سے خاصا چوڑا اور بھرا بھرا تھا۔ میں نے اس کی پیشانی پر پسینے کی بُوندیں دیکھیں جو سلوٹوں میں جمع ہو کر چھوٹی سی ندی میں تبدیل ہو رہی تھیں۔ اس ندی کا بہاؤ بائیں کنپٹی کی جانب تھا۔۔۔ پھر یہ باریک سی ندی کنپٹی سے بہہ کر اس کے بائیں گال پر آ گئی۔

"ان میں سے کوئی بھی مجھ پر حملہ کرنے کی جرأت نہ کرتا۔" وہ غرّایا تو اس کی آواز میں شیر جیسی گرج تھی۔

"اتنی دولت کو کوئی آسانی سے کسی کے ہاتھوں میں نہیں جانے دیتا۔" میں نے مُسکرا کر کہا۔ یہ مُسکراہٹ جلتی پر تیل کا کام کر رہی تھی اور وہ کسی بھی لمحے بے قابو ہو سکتا تھا۔ "وہ یقیناً تم پر فائرنگ کرتے اور۔۔۔"

"میں کسی ایسے آدمی کو کبھی زندہ نہیں چھوڑتا جو مجھ پر قاتلانہ حملہ کرتا ہے۔"

"کچھ ایسا ہی اپنا بھی اصول ہے۔"

"مجھے تمہاری جوانی پر رحم آتا ہے۔"

"لیکن میں حملہ کرنے والے کی جوانی پر بھی رحم نہیں کھاتا۔" میں نے کہا۔ وہ آگ بگولا ہو چکا تھا۔ اس نے رائفل پھینک دی اور گھوڑے سے کُود گیا۔

میرا ہاتھ ریوالور کی طرف بڑھتے بڑھتے رُک گیا۔

گھوڑے سے اُتر کر وہ میرے گھوڑے کے سامنے آ کھڑا ہُوا۔ اس کی آنکھیں دیوانگی سے جل رہی تھیں اور اس کی دائیں کنپٹی کی ایک رگ بار بار تڑپ رہی تھی۔ جب وہ گھوڑے سے اُتر کر یُوں سامنے کھڑا ہُوا تو میں نے پہلی بار قریب سے اس کی قد کی طوالت کا جائزہ لیا۔ میں گھوڑے پر بیٹھا ہُوا تھا لیکن وہ زمین پر کھڑے ہونے کے باوجود میرے کندھوں تک پہنچ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ بیلچوں جیسے تھے اور لمبے لمبے بازوؤں پر درخت کی موٹی موٹی اور مضبوط شاخوں کا گمان ہوتا تھا۔

"تم نے رائفل کیوں پھینک دی؟" میں نے مضحکہ اُڑانے والے انداز میں کہا۔ "شاید تم اپنے اس پہاڑ جیسے وجود پہ نازاں ہو اور یہ چاہتے ہو کہ میں تمہارے مقابلے میں اپنے کم تر وجود کو لے کر نہتا ہی لڑنے پر آمادہ ہو جاؤں۔"

اس نے میرے اس جملے کا کوئی جواب نہیں دیا۔

گھوڑا اس سے خوف زدہ ہو رہا تھا اور بار بار اُچھلنے کُودنے لگتا تھا۔ لگاموں پر میری گرفت خاصی مضبوط تھی اس لیے میں گھوڑے کو بدک کر بھاگنے نہیں دے سکتا تھا۔

معاً طویل قامت شخص نے ایک قدم بڑھایا۔

گھوڑا یکایک اُچھلا۔

اس بار گھوڑے نے خوف زدہ ہو کر عقبی ٹانگوں کو دولتی کے انداز میں چلایا تھا۔ میں اگر مضبوطی سے نہ بیٹھا ہوتا تو شاید گھوڑا مجھے گرانے میں کامیاب ہو گیا ہوتا۔

وہ اس صورت حال پر ہنس پڑا۔

میرے ذہن پر غصّے کی لہر رفتہ رفتہ غالب آنے لگی۔ جسے میں نے اپنی قوتِ ارادی سے دھکیل دیا اور خود کو ہر اعتبار سے پُرسکون رکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس جیسے دیو قامت شخص کے سامنے غصّے سے بے قابو ہونے کا ایک ہی مطلب تھا کہ میں ضبط کا دامن چھوڑ کر اس کے مضبوط بازوؤں میں پہنچ جاؤں۔ میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ ایک بار اس کے بازوؤں نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا تو پھر میری ہڈیاں تک سُرمہ بن جائیں گی۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھتا رہا حتیٰ کہ گھوڑے سے دو قدم کے فاصلے پر رُک کر اس نے ہاتھ بڑھا کر لگام تھام لی۔

اگلے ہی لمحے اس نے ایک زوردار جھٹکا دیا۔

گھوڑا زور سے ہنہنایا اور نصف دھڑ سے کھڑا ہو گیا۔۔۔ پھر لڑکھڑایا اور عقبی ٹانگیں کوشش کے باوجود جسم کو نہ سہار سکیں۔ اُسی لمحے اُس نے پُوری قوت سے گھوڑے کے پیٹ میں گھونسہ مارا۔ میں نے خود کو سنبھالتے ہُوئے چھلانگ لگا دی اور زمین پر پاؤں ٹکتے ہی پھرتی سے پلٹ پڑا۔ گھوڑا زمین پر پڑا تڑپ رہا تھا اور اس کے حلق سے عجیب عجیب آوازیں نکل رہی تھیں۔

مارے غصّے کے میرا عجیب حال تھا۔

طاقت کا مظاہرہ کرنے کے لیے اس نے میرے گھوڑے کو جو اذیت دی تھی، وہ ایک طرح سے میرے لیے تنبیہ تھی کہ اگر میں نے اس کی بات نہ مانی تو اس کا ایک ہی گھونسہ مجھے بھی گھوڑے کی طرح زمین پر تڑپنے کے لیے مجبور کر دے گا۔

میں آہستہ آہستہ اُٹھ کھڑا ہُوا۔

ایک نوجوان کی عجیب داستان
جو اپنی یادداشت کھو بیٹھا تھا
گم کردہ
یعقوب جمیل کے قلم سے
خوبصورت سرورق، بہترین طباعت و کتابت
قیمت =/100 روپے
مکتبہ القریش
سرکلر روڈ اردو بازار لاہور
7668958

وہ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا۔

اس کے ہونٹوں پر تضحیک آمیز مسکراہٹ تھی۔ زمین پر گرتے وقت میں نے اپنا ریوالور نکال لیا تھا لیکن اس غیر معمولی قد آور اور چٹان جیسے وجود والے شخص کی مسکراہٹ نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں کوئی ہتھیار استعمال کیے بغیر اس کے مقابلے پر جم جاؤں۔

میں نے ریوالور پھینک دیا۔

"تم اپنے بارے میں کسی غلط فہمی کا شکار ہو نوجوان!" طویل قامت شخص نے قہقہہ لگا کر کہا۔ "مجھے تمھاری جوانی پر رحم آتا ہے۔ اب بھی مقابلے سے باز آ جاؤ اور اپنی جان بچا کر چلے جاؤ۔"

"زندگی اب میرے لیے بے معنی ہو گئی ہے۔" میں نے دانت پیستے ہوئے جواب دیا۔ "میں کسی ایسے شخص کو کبھی معاف نہیں کرتا جو مجھ پر حملہ کرتا ہے۔"

ہم دونوں ایک دوسرے کے سامنے جم کر کھڑے ہو گئے۔

ہماری آنکھیں ایک دوسرے کی آنکھوں میں گڑ گئی تھیں۔

میں نے چند ہی لمحوں میں اُسے سر کو جھٹکا دیتے ہوئے دیکھا۔

وہ میری آنکھوں کی غیر معمولی چمک اور میری قوت ارادی سے متاثر ہو رہا تھا۔ اس کا دایاں ہاتھ آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ کسی پہلوان کے سے انداز میں۔ . . جیسے وہ مجھ پر پنجہ آزمانا چاہتا ہو۔ میں اپنی جگہ کسی چٹان کی طرح منجمد رہا۔

اس کا ہاتھ میرے سینے کے سامنے آیا تو میں نے ذرا سا گھوم کر پوری قوت سے اس کی کلائی پر کھڑی ہتھیلی کا وار کیا۔ اس کے حلق سے ایک گھٹی گھٹی سی چیخ نکل گئی اور مجھے یوں لگا جیسے میں نے کسی درخت کے ٹھوس تنے پر ہاتھ کی چوٹ لگائی ہو۔

چوٹ لگاتے ہی میں اس کی بغل کے نیچے سے نکل گیا۔

اس نے دوسرے ہاتھ کو بڑی پھرتی سے گھمایا تھا لیکن میں اس کی پشت پر تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ پلٹ کر مجھ پر حملہ کرتا، میں زمین سے تین ہاتھ کے قریب اچھلا۔ میرے دونوں پاؤں ملے ہوئے تھے۔ یہ دونوں پیر اس کی کمر تک گئے اور پھر میں نے پورے جسم کو کسی ایسے شمشیر کی طرح سیدھا اور ٹھوس بنا لیا جسے دیو پیکر ہاتھوں نے اس کی طرف اچھالا ہو۔

ٹھوکر کھا کر وہ لڑکھڑا گیا۔

وہ منہ کے بل گرتا دکھائی دیا۔

میں نے زمین پر پہنچتے ہی خود کو دونوں پیروں پر اچھال دیا اور یہی حرکت میرے کام آ گئی۔ اس نے منہ کے بل گرتے گرتے ہی سنبھل کر پلٹتے ہوئے حملہ کیا تھا لیکن اس کے دونوں ہاتھ جس جگہ مجھے ٹٹولتے رہ گئے تھے، وہاں سے تو میں چند لمحے قبل ہی اچھل کر فضا میں پہنچ چکا

نامور مصنف محمود احمد مودی
وہی تحریر اور وہی انداز
کے ساتھ 'اپنے چاہنے والوں
کے لئے ایک نئی سوغات لئے
PVL
PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk
قیمت =/180
مکتبہ القریش
سرکلر روڈ اردو بازار لاہور
7668958

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھا۔ میں گرنے لگا تو اس نے یکایک اُٹھ کر مجھے دونوں ہاتھوں میں دبوچ لینے کی کوشش کی۔ . . لیکن اس بار بھی وہ مجھے جکڑنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔

ایک ٹھوکر اس کی کھوپڑی پر پڑی اور گرتے گرتے میں نے اس کی گردن پر بھی ایک چوٹ لگا دی۔

اس کے حلق سے دھاڑ نکل گئی۔

وہ سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر کسی نشے باز کی طرح لڑکھڑایا۔ میں رُک کر اس کی ڈگمگاہٹ دیکھنے لگا۔ کچھ دیر اُسے یوں ہی جھومتے دیکھ کر میں لطف اندوز ہوتا رہا۔ . . پھر میں نے بڑھ کر اس کے جھکے ہوئے سر پر مکے برسانے چاہے لیکن میرا بایاں بازو اس کی گرفت میں آ گیا۔

ایک لمحے کے لیے مجھے یوں لگا جیسے میرے بائیں ہاتھ پر اس کے ہاتھ کی اُنگلیاں نہیں بلکہ پانچ طاقت ور سانپ لپٹ گئے ہوں۔ . . ایسے سانپ جو میری کلائی پر بل کھاتے ہوئے اس کی ہڈی تک سُرمہ بنا دینا چاہتے ہوں۔ میں نے جھٹکا مارا لیکن میری کلائی آزاد نہ ہو سکی۔

اس کا ایک ہاتھ اب بھی اپنے سر پر تھا۔

غالباً اس کی کھوپڑی چوٹوں کی وجہ سے ابھی تک گھوم رہی تھی۔ اگر اس کا دوسرا ہاتھ بھی کارآمد ہوتا تو اس کی گرفت سے نکلنے کے لیے مجھے ناخنوں پسینہ آ جاتا۔ . . لیکن اس کی آنکھوں کے سامنے شاید تاریکی چھا گئی تھی اور اس کے ایک ہاتھ میں میری کلائی بس اتفاق ہی سے جکڑی گئی تھی۔ اس نے میرے بازو کو پوری قوت سے جھٹکا مارا۔

مجھے اس داؤ کی توقع تھی۔

میں نے اپنے جکڑے ہوئے بازو کو اس کی گرفت سے چھڑانے کا خیال چند لمحے پہلے ہی ترک کر دیا تھا۔ اس لیے اس نے جیسے ہی میرے بازو کو جھٹکا دیا، میں نے اُچھل کر دونوں پاؤں اس کی پیٹھ پر جما دیے۔ یہ خوف ناک جھٹکا میرا بازو کندھے سے توڑ دینے کے لیے کافی تھا لیکن میں نے جو ترکیب استعمال کی تھی، اس کے تحت اس غیر معمولی طاقت ور شخص کی توانائی خود اسی کے خلاف استعمال ہو گئی۔

اس نے میرا بازو چھوڑ دیا۔

جھٹکا لگنے سے خود اس کا بازو کہنی سے ٹوٹ گیا۔ اس نے میرے ہاتھ ہٹا لیا اور ٹوٹی ہوئی کہنی کو تھام لیا۔ اس کے حلق سے بڑی ہی بھیانک آواز نکلی تھی۔ میں اس سے دو قدم کے فاصلے پر کھڑا اُسے دیکھ رہا تھا۔

وہ زمین پر بیٹھ چکا تھا۔

اس کے حلق سے غراہٹ آمیز آوازیں نکل رہی تھیں۔

میں اگر چاہتا تو اس موقعے پر اس کی کھوپڑی کو پے در پے چوٹوں سے چکنا چور کر سکتا تھا لیکن میں خاموش تماشائی بنا ہوا تھا۔ وہ ایک اعلا ظرف دُشمن تھا۔ اُس نے مجھ پر ہوائی فائر کیا تھا حالانکہ وہ گولی میری پُشت میں بھی پیوست ہو سکتی تھی۔ اس لیے میں اُسے اتنی شدید تکلیف اور اذیت کے علاوہ زخمی حالت میں مزید نقصان صرف اُسی وقت پہنچانا چاہتا تھا، جب وہ مجھ پر مزید کوئی حملہ کرتا۔ . . میں طاقت ور اور بہادروں کا قدر دان ہوں اس لیے میں انھیں ضائع کرنا پسند نہیں کرتا۔

اب میں اس کے مزید اقدام کا منتظر تھا۔

کچھ دیر بعد اس نے نگاہ اُٹھا کر میری طرف دیکھا۔

مارے تکلیف کے اس کے نقش و نگار مسخ ہو گئے تھے۔ اس کی آنکھوں میں شکست اور زخم خوردگی کے تاثرات تھے۔ اس کا چہرہ سُرخ ہو گیا تھا اور آنکھوں میں لالی جھلک آئی تھی جیسے شکست کے احساس نے اس کی آنکھوں میں خون اُتار دیا ہو۔

"تم بہت بہادر ہو۔ . ." وہ بڑبڑایا۔ "لیکن میں اب تمھیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میں شکست خوردہ ہو کر زندہ نہیں رہ سکتا۔"

"مجھے تم سے ہمدردی ہے۔"

"حالانکہ تم میرے دُشمن ہو۔" اس کے لہجے میں حیرت پیدا ہو گئی۔ جیسے اُسے کسی فاتح سے ہمدردی کا یقین نہ آیا ہو۔

"میں صرف اُنھی کا دُشمن ہوں جو مجھ سے دُشمنی روا رکھتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "تمھیں دولت کی خواہش اور طاقت نے اندھا کر رکھا ہے۔ تم دیکھ رہے ہو کہ اس اندھے پن میں تم اپنے ایک بازو سے محروم ہو گئے ہو۔ . . اور اب شاید۔ . ."

"تم نے مجھے بہت نقصان پہنچایا ہے۔" وہ چیخ پڑا۔ "کاش! میں ہوائی فائر کرنے کی بجائے تمھیں پُشت پر گولی ہی مار دیتا۔"

"میں نے تمھیں جو نقصان پہنچایا ہے، اس میں خود تمھارا ہی قصور ہے۔" میں نے بڑھ کر اس کے دانتوں پر ایک ٹھوکر چاہی لیکن وہ جھکائی دے گا۔

ٹوٹے ہوئے بازو میں حرکت ہوئی تو وہ اپنا صحت مند بازو بھی استعمال کرنے میں کامیاب نہ ہوسکا۔ اس کے حلق سے ایک دلدوز چیخ نکل گئی تھی۔ ٹھوکر مارنے میں ناکامی کے باعث میں لڑکھڑا گیا۔ میں نے سنبھلنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ مجھ سے زیادہ دور نہیں تھا...... لمبی شاخ جیسا اس کا صحت مند بازو میری طرف بڑھا اور اس کی انگلیاں میری گردن پر جم گئیں۔

میں نے فوراً ہی دونوں ٹانگوں کو اچھال کر اس کے بازو کو ان کی گرفت میں لے لیا... پھر دھڑ کو ایک طرف جھٹکا مارا۔ وہ میری ٹانگوں میں پھنسے ہوئے بازو پر بلند ہوا اور میرے اوپر سے ہوتا ہوا دور جا گرا۔

میں پھرتی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ زخمی بازو کے بل گرا تھا۔

ٹوٹی ہوئی ہڈی اسے بے پناہ اذیت دے رہی تھی لیکن وہ شاید بڑی سے بڑی اذیت سہنے کے لیے خود کو تیار کر چکا تھا وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

اس کا ٹوٹا ہوا بازو بالکل اس انداز میں جھول رہا تھا جیسے کسی درخت کی کوئی شاخ ٹوٹ کر لٹک جاتی ہے۔ صحت مند ہاتھ سے اس نے ٹوٹے ہوئے بازو کو تھام لیا اور آہستہ آہستہ میری طرف بڑھنے لگا۔

وہ کسی زخمی بھیڑیئے کی طرح خطرناک ہو گیا تھا۔

"میں تمھیں اپنی زندگی بچا کر نکل جانے کا ایک موقع دینا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"تم نے میرا منصوبہ تباہ کر دیا۔ تم نے مجھے..." وہ غرایا۔

"منصوبہ..." میں نے حیرت سے کہا "کیسا منصوبہ؟"

"میں ان ڈاکوؤں کا تعاقب کر رہا تھا۔" اس نے غراہٹوں کے درمیان بتایا "وہ الاؤ میں نے ہی روشن کیا تھا۔ تین دیہاتوں والے شکار کے بارے میں، ان میں سے کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ میں دھوئیں کے سوراخ باری باری بند کر دیتا اور وہ وہیں دم گھٹ کر مر جاتے۔"

"پھر تم نے ایسا کیوں نہیں کیا؟"

"تمھاری آمد کے بعد فوری طور پر صورت حال یکایک بدل گئی۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ تم تینوں ہی ہو یا تمھارے اور بھی ساتھی ہیں۔ اسی دوران تم نے انھیں بے دردی سے قتل کر دیا... اور

ایک پراسرار مورتی کے حصول کے لئے ہونے والے خوفناک معرکے کا احوال

خبیث

انوار صدیقی کے پراسرار قلم سے

5 حصوں میں، مکمل سیٹ =/200 روپے

مکتبہ القریش سرکلر روڈ اردو بازار لاہور

فون 7668958

چاندی کے تھیلے لے کر نکل جانے میں کامیاب ہو گئے۔ میرے پاس جو رائفل تھی اس میں گولیاں بہت کم تھیں اس لیے میں، تمھیں نشانہ بنا کر ان تین آدمیوں کو خود پر گولیاں برسانے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ تمھارے لیے وہاں سے فرار ہونے کے لیے اتنی ہی مہلت کافی تھی۔ تم وہاں سے نکل گئے تو میں ان تینوں کی باتیں سنتا رہا۔ جب ان میں سے ایک ملک نواز کو اطلاع دینے اور دو تمھارے تعاقب میں چل دیے تو میں بھی خاموشی سے ان کے پیچھے چل دیا۔ گھاٹی میں تم لوگوں کے درمیان جنگ ہوئی جب کہ میں راستہ بھٹک جانے کی وجہ سے بہت دیر میں وہاں پہنچا ورنہ تم اس گھاٹی سے، میرے ہاتھوں سے زندہ بچ کر نکل پاتے۔"

میں نے صورت حال پر غور کیا۔

وہ غلط بیانی سے کام نہیں لے رہا تھا۔

"لیکن تمھیں اس دولت کی بھنک کہاں سے پڑ گئی اور تم نے محض دولت کے لیے اپنے آپ کو ہلاکت میں کیوں ڈال دیا؟ تم ایک اچھے آدمی لگتے ہو۔ میں محسوس کر چکا ہوں کہ تم لالچی آدمی نہیں ہو۔" میں نے کہا۔

"میں لالچ کی وجہ سے نہیں بلکہ حق وفاداری نبھانے کے لیے اپنی جان ہتھیلی پر لے کر نکلا تھا۔" اس کے حلق سے کراہ نکل گئی۔

میں اس کے کچھ اور قریب آ گیا۔

مجھے پھر کو مجھے یوں لگا تھا جیسے کوئی چٹان کراہ اٹھی ہو۔

"میں، تمھارا مطلب نہیں سمجھا۔" میں نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا "کیا تم مجھے تفصیل سے نہیں بتاؤ گے؟"

"بہتر تمھیں، مجھ سے یکایک اتنی ہمدردی کیوں ہو گئی ہے؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اس لیے کہ مجھے دیر میں سہی لیکن یہ احساس ہو گیا ہے کہ مجھے تم سے نہیں الجھنا چاہیے تھا۔ میں نے بلاوجہ تمھاری طاقت کو اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا حالانکہ یہ دولت میں اس کے وارث ولی خان کے حوالے کرنے کے لیے جا رہا تھا۔"

"تم... تم... یہ چاندی کے روپے ولی خان کے پاس لے جا رہے تھے؟" اس کی آواز میں حیرت کا گہرا تاثر تھا۔

"کیوں۔ تم اس قدر حیران کیوں ہو رہے ہو؟" میں نے چونک کر پوچھا "کیا تمھاری دانست میں اس دولت کا کوئی اور شخص حق دار ہے؟"

"نہیں..." وہ پرجوش لہجے میں بولا "یہ ولی خان ہی کی دولت ہے اور میں ولی خان کا جانثار ملازم ہاشو خان ہوں۔"

"ولی خان... ملازم... ہاشو خان۔" میں نے اٹک اٹک کر دہرایا۔ اب مجھے اس دیو ہیکل شخص سے لڑنے اور اسے بری طرح زخمی کرنے کا اور زیادہ ملال ہونے لگا تھا "مجھے افسوس ہے، ہاشو خان! کاش تم نے یہ سب کچھ مجھے پہلے بتا دیا ہوتا۔"

"اب مجھے اپنی شکست اور زخموں کی کوئی پروا نہیں۔" اس کے موٹے موٹے اور بھدے ہونٹوں پر پہلی بار ایسی مسکراہٹ ابھر آئی جس میں طمانیت کا بھرپور تاثر تھا۔

وہ غالباً مارے خوشی کے اپنا ہر دکھ بھول گیا تھا۔

اس نے اپنے صحت مند ہاتھ سے میرا ہاتھ تھام لیا۔

اس کے انداز میں اتنی محبت تھی کہ میرا رواں رواں کانپ گیا۔

اس نے میرا ہاتھ دبا کر چھوڑ دیا۔

میں نے اس کے ٹوٹے ہوئے بازو کا جائزہ لیا۔

ہڈی بری طرح ٹوٹی تھی۔ وہ دیو قامت آدمی بازو کی ذرا سی حرکت پر چیخ پڑتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں تکلیف کی شدت سے آنسو آ گئے تھے... پھر موتی اس کی پلکوں سے ٹوٹ کر رخساروں پر گر گئے... لیکن اس کے ہونٹوں پر اب بھی طمانیت بھری مسکراہٹ تھی۔ بیک وقت دکھ اور راحت کے تاثرات کا امتزاج میں نے زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا اور خود میرے جذبات عجیب سے ہو رہے تھے۔

اس وقت ہم دونوں ایک ایسے علاقے میں تھے جہاں دور دور زندگی کے آثار مفقود تھے۔ ہاشو خان اگرچہ کافی ضبط سے کام لے رہا تھا لیکن مجھے احساس تھا کہ وہ بے پناہ اذیت میں مبتلا ہے۔

"کیا تم کھڑے ہو سکتے ہو؟" میں نے کہا۔

"کیوں نہیں..." اس نے یہ کہہ کر اٹھنے کی کوشش کی لیکن بازو کی ٹوٹی ہوئی ہڈی سے تکلیف کی ایسی لہر اٹھی کہ وہ دلدوز چیخ کے ساتھ دوبارہ زمین پر گر گیا۔

"تم اسی طرح لیٹے رہو، ہاشو خان۔" میں نے کہا "میں ابھی کچھ کرتا ہوں۔ تمھارے بازو نے اگر چند بار مزید حرکت کی تو شاید تم زندگی بھر کے لیے اس بازو سے محروم ہو جاؤ۔"

میں نے کندھے اور ہتھیلی کے درمیان دو جگہ سے اس کے بازو کو تھام کر اٹھایا۔ وہ کراہا۔ اس نے زبان دانتوں تلے دبا لی۔ اس کی پلکیں اس انداز میں پھڑپھڑا رہی تھیں جیسے اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا پھیلتا جا رہا ہو۔

بازو کو اس کے سینے پر آرام دہ حالت میں رکھ کر میں نے اسے لیٹ جانے میں مدد دی۔ دھوپ خاصی تیز ہو گئی تھی اور زمین تپ کر ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی..... ہاشو خان کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں چمک رہی تھیں۔

اس کے انداز سے اب نقاہت جھلکنے لگی تھی۔

میں نے اس گھوڑے کی طرف دیکھا جس پر کچھ دیر قبل میں سوار تھا اور جسے ہاشو خان نے پیٹ میں پوری قوت سے ایک گھونسہ مارا تھا۔ گھوڑے کو نظر انداز کر کے میں ہاشو خان سے الجھ گیا تھا اور پھر اس کی طرف دیکھنے کی مہلت ہی نہیں ملی تھی... اب جو میں نے اس گھوڑے کی طرف دیکھا تو اسے بے حس و حرکت زمین پر پڑے پایا۔ اس کی تڑپ ختم ہو گئی تھی اور اس کا جسم ہمیشہ کے لیے پرسکون ہو گیا تھا۔

گھوڑا مر چکا تھا۔ میں سر سے پاؤں تک کانپ گیا۔

جذبات انسان کو بعض اوقات کس قدر کمزور کر دیتے ہیں۔

میں نے ایک جھرجھری سی لے کر خود کو سنبھالا اور اس گھوڑے کی طرف دیکھا جس پر ہاشو خان نے سوار ہو کر میرا پیچھا کیا تھا۔

گھوڑا وہاں موجود نہیں تھا۔

میں نے اس کی تلاش میں چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ وہ کہیں بھی نظر نہ آیا۔ غالباً ہماری جنگ کے دوران میں وہ بدک کر کسی طرف بھاگ نکلا تھا۔ مجھے تو وہ سمت بھی معلوم نہیں تھی جس طرف وہ فرار ہوا تھا۔ میں عجیب مخمصے میں پھنس گیا۔

میرا گھوڑا مر چکا تھا اور ہاشو خان جس گھوڑے پر میرے تعاقب میں آیا تھا، وہ بھاگ گیا تھا۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ اس صورت حال میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟

سب سے پہلے تو ہاشو خان کے ٹوٹے ہوئے بازو کا کوئی

علاج کرنا چاہیے تھا۔ بچپن میں ماں ریشم جان مختلف جڑی بوٹیوں کے بارے میں مجھے بتاتی رہتی تھیں۔ مجھے چند ایسی جھاڑیوں کا علم تھا جن کے پتے اور چھال زخم کی جگہ لگا دینے سے سکون ملتا ہے۔ میں نے ندی کی طرف دیکھا۔ اسی جانب جھاڑیاں تھیں۔ . . لیکن جھاڑیوں کی طرف جانے سے پہلے ہاشو خان کو کسی سائے دار جگہ پہنچانا بھی ضروری تھا۔

چند لمحوں تک میں سوچ میں ڈوبا رہا۔

اُسے اُٹھا کر درخت کے نیچے پہنچانا مشکل تھا کیوں کہ اس طرح اس کے ٹوٹے ہوئے بازو میں بے پناہ تکلیف ہوتی اور ہڈیوں کا گوشت میں پیوست ہو جانا بھی لازمی تھا۔ ایسی صورت میں درد کی شدت ناقابلِ برداشت ہو جاتی ہے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ ہاشو خان کو کسی سائے دار جگہ پہنچا کر ایسی جڑی بوٹیاں تلاش کروں گا جن کے لیپ سے اس کی تکلیف کم ہو جائے . . . پھر میں ولی خان تک پہنچنے کی کوشش کروں گا۔ وہاں سے کسی گاڑی کا بندوبست کر کے ہاشو خان کو لے جاؤں گا۔

میں اس گھوڑے کے بارے میں تو بھول ہی گیا تھا جس پر ہاشو خان نے میرا تعاقب کیا تھا۔ یہ گھوڑا ندی کے اس پار جھاڑیوں میں کسی جگہ موجود ہونا چاہیے تھا۔ پتہ نہیں ہاشو خان نے اسے کسی درخت سے باندھ بھی دیا تھا یا نہیں۔ اگر وہ اسے یوں ہی چھوڑ آیا تھا تو اب اس کے ملنے کا امکان کم ہی تھا۔ ممکن ہے وہ کسی طرف بھاگ نکلا ہو۔

قریبی درخت بیس قدم دُور تھا۔

یہ ایک گھنا اور سائے دار درخت تھا۔ اس کے نیچے ہاشو خان کو دھوپ سے نجات مل سکتی تھی لیکن اُسے وہاں تک پہنچانا بڑا مسئلہ تھا۔ میں نے اپنی گردن پر لٹکی ہوئی میان سے خنجر نکالا اور مُردہ گھوڑے کی طرف بڑھ گیا۔ ہاشو خان کو درخت تک پہنچانے کا بس ایک ہی طریقہ تھا کہ اُسے گھسیٹ کر درخت کے نیچے پہنچا دیا جائے۔

خنجر نکال کر میں نے گھوڑے کے قریب پہنچتے ہوئے اس کی لگامیں کاٹ لیں۔ ان لگاموں سے میں نے ہاشو خان کے ٹخنوں کو باندھ دیا۔ اب میں اُسے اطمینان سے گھسیٹ کر درخت تک لے جا سکتا تھا۔

ٹخنوں کو باندھنے کے بعد میں نے ہاشو خان کی طرف دیکھا۔ وہ اُکھڑی اُکھڑی سانسیں لے رہا تھا۔ مارے تکلیف کے اس کا چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ اس نے سختی سے آنکھیں بھینچ رکھی تھیں۔ اس کے جبڑے اتنی سختی سے بھینچے ہوئے تھے کہ اس کے رُخساروں کی ہڈیاں بے حد نمایاں نظر آ رہی تھیں۔ اتنی نمایاں کہ اگر وہ جبڑوں پر ذرا سا اور زور ڈالتا تو شاید گوشت چیر کر باہر آ جاتیں۔

اس کا ٹوٹا ہوا بازو اُس کے سینے پر بے جان پڑا تھا۔

"ہاشو خان . . ." میں نے دھیمی آواز میں اُسے پکارا۔

اس کے پپوٹوں میں خفیف سی حرکت ہوئی لیکن آنکھیں نہ کھلیں۔ غالباً وہ بے پناہ نقاہت محسوس کر رہا تھا۔

"ہاشو خان . . ." میں نے اس بار قدرے بلند آواز میں اُسے پکارا لیکن اس نے پھر بھی آنکھیں نہ کھولیں۔

میں ایک طویل سانس لے کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

لگاموں کو تھام کر میں نے ہلکا سا زور لگایا۔

اس کے حلق سے کراہ نکل گئی۔

میں نے کچھ اور زور لگا کر ایک قدم کا فاصلہ طے کیا۔ وہ لگاموں کی مدد سے گھسٹ آیا تھا۔ میں پلٹ کر اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کا مُردہ ہاتھ اب بھی سینے پر تھا۔ گویا کھینچنے سے بازو کے لڑھک کر زمین پر گرنے کا کوئی خدشہ نہیں تھا۔

میں اُسے ایک بار پھر کھینچنے لگا۔

اس نے سر کو تھوڑا سا اُٹھا لیا تھا جس کی وجہ سے اُس کی کھوپڑی زمین سے ٹکرانے سے محفوظ رہی۔ میں اُسے گھسیٹتا رہا۔ وہ کافی وزنی تھا۔ زمین نرم تھی اسی وجہ سے مجھے یقین تھا کہ اُسے زیادہ خراشیں نہیں آئیں گی۔ اس کی قمیص پشت سے رگڑ کھا کر پھٹ سکتی تھی لیکن جب میں اسے گھسیٹتا ہوا درخت کے

پکار
اظہر کلیم
دو جلدوں میں
جلد اول =/150 جلد دوم =/150
مکتبۃ القریش
سرکلر روڈ اردو بازار لاہور
فون 7668958

نیچے لے آیا تو میں نے جائزہ لیا۔ اس کی قمیص کو بھی زیادہ نقصان نہیں پہنچا تھا۔

درخت کے سائے میں پہنچنے کے بعد وہ کچھ دیر تو اپنے پپوٹوں کو حرکت دیتا رہا . . . پھر اس کے پپوٹے بھی ساکت ہو گئے۔ تب میں نے اس کی نبض دیکھی اور دل کی خفیف سی دھڑکن کو محسوس کر کے یقین کر لیا کہ وہ زندہ ہے ورنہ دیکھنے میں وہ ایک غیر معمولی جسامت کی لاش ہی نظر آ رہا تھا۔

اس کے چہرے پر کرب کے تاثرات منجمد ہو گئے تھے۔

میں واپس گھوڑے کی طرف گیا۔

اس کی کاٹھی کھول کر میں نے چاندی کے روپوں سے بھرے ہوئے تھیلے، اپنا مختصر سا سامان اور رائفل بھی لا کر ہاشو خان کے قریب ہی رکھ دی۔ ریوالور کو ہولسٹر میں ڈال کر میں تیزی سے ندی کی طرف چل دیا۔ میں دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کر رہا تھا کہ ہمارے درمیان یہ کشمکش ندی کے قریب ہی ہوئی ورنہ میں گھوڑا دوڑاتا ہوا دُور نکل جاتا اور تب ایسی صورتِ حال پیش آتی تو دشواریوں میں کئی گنا اضافہ ہو گیا ہوتا۔

میں نے ندی کے ٹھنڈے پانی سے برتن بھرا اور فوراً ہی واپس آ گیا۔ ہاشو خان کے چہرے پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹوں نے آبِ حیات کا سا کام کیا۔

وہ جلد ہی ہوش میں آ گیا۔

اس نے آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا . . . پھر اس کے ڈھیلوں نے چکرا کر آس پاس کا جائزہ لیا۔ تب اس کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

میں نے پانی کا برتن اس کے مُنہ سے لگا دیا۔

اس نے بڑے بڑے گھونٹ لے کر پانی کا پورا برتن خالی کر دیا۔

پانی پینے سے اس کے چہرے پر بشاشت آ گئی۔ اس کا ٹوٹا ہوا بازو ابھی تک اس کے سینے پر بے جان پڑا تھا۔ میں نے پانی پلانے سے پہلے اس کے سر کے نیچے گھوڑے کی زین رکھ دی تھی اور وہ اب اس مخصوص تکیے پر سر رکھے، آنکھیں بند کیے دراز تھا۔ کچھ دیر وہ گہری گہری سانسیں لیتا رہا . . . پھر اس نے آنکھیں کھول دیں۔

"اب کیسا محسوس کر رہے ہو، ہاشو خان؟" میں نے پوچھا۔

"یہ چند گھونٹ آبِ حیات ثابت ہوئے ہیں۔"

"تم اب آرام سے لیٹے رہو۔ تمھاری وجہ سے میرا کام کافی بڑھ گیا ہے۔"

"میں نے ابھی تک تمھارا نام نہیں پوچھا۔"

"میرا نام شہباز ہے اور میں تموری قبیلے سے تعلق رکھتا ہوں۔"

"تم ایک عظیم انسان ہو۔ مجھے تمھارے بارے میں کچھ احساس تو ہو رہا تھا لیکن بس بعض اوقات زبان سے نکلے ہوئے چند جملے انسان کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کر دیتے ہیں۔ بہرحال، میں نے اپنی غلط سوچ کا کڑوا پھل پا لیا۔"

"تمھارا گاؤں یہاں سے کتنے فاصلے پر ہے؟" میں نے اس کی پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔ یہ پسینہ بہہ کر اس کے کانوں کی طرف جا رہا تھا۔

"اگر تم تیز رفتاری سے سفر کرو تو کل صبح کا سورج طلوع ہونے تک وہاں پہنچ سکتے ہو۔" اس نے کہا۔

"تمھارے ٹوٹے ہوئے بازو کی وجہ سے تمھیں ساتھ لے جانا ممکن نہیں۔ میں سوچ رہا ہوں، تنہا ہی چلا جاؤں اور ولی خان کو صورتِ حال سے آگاہ کر دوں۔ وہ تمھارے لیے کسی گاڑی اور حکیم کا بندوبست کر دے گا۔"

وہ خاموش رہا۔

"لیکن جانے سے پہلے میں تمھارے لیے تھوڑی سی دوا کا بندوبست کر دیتا ہوں۔ اس طرح تم مدد پہنچنے تک سکون سے وقت گزار سکو گے۔"

"دوا . . . اس ویرانے میں؟"

"میں چند جڑی بوٹیوں کے بارے میں جانتا ہوں۔ انھیں تلاش کر کے میں ایسی دوا تیار کر لوں گا جس سے تمھارے بازو کی تکلیف کم ہو جائے گی۔"

"اوہ، میں تو سمجھا تھا کہ شاید تمھارے تھیلے میں کوئی ایسی چیز ہو گی۔"

اس کے لہجے میں خفیف سی مایوسی محسوس کر کے میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ "گھبرانے کی ضرورت نہیں۔" میں نے اس کا کندھا نرمی سے تھپ تھپاتے ہوئے کہا۔ "میں نیم حکیم ثابت نہیں ہوں گا۔"

میں اُسے اطمینان دلا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

دوبارہ ندی کے کنارے پہنچ کر میں نے جھاڑیوں کو دیکھتے ہوئے آگے بڑھنا شروع کیا . . . پھر میں ندی کے پانی سے گزر کر دوسرے کنارے پہنچ گیا۔ وہاں نسبتاً زیادہ ہریالی تھی۔ مطلوبہ جڑی بوٹیوں کی تلاش میں مجھے زیادہ وقت برباد نہیں کرنا پڑا۔ انھیں حاصل کر کے میں تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

میں اس مقام پر پہنچا، جہاں وہ گھوڑا پڑا ہوا تھا جس پر

چاندی کے روپوں سے بھرے ہوئے تھیلے تھے اور جو گھاٹی سے فرار ہو گیا تھا۔ وہاں پہنچ کر میں نے اس طرف دیکھا جدھر سے ہاشو خان جھاڑیوں سے برآمد ہوا تھا۔

ان جھاڑیوں سے نکل کر میں ایک ایسے درخت تک جا پہنچا، جہاں ایک گھوڑا چر رہا تھا۔ یہ گھوڑا بندھا ہوا نہیں تھا۔ میں نے ایک طویل سانس لی۔ گھوڑا غالباً بہت زیادہ سدھا ہوا تھا۔ میرے قدموں کی چاپ سن کر اس نے ہریالی سے منہ اٹھایا اور میری طرف دیکھا۔

ایک اجنبی کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر وہ زور سے ہنہنایا۔ میں نے اسے چمکارا اور قریب جا کر اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے لگام تھام لی۔ اس نے زیادہ مزاحمت نہیں کی اور جلد ہی رام ہو گیا۔ میں اچھل کر اس کی پشت پہ سوار ہو گیا اور اسے ایڑ لگا دی۔

گھوڑا مضبوط تھا۔ اشارہ پاتے ہی دوڑنے لگا۔

جھاڑیوں کو روندتا ہوا اور ندی کے پانی میں چھینٹے اڑاتا ہوا وہ جلد ہی میدانی جگہ پہنچ گیا۔ دھول کا بادل سا عقب میں چھوڑ کر جب وہ اس درخت کے نیچے پہنچا، جہاں ہاشو خان لیٹا ہوا تھا تو اس نے اپنے مالک کو فوراً ہی پہچان لیا۔ میں اس کی پشت سے کود گیا۔

گھوڑا رک کر ہاشو خان کی طرف دیکھنے لگا۔

"ہاشو خان جیسے مالک کو یوں بے بسی سے زمین پر پڑے دیکھ کر غالباً اسے صدمہ پہنچا تھا۔ میں نے گھوڑے کے حلق سے نکلتی ہوئی سی آوازیں نکلتی محسوس کیں تو اسے تھپک کر دو بڑے بڑے پتھر اٹھا لایا۔

گھوڑا ہاشو خان کو سونگھنے لگا۔

اس کے حلق سے اب بھی کرب ناک آوازیں نکل رہی تھیں۔ وہ بار بار پچھلے سُم زمین پر مار کر اپنی بے چینی کا اظہار کر رہا تھا۔ ہاشو خان نے گھوڑے کے جھکے ہوئے منہ پر اپنے صحت مند ہاتھ کو پھیرتے ہوئے پیار کیا اور اس سے باتیں کرنے لگا۔

میں جھاڑیوں سے جن پتوں، شاخوں اور جڑوں کو منتخب کر کے لایا تھا انھیں پتھروں کی مدد سے پیسنے لگا۔ لیپ تیار کر کے میں نے اپنی چادر سے لمبی پٹی پھاڑ لی۔ درخت سے چند مضبوط شاخیں کاٹ کر میں نے چاقو کی مدد سے کھپچیاں بنائیں اور ہاشو خان کی طرف متوجہ ہو گیا۔

اس کے بازو کو ہاتھ لگایا ہی تھا کہ وہ کرب ناک انداز میں چیخنے لگا۔ میں نے بڑی مشکل سے قمیص کی آستین خنجر سے کاٹ کر اس کا بازو ننگا کیا اور پھر ہڈیوں کو بازو کی سیدھ میں جما کر لیپ کر دیا۔

اس کا چہرہ مارے تکلیف کے سرخ ہو رہا تھا۔

وہ نچلے ہونٹ کو دانتوں میں دبانے کے لیے مجبور ہو گیا۔

لیپ کی وجہ سے اسے جلد ہی سکون محسوس ہوا۔ میں نے شاخوں کے ٹکڑے رکھتے ہوئے کس کر پٹی باندھ دی۔

وہ سینے پہ ہاتھ رکھے بری طرح ہانپ رہا تھا۔ اس کا ماتھا پسینے سے بھیگ چکا تھا اور بوندیں اس کی پلکوں پر بھی لرز رہی تھیں۔ اس کی مونچھوں میں پسینے کی گیلاہٹ کا احساس ہوتا تھا۔

"اب کیسا محسوس کر رہے ہو، ہاشو خان؟" میں نے نرمی سے پوچھا۔

"بہت ہی بہتر۔۔۔ میرا خیال ہے، اب تمھارے ساتھ گھوڑے پر سوار ہو کر چل سکتا ہوں۔"

"نہیں۔۔۔ تمھارا خیال غلط ہے۔" میں نے کہا۔ "تمھارے بازو میں ذرا سی بھی حرکت بے حد تکلیف دہ ہوگی۔ اس کے علاوہ زخم کے بگڑنے کا بھی اندیشہ ہے۔ گھوڑے پر سفر کرنا تمھارے لیے کسی طرح بھی مناسب نہیں ہوگا۔ تم یہیں انتظار کرو۔"

میں نے رائفل اٹھائی اور اس کے دائیں ہاتھ کے قریب

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رکھ دی۔ وہ اپنے اس صحت مند ہاتھ سے بوقتِ ضرورت اسے استعمال کر سکتا تھا۔ اپنے سامان میں سے کچھ غذا نکال کر میں نے اس کے قریب رکھ دی اور اپنا کمبل بھی اس کی ٹانگوں کے قریب ہی رکھ دیا۔

"اس علاقے میں بھیڑیے تو نہیں پائے جاتے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔۔۔ آج تک تو ان کا کوئی غول ادھر دیکھنے میں نہیں آیا۔" اس نے جواب دیا۔ "البتہ سانپ ضرور ہیں۔"

"تمھیں اس انداز میں یہاں چھوڑنا خطرناک ہے۔" میں نے سوچ میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔ "لیکن اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی تو نہیں۔"

"میرے بارے میں زیادہ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں، دوست!" اس نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ "مجھے کچھ نہیں ہوگا۔ جو ہونا تھا، وہ ہو چکا ہے۔ اس سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔"

"ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی اور اس کا بے جا استعمال ہمیشہ خطرناک ثابت ہوتا ہے۔"

"میرے پاس رائفل ہے۔ جب تک اس میں گولی موجود ہے، مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔"

"تب پھر مجھے اجازت دو۔"

"تمھارا گھوڑا تو مر گیا ہے۔۔۔" اس نے کچھ دور پڑے ڈھیر کی طرف نظریں گھما کر دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔۔۔ اور دوسرا فرار ہو گیا ہے۔"

"میرا گھوڑا تمھیں سیدھا ولی خان کے گھر لے جائے گا۔" اس نے گھوڑے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

گھوڑا فوراً ہی اس کا ہاتھ چاٹنے لگا۔

"میرے دوست کو گھر لے جاؤ۔" اس نے محبت سے گھوڑے کی تھوتھنی پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "اور دیکھو۔۔۔ اسے کوئی شکایت کا موقع نہ دینا۔ سمجھ گئے؟"

گھوڑا جواباً ہنہنایا جیسے اس کی بات اچھی طرح سمجھ گیا ہو۔

میں نے ندی سے پانی کا برتن بھر کر اس کے قریب رکھ دیا اور چاندی کے روپوں سے بھرے ہوئے تھیلے زین کے ساتھ کسنے لگا۔ رائفل بھی زین میں اڑس لی اور پھر میں نے ہاشو خان سے سمت معلوم کر کے گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔

گھوڑا پل بھر میں ہوا ہو گیا۔

دھوپ میں اب اتنی تیزی آ گئی تھی کہ سورج کی کرنیں جسم کے کھلے حصوں کو چھیدتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں لیکن مجھے ایک طویل سفر طے کرنا تھا۔

گھوڑا چرنے اور پانی پینے کے بعد تازہ دم ہو چکا تھا۔۔۔ پھر شاید اسے اپنے مالک کے حکم کا بھی پاس تھا کہ وہ طوفانی رفتار سے زمین کو کچلتا ہوا مسلسل آگے بڑھ رہا تھا۔

شام تک یہ سفر اسی تندہی کے ساتھ جاری رہا۔

رات ہوئی تو گھوڑے کی رفتار سے تھکن جھلکنے لگی۔

ہاشو خان نے مجھے ایک چشمے کا پتہ بتایا تھا جو راستے ہی میں پڑتا تھا۔ میری خواہش تھی کہ میں اندھیرا پھیلنے سے پہلے پہلے اس چشمے تک پہنچ جاؤں۔ وہاں گھوڑے کو ہریالی اور پانی مل سکتا تھا اور کچھ دیر آرام کرنے یا پیاس بجھانے کے بعد ہم اپنا سفر رات بھر جاری رکھ سکتے تھے۔

راستے کے بارے میں سمجھتے ہوئے میں نے جو نشانیاں ذہن نشین کی تھیں، اب تک میرا سفر ان کے مطابق ہی ہو رہا تھا لیکن وہ چشمہ کہیں نظر نہیں آ رہا تھا جس کا تذکرہ ہاشو خان نے کیا تھا۔

میدانی علاقہ ختم ہو چکا تھا۔

اب وقفے وقفے سے چھوٹی بڑی چٹانیں راہ میں حائل ہو رہی تھیں۔ گھوڑے کے ہانپنے کی آواز میں بھی شدت آ چکی تھی اور اس کا جسم پسینے میں نہا گیا تھا۔

میں نے لگامیں کھینچ لیں لیکن گھوڑا رکا نہیں۔

وہ آگے بڑھنے کے لیے زور لگاتا رہا۔

میں سمجھ گیا کہ وہ رکنا نہیں چاہتا اور تھکن و پیاس کے باوجود کسی خاص جگہ تک پہنچنے کی مرتوڑ کوشش کر رہا ہے۔

میں نے باگیں ڈھیلی چھوڑ دیں۔

چٹانوں کے مختصر سے، پگڈنڈی نما راستے پہ دوڑتے دوڑتے گھوڑا یکایک ایک چٹان کے قریب خود بخود بے حد آہستہ ہو گیا۔ اس کے کان تیزی سے متحرک ہو گئے تھے جیسے وہ کسی آواز کو سننے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں نے اسے اس کی مرضی پر چھوڑ دیا تھا۔

یہ گھوڑا ہاشو خان کے ساتھ شاید اس طرف ان گنت بار سفر کر چکا تھا اس لیے میں سمجھ چکا تھا کہ اسے باگوں کے ذریعے رہنمائی کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے محض آزمائش کے لیے راستے میں اسے دو ایک بار ادھر ادھر موڑنے کی کوشش

کی تھی تو وہ اشارے کے مطابق گھوم تو گیا تھا لیکن اس کے انداز میں تذبذب کی جھلک آگئی تھی۔ . . اور اس کے بعد لگام میں ڈھیل پڑتے ہی وہ پھر اصل راستے پر تیزی سے دوڑنے لگا تھا۔

چٹان سے ایک پگڈنڈی بائیں جانب جاتی تھی۔ گھوڑا سیدھے راستے کو چھوڑ کر اسی پگڈنڈی پر گھوم گیا۔ . . اور جب وہ اس چٹان سے گزر گیا تو نشیبی علاقے میں اترتے وقت میرے کانوں سے پانی گرنے کی آواز ٹکرانے لگی۔ تب مجھے یاد آیا کہ چشمے کے بارے میں، میں زیادہ توجہ نہیں دے سکا تھا حالانکہ باشو خان نے مجھے اسی مختصر پگڈنڈی سے گھوم جانے کے لیے کہا تھا جس پر گھوڑا اپنی مرضی سے چل رہا تھا۔

عقب میں دوڑتے دوڑتے گھوڑا ایک جگہ رک گیا۔

میں اس کی پیٹھ سے کود کر اترا۔

دائیں جانب شام کے جھٹپٹے میں مجھے پانی کا دھندلا سا عکس نظر آ رہا تھا۔ گھوڑا ہنہنایا اور گھاس پر منہ مارتا ہوا چشمے کی طرف بڑھنے لگا۔

میں بھی چشمے کے قریب جا کھڑا ہوا۔

شام کے سایوں کا رنگ تیزی سے سیاہ ہوتا جا رہا تھا اور ہوا میں گرم جھونکوں کی سی کیفیت ختم ہو گئی تھی۔ . . پھر یہ ہریالی کا نشیبی علاقہ تھا اس لیے یہاں یوں بھی ٹھنڈک کا احساس ہو رہا تھا۔

میں نے منہ ہاتھ دھویا اور خود کو قدرے تر و تازہ کرنے کے بعد گھوڑے کی طرف متوجہ ہوا جو پانی پینے کے بعد چشمے کے آس پاس پھیلے ہوئے سبزے پر منہ مار رہا تھا۔

پہلے میں نے سوچا تھا کہ یہاں کچھ دیر رک کر آرام کروں گا اور کھانے کے بعد ہی آگے چلوں گا۔ . . لیکن پھر میں نے یہ ارادہ رد کر دیا۔ شام کے سائے گہرے ہو کر رات کی سیاہی میں گھل مل رہے تھے اور میں اس وقت چٹانی علاقے میں پہنچ چکا تھا۔ باشو خان نے اپنے گاؤں کی مسافت بتاتے ہوئے کہا تھا کہ اگر میں مسلسل چلتا رہوں تو صبح تک ہی منزلِ مقصود تک پہنچ سکوں گا۔

باشو خان کا خیال آتے ہی میں اٹھ کھڑا ہوا۔

میرے پاس ضائع کرنے کے لیے ایک لمحہ بھی نہیں تھا۔

میں سوچ رہا تھا کہ وہ بے چارہ نہ جانے کس حال میں ہو گا؟ اگرچہ وہ ایک طاقت ور اور غیر معمولی جسامت کا آدمی تھا لیکن اس کے بازو کی ہڈی کچھ اس انداز میں ٹوٹی تھی کہ وہ بے بس ہو کر رہ گیا تھا۔ میں اس کے پاس ایک رائفل چھوڑ آیا تھا لیکن یہ ہتھیار صرف اسی وقت انسان کے لیے کارآمد دوست اور محافظ ثابت ہوتے ہیں جب وہ انھیں استعمال کرنے کے قابل ہو۔

باشو خان کا خیال آتے ہی، گھوڑے کی لگام تھام کر میں ایک تنگ سے راستے پر چلتا ہوا کھلی جگہ نکل آیا جہاں گھوڑے کی پشت پر سوار ہوا اور اُسے منزلِ مقصود کی طرف دوڑانا شروع کر دیا۔ . . گھوڑا تازہ دم ہو چکا تھا۔ اس لیے مجھے توقع تھی کہ سپیدۂ سحر نمودار ہونے تک میں ولی خان تک پہنچ جاؤں گا۔

رات بھر سفر جاری رہا۔

گھوڑے کا جسم پسینے سے نہا گیا تھا اور اس کے ہانپنے کی آواز میں خاصی تیزی آگئی تھی لیکن اس کی رفتار میں کمی نہیں آئی۔ . . حتیٰ کہ سپیدۂ سحر نمودار ہونے لگا اور اس کے ساتھ ہی ایک بستی کے آثار بھی دکھائی دینے لگے۔

گویا میں منزلِ مقصود پر پہنچ گیا تھا۔

مجھے گھوڑے کی رہنمائی نہیں کرنی پڑی۔ میں نے اس کی لگام میں ڈھیل چھوڑ دی تھیں اور وہ خود ہی جانے پہچانے راستوں سے ہوتا ہوا آگے بڑھتا جا رہا تھا۔

اس وقت میں گھوڑے پر بیٹھا گاؤں کی جس گلی میں چل رہا تھا، اس کے دونوں طرف بند دکانیں تھیں۔ گویا یہ اس قصبے کا بازار تھا۔ گاؤں کے بیشتر مکانوں پر خاموشی چھائی ہوئی تھی اور میرے گھوڑے کی ٹاپوں سے گلی میں شور پیدا ہو رہا تھا۔

ابھی تک کسی نے باہر جھانک کر نہیں دیکھا تھا۔ . . لیکن بازار کے دوسرے حصے میں مجھے ایک انسانی شبیہہ متحرک نظر آ رہی تھی۔ کوئی اسی طرف چلا آ رہا تھا جدھر میں اس وقت موجود تھا۔ گھوڑے کے انداز میں ذرا سی بھی ہچکچاہٹ نہیں تھی اس لیے مجھے یقین تھا کہ وہ سیدھا ولی خان کے دروازے تک جا کر ہی دم لے گا۔

فاصلے پر جو انسانی ہیولہ دکھائی دیا تھا، وہ قریب آگیا۔ . . وہ لڑکھڑاتا ہوا چل رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ گر جاتا۔ . . اس کے قریب پہنچ کر میں نے گھوڑے کی لگام کھینچ لی۔

"ولی خان کا مکان اسی طرف ہے؟" میں نے پوچھا۔

اس شخص کی آنکھیں بند تھیں۔ پہلی نظر میں وہ مجھے کوئی اندھا دکھائی دیا لیکن میری آواز سن کر اس کے پپوٹوں میں حرکت سی پیدا ہوئی۔

اس نے آنکھیں کھولیں تو انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ تیز روشنی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی طرف دیکھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس کی آنکھوں پر خمار کا بوجھ تھا اور اس کے لیے اپنی پلکیں اٹھانا مشکل ہو رہی تھیں۔ اس نے میری بات کے جواب میں کچھ کہا لیکن میں سمجھ نہ سکا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ اس وقت نشے میں ہے۔ میرا دل فرنگیوں کے خلاف نفرت سے بھر گیا۔ علاقائی لوگوں میں سے جو بھی ہاتھ لگا، وہ اسے اپنی راہ پر لگا لیتے تھے۔ . . لیکن اس بے راہ روی کے لیے میرے نزدیک فرنگیوں سے زیادہ خود ہمارے اپنے ہی لوگ ذمے دار تھے۔ انھیں دوسروں کے ہاتھوں کٹھ پتلی نہیں بننا چاہیے۔

میں نے گھوڑے کو آگے بڑھا دیا۔

کسی ایسے شخص سے کچھ معلوم کرنا ممکن نہیں ہوتا جسے خود اپنی بھی خبر نہ ہو۔ نہ جانے یہ نشے باز کہاں سے آیا تھا اور کہاں جا رہا تھا۔ اس کے قدم خود اپنے گھر کی طرف اٹھ رہے تھے یا ہر اٹھتا ہوا قدم اسے اپنے گھر سے دور لے جا رہا تھا۔ اس کی مجھے قطعاً خبر نہیں تھی اور غالباً وہ نشے باز بھی اس بات سے بے خبر ہی تھا۔

گاؤں کے مکانوں کی حالت بتا رہی تھی کہ یہاں خوشحال لوگوں کی کمی نہیں ہے۔ میں ولی خان کے بارے میں سوچنے لگا۔ . . لیکن اسی لمحے گھوڑا ایک دروازے کے سامنے رک کر اگلے پاؤں بار بار زمین پر مارنے لگا۔ اس نے ایک دو بار گردن بھی جھٹکی، جیسے مجھے اطلاع دے رہا ہو کہ وہ منزلِ مقصود پر پہنچ چکا تھا اور مجھے اس کی پشت سے اتر جانا چاہیے۔

میں نے گھوڑے سے اتر کر گلی میں دیکھا۔ ایک طرف سناٹا تھا جب کہ دوسری طرف اسی نشے باز کا ہیولہ کسی آوارہ روح کی طرح منڈلاتا ہوا نظر آ رہا تھا۔

میں اس دروازے کی طرف متوجہ ہو گیا جس کے سامنے گھوڑا رک گیا تھا۔ یہ ایک سرائے کا بند دروازہ تھا۔ اندر سے کسی کے چلنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں نے دروازے پر دستک دی۔

اسی لمحے گھوڑا زور سے ہنہنایا۔

میں نے دائیں بائیں دیکھا۔

گھوڑے نے غالباً سرائے میں موجود لوگوں کو اپنی آمد کی اطلاع دی تھی۔ فوراً ہی سرائے کا دروازہ کھل گیا اور ایک شخص نے جھانک کر باہر دیکھا۔ گھوڑے پر نگاہ پڑتے ہی وہ چونک پڑا۔ اس نے میری طرف ایسی نظروں سے دیکھا جیسے میرا تعلق کسی اور سرزمین سے رہا ہو۔ اس کی آنکھوں میں الجھن تھی۔

"اجنبی تم کون ہو؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"میرا نام شہباز ہے اور میں ولی خان سے ملنا چاہتا ہوں۔" میں نے لہجے میں نرمی سمو کر جواب دیا۔

"یہ تم کس سے باتیں کر رہے ہو؟" اندر سے ایک سُریلی نسوانی آواز سنائی دی۔ "دروازہ کھول دو۔"

سرائے کا دروازہ کھل گیا۔ ایک پاکیزہ تاثرات والے چہرے کی مالک لڑکی مجھے سامنے ہی کھڑی دکھائی دی۔ اس نے میری طرف دیکھا اور اس کے ہونٹوں پر استقبالیہ مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔ . . پھر اس کی نگاہ گھوڑے کی طرف گئی تو میں نے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کو دم توڑتے ہوئے دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے ایک عجیب سے تاثر کا اظہار ہونے لگا جسے میں فوری طور پر کوئی نام نہ دے سکا۔

"خوش آمدید، اجنبی!" لڑکی نے جلدی سے سنبھل کر کہا۔ "کیا یہ باشو خان کا گھوڑا ہے؟" اس نے تیر کی طرح سیدھی انگلی گھوڑے کی طرف اٹھا دی۔

"ہاں۔ . . یہ اسی کا گھوڑا ہے۔" میں نے نرمی سے کہا۔ "میں ولی خان سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"اندر آ جاؤ، اجنبی!" لڑکی نے کہا اور دروازے کے سامنے سے ہٹ گئی۔ اس کے انداز میں تذبذب تھا اور اس کے ساتھ کھڑے ہوئے آدمی کی نگاہوں میں میرے لیے سختی آگئی تھی۔ میں نے دیکھا کہ وہ بار بار چور نگاہوں سے بائیں طرف دیکھ رہا تھا۔

اس کے مشکوک انداز نے مجھے اس کی نگاہوں کے تعاقب پر مجبور کر دیا۔ میں نے بائیں دیوار پر ایک رائفل دیکھی۔ وہ غالباً دروازے سے رائفل کے فاصلے کا تعین کر کے اسے جھپٹ لینے کی خواہش میں مبتلا تھا۔ میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

"سنو دوست!" میں نے خوش دلی سے کہا۔ "مجھے اپنا دشمن مت سمجھو، میں دوست ہوں اور ولی خان سے ایک خاص مقصد کے تحت ملنا چاہتا ہوں۔"

میری اس بات نے لڑکی اور اس شخص کو قدرے پُرسکون کر دیا۔ تب غالباً پہلی بار ان دونوں کی نگاہ گھوڑے پر لدے ہوئے تھیلوں پر پڑی۔ . . پھر انھوں نے معنی خیز انداز میں ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور اثبات میں سر ہلا کر رہ گئے۔

"میرے بابا بے حد بیمار ہیں اور اس وقت کسی سے نہیں مل سکتے۔" لڑکی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں اب بھی الجھن کا تاثر تھا لیکن تشویش زائل ہو چکی تھی۔

"ان سے ملنا بے حد ضروری ہے۔"

"میں ان کی بیٹی ہوں۔ مجھ سے۔ . ."

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لاتعداد پراسرار اور سنسنی خیز داستانوں کے خالق

ایم اے راحت

ایک اور ہیبت ناک پراسرار

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

مکتبہ القریش سرکلر روڈ، اُردو بازار، لاہور۔

"میرے پاس ولی خان کی ایک امانت ہے۔" میں نے ٹھوس لہجے میں کہا "اور یہ امانت صرف ولی خان ہی کو دی جاسکتی ہے۔" یہ کہتے ہوئے میں نے گھوڑے سے دونوں تھیلے اُتار لیے۔

"ہاشو خان کہاں ہے؟" لڑکی نے پوچھا۔

"اُدھر۔۔" میں نے اس سمت میں اشارہ کیا جدھر سے آیا تھا "یہاں سے ایک رات اور نصف دن کی مسافت پر معذور پڑا ہے اور اسے کسی طبیب کی شدید ضرورت ہے۔"

"کیا وہ زخمی ہے؟"

"اس کا ایک بازو بُری طرح ٹوٹ گیا ہے۔"

"اوہ۔۔" لڑکی کے ہونٹ سکڑ گئے۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ انداز سوالیہ تھا لیکن وہ سوال کرنے کی جرأت نہ کرسکی۔۔۔ وہ میری آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔۔۔ پھر اس کی پلکیں جُھک گئیں۔ "میرے ساتھ آؤ۔" اس نے کہا اور پلٹ کر ایک دروازے کی طرف چلنے لگی۔

میں تھیلے اُٹھائے اس کے تعاقب میں چل دیا۔

جس شخص نے دروازہ کھولا تھا۔ وہ وہیں کھڑا رہا۔ اس کے انداز سے اب خونخواری جھلکنے لگی تھی۔ میں جیسے ہی اس کے قریب سے گزرا، وہ تیزی سے بائیں دیوار کی طرف لپکا۔ غالباً اس نے دیوار سے ٹنگی ہوئی رائفل اُتار لی تھی لیکن میں نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ لڑکی مجھے ایک کمرے میں لے آئی۔

اس کمرے میں ایک سفید بالوں والا بے حد بُوڑھا آدمی بستر پر دراز تھا۔ اس کی آنکھیں بے پناہ ذہانت کو ظاہر کر رہی تھیں لیکن اس وقت چہرہ بُجھا بُجھا سا تھا جیسے بیماری نے اسے نڈھال کر دیا ہو۔ قدموں کی چاپ اور بیٹی کی آواز پر اس نے آنکھیں کھولی تھیں اور پھر اس نے میرے اجنبی چہرے کو بغور دیکھ کر نگاہ جُھکا لی تھی۔۔۔ اب وہ میرے ہاتھ میں جھولتے ہوئے تھیلوں کو گھور رہا تھا۔ لڑکی ایک طرف کھڑی ہوگئی۔

"بابا۔۔" اس نے مترنم آواز میں کہا "یہ اجنبی آپ سے ملنے کے لیے بضد تھا۔ یہ کوئی امانت آپ تک پہنچانے آیا ہے۔۔۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ یہاں تک اس نے ہاشو خان کے گھوڑے پر سفر کیا ہے۔"

"ہاشو خان کہاں ہے؟" بُوڑھے نے چونک کر پوچھا۔

"سردار ولی خان۔۔" میں نے نرمی سے کہا اور اس کے قریب جاکر رُک گیا "اگر آپ مجھے چند لمحوں کی مہلت دیں تو میں سب کچھ تفصیل سے سُنا دیتا ہوں۔"

"لیکن میں نہیں جانتا تم کون ہو؟"

اس کی آواز، ظاہری جسمی حالت کے مقابلے میں بھاری اور رُعب دار تھی۔ میں نے لڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ بھی تجسس سے میری طرف ہی دیکھ رہی تھی۔ میں نے دونوں تھیلے چارپائی کے قریب رکھ دیے۔

"ان تھیلوں میں وہ افغانی روپے ہیں، جن کی تلاش میں آپ نے ہاشو خان کو بھیجا تھا۔"

"کیا واقعی؟" ولی خان حیرت سے اُچھل پڑا۔

لڑکی نے جلدی سے بڑھ کر اُسے سہارا دیا۔ اُچھلنے کی وجہ سے ولی خان کو اندرونی طور پر شاید کوئی جھٹکا لگ گیا تھا۔ وہ کراہ کر لڑکی کے ہاتھوں میں جھول گیا تو میں نے اُسے سہارا دے کر دوبارہ لٹاتے ہوئے کہا "سردار۔۔۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ دراصل یہ ایک طویل کہانی ہے جس کا آغاز کرنے سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ آپ کسی طبیب کو ایک گھوڑا گاڑی میں، ہاشو خان کو لینے بھیج دیں۔۔۔ معلوم نہیں، اس ویرانے میں بے چارے ہاشو خان پر کیا بیت رہی ہوگی؟"

"عادل کو بلاؤ۔" سردار نے ہانپتے ہوئے کہا۔

اس کی حالت اب بھی غیر تھی۔ لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ وہ سمجھدار بوڑھا خود پر تیزی سے قابو پا رہا ہے۔ لڑکی اس کے حکم پر دوڑتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھی لیکن اس سے پہلے ہی دروازہ کھل گیا اور وہی شخص دکھائی دیا جس نے میرے آتے ہی رائفل کی طرف دوڑ لگادی تھی۔ میرا اندازہ غلط ثابت نہ ہوا۔ اس کے ہاتھ میں اس وقت واقعی ایک رائفل دبی ہوئی تھی۔

"عادل۔۔" بوڑھے ولی خان نے اس شخص سے مخاطب ہوکر کہا "جلدی سے ایک گھوڑا گاڑی تیار کرواؤ اور حکیم کو لے کر اس نوجوان کے بتائے ہوئے مقام پر پہنچو۔"

عادل خان تعظیماً جھکا اور دروازہ بند کرتا ہوا واپس چلا گیا۔

میں چارپائی کی پٹی پر بیٹھ گیا۔ ولی خان نے اپنی بیٹی کا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے کہا "زیتون۔۔۔ جاؤ، مہمان کے لیے کچھ لے آؤ!"

زیتون نے میری طرف دیکھا اور دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ اس کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ طوعاً و کرہاً ہی کمرے سے باہر جا رہی ہے۔ غالباً وہ اس کہانی کو سُننے کے لیے بے چین تھی جو میں ولی خان کو سُنانے والا تھا۔

وہ چلی گئی اور دروازہ بند ہوگیا۔

ولی خان تکیے کے سہارے بیٹھ چکا تھا۔ اس کی سانسیں

ابھی تک بے ترتیب تھیں۔ وہ بار بار ان تھیلیوں کی طرف دیکھ رہا تھا جنھیں میں نے زمین پر ڈال دیا تھا۔

"اے نوجوان۔ سب سے پہلے تو یہ بتاؤ کہ تم کون ہو اور تمھارا کس قبیلے سے تعلق ہے؟" کچھ دیر بعد اس نے میری طرف متوجہ ہوتے ہوئے سوال کیا۔

"میرا نام شہباز ہے اور میں گھوری گاؤں کے سردار کا منہ بولا بیٹا ہوں۔ میرا تعلق منگول خاندان سے ہے جس کا شاید میں اب آخری فرد ہی دنیا میں رہ گیا ہوں۔"

سردار ولی خان نے زبان سے کچھ نہ کہا۔

وہ بس سر ہلا کر رہ گیا تھا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ میری باتوں میں مداخلت کر کے وقت ضائع نہ کرنا چاہتا ہو اور جلد از جلد ہر بات معلوم کر لینا چاہتا ہو۔

میں نے اپنے بارے میں مختصراً بتا کر سردار پارس اور اس کے قبیلے پر ہونے والے ظلم کی داستان سنائی جسے سن کر بوڑھے ولی خان کی حالت غیر ہونے لگی۔ اس کی بوڑھی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے اور اس کے رخساروں پر اُگے ہوئے بالوں کا کھیت سیراب ہونے لگا...

میں اس کے بھائی پارس خان کے ساتھ پیش آنے والے حادثے کی تفصیل سنانے کے دوران میں اسے تسلی بھی دیتا رہا حتیٰ کہ میں نے ہاشم خان سے ملاقات اور جھگڑے کا حال سنایا اور پھر اس کا ہاتھ تھام کر بولا "آپ بیمار ہیں۔ ان باتوں کا زیادہ اثر لینا آپ کی صحت کے لیے اور بھی خراب ہوگا۔"

"پارس... پارس خان" اس کی ہچکیاں لیتے ہوئے کہا اور بڑی ہی زخمی نگاہ سے ان تھیلیوں کی طرف دیکھا جن میں بھری ہوئی دولت کی وجہ سے سردار پارس اور اس کا پورا قبیلہ موت کے منہ میں پہنچ گیا تھا۔

اس کی حالت دیکھ کر مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ ولی خان اور اس کی بیٹی کو اس سے پہلے پارس قبیلے پر ٹوٹ پڑنے والی قیامت کی خبر نہیں ملی تھی۔ میں یہ سوچ کر آزردہ ہو گیا۔ اس وقت ہم دونوں میں حالات کے مطابق کوئی خاص فرق نہیں تھا۔ بالکل ایسے ہی حالات سے میں بھی گزر چکا تھا۔

"آہ... میں شاید اب زندہ نہ رہ سکوں" وہ بڑبڑانے لگا۔ میں سوچوں کے بھنور سے نکل کر ولی خان کی طرف متوجہ ہوا تو اس کی حالت کافی خراب نظر آئی۔ صدمے نے اسے آہستہ آہستہ ہلاکت کی طرف دھکیلنا شروع کر دیا تھا۔

"سردار ولی خان..." میں نے مضبوط لہجے میں کہا "تمھیں حوصلے سے کام لینا چاہیے۔ تمھاری بیٹی کو ابھی تمھاری زندگی درکار ہے۔"

"ہاں... یہاں ہر ایک کو دوسرے کی ضرورت رہتی ہے لیکن اس کے باوجود لوگ دوسروں کو تنہا چھوڑ کر ملک عدم کی راہ لیتے ہیں۔" اس نے ایک دل خراش آہ بھرتے ہوئے کہا۔

اس کی آنکھوں میں سرخی آ گئی تھی۔

میں دیکھ رہا تھا کہ اب اسے مزید سمجھانا بیکار ہے لیکن اس کے باوجود میں اسے ہر ممکن تسلی دیتا رہا۔ اچانک دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے دروازے کی طرف دیکھا۔

زیتون ناشتے کے برتن اٹھائے کھڑی تھی۔

اس کی نگاہ جیسے ہی اپنے باپ کی طرف اٹھی، وہ بری طرح چونک کر آگے بڑھی۔ بے دھیانی کی وجہ سے اس کا پاؤں اپنی شلوار کے کھلے پائنچے میں الجھ گیا اور وہ کوشش کے باوجود بھی نہ سنبھل سکی۔

نتیجۃً وہ منہ کے بل گرنے لگی۔

برتن اس کے ہاتھ سے نکل گئے اور اعصاب شکن آواز کے ساتھ زمین پر آ رہے۔ میں بڑی تیزی سے آگے بڑھا تھا لیکن وہ میرے ہاتھوں کی رسائی سے پہلے ہی گر گئی۔

"بابا..." اس کے حلق سے یہ نام کسی دلدوز کراہ کی طرح نکلا تھا "بابا..." وہ دیوانہ وار اٹھ کر اپنے بوڑھے باپ سے لپٹ گئی۔

دونوں ایک دوسرے سے لپٹے روتے رہے۔ یہ منظر بے حد رقت آمیز تھا۔ میں منہ پھیرنے پر مجبور ہو گیا۔ زیتون اپنے باپ کی بگڑی ہوئی حالت سے متاثر ہو کر رو رہی تھی۔ اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کا بوڑھا باپ کس قیامت خیز تذکرے پر ہلکان ہو رہا ہے۔

"سردار..." میں نے کچھ دیر بعد کہا "میں اپنا فرض پورا کر چکا ہوں۔ اب مجھے اجازت دیجیے۔ میں اپنی منزل سے دور ہوں۔ مجھے ابھی بہت سے ضروری کام نمٹانے ہیں۔"

کمرے میں گونجنے والی سسکیاں یکایک تھم گئیں۔

یوں لگا جیسے انھیں پہلی بار میری موجودگی کا احساس ہوا ہو۔ لڑکی اٹھ گئی۔ اس نے آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھوں سے اپنے باپ کی طرف دیکھا اور پھر میری طرف متوجہ ہو گئی۔

ولی خان کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگ چکا تھا اور اس کی آنکھوں سے ویرانی جھانکنے لگی تھی۔ اس کا دایاں ہاتھ بلند ہوا اور اس نے مجھے اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں اس کے قریب بیٹھ گیا۔

زیتون زمین پر گرے ہوئے برتنوں کو سنبھالنے میں لگ گئی۔

"شہباز..." بوڑھے کے حلق سے میرا نام کراہ بن کر نکلا "کاش میرا کوئی بیٹا ہوتا تو اس بڑھاپے میں..."

"مایوسی کی باتیں نہیں کرتے" میں نے اس کا ہاتھ محبت سے تھام لیا "تم مجھے اپنا بیٹا سمجھ سکتے ہو۔"

"تم عظیم ہو، میرے بچے۔ تمھارے والدین کو کروٹ کروٹ جنت نصیب ہو۔ یقیناً تمھاری ماں بھی کوئی عظیم عورت تھی جس نے تم جیسے بیٹے کو جنم دیا... تم نے میرے دل میں پارس اور اس کے قبیلے کا عبرتناک حال سنا کر جو آگ لگائی تھی، اسے تم نے خود ہی ٹھنڈا کر دیا ہے۔ اگر ہاشم خان تمھارے ہاتھوں انجام کو نہ پہنچا ہوتا تو شاید میرا دل شدت غم سے دھڑکنا ہی بھول جاتا... بس اب تم میرا ایک کام کر دو..."

"میں تمھاری کیا خدمت کر سکتا ہوں، بابا؟"

"اگر تم یہ کام کرنے کا وعدہ کر لو تو مجھے یقین ہے کہ میں سکون کی موت مر سکوں گا۔ وعدہ کرو شہباز تم..."

"میں وعدہ کرتا ہوں کہ جو کچھ میرے بس میں ہوا ضرور کروں گا" میں نے کہا اور زیتون کی طرف دیکھا۔

اچانک مجھے ایک ذہنی جھٹکا لگا۔

وہ زمین پر بیٹھی ہوئی تھی۔

اس کا ایک ہاتھ ایک برتن کی طرف بڑھتے ہوئے وہیں ساکت ہو کر رہ گیا تھا۔ اس کی آنکھیں پتھرائی سی لگ رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے اسے سکتہ ہو گیا ہو۔

"زیتون..." میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اس کی حالت میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہوئی۔

ولی خان بھی بیٹی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"زیتون..." وہ چیخ پڑا۔

بوڑھے کی چیخ بڑی دردناک تھی۔ اس نے غالباً نوعمر زیتون کی روح تک کو جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ سر سے پاؤں تک کانپ گئی اور پھر اس نے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا۔

وہ روتی ہوئی اٹھی اور چیختی ہوئی دروازے سے نکل کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ اس کے انداز سے غم کی شدت اور دیوانگی کا اظہار ہوتا تھا۔

بوڑھا ولی خان ایک بار پھر بے قابو ہو گیا۔

اس نے بھی بلک بلک کر رونا شروع کر دیا تھا۔

"حوصلہ کرو، بابا" میں نے ایک بار پھر اسے سمجھانے کی کوشش کی "اس طرح تم زیتون کو سہارا دینے کی بجائے مزید دکھ میں مبتلا کرنے کا باعث بن رہے ہو۔"

"شہباز... اس خونی دولت کو لے جا کر پارس کے ناخلف بیٹے مراد خان کے حوالے کر دو کہ اب وہی اس کا وارث ہے۔"

"لیکن مجھے تو یہ بتایا گیا تھا..."

"ہاں..." بوڑھے نے میری بات کاٹ دی "مراد خان اس کا حق دار نہیں لیکن وہ میری بیٹی کا سہاگ ہے۔ تم اسے سمجھا بجھا کر یہ ساری دولت اسے دے دینا۔ وہ زندگی بھر دولت کے پیچھے دوڑتا رہے گا لیکن اسے اتنی دولت نہیں مل سکتی۔ شاید اپنے باپ کی موت اور قبیلے کی تباہی کا حال سن کر سنبھل جائے... یہ میری آخری خواہش ہے، شہباز! کاش تم اسے پورا کر دو۔"

"سردار..." میں نے صورت حال سے متاثر ہوتے ہوئے کہا "لیکن وہ بدنصیب نوجوان کہاں ہے؟"

"وہ تین سال پہلے پشاور گیا تھا اور پھر واپس نہیں آیا" بوڑھے نے سسک کر کہا اور اپنے داماد کے بارے میں بتانے لگا۔

مراد خان اور زیتون کی منگنی بچپن ہی میں ہو گئی تھی اور وہ دونوں ایک دوسرے کو بے حد چاہتے تھے لیکن شادی کے چند ماہ بعد مراد خان اپنے چند دوستوں کے ساتھ پشاور چلا گیا جہاں وہ کسی دولت مند بیوہ کی زلف گرہ گیر میں ایسا پھنسا کہ اس نے نہ تو واپس آ کر اپنے والدین کی خبر لی اور نہ ہی اپنی بیوی زیتون کا حال معلوم کیا۔

وہ ایک لالچی نوجوان تھا۔

نہ جانے کیسے اسے نشے کی لت پڑ گئی۔ یہ لت اسے سب سے دور لے گئی۔ وہ چرس کا عادی ہو گیا تھا اور یہ نشہ اسے بالآخر بیگانہ بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ پارس نے دو بار پشاور جا کر اسے سمجھانے کی کوشش کی اور اس سے واپس گھر آنے کے لیے کہا لیکن وہ رضامند نہ ہوا۔

پارس خان کی ناکامی کے بعد تین بزرگوں پر مشتمل ایک وفد اس کے پاس پہنچا لیکن اس نے گھر آنے سے انکار کر دیا۔ اس پر پارس خان نے اسے عاق کر دیا اور یہ اعلان کر دیا کہ جو کوئی بھی مراد خان سے تعلق رکھے گا، وہ پارس قبیلے کا دشمن گردانا جائے گا۔

مراد خان نے پشاور میں جس دولت مند بیوہ سے تعلق بڑھایا تھا، وہ اس کی نشے بازی سے اکتا کر جلد ہی اس سے دور ہٹ گئی اور یوں وہ شہر میں در بدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہو گیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ولی خان نے اپنی بیٹی کا اُجڑا ہوا گھر بسانے کے لیے ایک آخری کوشش کرنی چاہی لیکن قبل از وقت پارس خان کو پتہ چل گیا۔ اس نے اُسے بڑی سختی سے منع کر دیا اور یہ تک اجازت دے دی کہ وہ زیتون کو کسی اور سے بیاہ دے۔

زیتون کو یہ فیصلہ قبول نہیں تھا۔

اس نے ولی خان سے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ وہ مُراد خان کا انتظار کرے گی۔ چاہے وہ اس کی آخری سانس تک واپس نہ آئے۔ وہ کسی اور سے شادی نہیں کرے گی۔

"اس نے یہ پیغام چند روز پہلے ایک آدمی کے ہاتھ بھیجا تھا۔" بوڑھے ولی خان نے سسک کر کہا اور ایک خط نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔

اس خط میں مُراد خان نے اپنی کوتاہیوں کی معافی مانگی تھی اور ولی خان سے درخواست کی تھی کہ وہ چند دنوں کے لیے سردار پارس کے پاس جائے اور اس سے کہے کہ وہ بھی اُسے معاف کر دے۔

"کیا آپ نے سردار پارس سے بات کی؟" میں نے پوچھا۔

"میں بیمار تھا اس لیے نہ جا سکا۔ میں نے پارس قبیلے میں ہونے والی شادی میں شرکت کے لیے جانے والے ایک شخص کے ہاتھ یہ پیغام پارس کو بھجوایا تھا لیکن اس کا جواب ملنے سے قبل ہی تم نے ملک فراز کی درندگی کی داستان سُنا ڈالی۔ . ."

وہ ایک بار پھر سر سے پاؤں تک کانپ گیا۔

غالباً میری باتیں اس کے ذہن میں تازہ ہو گئی تھیں۔

"اب مُراد خان کے علاوہ زیتون کا کوئی سہارا نہیں۔ اسے اُس کے پاس پہنچا دو اور یہ ساری دولت بھی اسے دے دو۔ اُسے غیرت دلاؤ کہ وہ اپنے آپ کو سنبھالے اور اپنے خاندان کا نام مٹنے نہ دے۔ . . اُسے سمجھانا کہ وہ طاقت وَر بنے اور اپنے باپ کے خون کا بدلہ ضرور لے۔ شاید اسی طرح اس کی بخشش ہو جائے ورنہ قیامت کے روز اس کا گریبان ہو گا اور پارس کا ہاتھ۔ . ."

میں نے خط تہ کر کے جیب میں رکھ لیا۔

"مجھے ایک کام سے پشاور جانا ہے۔" میں نے دھیمی آواز میں بتایا۔ "میں وہاں تمھارے داماد کو تلاش کرنے کی کوشش کروں گا۔ تم بے فکر ہو سردار۔ میں اُسے خوب سمجھاؤں گا۔"

"میں یقین رکھتا ہوں کہ تمھیں اپنے مقصد میں ناکامی نہیں ہو۔ . . زیتون کو ساتھ لے جانا۔ عادل آ جائے تو اُسے بتا پیغام۔ . ."

"مایوسی کی باتیں نہ کرو، بابا۔" میں نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔ "عادل پرسوں تک واپس آ جائے گا۔ مجھے دو تین روز کے لیے ایک جگہ جانا ہے، تب تک میں بھی لوٹ آؤں گا، تب تم ہمیں اپنے سامنے رُخصت کرنا۔ عادل کی واپسی۔ . ."

بوڑھے ولی خان نے جلدی سے میری بات کاٹی۔

"نہیں۔ . . میری چند سانسیں باقی ہیں۔ میں عادل کی واپسی تک زندہ نہیں رہ سکتا۔ مجھے خوشی ہے کہ خدا نے تمھیں میری موت سے پہلے فرشتۂ رحمت بنا کر بھیج دیا۔ اب میں سکون سے مر سکوں گا۔"

اس کی سانسیں اُکھڑی ہوئی محسوس ہوئیں۔

میں نے اسے لٹا دیا اور اس کی ہتھیلیاں سہلانے لگا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے چہرے پر اب پہلے جیسی ویرانی نہیں تھی بلکہ وہ پُرسکون لگ رہا تھا۔ . . بے حد مطمئن۔ . .

میں اس کی ہتھیلیاں سہلاتا رہا۔

کچھ دیر بعد وہ کچھ اور سنبھل گیا۔

اس کے ہونٹوں کی سختی، نرمی میں بدل گئی اور پھر شاید نیند نے اس کے پورے جسم کو اپنی وادی میں گھسیٹ لیا تھا۔

وہ سو گیا۔ میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔

محض دیکھنے سے یہ اندازہ لگانا ممکن نہیں تھا کہ وہ محض سو رہا ہے یا اُسے وہ نیند آ چکی ہے جس سے کبھی کوئی اس دُنیا میں بیدار نہیں ہوتا۔ . . میں نے اس کی نبض ٹٹولی۔

نبض میں دھیمی سی تڑپ زندگی کا اظہار کر رہی تھی۔

میں اُٹھ کھڑا ہوا۔

یہ بوڑھا ایک عرصے سے دل و دماغ پر اپنی بیٹی کا بوجھ لیے زندگی گزار رہا تھا۔ . . آج شاید میری وجہ سے اس کا یہ بوجھ ہٹ گیا تھا۔ غالباً وہ یہ سوچ کر خود کو مطمئن کرنے میں کامیاب ہو گیا

دو جلدیں
ایم اے راحت
قیمت ۳۰۰ روپے
تاریک وادی

تھا کہ جو شخص چاندی کا اتنا بڑا خزانہ اس کے دُشمنوں سے چھین کر لا سکتا ہے، وہ اس کی آخری خواہش ضرور پوری کر دے گا۔

انسان کیسی کیسی خواہشوں میں مبتلا ہو کر اپنی زندگی گزار رہا ہے۔ اسے محسوس کر کے میں ایک طویل سانس لیتا ہوا اُٹھ گیا۔ میں اس لڑکی کی بھی خبر لینا چاہتا تھا جو منہ چھپا کر شاید دوسرے کمرے میں سسک رہی تھی۔

مجھے اس نوجوان پر بے حد غصہ آ رہا تھا جس نے جھوٹی تسکین اور محض آوارگی کی خاطر زیتون جیسی پیاری عورت کو ٹھکرا دیا تھا۔ بوڑھا اب بھی بے حس و حرکت لیٹا ہوا تھا۔ میں اس کو چادر اوڑھا کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

دوسرے کمرے میں لڑکی ایک چارپائی پر اوندھی پڑی سسکیاں لے رہی تھی۔ میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے قریب جا کھڑا ہوا۔

"زیتون۔ . ." میں نے اُسے دھیمی آواز میں کہا۔

اس کی سسکیاں اور تیز ہو گئیں۔

میں نے محبت اور شفقت سے اس کی چادر اس کے سر پر ڈالی جو سر سے ڈھلک کر اس کے قریب ہی پڑی تھی۔

. . . پھر میں نے اس کا کندھا تھپ تھپایا۔

"زیتون اُٹھ جاؤ۔ تمھارے بابا نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔" میں نے محبت بھری آواز میں کہا۔ "فی الحال تو تمھیں خود کو سنبھالنا ہے۔ اس کے بعد اپنے بوڑھے باپ کو تسلی دو۔ اُسے تمھاری خوشیوں کی ضرورت ہے۔ آنسو پونچھ لو بہن۔ تم اب تنہا نہیں ہو۔ میں تمھارے ساتھ ہوں۔"

وہ تڑپ کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"شہباز بھائی۔ . ." اس کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔

"ہاں۔ . . مجھے افسوس ہے کہ تم لوگوں کے ساتھ زمانے نے بڑی زیادتی کی ہے۔ . . لیکن انسان ہمیشہ اپنے مقدر ہی سے ہارتا ہے۔" میں نے اس کا کندھا تھپ تھپا کر محبت سے کہا۔ "لیکن انسان کو صبر کرنا چاہیے۔ اپنی سی کوشش ضرور کی جائے کہ صبر کا پھل اللہ تعالیٰ میٹھا ہی دیتا ہے۔"

اس کی بھیگی ہوئی آنکھوں سے نمی کے قطرے اس کے رخساروں پر گرتے رہے حتیٰ کہ وہ آہستہ آہستہ پُرسکون ہوتی چلی گئی۔

مجھے خوشی ہوئی کہ میری وجہ سے دو دُکھے ہوئے انسانوں کو سکون مل رہا تھا۔

"بابا۔ . . بابا کیسے ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"میں نے انھیں سُلا دیا ہے۔"

"اوہ۔ . . چچا پارس اور ان کے خاندان پر کیا گزری، شہباز، مجھے بتاؤ۔ کیا وہ ملک فراز ہی کے ظلم و ستم کا نشانہ بنے ہیں؟"

"ان سب باتوں کو بھول جاؤ اور خود کو مُراد خان کے پاس چلنے کے لیے تیار کر لو۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"مُراد خان۔ . ." اس نے زیرِ لب اس نام کو دُہرایا۔

"ہاں۔ . . ہم پشاور جا رہے ہیں۔"

اس کی پلکیں حیا سے جھک گئیں۔

میں نے اُسے سمجھایا کہ مجھے اپنا ضروری سامان خزانے سے لینے کے لیے دو ایک روز کے لیے جانا پڑے گا۔ اس لیے میری واپسی تک وہ پُرسکون رہے اور اپنے بوڑھے باپ کے سامنے ہنستی مسکراتی رہے ورنہ وہ جانبر نہ ہو سکے گا۔ میں اس سے رخصت ہو کر بیرونی دروازے کی طرف چل دیا۔

"شہباز۔ . ." اس کی آواز عقب سے آئی۔

میں نے پلٹ کر دیکھا۔

"تم کھانا کھائے بغیر ہی چلے جاؤ گے؟"

"میں جلد از جلد رخصت ہو جانا چاہتا ہوں۔ تمھاری مہمان نوازی سے لطف اندوز ہونے کے لیے ابھی ساری زندگی پڑی ہے۔" میں نے یہ کہہ کر ایک بار پھر اُسے صورتِ حال کے تحت سمجھایا اور باہر آ گیا۔

عادل نے میرا گھوڑا اصطبل میں لے جا کر باندھ دیا تھا۔

میں نے گھوڑا کھولا اور اس کی لگام تھام کر باہر بازار میں آ گیا۔ قصبے کا بازار اب بارونق ہو گیا تھا۔ میں نے اس سرائے کی طرف دیکھا جس سے میں ابھی ابھی نکل کر آیا تھا۔ نہ جانے ولی خان نے سرائے میں مسافروں کو ٹھہرانے کا سلسلہ کیوں ختم کر دیا تھا۔

چلتے چلتے میں ایک قہوہ خانے کے سامنے رُک گیا۔

مجھے بھوک کا احساس ہو رہا تھا۔ سوچا کہ قہوے کے گھونٹ حلق سے اُتارنے کے ساتھ ساتھ اگر یہاں کچھ کھانے کو بھی مل جائے تو اچھا ہو گا۔ گھوڑے کو باہر ہی چھوڑ کر میں اندر چلا گیا۔

قہوہ خانے میں اس وقت صرف تین آدمی تھے۔

میں ایک چارپائی پر بیٹھ گیا۔

ان تینوں نے میری طرف دیکھا۔

ان کی آنکھوں میں اجنبیت تھی لیکن چمک یہ ظاہر کر رہی تھی کہ وہ میرے بارے میں تجسس کا شکار ہیں۔

میں ان کی طرف منہ پھیر کر بیٹھ گیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

قہوہ خانے سے مجھے کھانے کے لیے جو کچھ بھی ملا، اُسے پیٹ میں اتار کر میں ادائیگی کرتا ہُوا باہر آ گیا۔ گھوڑے کی پُشت پر سوار ہو کر میں اس طرف چل دیا جدھر خوارزم کا قصبہ واقع تھا۔

خوارزم میں مجھے بے پناہ تکلیف کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ میں خیر خان کی سازش کا شکار ہو کر زخمی ہو گیا تھا... لیکن قدرت نے اس دیار غیر میں بھی میرے لیے دو ہمدرد پیدا کر دیے تھے۔ جنھوں نے میری جان بچائی اور میری دیکھ بھال کی حتیٰ کہ رفیق یہاں آ پہنچا اور مجھے ساتھ لے آیا۔

میری آنکھوں میں گل کا معصوم چہرہ گھوم گیا اور پھر اُس کی حالت بھی میری نگاہوں میں گھومتی رہی جس میں اُسے مرتے وقت مبتلا دیکھ کر مجھ پر دیوانگی طاری ہو گئی تھی۔

خوارزم پہنچتے پہنچتے مجھے شام ہو گئی۔

گھوڑا نڈھال ہو رہا تھا۔

میں نے اُسے سرائے کے باہر چھوڑا اور سرائے کے مالک بابا رحمان سے ملا۔ وہ مجھے دیکھ کر بے حد خوش ہُوا۔ میرا تھیلا اُس کے پاس محفوظ تھا۔ میں ایک چارپائی پر لیٹ گیا اور صبح تک کے لیے غافل ہو گیا۔

اگلے روز میں نے واپسی کا ارادہ کیا۔

رحمان بابا سے رُخصت ہوتے وقت میں نے اُس سے کتے کے بارے میں پُوچھا: "وہ کتا کہاں ہے، بابا؟"

"وہ نہ جانے کہاں مارا مارا پھر رہا ہو گا۔" رحمان نے مُسکرا کر کہا: "تمھارے جانے کے بعد میں نے اُسے دروازے کے سامنے بیٹھے پایا تھا۔ اس کے بعد وہ اِدھر اُدھر سُونگھتا رہا... پھر لوٹ کر نہیں آیا۔"

میں سرائے سے باہر آ گیا۔

رات بھر آرام کرنے سے اور چارہ کھانے کے بعد گھوڑا بھی تازہ دم ہو چکا تھا۔ میں نے ولی خان کے گاؤں کی طرف سفر شروع کر دیا۔

شام تک میں وہاں پہنچ گیا۔

راستے میں کوئی ناخوش گوار حادثہ پیش نہیں آیا۔ جب میں ولی خان کی سرائے پہنچا تو عادل واپس آ چکا تھا۔ باشو خان اُسے زندہ حالت میں ہی مل گیا تھا اور وہ اُسے گھوڑا گاڑی میں ساتھ لے آیا تھا۔ جب میں اندر کمرے میں پہنچا تو باشو خان چارپائی پر دراز تھا۔ بان کی یہ چارپائی اس کا بوجھ سہارنے میں ناکام ہو رہی تھی اور بان جھک کر زمین سے چھو رہا تھا۔

مجھ پر نگاہ پڑتے ہی اُس کے ہونٹ مسکراہٹ سے پھیل گئے۔

"شہباز، تم کہاں چلے گئے تھے؟ میں بڑی بے چینی سے تمھارا انتظار کر رہا تھا۔" اس نے اپنا صحت مند ہاتھ میری طرف بڑھاتے ہُوئے کہا۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"مجھے خوارزم سے اپنا کچھ سامان لانا تھا۔" میں نے جواب دیا اور دُوسری چارپائی پر اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

میں نے باشو خان کا جائزہ لیا۔

اس کے چہرے پر اب تکلیف کی کوئی علامت نہیں تھی۔ عادل جاتے وقت قصبے سے حکیم کو ساتھ لے گیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ باشو خان کے بازو پر پٹی بندھی ہُوئی ہے اور اس کا بازو اس کے سینے پر رکھا ہُوا ہے۔

"تمھارے بازو کا کیا حال ہے؟" میں نے پُوچھا۔

"اب پہلے جیسی تکلیف نہیں رہی۔" اس نے مُسکرا کر جواب دیا۔ "ویسے میں جب بھی اس منظر کو ذہن میں لاتا ہُوں..."

"ماضی کو بھُول جاؤ، باشو خان۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہُوئے سنجیدگی سے کہا: "ولی خان کی طبیعت اب کیسی ہے؟"

"تم تو جادوگر ہو، شہباز۔" باشو خان نے ہنس کر کہا: "میں جب سے یہاں آیا ہُوں، زیتون اور ولی خان نے تمھارے بارے میں تعریفیں کر کر کے مجھے رشک میں مبتلا کر دیا ہے۔"

"میں بھلا کس قابل ہُوں۔" میں نے انکسار سے کہا۔

"تم جس قابل ہو، میں خوب جانتا ہُوں۔" اس کے لہجے میں مزاح تھا: "کم از کم اس ٹوٹے ہُوئے بازو کو دیکھ کر ہر شخص بہ آسانی سے سمجھ سکتا ہے کہ تم کس قابل ہو۔"

نئے افق کا مقبول سلسلہ

سرفروش

نامور مصنف اظہر کلیم

کے ایڈونچرس قلم سے

دو حصوں میں مکمل سیٹ =/100

مکتبہ القریش سرکلر روڈ اردو بازار لاہور

فون 7668958

"میں ذرا ولی خان سے مل لُوں۔" میں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"اوہ شہباز... تم آ گئے۔" اچانک عقب سے آواز سنائی دی۔ یہ زیتون کی آواز تھی: "ٹھہرو، میں پہلے بابا کو تمھاری آمد کی اطلاع دے دوں۔" یہ کہہ کر وہ دوڑتی ہُوئی چلی گئی۔

میں دوبارہ چارپائی پر بیٹھ گیا۔

کچھ ہی دیر بعد ولی خان بھی اسی کمرے میں آ گیا۔ اُسے بستر سے اُٹھ کر چلتے پھرتے دیکھ کر مجھے بے پناہ خوشی ہُوئی۔ وہ اب خاصا تن درست لگ رہا تھا حالانکہ جب میں خوارزم کی طرف روانہ ہُوا تھا تو اس وقت میرے ذہن میں ان گنت وسوسے تھے اور اس بات کی توقع ذرا کم ہی تھی کہ میں واپسی میں اس بڈھے کو زندہ حالت میں بھی دیکھ سکوں گا۔

... لیکن وہ نہ صرف زندہ تھا بلکہ چل پھر بھی رہا تھا۔

اس کے چہرے پر سکون ہی سکون تھا۔

میں نے زیتون کی طرف دیکھا۔

وہ بھی بے حد خوش تھی۔

میں سمجھ گیا کہ اس نے میری ہدایت پر عمل کرتے ہُوئے نہ صرف اپنے بابا کو سنبھالا دیا بلکہ خود بھی سنبھل گئی۔ میں نے قدموں کی آہٹ سُن کر عقب میں دیکھا تو عادل خان نظر آیا۔

وہ مجھے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

اس کی آنکھوں میں اب بھی میرے لیے شکوک کے سائے تھے۔ وہ دروازے ہی میں رُک کر مجھے گھورنے لگا۔

"عادل خان..." باشو خان نے اُسے دیکھتے ہی پکارا۔ "آؤ میں تمھیں مگوری کے شہ زور سے ملواؤں۔ یہ وہی نوجوان ہے جس نے باشو خان کا بازو توڑ ڈالا تھا۔"

وہ آہستہ آہستہ آگے آیا۔

"تم مجھ سے کچھ ناراض معلوم ہوتے ہو، دوست۔" میں نے مُسکرا کر کہا اور اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

"میں اتنی جلدی کسی سے متاثر نہیں ہوتا۔" اس کا لہجہ کھردرا تھا۔

"حالانکہ تم غلط بیانی سے کام لے رہے ہو۔"

"کیا مطلب؟"

"تم مجھ سے متاثر ہو چکے ہو۔" میں نے کہا۔

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟" اس کا لہجہ خونخوار ہو گیا۔

"متاثر بُرے معنوں میں بھی تو ہُوا جاتا ہے نا"

باشو خان ہنس پڑا۔

"عادل..." اس نے ٹھہری ہُوئی آواز میں اُسے سمجھایا۔ "شہباز کے بارے میں ہر بُرے خیال کو دل سے نکال دو۔ یہ ہمارے سردار کا ہی نہیں میرا بھی محسن ہے۔"

عادل نے اثبات میں سر ہلا دیا لیکن اس کی آنکھوں سے شکوک کی پرچھائیاں دُور نہ ہُوئیں۔ زیتون کھانا لے آئی۔ اس دوران میں باتیں بھی ہُوتی رہیں۔

رات کو سونے سے پیشتر یہ بات طے ہو گئی کہ میں، عادل اور زیتون تینوں پشاور جائیں گے۔ ولی خان نے عادل کو تین گاڑیاں تیار کرنے کا حکم دے دیا تھا۔ ایک گھوڑا گاڑی اور دو خچر گاڑیاں تھیں۔

باشو خان آزردہ ہو گیا۔

وہ ساتھ جانا چاہتا تھا لیکن اس کی حالت کسی مُہم جُوئی کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ میں دیر تک اس کے پاس بیٹھا رہا اور اِدھر اُدھر کی باتوں سے اس کا دل بہلاتا رہا۔

... پھر میں سونے کے ارادے سے اُٹھ گیا۔

پُوری رات بے چینی سے گزری کیوں کہ میں جانتا تھا کہ زیتون اور چاندی کے روپوں کو ساتھ لے جانا کسی طرح بھی خطرے سے خالی نہیں ہے۔ ملک نواز کو میرے بارے میں اطلاع مل چکی ہو گی اور وہ انتقام کی آگ میں جلتا ہُوا درندہ بن چکا ہو گا۔

اِدھر عادل کے انداز سے اب بھی یہ ظاہر ہوتا تھا کہ اس کا دل میری طرف سے صاف نہیں ہُوا۔ کسی ایسے آدمی کے ساتھ کسی مُہم پر جانا یُوں بھی خطرناک ہوتا ہے۔ میں نے ہر وسوسے اور ہر خیال کو ذہن سے جھٹک کر سو جانے کی کوشش کی۔ قبل از وقت کچھ سوچنا بیکار تھا۔

نیند آ گئی لیکن یہ سکون کی نیند نہیں تھی۔

●

اگلے روز صبح دس بجے کے قریب ہمارا قافلہ روانہ ہُوا۔ سب سے آگے آگے وہ خچر گاڑی تھی جس کے کوچوان کا فرض عادل خان ادا کر رہا تھا۔ درمیان میں گھوڑا گاڑی تھی۔ اس میں زیتون سوار ہوئی تھی۔ آخری خچر گاڑی کو گھوڑا گاڑی سے باندھ دیا گیا۔

یہ منصوبہ رات باتوں ہی باتوں میں ولی خان اور میں نے مل کر تیار کیا تھا۔ تین گاڑیاں اور ایک گھڑ سوار دُور سے دیکھنے میں خاصا بڑا قافلہ محسوس ہو سکتا تھا۔ ایک فالتو گھوڑا بھی ساتھ لے لیا گیا تا کہ بوقت ضرورت عادل خان کے استعمال میں آ سکے۔

قصبے سے نکلتے وقت لوگوں نے اس قافلے کو حیرت سے

دیکھا تھا لیکن عادل خان اور زیتون کی موجودگی نے انھیں کچھ بولنے کا موقع نہیں دیا۔ میں گھوڑے پر سوار اس خچر گاڑی کے ساتھ ساتھ تھا جس میں عادل خان سوار تھا۔ چلنے سے پہلے میں نے پشاور جانے والے تین مختلف راستوں کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا اور ان میں سے ایک جو قدرے مختصر لیکن پیچیدہ تھا، اس کا انتخاب کر کے سفر شروع کر دیا تھا۔

دوپہر تک ہم پہاڑی علاقے میں پہنچ گئے۔

اب ہمیں صبح تک اسی چٹانی سلسلے میں سفر کرنا تھا۔

سہ پہر کے وقت ایک جگہ رُک کر ہم نے کھانا کھایا اور اس کے فوراً ہی بعد آگے بڑھ گئے۔ شام تک کوئی ناگوار صورت حال پیدا نہ ہوئی لیکن نہ جانے کیوں مجھے بار بار یہ احساس ہو رہا تھا کہ تاریکی کے پردوں میں ہمارے لیے ان گنت مصائب پوشیدہ ہیں۔

سورج رفتہ رفتہ ڈوب رہا تھا۔

اب تک عادل خان سے میری کوئی قابلِ ذکر بات چیت نہیں ہوئی تھی۔ میں نے اُسے کئی بار کن انکھیوں سے اپنی طرف متوجہ پایا تھا۔ شاید اس لیے دو ایک بار میرے ذہن میں یہ خیال بھی پیدا ہوا کہ کہیں یہ شخص ملک نواز کے ساتھیوں میں سے تو نہیں ہے۔ اگر ایسا تھا تو میرے لیے مزید مسائل پیدا ہو گئے تھے۔ مجھے آس پاس کا خیال رکھنے کے علاوہ اس شخص کی طرف سے بھی محتاط رہنا پڑے گا۔

رات ہونے سے پہلے میں نے قافلہ رکوا کر زیتون کو اگلی خچر گاڑی میں عادل کی جگہ بٹھا دیا اور عادل سے کہا کہ وہ گھوڑے پر سوار ہو کر قافلے کے ساتھ ساتھ چلے۔ اب تینوں گاڑیاں ایک سلسلے میں بندھ گئی تھیں۔

میری اس تجویز پر اُس نے کوئی اختلاف نہیں کیا۔

اب ہم دونوں اپنے اپنے گھوڑے پر سوار قافلے کے دائیں بائیں چل رہے تھے۔ عادل خان زیادہ تر خاموش ہی رہا۔ زیتون مجھ سے باتیں کرتی رہی لیکن یہ باتیں زیادہ تر علاقائی کہانیوں کے بارے میں تھیں۔

شام کے سائے جیسے ہی گہرے ہوئے ہمارا یہ مختصر لیکن تین گاڑیوں پر مشتمل قافلہ ایک درّے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔

ہم نے درّے کا دُور ہی سے جائزہ لیا اور جہاں تک تاریکی میں میری نگاہ کام کر سکتی تھی، میں نے دیکھا اور محسوس کیا کہ درّے سے خیریت کے ساتھ گزر گئے تو میلوں تک کوئی ناخوش گوار صورت حال پیدا نہیں ہو گی۔

... لیکن ابھی ہمارا قافلہ درّے کی طرف گھوما ہی تھا کہ اچانک فضا گولیوں سے گونج اُٹھی۔

چٹانوں میں گولیوں کی یہ آوازیں چاروں طرف سے آتی محسوس ہوتی تھیں۔ "سنبھلو، عادل خان..." میں نے کہا اور گھوڑے کی لگام کھینچ لی۔

اچانک سامنے والی گاڑی کے خچر بھڑک اُٹھے اور اُنھوں نے تیزی سے دوڑنا شروع کر دیا۔ راستہ ناہموار تھا۔ معاً ایک خچر نے ٹھوکر کھائی اور گر گیا۔ دوسرا بھی اس کے ساتھ ہی لڑھکا۔ گاڑی اُلٹ گئی۔

میرے کانوں سے زیتون کی آواز ٹکرائی۔

وہ بُری طرح چیخ پڑی تھی۔

میں زبان کو دانتوں تلے دبا کر رہ گیا۔

زیتون کی چیخ کچھ ایسی تھی جیسے وہ چیختی ہوئی کسی بلند مقام سے گہرائی میں گر رہی ہو۔ تیز چیخ آہستہ آہستہ معدوم ہو گئی اور پھر سناٹا چھا گیا۔

"عادل خان..." میں نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا "میں زندہ ہوں" اس کی غراہٹ سنائی دی۔ "لیکن یہ گولیاں ہم پر کس سمت سے چلائی گئی تھیں؟"

"ابھی تک میں خود بھی اندازہ نہیں لگا سکا" میں نے جواب دیا اور تاریکی میں اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ "زیتون کو دیکھو۔"

"وہ شاید گاڑی سے بائیں طرف کے نشیب میں لڑھک گئی ہے" عادل نے جواب دیا۔ اس کے لہجے میں گہری تشویش تھی۔

اچانک مجھے ایک گھوڑے کی ٹاپیں سنائی دیں۔

یہ آوازیں بائیں طرف سے آ رہی تھیں۔

"لڑکی ہے، سردار..." کسی نے چیخ کر کہا۔

میں نے گھوڑے کو سختی سے وہیں روک لیا جہاں وہ کھڑا تھا۔ میں سننا چاہتا تھا کہ زیتون کس حال میں ہے۔

"کیا یہ زندہ ہے؟" ایک بھاری آواز سنائی دی۔

"ملک نواز..." عادل بڑبڑایا۔

میں نے بھی یہ آواز پہچان لی تھی۔ یہ ملک نواز ہی تھا۔

"بے ہوش ہے اور اسے کافی خراشیں آئی ہیں" پہلی آواز دوبارہ سنائی دی۔ "اگر نشیب میں نرم جھاڑیاں نہ ہوتیں تو شاید یہ قیمہ بن کر ہی نیچے پہنچتی۔"

"ٹھیک ہے۔ اس کا زندہ رہنا ہی ہمارے لیے کارآمد ہے" ملک نواز کی آواز سنائی دی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اب میری سمجھ میں آیا کہ درحقیقت کیا ہوا تھا۔ ملک نواز نے ایسی چال چلی تھی جس کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے نشیب میں رہ کر فائرنگ کی تھی اور اس کے دو تین ساتھی اوپر پہاڑوں پر بھی موجود تھے۔ بیک وقت ہونے والی دو طرفہ فائرنگ سے ہمیں کسی جانی نقصان سے دوچار نہیں ہونا پڑا لیکن زیتون اُن کے ہاتھوں میں جا پہنچی تھی۔

میں خاموشی سے نشیب سے اُٹھنے والی آوازیں سُنتا رہا۔

"یہ زندہ لڑکی ہمارے لیے چاندی کا ذخیرہ ہے" ملک نواز نے قہقہہ لگا کر کہا۔ "میں ایک ایسے شخص کو جانتا ہوں جو اس کی زندگی کے بدلے چاندی کا ذخیرہ میرے حوالے کر سکتا ہے۔ اسے کوئی تکلیف نہ دینا۔ میں اس نعمتِ غیر مترقبہ کو ہاتھ سے کھونا نہیں چاہتا۔"

میں نے آواز سے اس کی موجودگی کی سمت کا تعین کیا لیکن میں اُسے کوئی نقصان پہنچانے میں کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے قہقہے نے میرا خون کھولا دیا تھا۔

"اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟" عادل نے تشویش سے کہا۔ اس نے آواز بے حد دھیمی رکھی تھی۔ "وہ لوگ نشیب میں ہیں اور زیتون بھی اس وقت اُن کے قبضے میں ہے اس لیے اُن سے مقابلہ بھی نہیں کر سکتے۔"

"خاموش رہو" میں نے دھیمی آواز میں اُسے ڈانٹ دیا۔ "یقیناً دو تین آدمی اُوپر چٹانوں پر بھی موجود ہیں۔"

"میں نیچے جا رہا ہوں" وہ غرایا۔

"وہ کس لیے؟"

"زیتون کو اُن کے قبضے میں نہیں رہنے دیا جا سکتا۔"

"اس طرح تم اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔"

"مجھے اپنی زندگی کی کوئی پروا نہیں۔"

"اس کا مجھے اچھی طرح سے اندازہ ہے" میں نے زہرخند سے کہا "لیکن فی الحال مجھے تمھاری زندگی کی پروا ہے۔ میں تمھیں خودکشی کی اجازت نہیں دے سکتا... اور یہ بات ذہن میں رکھو کہ تمھاری موت سے زیتون کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔"

وہ خاموش ہو گیا۔

میں نے اُن ترپالوں کا جائزہ لیا جن کے سائبان تینوں گاڑیوں پر بنے ہوئے تھے۔ تاریکی میں ٹٹول کر میں نے اُن سوراخوں کو دیکھا جو فائرنگ کی وجہ سے پیدا ہوئے تھے۔ یہ سوراخ تعداد میں بارہ تھے۔ آٹھ سوراخ دائیں جانب اور چار بائیں طرف سے محسوس ہوئے۔ بائیں طرف کے سوراخ بلندی پر تھے جبکہ دائیں طرف کے سوراخ ترپالوں کے نچلے حصے میں محسوس ہوئے۔ میرا اندازہ غلط نہیں تھا۔ دائیں طرف کی چٹانوں میں بلندی پر ملک نواز کے آدمی موجود تھے۔

نشیب سے اب بھی باتوں کی آواز آ رہی تھی۔

... لیکن جو کوئی بھی بول رہا تھا، اس کی آواز دھیمی تھی یا پھر وہ مخالف سمت میں متوجہ ہو کر بول رہا تھا، اس وجہ سے اس کی باتیں میری سمجھ میں نہ آ سکیں۔

آوازوں سے سمت کا اندازہ ہوتا تھا اور یہ بات بھی ذہن میں آتی تھی کہ وہ کتنی گہرائی میں ہیں۔ میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ مجھے نہ صرف زیتون کو واپس لینا تھا بلکہ چاندی کے ذخیرے کو بحفاظت پشاور تک پہنچانا تھا۔ دوبدو مقابلہ ہوتا تو شاید اب تک سارا کھیل ہی ختم ہو جاتا... صورت حال بے حد الجھی ہوئی اور خطرناک تھی۔

عادل خان اب خاموش تھا۔ شاید وہ بھی کچھ سوچ رہا تھا لیکن میری ترش روی کے بعد اس نے کوئی خیال آرائی نہیں کی تھی۔

فائرنگ کے بعد گاڑیاں کافی آگے آ گئی تھیں اس لیے اوپر چٹانوں میں موجود لوگوں کا سُراغ لگانا اس وقت تک ممکن نہیں تھا جب تک اوپر سے ویسی ہی کوئی آواز نہ سنائی دیتی جیسی کہ نشیب سے سنائی دے رہی تھی۔ میں نے ان چٹانوں کی طرف دیکھا۔

کوئی متحرک سایہ تک دکھائی نہیں دیا۔

اچانک میرے ذہن میں ملک نواز کی بات گھوم گئی۔

اس نے کہا تھا کہ زیتون کو زندہ رکھا جائے اور اُسے کوئی تکلیف نہ پہنچائی جائے کیونکہ وہ اس کے بدلے میں چاندی کا ذخیرہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ زیتون کو زندہ رکھا جائے اور اُسے کوئی تکلیف نہ پہنچائی جائے کیوں کہ وہ اس کے بدلے میں چاندی کا ذخیرہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ وقتی طور پر زیتون کی زندگی محفوظ ہو گئی تھی۔

میں گھوڑے سے کود کر گرے ہوئے خچروں کے پاس پہنچا۔ اُنھیں اُٹھانے کے بعد میں نے بندھی ہوئی گاڑیوں کو کھولنا شروع کر دیا۔ عادل خاموشی سے میرے قریب ہی رہا... لیکن پھر شاید تجسس نے اسے بولنے پر مجبور کر ہی دیا۔

"یہ تم کیا کر رہے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"سنو، عادل خان" میں نے دھیمی آواز میں اُسے سمجھایا۔ "اس وقت ہم بُری طرح پھنس گئے ہیں۔ عقب میں جانا حماقت ہے۔ سامنے درّہ ہے اور دونوں طرف دشمن موجود ہے۔ ہمارے پاس آگے بڑھنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔ میں چاندی کے

اس ذخیرے کو محفوظ کر لینا چاہتا ہوں۔ اس سے ہم کم از کم زیتون کر ڈر واپس لے ہی سکتے ہیں۔"

"لیکن ولی خان یہ کبھی پسند نہیں کرے گا کہ چاندی کا ذخیرہ یوں آسانی سے دُشمن کے ہاتھوں میں چلا جائے۔"

"جس کی بیٹی دُشمن کے ہاتھوں میں جا چکی ہو، وہ دولت کی پروا نہیں کر سکتا۔ دولت اور بیٹی میں تمھارے نزدیک کوئی فرق ہے یا نہیں . . . ؟"

وہ میری بات سمجھ گیا۔

"لیکن اب تم کیا کرو گے ؟"

"میں ان سے تھوڑی سی تجارت کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ "انھیں زیتون کو ہمارے حوالے کرنا پڑے گا۔"

میں نے اُسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ "آؤ . . . اپنے گھوڑے کو بھی ہمیں لے لو۔ ہم گاڑیوں کے درمیان رہ کر دَرّے سے گزرنے کی کوشش کریں گے۔"

"لیکن ملک نواز . . . "

"یہ لوگ یقیناً ہمارا پیچھا کریں گے اور اس دوران کوئی نہ کوئی بہتر صورتِ حال پیدا ہو جائے گی۔ بس مجھے ان میں سے کسی سے بات کرنے کا موقع مل جانا چاہیے۔"

گھوڑوں کو دائیں بائیں رکھتے ہوئے میں نے گاڑیوں کے درمیان آگے بڑھنا شروع کر دیا۔ آگے والے خچروں کی لگامیں، میں نے گاڑی کے پیچھے سے نکال کر تھام لی تھیں۔ اس لیے وہ بھاگ نہیں سکتے تھے۔

ہم دَرّے میں داخل ہو گئے۔

میرا خیال غلط ثابت ہوا۔ دَرّے میں ہمیں گولیوں کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اس کا مطلب تھا کہ ملک نواز کے پاس زیادہ آدمی نہیں تھے ورنہ وہ اس دَرّے کو کبھی خالی ہرگز نہ چھوڑتا۔

دَرّے سے نکلنے کے بعد ہم جس راستے پر چل رہے تھے، اس کے دائیں بائیں اُونچی چٹانوں کے سلسلے تھے۔ اچانک میری نگاہ ایک جھونپڑے پر پڑی۔ میں نے عادل کو اُس طرف متوجہ کیا۔

"یہ لکڑی سے بنا ہوا جھونپڑا ہے۔" میں نے کہا۔ "کیا تم نے پہلے بھی کبھی دیکھا ہے؟"

"نہیں . . . میں چھ ماہ بعد اِدھر سے گزر رہا ہوں۔ یہ پچھلے چھ مہینوں کے دوران کسی نے بنایا ہے۔"

"آؤ دیکھتے ہیں، کس نے بنایا ہے۔" میں نے گاڑیوں کو روکا

سرزمین نیپال کا سچا واقعہ

درندہ

یعقوب جمیل کے ہوشربا قلم سے

دو جلدوں میں

مکمل سیٹ =/300 روپے

مکتبہ القریش سرکلر روڈ اردو بازار لاہور

فون 7668958

اور گھوڑے کے پیچھے سے نکل کر اس جھونپڑے کی طرف بڑھ گیا۔

میں دبے قدموں چل رہا تھا۔

جھونپڑے میں روشنی کی ہلکی سی بھی کرن نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ جھونپڑا ویران ہے یا پھر اس کا مکین اندھیرے میں لیٹا گہری نیند کے مزے لوٹ رہا ہے۔

قریب پہنچ کر میں نے دستک دی۔

کوئی جواب نہ ملا۔

جھونپڑا دائیں جانب اُونچی چٹانوں کے درمیان تھوڑی سی ہموار جگہ پر بنایا گیا تھا۔ اس کی ساخت بتاتی تھی کہ اسے کسی مقامی آدمی نے تعمیر نہیں کیا بلکہ یہ فرنگی ہاتھوں کا کمال ہے۔

میں نے دوسری بار دستک دی۔

"کوئی ہے؟" میں نے قدرے بلند آواز میں پوچھا۔

جواب ندارد۔

"اندر کوئی نہیں ہے۔" عقب سے عادل خان کی آواز آئی۔ "میرا خیال ہے یہ ان فرنگیوں نے بنایا ہے جو اچھے موسم کے ختم ہوتے ہی یہاں معدنیات کی تلاش میں آ کر قیام کرتے ہیں۔ ان دنوں میں چونکہ کسی آدمی کو اس طرف آنے کی ضرورت نہیں پڑتی اس لیے وہ اطمینان سے اپنا کام کرتے رہتے ہیں لیکن جیسے ہی موسم اچھا ہوتا ہے اور ہمارے قافلے اس علاقے کی طرف نکلتے ہیں، انھیں یہاں سے فرار ہو جانا پڑتا ہے۔"

میں نے دروازے پر دباؤ ڈالا۔

دروازہ ایک کیل کی مدد سے بند کیا گیا تھا۔

زور پڑنے پر کواڑ کھل گیا۔

میں نے اندر قدم رکھنے سے پہلے احتیاطاً ریوالور نکال کر ہاتھ میں لے لیا تھا تاکہ کسی بھی ناخوش گوار صورتِ حال سے بروقت نمٹا جا سکے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

. . . لیکن وہ جھونپڑا واقعی خالی تھا۔

جھونپڑے میں داخل ہونے کے بعد میں نے ماچس کی ایک تیلی جلا کر جائزہ لیا اور یہ دیکھ کر چونکے بغیر نہ رہ سکا کہ اس کا عقبی حصّہ دراصل ایک غار کے دہانے پر واقع ہے۔ میں فرنگیوں کی ہوشیاری کو سراہے بغیر نہ رہ سکا۔ دُور سے اس جھونپڑے کو دیکھ کر کسی کو خاص بات کا احساس نہیں ہو سکتا تھا۔ . . میں نے پلٹ کر عادل کی طرف دیکھا۔

"تم باہر کا خیال رکھو۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ اس غار میں کیا ہے۔" میں نے اسے غار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور رائفل سنبھالتا ہوا باہر چلا گیا۔

میں ماچس کی تیلی جلا کر اسے دونوں ہاتھوں سے ڈھانپے غار میں داخل ہوا تو یہ دیکھ کر خوشی سے اچھلے بغیر نہ رہ سکا کہ وہاں تین پیٹیاں پڑی ہوئی ہیں۔

میں نے ان پیٹیوں پر بارود کے نشانات دیکھ لیے تھے۔

ایک پیٹی کو کھول کر میں نے اطمینان کر لیا کہ اس میں واقعی بارود کی سلاخیں موجود ہیں۔ اس غار کا جائزہ لیتے ہوئے مجھے اندازہ ہو گیا کہ اسے معدنیات کی تلاش میں دھماکے سے پھٹنے والے مسالے کی مدد سے بنایا گیا تھا اور پھر کسی وجہ سے کام ادھورا ہی چھوڑ کر فرنگیوں کو یہاں سے فرار ہونا پڑا تھا۔

میں نے غار کا جائزہ لینے کے بعد ایک پیٹی اُٹھا لی۔

اب میرا رُخ باہر کی جانب تھا۔

اس بارود کے ذخیرے نے میری ایک بہت بڑی اُلجھن حل کر دی تھی۔ ورنہ میرا ذہن اب تیزی سے ایک منصوبے کا تانا بانا بُن رہا تھا۔

باہر عادل خان بے چین کھڑا تھا۔

"میرا خیال ہے، وہ لوگ آس پاس ہی کہیں موجود ہیں۔" اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا پھر چونک پڑا۔ "یہ تم نے کیا اُٹھا رکھا ہے؟"

"بارود کی پیٹی ہے۔"

"اوہ . . ." اس کے حلق سے اطمینان کی سانس نکل گئی۔

"ایسی دو پیٹیاں اور بھی غار میں موجود ہیں۔ اُنھیں جلدی سے اُٹھا لاؤ اور گاڑیوں تک پہنچاؤ۔"

میں پیٹی اُٹھائے عقبی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

جب میں اسے عقبی گاڑی میں رکھ کر کھول رہا تھا تو عادل خان دونوں پیٹیاں اُٹھائے آ گیا۔ وہ ہانپ رہا تھا۔

"ایک پیٹی درمیانی گاڑی میں اور دوسری پہلی گاڑی میں رکھ دو۔" میں نے کہا۔ "جلدی کرو، ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔"

میں اب گھوڑوں کی ٹاپیں سُن رہا تھا۔

ملک نواز نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہمارا تعاقب شروع کر دیا تھا اور یہی میری خواہش بھی تھی۔ میرے ہاتھ تیزی سے کام کرنے لگے۔ ملک نواز نے اپنی ذہانت سے جس طرح مجھے حیرت میں ڈال کر کامیابی حاصل کی تھی، بالکل اُسی طرح میں اسے اپنے منصوبے کا شکار بنا کر حیرت زدہ کرنا چاہتا تھا۔

میں نے بارود کی پیٹی کھول کر ایک چادر پھاڑی اور پھر اس کی ایک لمبی سی رسّی بنا کر مٹی کے تیل میں بھگو لی۔ اس رسّی کا ایک سرا میں نے بارود کی پیٹی میں دبا دیا اور دُوسرے کو اس جگہ باندھ دیا جہاں گاڑی بان کے بیٹھنے کی جگہ تھی۔

عادل خان پیٹیاں میری ہدایت کے مطابق رکھ کر واپس آ گیا تھا اور اُلجھن سے میری ایک ایک حرکت کا جائزہ لے رہا تھا۔

میں نے اپنا کام مکمل کر کے ایک بار پھر خالی گاڑیوں کے قافلے کو آگے بڑھانا شروع کر دیا۔ اب گھوڑوں کی ٹاپیں گونجتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے بائیں طرف کی چٹانوں کی اوٹ میں بھی گھوڑے چل رہے ہوں۔

"ان چٹانوں کے عقب میں وہی ڈھلان ہے جو دَرّے کے ابتدائی حصّے میں پھیلی ہوئی ہے؟" میں نے عادل خان سے پوچھا۔

"ہاں . . . آگے جا کر بائیں سمت میں وہی ڈھلان دکھائی دے گی۔" اس نے جواب دیا۔ "اس ڈھلان میں پگڈنڈی موجود ہے۔"

"بہت خوب۔ بات کچھ بنتی نظر آ رہی ہے۔" میں نے اطمینان کے اظہار میں کہا اور مسکرانے لگا۔

ہم ان چٹانوں سے نکل آئے۔

اب دائیں طرف بھی ڈھلان تھی اور بائیں طرف بھی نشیبی علاقہ نظر آ رہا تھا۔ میں نے اس راستے کو تلاش کرنے کی کوشش کی جس کا عادل خان نے کچھ دیر پہلے تذکرہ کیا تھا۔

اس راستے پر گھوڑے دکھائی دے رہے تھے۔

میں نے ان ہیولوں کو دیکھ کر پہچان لیا کہ زیتون ان لوگوں کے ساتھ ہے۔ اسے ایک شخص نے گھوڑے پر اپنے ساتھ بٹھا رکھا تھا۔ اُسی لمحے غالباً نیچے والوں نے ہمیں بھی دیکھ لیا۔

"رُکو . . ." ایک دھاڑ سنائی دی۔ "ہم تمھیں دیکھ چکے ہیں۔"

"مجھے معلوم ہے۔" میں نے جواباً کہا۔

"ہمیں اس چاندی کے ذخیرے کی ضرورت ہے۔"

"اس کی ضرورت تو مجھے بھی ہے۔"

"لیکن ولی خان کی بیٹی ہمارے پاس ہے۔"

"پھر تم کیا چاہتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"کیا تم ہم سے تجارت کرنا چاہتے ہو؟"
"میں تمھارا مطلب نہیں سمجھا۔"
"لڑکی واپس لے لو اور چاندی ہمارے حوالے کر دو۔"
"تم کون ہو؟"
"ملک نواز۔۔۔"
"کیا لڑکی زندہ ہے۔ اسے کوئی نقصان تو نہیں پہنچا؟" میں نے صورتِ حال کا جائزہ لیتے ہوئے چیخ کر پوچھا۔
"میں ٹھیک ہوں، شہباز۔۔۔" زیتون کی آواز سنائی دی۔ فاصلے کی وجہ سے میں یہ اندازہ نہ لگا سکا کہ وہ خوف زدہ ہے یا نہیں لیکن آواز اطمینان دار تھی جس سے پتہ چلتا تھا کہ نرم جھاڑیوں میں گرنے کی وجہ سے اسے کوئی خطرناک چوٹ نہیں آئی ہوگی۔
"یہ تبادلہ کیسے ہوگا، ملک نواز؟" میں نے پوچھا۔
"میں ایک آدمی کو بھیج رہا ہوں۔ تھیلے اسے دے دو۔"
"یہ تو تجارت کا کوئی طریقہ نہ ہُوا۔"
"اس کے بعد میں لڑکی کو چھوڑ دوں گا۔"
"میں تمھاری زبان پر اعتماد نہیں کر سکتا۔"
"تم کتنے آدمی ہو؟"
"صرف چھ عدد۔۔۔" میں نے جھوٹ بولا۔
وہ ہنس پڑا۔ اس کا قہقہہ نشیب سے گونجتا ہُوا میری سماعت تک پہنچا تھا اور یہ اندازہ نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ میری بات کو جھوٹ سمجھ کر ہنس پڑا ہے یا اس کے انداز میں حقارت ہے۔
"کیا چھ آدمی تیس آدمیوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں؟" کچھ دیر بعد اس کی آواز سنائی دی۔
"حالات پر منحصر ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "اگر تم تبادلہ چاہتے ہو تو اس کی ایک ہی صورت ہے۔"
"وہ کیا؟"
"زیتون کو کسی آدمی کے ساتھ اُوپر بھیج دو۔ جیسے ہی وہ آدھے راستے میں پہنچے گا۔ میں گاڑیاں آگے بڑھا دوں گا۔ آخری گاڑی میں چاندی کے تھیلے موجود ہیں۔ پہلی دونوں گاڑیاں آگے بڑھ جائیں تو زیتون کو لانے والا آدمی اُسے چھوڑ کر تیسری گاڑی کی طرف چل دے۔ دونوں بیک وقت اپنی اپنی منزل پر پہنچیں گے۔ اس طرح لڑکی ہمارے پاس اور تمھارا آدمی چاندی کے ذخیرے کے پاس پہنچ جائے گا۔"
"لیکن اگر اس میں کوئی دھوکا ہُوا تو۔۔۔؟"
"تمھارا آدمی تمھیں چیخ کر اطلاع دے سکتا ہے۔ اس وقت تک ہم تمھاری دسترس میں رہیں گے جو چاہے کر گزرنا۔"
جواباً خاموشی طاری ہو گئی۔
غالباً وہ میری اس تجویز پر غور کر رہا تھا۔
"مجھے اس معاملے میں کسی شرارت کی بُو آ رہی ہے۔" کچھ دیر بعد اس نے سخت لہجے میں کہا۔
"تو پھر لڑکی کو گولی مار دو اور اپنے آدمیوں سے کہو کہ وہ ہم پر فائرنگ شروع کر دیں۔ اس طرح زیادہ بہتر انداز میں فیصلہ ہو جائے گا۔" میں نے چیخ کر جواب دیا۔
"ٹھیک ہے۔ میں تیار ہوں۔"
"تبادلے کے لیے یا جنگ کے لیے؟"
"فی الحال تبادلہ ہی ہو جائے۔"
"لڑکی کو کسی کے ساتھ اُوپر بھیج دو۔" میں نے کہا اور رائفل ہاتھ میں لے لی۔ میری نگاہ ان سایوں پر جمی ہوئی تھی جو نگ جھک کیے ہوئے تھے نیچے ڈھلانی راستے پر کھڑے تھے۔
زیتون کو گھوڑے سے اُتارا گیا۔۔۔ پھر ایک آدمی اسے ساتھ لے کر اُوپر چڑھتا دکھائی دیا۔
"اس شخص سے کہو کہ ماچس کی تیلی جلا کر زیتون کو دکھائے۔" میں نے کہا۔ "کہیں ایسا تو نہیں کہ تم نے اپنے کسی آدمی کو عورت بنا کر اُوپر بھیج دیا ہے؟"
دونوں متحرک سائے رُک گئے۔
"ماچس جلا کر لڑکی کا چہرہ اسے دکھا دو۔" ملک نواز نے غصیلی آواز میں کہا۔ اس نے میرے بارے میں چند ناشائستہ الفاظ بھی کہے تھے لیکن آواز کو دھیما رکھا تھا۔
میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔
جو سائے نشیب سے اُوپر کی طرف آ رہے تھے، ان میں سے

الف لیلہ ڈائجسٹ کا مقبول سلسلہ
انسان اور شیطان
مصنف محمد فراز
امیر علی خان کی خوفناک آپ بیتی
مکتبہ القریش سرکلر روڈ اردو بازار لاہور
فون 7668958

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایک نے ماچس کی تیلی جلائی۔ میں نے واضح طور پر زیتون کو دیکھ لیا۔ "ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "اب تم دونوں اُوپر آ سکتے ہو۔"
تیلی بجھ گئی اور وہ سائے ایک بار پھر متحرک ہو گئے۔
"ٹھہرو۔۔۔" ملک نواز نے دھاڑ کر کہا۔ "سنو۔۔۔ مجھے کیسے یقین آئے کہ اس گاڑی میں چاندی موجود ہے؟"
دونوں سائے رُک گئے۔
میں نے درمیانی گھوڑا گاڑی میں رکھے ہُوئے تھیلوں میں سے ایک افغانی روپیہ نکالا اور اُسے اندازے سے آواز کی طرف پھینک دیا۔ "تم اس روپے کو دیکھ کر اپنا اطمینان کر سکتے ہو۔" میں نے کہا۔
کچھ دیر بعد روپیہ کسی چٹان سے ٹکرایا تو شاید اسی سے ملک نواز کا اطمینان ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے آدمی کو حکم دیا کہ وہ لڑکی کو اُوپر لے جائے۔ مجھے یقین ہے کہ ملک نواز نے وہ روپیہ نہیں دیکھا تھا۔ اس وقت اگر میں روپے کی بجائے کوئی اور چیز پھینک کر بھی یہی بات کہہ دیتا تو وہ یقیناً مان جاتا۔
مجھے اس روپے کے بارے میں افسوس ہونے لگا جو میرے ہاتھ سے نکل کر تاریکیوں میں گم ہو گیا تھا۔
"عادل خان۔۔۔" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ "اپنے آپ کو تیار رکھو۔ عقبی گاڑی کو یہیں چھوڑنا پڑے گا۔ تم دونوں ہی گاڑیاں لے کر آگے بڑھو گے۔ اس دوران میں گھوڑے پر سوار ہو کر تمھارا پیچھا کروں گا۔"
اس نے بے چون وچرا میرے حکم کی تعمیل پر رضامندی ظاہر کر دی۔ میری نگاہ نشیب میں ساکت سایوں پر سے ہوتی ہُوئی زیتون اور اس کے ساتھ آنے والے آدمی کے ہیولے پر جم گئی۔
انھوں نے بڑی تیزی سے ڈھلان کو طے کیا تھا۔
آدھے فاصلے پر وہ رُک گئے۔
"ٹھیک ہے، زیتون۔" میں نے کہا۔ "اب تم متحرک گاڑیوں کی طرف آؤ اور تم۔۔۔" میں نے چیخ کر اس کے قریب کھڑے آدمی کو مخاطب کیا۔ "تم تیسری گاڑی میں رکھے ہُوئے تھیلے لے لو۔"
"جلدی کرو۔۔۔" نیچے سے ملک نواز دھاڑا۔ "اور گاڑی کے پاس پہنچ کر مجھے بتاؤ کہ اس میں چاندی ہے یا نہیں؟"
زیتون تیزی سے اوپر آئی۔
اس وقت تک میرے اشارے پر عادل خان دو گاڑیوں کو آگے بڑھا چکا تھا۔ اسی لمحے ملک نواز کا آدمی تیسری گاڑی کے پاس پہنچ گیا۔ میں نے زیتون کو سہارا دے کر اُوپر اُٹھایا اور اسے گھوڑے پر بٹھا کر ایڑ لگا دی۔
جلد ہی ہم دونوں گاڑیوں کے قریب جا پہنچے۔
عادل خان انھیں تیزی سے دوڑا رہا تھا۔ میں نے دوڑتے ہُوئے گھوڑے سے زیتون کو ایک گاڑی میں اُتار دیا۔۔۔ اور خود گھوڑا روک کر پلٹ پڑا۔
تیسری گاڑی کچھ فاصلے پر تھی۔
میں نے رائفل کی نال اُٹھائی اور اس جگہ کا نشانہ لیا جہاں میں نے مٹی کے تیل میں بھیگی ہُوئی رسّی کا سرا باندھا تھا۔ جو شخص چاندی کے روپوں سے بھرے ہُوئے تھیلے لینے آیا تھا وہ اس وقت گاڑی میں چڑھ رہا تھا۔
میں نے اُوپر تلے دو گولیاں چلائیں۔
چند لمحوں تک تو مجھے یوں لگا جیسے میری چلائی ہُوئی وہ دونوں گولیاں رائگاں گئی ہیں۔۔۔ لیکن پھر ایک کان پھاڑ دھماکا ہُوا۔ گھوڑا گاڑی پُرزوں میں تبدیل ہو گئی۔
میں نے گھوڑا موڑا اور اُسے ایڑ لگا دی۔
مجھے پلٹ کر دیکھنے کی ضرورت نہیں تھی کیوں کہ میں جانتا تھا کہ بارود کی ایک پوری پیٹی کے پھٹ جانے سے کیا نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ ایک چیخ سنائی دی۔ معلوم نہیں کوئی نیچے کھڑے لوگوں میں سے چیخ پڑا تھا یا یہ اسی شخص کی آخری پکار تھی جو چاندی لینے کے لیے گاڑی میں سوار ہو رہا تھا۔
نشیب سے رائفلیں گرج اُٹھیں۔
گولیوں سے پوری وادی گونج رہی تھی۔
میں نے خود کو گھوڑے کی پُشت پر گرا دیا اور اسے جھکی جھکی حالت میں سرپٹ دوڑاتا رہا۔ ایک گولی میرے کان کے قریب سے گزر گئی اور نہ جانے کتنی گولیاں چٹانوں میں پیوست ہو گئیں۔
دھماکے کی وجہ سے گھوڑا بدک گیا تھا اور گاڑیوں کی رفتار بھی پہلے سے کہیں تیز ہو گئی تھی۔
میں گھوڑا دوڑاتا ہُوا گاڑیوں کی آوٹ میں پہنچ گیا۔
راستہ اب ہموار تھا۔
"تیز چلو۔۔۔" میں نے چیخ کر عادل خان سے کہا۔
اس نے گھوڑوں اور خچروں کو بے قابو کر دیا۔ ہر لمحے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے یہ گاڑیاں اُلٹ جائیں گی لیکن ہموار راستے کی وجہ سے کوئی نقصان نہیں ہُوا۔

چٹانی علاقے سے نکل کر میں نے عقب میں دیکھا۔ ابھی تک کوئی متحرک سایہ بھی نظر نہیں آیا تھا۔

گویا وہ لوگ وہیں رُک گئے تھے اور انھیں اپنی شکست کا اندازہ ہو گیا تھا۔ ممکن ہے لالچی ملک نواز اپنی آنکھوں سے یہ دیکھنے کی خواہش میں جلتی ہوئی گاڑی کی طرف چلا گیا ہو کہ وہاں چاندی کے تھیلے موجود ہیں یا نہیں۔

"اب ہمیں یہاں سے راستہ بدل لینا چاہیے۔" عادل خان نے کہا۔ اس نے گھوڑوں اور خچروں کو قابو میں کر لیا تھا اور اس وقت بے حد خوش نظر آ رہا تھا۔

اب تک اس نے میرے ساتھ جو رویہ اختیار کر رکھا تھا، اس میں خاصی تبدیلی آ گئی تھی جسے محسوس کر کے میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

"ٹھیک ہے، عادل خان۔" میں نے قہقہہ لگا کر کہا۔ "اب تم جدھر چاہو، گھوم سکتے ہو۔ راستہ تو صرف تمھیں ہی معلوم ہے۔"

"تم واقعی ایک بہادر نوجوان ہو، شہباز۔" اس نے کہا۔ "مجھے خوشی ہے کہ میری طرف سے تمھارا ذہن صاف ہو گیا ہے۔" میں نے کہا۔ "اب مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں۔"

عادل خان نے راستہ تبدیل کر لیا اور گاڑیاں میدانی علاقے میں دوڑنے لگیں۔

●

زیتون بے حد خوش تھی اور عادل خان بھی بات بے بات ہنسے چلا جا رہا تھا۔ انھیں اس فتح و کامرانی کی بے حد خوشی تھی۔ خوش تو میں بھی تھا لیکن سوچ رہا تھا کہ ملک نواز ایک خطرناک سانپ ہے۔ وہ اس وقت تک مجھے چین سے نہیں بیٹھنے دے گا جب تک اس کا سر اچھی طرح سے نہیں کچل دیا جائے گا۔

میں تصور کی آنکھ سے اس کی حالت کا اندازہ کر سکتا تھا۔ وہ کسی باؤلے کتے کی طرح اپنے آدمیوں پر الٹ پڑا ہو اور چیخ چیخ کر انھیں کہہ رہا ہو گا کہ ہمیں تلاش کیا جائے۔ وہ ہمارے پیچھے نہیں آیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ اُوپر رستے سے ہٹ کر جلتی ہوئی گاڑی کے ملبے کی طرف ہی دوڑا گیا ہو گا۔

اچانک مجھے ان آوازوں کا خیال آیا جنھیں میں نے دھماکے کے بعد سنا تھا۔ اس وقت میں سمجھا تھا کہ شاید ملک کے کچھ آدمی اُوپر رستے پر بھی آ گئے ہیں... لیکن میرا خیال ثابت ہوا۔ غالباً یہ آوازوں کی بازگشت ہی تھی جس نے دھوکا دیا تھا ورنہ اس رستے پر اس وقت کسی نے بھی قدم نہیں رکھا تھا۔

دن نکلنے والا تھا۔

رات بھر میدانی علاقے میں سفر جاری رہا۔

زیتون گاڑی میں سو رہی تھی اور عادل خان بھی بیٹھا اُونگھ رہا تھا۔ میں کسی محافظ کی طرح اپنے گھوڑے پر سوار ان کے ساتھ ساتھ سفر کر رہا تھا۔

میں نے دن نکلنے کے بعد اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ میدانی علاقہ اب ختم ہو رہا تھا۔

ایک بار پھر چٹانیں راہ میں حائل ہو رہی تھیں۔

کسی چشمے یا ندی کی تلاش میں دیکھتے ہوئے مجھے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تو میں عادل خان سے مخاطب ہوا۔

"میرا خیال ہے، اب ہمیں کچھ دیر آرام کر لینا چاہیے۔"

"جیسے تمھاری مرضی۔"

"آس پاس کوئی چشمہ ہے؟"

"اس علاقے میں صرف ایک ندی ہے۔" اس نے ہاتھ سے پیشانی پر چھجا بنا کر آنکھوں کو دھوپ سے بچاتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر گاڑیوں کا رُخ بدل دیا۔

دوپہر تک ہم اس چٹانی علاقے میں سفر کرتے رہے۔

... پھر ندی کے کنارے پہنچ کر عادل گاڑی سے کود گیا۔ اس نے رائفل لی اور کسی شکار کی تلاش میں نکل گیا۔ میں نے گھوڑے کی زین اتاری اور اُسے چرنے کے لیے چھوڑ دیا۔

تمام گھوڑے اور خچر پانی اور ہریالی کی وجہ سے مطمئن نظر آ رہے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ ہمیں ایک گھنٹے سے زیادہ یہاں نہیں رُکنا چاہیے۔ اس خیال کا اظہار میں نے زیتون سے بھی کیا۔

"ہاں... لیکن میرا خیال ہے کہ ملک نواز دھوکا کھا گیا ہے۔" اس نے کہا۔ "وہ شاید یہ تصور بھی نہ کر سکے کہ ہم کس طرف نکل گئے ہیں۔"

"وہ ایک ذہین آدمی ہے۔ غصہ عقل کو کھا جاتا ہے۔ ممکن ہے غصے کی وجہ سے اس کا ذہن کام نہ کرے لیکن یہ ایک سیدھی سی بات ہے کہ ہم جیسے بھاگے ہوئے لوگ کبھی سیدھ میں نہیں چلتے۔"

"لیکن وہ مخالف سمت میں بھی تو جا سکتا ہے۔"

"نہیں... وہ ایسا نہیں کرے گا۔" میں نے کہا۔ "یقیناً وہ اپنے آدمیوں کو تین حصوں میں تقسیم کر کے تینوں سمتوں میں بھیجے گا۔ اب یہ ان آدمیوں پر منحصر ہے کہ وہ کس قدر آرام کرتے ہیں۔ اگر انھوں نے آرام کرنے میں زیادہ وقت ضائع کیا تو تب بھی وہ ہمارے سروں پر آ پہنچیں گے۔"

زیتون خاموش رہی۔

اُسے زیادہ تر ہلکی ہلکی خراشیں آئی تھیں۔

ایک خراش ذرا گہری تھی۔ اس پر میں نے جڑی بوٹیوں کا لیپ سا کر دیا۔ اس کی آنکھوں میں خوف کا نام و نشان تک نہیں تھا۔

"ملک نواز کے ہاتھوں میں جا کر تمھیں خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا، زیتون؟" میں مسکرا کر پوچھا۔

"نہیں..." اس نے متفکر لہجے میں کہا۔

"تم ایک بہادر لڑکی ہو۔"

"دراصل جب میں نشیب میں گری تھی تو میں نے سمجھ لیا تھا کہ اب میں زندہ نہیں رہوں گی... لیکن جب میں زندہ بچی تو مجھے یہ اطمینان بھی ہو گیا کہ خدا مجھے ان وحشیوں کے ہاتھوں مرنے نہیں دے گا... اس کے علاوہ مجھے تمھاری طرف سے بھی توقع تھی۔ تم نے مجھے حیرت میں ڈال دیا، شہباز۔"

"اس وقت تم نے کیا سوچا تھا؟"

"یہی کہ تم مجھے حاصل کر کے انھیں چاندی کا ذخیرہ دے دینے کا فیصلہ کر چکے ہو۔"

"وہ صورت بھی ممکن تھی لیکن ویسا میں صرف اس صورت میں کرتا جب یہ منصوبہ ناکام ہو جاتا۔"

"یہ ایک شان دار منصوبہ تھا۔"

میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

ابھی ہم اس قسم کی باتوں میں مصروف تھے کہ عادل خان واپس آ گیا۔ اس کی پشت پر ایک پہاڑی بکرا لدا ہوا تھا جسے اس نے کسی چٹان سے مار گرایا ہو گا۔

"ان چٹانوں میں اپنی فتح کا جشن منانے کے بارے میں کیا خیال ہے، شہباز؟" اس نے قریب آ کر بکرے کو زمین پر رکھتے ہوئے کہا۔ "دیکھو، میں نے گوشت کا بندوبست کر لیا ہے۔"

"ہاں... لیکن یہاں جشن منا کر ہم دشمن کو اپنے سر پر پہنچنے کا موقع نہیں دے سکتے۔"

"وہ اِدھر نہیں آئیں گے۔" اس نے حتمی لہجے میں کہا۔

"بے جا اعتماد اچھا نہیں ہوتا۔ دشمن کو کمزور اور احمق سمجھنا حماقت ہے، عادل خان۔" میں نے ٹھہرے لہجے میں کہا تو اس نے تائید میں سر ہلا دیا۔

"لیکن ہم کھانے کے بعد ہی یہاں سے روانہ ہوں گے۔" اس نے کہا۔

"ہمارے پاس وقت کم ہے۔ چلو تینوں مل کر کام کرتے ہیں۔ میں آگ جلاتا ہوں اور اس کے بعد بکرے کی کھال اتارنے میں تمھاری مدد کروں گا۔ اس دوران میں زیتون باقی چیزیں تیار کر لے گی۔"

اس وقت ہم تینوں بے حد خوش تھے۔

انداز ایسا ہی تھا جیسے کوئی خوش حال گھرانا آبادی سے دور اس ندی کے کنارے محض تفریح کے لیے آباد ہو گیا ہو۔

پشاور تک ابھی ایک دن اور ایک رات کی مسافت باقی تھی۔

عادل خان نے جس راستے کا انتخاب کیا تھا۔ وہ ایک فوجی چھاؤنی کے قریب سے گزرتا تھا۔ اس لیے میں نے اسے محفوظ سمجھا جب کہ زیتون کے خیال میں کسی فوجی چھاؤنی کے قریب سے گزرنا خطرناک بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ اُسے فرنگیوں سے نفرت ہی نہیں خوف بھی آتا تھا۔

یہ غالباً ان قصے کہانیوں کا قصور تھا جو اُسے بچپن سے اب تک سنائی گئی تھیں اور ان میں فرنگیوں کے مظالم کو اصل سے بڑھا چڑھا کر بیان کیا گیا تھا حالانکہ صورتِ حال اس سے مختلف تھی۔ فرنگی نے اس علاقے میں جتنا نقصان علاقائی لوگوں کے ہاتھوں اُٹھایا تھا اتنا نقصان اس نے شاید ہی کہیں اور برداشت کیا ہو گا... لیکن اس کے باوجود وہ علاقہ غیر پر اپنا تسلط جمانے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا اور اُسے پے در پے شکست کی کھانا پڑ رہی تھی۔

کھانا تیار ہو گیا۔

ہم تینوں ایک ہی دسترخوان پر بیٹھ گئے۔

کھانے سے نمٹ کر عادل خان نے جلدی جلدی گھوڑوں اور خچروں کو گاڑیوں میں جوتنا شروع کر دیا اور میں زیتون کی مدد کرنے لگا۔ اس کے بعد میں نے کاٹھی اُٹھائی اور اپنے گھوڑے کی طرف بڑھ گیا۔ اسی لمحے ایک للکار سنائی دی۔

یہ گرج دار آواز کسی شیر کی دھاڑ جیسی ہی تھی۔

میں تیزی سے پلٹا۔

میرا ہاتھ تیزی سے ریوالور کے دستے پر پہنچ گیا تھا۔

میں نے ریوالور نکالنے میں کسی قسم کی سستی کا مظاہرہ نہیں کیا... لیکن شیر کی طرح گرجنے والا دشمن تھا اس لیے میں نے ایک ہی نظر میں صورتِ حال کا جائزہ لے کر ریوالور دوبارہ ہولسٹر میں رکھ لیا۔

وہ مجھ سے دس قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس کے چہرے پر داڑھی کے بال بڑے بڑے کانٹوں کی طرح نظر آ رہے تھے اور اس کی آنکھیں اتنی سُرخ تھیں کہ ان میں خون تیرتا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کے کپڑے تار تار تھے اور دھجیاں بن کر اس کے جسم پر جھول رہے تھے۔

وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔

اس کے دونوں ہاتھ کسی درندے کے پنجوں کی طرح بلند تھے۔ اس کا انداز جارحانہ تھا لیکن میں اپنی جگہ کسی چٹان کی طرح منجمد کھڑا تھا۔ میری آنکھیں اُس کی ایک ایک حرکت کا جائزہ لے رہی تھیں۔

دھونکنی کی طرح پھولتے اور پچکتے ہوئے سینے پر بالوں کا جنگل صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے ناخن ٹوٹے ہوئے تھے اور اس کے ہونٹوں پر زخموں کی دالی نظر آ رہی تھی۔

اچانک مجھے کسی رائفل کا گھوڑا چڑھانے کی آواز سُنائی دی۔ میں نے وزدیدہ نظروں سے عادل خان کی طرف دیکھا۔ اس نے رائفل کی نال اُس وحشی کی طرف تان رکھی تھی اور کسی بھی لمحے گولی داغنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ "رُک جاؤ، عادل خان!" میں نے بے بسی سے کہا۔ "کیا تم ایک نہتے پر بارُود ضائع کرنا چاہتے ہو؟"

"عادل خان!" وحشی کے حلق سے یہ نام کسی کراہ کی طرح نکلا اور وہ جہاں تھا، وہیں رُک گیا۔

اب اُس کی نگاہ میری بجائے، عادل خان کی طرف اُٹھ گئی تھی۔ وہ یُوں پلکیں جھپکا جھپکا کر عادل کو دیکھ رہا تھا جیسے آنکھوں میں تیرتی ہُوئی خون رنگ سُرخی اُس کی بینائی کو متاثر کر رہی ہو... اور وہ عادل خان کو پہچاننے میں ناکام ہو رہا ہو۔

"عادل خان!" وحشی نے دوبارہ کہا اور وحشیانہ انداز میں ہنس پڑا۔ "تو تم اب اپنے مالک پر گولی چلاؤ گے؟"

"مالک...!" میں بھی چونکے بغیر نہ رہ سکا۔

عادل خان کا مُنہ بھی حیرت اور بے یقینی سے کُھل گیا تھا۔ رائفل کی نال جُھک گئی اور وہ اس وحشی کو گھُورنے لگا جس نے اس کے مالک ہونے کا دعوا کیا تھا۔

وحشی آہستہ آہستہ اب عادل خان کی طرف پیش قدمی کرنے لگا۔ میں خاموش کھڑا، ویرانے کے اس شہنشاہ کو دیکھتا رہا۔ وہ عادل خان کے سامنے جا کر رُک گیا۔ اُسی لمحے زیتون کے حلق سے ایک چیخ نکل گئی اور وہ دوڑتی ہُوئی اس وحشی کی طرف لپکی۔

"مُراد خان!" یہ زیتون کا انداز ہذیانی تھا۔

مجھے یُوں محسوس ہُوا جیسے کسی نے میرے جوش و خروش پہ برف کی ایک بہت بڑی سل رکھ دی ہو۔ میں بھی حیرت زدہ رہ گیا تھا۔ اس نامراد مُراد خان سے اس انداز میں ملاقات ہوگی، یہ تو میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ زیتون اپنے سہاگ سے چمٹ کر بُری طرح سسک پڑی تھی اور وہ وحشی جذبوں کا نقیب غیر متحرک چٹان بن کر کھڑا دُور خلاؤں میں گھُور رہا تھا۔ اب تک زیتون کی سسکیوں سے اس کے وجود میں ذرا سی حرکت بھی نہ

جاسوسی ڈائجسٹ کے مقبول سلسلے
PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk
مکتبہ القریش سرکلر روڈ اردو بازار لاہور
فون 7668958

شہباز
مصنف اظہر کلیم
دو حصوں میں
مکمل سیٹ =/100 روپے
مکتبہ القریش سرکلر روڈ اردو بازار لاہور
فون 7668958

پیدا ہُوئی تھی۔ وہ تباہی کا زندہ مجسمہ تھا۔ نشے نے اُسے بُری طرح چبایا تھا اور وہ ایک ایسا شخص نظر آ رہا تھا جسے کسی دیوپیکر درندے نے ہضم نہ ہونے کی صورت میں واپس زمین پر اُگل دیا ہو۔

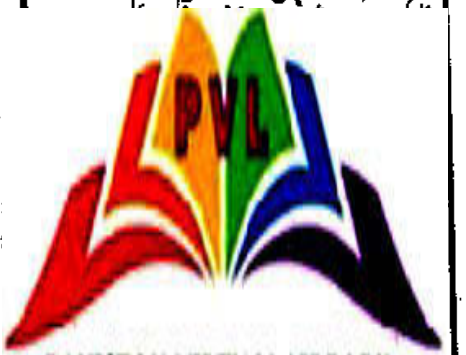

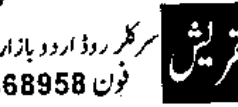

... اور پھر اچانک ہی اس وجُود پر زلزلہ سا طاری ہو گیا۔ میں نے عادل خان کی طرف دیکھا جو آنکھوں کے کنارے پونچھ رہا تھا۔ میرے لبوں سے ایک پُرسکون سانس نکل گئی۔ میں زیتون اور مُراد خان کا ملاپ دیکھ رہا تھا۔ غالباً دونوں بدنصیب ایک ہی وقت میں، خوش بختی کی طرف چل دیے تھے اور یُوں وہ ایک دُوسرے کی منزل بنے، بالآخر آمنے سامنے آ گئے تھے۔

مجھے خوشی تھی کہ مُراد خان، زیتون کو مل گیا۔

دیر تک منظر رقت آمیز رہا... پھر مُراد خان کے پھٹے ہونٹوں سے زندگی سے بھرپور قہقہہ نکل گیا اور ویرانہ اس قہقہے کی گونج سے آباد ہو گیا۔ میں نے عادل خان کا ہاتھ تھام لیا اور اُسے ایک طرف لے گیا۔

"عادل خان! قسمت کا لکھا اٹل ہوتا ہے۔ زیتون کو مُراد مل گیا اور یُوں میرے سر سے ایک بھاری ذمے داری اُتر گئی۔ اب مجھے اجازت دو۔"

"لیکن خان! تم کہاں جاؤ گے؟"

"میری منزل ابھی بہت دُور ہے۔"

"جو شخص دوسروں کی منزل آسان کرتا ہے، اُس کی منزل کو رب عظیم خود اُس کے قدموں میں پہنچا دیتا ہے۔ مُراد خان ہوش میں آ جائے تو کم از کم اُسے اپنے محسن سے گلے ملنے دو۔"

"وہ ہوش میں آ چکا ہے... تم نے اس تباہ حال جوان کو اپنے سینے سے نوچ کر اس ویرانے میں پھینک دیا تو اُسے اپنی منزل مل گئی۔ مجھے یقین ہے کہ مُراد خان اب کبھی نہیں بھٹکے گا۔"

"کیا تم زیتون سے ملے بغیر ہی..."

"اب صورتِ حال تمھارے ہاتھ میں ہے، اسے سنبھالو۔ زندگی اور مقدر میں لکھا ہُوا تو پھر ملاقات ہوگی۔ بس اب مجھے نہ روکو۔" میں نے اس کا کندھا تھپتھپایا اور گھوڑے کی پشت پر سوار ہو گیا۔ عادل خان کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

اس وقت ہم گاڑیوں سے کافی فاصلے پر تھے اور ہمارے درمیان ایک ٹیلہ حائل تھا... اس لیے مجھے توقع تھی کہ زیتون اور مُراد خان کو میرے جانے کی خبر اُس وقت ہوگی جب میں یہاں سے دُور نکل چکا ہوں گا۔

میرا رُخ پشاور کی طرف تھا۔

ایک بھرے پُرے بازار سے گزرتے ہُوئے میری ذہنی حالت کچھ عجیب سی ہو رہی تھی۔ شہر کے دَر و دیوار میرے لیے اجنبی تھے مگر نہ جانے کیا بات تھی کہ مجھے ان اجنبی دَر و دیوار سے اپنائیت کی بُو محسوس ہو رہی تھی۔ متعدد قبائلی بستیوں اور سنگلاخ گھاٹیوں سے گزرتے ہُوئے اس شہر میں قدم رکھنے کے بعد میں خود کو اسی ماحول اور معاشرے کا باسی محسوس کر رہا تھا۔

صبح کے دس بج رہے تھے اور شہر کی رونق نواحی بستیوں سے آنے والے لوگوں سے اور بھی بڑھ گئی تھی۔ راہگیر میری وجیہہ شخصیت کو دیکھتے اور چلتے چلتے اچانک رُک جاتے۔ میرا قد کاٹھ اور ڈیل ڈول دیکھ کر ان کی آنکھوں میں تحسین کی لہریں اُبھرتیں جنھیں دیکھ کر میرے ہونٹوں پر ایک فخریہ مُسکراہٹ آ جاتی۔

اسی دوران میں اکا دُکا فوجی گاڑیاں مختلف سمتوں سے آتی جاتی دکھائی دیتیں تو میرے سینے میں جوش و جذبات کروٹیں لینے لگتے۔ میرا تھکا ہُوا وجود دوبارہ چستی اختیار کر لیتا اور بے اختیار میری اُنگلیاں اُس صداقت نامے کو چھونے لگتیں جس کی بدولت مجھے اس چھاؤنی میں داخل ہونے کا نادر موقع ملا تھا، جہاں میری سب سے عزیز ہستی کی موجودگی کا امکان تھا۔ اس کے علاوہ اس صداقت نامے کی اپنی جیب میں موجودگی محسوس کرتے ہُوئے پانچ ہزار طلائی سکوں کی جھنکار ایک سرور آمیز گیت کی طرح میرے کانوں میں گونج اُٹھتی اور ساتھ ہی میرے دل کی گہرائیوں میں چھپا ہُوا یہ احساس اُجاگر ہو جاتا کہ آج سے کئی سال پہلے میرے بابا شاپیار خان کو باغیانہ سرگرمیوں کے جرم میں پشاور چھاؤنی لایا گیا تھا۔ دولت کی ضرورت کسے نہیں ہوتی مگر اس دولت سے بڑھ کر میرے لیے یہ بات اہم تھی کہ آج سے بائیس سال پہلے جو مجرم پشاور چھاؤنی لایا گیا تھا، مجھے اس کا سُراغ لگانا ہے۔ وہ میرے بابا شاپیار خان تھے۔ جو کسی بھی طور فرنگیوں کی حاکمیت تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھے اور اُنھیں اپنی اسی آزاد و باغیانہ روش کی بدولت اپنی زندگی کی بازی لگا دینا پڑی تھی۔ میرے بابا شاپیار خان زندہ تھے یا اپنے انجام کو پہنچ چکے تھے، اس بات کی تحقیق بھی ضروری تھی۔ گو میرے بابا ایک طویل عرصے سے گُم تھے لیکن کسی سے اُن کی زندگی کے بارے میں کوئی اطلاع نہ پا کر بھی میرا دل اُنھیں مُردہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔

مجھے یقین تھا کہ پشاور چھاؤنی میں تعمیر کیے گئے ان تہ خانوں میں جن میں اسیر اور خطرناک مجرم رکھے جاتے تھے، اُن ہی میں میرے

باغی اپنی بدلی ہُوئی شکل رعُونت کے ساتھ موجود ہوں گے۔ اُن کی داستانِ حیات سے پتہ چلتا تھا کہ وہ آسانی سے شکست تسلیم کرنے والے لوگوں میں سے نہیں تھے اور یہ بات بھی میرے علم میں تھی کہ ایسے خطرناک باغی مُجرموں کے ساتھ فرنگی درندے بڑا وحشیانہ اور سنگدلانہ سلوک کرنے کے عادی ہیں اور جب تک اُن سے زندگی کی آخری رمق تک نہ چھین لیں وہ اپنے اقتدار کو مستقل اور پائدار محسوس نہیں کرتے۔

ان بائیس برسوں کے دوران... بہت سے لوگوں نے اپنے ہاتھوں میں آزادی کا عَلم اُٹھا کر چلنے کی جسارت کی تھی جس کے جواب میں موت کے سوداگر فرنگیوں نے اُنھیں زندگی کی عظیم نعمتوں سے دست بردار ہونے پر مجبور کر دیا اور جنھیں وہ اپنی مصلحتوں کی وجہ سے موت کی سزا نہیں دے سکے تھے ایسے بہت سے حُریت پسند ان زندانوں اور سنگلاخ کوٹھڑیوں میں اپنی زندگی کی آخری سانسیں گن رہے تھے... آزادی کے یہ پرستار جُرمِ آزادی کی طویل اور خوفناک سزائیں بھگت رہے تھے۔ فرنگیوں نے اِن تاریک جیل خانوں کو تاریک قبرستانوں کی شکل دے دی تھی۔

دل و دماغ سے غم و اندوہ کے عجیب تاثرات اُبھر اُبھر کر میرے ذہن میں ہلچل سی مچا رہے تھے۔ غم انگیز سوچوں بخارات کا عمل جاری تھا کہ میں گھومتا ہُوا چھاؤنی پہنچ گیا۔

چھاؤنی کے پھاٹک پر ایک رائفل بردار سپاہی موجود تھا... میں نے صداقت نامہ اپنے ہاتھ میں تھاما اور بے پروائی سے چلتا ہُوا چھاؤنی کے گیٹ پر پہنچ گیا۔

سپاہی کی آنکھیں مجھ پر جمی ہُوئی تھیں۔ وہ میرے گلے میں کارتوسوں کی پیٹی اور ریوالوروں کو گھُور رہا تھا جو ہر کڑے وقت میں میری زندگی کی بہترین ضمانت ثابت ہُوئے تھے۔ میں نے اُسے ہاتھ کے اشارے سے سلام کیا اور صداقت نامہ سنبھالتے ہُوئے چھاؤنی کے اندرونی حصّے کی جانب قدم بڑھائے۔

جونہی میرے قدم چھاؤنی کا گیٹ پار کرنے کے ارادے سے اُٹھے۔ اُس کا وجود ایک دم تن گیا اور مجھے اپنی رائفل کی زد میں لے کر کرختگی سے بولا۔

"ہالٹ! جہاں کھڑے ہو وہیں رُک جاؤ اور شناختی کاغذات دکھاؤ۔"

وہ ایک سکھ فوجی تھا جس کی کرخت آواز نے مجھے جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ میں نے صداقت نامہ نکال کر اُس کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہُوئے کہا۔

"میرے پاس تاجِ برطانیہ کے ایک ذمّے دار افسر کا صداقت نامہ موجود ہے، اور میں اس تحریر سے انعام کی رقم وصول کرنے آیا ہُوں۔" یہی بات ختم کرتے ہی میں نے صداقت نامہ اُس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ سکھ فوجی غالباً اَن پڑھ تھا۔ وہ صداقت نامہ لے کر دیر تک اُسے اُلٹ پلٹ کر دیکھتا رہا پھر کاغذ میری طرف بڑھاتے ہُوئے بولا۔ "تم نے کون سی ایسی مہم سر کی ہے جو کاغذ کا ایک پُرزہ لے کر زمین پر اکڑتے پھر رہے ہو؟"

اُس کے لب و لہجے میں گنوارپن تھا جو مجھے سخت ناگوار گزرا۔

"فوجی قانون کے مطابق کوئی مقامی شخص چاہے وہ کتنی ہی بڑی حیثیت کا مالک کیوں نہ ہو، چھاؤنی کی حدود میں اسلحہ لے کر داخل نہیں ہو سکتا۔ تمھیں چاہیے تھا کہ چھاؤنی آنے سے پہلے ان خطرناک ہتھیاروں سے نجات حاصل کر لیتے۔ اپنا سارا اسلحہ اُتار کر اُس کیبن کی طرف چلے جاؤ۔"

اُس نے گیٹ سے کچھ فاصلے پر بنے ہُوئے ایک کیبن کی طرف اشارہ کیا۔

"کیبن میں ایک سارجنٹ ڈیوٹی پر موجود ہے جو تمھارے کاغذات چیک کرے گا اور تمھارا اسلحہ جمع کر کے اُس وقت تک اپنی تحویل میں رکھے گا جب تک تم واپس نہیں آ جاتے۔"

میری اور سکھ فوجی کی تکرار کے دوران ایک باوردی فرنگی کیبن کے دروازے پر آ کر ہماری باتیں سُننے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے بڑی متانت سے اس سکھ نوجوان کا شکریہ ادا کیا... اور صداقت نامہ واپس لے کر اس کیبن کی طرف بڑھا جہاں فرنگی سارجنٹ کھڑا میری جانب بڑی گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس کے قریب پہنچتے ہی بلا خوف و خطر کہا۔

"میرے پاس تاجِ برطانیہ کے ایک افسر کا صداقت نامہ ہے اور میں اس میں تحریر شدہ انعام کی رقم وصول کرنے آیا ہُوں۔" میرے بے خوف لہجے میں گہرا اعتماد تھا۔

سارجنٹ نے صداقت نامہ میرے ہاتھ سے اُچک لیا اور میرے وجود پر گہری نظریں ڈالتا ہُوا وہ مُلگجے کاغذ کو پڑھنے لگا جسے صداقت نامہ کہا جا رہا تھا۔

"صداقت نامہ درست ہے جوان! اس کی رُو سے میں تمھیں میجر شیپرڈ کے پاس بھیجنے کا پابند ہُوں۔" اُس نے مقامی زبان میں جواب دیا۔ "مگر اس سے پہلے تم اپنے ہتھیار نکال کر یہاں ڈھیر کر دو تاکہ ضابطے کی کارروائی مکمل ہو جائے۔" اُس کی نظریں میرے گلے میں پڑی کارتوسوں کی پیٹیوں اور ہولسٹر میں رکھے ہُوئے ریوالورز پر جمی ہُوئی تھیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ٹھیک ہے افسر!" میں نے رضامندی کا اظہار کرتے ہُوئے شائستگی سے جواب دیا۔ "تم ضابطے کی کارروائی مکمل کر سکتے ہو۔" اس کے ساتھ ہی میں نے چمڑے کی دونوں پیٹیاں اُتار کر اُس کے ہاتھ میں تھما دیں... پھر دونوں ریوالور بھی اُس کے سپرد کر دیے۔

اُس نے آگے بڑھ کر میرے جسم کے مختلف حصّے ٹٹولے جب وہ مطمئن ہو گیا کہ میرے پاس کوئی اور ہتھیار نہیں ہے تو اُس نے ایک طرف اشارہ کرتے ہُوئے کہا۔

"نوجوان وہ تمھاری منزل ہے، وہاں میجر شیپرڈ تم سے ملے گا۔ پھر وہی بتائے گا کہ انعام کہاں سے مل سکتا ہے۔" یہ کہتے ہُوئے اُس نے زور آور سنگھ کو آواز دی۔

میں پہلے ہی ایک سکھ کو دیکھ چکا تھا جو کیبن کے ساتھ کھڑا تھا۔ زور آور سنگھ نے کیبن میں آتے ہی فرنگی کو سیلوٹ کیا اور خاموش کھڑا ہو گیا۔ سارجنٹ نے اُس سے کہا۔ "ویل زور آور سنگھ! اس نوجوان کو میجر شیپرڈ کے پاس لے جاؤ۔" وہ میرے وجود کو بڑی دلچسپی اور گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

فرنگی افسر نے صداقت نامہ مجھے واپس دیتے ہُوئے کسی بُت کی طرح ساکت زور آور سنگھ کو مخاطب کیا۔ "اسے میجر شیپرڈ کے پاس لے جاؤ سنگھ۔ یہ وہی نوجوان ہے جس کو انعام دینے کی سفارش پولیٹیکل ایجنٹ نے کی تھی۔"

زور آور سنگھ نے ایڑیاں بجا کر گھومتے ہُوئے مجھے اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔

کیبن سے باہر آ کر وہ ایک جیپ کی طرف بڑھ گیا۔ اُس نے مجھے بیٹھنے کے لیے کہا۔ جیپ چلاتا ہُوا وہ اس وسیع و عریض چھاؤنی کی ایک سڑک پر روانہ ہو گیا۔ اس کا چہرہ اب بھی جذبات سے عاری تھا اور یُوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میری موجودگی اس کے لیے کوئی معنی نہ رکھتی ہو۔

راستے میں دو تین جگہ جیپ کو روکا گیا۔ زور آور سنگھ اپنی شناخت کروا کر جیپ کو آگے بڑھاتا رہا۔ اُس نے ایک بیرک کے سامنے جیپ روکی۔ وہاں مجھے ایک افسر سے مِلوایا گیا جس نے مجھے ایک اور فرنگی افسر کے پاس بھیج دیا۔ حتیٰ کہ تین افسروں کو اپنا دیدار کروا کر میں بالآخر زور آور سنگھ کے ساتھ ایک اور گیٹ تک جا پہنچا۔

"میں یہاں سے تمھارے ساتھ نہیں جا سکتا۔ اب تمھیں تنہا جانا پڑے گا۔" سنگھ نے میری طرف دیکھتے ہُوئے کہا۔ "آؤ میں... تمھیں متعلقہ چوکی افسر سے ملوا دوں۔"

وہ مجھے گیٹ کے ایک طرف بنے ہُوئے کمرے میں لے گیا۔ جہاں اُس نے وہ کاغذات ایک فرنگی افسر کو پیش کیے جو غالباً میرے داخلے کے اجازت نامے کی حیثیت رکھتے تھے فرنگی افسر نے سر سے پاؤں تک میرا جائزہ لیا۔ پھر سنتری سے کہا کہ وہ مجھے آگے جانے دے۔ مجھے اشارے سے منزلِ مقصود کے بارے میں بتا دیا گیا اور میں قدرے بے چینی کا شکار آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ مجھے حیرت تھی کہ حکومت کرنے کا خواب دیکھنے والے خود کو کس طرح سات پردوں میں چھپائے ہُوئے ہیں۔ ان سے تو بہ آسانی ملنا بھی مشکل ہے۔

مختلف سڑکوں پر گھومتا ہُوا جونہی میں ایک بیرک کے قریب پہنچا، ہالٹ کی کرخت آواز سُن کر ٹھٹک گیا۔

"کون ہو تم اور اتنی آزادی سے گھوم رہے ہو شناختی کاغذات دکھاؤ۔"

میں نے دیکھا کہ ایک تُند مزاج سپاہی کی رائفل میری طرف اُٹھی ہُوئی تھی۔

وہ دیسی آدمی ہی معلوم ہو رہا تھا۔ مجھے اس کی کرخت آواز میں سفاکی کا احساس ہُوا۔ شاید فرنگیوں کے نمک نے اُس سے قومیت کی بُو باس بھی چھین لی تھی۔ مجھے اس بات کا یقین ہو گیا کہ اگر میں نے اُسے صداقت نامہ دکھانے میں ایک لمحے کی بھی تاخیر کی تو یہ ضمیر فروش میری قومیت کا احساس کیے بغیر مجھ پر گولی چلانے میں گریز نہیں کرے گا...

"میرے پاس اجازت نامہ موجود ہے۔" میں نے وہ کاغذ اُس کی طرف بڑھا دیا جو گیٹ سے اندر آتے وقت مجھے دیا گیا تھا۔ اُس نے اجازت نامہ میرے ہاتھ سے اُچک لیا اور اُسے پڑھنے لگا۔ اُسے پڑھنے کے باوجود اُس کے چہرے پر وہی سختی چھائی رہی جو میرے بارے میں جاننے سے پہلے موجود تھی۔ اُس نے اجازت نامہ پڑھنے کے بعد چند لمحات سوچنے میں ضائع کر دیے۔

"تم ایسا کرو۔ اِدھر ایک طرف ہو کر بیٹھ جاؤ۔ میں اندر جا کر میجر شیپرڈ کو تمھاری آمد کی اطلاع دے دیتا ہوں۔ تمھارے پاس کسی قسم کا کوئی ہتھیار تو نہیں ہے؟" اچانک اُس نے ناگوار سا سوال کر دیا۔

"میرے ہتھیار تمھارے آقاؤں کا ایک نمک خوار پہلے ہی حاصل کر چکا ہے۔ اس وقت میں بالکل نہتا ہُوں، اگر یقین نہ آئے تو تم میری تلاشی لے سکتے ہو۔" میں نے تلخی سے جواب دیا اور وہاں بنی ہُوئی ایک پتھریلی بینچ پر بیٹھ گیا۔

اُس نے ایک لمحے تک مجھے گہری نظروں سے دیکھا۔ "تم اس وقت چھاؤنی میں ہو، پہاڑوں پر نہیں۔ اس لیے ذرا اپنی

زبان کو قابو میں رکھو۔" یہ کہہ کر وہ بیرک کے اندر چلا گیا۔

کچھ دیر بعد وہ باہر آیا اور کاغذات میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "میجر شیپرڈ کے کہنے کے مطابق اس صداقت نامے کی رقم جنرل ڈوگ کے علاوہ اور کوئی شخص، کسی کو دینے... کا مجاز نہیں ہے۔ جنرل ڈوگ آفس میں موجود نہیں وہ کسی اہم کانفرنس میں شرکت کے لیے گئے ہیں۔ تمھیں اُن کی واپسی تک انتظار کرنا ہوگا۔"

"میں اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لیے ایک طویل مدت سے جدوجہد جاری رکھے ہوئے ہوں اور ان کے نتائج کا انتظار کرتا رہا ہوں۔ چند منٹ کا مزید انتظار میرے خیالات تبدیل نہیں کر سکتا۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"مجھے ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے میں تمھیں پہلے سے جانتا ہوں اور تمھارا یہ تیکھا اور کڑوا لب و لہجہ میرے لیے اجنبی نہیں ہے کیا تم بتا سکتے ہو کہ اس کی کیا وجہ ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اس سے پہلے میں نے تمھیں نہیں دیکھا، پھر بھی یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں تمھیں برسوں سے جانتا ہوں۔"

سپاہی کے سخت لہجے میں اب ہلکی سی اپنائیت اور ملائمت پیدا ہو گئی تھی۔

"اب تمھاری حیثیت سرکاری مہمان کی ہے۔ جنرل ڈوگ کے دفتر میں معزز مہمانوں کے لیے ایک انتظارگاہ موجود ہے۔"

اُس نے مجھے اُٹھنے کا اشارہ کیا اور مجھے لے کر جنرل کے دفتر کی طرف چل دیا۔

جنرل کے کمرے کے سامنے جا کر وہ رُکا اور دروازے کے سامنے کھڑے ہوئے اردلی سے کچھ کہا پھر مجھے ایک کمرے میں بٹھا کر واپس چلا گیا۔

انتظارگاہ میں بہت بڑے بڑے دو صوفے پڑے تھے ابھی میں ٹھیک سے بیٹھا بھی نہیں تھا کہ جنرل ڈوگ کے دفتر کا دروازہ کھلا اور ایک نوخیز کلی فضا کو معطر کرتی ہوئی برآمد ہوئی اُس کے ہونٹوں میں خوشبودار سگریٹ دبی ہوئی تھی... جس کے ہلکے ہلکے کش لیتی ہوئی وہ اچانک میرے قریب آ کر رُک گئی۔ اور میری آنکھوں میں جھانکنے لگی... پھر وہ کسی لچکیلی شاخ کی طرح بل کھاتی ہوئی آگے بڑھی اور صوفے پر میرے قریب بیٹھ گئی۔

میں اُس کا قرب برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اُس کے بیٹھتے ہی میں اچانک اُٹھ کھڑا ہوا۔ لڑکی بہت حسین تھی اور بے حد پُرجوش جذبات کی مالک لگتی تھی، مگر نہ جانے کیوں اُس کا یہ زہریلا حسن مجھے متاثر نہ کر سکا۔ اس کی آنکھوں میں بھوک کی پیاسی پرچھائیاں دیکھ کر نہ جانے کیوں مجھے کراہت سی محسوس ہونے لگی۔ اُس کی نظریں میرے پورے وجود کو ٹٹول رہی تھیں اور اُس کا یہ انداز مجھے بہت ہی بھونڈا لگا۔

"ارے! تم ہمارے قریب سے کیوں اُٹھ گیا؟" اُس نے انگریزی لہجے کی اُردو میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ "تم ہمیں بہت اچھا لگا ہے مگر کیا مشرق کے سارے مرد تمھاری طرح شرمیلے اور بزدل ہوتے ہیں کہ اپنے قریب ایک عورت کا وجود بھی برداشت کرنے کی سکت نہیں رکھتے...؟"

"مرد چاہے مشرق کا ہو یا مغرب کا، سب کی خصوصیت ایک ہی ہے۔" میں ناصحانہ انداز اختیار کرتے ہوئے بول پڑا۔ میں صوفے کے قریب پڑی خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"بزرگوں کا قول ہے کہ حسین عورت کا قرب بہت سی ایسی کمزوریاں پیدا کر دیتا ہے جس سے اُس کے دشمن فائدہ اُٹھانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔"

"میں نے سُنا تھا کہ مشرق کے مرد بڑے پُراسرار اور انوکھے ہوتے ہیں۔" اُس نے جواب دیا اور ایک ادائے خاص سے اِٹھلاتی ہوئی صوفے سے اُٹھ کر میری کرسی کا بازو پکڑ کر کھڑی ہو گئی۔

اس فرنگی عورت کا اتنی جلدی بے تکلف ہو جانا میرے لیے اُلجھن کا باعث بن گیا۔ وہ مجھے سنگِ مرمر کا مجسمہ لگ رہی تھی۔ رنگت تو دودھیا تھی لیکن اس کا انداز غیر پسندیدہ تھا۔ البتہ جسم سے اُٹھتی ہوئی خوشبو کی لہریں میرے دل و دماغ پر اثرانداز ہونے لگیں۔

اس دوران میں نوجوان فوجیوں کا ایک گروہ کھڑکی کے قریب سے گزرا مگر ہمیں اس طرح نظرانداز کر کے آگے بڑھ گیا جیسے یہ منظر اُن کا دیکھا بھالا ہوا اور اب اُن کے لیے اپنی کشش کھو چکا ہو...

جونہی فوجیوں کی ٹولی نظروں سے اوجھل ہوئی... وہ ایک مترنم قہقہہ لگاتی ہوئی کرسی کے ہتھے پر بیٹھ گئی۔

میں ایک بار پھر گھبرا کر غیرارادی طور پر کھڑا ہو گیا... اور وحشت زدہ نظروں سے اُس نازنین کو گھورنے لگا جو میرے اعصاب پر مسلسل ضربیں لگا رہی تھی۔

میرے چہرے پر گھبراہٹ اور سراسیمگی کے آثار دیکھ کر اُس کے ہونٹوں پر ایک دلفریب مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔

"میں حیران ہوں کہ تم نے وہ کارنامہ کیسے انجام دیا ہوگا جس کے لیے سیاسی ایجنٹ نے انعام کی سفارش کی ہے۔" اُس نے عجیب سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لہجے میں کہا۔

میں خاموش رہا۔ اب اُسے کیا بتاتا کہ میدان میں شہ زوری دکھانے اور کسی غیر عورت کے قرب میں خود کو سنبھالنے میں کیا فرق ہوتا ہے۔

دفعتاً اُس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک لہرائی۔ جسے دیکھ کر اُس کے حسن کا سارا نشہ اُتر گیا۔

اب وہ مجھے کسی آدم خور عفریت کی مانند نظر آئی جو اپنے شکار کو نوالہ بنانے سے پہلے چوہے بلی کا کھیل کھیلنے کی عادی ہو۔ کچھ دیر وہ اپنی مست نظروں سے مجھے دیکھتی رہی پھر اچانک کھلکھلاتی ہوئی اُٹھی اور میری جانب مسکراہٹ کے پھول پھینکتے ہوئے جنرل ڈوگ کے دفتر میں چلی گئی۔

اُس کے جاتے ہی ایک محافظ دوسرے دروازے سے اچانک نمودار ہوا اور جنرل ڈوگ کے دروازے کے سامنے آ کر رُک گیا۔

اس خوبصورت ناگن کے چلے جانے پر میں نے اطمینان کی سانس لی تھی۔ جب تک وہ میری آنکھوں کے سامنے موجود رہی... میرے وجود پر زلزلے کی سی کیفیت طاری رہی تھی جس میں ہولناک مستقبل کا خوف اور سرکش جوانی کے انوکھے جذبات کی تلخی بھی... شامل تھی۔

میں دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا اور جنرل ڈوگ کے بارے میں سوچنے لگا۔

میں چاہتا تھا کہ جنرل ڈوگ مجھ سے اس حد تک متاثر ہو جائے کہ میں چھاؤنی کے آس پاس پھیلے تیرہ و تار جیل خانے دیکھ سکوں۔ مجھے یقین تھا کہ میرے بابا زندہ ہیں اور سینکڑوں قیدیوں کے درمیان اپنے جھکے ہوئے کندھوں پر زندگی کا بوجھ اُٹھائے... کسی ایسے فرد کے منتظر ہیں جو اُس کی رہائی کے لیے راستہ ہموار کر سکے۔

اچانک محافظ نے ایڑیاں بجا کر سیلوٹ کیا اور تن کر کھڑا ہو گیا۔ جنرل ڈوگ چند افسروں کے ساتھ میرے عقب سے آنے والے راستے سے نمودار ہوا اور اپنے دفتر کی طرف بڑھنے لگا۔

اچانک اُس کی گھورتی ہوئی نیلی آنکھیں میرے چہرے پر جم گئیں۔

اُس کی نظریں میرے طاقت ور وجود کا جائزہ لے رہی تھیں میں نے محسوس کیا اُس کی نگاہوں میں ستائش کے آثار اُبھرے تھے۔ یہ کیفیت چند لمحوں کی تھی پھر وہ آگے بڑھ گیا۔

اُس کی آنکھوں میں پسندیدگی کے آثار میرے لیے حوصلہ افزا تھے مگر وہ نیلی آنکھوں والی لڑکی ابھی تک میرے شعور کے ساتھ چپکی ہوئی تھی اور اُلجھن کا باعث بن رہی تھی۔

اچانک محافظ نے اشارے سے مجھے اپنے قریب بُلا کر کہا۔ "جنرل ڈوگ تمھارا انتظار کر رہے ہیں۔"

میں نے ایک نظر اُس محافظ کی طرف دیکھا اور دروازے کا اسپرنگ دار پٹ اندر کو دھکیلتا ہوا آگے بڑھ آیا۔

کمرے کے وسط میں ایک بہت بڑی اور نفیس میز رکھی ہوئی تھی میز کے درمیان عقب میں جنرل ڈوگ اپنی مخصوص کرسی پر براجمان تھا اور میز کی دُوسری جانب دو اور افسر موجود تھے۔

وہ نیلی آنکھوں والی نازنین بھی میز سے چند قدم کے فاصلے پر ایک نرم صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس نے اپنی آنکھوں پر چشمہ لگایا تھا جس میں اُس کی خوبصورت نیلی آنکھیں چھپ گئی تھیں۔

مجھے دیکھتے ہی جنرل ڈوگ کے چہرے پر ایک دوستانہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "خوش آمدید بہادر نوجوان! ہم تمھاری آمد سے بہت خوش ہیں کیونکہ تم تاجِ برطانیہ کے وفاداروں میں سے ایک ہو۔"

میں نے جواباً صداقت نامہ اُس کی طرف بڑھا دیا۔ "مجھے تمھارے آنے کی اطلاع مل گئی تھی مگر میں ایک میٹنگ میں مصروف تھا اس لیے تمھیں میرا انتظار کرنے کی زحمت اُٹھانا پڑی۔"

اُس نے ایک نظر صداقت نامے پر ڈالی پھر اُسے میز پر رکھ دیا اور مسکراتی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے ایک خالی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

میں اطمینان سے بیٹھ گیا۔

"کیپٹن مارک! یہ نوجوان بہت دلیر اور بہادر ہے یہ ظلِ راتِ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر چلنے کا عادی ہے۔" جنرل نے اپنے ساتھیوں میں سے ایک سے مخاطب ہو کر کہا۔ "میں چاہتا ہوں کہ تم اسے اپنی بیرک میں کوئی کمرہ اس کے لیے مخصوص کر دو، اور اس کی خوب خاطر مدارات کرو تاکہ اسے ہماری دوستی اور خلوص کا پورا پورا یقین آ جائے۔"

جنرل ڈوگ کی مُبہم باتیں سُن کر میرے ذہن میں ایک ہلچل پیدا ہو گئی۔

"اب تم لوگ جا سکتے ہو میں کچھ دیر تک اس نوجوان کے ساتھ تنہائی میں کچھ باتیں کروں گا اور ٹھیک تیس منٹ بعد اپنا کوئی آدمی بھیج کر اسے اس کے کمرے تک پہنچا دینا۔"

جنرل ڈوگ نے ایک نظر مجھ پر ڈالتے ہوئے ہدایات جاری کیں۔ پھر اُس نے گھنٹی بجا کر اپنے اردلی کو طلب کیا اور کافی لانے

کا حکم دیا۔

ابھی تک میں نے جنرل ڈوگ سے ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا اور جنرل کو بولنے کا موقع دیا تھا۔

چند منٹ بعد ہی اردلی کافی لے کر آ گیا اور وہ نیلی آنکھوں والی حسین ناگن بل کھاتی ہوئی صوفے سے اٹھی اور آکر اس کرسی پر بیٹھ گئی جس پر چند لمحے پہلے کیپٹن مارک بیٹھا ہوا تھا۔

وہ خاموشی سے پیالیوں میں قہوہ انڈیلنے لگی۔

کافی کا ایک گھونٹ اپنے حلق میں انڈیلا ہی تھا کہ اچانک جنرل ڈوگ کی نرم آواز سنائی دی۔

"یہ میری بیٹی ایلس ہے۔" اس نے حسین ناگن کا تعارف کراتے ہوئے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھا۔ "یہ بچپن ہی سے مشرق کی پُراسرار زمین دیکھنے کی شوقین تھی اور اپنے اس شوق کی تکمیل کے لیے اس نے یہاں کی دو ایک مقامی زبانوں پر عبور بھی حاصل کر لیا ہے۔"

میں نے تعریفی انداز میں سر ہلا دیا۔

"یہ بات میرے لیے بڑے اطمینان کا باعث ہے کہ تمہارے خدوخال میں اسے مشرق کا پُراسرار انسان نظر آ گیا ہے... یہ اس موضوع پر کچھ تحقیقی کام کرنا چاہتی ہے کہ قبائلی نوجوان عورتوں سے کس قسم کا سلوک کرنے کے عادی ہیں۔ تمہاری معلومات اس کے لیے کافی سودمند ثابت ہوں گی۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ جب تک تم یہاں ہو اس کے لیے تھوڑا بہت وقت ضرور نکال لیا کرو۔"

میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

"ایلس کی خوشی میری اپنی خوشی ہے۔" اس نے گویا مجھے حکم سنا دیا کہ میں اس کی بیٹی کی خوشیوں کا خاص خیال رکھوں۔

"جنرل! قبائلی لوگ عورتوں کو اپنے پیروں کی زنجیر بنانے کے عادی نہیں ہیں۔" میں نے پُراعتماد لہجے میں جواب دیا۔ "پھر بھی میری یہی کوشش ہوگی کہ آپ کی بیٹی کو میری ذات سے کوئی صدمہ نہ پہنچنے پائے مگر اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ ایلس کسی ایسی بات کے لیے مجھ سے ضد نہ کرے جسے پورا کرنا میرے بس میں نہ ہو... میں بھی دوسرے لوگوں کی طرح ایک عام انسان ہوں اور اپنے قوتِ بازو کے بل پر ابھی تک زندہ ہوں۔ آپ کے آدمیوں نے مجھ سے میرا اسلحہ لے لیا ہے اور ہتھیاروں کی غیر موجودگی میں مجھے ادھورے پن کا احساس ہوتا ہے۔ میں شہباز ہوں کوئی مردار خور گدھ نہیں کہ اپنی پرواز ختم کر دوں۔ مجھے میرا اسلحہ واپس ملنا چاہیے۔ جب تک میرے ہتھیار واپس نہیں مل جاتے

میں یہ بات سوچنے پر مجبور ہوں کہ اپنے بہت سے ہم وطنوں کے خون کی قربانی دینے کے باوجود میری شخصیت تاجِ برطانیہ کی نظروں میں مشکوک ہے۔"

میں نے محسوس کیا کہ جنرل ڈوگ کا چہرہ کسی باؤلے کتے کے نقش و نگار اختیار کر گیا ہے لیکن اس نے کمالِ ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے خود کو جلد ہی سنبھال لیا۔

میں نے کن انکھیوں سے اس کی بیٹی کی طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر البتہ اب بھی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

جنرل ڈوگ نے میز پر بے چینی سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "شہباز! مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ رضا بلٹے کی ایک معمولی کارروائی نے تمہیں ہم سے برگشتہ کر دیا ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ جلد سے جلد تمہاری شکایت دور کر دوں۔"

میں خاموش رہا۔ اتنی حتمی بات کے بعد بحث بیکار ہی تھی۔

"پاپا آپ انہیں ڈنر کی دعوت کیوں نہیں دیتے؟" حسین ایلس کے خوبصورت ہونٹوں کو جنبش ہوئی اور میری رگوں میں گردش کرتا ہوا خون ایک نئی حرارت سے آشنا ہو گیا۔

جنرل ڈوگ کی بیٹی مجھ سے اس قدر متاثر تھی کہ اس کی خوبصورت نیلی آنکھوں میں خمار جھلکنے لگا۔

"کیوں نہیں! شہباز آج ڈنر ہمارے ساتھ کرے گا۔" جنرل ڈوگ نے اس انداز میں کہا جیسے یہ بات میرے لیے حکم کا درجہ رکھتی ہو... ویسے اس نے لہجہ سوالیہ ہی رکھا تھا۔

وہ جواب طلب نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے جنرل ڈوگ کی نیلی آنکھیں میری روح میں جھانک رہی ہوں۔

"اور رات کو ہی ہم ایک خاص موضوع پر تبادلۂ خیال کریں گے

نامور مصنف ایم۔ الیاس۔ کے شہکار
قلم سے ایک اچھوتی کہانی
ذلیل
خوبصورت سرورق عمدہ پرنٹنگ کتابت
قیمت =\150 روپے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں خیال کرتا ہوں کہ اس موضوع پر بات کرنے کے بعد تمہارے لیے شاندار مستقبل کے دروازے کھل جائیں گے۔"

"میری زندگی کا طویل حصہ ان لوگوں میں گزرا ہے جو بغیر لگی لپٹی کے بات کرنے کے عادی ہیں۔ آپ کی کچھ باتیں میرے لیے الجھن کا باعث بن رہی ہیں۔ میں یہاں اپنا انعام وصول کرنے آیا ہوں۔ اپنے لیے کوئی الجھن خریدنے نہیں آیا۔ اس صداقت نامے کی رو سے میں پانچ ہزار روپے حاصل کرنے کا مجاز ہوں اور بغیر کسی تردد کے مجھے ملنے چاہییں۔" میرے لہجے میں ہلکی سی تلخی آ گئی تھی۔

"نوجوان میری بات غور سے سنو۔ میرے منصوبے کے بارے میں سنو گے تو تم میری نوازش کی داد ضرور دو گے۔ میرا منصوبہ یہ ہے کہ اس رقم کو بڑھا کر دس ہزار کر دیا جائے۔" جنرل ڈوگ نے اچانک ایک دھماکا خیز بات کی۔

میں چونکے بغیر نہ رہ سکا۔

میرے چہرے کی بدلتی ہوئی رنگت دیکھ کر وہ مسکرانے لگا۔

"تاجِ برطانیہ کو ایک بار پھر تمہاری خدمات کی ضرورت ہے۔ اور میں تمہاری ذات سے بہت سی امیدیں وابستہ رکھنے میں حق بجانب ہوں۔ ہمیں ایک ایسی ہی مہم کا سامنا ہے۔ جیسی کہ تم پہلے انجام دے چکے ہو۔ ہماری ایک سرحدی چوکی پر باغیوں کے حملے برابر جاری ہیں اور وہ اس اہم مورچے پر قبضہ کرنے کے لیے اس پہاڑی درّے کو اپنے گھیرے میں لے چکے ہیں۔ ہمارے جوانوں کو فوری طور پر اسلحے اور خوراک کی ضرورت ہے لیکن ہم انہیں کمک پہنچانے میں ناکام ہو چکے ہیں۔ حالات ایسے ہیں کہ ان پر باقاعدہ لشکر کشی نہیں کی جا سکتی۔ ہم تمہیں خوراک اور اسلحہ پہنچانے کی ذمے داری سونپ رہے ہیں تاکہ برطانیہ کے یہ وفادار اس اہم مورچے پر بدستور قابض رہیں۔ تمہارے آنے سے پہلے ہم کانفرنس میں اسی مسئلے پر غور کر رہے تھے۔ اب اس ملاقات کے بعد ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ تمہیں اس مہم کے سربراہ کا معاون مقرر کیا جائے اور میں یہ سوچنے میں حق بجانب ہوں کہ تمہیں فوج میں کوئی بڑا عہدہ دیا جاتا تاکہ لوگ دیکھ سکیں کہ تاجِ برطانیہ وفاداروں کو صلہ دینے میں بخیل نہیں ہے۔"

جنرل نے اپنے منصوبے کا پس منظر بتاتے ہوئے اپنی بیٹی ایلس کی طرف دیکھا جو اس کی باتوں کے دوران بڑی بے چینی سے پہلو بدل رہی تھی۔

"مجھے مزید کوئی خدمت انجام دیتے ہوئے ذاتی خوشی ہوگی..." میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "مگر میں اس مہم پر جانے سے پہلے چند روز شہر میں گزارنا چاہتا ہوں کیونکہ شہر اور اس کے گرد و نواح

کو دیکھنے کی حسرت ایک عرصے سے میرے دل میں موجود ہے۔ اس دوران آپ اپنی مہم کی تیاریاں جاری رکھیں۔"

اچانک میری نظریں ایلس کی نیلی آنکھوں سے ٹکرا گئیں جو محویت سے میری باتیں سن رہی تھی۔

میں ایلس کے چہرے سے نظریں ہٹا کر جنرل ڈوگ کو دیکھنے لگا جو اس وقت سنجیدگی کا پیکر نظر آ رہا تھا اور اس کی پیشانی پر ابھری ہوئی سلوٹیں اس کی ذہنی الجھنوں کی آئینہ دار تھیں۔

"تم پورا ایک ہفتہ پشاور میں گزار سکتے ہو۔" جنرل ڈوگ نے فیاضی سے کہا۔ "اسی دوران ہمارے ماہر تمہیں ہر قسم کا جدید اسلحہ چلانے کی ٹریننگ دیں گے۔ تم شام کو دو گھنٹے بھی نکال کر بہ آسانی ان کی مہارت سے فائدہ اٹھا سکتے ہو۔"

"جنرل!" میرے لہجے میں گہری سنجیدگی تھی۔ "جو شخص آنکھ کھولنے کے بعد سے اب تک زندگی اور موت کی خطرناک جنگ لڑتے ہوئے اپنی برتری منوا چکا ہو اسے مزید کسی تربیت کی ضرورت نہیں رہتی۔ میرے مضبوط ہاتھ ہتھیاروں کو استعمال کرنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ وہ مہارت جسے میں اپنے ماضی میں حاصل کر چکا ہوں میرے مستقبل کے لیے بہت بڑا سہارا ہے۔ مجھے اپنے بازوؤں کی قوت پر ناز ہے جو آج بھی اپنے دشمن کو للکارنے کی طاقت رکھتی ہے۔" میری آواز بدستور بلند رہی۔

"شاید میں اپنی پوری بات ابھی تک نہیں سمجھا سکا۔" جنرل نے جواب دیا۔ "کانفرنس سے واپسی پر میں نے تمہارے بارے میں اس افسر سے بات کی تھی جس کی تم نے جان بچائی تھی۔ اس گفتگو کے بعد ہی میں نے فیصلہ کیا کہ تمہیں فوج میں ایک مستقل عہدہ دے دیا جائے اور اس عہدے کے سارے اعزازات بھی دیے جائیں تاکہ بھرپور اعتماد سے تم اپنی ذمے داریاں پوری کر سکو۔ تمہاری سابقہ خدمات اور اپنے ذاتی تجربے کو مدِنظر رکھتے ہوئے میں تمہیں فی الحال اعزازی عہدہ پیش کر رہا ہوں اور ایک ہفتے بعد تمہیں اس خفیہ مہم میں سربراہ کے نائب کی حیثیت سے شریک ہونا ہے جس کی تیاریوں کا حکم جاری کیا جا چکا ہے۔"

"شکریہ جنرل!" میں نے بے دلی سے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور یہ سوچنے لگا کہ میں نے اپنی زندگی کیا اسی لیے داؤ پر لگائی تھی کہ اپنی پیشانی پر غلامی، بزدلی اور غداری کا داغ سجاؤں اور اپنے ہم وطنوں کے خون سے ہاتھ رنگتا رہوں؟

...لیکن اس غداری کے پس پُشت ایک عظیم مقصد تھا۔ یہ ساری جنگ وہ اس غازی کو تلاش کرنے کے لیے تھی جس نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آج سے بائیس سال پہلے اپنے علاقے سے فرنگیوں کو دُور رکھنے کی کوشش کی تھی مگر اب وہ ناکامی کی صُورت میں قیدوبند کی صعوبتیں بھگت رہا تھا۔

ایک موہوم سی اُمید ابھی تک میرے دل کے نہاں خانے میں روشن تھی جو کبھی کبھی شعلے کی صُورت اختیار کر جاتی تھی اور میں محسوس کرتا تھا کہ میرا جسم جل اور پگھل رہا ہے۔ میرے مسام آگ اُگل رہے ہیں اور میرا وجود اس نادیدہ آگ میں جل کر اپنا تشخص کھو بیٹھا ہے۔

جنرل چند لمحے بعد خیالات کے بھنور سے نکل کر میری طرف دیکھنے لگا۔

"میں تاجِ برطانیہ کے دوستوں میں شمار ہوتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اور میں آپ سے بھی دوستی کا طالب ہوں۔ میرے پاؤں غلامی کی بھاری زنجیریں پہننے کے عادی نہیں ہیں۔ میں نے آزاد فضاؤں میں آنکھ کھولی ہے اور آزادی کی موت مرنا باعثِ افتخار خیال کرتا ہوں۔ میری دلی تمنا ہے کہ آپ کے زیادہ سے زیادہ کام آؤں مگر اس کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ مجھے برطانوی قانون کا پابند بنا دیا جائے۔ میرا ہر کام اپنے آقاؤں کی اجازت سے ہو اور میں اپنی مرضی سے کچھ کرنے کے اختیار سے محروم ہو جاؤں۔"

میرے لہجے میں گہرا طنز تھا جسے جنرل ڈوگ نے بڑی شدت سے محسوس کیا۔ میری باتیں سُن کر اُس کی پیشانی پر شکنوں کا جال بکھر گیا۔

"نوجوان تمھاری باتوں سے میں ذاتی طور پر بہت متاثر ہوا ہوں۔ تمھاری باتیں سچائی اور حقیقت پر مبنی ہیں۔ اگر تم فوج میں باقاعدہ ملازمت نہیں کرنا چاہتے تو میں تمھیں مجبور نہیں کروں گا۔ تم جب اپنی مہم سے کامیاب واپس آؤ گے تو تمھارا انعام تمھیں بغیر کسی حیل و حجت کے ادا کر دیا جائے گا۔ ویسے میرا ذاتی خیال تھا ... کہ تم جیسا وجیہہ جوان فوج کے لیے بہت موزوں رہے گا۔ تمھیں ایک اہم عہدے کی پیش کش کی جا چکی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ تم اسے قبول کرتے ہو یا نہیں۔ میں اس سلسلے میں جبر کا قائل نہیں ہوں۔" جنرل ڈوگ کی آواز میں خاص دبدبہ تھا۔

اچانک کیپٹن مارک کے ایک اردلی نے اپنی آمد کی اطلاع دی تو میں جنرل ڈوگ اور اُس کی بیٹی پر آخری نظریں ڈالتا ہوا کرسی سے اُٹھ گیا۔

نووارد ایک گورکھا نوجوان تھا جو مجھے میری عارضی رہائش گاہ تک پہنچانے کے لیے آیا تھا۔

راستے میں باتوں کے دوران مجھے معلوم ہوا کہ فی الحال یہ گورکھا نوجوان ہی میری خدمت پر مامور کر دیا گیا ہے۔

کمرے میں آتے ہی گورکھا گرم گرم کھانا لے کر آ گیا۔ جسے میں نے اپنے مستقبل کے بارے میں غور کرتے ہوئے بڑی رغبت سے کھایا۔ گورکھا سپاہی جب برتن اُٹھانے آیا تو خالی برتن دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں حیرت عُود کر آئی۔ اُس کے جانے کے بعد میں چارپائی پر دراز ہو گیا اور اپنے ذہن میں مستقبل کا نقشہ ترتیب دینے لگا۔

مجھے جنرل ڈوگ کے اعتماد کی بے حد ضرورت تھی۔ یہ بات میں اُس پر ظاہر نہیں کر سکتا تھا کہ در حقیقت میں خود اُن کے قریب رہ کر اُن کی زندگیوں کا مشاہدہ کرنا چاہتا ہوں اور حقیقتاً میرا مقصد آزادی کے ایک گم شدہ مسافر کو ... ان سنگی جیل خانوں میں تلاش کرنا تھا جہاں ہوا کا بھی گزر مشکل تھا۔

انھی خیالات میں نہ جانے کب نیند کی دیوی نے اپنے پر پھیلا کر مجھے اپنی آغوش میں چھپا لیا۔

... پھر اچانک اُس ... میری آنکھ کھلی جب خوشبوؤں سے مہکتا ہوا کوئی وجود مجھ پر جھکا ہوا ... ہاتھوں کی نرم انگلیوں سے مجھے نیند سے بیدار کر رہا تھا۔

آنکھیں کھولتے ہی ایلس کا خوب صُورت چہرہ مسکراتا ہوا نظر آیا۔

وہ ایک ہلکا نیلا اسکرٹ پہنے ہوئی تھی جو اس کی جلد کی رنگت کے ساتھ بہت بھلا نظر آ رہا تھا۔

"ہیلو شہباز!" ایلس نے عجیب اور ناقابلِ فہم تاثرات سے لبریز نگاہوں سے میری طرف گھورتے ہوئے بے تکلفی کا ہلکا سا مظاہرہ کیا۔ "میں نے سوچا تھا کہ ہم دونوں مل کر شہر کی سیر کریں گے اور پھر ڈنر کے وقت تک پاپا کے پاس پہنچ جائیں گے۔ تمھیں یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟"

"آپ نے بہت اچھا کیا جو میری راہنمائی کے لیے آ گئیں ..." میرا لہجہ معنی خیز تھا۔ "دراصل بغیر کسی ساتھی کے کہیں بھی سیر کرنے کا لطف نہیں آتا۔ ویسے اس وقت کس طرف جانے کا ارادہ ہے؟" میں نے بے تکلفی سے سوال کر دیا۔

چند لمحوں تک وہ میری طرف یوں دیکھتی رہی جیسے اُسے میرے انداز میں تبدیلی پر یقین نہ آ رہا ہو ... پھر اُس کے ہونٹوں پہ فاتحانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ احساس جمال نے غالباً اُسے یہ بات سمجھائی تھی کہ وہ مجھ پہ اثر انداز ہونے میں کامیاب ہو چکی ہے۔

"میں سوچ رہی ہوں کہ آج اس درّے کی جانب جاؤں جہاں قلعوں میں خطرناک قیدی رکھے جاتے ہیں۔ میں یہ مشاہدہ کرنا چاہتی ہوں کہ طویل عرصے کی اسیری قیدوبند نے اُن میں کیا کیا تبدیلیاں پیدا کر دی ہیں۔"

میں نے اس خواہش پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

"میں نے سُنا ہے کہ پرانے قیدیوں کی اکثریت پاگل ہو چکی ہے مگر ان میں کچھ پرانے قیدی ایسے بھی ہیں جو آج بھی تاجِ برطانیہ کی برتری تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اُن کی جوانی بڑھاپے میں تبدیل ہو چکی ہے اور ان کے مضبوط قویٰ مضمحل ہو چکے ہیں مگر ان کے ارادوں میں اب بھی چٹانوں جیسی سختی اور خیالات میں پختگی کا وہی عنصر موجود ہے۔ وہ جان جیسی قیمتی چیز سے دست بردار ہونے کو تیار ہیں لیکن کسی کی برتری ماننا اُن کے بس کی بات نہیں ہے۔" وہ اپنی ہی جھونک میں بولتی چلی گئی۔

"ایسے لوگوں کو دیکھ کر تمھیں کیا ملے گا ایلس؟" میں نے انگڑائی لے کر اُٹھتے ہوئے پوچھا۔ "ایسے خطرناک لوگوں سے ہمیشہ دُور ہی رہنا چاہیے۔"

"وہ کیوں؟" اُس نے پلکیں جھپکا کر سوال کیا۔

"اگر اُن میں سے کسی پاگل نے تمھارے ساتھ کوئی زیادتی کی تو کیا ہو گا؟" میں نے بڑی سادگی سے سوال کیا۔

ایلس کے چہرے پر خطرناک مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

"میں مشرق کی کوئی گنوار عورت نہیں ہوں کہ آسانی سے اُس کا شکار بن جاؤں۔ جب تک اُن میں سے کوئی میرے ساتھ زیادتی کرنے کے ارادے سے میرے قریب آئے گا میرے پستول کا نشانہ بن جائے گا۔"

اُس نے پستول نکال کر انگلیوں کی مدد سے گھمانا شروع کر دیا ...

"اس کا مطلب ہے کہ مجھے تمھارا ساتھ دینا ہی پڑے گا۔" میں نے ہنسی سے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

●

سہ پہر کے بعد ہم لوگ نکلے تھے اور ابھی ایک قید خانہ بھی پوری طرح دیکھ نہ پائے تھے کہ شام ہو گئی تو ہمیں واپس آنا پڑا۔

ڈنر میں ہمارے ساتھ کچھ فرنگی اور بعض مقامی افسر بھی شریک تھے جنھوں نے مجھے اس عہدے کی مبارک باد دی۔ جسے قبول کرنے کی میں نے ابھی تک حامی نہیں بھری تھی۔ بہر حال اُنھوں نے مجھے تاجِ برطانیہ کا بہترین دوست قرار دیا۔ جسے میں نے خندہ پیشانی سے قبول کر لیا۔

شراب کی محفل جمنے لگی تھی تو میں نے اُٹھنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ ایلس مجھے باہر دروازے تک چھوڑنے آئی اور رُخصت ہوتے وقت اچانک اُس نے پنجوں کے بل پر گھوم کر میرے دونوں کندھے تھام لیے۔

میرا جی تو چاہا کہ اُس کے نفرت انگیز وجود کو جھٹک کر اُسے دُور پھینک دوں ...

... مگر میں اپنے اس ارادے پر عمل نہ کر سکا۔ اچانک ہی ایلس ---------- اپنی اداؤں کا جال سمیٹتی ہوئی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

ایلس میرے لیے بہترین مددگار ثابت ہو رہی تھی۔ میں پشاور چھاؤنی کے تیرہ و تار جیل خانوں میں اپنے اس بہادر باپ کو تلاش کرنا چاہتا تھا جس کے بوڑھے جسم کی معدوم ہوتی ہوئی حرارت آج بھی تاجِ برطانیہ کو ایک بڑے خطرے کا نشان نظر آ رہی تھی۔ ایلس نے جب اِن تاریک جیل خانوں کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو میں نے اس کا تجسس بڑھانے کے لیے زیبِ داستان کے طور پر کچھ ایسے افسانے اور افواہیں بھی سُنا دیں۔ جنھیں سُن کر اس کا اشتیاق اور بھی بڑھ گیا پھر یہی اشتیاق میری کامیابی کی علامت ثابت ہوا تھا۔

میں نے پہلے روز بھی اس کا بھرپور ساتھ دیا تھا اور رخصت ہوتے وقت بھی یہی پروگرام ہم دونوں کے لیے بحث کا موضوع بنا رہا۔ وہ انجانے پن میں میری مددگار ثابت ہو رہی تھی ... دوسرے روز بھی ایسا ہی ہوا۔

ہم نے متعدد تیرہ و تار قید خانے کھنگال ڈالے ... مگر ابھی تک میری آنکھوں کے سامنے میرا گوہرِ مراد نہیں آیا تھا۔

تیسرے روز اس نے بتایا "آج ہم ایک ایسے کیمپ کی جانب چل رہے ہیں، جہاں نہایت خطرناک اور پاگل قیدی رکھے جاتے ہیں۔"

"میں نے اپنی زندگی میں آج تک کوئی خطرناک پاگل نہیں دیکھا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم لوگ اپنے دماغ سے کام لینے کے بجائے جسم کے دوسرے اعضا سے کام لینے کے زیادہ عادی ہیں۔ میں نے نشے کے عالم میں کئی شرابیوں کو عجیب حرکتیں کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ جسے دیکھ کر دوسرے لوگ کہتے تھے کہ یہ پاگل ہو گیا ہے مگر نشہ اُترنے کے بعد وہ ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ میری زندگی میں یہ خواہش رہی کہ میں کسی ایسے پاگل سے

ملاقات کروں اور دیکھوں۔۔ کہ ذہنی طور پر ماؤف ہو کر انسان اپنی زندگی کیسے گزارتے ہیں۔"

"شہباز!" اچانک ایلس نے مجھے رُکتے ہُوئے کہا۔ "تمہاری یہی سادگی آہستہ آہستہ مجھے تمہارے سحر میں مبتلا کرتی جا رہی ہے۔" اس نے یہ بات جیل خانے کی تاریک سیڑھیوں سے اُترتے ہُوئے کہی۔ "کیا میرے سامنے ہمیشہ شریف آدمی ہی بنے رہو گے؟ میں نے ہمیشہ تمہاری ہر بات کو پسند کیا ہے مگر تم نے اب تک کبھی میری کسی بات کو نہیں سراہا۔ کیا تمہارے ہاں عورتوں کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا جاتا ہے؟"

اس کا جذباتی لہجہ انتہائے شوق کو چھو رہا تھا۔

مجھے اس کا چہرہ اس ناگن سے مشابہ نظر آیا جو اپنی دوشاخہ زبان لہراتی ہُوئی مجھ پر حملہ آور ہونے کے لیے بل کھا رہی ہو۔

"خوب صورت زہریلی ناگن تیرا کوئی جادو مجھ پر اثر نہیں کر سکتا۔" میں نے اپنے دل میں سوچا۔

"میں یہاں جوانی کے تقاضے پُورے کرنے نہیں آیا ہوں۔" میں نے نرمی سے اسے سمجھاتے ہُوئے کہا۔ "اور نہ ہی میرا مذہب کسی غیر عورت سے کوئی ایسا تعلق رکھنے کی اجازت دیتا ہے۔"

میری باتیں سن کر ایلس کا خوش نُما چہرہ بے رنگ نظر آنے لگا۔

"تم لوگ انتہائی قدامت پسند ہو اور زندگی کی چھوٹی چھوٹی آرزوؤں کے راستے میں بھی مذہب کی دیواریں کھڑی کر دیتے ہو۔ اگر دو دل محبت کی گرمی سے ایک دوسرے کے لیے پگھل جائیں تو اس میں کیا حرج ہے؟" اس نے پینترا بدل کر مجھ پر دوسرا جال پھینکا۔

"میں اپنی رُوح کو گناہوں کی سیاہی سے آلودہ کرنے کا عادی نہیں ہُوں۔" میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "کیوں کہ ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں سے انسان کی قوتِ ارادی میں کمی واقع ہو جاتی ہے اور اسے بُزدل بنا دیتی ہے۔"

ایلس نے ایک طویل سانس لی اور اپنی نیلی آنکھیں میرے چہرے پر گاڑتے ہُوئے بولی۔

"میں نے جس معاشرے میں آنکھ کھولی ہے، وہاں ان باتوں کی پروا نہیں کی جاتی اور آج تک میں نے جسے چاہا، اسے حاصل کر لیا مگر نہ جانے کیا بات ہے کہ تمہیں دیکھ کر دل میں ایک عجیب سا درد بیدار ہو جاتا ہے۔ کیا تم وضاحت کر سکتے ہو کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟"

ہم دونوں ابھی تک سیڑھیوں کے درمیان رُکے ہُوئے تھے۔

"ایلس!" میں نے نرمی سے جواب دیتے ہُوئے کہا۔ "یہ جگہ ایسی گہری اور پیچیدہ باتوں پر غور کرنے کے لیے مناسب نہیں ہے۔ ہم اس وقت پاگل اور خطرناک قیدیوں کے درمیان ہیں اور ان کی حرکات و سکنات سے اپنے تجربے میں اضافے کرنے کے لیے یہاں آئے ہیں۔ وہ دیکھو!" میں نے ایک کوٹھری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اُسے بتایا جہاں ایک قیدی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ "دیکھو ایلس یہ قیدی اس وقت کس قدر افسردہ نظر آ رہا ہے۔ شاید یہ اپنے مستقبل سے مایوس ہو چکا ہے۔"

میں نے اس کی توجہ ایک قیدی کی جانب مبذول کرائی۔ جس کے بدن پر لباس کی جگہ چیتھڑے لٹک رہے تھے۔ داڑھی اور سر کے بال بے تحاشا بڑھے ہُوئے تھے۔ جس سے اس کے چہرے کے اصل خدوخال چُھپ گئے تھے۔

سیڑھیاں طے کر کے ہم اس قیدی کے جنگلے کے سامنے جا کھڑے ہُوئے۔

قیدی نے ہمارے قدموں کی چاپ سُن کر ایک نظر ہمیں دیکھا اور دوبارہ سر جُھکا کر یاسیت کے سمندر میں ڈوب گیا۔

میں نے قیدی کو پہچاننے کی کوشش کی مگر اس کے چہرے کے نقش و نگار میرے لیے اجنبی ہی رہے۔

یہ جیل خانہ ایک پہاڑ کی پوشیدہ کھوہ میں تعمیر کیا گیا تھا اور اس وسیع کھوہ میں متعدد غار ایسے بھی موجود تھے جنھیں سلاخیں لگا کر جیل کا ایک حصّہ بنا دیا گیا تھا۔

ہم نے ایک ایک کر کے بہت سی ایسی کوٹھریاں دیکھ ڈالیں جن میں خطرناک قیدی تنہا رکھے گئے تھے۔ میری اُمیدوں پہ مایوسی کی گرد جمنے لگی تھی۔

ایک ایک کر کے سارے ہی خفیہ جیل خانے دیکھ لیے تھے مگر ان میں کسی قیدی کے خدوخال مانوس نظر نہیں آئے تھے۔۔۔

اچانک قیدیوں کا سکھ محافظ ایلس کو دیکھ کر خوشامدانہ انداز میں قریب آ گیا اور ہمیں ان خطرناک قیدیوں کے بارے میں بتانے لگا۔

"سردار جی! ان قیدیوں میں سے کوئی ایسا بھی قیدی ہے جس سے تم سب سے زیادہ متاثر ہُوئے ہو۔ اس کے غصّے سے اس کے رُعب و دبدبے سے یا اس کی جسامت سے یا پھر اس کی گرج دار آواز سے یا کوئی ایسی خصوصیت جو دوسروں میں نہ ہو؟" میں نے اچانک سکھ محافظ سے سوال کیا۔

سکھ محافظ چند منٹ تک اپنی داڑھی کُھجاتا رہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"مجھے یاد پڑتا ہے کہ ایک قیدی ایسا بھی ہے جو بائیس سال سے تنہائی کی قید بھگت رہا ہے مگر اس کے رُعب اور دبدبے کا یہ عالم ہے کہ آج بھی کوئی تنہا آدمی اس کے قریب جانے کی جرأت نہیں کرتا۔ اس کے بارے میں یہ بھی سُنا ہے کہ اس نے مسلسل کئی سالوں تک سپاہیوں کا شدید تشدّد برداشت کیا مگر زبان نہیں کھولی۔۔۔"

"وہ قیدی کہاں ہے؟" میں نے دلچسپی ظاہر کرتے ہُوئے کہا۔ "مجھے ایسے شیر دل انسان کو دیکھنے کا مدتوں سے اشتیاق ہے۔ جو اتنی طویل مدّت سے زندگی اور موت کے درمیان معلق رہنے کے باوجود اپنا حوصلہ نہیں ہارا۔ اور اس کی مزاحمت آج تک بھی جاری ہے؟"

سکھ محافظ نے ہمیں اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

وہ مختلف راستوں سے گزرتا ہُوا ایک دروازے کے سامنے ٹھہر گیا۔ ہمارے قدموں کی چاپ سُن کر فضا میں زنجیروں کی جھنکار اُبھری اور ایک دیو قامت انسان گہری سانسیں لیتا ہُوا کھڑا ہو گیا۔

اس کی داڑھی کے بال بڑھے ہُوئے تھے جن میں جگہ جگہ سفیدی جھلک رہی تھی۔ اس نے درخت کی مضبوط شاخوں جیسے فولادی بازوؤں کو حرکت دی تو یہ دیکھ کر مجھے ایک دھچکا لگا۔

اس کا ایک ہاتھ اور ایک پاؤں زنجیروں کی آہنی گرفت میں تھا۔

اس نے نگاہ اُٹھا کر میری جانب دیکھا تو اس کی لہو رنگ آنکھوں میں انتقام اور نفرت کی آگ روشن دیکھ کر میں حیرت زدہ رہ گیا۔

اچانک اس نے ایک بار پھر اپنے ہاتھوں کو حرکت دی۔ وہ کسی وحشی درندے کی طرح ان زنجیروں سے آزاد ہونے کے لیے جدوجہد کرنے لگا۔

اس کی سُرخ سُرخ آنکھیں میری جانب اُٹھیں اور مجھے اپنی رُوح کے انتہائی گوشوں میں جھانکتی ہُوئی محسوس ہُوئیں۔ اس کے ساتھ ہی میرے وجود میں ایک نیا احساس اُبھرنے لگا جس میں اپنائیت کی خوشبو بھی تھی اور ماضی کی دفن شدہ یادیں بھی تھیں۔

اس قیدی کی صُورت میں اس وقت میرے سامنے میرے بابا شالیار خان زنجیروں میں جکڑے کھڑے تھے۔

انھیں پابندِ سلاسل پا کر دل کو گہرا صدمہ ہُوا اور اپنے شیر دل باپ کی بدحالی دیکھ کر میری آنکھوں کے کونے لرزنے لگے۔۔۔

لیکن میں نے انتہائی ضبط سے کام لیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میرے رویّے سے کسی کو بھی میرے اور اس کے کسی تعلق کا احساس ہونے پائے۔

"اسے زنجیروں میں کیوں جکڑ رکھا گیا ہے۔ یہ امتیازی سلوک اس کے ساتھ کیوں ہو رہا ہے؟"

میں نے سرسری سے لہجے میں سکھ محافظ سے سوال کیا۔

"یہ بہت خطرناک قیدی ہے جناب!" اس نے قیدی کی طرف ایک نظر دیکھتے ہُوئے جواب دیا۔ "اس کا نام شالیار خان ہے جو اپنے وقت کا مشہور باغی تھا۔ اس نے تاج برطانیہ کے ایک خزانے پر ڈاکا ڈالا اور ہزاروں روپے کا سونا لے کر غائب ہو گیا تھا۔"

"اوہ، واقعی خطرناک آدمی ہے۔" میں نے تبصرہ کیا۔

"اس خزانے کے لُوٹے جانے کے بعد حکومت نے بڑے پیمانے پر اس کی تلاش شروع کر دی۔ بالآخر ایک دن پکڑا گیا۔ اس پر برسوں تشدد ہوتا رہا مگر اس نے آج تک خزانے کا پتہ نہیں بتایا اور نہ ہی اس کے ہونٹوں سے اس کے کسی ساتھی کا نام نکلا۔ اسے زنجیروں میں اس لیے باندھ کر رکھا گیا ہے کہ یہ اب تک تین محافظوں کو قتل کر چکا ہے۔ اس نے فرار ہونے کی بھی متعدد کوششیں کی ہیں۔"

"اسے ہلاک کیوں نہیں کر دیا گیا؟"

"اسے اب تک محض اس لیے زندہ رکھا جا رہا ہے کہ حکومت ہر قیمت پر وہ مسروقہ سونا برآمد کرنا چاہتی ہے۔ جس روز بھی اس کی زبان کُھل گئی اور اس نے خزانے کا پتہ بتا دیا، وہ اس کی زندگی کا آخری دن ہو گا۔ حکومت قاتلوں کو معاف کرنے کی عادی نہیں ہے۔"

سکھ سپاہی دھواں دھار تقریر کرتے ہُوئے میری معلومات میں اضافہ کرتا رہا۔

اسے کیا معلوم تھا کہ میرا اس قیدی سے کیا رشتہ ہے اور اسے زنجیروں میں جکڑے دیکھ کر میری کیا حالت ہو رہی ہے۔

اچانک میرے خیالات ماضی کی شاہراہوں پر بھٹکنے لگے۔

میں اپنے شیر دل اور غیور باپ کے بارے میں سوچتے ہُوئے ایک عجیب سا فخر محسوس کرنے لگا۔

قیدی کی سُرخ آنکھیں بار بار میرے چہرے کی جانب اُٹھ رہی تھیں جن میں آتشِ انتقام کی لہریں اُبھرتی ہُوئی دکھائی دیتی تھیں۔

اچانک قیدی بڑے وحشیانہ انداز میں غرّایا اور اپنا بازو

بھاری زنجیروں کو قید سے آزاد کرنے کی جدوجہد کرنے لگا مگر اس کی یہ کوشش بھاری زنجیروں کو توڑنے میں ناکام رہی۔

اپنی ناکامی پر اس کی لہو رنگ آنکھیں خوف ناک انداز میں پھیل گئیں۔

وہ ایلس کو گھورتے ہوئے بار بار کسی وحشی درندے کی طرح چنگھاڑنے لگا۔

ایلس خوف زدہ سی نظر آ رہی تھی۔ وہ مجھ سے بالکل لگ کر کھڑی ہو گئی اور کسی قدر لرزیدہ آواز میں کہنے لگی۔

"شہباز، یہ ایک پاگل قیدی ہے۔" ایلس نے قیدی کو چنگھاڑتے ہوئے دیکھ کر تبصرہ کیا۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"تمھیں کسی پاگل شخص کو دیکھنے کا شوق تھا۔ اسے دیکھ کر اپنے اس شوق کی تکمیل کر سکتے ہو۔ تم نے محسوس کیا کہ محبوس ہونے کے باوجود اس کی آنکھیں قہر و غضب کی آگ اگل رہی ہیں۔۔"

میں نے سلگتی ہوئی نظروں سے ایلس کی طرف دیکھا اور اس کی باتوں پر غور کرنے لگا۔ نفرت اور محبت ایک ایسا عمل ہے جو زمان و مکاں کی قید سے آزاد ہے۔ اس میں رنگ، نسل اور قوم کی قید نہیں ہے۔

قیدی کی آگ اگلتی ہوئی آنکھوں سے نفرت کا اظہار ایک قدرتی عمل تھا کیوں کہ سفید چمڑی والے فرنگیوں نے اس کی آزادی سلب کر کے اس پر موت کی تاریکیاں مسلط کر دی تھیں اور اسے بائیس سال کا طویل عرصہ اپنے جسم پر اذیتیں اٹھاتے ہوئے گزر گیا تھا۔

"شہباز!" اچانک ایلس نے میرا بازو تھامتے ہوئے کہا۔ "مجھے اس قیدی کو دیکھ کر خوف آ رہا ہے۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے اسے زندگی میں اگر کبھی موقع مل گیا تو یہ میرے ساتھ بڑا وحشیانہ سلوک کرے گا۔"

"ایلس، ایک محبوس قیدی سے اس قدر خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔۔۔" میں نے سپاٹ آواز میں اسے سمجھایا۔

"ایسے لوگوں کو فوراً گولی مار دینی چاہیے۔" اس نے تبصرہ کیا۔

"اس کا ایک پاؤں اور ایک ہاتھ بھاری زنجیروں سے جکڑا ہوا ہے اور اتنا طویل عرصہ گزرنے کے بعد بھی یہ ان بھاری زنجیروں سے خود کو آزاد نہیں کرا سکا۔ اس سے خوف کھانے کی بجائے اس سے ہمدردی اور رحم دلی کا سلوک کرنا چاہیے ورنہ اس کی وحشتوں میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اضافہ ہوتا جائے گا۔ اس کا چہرہ غور سے دیکھو۔ اس پر اس کی بہادری اور شجاعت کے کھلے نشانات ثبت ہیں۔ یہ ایک غیور اور بہادر قوم کا فرزند ہے۔ اسے کوئی انسان طاقت اور تشدد کے بل پر زیر نہیں کر سکتا۔ اس کی زبان کھلوانے کے لیے نرمی اور محبت کی ضرورت ہے جس سے اسے محروم رکھا جا رہا ہے۔"

ایلس گہری توجہ سے میری باتیں سن رہی تھی۔

"شہباز، تم نے جس دردناک انداز میں اس قیدی کی حالتِ زار پر تبصرہ کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے، اسے دیکھ کر تمھارے دل میں زبردست ہمدردی کی لہر پیدا ہو گئی ہے، اور تم اسے قیدِ تنہائی سے نجات دلانے کے بارے میں غور کر رہے ہو۔ کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ تمھارے خیالات میں اچانک اس تبدیلی کا سبب کیا ہے؟"

ایلس کا تجزیہ خطرناک حد تک درست تھا۔ مجھے اس کے سامنے اس انداز میں اپنی ہمدردی کا اظہار نہیں کرنا چاہیے تھا۔۔ مگر انسان خطا کا پتلا ہے اور غلطی کرنا اس کا ازلی اور ابدی مقدر ہے۔ ایلس کی باتیں سن کر میرے ہونٹوں پر ایک سوگوار مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"ایلس، کیا ایک انسان ہونے کے ناتے تمھارا دل انسانی ہمدردی سے خالی ہو چکا ہے؟ یہ میرا ہم وطن اور ہم قوم ہے۔ اگر اس کی خراب و خستہ حالت دیکھ کر میرے دل میں قدرتی طور پر ہمدردی کے جذبات ابھر آئے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ میرے چہرے پر غداری کا داغ ثبت کر دیا جائے۔ میں کسی دباؤ اور لالچ سے آزاد ہو کر لوگوں سے ملنے کا عادی ہوں۔ تم ایک فاتح قوم کی بیٹی ہو۔ تم مفتوح قوم کے جذبات کا صحیح اندازہ کبھی نہیں لگا سکتیں کیوں کہ تم آزاد فضاؤں میں رہنے کی عادی ہو اور حکمران طبقے سے تعلق رکھتی ہو۔" میرے لہجے میں تلخی آ گئی۔

"یہ بات نہیں ہے۔ ہمدردی اور محبت صرف تعلق کے زیرِ اثر ہوتی ہے۔ اگر میرا اس قیدی سے کوئی تعلق ہوتا تو میں یقیناً اس کے لیے ہمدردی محسوس کرتی۔"

"اس سے تمھارا تعلق ہے اور تم اسے بھول رہی ہو۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"کیسا تعلق؟" اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

"دشمنی کا تعلق۔" میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ برقرار رہی۔

میری بات سمجھ کر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔۔۔ پھر ہنسی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ضبط کرتے ہوئے بولی۔ "اس قیدی سے تمھارا کیا رشتہ ہے جو تم اس کی اتنی شدت سے حمایت کرنے پر تلے ہوئے ہو؟" ایلس نے مسکراتے ہوئے سوال کیا۔ "تمھاری باتیں مجھے بہت متاثر کر رہی ہیں۔ تمھارے لب و لہجے سے جھلکتی ہوئی برہمی دیکھ کر مجھے محسوس ہو رہا ہے، جیسے میری قوم کے خلاف تمھاری روح میں نفرت کا لاوا ابل رہا ہو۔"

"میرا اس قیدی سے انسانیت کا قدیم رشتہ ہے، جس کے ڈانڈے تمھاری ذات کے ساتھ بھی ملے ہوئے ہیں۔" میرا لہجہ فلسفیانہ ہو گیا۔ "مگر تم اس رشتے کی اہمیت نظر انداز کر چکی ہو، جو ایک انسان کا دوسرے انسان کے ساتھ ہے۔ دنیا رنگ، نسل اور قوموں میں بٹ چکی ہے۔ یہی وجہ ہے اس قیدی کی حالت دیکھ کر تمھارے سینے میں کوئی لہر نہیں ابھری۔ اگر اس قیدی کی جگہ کوئی سفید فام ہوتا تو تمھیں یہ سوال کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوتی کہ میرا اس بوڑھے قیدی سے کیا رشتہ ہے۔"

"شہباز!" ایلس اچانک جذباتی انداز میں چلائی۔ "چلو واپس چلیں۔ مجھے تمھاری باتیں سن کر وحشت ہو رہی ہے۔"

میں نے ایک نظر اس بوڑھے شیر کی طرف دیکھا اور خاموشی سے واپسی کے راستے پر چل پڑا۔

ذہنی فضا مکدر ہو چکی تھی اس لیے قید خانے سے چھاؤنی تک واپسی کا راستہ بڑی خاموشی سے طے ہوا۔

اپنے بابا کو اپنی آنکھوں سے زندہ دیکھ کر میری وحشتوں میں کمی ہو چکی تھی اور میں سنجیدگی سے اپنے ذہن کے نہاں خانوں میں کوئی ایسا قابلِ عمل منصوبہ ترتیب دے رہا تھا جو میرے بوڑھے بابا کے لیے رہائی کا راستہ ہموار کر دے۔

اپنے بابا کو تلاش کر لینے کے بعد مجھے اپنے وجود میں ایک عجیب سی خلش محسوس ہو رہی تھی۔

مسلسل دو روز اسی سوچ و بچار میں گزر گئے مگر کوئی ایسا قابلِ عمل منصوبہ ذہن میں نہ آ سکا۔

کوئی صورت نظر نہ آئی تو جھنجلا کر یہی سوچا کہ اس چھاؤنی میں بغاوت پھیلا دوں اور پھر سب کچھ تباہ کر دوں۔ ایک ایسی آگ بھڑکا دوں جس میں سارے فرنگی اور ضمیر فروش لوگ جل کر راکھ ہو جائیں۔۔ لیکن اس طرح کی بہادری حماقت کا دوسرا نام ہے اور میں احمقانہ انداز میں کوئی قدم اٹھا کر خود کو ہلاکت میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ زندہ رہ کر اپنے بابا کی زندگی ان لوگوں سے چھین لے جانا چاہتا تھا۔

میں گہری سوچوں میں گم تھا کہ اچانک گورکھا اردلی خاموشی سے آ کر میرے قریب کھڑا ہو گیا۔

اسے دیکھ کر میں نے محسوس کیا، جیسے وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہو۔۔ مگر ہچکچاہٹ محسوس کر رہا ہے۔

"مانک ٹالہ۔۔" میں نے اسے نرمی سے مخاطب کیا۔ "کیا بات ہے، اس قدر بے چین کیوں نظر آ رہے ہو؟"

مانک ٹالہ خوشامدانہ انداز میں مسکرایا اور کہنے لگا۔

"آپ دوسرے تمام فوجی لوگوں سے بہت مختلف زندگی گزار رہے ہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ کل شام سے بہت ہی خاموش خاموش نظر آ رہے ہیں جب کہ اس کے برعکس دوسرے تمام فوجی افسر عیش کر رہے ہیں۔ آپ نے ابھی تک کوئی فائدہ نہیں اٹھایا؟"

"مانک ٹالہ، میں کوئی افسر نہیں ہوں۔" میں نے تلخی سے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "مجھے ایک عہدہ، خاص مصلحت کے تحت دیا جا رہا ہے۔ میں یہاں اپنی رقم وصول کرنے آیا تھا کوئی عہدہ حاصل کرنے کی تمنا لے کر نہیں آیا تھا۔ اب میرے سامنے ایک نئی مہم درپیش ہے۔ جس کے بارے میں، میں خود کو ذہنی طور پر تیار کر رہا ہوں مگر تم میری ذات سے اس قدر گہری دل چسپی کیوں لے رہے ہو؟"

میرے اس سوال سے مانک ٹالہ کے چہرے پر تاریک سائے پھیل گئے اور وہ مجھ سے آنکھیں چرانے لگا۔

"یہ فرنگی افسر میرے وطن کی عورتوں کے ساتھ بڑا وحشیانہ سلوک کرتے ہیں۔" مانک ٹالہ کسی آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑا۔۔۔ "انھوں نے میری آنکھوں کے سامنے میری ماں اور بہن کو بے آبرو کیا پھر سنگینوں سے انھیں چھید ڈالا اور مجھے دوسرے قیدیوں کے ساتھ ہانکتے ہوئے لے آئے۔ آج بھی وہ منظر میری آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا ہے تو میرے سینے میں انتقام و نفرت کے شعلے بھڑک اٹھتے ہیں اور یہی آگ جو برسوں سے میری روح کو جلا رہی ہے، وہی آگ میں آپ کی آنکھوں میں بھی محسوس کر رہا ہوں۔ یوں لگ رہا ہے جیسے آپ درپردہ فرنگیوں سے انتقام لینے کا ارادہ رکھتے ہیں مگر کسی خاص مصلحت کے تحت اپنی نفرت کا کھل کر اظہار نہیں کرنا چاہتے؟"

مانک ٹالہ میری توقع سے کہیں زیادہ ذہین اور حساس تھا۔ میں اس کے اس عمیق مشاہدے کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔

"مانک ٹالہ!" میں نے مسکرا کر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "ذہانت اچھی چیز ہے مگر اس کا بے محابا استعمال نقصان

کے لیے مُعِز ثابت ہوتا ہے۔"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔" وہ چونک پڑا۔

"اگر تمھیں ان لوگوں سے اس قدر نفرت ہے تو تم نے اب تک فرار ہونے کی کوئی کوشش کیوں نہیں کی؟ اگر تمھاری ان باتوں کی بھنک کسی ذمے دار افسر کے کانوں میں پڑ گئی تو قبر کی تاریکیاں تمھارا مقدر بن جائیں گی۔"

میری باتیں سُن کر مانک ٹالہ کا چہرہ زرد پڑ گیا۔

"دراصل میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ میں آپ کو پسند کرتا ہوں اور آپ کے کسی کام آنا چاہتا ہوں مگر آپ نے میری باتوں کا غلط مطلب لیا ہے جس کا مجھے افسوس ہے۔" اس نے بوکھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

میں خاموشی سے مانک ٹالہ کی پیش کش پر غور کرنے لگا۔ مانک ٹالہ کے لب و لہجے میں سچائی جھلک رہی تھی۔

"مانک ٹالہ!" میں نے فیصلہ کن انداز اختیار کرتے ہوئے کہا "مجھے واقعی تم جیسے ایک ہمدرد کی بے حد ضرورت ہے مگر کوئی کام سونپنے سے پہلے تمھیں اس بات سے آگاہ کر دینا چاہتا ہوں کہ اگر تم نے مجھے دھوکا دینے کی کوشش کی تو میرے ہاتھ تمھارا گلا دبانے سے کبھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کریں گے۔ کیا تم مجھے اس بات کا یقین دلا سکتے ہو کہ ہمیشہ میرے وفادار رہو گے؟"

"عظیم ماں کی قسم! میں تم سے غداری کرنے کے بارے میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا۔" مانک ٹالہ کی بھرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ "مجھے اپنی ماتا کے لہو کی سوگند مانک ٹالہ زندگی کے آخری سانس تک تمھارا وفادار رہے گا۔"

"مجھاؤنی کے مغربی حصے میں قیدیوں کا کیمپ ہے جس کا نگران میجر شیپرڈ ہے۔ کیا تم اس کیمپ کے بارے میں کچھ معلومات رکھتے ہو؟" میری نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

"اس کیمپ میں بڑے خطرناک قیدی رکھے جاتے ہیں۔" مانک ٹالہ نے کھوئے ہوئے انداز میں جواب دیا۔

"مگر مجھے ایک خاص قیدی سے دلچسپی ہے۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "میں چاہتا ہوں کہ جب تک میں اس مہم سے واپس نہیں آجاتا، اس قیدی کی خبرگیری کی جائے اور اگر ہو سکے تو اسے خوراک اور دیگر ضروری اشیا مہیا کی جائیں مگر اس پر یہ ظاہر نہ ہونے دیا جائے کہ اسے یہ سہولتیں کون مہیا کر رہا ہے۔ کیا تم یہ کام کر سکتے ہو؟"

"یہ کام اس قدر رازداری سے کیا جائے گا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوگی اور قیدی کو ساری سہولتیں مل جائیں گی۔ اس کام کے لیے محافظوں کو کچھ رشوت پیش کرنی پڑے گی تب یہ مسئلہ آسان ہو جائے گا مگر ابھی تک آپ نے اس قیدی کا نام نہیں بتایا کہ وہ کون معزز شخصیت ہے جس کے لیے آپ اس قدر بے چین اور بے قرار نظر آ رہے ہیں؟"

"مانک ٹالہ! تم مجھے آپ جناب سے مخاطب نہ کرو۔ مجھے ایسے آداب سے نفرت ہے جن سے غلامی کا احساس اُجاگر ہوتا ہو۔ تم مجھے شہباز کہہ کر پکار سکتے ہو۔ اس سے میری شخصی وجاہت میں کوئی کمی نہیں آئے گی۔ میری اس نصیحت کو یاد رکھنا، یہ راز کبھی نہیں کھلنا چاہیے کہ میں نے تم سے کسی قیدی کو سہولتیں مہیا کرنے کی سفارش کی تھی۔" میں نے دوبارہ اسے یاد دلایا۔

"مجھ پر اعتماد کرو، دوست!" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں دیوتاؤں سے غداری نہیں کر سکتا۔ میں تم میں کسی دیوتا کی جھلک دیکھ رہا ہوں۔"

"بس۔ ۔ ۔ بس۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "اب زیادہ بانس پر مت چڑھاؤ۔"

"تم نے ابھی تک مجھے اس قیدی کا نام نہیں بتایا جس پر تم جیسا دیوتا مہربان ہو رہا ہے؟"

"اس کا نام ہے شالیار خان۔ ۔ ۔" میں نے نرمی سے جواب دیا۔

"وہ۔ ۔ ۔ وہ۔ ۔ ۔ پاگل اور خطرناک قیدی ہے۔ تمھارا اس سے کیا تعلق؟"

"میرے اور اس کے درمیان رشتہ تلاش کرنے کی جستجو نہ کرو۔" میرے لہجے میں برہمی آگئی۔

ایک پراسرار مورتی کے حصول کے لئے ہونے والے خوفناک معرکے کا احوال
خبیث
انوار صدیقی کے پراسرار قلم سے
5 حصوں میں مکمل سیٹ =/200 روپے
مکتبہ القریش سرکلر روڈ اردو بازار لاہور
فون 7668958

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"تمھیں ناگوار محسوس ہو رہا ہے تو میں معافی چاہتا ہوں۔"

"صرف یہ بتاؤ کہ تم یہ کام کر سکتے ہو یا نہیں؟"

"میں تمھیں کیسے یقین دلاؤں کہ یہ کام بہت آسانی سے کر سکتا ہوں۔" مانک ٹالہ نے چوکنا ہو کر اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا اس کے بدلے میں کچھ چاہتے بھی ہو؟" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ ۔ ۔" اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"وہ کیا؟"

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم مجھے اپنی مہم میں شامل کر لو؟"

میں اس کا ناتواں جسم دیکھ کر ہنس پڑا۔

"میری ساری زندگی پہاڑوں اور ٹیلوں کے درمیان گزری ہے۔ میں پتھر سونگھ کر بتا سکتا ہوں کہ اس کے پیچھے کتنے آدمی چھپے ہوئے ہیں۔ تم چاہو تو میری ان صلاحیتوں کو آزما سکتے ہو۔"

"ایسا ہونا بہت مشکل ہے، مانک ٹالہ!" میں نے نرمی سے جواب دیا۔

"کیا مشکل ہے شہباز۔ تم مجھے یہاں سے رہائی دلا سکتے ہو؟"

"اگر تم یہاں سے جانا چاہتے ہو تو تمھیں کون روک سکتا ہے۔ تم قیدی تو نہیں ہو؟" میں نے کہا۔

"بات یہ ہے کہ میں کسی ایسے گروہ کے ساتھ شامل ہونا چاہتا ہوں جو فرنگیوں کے خون کا پیاسا ہو۔ میرے دل میں انتقام کی آگ جل رہی ہے۔"

"اگر تم میرے ساتھ چلے گئے تو اس قیدی کی خبرگیری کون کرے گا؟ ویسے اس بات کا یقین دلاتا ہوں کہ اس مہم سے واپسی کے بعد میں تمھیں مستقل طور پر اپنے ساتھ رکھوں گا۔"

میری اس یقین دہانی سے مانک ٹالہ کا چہرہ شدتِ جذبات سے سُرخ ہو گیا۔

اسی روز شام کو جنرل ڈوگ نے مجھے اپنے دفتر میں طلب کیا اور اس مہم کے کاغذات میرے ہاتھوں میں تھما دیے جس پر مجھے روانہ ہونا تھا۔

میری نظریں کاغذات کا جائزہ لینے لگیں۔ منصوبے کی ایک ایک تفصیل بڑے غور سے پڑھی اور کاغذات جنرل کی میز پر ڈال دیے۔

"اس منصوبے کے مطابق مہم میں کامیابی حاصل کرنا بہت مشکل ہے کیوں کہ راستہ اور طریقہ کار متعین کرنے والے منصوبہ ساز ذہنوں نے ہمارے سفر کی صعوبتوں کا اندازہ لگانے میں غلطی کی ہے۔"

"کیا مطلب؟" جنرل ڈوگ کا چہرہ بگڑنے لگا۔

"یہ مہم میں اپنے بنائے ہوئے منصوبے کے مطابق سَر کروں گا۔ حالات اور ماحول کی نزاکت کو سامنے رکھتے ہوئے مجھے اس بات کا فیصلہ کرنے کا اختیار ہونا چاہیے کہ جب اور جہاں چاہوں اپنے منصوبے میں ردّ و بدل کر سکوں۔" میں نے وضاحت کی۔

جنرل ڈوگ میرا اعتراض سن کر حیرت زدہ نظر آ رہا تھا۔ ۔ ۔ شاید اس کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ اس سے کم تر درجے کے کسی آدمی نے اس کا منصوبہ مکمل طور پر رَد کر دیا تھا۔

اس نے چشمہ اُتار کر میز پر رکھ دیا اور اپنے ہاتھوں کو مَلتے ہوئے کہا۔

"تمھیں اس منصوبے میں کیا خرابی نظر آ رہی ہے؟"

میں نے گہری سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے جواب دیا۔

"خرابی تمھارے بنائے ہوئے منصوبے میں نہیں بلکہ میرے ذہن میں ہے جو زندگی اور موت کی اس خوف ناک جنگ میں ماحول کی مطابقت سے فیصلے کرنے کا عادی ہے۔ آپ مجھے آدمی اور اسلحہ مہیا کر دیں۔ اس کے بعد بقیہ چیزیں مجھ پر چھوڑ دیں کہ میں اپنا یہ سفر کس انداز میں طے کرتا ہوں۔ اس کے علاوہ کوئی دوسری صورت موجود نہیں ہے جو مجھے اس خطرناک سفر کے لیے آمادہ کر سکے۔ اگر آپ کو یہ بات منظور نہیں ہے تو کوئی دوسرا آدمی منتخب کر سکتے ہیں جو آپ کے بنائے ہوئے منصوبے کے مطابق یہ دشوار گزار سفر کرنے پر تیار ہو جائے۔"

جنرل کی نیلی آنکھیں ابھی تک مجھے حیرت اور تجسس سے گھور رہی تھیں۔

اس نے اپنا بجھا ہوا سگار سلگایا اور دھواں اُگلتے ہوئے بولا۔

"مجھے اس بات کا صدمہ ضرور ہوا ہے کہ میرا منصوبہ مسترد کر دیا گیا مگر یہ بات میرے لیے اطمینان کا باعث ہے کہ میں نے اس خطرناک مہم کے لیے کسی غلط آدمی کا انتخاب نہیں کیا ہے۔"

اس نے کاغذات اُٹھا کر ردّی کی ٹوکری میں ڈال دیے اور مسکراتے ہوئے میری جانب تعریفی انداز میں دیکھنے لگا۔

"مجھے پچیس بہترین لڑاکا جوان مہیا کر دیں تاکہ میں یہ فیصلہ کر سکوں کہ مجھے یہ سفر کس انداز میں طے کرنا چاہیے۔" میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

جنرل ڈوگ سے اس مہم کے سلسلے میں بات چیت کرتے

ہوئے دو گھنٹے سے زیادہ وقت گزر گیا۔ میں نے اُسے اُس خطرناک منزل اور اس کے درمیان پھیلے ہوئے پہاڑوں، دریاؤں اور ڈاکوؤں کے مسکنوں کے بارے میں تفصیل سے بتایا اور اپنا لائحہ عمل سمجھایا۔ وہ میری ایک ایک بات توجہ سے سُن رہا تھا۔ بالآخر اس نے ایک طویل سانس لی اور میری ہر بات کو مانتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"تمہارا لائحہ عمل واقعی بے مثال ہے شہباز!" اس نے کہا۔ "میں تمہاری دلیری کے ساتھ ساتھ تمہاری ذہانت کا بھی قائل ہو گیا ہوں۔ اب مجھے اچھی طرح احساس ہو رہا ہے کہ اس سے پہلے ہمارے جتنے بھی دستے اُس طرف گئے ہیں، انھیں ناکامی کا منہ کیوں دیکھنا پڑا؟"

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔

اچانک اردلی نے آکر اطلاع دی۔

"سارجنٹ فلپ اپنے ساتھیوں سمیت اس وقت دفتر کے سامنے موجود ہیں اور آپ کے حکم کے منتظر ہیں۔"

"سارجنٹ فلپ کو بلاؤ تاکہ وہ شہباز سے متعارف ہو جائے۔" جنرل نے حکم دیا۔

چند لمحوں کے بعد ایک لحیم شحیم پختہ عمر کا آدمی میرے سامنے آکھڑا ہوا۔

اس کی فراخ پیشانی پر زخموں کے متعدد نشانات تھے... آنکھوں سے عیاری اور سخت گیری جھلکتی تھی۔

"سارجنٹ! یہ شہباز ہے۔" جنرل نے میری جانب ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے تعارف کرایا۔ "تم لوگ جس مہم پر جا رہے ہو، اس میں شہباز تمہارا معاون ہوگا۔ اس نے جو لائحہ عمل اختیار کیا ہے، مجھے بے حد پسند آیا۔ اس لیے میں حکم دیتا ہوں کہ اس کی پابندی کی جائے۔ اس کے علاوہ مہم میں شہباز کے مشوروں کو خاص اہمیت دی جائے۔"

"آپ کے حکم کی تعمیل کی جائے گی۔" سارجنٹ فلپ نے پاٹ دار آواز میں جواب دیا اور گہری نظروں سے میری جانب دیکھنے لگا۔

"اب تم انھیں اپنے ساتھیوں سے متعارف کرا دو اور انھیں سمجھا دو کہ اس مہم میں ناکامی کا تصور بھی برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے کوئی بھی شخص بے پروائی کا مرتکب نہ ہو۔"

سارجنٹ نے سیلوٹ کیا اور میرے ساتھ جنرل کے دفتر سے باہر آگیا۔

وہ اب بھی دزدیدہ نظروں سے میرا چہرہ دیکھ رہا تھا جیسے میرے خدوخال پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔

"شہباز!" راہداری سے گزرتے ہوئے اچانک فلپ نے مجھے مخاطب کر کے کہا۔ "تمہارا چہرہ دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں تمہیں بہت قریب سے دیکھ چکا ہوں۔ تمہارے نقش و نگار اور جسم کی بناوٹ میری آنکھوں کو مانوس محسوس ہو رہی ہے۔"

"سارجنٹ فلپ!" میں نے اس کی عیار آنکھوں میں جھانکتے ہوئے جواب دیا۔ "میری زندگی کا شاید یہ دوسرا یا تیسرا موقع ہے کہ میں سنگلاخ پہاڑوں سے گزر کر پشاور آیا ہوں۔ آج تک میں نے چھوٹی چھوٹی بستیاں ہی دیکھی ہیں۔ مجھے تمہاری یہ بات سُن کر حیرت ہو رہی ہے کہ تم نے اس سے پہلے مجھے کہاں دیکھا ہوگا۔"

سارجنٹ فلپ کی آنکھیں سوچنے کے انداز میں سکڑ گئیں۔ وہ اپنا ذہن کرید رہا تھا اور یہ یاد کر رہا تھا کہ میرا چہرہ اسے کیوں مانوس محسوس ہوا ہے۔

ہم راہداری سے گزر کر ایک کھلے میدان میں آگئے جہاں میدان کے ایک کنارے کچھ لوگ ایک قطار میں کھڑے نظر آ رہے تھے۔ جوں ہی سارجنٹ ان کی نظروں کے سامنے آیا، وہ خاموشی سے ہماری جانب دیکھنے لگے۔

میں ان لوگوں کو دلچسپی کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا جو میرے ساتھ اس خطرناک مہم پر جانے کے لیے منتخب کیے گئے تھے۔ ان میں چار سکھ اور چار گورکھے تھے اور بارہ قبائلی نوجوان تھے، جو چمکتے ہوئے سکوں کی جھنکار پر اپنے ہم وطنوں کا خون بہانے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ پانچ فرنگی سپاہی بھی تھے۔

میں نے ایک ایک شخص کو اپنی نظروں میں تول کر دیکھا۔ ان میں سے ہر شخص مستعد اور بے خوف ہو کر موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کا عادی نظر آ رہا تھا۔

میں نے سفید فام فوجیوں پر گہری نظریں ڈالتے ہوئے کہا۔ "تمہارا انتخاب لاجواب ہے سارجنٹ!" جواباً اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"کیا یہ فرنگی سپاہی میرے احکامات کی تعمیل کرتے ہوئے اپنی توہین تو خیال نہیں کریں گے۔ مجھے ان کے بارے میں شبہ ہے کہ کہیں یہ وقت آنے پر کوئی خلاف ورزی نہ کریں؟"

فلپ نے اپنی مکار آنکھیں میرے چہرے پر گاڑتے ہوئے کہا۔ "میں تمھیں یقین دلاتا ہوں کہ یہ تمہارے لائحہ عمل کے لیے ضرر رساں نہیں ثابت ہوں گے۔ یہ میرے آزمائے ہوئے دلیر نوجوان ہیں۔ تاج برطانیہ کا پرچم بلند رکھنے کے لیے اپنے فرائض

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں کبھی کوتاہی نہیں کریں گے۔"

"اس مہم کے لیے ہمیں سواری کے لیے کیا کچھ دیا جا رہا ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"ایک جیپ، دو گھوڑا گاڑیاں اور سواروں کے لیے مضبوط گھوڑے یا خچر۔"

"جیپ کی ہمیں ضرورت نہیں پڑے گی کیونکہ اس سفر میں وہ کارآمد ثابت نہیں ہو سکتی۔ البتہ میں ان گھوڑا گاڑیوں کو دیکھنا چاہتا ہوں جن میں راشن اور اسلحہ لدا ہوا ہے۔ میرا خیال ہے کل صبح کا سورج نکلنے سے پہلے ہم اپنی مہم پر روانہ ہو چکے ہوں گے!"

فلپ نے تائید میں سر ہلایا اور مجھے سپاہیوں سے متعارف کرانے لگا... پھر وہ مجھے ان گاڑیوں کی طرف لے گیا جو مہم کے لیے فراہم کی گئی تھیں۔

★★

پشاور سے ترحلا کی جانب یہ میرا پہلا سفر تھا۔ میں نے اپنے قافلے کو چار چار آدمیوں کی ٹولی میں تقسیم کر دیا اور انھیں مقامی لوگوں کا لباس پہنا کر فرنگی حکومت کا ہر نشان گاڑیوں سے مٹا دیا۔ سب سے آگے چار سنی گورکھا جوان تھے جو اس بات کا دعویٰ کرتے تھے کہ چٹان کو سونگھ کر وہ یہ بتا سکتے ہیں کہ اس کے دوسری جانب کیا ہوگا۔

وہ ہم سے دو فرلانگ آگے چل رہے تھے۔

فرنگی سپاہیوں کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ ایک فرلانگ کا فاصلہ دے کر گورکھا نوجوان کے پیچھے چلیں اور بارہ قبائلی جوانوں میں سے چھ ایک سمت سے آگے بڑھ رہے تھے جب کہ چھ دوسری سمت سے گاڑی پر نظریں رکھے ہوئے تھے۔ دو سکھ نوجوانوں کو گاڑی پر بطور کوچوان بٹھا دیا گیا۔ اُن کے پاس دستی بم اور رائفلیں تھیں اور بقیہ دو سکھ سپاہی خطرناک ہتھیاروں سے لیس، گاڑی کے پیچھے چلے آ رہے تھے۔

میں اور سارجنٹ فلپ گاڑی سے چند قدم آگے چل رہے تھے۔

ہمارے راستے میں عام قبائلی بستیاں آئیں مگر میں نے حکمت عملی سے کام لیتے ہوئے قافلے کو بستیوں سے دور رکھا۔ اس طرح شام تک ہم نے تقریباً تیس میل کا سفر طے کر لیا۔

شام کے سائے زمین پر پھیل رہے تھے۔ مگر میں ابھی تک قافلے کے پڑاؤ کے لیے کوئی موزوں جگہ تلاش نہیں کر سکا تھا۔ یہاں سے اب ہمیں ممبنڈی کی جانب سفر کرنا تھا۔

اچانک مجھے چند گز کے فاصلے پر ڈھلان میں ایک چشمہ نظر آیا۔ میں گھوڑا آگے بڑھا کر چشمے کے قریب آگیا۔ چشمے کے کنارے ایک چٹان دور تک کسی چھتری کی مانند جھکی چلی گئی تھی اور اس چٹان کے نیچے اتنی جگہ تھی کہ سب لوگ بحفاظت اس کے سائے میں رات گزار سکتے تھے۔

میں نے اس موزوں جگہ کو دیکھ کر سارجنٹ فلپ کی طرف دیکھا جو مجھ سے چند گز کے فاصلے پر کھڑا اُس پہاڑ کو گھور رہا تھا جس کی چوٹیاں آسمان کو چھو رہی تھیں۔

"سارجنٹ! دیال سنگھ سے کہو کہ وہ گاڑی آگے بڑھا کر اس چٹان کے نیچے لے آئے۔ میں نے رات اس چشمے کے کنارے گزارنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

میں گھوڑے کی پیٹھ سے اُتر آیا اور اُسے چشمے کی جانب ہنکا دیا۔

گاڑی کو ایک محفوظ جگہ کھڑی کر کے میں نے اطمینان کی سانس لی۔ میں نے باری باری چار چار جوانوں کا انتخاب کر کے ان کے ذمے یہ کام لگا دیا کہ وہ دو دو گھنٹے نگرانی کرنے کے بعد دوسری ٹولی کو جگا دیں۔

سارجنٹ کے فرنگی سپاہی کھانے سے فارغ ہو کر شراب پینے میں مشغول ہو گئے۔ تو میں گھومتا ہوا اور جائزہ لیتا اس چھولداری پر آیا جس میں قبائلی جوان تھے... لیکن وہ کوئی نشہ آور شے استعمال کرنے کی بجائے لیٹے ہوئے دن بھر کی تھکن اتار رہے تھے۔

میں نے ہر طرف سے مطمئن ہو کر اپنی چھولداری کا رخ کیا جو گاڑی کے بالکل قریب نصب کی گئی تھی۔

میرے وجود میں گہری تھکن رچی ہوئی تھی اور پلکیں نیند کے بوجھ سے جھکی جا رہی تھیں۔

میں بانسوں کے درمیان بنائے ہوئے جھولے میں لیٹ گیا اور سونے کے ارادے سے اپنی آنکھیں موند لیں لیکن اُسی لمحے اپنے بابا کا چہرہ میرے سامنے آگیا اور میری نظروں کے سامنے جیل کا تاریک منظر گھوم گیا جہاں زنجیروں سے بندھا وہ شیر دل بڈھا آج بھی فرنگی حکومت کے لیے ایک ہوا بنا ہوا تھا۔

اس نے اپنی زندگی کے کئی سال صرف اس لیے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرتے گزار دیے کہ اس نے خزانے کا پتہ بتانے سے انکار کر دیا تھا۔

بابا کا سراپا آنکھوں کے سامنے لہراتے ہی میرے خیالات

میں طوفان آ گیا۔ دل و دماغ میں غم و اندوہ کی تیز آندھیاں چلنے لگیں۔ اپنے بوڑھے باپ کی جسمانی اذیتوں کا تصور کرتے ہوئے میرے سینے میں انتقام کی آگ بھڑکنے لگی! شدتِ احساس کے یہ چند لمحات میرے لیے بڑی کربناک صورت اختیار کر گئے۔۔۔

پھر خبر نہیں کب میرا ذہن غنودہ ہو گیا اور مجھے گہری نیند آ گئی۔

جب آنکھ کھلی تو دُودھیا اُجالا پہاڑوں کی برفیلی چوٹیوں سے نشیب میں تیزی سے اُتر رہا تھا۔

آنکھیں کھلتے ہی میں نے ماحول کا جائزہ لیا تو باہر کچھ رنگوں کی آوازیں میری سماعت سے ٹکرانے لگیں۔

قہوے کی خوشبو سے فضا مہک رہی تھی۔ میں انگڑائی لیتے ہوئے اُٹھا اور کپڑے اُتار کر چشمے میں کُود پڑا۔

چشمے کے یخ بستہ پانی نے وجود کی ساری کسلمندی دُور کر دی اور میں تازہ دم ہو کر اپنے خیمے میں آ گیا جہاں ایک گورکھا سپاہی میرا ناشتہ لیے موجود تھا۔

میں نے ناشتے کی ٹرے بے تکلفی سے اس کے ہاتھوں سے چھین لی اور کھانے بیٹھ گیا۔

آج کا سفر پہلے دن کی بہ نسبت زیادہ دُشوار تھا۔ بُلندی کی جانب گاڑی کھینچتے ہوئے چاروں گھوڑے پسینے میں شرابور ہو رہے تھے اور انھیں گاڑی کھینچنے میں بڑی محنت کرنا پڑ رہی تھی۔ وہ تو اچھا ہُوا کہ میں نے صرف ایک ہی گاڑی میں سب کچھ لدوا لیا تھا اور دوسری گاڑی وہیں چھوڑ دی تھی۔ بہرحال دوسرے دن کا سفر بغیر کسی حادثے کے اختتام تک پہنچ گیا۔

اب ہم اس قدر بُلندی سے گزر رہے تھے کہ جہاں تیز ہوائیں راستے کی زبردست رکاوٹ بن رہی تھیں۔ رات کو ایک پہاڑی کھوہ میں قیام کیا اور صبح ہوتے ہی ضروریات سے فارغ ہو کر دوبارہ اپنا سفر شروع کر دیا۔ دوپہر تک ہم ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں سے راستہ ڈھلان ہو جاتا تھا۔

تیسرے روز کا سفر بہت آسان ثابت ہوا اور ہم نے وہ خطرناک وادی پار کر لی۔ اب ہم چٹانوں کے درمیان سفر کر رہے تھے۔۔۔ کچھ فاصلے پر دو چٹانیں بُلندی کی جانب اس طرح استادہ تھیں جیسے مجھے دُور سے ہی خطرے کا نشان نظر آ رہی تھیں۔ میری طرح سارجنٹ فلپ بھی اپنے گھوڑے پر بیٹھا ہُوا انھی چٹانوں کو گھور رہا تھا۔

"سارجنٹ!" میں نے اُسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "ہم اس وقت جن پہاڑیوں کے درمیان سفر کر رہے ہیں، ان میں جگہ جگہ ایسی چٹانیں موجود ہیں جہاں دُشمن کی موجودگی کا شبہ کیا جا سکتا ہے۔"

سارجنٹ فلپ نے کچھ کہنے کے لیے مُنہ کھولا تھا کہ اچانک ایک گڑگڑاہٹ کی آواز سن کر ہم خاموش ہو گئے۔

"ہمیں یُوں محسوس ہو رہا ہے جیسے دُشمن ہمیں آگے بڑھنے کے لیے خود بخود راستہ دے رہا ہو۔ یہ چٹانیں مجھے دُشمن نظر آ رہی ہیں۔۔۔"

"نانگر!" اچانک سارجنٹ نے اُسے ٹوکتے ہوئے کہا۔ "شاید دُشمن ہم سے میلوں دُور ہے اور تم ابھی سے اتنے بدحواس ہو رہے ہو!"

اس نے کچھ کہنے کے لیے مُنہ کھولا ہی تھا کہ اچانک ایک ٹیلے پر مجھے رائفل کی چمکتی ہوئی نال نظر آ گئی۔۔۔ اور اس کا نشانہ ہم لوگ تھے۔ میں نے ایک ہاتھ بڑھا کر نانگر کو پھرتی سے گھوڑے سے گرا دیا اور جھکتے ہوئے سارجنٹ کا شانہ تھام کر اُسے گھوڑے سے کھینچ لیا۔

ایک ساتھ کئی شعلے ہماری جانب لپکے۔۔۔ مگر اب ہم ایک چٹان کی آڑ لے چکے تھے۔

سارجنٹ فلپ گھوڑے سے گرتے وقت زخمی ہو گیا اور وہ زخمی شیر کی طرح دھاڑتا ہُوا انگریزی میں گالیاں بکنے لگا تھا اگر اُسے فوراً گورکھا سپاہی میک آ کر سنبھال نہ لیتا تو وہ یقیناً دُشمن کی چلائی ہُوئی کسی گولی کا نشانہ بن جاتا۔

"اپنی اپنی جگہ مورچہ بندی کر لو اور جواباً اندھا دھند گولیاں برسانا شروع کر دو۔" میں نے چیخ کر کہا۔

الف لیلہ ڈائجسٹ کا مقبول سلسلہ
انسان اور شیطان
مصنف محمد فراز
امیر علی خان کی خوفناک آپ بیتی
مکتبہ القریش سرکلر روڈ اردو بازار لاہور
فون 7668958

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پہاڑوں سے گھری ہُوئی پُرسکون وادی میں آگ اور خون کا خوفناک کھیل شروع ہو گیا تقریباً پندرہ منٹ دونوں طرف سے بڑے زور و شور سے گولیوں کا تبادلہ ہوتا رہا۔ ابھی تک مجھے اپنے کسی آدمی کے معمولی سے زخمی ہونے کی بھی اطلاع نہیں ملی تھی یہ ایک اچھی علامت تھی۔

دفعتاً آگ اگلتی ہوئی سربفلک چوٹیاں خاموش اور سنسان ہو گئیں۔

میرے ساتھیوں نے عقل مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فائرنگ بند کر دی۔ انھوں نے محسوس کر لیا تھا کہ دُشمن ان چٹانوں سے کہیں اور منتقل ہو گیا ہے۔

مجھے احساس تھا کہ دُشمن ہمیں جھانسہ دے کر آگے بڑھانے کے لیے نفسیاتی حربے استعمال کر رہا ہے۔۔۔ ابھی دُشمن نے اپنی اصل طاقت استعمال نہیں کی ہے مجھے ان لٹیروں کی ذہنیت اور ذہانت کا علم تھا۔ اس لیے میں نے قافلے کو ایک فرلانگ پیچھے ہٹ جانے کا حکم دیا اور ایک جھنڈ میں رات گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔

جس پہاڑ پر یہ گھنا جنگل واقع تھا، وہاں سے آس پاس کے تمام ماحول پر نظر رکھی جا سکتی تھی۔ مگر سوال تو یہ تھا کہ گاڑی اس بلند ٹیلے پر کیسے پہنچائی جائے۔

رات کے کسی بھی حصے میں دُشمن کی آمد متوقع تھی اور اس بُلند ٹیلے کے سوا آس پاس کوئی ایسی جگہ نہیں تھی، جہاں دُشمن کے اچانک حملے سے محفوظ رہا جا سکتا ہو۔

میں نے گاڑی سے راشن کا کچھ سامان اتروا کر اس کا وزن ہلکا کر دیا اور چار گھوڑوں کی بجائے آٹھ گھوڑے جوت دیے جو اسلحے سے بھری ہوئی اس وزنی گاڑی کو بُلندی کی جانب کھینچنے لگے۔

بمشکل آدھا راستہ بھی طے نہیں ہُوا تھا کہ ایک بھاری چٹان بُلندی سے لڑھکتی ہُوئی ہماری جانب آنے لگی۔

اتنا وقت نہیں تھا کہ ہم ایک دوسرے کو ہوشیار کر سکتے چٹان ایک بھاری گڑگڑاہٹ کے ساتھ اسلحے سے بھری ہُوئی گاڑی کے چند فٹ اُوپر سے اُچھلتی ہُوئی نشیب کی جانب لڑھک گئی۔

اس اچانک خطرے سے میرے اعصاب تن گئے تھے ہر لمحے مجھے یہ خدشہ تھا کہ اگر کوئی ایسی ہی چٹان اسلحے سے بھری ہُوئی گاڑی سے ٹکرا گئی تو بارود کے خوفناک دھماکوں سے ہمارے جسموں کے چیتھڑے تک اُڑ جائیں گے اور ہم میں سے کوئی بھی اس اچانک موت کی رُوداد سنانے کے لیے زندہ نہیں رہے گا۔

۔۔۔ مگر موت کا خطرہ ٹل گیا تھا۔

گھوڑے دوبارہ اپنی طاقت کا مظاہرہ کرتے ہُوئے گاڑی بلندی کی جانب گھسیٹنے لگے۔ گھوڑوں کی تیز تیز سانسیں دُور تک سُنائی دے رہی تھیں۔

اچانک ایک گھوڑے کا پاؤں چٹان پر پھسلا اور اس نے اپنی اگلی ٹانگیں چٹان پر ٹکا دیں اس کا یہ انداز بیٹھنے جیسا تھا۔ اس کے اس طرح ڈگمگانے سے پچھلے گھوڑے بھی بہکے۔ لہٰذا گاڑی کا توازن بھی برقرار نہ رہ سکا۔

"دیال سنگھ!" میں حلق کے بل چیخا۔ "گاڑی جہاں ہے وہیں روک دو۔ ورنہ اس کے اُلٹ جانے کا خطرہ ہے۔"

دیال سنگھ اور اس کے ساتھی نے فوراً گھوڑوں کی رسیاں کھینچ لیں۔ اگر ایک لمحے کی بھی دیر ہو جاتی تو گاڑی اُلٹ چکی تھی۔ زخمی گھوڑا اپنا توازن کھو چکا تھا لیکن باقی سات گھوڑوں کی طاقت نے اسے سنبھال لیا۔

میرے وہاں پہنچنے تک میک اور اس کے ساتھی اُسے کھڑا کر چکے تھے اور اس کی زخمی ٹانگ کا معائنہ کر رہے تھے۔

"دیال سنگھ! اس زخمی گھوڑے کو جلدی سے الگ کر دو۔" میں نے صورتِ حال کا جائزہ لیتے ہوئے کہا "اگر یہ گھوڑا درمیان میں اسی طرح جُتا رہا تو پھر اس گاڑی کا خدا ہی حافظ ہو گا۔"

دیال سنگھ اور میک کے ساتھیوں نے گھوڑے کا ساز کھول کر اُسے درمیان سے گھسیٹ کر نکال لیا اور اس کی جگہ دُوسرا گھوڑا جوت دیا۔

گھوڑے ایک بار پھر آہستہ آہستہ آگے کی جانب رینگنے لگے۔ خدا خدا کر کے اسلحے سے بھری ہوئی گاڑی درختوں کے جھنڈ تک پہنچ گئی۔ اُسے چھپا کر کھڑا کر دیا تو سب نے اطمینان کی سانس لی۔

آج کے دن کا سب سے مشکل مرحلہ یہی تھا کہ اسلحے سے لدی ہوئی گاڑی کو دُشمنوں کی نظروں سے حتی الامکان محفوظ رکھا جائے۔ ویسے اس دوران مجھے اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ دُشمن ہماری نقل و حرکت سے پُوری طرح باخبر ہے اور اجتماعی حملہ کرنے کے لیے کوئی مناسب موقع اور مقام کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کر چکا ہے۔

سپاہی کھانے کی تیاری اور خیمے گاڑنے میں مصروف ہو گئے مگر میں چوکنا ہو کر ان ٹیلوں کو گھورتا رہا، جن کے عقب سے موت کی آگ ہمارا نشانہ لے کر برسائی گئی تھی۔

اب وہ چٹانیں موت کی المناک خاموشی کا راگ الاپ رہی تھیں۔

کھانا تقسیم ہونے کے بعد میں نے بلند آواز میں اعلان کیا کہ آج کی رات دشمن کے حملے کی توقع ہے۔ اس لیے دس آدمی پہرہ دیں گے اور باقی آرام کریں گے۔ اسی طرح ہر تین گھنٹے کے بعد دوسرے تازہ دم جوان ان کی جگہ لے لیں گے۔

میری ان باتوں کا خاطر خواہ اثر ہوا اور مجھے اپنا ہر ساتھی جوش و خروش کا مظاہرہ کرتا ہوا محسوس ہوا... دشمن ہم پر حملہ کر کے اپنی موجودگی کا یقین دلا چکا تھا۔

میں درختوں کی آڑ میں مورچہ بندی کرنے کے... بعد تھوڑی دیر کے لیے کمر سیدھی کرنے کے ارادے سے سفری بستر پر دراز ہو گیا، اپنی گن میں نے بستر کے ساتھ ہی ٹکا کر رکھ دی... اور اپنے دشمنوں کے بارے میں سوچنے لگا۔

اس وقت ہم سنگدل لٹیروں کی ایک بستی کے قریب تھے اور کسی ناگہانی صورت حال کا خدشہ، لاشعور پر بار بار کچوکے لگا رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے یہ ٹیلا ہماری زندگی کی ایک یادگار حیثیت اختیار کرنے والا ہے اور میری زندگی ایک انقلاب آفریں لمحات کی زد میں ہے۔ دل و دماغ دیر تک الجھے الجھے خیالات کی آماجگاہ بنے ہوئے تھے۔ میرے دل میں یہ شبہ تقویت پکڑتا جا رہا تھا کہ آج کی رات کوئی خونی معرکہ ضرور پیش آنے والا ہے۔ راشن کا سارا سامان دوسرے ساتھی گھوڑوں کی مدد سے دوبارہ گاڑی پر لاد چکے تھے اور اب گاڑی ایک بار پھر پہلے جیسی وزنی ہو گئی تھی۔

سرد برفیلی ہوا بدن کے روئیں روئیں میں گھس رہی تھی پھر اچانک میں ہوا میں تیزی کی گونج محسوس کرتے ہی لپک کر اٹھا اور اپنے خیمے سے باہر آ گیا۔

فضا میں طوفان کے آثار دیکھ کر میں نے بلند آواز میں اپنے ساتھیوں کو خبردار کیا اور ایک رسہ نکال کر گاڑی کے پہیوں سے لپیٹ دیا۔ اس رسے کو ایک درخت سے باندھ دیا۔ اس رسے نے گاڑی کے پہیوں کو مضبوطی کے ساتھ جکڑ لیا تھا ہم نے گاڑی کے پہیوں میں دونوں طرف کافی بڑے پتھر رکھ دیے اس طرح سے گاڑی کے ہلنے جلنے یا پہیوں کی نقل و حرکت کا امکان ختم ہو گیا تھا تاہم یہ احتیاط اضافی، لیکن ضروری تھی۔

ہوا کے تیز جھکڑ، طوفان کی صورت اختیار کر چکے تھے اور آسمان اچانک سیاہ بادلوں سے ڈھک گیا تھا۔ طوفان نے شدت اختیار کی تو گھوڑے بدکنے لگے اور ہنہناتے ہوئے اپنی ٹانگیں چلانے لگے۔

میں نے گھوڑے باندھنے میں دیال سنگھ کی مدد کی اور پھر اسے خیمے میں جا کر آرام کرنے کا مشورہ دیا۔ وہ متشکر نگاہوں سے مجھے دیکھتا ہوا اپنی چھولداری میں چلا گیا ہر طرف گہری تاریکی چھا گئی اور موت کی گونجیلی آوازیں طوفان کی شدت کے ساتھ ساتھ بلند ہونے لگیں۔

دفعتاً بادل بڑے زور سے گرجے اور ہوا میں بارش کی تیز بوچھار شامل ہو گئی جوں جوں بارش اور طوفان کا زور بڑھتا جا رہا تھا گھوڑوں کی بے چینی بھی بڑھتی جا رہی تھی۔

میرے دل میں یہ اندیشہ جڑ پکڑتا جا رہا تھا کہ گھوڑوں نے ٹانگیں چلا چلا کر ایک دوسرے کو زخمی کر دیا تو آگے کا سفر بے حد دشوار ہو جائے گا۔

دو گھنٹے تک موسلا دھار بارش کے ساتھ طوفان کی گرجدار آوازیں گونجنے کے بعد ماحول قدرے پُرسکون ہونے لگا۔ طوفان کا زور ٹوٹ رہا تھا کہ اچانک فضا میں متعدد انسانی چیخوں کی آوازیں سنائی دیں۔

میں اپنے خیمے کا پردہ ہٹا کر اپنے ساتھیوں کے خیموں کی جانب دیکھنے لگا۔

ایک خیمہ گر گیا تھا اور یہ انسانی چیخیں اس گرے ہوئے خیمے سے برآمد ہو رہی تھیں۔ اس صورت حال کو دیکھ کر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی اور میں ان کی بوکھلاہٹ سے لطف اندوز ہونے لگا۔

میں نے دیکھا کہ کچھ سپاہیوں نے بارش اور طوفان کا مقابلہ کرتے ہوئے اس منہدم خیمے کو سمیٹ کر اس کے نیچے سے بکھرے جوانوں کو باہر نکالا جو کیچڑ میں لت پت ہو کر اس منظر میں ایک نئے رنگ کا اضافہ کر رہے تھے۔ خیمے کی رسیاں دوبارہ مضبوطی سے باندھی گئیں مگر اس دوران میں بہت سا سامان بھیگ کر ناکارہ ہو چکا تھا۔

فضا میں ہلکا سا دھندلا سا اجالا پھیلنے لگا مگر آسمان کی چھت سے ابھی تک پانی ٹپک رہا تھا۔ موسم کی اس اچانک تبدیلی کا اثر کیمپ کے سامنے سپاہیوں نے شدت سے محسوس کیا تھا۔

مجھے سب سے زیادہ اس بات کی فکر تھی کہ اس طوفانی بارش نے اسلحے اور راشن کو نقصان نہ پہنچایا ہو... حالانکہ گاڑی پر متعدد ترپالیں ڈال کر اچھی طرح ڈھک دیا گیا تھا۔ مگر سرکش موسموں کے سامنے انسانی تدبیریں اکثر شکست کھانے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔

بوندا باندی جاری تھی مگر اب ماحول کی تاریکیاں آہستہ آہستہ ختم ہو کر اجالے کے سامنے اپنی شکست کا اعلان کر رہی تھیں اس بارش کے دوران پہاڑی سفر جاری رکھنا خود کو موت کے حوالے کرنے کے مترادف تھا۔

اسی لمحے کسی نے میرے خیمے کا پردہ اٹھا کر اندر جھانکا۔ میں چونک کر آنے والے کی طرف دیکھنے لگا۔

سارجنٹ اپنا ایک زخمی بازو لٹکائے خیمے کے اندرونی حصے کا جائزہ لیتے ہوئے میری جانب دیکھ کر ہلکے سے مسکراتا ہوا اندر آ گیا۔ اس کے ساتھ ہی میک بھی اندر آ گیا۔ میں نے اپنے پاؤں سمیٹے اور پوچھا۔ "کہو سارجنٹ رات کیسی گزری؟"

"یہ میری زندگی کی سب سے خوفناک رات تھی!" سارجنٹ فلپ نے میرے قریب بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔ "میں نے تمہاری صلاحیتوں کا اندازہ لگانے میں جلد بازی سے کام لیا تھا۔ مجھے یہ شک تھا۔ کہ شاید تم اس مہم کو کامیابی کی منزل تک نہیں پہنچا سکو گے... مگر تمہاری مضبوط قوت ارادی اور معاملہ فہمی نے میرے ان شکوک کو باطل کر دیا۔ اب میں یہ بات بڑے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ تمہاری رفاقت میں، میں موت کے عفریت کو بھی شکست دینے کا حوصلہ رکھتا ہوں۔ تم بلاشبہ اعلا دماغ کے مالک اور تجربہ کار ہو"

"سارجنٹ!" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "ضرورت سے زیادہ تعریف انسان کی صلاحیتوں کو زنگ آلود کر دیتی ہے۔ تمہیں پُراعتماد اور مطمئن پا کر مجھے خوشی ہوئی، مستقبل کے لیے ایک اچھی علامت ثابت ہو سکتی ہے۔ موسم کی خرابی کی وجہ سے ہم یہاں اس وقت تک قیام کریں گے جب تک اس بات کا یقین نہ ہو جائے کہ بلندی کی جانب اپنا سفر جاری رکھتے ہوئے کم از کم طوفان ہمارے راستے کی دیوار نہیں بنے گا۔ اس قدرتی دشمن سے مقابلہ کرتے ہوئے ہمارے اعصاب جواب دے جائیں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ درختوں کی شاخوں اور ترپال سے کچھ جھونپڑیاں بنائی جائیں جو اس موسم میں ہمارے لیے مورچے کا کام بھی دے سکیں۔ مجھے موسم کے آثار کچھ اچھے نظر نہیں آ رہے ہیں۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ کچھ لوگ ناشتہ تیار کریں اور دوسرے لوگ درختوں کے درمیان مورچے تعمیر کریں۔ دشمن اس موسم سے فائدہ اٹھانے کی کوشش ضرور کرے گا۔"

"تمھاری یہ تجویز نہایت عمدہ ہے ہم درختوں کے درمیان رسّے باندھ کر مورچہ بندی کر لیں گے۔" سارجنٹ فلپ نے خوشگوار انداز میں جواب دیا اور فرنگی سپاہی میک کے ساتھ خیمے سے نکل گیا۔

دو گھنٹے کی مسلسل محنت سے میں نے پچاس گز جگہ کو گھیرے میں لے کر اسے درختوں کی شاخوں سے اس طرح ڈھانپ دیا۔ جیسے ہمیشہ کے لیے یہیں رہنے کا ارادہ ہو... تین موٹے تنے کاٹ کر انھیں درختوں کے درمیان رسّوں سے باندھ کر مورچے بنا دیے گئے۔ اب ہم لوگ دشمن کے حملے کا مؤثر جواب دینے کے لیے بھی تیار ہو چکے تھے۔

پڑاؤ میں، چار فٹ گہرا گڑھا کھود کر اس میں آگ روشن کر دی تاکہ موسم کی ٹھنڈک جسموں پر اثر انداز نہ ہو سکے۔ یہ سارے انتظامات تین گھنٹے میں مکمل ہو گئے۔ چند گھوڑے زخمی تھے۔ دیال سنگھ اور اس کے ساتھیوں نے ان کی مناسب دیکھ بھال کی تھی اس لیے میں مطمئن ہو کر دوبارہ اپنے خیمے میں آ گیا جہاں سارجنٹ فلپ، میک کے ساتھ بیٹھا، میرا انتظار کر رہا تھا۔

میں نے اس کے برابر بیٹھتے ہوئے قہوے کی پیالی اٹھائی اور اسے جرعہ جرعہ اپنے حلق میں انڈیلنے لگا۔

"باہر موسم کیسا ہے؟ تم تو پہاڑوں کے موسمی مزاج سے گہری واقفیت رکھتے ہو؟" فلپ نے پوچھا۔

"میرا خیال ہے ابھی دو گھنٹے تک ایسا ہی موسم رہے گا۔" میں نے متجسس نظروں سے اسے ٹٹولتے ہوئے کہا۔ "کوئی خاص بات؟"

"میرے ساتھی وادی میں اتر کر شکار کھیلنا چاہتے ہیں تاکہ تازہ گوشت مل سکے۔" اس نے انکشاف کیا۔ "اور مجھے ان کے ارادے سے مکمل اتفاق ہے۔ اسی بہانے وہ وادی میں دشمن کی خفیہ کمین گاہوں کا بھی پتہ لگا لیں گے۔"

"شکار کھیلنے کے لیے وادی میں اترنا ضروری نہیں۔" میں نے رائے زنی کرتے ہوئے کہا۔ "اس ٹیلے کے عقب میں گھنا جنگل موجود ہے، جہاں وہ اپنا شوق بلاخوف و خطر پورا کر سکتے ہیں۔ ہم اپنے دشمن کی تلاش میں نہیں جائیں گے۔ اس کے برعکس ہمارا دشمن ہمیں یہاں تک تلاش کرتا ہوا ضرور آئے گا کیونکہ رات بھر ہم جس ہولناک طوفان کا سامنا کرتے رہے ہیں، اس نے ہمارے دشمن کو یقین دلا دیا ہو گا کہ ہم اس طوفان کے سامنے بکھر کر تباہ ہو چکے ہوں گے۔ مجھے یقین ہے کہ کہنے والے

لمحات بہت خون ریز ہوں گے۔ دُشمن ہمیں بے یار و مددگار اور شکست خوردہ سمجھ کر آئے گا تو ہمیں مستعد اور تیار پا کر اسے اپنے بہت سے ساتھیوں کی بھینٹ دینا پڑے گی۔ یہ نفسیاتی داؤ ضرور کارگر ہو گا۔" میرے لہجے میں گہرا اعتماد تھا اسلیے سارجنٹ فلپ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے فیصلہ سُنا دیا کہ وہ علی الصبح جنگل میں شکار کے لیے جائے گا۔

میں مُسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ فرنگی اتنے خطرات میں گھرے کے باوجود اپنے شوق ضرور پُورے کرتے ہیں۔ غالباً اسی وجہ سے بہادروں کے بیٹے انھیں شکست دینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ فرنگی سپاہی شکار پر چلے گئے تو جانے سارجنٹ انکے ساتھ کیوں نہیں گیا۔

سکھ جوان تاش سے دل بہلا رہے تھے۔ اور قبائلی جوانوں کی ٹولی کوئی پشتو لوک گیت گانے میں مصروف تھی۔ البتہ گورکھے مورچوں پر مستعد بیٹھے عقابی نظروں سے نگرانی کے فرائض انجام دے رہے تھے۔

فرنگی سپاہیوں کو گئے ہوئے دو گھنٹے سے زیادہ وقت گزر چکا تھا اور آہستہ آہستہ موسم میں تبدیلی کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔

اچانک بادل زور سے گرجے اور کڑکتی بجلیوں کی خوفناک آوازیں فضا میں گونجنے لگیں۔ اس کے ساتھ ہی آسمان سیاہ بادلوں سے ڈھک گیا اور دوبارہ طوفانی بارش شروع ہو گئی۔ طوفان کی آمد نے سارے کیمپ پر سوگواری طاری کر دی اور میرے خیمے میں بیٹھے ہوئے سارجنٹ فلپ کا چہرہ رنگ بدلنے لگا۔ "میک اور کارٹر کو اپنے ساتھیوں سمیت اب تک آ جانا چاہیے تھا۔"

"مجھے ڈر ہے کہیں وہ راستہ نہ بھٹک گئے ہوں۔" میں نے سارجنٹ فلپ کو مخاطب کرتے ہوئے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔

"میرا دل کہتا ہے کہ میک اور اس کے ساتھی کسی ناگہانی کا شکار ہو چکے ہیں۔ ورنہ موسم کو تبدیل ہوتے دیکھ کر وہ اب تک واپس آ گئے ہوتے۔" اس نے میرے خدشات کی تائید کرتے ہوئے جواب دیا۔

میں ایک دم تن کر کھڑا ہو گیا اور برساتی پہن کر اپنی رائفل سنبھالتا ہوا ان کی تلاش میں جانے کا ارادہ کرنے لگا۔ فلپ نے میرے ساتھ چلنے پر اصرار کیا جسے میں نے مسترد کرتے ہوئے کہا۔ "تم زخمی ہو اور کیمپ میں تمھاری موجودگی لازمی ہے۔ میں ناگر کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ زیادہ آدمیوں کو خطرے میں ڈالنا مناسب نہیں ہے۔"

میں نے خیمے کا پردہ اُٹھا کر آواز دی تو ناگر میری آواز سنتے ہی کسی چیتے کی طرح جست لگا کر میرے قریب آ گیا۔

"آؤ، ہم میک اور والٹر کے ساتھیوں کو تلاش کرنے چل رہے ہیں۔ تمھیں کچھ اندازہ ہے وہ جنگل میں کس سمت گئے ہوں گے؟"

"میں نے انھیں دائیں جانب کی ڈھلان پر اترتے دیکھا تھا۔" اس نے جواب دیا۔

"ہم انھیں تلاش کرنے کا آغاز اسی ڈھلان سے کریں گے۔" ناگر خاموشی سے میرے آگے آگے تاریکی میں چلنے لگا۔ آگے بڑھتے ہوئے جلد ہی ہم اس ڈھلان تک پہنچ گئے۔ ہوا کے تیز جھکڑ بار بار راستے کی دیوار بن رہے تھے۔ جونہی ہم ڈھلان سے اترے اندھیرے میں کچھ سائے اپنی جانب حرکت کرتے دیکھ کر میرے قدم وہیں جم گئے۔ میں نے للکارتے ہوئے کہا۔ "کون ہے؟"

"شہباز! فرنگی سپاہی میک کی آواز سنائی دی۔ "ہمارا ایک ساتھی زخمی ہو گیا ہے اس لیے ہمیں دیر ہو گئی۔ ذرا اُسے سنبھالنے میں ہماری مدد کرو کیونکہ ہمیں دُہرا بوجھ اُٹھانا پڑ رہا ہے۔"

میں اور ناگر فوراً میک اور اس کے ساتھیوں کے قریب پہنچ گئے۔

والٹر کی ٹانگ ٹوٹ چکی تھی اور اُسے میک نے اپنی پیٹھ پر لاد رکھا تھا۔ اس کے دونوں ساتھی ایک ایک ہرن اٹھائے ہوئے تھے میں نے والٹر کو اپنی پیٹھ پر منتقل کر لیا اور واپس چل دیا۔

★★

ہماری واپسی پر سارے کیمپ میں جوش و خروش کی لہر دوڑ گئی۔ والٹر کو طبی امداد دی گئی اور شکار کیے ہوئے ہرن بھونے جانے لگے۔ ہرن کا لذیذ گوشت سب نے بڑی رغبت سے کھایا اور دیر تک والٹر کی تیمارداری میں لگے رہے۔ اس برفانی موسم میں الاؤ کی آگ اور تیز کر دی گئی جس کی تیز حرارت نے جوانوں کے حوصلے بلند کر دیے اور یہی اس خطرناک مہم میں میری سب سے بڑی کامیابی تھی کہ میں نے اس طوفانی موسم کے سامنے اپنے ساتھیوں کے عزم و حوصلے بلند رکھنے کے لیے بھرپور صلاحیتوں سے کام لیا تھا۔

سرِ شام اچانک طوفان تھم گیا اور چبھنے والی ہوا کی شدت میں کمی آ گئی۔ میں نے خیمے سے نکل کر پڑاؤ کا جائزہ لیا۔ مورچوں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پر قبائلی جوان مستعد چوکنا تھے اور نگرانی کے فرائض بڑی خوش اسلوبی سے انجام دے رہے تھے۔ گورکھے مورچوں کے بیٹھے ہوئے اپنی زبان میں خوش گپیوں میں مشغول تھے۔ البتہ میک کے خیمے میں گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

سکھ جوان گھوڑوں کی نگرانی کرتے ہوئے پنجابی کے لوک گیت گا رہے تھے۔ فضا میں طوفان کے خاتمے کے آثار دیکھ کر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ اُبھر آئی۔

الاؤ کے گرد لکڑیوں کا ذخیرہ کر لیا گیا تھا۔ میں چند لمحے الاؤ کے قریب کھڑا وادی کے نشیب میں جھانکتا رہا۔ رات کا کھانا ختم ہوتے ہی پڑاؤ میں پُراسرار خاموشی چھا گئی۔ فضا کو اس قدر خاموش اور سنسان محسوس کر کے میرے ذہن میں اندیشوں کے ہزاروں زہریلے سانپ رینگنے لگے۔ مجھے خاموشی کا یہ وقفہ کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ محسوس ہو رہا تھا اور میری نظریں بار بار اندھیری وادی کی طرف اُٹھ رہی تھیں۔

انتظامات سے مطمئن ہو کر جب میں اپنے خیمے میں واپس آیا تو سارجنٹ فلپ سگریٹ کے دھوئیں سے کھیل رہا تھا۔ "کیا خیال ہے شہباز! ہم کب تک آگے سفر کرنے کے قابل ہو سکیں گے؟" اس نے پوچھا۔

"جب تک یہ طوفان جاری ہے، اس محفوظ مقام کو چھوڑ کر آگے بڑھنا خطرے سے خالی نہیں۔" میں نے پُرخیال انداز میں جواب دیا اور خیمے کے باہر پھیلی ہوئی تاریکی کو گھورنے لگا۔ "میرا خیال ہے کہ ہماری آج کی رات بھی بہت مصروف گزرے گی! کیونکہ اب دشمن کی آمد یقینی ہے۔ اپنے آدمیوں کو چوکنا کر دو۔ میں خطرے کی بُو سونگھ رہا ہوں۔"

سارجنٹ فلپ اُٹھا اور اپنے ساتھیوں کو ہوشیار کرنے چلا گیا۔

رات اپنا آدھا سفر طے کر چکی تھی کہ اچانک گھوڑوں کی ہنہناہٹ سُن کر میری آنکھ کھل گئی۔ گھوڑوں کی ہنہناہٹ سے چھپے ہوئے خطرے کی آمد کا اظہار ہو رہا تھا... پھر اچانک ایک دھماکا سُنائی دیا اور کیمپ کی جانب آگ کی بارش ہوتی نظر آئی۔ میں اپنی رائفل سنبھالتا ہوا اُٹھا اور ایک مورچے پر پہنچ گیا جہاں قبائلی جوان دشمن کی بے پناہ فائرنگ کا جواب دیتے ہوئے گولیاں چلا رہے تھے۔

میرے خدشات ایک خوفناک حقیقت بن کر ظاہر ہوئے۔ میری انگلیاں مسلسل لبلبی پر دباؤ ڈال کر دشمن کی یلغار روکنے میں مصروف ہو گئیں۔

ایک گھنٹے تک مسلسل فضا میں بارود کی دھماکوں کی آوازیں گونجتی رہیں... پھر اچانک نیچے وادی میں خاموشی چھا گئی۔ انسانی چیخوں اور کراہوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ دشمن کو خاصا نقصان اُٹھا کر پسپا ہونا پڑا ہے۔ بلندی پر ہونے کے باوجود وہ ہمیں کوئی جانی نقصان پہنچانے میں ناکام رہے تھے۔

دشمن کے پیچھے ہٹتے ہی میرے ساتھیوں نے فائرنگ بند کر دی اور مورچوں سے نکل کر دہکتے ہوئے الاؤ کے قریب میرے گرد گھیرا ڈال کر کھڑے ہو گئے۔

"تمھاری خطرہ محسوس کی حس بہت تیز ہے۔" دیال سنگھ نے میری تعریف میں اپنی زبان کھولتے ہوئے کہا۔ "اگر تم ہمیں قبل از وقت خبردار نہ کر دیتے تو شاید ہمیں بہت سا جانی نقصان اُٹھانا پڑتا۔ دشمن نے بھاری حملہ کیا تھا۔ اگر ہم پہلے سے ہوشیار نہ ہوتے تو دشمن ہمارا صفایا کرنے میں کامیاب ہو جاتا۔"

"ہمارے انتظامات اتنے مکمل تھے کہ کوئی لشکر بھی ہم پر حملہ آور ہوتا تو اپنا مقصد حاصل کرنے میں ناکام رہ جاتا۔ گورو کی قسم!" سکھ نے زورِ بیان صرف کرتے ہوئے قسم کھائی۔ "تم اپنے وقت کے بہت پُراسرار آدمی ہو اور اپنے وجود میں کچھ خفیہ طاقتیں رکھتے ہو۔ تمھاری رُوح کی پرواز بہت بلند ہے اور تمھیں آنے والے خطرے سے پہلے ہی آگاہ کر دیتی ہے۔"

"گورو کی قسم! دیال سچ کہتا ہے۔ ہمارے سامنے کھڑا یہ جوان بڑی روحانی قوت کا مالک ہے۔" ارجن نے سر ہلاتے ہوئے دیال سنگھ کی تائید کی۔

"میرا تجربہ کہتا ہے کہ صبح ہونے تک دشمن ایک کوشش اور کرے گا!" میں نے بلند آواز میں خیال آرائی کرتے ہوئے کہا۔ "تمھیں اپنی تھکن اتارنے کے لیے تیز قہوے کی ضرورت ہے۔ اب آرام کرنے کا خیال دل سے نکال دو۔ جن کا دشمن زندہ ہو وہ آرام کی نیند حرام خیال کرتے ہیں۔ یہ ایک قبائلی کہاوت ہے۔ دشمن تاریکی سے فائدہ اُٹھا کر ہم پر اچانک حملہ آور ہو سکتا ہے۔ غالب امکان یہی ہے کہ وہ ایسا ضرور کرے گا۔ یہ ایک جنگی حکمتِ عملی ہے جس کا وہ فائدہ اُٹھانے کی بھرپور کوشش [illegible] مجھے یقین ہے کہ ہم اس بار بھی انھیں اپنے ناپاک ارادوں سے [illegible] کی مہلت نہیں دیں گے۔ قہوہ پینے کے بعد [illegible] دشمن پر یہ ثابت کر دو کہ اُن کی بھاری تعداد ہمارے آہنی عزائم کے راستے کی دیوار نہیں بن سکتی۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دو سپاہی قہوہ تیار کرنے اور باقی اپنے اپنے ہتھیاروں کا جائزہ لینے لگے۔

قہوہ پینے کے بعد تمام لوگ پھیل کر اپنے اپنے فرائض انجام دینے لگے۔ اس دوران میں سارجنٹ فلپ بہت خاموش نظر آرہا تھا۔

"سارجنٹ!" میں نے اُسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "تم بہت دیر سے خاموش ہو۔ کیا کوئی خاص بات ہے جو تمہیں پریشان کر رہی ہے؟"

"میں تمہارے ہی بارے میں سوچ رہا تھا۔" اس نے مصنوعی انداز میں مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "اب مجھے یاد آرہا ہے کہ تمہاری شخصیت میری آنکھوں کو کیوں مانوس لگ رہی تھی۔"

سارجنٹ کے پُراسرار لہجے نے میرے دماغ میں خطرے کی سُرخ بتی روشن کر دی۔ میں بھونچکا ہو کر اس کی طرف حیرت سے دیکھنے لگا۔

"تم کیا جاننے کی کوشش کر رہے ہو سارجنٹ؟ جو کچھ تمہارے دل میں ہے کھل کر کہہ دو۔ اگر کوئی بات میرے مزاج کے خلاف بھی ہوئی تو میں اس کا بُرا نہیں مانوں گا۔"

"تمہاری ذات ہر شبے سے بالاتر ہے۔" اس نے سنجیدگی سے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "دراصل تمہاری دلیری اور شجاعت دیکھ کر میری آنکھوں کے سامنے اسی کی ایک شخصیت کا عکس اُبھر آیا تھا۔ تمہارا شالیار خان سے کیا رشتہ ہے؟" اس نے پینترا بدل کر اچانک ایک نازک سوال کر دیا۔

"رشتہ کیا ہو سکتا ہے؟" میں نے سرسری سے لہجے میں کہا۔ "یہ نام میں بھی سُن چکا ہوں۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ یہ شخص کون ہے اور اس وقت کہاں ہے؟" میں نے پُرتجسس انداز میں استفسار کیا۔

"تمہارے باپ کا کیا نام ہے شہباز؟" اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"میرا تعلق گوری قبیلے سے ہے اور اس کے سردار نے میری پرورش کی ہے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم نے مجھے بتایا نہیں کہ شالیار خان کون ہے اور کہاں ہے؟"

"اس مہم سے واپسی پر میں تمہیں اس کے پاس لے چلوں گا... مگر اب تو وہ تشدد برداشت کرتے کرتے پاگل ہو چکا ہے۔ پھر بھی اس کی شخصیت دیکھنے والوں پر ہیبت طاری کر دیتی ہے۔ اس کا وجود یقیناً تمہیں متاثر کرے گا۔" اس نے کھوئے ہوئے انداز میں جواب دیا اور اپنی جیب ٹٹول کر سگریٹ نکال کر سلگانے لگا۔

"اُسے کس جرم میں گرفتار کیا گیا ہے؟" میں نے سادگی سے سوال کیا۔

"اس پر سرکاری خزانہ لوٹنے کا الزام تھا۔ تشدد اُٹھاتے اُٹھاتے وہ پاگل ہو گیا ہے مگر کوئی بھی اس کی زبان سے خزانے کا راز نہیں اُگلوا سکا۔"

اپنے بوڑھے شیر دل باپ کے بارے میں سوچتے ہوئے میری ذہنی حالت دیوانگی کا شکار ہونے لگی اور ماضی کی خوفناک یادیں دل و دماغ پر اپنی گرفت مضبوط کرنے لگیں۔ گزرے ہوئے موسموں کی چیختی چنگھاڑتی آوازیں میری روح کے قالب میں گونجنے لگیں تو آنکھوں میں خون اُتر آیا اور میرا وجود انتقام کا دہکتا ہوا جہنم بن گیا۔

معلوم نہیں کتنا وقت مجھے اسی عالم میں بیٹھے ہوئے بیت گیا۔ اچانک گھوڑے کسی اجنبی کی آمد محسوس کرتے ہوئے بڑے زور سے ہنہنائے۔ اس کے ساتھ ہی آگ کے بارُودی شعلے پڑاؤ کی جانب لپکتے ہوئے نظر آئے۔

میرے ساتھی اپنے اپنے مورچوں میں چوکنے ہو کر بیٹھ گئے اور دشمن کے آگے بڑھنے کا انتظار کرنے لگے۔

میں نے گہری نظروں سے وادی کا جائزہ لیا اور چیختی ہوئی آواز میں کہا۔ "دشمن ہمارے ساتھ فریب سے کام لے رہا ہے۔ کچھ لوگ عقب میں چلے جائیں۔ زیادہ اندیشہ یہی ہے کہ دشمن اس مرتبہ اپنا رخ بدل کر عقب سے آگے بڑھے گا۔ نیچے فائرنگ کرنے والے صرف چند آدمی ہیں جو ہمیں مغالطے میں رکھنے کے لیے ایک جگہ جمے ہوئے ہیں۔"

میری باتوں کا خاطر خواہ اثر ہوا۔

شعلے کا سوامی
مصنف طارق اسمٰعیل ساگر
خوبصورت سرورق
دیدہ زیب پرکشش طباعت
قیمت =/150 روپے
مکتبہ القریش
سرکلر روڈ اردو بازار لاہور
فون 7668958

مورچوں میں مستعد نوجوان چوکنے ہو کر اپنے عقب میں گھوم گئے۔ ابھی تک ہماری طرف سے فائرنگ کا جواب نہیں دیا گیا تھا۔ فرنگی سپاہی بیک، قبائلی جوانوں کی رہبری کرتا ہوا عقبی حصے میں مورچہ بندی کر کے بیٹھ گیا... پھر اچانک وادی سے اُٹھنے والے دھماکوں کی آواز مدھم پڑ گئی۔

چند لمحوں کے بعد اچانک ہر طرف گہری خاموشی کا تسلط ہو گیا۔

خاموشی کا وقفہ طویل ہو رہا تھا کہ اچانک ایک قیامت خیز شور کے ساتھ ہمارے عقب میں بارُودی دھماکوں کی آوازیں گونج اُٹھیں اور عارضی سکون کا یہ وقفہ ختم ہو گیا۔ سب ایک دم پیچھے کی طرف پلٹ پڑے اور اندھیرے میں بڑھتے ہوئے دشمن کی یلغار کے سامنے سیسہ پلائی دیوار بن گئے۔

میں دوڑ کر بیک کے قریب پہنچ گیا اور رائفل سنبھال کر اندھا دھند گولیاں چلانے لگا۔

فضا میں صبح کے آثار نمودار ہو رہے تھے کہ دشمن اپنے ساتھیوں کی کئی لاشیں چھوڑ کر پسپائی اختیار کرنے پر مجبور ہو گیا۔ اس کامیابی نے میرے حوصلے بلند کر دیے۔ دشمن میری جنگی حکمت عملی کا مقابلہ نہیں کر سکا تھا۔ میں نے اُن کی کثرت کا زعم باطل کر کے اپنی برتری قائم رکھی تھی۔

جوں جوں اُجالا پھیلتا جا رہا تھا، دشمن کی تباہی کے آثار نمایاں ہو رہے تھے۔ کل کی بہ نسبت آج موسم خشک تھا اور سفر کرنے کے لیے موزوں تھا مگر ہم رات بھر دشمن سے برسرِ پیکار رہنے کی وجہ سے بے حد تھکے ہوئے تھے اور سفر کرنے کے قابل نہیں تھے۔ اس لیے ناشتے سے فارغ ہوتے ہی کچھ سپاہی اپنے اپنے خیموں میں آرام کرنے چلے گئے اور کچھ مورچوں پر نگرانی کے فرائض انجام دینے لگے۔

"یہ ایک طویل اور بھیانک رات تھی۔" اچانک سارجنٹ فلپ کی پاٹ دار آواز مجھے اپنے قریب سنائی دی۔

"مگر اس بھیانک رات کی تاریکی میں ہم نے دشمن کی طاقت منتشر کر دی ہے اور اب مجھے یقین ہے کہ دشمن ہم پر براہِ راست حملہ کرنے کی ہمت نہیں کرے گا۔" میں نے جواب دیا اور فلپ مسکرانے لگا۔ "اب تک ہمارے ساتھی دشمن کی تیرہ لاشیں دریافت کر چکے ہیں اور اس خون ریز معرکے میں ہمارے کسی ایک آدمی کو معمولی سی خراش تک نہیں آئی۔ تم یقیناً مافوق الفطرت قوتوں کے مالک ہو۔" اس نے مجھے ستائشی نظروں سے دیکھتے ہوئے تبصرہ کیا۔

میں جواباً خاموش رہا۔ دشمن فرنگی مجھے اپنا دوست سمجھ کر میری تعریف کر رہا تھا اور نہیں جانتا تھا کہ بالآخر ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔

"قدرت نے تمہیں بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ اس پر تم جتنا بھی فخر کرو کم ہوگا۔ تمہاری جگہ اگر کوئی اور ہوتا تو بیڑا و سپاہی اور بربادی کے کنارے تک پہنچ گیا ہوتا۔"

"سارجنٹ!" میں نے اس کی عیار آنکھوں میں جھانکتے ہوئے جواب دیا۔ "کسی دستے کا ایک فرد بھی مشکل حالات کے سامنے اوسان کھو بیٹھے تو سارا دستہ شکست و ریخت سے دوچار ہو جاتا ہے۔ تم نے اپنے ساتھی منتخب کرتے ہوئے بڑی دانائی سے کام لیا تھا۔ مجھے یقین ہے جب ہم اپنے کامیابی کے جھنڈے گاڑتے ہوئے جنرل ڈوگ کے سامنے جائیں گے تو جنرل اس دستے کے ہر فرد کو اعلیٰ اعزاز سے نوازے گا۔"

"اس وقت ہمارے لیے قدرت کا سب سے بڑا انعام تمہاری ذات ہے۔" سارجنٹ نے فخر اور دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا پھر فاتحانہ نظروں سے اپنے ساتھیوں کا جائزہ لینے لگا جو اب بڑے سکون سے اپنے ہتھیاروں کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔

آہستہ آہستہ سورج کی سُنہری کرنیں برفیلی چوٹیوں سے اُتر کر نشیب میں رینگ رہی تھیں۔ اُبھرتے ہوئے سورج کا منظر بہت دلکش اور پیارا تھا۔ سورج کی روشنی سے وادی کے قدرتی حُسن میں اضافہ ہو گیا تھا۔

میں دیر تک ان برفیلی چوٹیوں کی جانب نظریں جمائے، اُنہیں گھورتا رہا۔ ابھی ہمارے سفر کا سب سے کٹھن مرحلہ باقی تھا۔ "جب تک پیچیدہ گھاٹیاں عبور کر کے ہم اپنی منزل پر نہیں پہنچ جاتے، ایسے چھوٹے موٹے واقعات کا سلسلہ جاری رہ سکتا ہے؟" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

"میرا خیال ہے، یہ چمکتا ہوا یادگار دن آگے سفر کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوگا۔" جواباً اس نے خیال آرائی کی۔

"مگر میں آج سفر کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔" میں نے جواب دیا۔ "سارے جوان رات بھر کی ہنگامہ آرائی سے بے حد تھکے ہوئے ہیں۔ اگر اسی حالت میں ہم نے آگے بڑھنے کا ارادہ کیا تو بہت سی قیمتی جانوں سے ہاتھ دھونے پڑ جائیں گے اور کوئی معمولی سا حادثہ بھی ہماری اس فتح کو شکست میں بدل

سکتا ہے۔ آج دن بھر سارے جوان آرام کریں گے۔ اب دشمن کے دوبارہ حملہ کرنے کی اُمید کم ہے... ممکن ہے وہ آخری درّے کا مورچہ مضبوط کرنے میں لگا ہُوا ہو۔ یہی وہ آخری مقام ہے جہاں دُشمن کی زبردست مزاحمت کا سامنا کرنا پڑے گا؟

"تمھارے خیالات کی پرواز بہت اونچی ہے۔" سارجنٹ نے اپنی مکّار آنکھیں میرے چہرے پر گاڑتے ہُوئے جواب دیا۔ "تمھارا تجربہ اور مشاہدہ بہت وسیع ہے۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ تم نے اتنی کم عمری کے باوجود یہ پختہ تجربات کا خزانہ کیسے حاصل کر لیا۔ تمھارا فیصلہ بے حد مناسب ہے کہ جوانوں کو مکمل آرام کرنے کا موقع دیا جائے تاکہ کل اگر موسم سازگار ہو تو کامیابی کے ساتھ ہم اپنا سفر جاری رکھ سکیں۔"

"سارجنٹ!" میں نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا۔ "موت کا خطرہ ہر انسان کے لیے یکساں حیثیت رکھتا ہے۔ کچھ موت کے عفریت کے سامنے اپنے اوسان کھو بیٹھتے ہیں اور اپنے لیے ذلّت کی موت منتخب کر لیتے ہیں۔ مگر ان میں کچھ لوگ موت کے سامنے ڈٹ کر اپنی زندگی کی حفاظت کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور بہادر کہلائے جانے کے مستحق قرار دیے جاتے ہیں مگر موت کے ظالم ہاتھوں کی گرفت بالآخر ان کو بھی اپنے شکنجے میں جکڑنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ یوں سمجھ لو کہ زندگی کے بیت المال میں ابھی ہماری کچھ سانسیں باقی ہیں۔ اس لیے موت کا عفریت ابھی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا اور جب... وقت اور سانسوں کا خزانہ ختم ہو جائے گا تو ہم لوگ بھی کسی تاریک قبر کو اپنا مستقل مسکن بنانے پر مجبور ہو جائیں گے۔ ابھی ہمارے پاس کافی وقت ہے اور ہم دشمن سے اپنی برتری کا لوہا منوا سکتے ہیں۔"

سارجنٹ فلپ میرے فلسفیانہ افکار سے بہت متاثر نظر آ رہا تھا۔ چند لمحوں تک وہ حیرت زدہ نظروں سے مجھے دیکھتا رہا پھر بولا۔ "تمھارے خیالات میں بہت پختگی اور گہرائی کا احساس ہوتا ہے۔ شاید تمھیں بہت چھوٹی عمر میں زندگی کی تلخ حقیقتوں کا سامنا کرنا پڑا ہے ورنہ جس شخص نے ایک عام اور سادہ زندگی گزاری ہو، وہ ایسے ٹھوس خیالات کا مالک نہیں ہو سکتا۔"

"سارجنٹ!" میں نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ "زندگی کے بارے میں ہر شخص کا تجربہ دوسروں سے مختلف اور منفرد ہوتا ہے جو لوگ دن رات زندگی اور موت سے کھیلنے کے عادی ہوں۔ ان کا تجربہ بہت ٹھوس ہوتا ہے اور وہ زبردست قوتِ ارادی کے مالک ہوتے ہیں۔"

اچانک گورکھے ناگر نے اعلان کیا کہ ناشتہ تیار ہے۔

ہم باتیں کرتے ہُوئے خیمے میں آ گئے۔

دن بھر کیمپ میں عجیب سے جشن کا سماں رہا۔ تمام سپاہی مختلف ٹولیوں میں بیٹھے خوش گپیوں میں اپنا وقت گزارتے رہے۔ سورج کا سُرخ گولا برفیلے پہاڑوں کے عقب میں روپوش ہو گیا تو میں نے کچھ جوانوں کو مورچوں میں تعینات کیا اور خیمے میں آ کر قہوے کے گھونٹ لینے لگا۔

سارجنٹ فلپ مجھ سے بہت متاثر تھا اور اپنا زیادہ وقت میرے خیمے میں گزارنے لگا تھا۔ وہ سگریٹ کا دُھواں چھوڑتے ہُوئے پھر نمودار ہوا اور مُسکرا کر میرے قریب ہی بیٹھ گیا۔

"باہر برف باری شروع ہو چکی ہے۔ کیا خیال ہے موسم کی یہ خرابی ہمارے لیے تکلیف کا باعث تو نہیں بنے گی؟" اس کے لہجے میں تشویش تھی۔ میں نے خیمے کا پردہ اُٹھا کر دیکھا تو فضا میں ہلکی ہلکی برف باری جاری تھی۔ "میرا خیال ہے، یہ معمولی برفباری ہمارے مستحکم ارادوں کو متزلزل نہیں کر سکتی۔ رات کے وقت سردی بڑھ جانے کا امکان ہے۔ اس لیے الاؤ میں آگ تیز کر دی جائے تو اس قدرتی دشمن کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔"

"ہمارے ساتھی کافی تجربے کار ہیں۔" سارجنٹ نے فخر سے جواب دیا۔ "وہ موسم کی یہ ضرورت خود ہی محسوس کریں گے۔ ہمیں احکامات صادر کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی... مگر میں تمھارے والی کل کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔"

"اس کے لیے ابھی سے فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں..." میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

"کاش! میرے سارے خدشات غلط ہوں۔" اس نے پھیکے انداز میں مسکراتے ہُوئے جواب دیا اور خیمے سے نکل گیا۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تمام رات ہلکی ہلکی برف باری جاری رہی جس سے سردی شدت اختیار کر گئی۔

دُوسرے روز جب ناشتے سے فارغ ہُوئے تو بھی برف باری جاری تھی اور دیر تک موسم تبدیل ہونے کے کوئی آثار نہیں تھے۔ میں نے خیمے سے باہر آ کر چند لمحوں تک ٹیلے پر کھڑے ہو کر وادی کا جائزہ لیا جہاں سفید برف کی ایک موٹی سی تہ جمی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

پھر میں فیصلہ کُن انداز میں پیچھے ہٹا اور سارجنٹ فلپ جو مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر دُوربین سے آس پاس کا جائزہ لے رہا تھا، سے مخاطب ہو کے کہا: "سارجنٹ! یہ وقت ہمارے سفر کرنے کے لیے نہایت مناسب ہے۔ اپنے ساتھیوں کو تیاری کا حکم دو اور کچھ جوانوں کو گاڑی تیار کرنے کے لیے کہو۔" میں نے بڑے اعتماد سے مشورہ دیا۔

"دیال سنگھ گاڑی تیار کرو!" فلپ وہیں سے چلایا "اور باقی تمام سپاہی اس کے اس کام میں مدد کریں۔"

گاڑی کو ٹیلے سے ڈھلان میں اُتارنا ایک مشکل مرحلہ تھا۔ میں نے راشن کی لدی ہُوئی بوریاں اُتروائیں اور گاڑی کے پچھلے حصّے سے رسّے باندھ کر ان کے سرے دو مضبوط درختوں سے باندھ دیے پھر اپنے ساتھیوں سے کہا کہ وہ ان رسّوں کو آہستہ آہستہ ڈھیلا کرتے جائیں تاکہ ڈھلان میں اُترتے وقت گاڑی بے قابو ہو کر اُلٹ نہ جائے۔

گھوڑے آہستہ آہستہ گاڑی کو کھینچتے ہُوئے ڈھلان اُترنے میں کامیاب ہو گئے۔

میں نے دوبارہ راشن کی بوریاں گاڑی پر لدوا کر اسے متعدد ترپالوں سے اچھی طرح ڈھک دیا۔ زخمی والٹر چونکہ گھوڑے پر سفر کرنے کے قابل نہیں تھا۔ اس لیے اسے دیال سنگھ اور اس کے ساتھیوں کے قریب گاڑی میں لٹا دیا گیا اور یوں یہ قافلہ ایک بار پھر آہستہ آہستہ منزل کی جانب بڑھنے لگا۔

کچھ دیر بعد برف باری بند ہو گئی اور سورج کا چمکتا ہُوا گولا ہماری رہنمائی کرنے لگا۔ دن بھر میں ہم نے یہ چکّر دار گھاٹی عبور کر لی۔ اب ہمیں بلندی سے ڈھلان ہی پر سفر کرنا تھا۔

وہ تاریخی درّہ ہمیں دُور سے نظر آ رہا تھا۔ جہاں سے گزر کر ہمیں آگے بڑھنا تھا۔

ڈھلان پر ہمارا سفر جاری تھا کہ اچانک چمکتا ہُوا سُورج دوبارہ سیاہ بادلوں کی اوٹ میں چھپ گیا اور ماحول تاریک ہونے لگا۔ میری کوشش تھی کہ چند میل کا فاصلہ طے کر لیا جائے مگر تاریکی راستے میں حائل ہو گئی۔ میں نے ایک درختوں کے جھنڈ میں قافلے کو ٹھہرنے کا حکم دیا اور گھوڑے سے نیچے اُتر آیا۔

دیال سنگھ نے گاڑی کو ٹیلے کی اوٹ میں روک کر گھوڑے کھول دیے اور انھیں چارہ ڈالنے میں مصروف ہو گیا۔ دُوسرے جوانوں نے اس دوران میں خیمے نصب کر دیے تھے اور ضروری کاموں کی دیکھ بھال میں مصروف ہو گئے تھے۔

ناگر اور اس کے ساتھیوں نے کچھ لکڑیاں جمع کر کے الاؤ روشن کر دیا اور کھانے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ اس کے ساتھ ہی درختوں کی شاخوں سے لدے بھری ہوئی گاڑی کو اس طرح ڈھانپ دیا گیا کہ موسم کی کوئی تبدیلی بھی اس کے نقصان کا باعث نہ بن سکے۔

آگ روشن ہوئی تو دن بھر کے سردی کھائے ہُوئے جسم اس کی حرارت سے لُطف اندوز ہونے لگے۔

سب کام اپنی نگرانی میں نمٹا کر جب میں اپنے خیمے میں آ گیا تو میرے وجود میں تھکن رچی ہُوئی تھی۔ کھانے سے فارغ ہو کر قہوے کا دور چلا تو سارجنٹ فلپ مسکراتا ہُوا خیمے میں آ گیا۔

"میرے خیال میں قیام کے لیے یہ جگہ مناسب نہیں تھی۔"

"تمھارا خیال دُرست ہے سارجنٹ!" میں نے قہوے کا گھونٹ اپنے حلق میں اُتارتے ہُوئے جواب دیا۔ "مگر اندھیرا ہونے کے باعث سفر کرنا خطرناک تھا۔ اس لیے میں نے سفر کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ ان حالات میں اس سے بہتر فیصلہ ممکن نہیں تھا۔"

سارجنٹ فلپ کے چہرے پر تھکن کے آثار تھے۔ شاید اس کے بازو کا زخم سردی کی وجہ سے تکلیف دے رہا تھا اس لیے وہ جلدی اُٹھ کر چلا گیا۔ کچھ سپاہیوں کو نگرانی پر متعین کرنے کے بعد جب سونے کے لیے دراز ہُوا تو اچانک میری آنکھوں کے سامنے اپنے بوڑھے باپ کا چہرہ گھوم گیا جس سے میری ذہنی حالت اذیت ناک ہو گئی اور میں دیر تک کروٹیں بدلتا رہا۔

★★

صبح کے آثار نمودار ہُوئے تو میری آنکھ کُھل گئی۔ خیمے سے باہر آ کر دیکھا تو دیال سنگھ اپنے ساتھیوں سمیت گھوڑوں کو چارہ ڈال رہا تھا اور کچھ لوگ ناشتہ تیار کرنے میں مصروف تھے۔ جُونہی سُورج کی زرد کرنیں زمین کی جانب لپکتی نظر آئیں، میں سارجنٹ سے دُوربین لے کر پڑاؤ سے نکل آیا اور درّے سے گزرنے والے راستے کا جائزہ لینے لگا۔

اچانک ایک رائفل کی نال دیکھ کر میں چونک گیا اور اپنی نظریں دُھوپ میں چمکتی ہُوئی رائفل کی نال پر جما دیں۔ اس کے ساتھ ہی متعدد رائفلوں کی چمکدار نالیں دیکھ کر میں دشمنوں کی تعداد کا اندازہ کرنے لگا۔

"دشمن درّے کی نگرانی کر رہا ہے۔" میں نے درّے کی کھائیوں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں متعدد چھپے ہوئے ڈاکوؤں کو دیکھنے میں کامیاب ہو چکا ہوں" اچانک سارجنٹ فلپ نے میرے عقب میں آکر اعلان کیا۔

"سارجنٹ: میں تم سے پہلے ہی دشمن کی موجودگی محسوس کر چکا ہوں" میں نے دُوربین اپنی آنکھوں سے ہٹاتے ہوئے اُس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا "اب تک میں متعدد رائفلوں کی جھلک دیکھ چکا ہوں۔ درّہ پار کرنے کا مرحلہ اس مہم کا سب سے خطرناک مرحلہ ہے"

"درّے سے گزرتے ہوئے دشمن ہمارے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے" فلپ نے پاٹ دار آواز میں تبصرہ کیا اور دُوربین اپنی آنکھوں سے لگالی۔

ناشتے سے فارغ ہوتے ہی ہمارا قافلہ آگے چل پڑا اور دوپہر ہونے تک ہم نے نشیب میں اُترنے کا خطرناک راستہ طے کر لیا۔ ہموار زمین پر قدم رکھتے ہی میں نے قافلے کو رُکنے کا اشارہ کیا اور منصوبے کے مطابق "دس آدمیوں سے" دائیں سے آگے بڑھنے کے لیے کہا . . . اور ایک ٹولی کو' بائیں جانب سے پہاڑ کا چکردار راستہ طے کرکے دشمن کے عقب میں حملہ کرنے کا حکم دیا . . . پھر یہ طے پایا کہ دیال سنگھ میدان سے تنہا گاڑی لے کر آگے بڑھے گا۔

دیال سنگھ گھوڑے ہانکتا ہُوا تیزی سے یہ مختصر میدانی فاصلہ طے کرنے لگا۔ میں اور سارجنٹ اپنے اپنے دستے کی رہنمائی کرتے ہوئے جلد ہی دُشمن کے عقب میں پہنچ گئے۔ گاڑی ابھی درّے سے نصف فرلانگ دُور ہوگی کہ دشمن نے گاڑی پر اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی۔ اچانک ایک سنسناتی ہوئی گولی آئی اور دیال سنگھ کے جسم میں اُتر گئی۔

دیال سنگھ کا جسم گولی لگتے ہی ایک جھٹکے سے اُچھلا اور پیچھے کی جانب لڑھک گیا۔

آگ اور بارُود کی بارش شروع ہوگئی۔

گھوڑے موت کی آہٹیں قریب پا کر بے قابو ہوگئے اور ان کے دوڑنے کی رفتار میں تیزی آگئی۔ اس کے ساتھ ہی دائیں جانب سے متعدد دھماکوں کی آوازیں میری سماعت سے ٹکرائیں تو مجھے یہ اندازہ لگانے میں دیر نہ لگی کہ میرے ساتھیوں نے دائیں طرف سے دشمن کے پیچھے موت کے ہتھیاروں کے منہ کھول دیے ہیں۔

گھوڑے سرپٹ دوڑ رہے تھے اور دشمن ان پر مسلسل آگ برسا رہا تھا۔

بائیں جانب کا محاذ کمزور تھا اس لیے جب ادھر سے فائرنگ کی آوازیں سُنائی دینے لگیں تو میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ اُبھر آئی۔ گاڑی کے تختے بے حد مضبوط تھے اور دشمن کی چلائی ہوئی ہر گولی کو آسانی سے اپنے اندر جذب کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔

جونہی گاڑی درّے سے گزری تو میں اور سارجنٹ اپنی رائفلیں سنبھالتے ہوئے گاڑی کو روکنے کی تدبیریں کرنے لگے۔ ہموار زمین ختم ہوگئی تھی اور گاڑی ہچکولے کھاتی ہوئی ابھی تک اسی رفتار سے آگے بڑھ رہی تھی۔

دفعتاً میں نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا کر تیزی سے آگے بڑھایا اور گاڑی کے برابر سے گزرتے ہوئے اس پر کُود گیا۔ پھر فوراً ہی گھوڑوں کی باگیں کھینچ کر انھیں رُکنے پر مجبور کر دیا۔ یہ میں ہی جانتا ہوں کہ میرے بازو انھیں روکنے میں شل ہوگئے تھے۔ کوئی معمولی قوت رکھنے والا انسان انھیں اتنی جلدی قابو نہیں کر سکتا تھا۔ اگر چند لمحوں کی اور دیر ہو جاتی تو گاڑی اُلٹ کر کھائی میں گر جاتی اور سارے کیے دھرے پر پانی پھر جاتا۔

گھوڑے ہنہناتے ہوئے آہستہ ہوئے اور کھائی سے چند فٹ کے فاصلے پر رُک گئے۔ اس کے ساتھ ہی مجھے اپنے ساتھیوں کی تحسین آمیز آوازیں اپنے عقب میں سنائی دیں۔ جو دشمن کا صفایا کرتے ہوئے ہم تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئے تھے۔

اس کے چند لمحے بعد دُوسری ٹولی بھی اپنی کامیابی کا اعلان کرتی ہوئی ہمارے قریب آکر رُک گئی۔ میں نے ایک سرسری نظر سے اپنے ساتھیوں کا جائزہ لیا تو ان میں چند سپاہی معمولی زخمی نظر آئے۔

دیال سنگھ کی موت کا ہر کسی کو افسوس تھا۔ اس نے بڑی جرأت اور دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے سینے پر گولی کھائی تھی۔ گاڑی کا رُخ منزل کی طرف سے ہٹنے نہیں دیا تھا ورنہ گھوڑے پلٹ کر دوڑتے تو دشمن کی کامیابی یقینی ہو جاتی۔ سبھی کچھ ان کے ہاتھوں میں پہنچ جاتا۔

ہم اپنی منزل کی طرف بڑھتے چلے گئے۔

★★

شام کے سائے زمین پر اپنی ظلمت کے سیاہ پرچم گاڑ رہے تھے کہ اچانک چند سفید فام فوجی تیزی سے اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر میں نے سوالیہ نگاہ سے فلپ کی طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔

"ہم منزلِ مقصود پر پہنچ گئے، شہباز! اُس منزل پر جہاں تک رسائی حاصل کرنے میں اب تک دس سے زیادہ مہماتی دستے ناکام ہو چکے ہیں" وہ خوشی سے سرشار لہجے میں بولا۔ "یہ اسی چوکی کے سپاہی ہیں جو یہاں گھر کر رہ گئے تھے۔ ان کے لیے یہاں سے نکلنا ناممکن ہو گیا تھا اور انھیں کمک بھی نہیں پہنچائی جا سکتی تھی۔ یہاں میجر براؤن موجود

ہے۔ وہ ہماری اس کارنامے سے بے حد خوش ہوگا۔"

میں خاموش رہا۔

"ہیلو سارجنٹ!" ایک فرنگی سپاہی نے ہنستے ہوئے کہا "ہمیں توقع تھی کہ آج کل میں کوئی نہ کوئی کمک ضرور آجائے گی . . . لیکن ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ سارجنٹ فلپ اتنی جلدی یہاں پہنچ جائے گا۔"

"اس مہم کی کامیابی کا سہرا ہمارے دوست شہباز پر ہے" فلپ نے مسکرا کر کہا اور میری طرف اشارہ کر دیا۔ فرنگی سپاہی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے دیکھنے لگے۔ ان کی آنکھوں میں احسان مندی کا بھرپور تاثر تھا۔

گھوڑا گاڑی چوکی پر پہنچ گئی تو ایک بوڑھا آدمی باہر آیا۔ اس کے بال سفید تھے اور اس کا چہرہ لال بھبوکا تھا۔ اس کی آنکھیں بھی سُرخ تھیں اور وہ یوں لڑکھڑا رہا تھا جیسے اُس نے شراب کی پوری مشکی اپنی توند میں انڈیل رکھی ہو۔

سارجنٹ فلپ نے اسے سیلوٹ کیا اور تیزی سے صُورتِ حال بتانے لگا۔ حالات معلوم کرنے کے بعد میجر کی نتھنے سے بوجھل پلکیں کچھ بلند ہوئیں اور وہ میری طرف دیکھنے لگا . . . پھر اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور میرا کندھا تھپتھپاتے ہوئے بولا "ویل ڈن، چیمباز . . . ویل ڈن" اپنے نام کی مٹی پلید ہوتے دیکھ کر میں مُسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

چند روز چوکی پر قیام کے بعد ہمارا قافلہ بخیریت واپس پشاور چھاؤنی پہنچ گیا۔ جو سپاہی جاتے وقت ساتھ تھے انھیں چوکی پر روک لیا گیا اور اسی تعداد میں چوکی پر موجود سپاہی واپس چھاؤنی بھیج دیے گئے۔ میجر براؤن بھی ساتھ آیا تھا اور اس کی جگہ ایک اور فرنگی نے سنبھال لی تھی۔

سارجنٹ فلپ اس مہم کی تفصیل جنرل ڈوگ کے گوش گزار کر چکا تھا۔ اس لیے ملاقات پر جنرل ڈوگ مجھ پر بے حد مہربان ہُوا۔ لیکن مجھے اس کی مہربانی کے بجائے دس ہزار روپوں ہی سے دلچسپی تھی جنھیں میں اپنے گاؤں بھجوا دینا چاہتا تھا۔

اس بار مجھے انعام کی رقم فوراً ہی ادا کر دی گئی۔

جنرل ڈوگ نے مجھے بہت اچھی پیش کش کی لیکن میں چند دنوں کے لیے چھاؤنی سے دُور چلے جانا چاہتا تھا۔ میں نے جنرل کو سمجھایا کہ مجھے چھاؤنی میں مستقل قیام سے قبل اپنے قبیلے کے چند فرائض کی تکمیل کرنی ہے اس لیے مجھے جانے کی اجازت دی جائے۔ انہیں نے میرے پیروں کی زنجیر بننے کی کوشش کی لیکن میں نے رُکنے سے انکار کر دیا۔ اس حسینہ کو بھلا کیا معلوم تھا کہ میرے پیروں میں ایک ایسی زنجیر پڑی ہوئی ہے جو مجھے چھاؤنی تک جلدی واپس کھینچ لائے گی۔

جس گورے کو ادلی کو میں نے اپنے بابا کے سلسلے میں رازدار بنایا تھا۔ اس نے مجھے یہ خوش خبری سُنا دی تھی کہ دس روز بعد میرے بابا شالیار کو طبی طور پر صحت یابی کا پروانہ مل جائے گا اور اسے جنرل ڈوگ کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ میں اس سے پہلے پہلے چند انتقامات کے لیے ملک سکندر سے ملنے جانا چاہتا تھا اس لیے اپنا اسلحہ واپس لے کر ایک روز میں علی الصباح ہی اپنے سفر پر روانہ ہوگیا۔

علاقہ غیر میں میرے گھوڑے کی ٹاپیں گونج رہی تھیں۔

میں بے حد پُرجوش تھا

ٹھیک دسویں روز میرے بابا کو ایک نئی زندگی ملنے والی تھی۔

دفعتاً مجھے یوں محسوس ہُوا جیسے میں خیالوں میں ڈوبا ہُوا گردوپیش سے بے خبر ہو رہا ہوں . . . اور ان گھوڑوں کی ٹاپیں سُننے سے غافل رہا ہوں جو فاصلے کے باوجود آسانی سے سُنی جا سکتی تھیں۔

میں نے گھوڑے کی لگام کھینچ لی۔

ایک چٹان کی اوٹ میں گھوڑے کو روک کر میں ان ٹاپوں پر غور کرنے لگا۔ جو ہر گزرتے ہوئے لمحے کے ساتھ قریب تر ہوتی جا رہی تھیں۔ نہ جانے کیوں مجھے یقین ہو رہا تھا کہ یہ گھڑسوار خاص طور سے میرے ہی تعاقب میں ہیں اور انھیں جنرل ڈوگ نے بھیجا ہے۔

گھوڑوں کی ٹاپیں مزید قریب آگئیں۔

میرا ہاتھ آہستہ آہستہ رینگتا ہوا اَصل کے دستے پر جم گیا۔

میری نظریں اپنے تعاقب میں آنے والے گھڑسواروں پر لگی ہوئی تھیں۔ جن کا فاصلہ ہر گزرتے ہوئے لمحے کے ساتھ کم ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے دُور سے انھیں پہچاننے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ شاید یہ لٹیرے ہیں۔ ان کے کانوں میں کہیں سے یہ بھنک پڑ گئی ہوگی کہ اس وقت میرے پاس دس ہزار طلائی سکے موجود ہیں۔ میں نے دل میں سوچا، ہو سکتا ہے یہ محض میرا خیال ہو اور یہ کوئی اور ہوں۔

میں اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا کر ایک ٹیلے کے عقب میں لے آیا تھا اور یہاں سے ان گھڑسواروں کی نقل و حرکت پر بھی بہ آسانی نظر رکھی جا سکتی تھی۔ ٹیلے کی آڑ میں چھپے ہوئے چند ساعتیں ہی گزری ہوں گی کہ آٹھ گھڑسواروں کا تیز رفتار قافلہ نمودار ہُوا۔ جب کہ میں نے پہلے صرف دو گھڑسوار دیکھے تھے تمام گھڑسواروں نے اپنے چہرے چادر کے پلو میں چھپا رکھے تھے۔ ان کی وضع قطع دیکھ کر مجھے اس بات کا پختہ یقین ہوگیا کہ یہ لوگ کسی خطرناک ارادے سے اپنا سفر تیز رفتاری سے طے کر رہے ہیں پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ درّے کی پُرپیچ گھاٹیوں میں غائب ہو گئے۔ میں ٹیلے کی اوٹ سے نکلا اور اپنے سفر

پہ چل پڑا۔

سہ پہر کے بعد راستے میں ایک چشمے کے کنارے میں نے گھوڑے کی باگیں کھینچ لیں۔ . . پھر خُرجی سے رقم کا بھرا ہُوا تھیلا اُتار کر ایک درخت کی آڑ میں رکھا، گھوڑے کو چَرنے کے لیے چھوڑ دیا اور خود چشمے کے ٹھنڈے میٹھے پانی سے لُطف اندوز ہونے لگا۔

چشمے کا پانی اس قدر یخ بستہ تھا کہ دو ڈبکیوں میں ہی مجھ پر لرزہ طاری ہوگیا۔ میں اپنا لباس پہن کر اس درخت کی طرف بڑھ رہا تھا جس کی اوٹ میں میں نے روپوں سے بھرا ہُوا تھیلا رکھا تھا کہ اچانک کہیں قریب ہی گھوڑوں کی ٹاپیں سُن کر چونک پڑا۔ میرا گھوڑا سامنے کھڑا، چشمے کے کنارے اُگی ہوئی گھاس پر منہ مارنے میں مشغول تھا۔ پھر یہ گھوڑے کی ٹاپیں کہاں سے سنائی دی تھیں؟

میں نے تھیلا اُٹھا کر دوبارہ خُرجی میں ڈالا اور گھوڑے پر سوار ہو کر اس پہاڑ کی طرف بڑھا جس کی خم دار گھاٹیوں میں ایک قبائلی بستی پوشیدہ تھی۔

معاً ایک بار پھر گھوڑوں کی ٹاپیں میری سماعت سے ٹکرائیں تو میں نے گھوڑا روک لیا اور درختوں کے جھنڈ کو گھورنے لگا جس کے عقب سے یہ محتاط آوازیں اُبھرتی ہُوئی سنائی دی تھیں۔ میں نے ایک دم اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور گھوڑا دوڑتا ہُوا دَرے کے میدانی علاقے سے گزرنے لگا۔

چند فرلانگ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اب میرا رُخ دَرے کے قریب ایک بلند ٹیلے کی جانب تھا۔ ٹیلے پر پہنچتے ہی میں نے اپنا گھوڑا ایک تناور درخت کی آڑ میں کر لیا اور دَرّے کی نگرانی کرنے لگا۔

میرا اس وقت تک آگے سفر کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا، جب تک میں اپنے عقب میں اُبھرنے والی گھوڑوں کی ٹاپوں کا معمہ حل نہ کر لیتا۔

اچانک دو گھڑ سوار دَرّے میں نمودار ہُوئے۔

وہ گھوڑوں کو اس انداز میں بڑھا رہے تھے کہ چٹانی سطح پر گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز کم سے کم پیدا ہو۔ دونوں مقامی لباس میں تھے مگر ان کے سدھائے ہُوئے گھوڑے دیکھ کر میری سوچوں میں اُلجھنیں اُترنے لگیں۔ سواروں کے چلنے کا انداز ظاہر کر رہا تھا جیسے انھیں اپنا سفر جلد طے کرنے سے کوئی دلچسپی نہ ہو۔

ان کا محتاط رویہ دیکھ کر میرے خون میں ہیجان کے بگولے اُٹھنے لگے۔ یہی احتیاط ان کا راز عیاں کرنے کا باعث بنی کہ یہ راز داری ضرور کسی مصلحت کی بنا پر برتی جا رہی ہے اور حیرت اس بات پر بھی تھی کہ اس قدر سُست رفتاری سے ان پہاڑوں کے درمیان عام لوگ سفر نہیں کرتے کیوں کہ یہ خطرناک گھاٹیاں ڈاکوؤں اور رہزنوں کی پناہ گاہوں کا کام دینے کے لیے مشہور تھیں۔

اب وہ دَرّے کا درمیانی فاصلہ طے کر کے میری جانب آگے بڑھ رہے تھے۔ میں نے گھوڑا ٹیلے کی اوٹ سے نکالا اور خم دار ڈھلائی کا فاصلہ طے کر کے ایک چشمے کے کنارے پہنچ گیا، جہاں ہر طرف گھاس کا سبز فرش بچھا ہُوا دُور تک نظر آ رہا تھا۔ میں نے گھوڑے کو پیار سے تھپکی دی اور خرجی سے روپوں کا تھیلا اُتار کر گھاس پر کچھ یوں لیٹ گیا جیسے اچانک چوٹ لگ جانے کے باعث اپنے حواس کھو چکا ہوں۔ چند لمحات مجھے اسی عالم میں پڑے ہُوئے گزر گئے۔ اچانک گھوڑوں کی محتاط آواز مجھے اپنے عقب میں رُکتی ہُوئی محسوس ہوئی . . . اور میں اپنی مکمل بے ہوشی کا مظاہرہ کرتے ہُوئے اسی کروٹ پڑا رہا۔

کچھ دیر بعد دو سوار ٹیلے کا چکر کاٹ کر سامنے آ گئے اور مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑے ہُوئے میرا منجمد جسم گھورنے

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk
مکتبہ القریش سرکلر روڈ اردو بازار لاہور
فون 7668958

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لگے۔ میں نے اپنی اَدھ کھلی آنکھوں کی درز سے ان اجنبی گھڑ سواروں کا جائزہ لیا مگر انھیں پہچاننے میں ناکام رہا۔

دونوں خاموشی سے آگے بڑھے اور میرے جسم کو سیدھا کر کے ... زخموں کا جائزہ لینے لگے۔ شاید گھوڑے سے گر جانے ... سے بے ہوش ہوگیا ہے۔ ان میں سے ایک نے پشتو میں ... ساتھی کو مخاطب کیا۔

... اگر یہ بے ہوش ہونے کی بجائے مر جاتا تو مجھے زیادہ خوشی ... دوسرے نے میرے سینے سے اپنا ہاتھ ہٹاتے ہُوئے جواب ... معلوم نہیں جنرل ڈوگ نے اس میں کیا خوبی دیکھی ہے جو اس ... نقل و حرکت سے باخبر رہنا چاہتا ہے اور اس کے ساتھی ... تو تم کو ٹیم کا ہیرو قرار دے رہے ہیں۔ ان لوگوں کے ... کے مطابق یہ شخص بہت بہادر، ذہین اور مضبوط قوتِ ارادی ... ہے اور خطرات میں تو اس کی قوتِ برداشت حیرت انگیز ... بڑھ جاتی ہے۔ اس نے تنہا ایسے کارنامے انجام دیے ہیں ... کمپنی کے جوان مل کر بھی انجام نہیں دے سکتے۔ مجھے تو ... یہ مبالغہ آمیز معلوم ہوتی ہیں۔ ویسے تمھارا اس بارے ... کیا خیال ہے؟

یہ ذہین اور بہادر تو ہو سکتا ہے۔ پہلے نے جواب دیا مگر ... ہم سے زیادہ ذہین نہیں ہو سکتا کیوں کہ ہم لوگ ایک فاتح قوم ... ہیں۔ آج ہماری برطانوی سلطنت کی حدود اتنی وسیع ہو ... گئی ہیں کہ اس میں کبھی سورج غروب نہیں ہوتا۔ اس کے لہجے ... میں غرور اور تکبر تھا۔

یہ انکشاف میرے لیے حیرت کا باعث تھا کہ جنرل ڈوگ ... نقل و حرکت کی مکمل نگرانی کرا رہا ہے۔ یہ جان کر میں اپنے ... میں ہلکے ہلکے دھماکے محسوس کرنے لگا۔

جنرل ڈوگ نے ہمارے ذمے اس شخص کی نگرانی کا فرض ... سونپ کر ہمارے ساتھ زیادتی کی ہے۔ مجھے تو اس شخص میں کوئی ... بات نظر نہیں آتی کہ جس کے لیے جنرل نے ہمیں مجبور ... کر کے اس ویرانے میں بھیج دیا ہے۔

تمھاری بات درست ہے۔ دوسرے نے اس کے ... کی تائید کرتے ہُوئے کہا۔ مگر اس وقت یہ سوچو کہ اسے ... ہوش میں کیسے لایا جائے کیوں کہ اس کا آگے سفر کرنا ... ضروری ہے ورنہ ہم جنرل کو کیا رپورٹ دے سکیں گے؟

جنرل یہ جاننا چاہتا ہے کہ یہ اس روپے کو کس طرح اور کہاں استعمال میں لاتا ہے۔ اب باتوں میں وقت ضائع نہ کرو۔ اپنی بوتل میں تازہ پانی بھر لو اور اسے ہوش میں لانے کی تدبیر کرو۔

ورمنٹ! تم خود کیوں نہیں چلے جاتے؟ ان میں سے ایک نے پہلی بار اپنے ساتھی کا نام لے کر مخاطب کیا۔

ڈان! میں اسے کسی محفوظ جگہ پر لے جانا چاہتا ہوں۔ . .

ورمنٹ نے جواب دیا۔ شام کا دُھندلکا پھیل رہا ہے اور اندھیرا پھیلنے سے پہلے پہلے اسے کسی محفوظ جگہ پہنچانا ہمارے حق میں زیادہ بہتر نتائج پیدا کر سکتا ہے۔ ابھی کچھ دیر میں برف باری شروع ہو گئی تو آگے سفر کرنا مشکل ہو جائے گا۔

وہ سامنے مجھے ایک غار نظر آ رہا ہے۔ اگر ہم اس بے ہوش ہاتھی کے بچے کو گھسیٹ کر وہاں تک لے چلیں تو سارا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ ڈان نے ایک بے ہنگم قہقہے کے درمیان اپنے ساتھی کو مشورہ دیا۔

دونوں نے مل کر مجھے اُٹھایا اور ایک تاریک غار میں لٹا دیا۔ کچھ دیر بعد ڈان نے میرے حلق میں پانی کے چند قطرے ٹپکائے تو میں نے مصنوعی بے ہوشی کا ڈھونگ ختم کرتے ہُوئے پہلے ہلکے سے کراہا پھر اچانک ہی کروٹ بدل لی۔

اب اسے تنہا چھوڑ دو، ڈان! اچانک ورمنٹ ہی کی سرگوشی سنائی دی۔ آؤ چلیں، اس کے ہوش میں آنے سے پہلے ہی ہمیں اس کی نظروں سے رُوپوش ہو جانا چاہیے۔

اندھیرے میں دو سائے آگے پیچھے چلتے ہُوئے غار سے باہر نکل گئے۔

میں چند لمحے آنکھیں کھولے خاموشی سے پڑا رہا تاکہ اگر وہ چھپ کر میری نگرانی کر رہے ہوں تو ان پر میری مصنوعی بے ہوشی کا ڈھونگ نہ کھل سکے۔ آنکھیں کھولتے ہی میرے سینے میں غصے کی آگ بھڑک اُٹھی۔

میں نے اپنے روپوں کے تھیلے اور ریوالور کا جائزہ لیا۔ ہر چیز اپنی جگہ موجود تھی . . . مجھے ان عیار فرنگیوں پر غصہ آ رہا تھا، جو دوسروں کو خود پر اعتماد کرنے کی تلقین کرتے ہیں مگر خود کسی پر بھی اعتبار نہیں کرتے۔

اچانک مجھے بابا شالیار کی خود نوشت یاد آئی اور اس میں لکھے ہُوئے عیار فرنگیوں کی سنگ دلی کے واقعات میری آنکھوں

کے سامنے گھومنے لگے۔ ان دونوں کے جانے کے بعد میں اُٹھ بیٹھا اور روپوں سے بھرا ہوا تھیلا اُٹھانے کے لیے جھک ہی رہا تھا کہ اچانک کسی انسان کے کراہنے کی آواز سُن کر چونک پڑا اور چوکنی نظروں سے غار کے اندرونی حصے میں جھانکنے لگا جہاں سے آواز آ رہی تھی۔

... پھر کوئی بڑے کرب کے عالم میں کراہا۔

اب تھوڑے تھوڑے وقفے سے کراہیں مسلسل اُبھر رہی تھیں۔ ان اذیت ناک کراہوں کو سُن کر میرے دل میں انسانی ہمدردی کے جذبات اُبھر آئے اور میں اپنی جیب سے ماچس نکال کر آگے بڑھا۔ ماچس کی تیلی کی روشنی میں چند قدم کے فاصلے پر پتھریلی دیوار کے ساتھ کسی کی موجودگی کا احساس ہُوا... کراہنے کی آوازیں اسی کے حلق سے اُبھر رہی تھیں۔

میں آگے بڑھ کر اس کے قریب پہنچ گیا اور ماچس کی تیلی جلا کر اس کراہتے ہوئے وجود پر نظریں ڈالیں تو دہشت کی ایک تیز لہر مجھے اپنے وجود میں سرایت کرتی محسوس ہوئی۔

ایک اُدھیڑ عمر عورت کوڑھ کے مرض میں مبتلا نظر آئی۔ اس کی خوب صورت آنکھیں اس بات کی آئینہ دار تھیں کہ جوانی میں وہ ضرور قاتل رہی ہوں گی مگر اب اس کے چہرے کے نقوش قصۂ پارینہ بن چکے تھے۔ کوڑھ کے موذی مرض سے اس کے ناک کا گوشت گل سڑ چکا تھا اور اب ناک کی جگہ دو بدنما سوراخ نظر آ رہے تھے۔ اس کی بگڑی ہوئی ہیئت دیکھ کر میرے سینے میں ہمدردی کی ایک تیز لہر اُبھری۔ میں فیصلہ کن انداز میں اُٹھا اور غار سے باہر آ کر کچھ سوکھی ہوئی لکڑیاں اکٹھی کرنے لگا۔

سُوکھی ہوئی لکڑیوں کا ڈھیر لا کر میں نے اس کے قریب رکھ دیا اور کچھ سوکھے پتوں کی مدد سے آگ روشن کر دی۔ آگ کی حرارت غار میں اپنا اثر دکھائے بغیر نہ رہ سکی۔ درد و کرب کی شدت سے لرزتا ہوا وجود حرارت پا کر پُرسکون نظر آنے لگا اور اس کے کراہنے کی آوازوں میں کمی آ گئی۔ اس کے جسم پر لباس کی جگہ چند چیتھڑے جھول رہے تھے۔ آگ کی مدھم روشنی میں اس کی آنکھیں مسلسل مجھے اپنی جانب گھورتی نظر آئیں۔

"تم کون ہو؟" میں نے بلند لہجے میں اسے مخاطب کیا اور اس کے قریب ہو کر کھڑا ہو گیا۔

"مجھ سے دُور رہو!" افسردہ اور کراہتی ہوئی آواز نے مجھے تنبیہ کی۔ "میں کوڑھ کے موذی مرض میں مبتلا ہوں اور ان مہربان ہاتھوں کی ایک طویل عرصے سے منتظر ہوں... جو مجھے زندگی کی قید سے آزاد کر دیں۔ تمھاری آنکھوں سے میرے لیے رحم دلی کے آثار اُبھر رہے ہیں۔ میری زندگی پر ایک احسان کر دو۔ اپنے ریوالور کی ایک گولی میری کھوپڑی میں اتار دو تاکہ مدتوں کی بے قرار روح تسکین پا جائے اور مجھے زندگی کی دردناک قید سے رہائی مل جائے۔"

"زندگی سے اس قدر مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔" میں اس کی ہدایت کے مطابق اس سے کچھ دور ہٹ کر ایک طرف بیٹھ گیا۔ اب میرے اور اس کے درمیان آگ کا الاؤ حائل تھا جس کے لپکتے ہوئے شعلے مجھے اپنی روح کو خاکستر کرتے محسوس ہو رہے تھے۔ "میں تمھیں یہاں سے اٹھا کر کسی بستی میں لے جاؤں گا۔ مجھے یقین ہے کہ کوئی اچھا طبیب تمھارے اس نامراد مرض پر ضرور قابو پا لے گا۔"

"نہیں... نہیں۔" عورت ایک دم دہشت کے عالم میں بولی۔ "ابھی میں کسی انسانی بستی میں جانے کے قابل نہیں ہوں۔ جب لوگ خوف اور نفرت کے انداز میں مجھے دیکھتے ہیں تو زندہ رہنے کی تمام خواہشیں دم توڑنے لگتی ہیں۔ ایک طویل عرصے سے کسی انسان نے بھی میرے ساتھ معمولی سی ہمدردی کا اظہار تک نہیں کیا۔ انسان کو ہمدردی اور محبت کی ضرورت اس وقت ہوتی ہے جب وہ اپنے اندر زندہ رہنے کی بھرپور اُمنگیں رکھتا ہو۔ آج میں بے بسی کے اندھیرے میں سسک رہی ہوں۔ کیا تمھیں میری بگڑی ہوئی حالت دیکھ کر مجھ پر رحم نہیں آتا؟" اس نے سوال کیا۔

"میں اس ملاقات کے مختصر عرصے میں تمھاری ذات کے ساتھ بڑی گہری ہمدردی محسوس کر رہا ہوں۔" میں نے نرمی سے جواب دیا۔ "اور میں تمھیں اس ویرانے میں مرنے نہیں دوں گا۔ میں تمھارے لیے کوئی اچھا طبیب ضرور تلاش کروں گا۔"

"نہیں نہیں!" اس نے دوبارہ اپنی بے چینی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھے مخاطب کیا۔ "اپنی ہمدردی ظاہر کر کے مجھے روحانی کرب میں مبتلا نہ کرو۔ اگر واقعی تمھاری ہمدردی میں کوئی سچائی پوشیدہ ہے تو تمھارا مجھ پر سب سے بڑا احسان یہی ہو گا کہ مجھے اس مستقل آزار سے رہائی دلا دو... اس سے پہلے خود بھی دو مرتبہ مرنے کی کوشش کر چکی ہوں۔ ایک مرتبہ دریا میں ڈوب کر اپنی زندگی کا قصہ تمام کرنے کی کوشش کی تو ایک شکاری نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مجھے دریا میں غوطے کھاتے ہوئے باہر نکال لیا اور مجھ پر دوبارہ زندگی کا بھاری بوجھ لاد دیا۔ دوسری مرتبہ میں نے زہر کھا کر مرنے کی کوشش کی تو زہر مجھے کوئی نقصان پہنچانے میں ناکام رہا... اب مجھے کوئی انسانی ہاتھ ہی اس دردناک اذیت سے نجات دلا سکتا ہے۔"

عورت شدید جذباتی ہو رہی تھی اور اس کے لہجے میں سچائی کی جھلک پا کر میرا دل افسردہ ہو گیا۔

"بہادر نوجوان! کیا سوچ رہے ہو؟" اس نے اپنی ویران آنکھیں میرے چہرے پر گاڑ دیں۔ "تمھارے ریوالور کی ایک گولی میری اذیتوں کا خاتمہ کر سکتی ہے۔ کیا تم اپنی ہمدردیوں کو عملی جامہ نہیں پہنا سکتے۔ مجھے حیرت اور افسردگی سے دیکھنے کی بجائے میرے جسم اور روح کی ان اذیتوں کا اندازہ لگاؤ جنھیں میں برسوں سے اپنے جسم و جان پر برداشت کر رہی ہوں۔ تمھارے ہاتھ کی ایک معمولی سی جنبش میری ان بے پناہ اذیتوں کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دے گی۔ سوچتے کیا ہو، اپنا ریوالور نکالو اور میرے لیے مسیحا بن جاؤ۔"

اس کی مایوس کن باتیں سُن کر میری افسردگی میں مزید اضافہ ہو گیا...

میں متجسس نظروں سے اس کی بگڑی ہوئی شخصیت کا جائزہ لینے لگا۔ "تم کون ہو، اور کیوں میرے ہاتھوں مرنے کے لیے اصرار کر رہی ہو؟" میں نے اچانک سوال کیا۔ "میں تمھاری آخری خواہش پوری کرنے کے لیے تیار ہوں مگر اس سے پہلے تمھیں اس راز سے پردہ اُٹھانا ہو گا کہ موت کی خواہش کے پس پُشت وہ کون سے عوامل ہیں جو تمھیں اس منزل پر لے آئے ہیں۔ تمھاری مترنم اور لوچدار آواز اس بات کی غماز ہے کہ تم اپنے وقت کی حسین ترین عورت رہی ہو۔ مجھے اپنے بارے میں بتاؤ اس طرح تمھارے دل کا بوجھ بھی ہلکا ہو جائے گا۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ تمھاری مشکل کو آسان کرنے کی ہر ممکن کوشش کروں گا۔"

"نوجوان! تمھاری باتوں سے صداقت کی بُو آ رہی ہے۔" اس نے رُکتے ہوئے ایک طویل سانس اپنے سینے سے خارج کر کے مجھے جواب دیا۔ "مگر ماضی کی اذیت ناک یادیں مجھے مزید بے چین اور افسردہ کر دیں گی۔ مجھ سے ماضی کے بارے میں کوئی سوال نہ کرو، کیوں کہ ماضی کی یاد میری رُوحانی اور جسمانی تکلیف میں اضافہ کر دیتی ہے۔"

"یہ بہت ضروری ہے خاتون!" میں نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "میں اس وقت تک اپنے ریوالور کی گولی کسی پر ضائع کرنے کا عادی نہیں ہوں جب تک اس کے بارے میں پوری معلومات حاصل نہ کر لوں۔" میرا لہجہ پُراعتماد تھا۔

"نوجوان! میں تمھیں خدا کا واسطہ دیتی ہوں۔" اس نے نہایت رقت آمیز آواز میں کہا۔ "مجھ پر ایک آخری احسان کر دو۔ مجھے موت کی اندھیری وادیوں میں دھکیل دو۔"

"اپنی اس خواہش کو آسودہ کرنے کے لیے تمھیں اپنی زبان کھولنا پڑے گی۔" میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "تمھاری اپنی ذات کے متعلق پوشیدہ رکھنے کی اس کوشش نے میرے تجسس کو بیدار کر دیا ہے۔ تمھیں اپنے ماضی کے بارے میں بتاتے ہوئے کسی ہچکچاہٹ سے کام نہیں لینا چاہیے۔ مجھے یہ تو معلوم ہو جائے گا کہ میری گولی سے مرنے والی خاتون کون ہے؟ اس کا کس علاقے سے تعلق ہے اور کس خاندان کا خون اس کی رگوں میں گردش کر رہا ہے۔"

"تمھیں اس بات کا وعدہ کرنا پڑے گا کہ میری درد بھری داستان سُن کر تم مجھ سے نفرت نہیں کرنے لگو گے اور مجھے زندگی کے دردناک عذاب سے نجات دلانے میں گریز نہیں کرو گے۔" اس نے مجبوراً ہتھیار ڈالتے ہوئے مجھ سے سادگی سے سوال کیا۔

"تمھاری داستان سُننے کے بعد بھی میرے خیالات میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔" میں نے اس کی سادگی سے متاثر ہوتے ہوئے جواب دیا۔ "میں بہت فراخ دل ہوں، اگرچہ سنگ دلی اور سفاکی میری فطرت ثانیہ بنتی جا رہی ہے مگر پھر بھی میرا دل انسانی ہمدردی سے خالی نہیں ہے۔ انسان کو اپنے ماضی سے محبت کرنا چاہیے۔ ماضی سے خوف کھانے والے بزدل اور ناکارہ بن جاتے ہیں۔ تمھاری آزردہ باتیں سُننے کے لیے میرے پاس کافی وقت ہے۔ گھبراؤ نہیں، میں تمھاری یہ آخری خواہش ضرور پوری کروں گا۔" میں نے اسے اپنا ماضی بے نقاب کرنے پر اُکساتے ہوئے کہا۔

"تمھاری آواز سُن کر مجھے محسوس ہو رہا ہے جیسے میں یہ آواز اپنے ماضی میں بھی سُن چکی ہوں۔" اس کی آنکھیں فکر انگیز انداز میں سکڑنے لگیں۔ "پہلے تم مجھے اپنے بارے میں بتاؤ کہ تم

"کون ہو؟ اور تمھارا کس قبیلے سے تعلق ہے؟" اس نے اُلٹا مجھی سے سوال کر دیا۔

"مہاتون" میں نے اس کی بات کاٹتے ہُوئے کہا: "مجھے بے معنی سوالات میں اُلجھانے کی کوشش نہ کرو۔ ایسا نہ ہو کہ میرے خیالات بدل جائیں اور۔۔۔" میں جان بُوجھ کر اپنی بات ادھوری چھوڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

یک بارگی اس کی آنکھیں میری جانب اُٹھیں، جن میں لاکھوں التجائیں مچلتی ہُوئی محسوس ہوئیں۔ اچانک اس کے بگڑے ہُوئے چہرے پر پریشانی کے آثار نمودار ہُوئے پھر فوراً ہی اس کے ہونٹوں میں جنبش ہُوئی اور اس کی لرزتی ہُوئی کرب انگیز آواز سُنائی دی: "میں وادیِ خوف کے ایک شریف آدمی۔۔۔ کی بیٹی ہُوں۔"

ابھی اس نے تمہیدی الفاظ زبان سے نکالے ہی تھے کہ اچانک میری آنکھوں کے سامنے باباشالیار خان کی خود نوشت حقیقت کا رُوپ دھار کر میری آنکھوں کے سامنے ماضی کا نقشہ پیش کرنے لگی۔

"جب میں جوان ہُوئی تو آس پاس کے بہت سے قبیلوں کے سرداروں کی یہ تمنا تھی کہ میرا دل جیت کر میرے خوب صورت سراپا پر اپنا قبضہ جما لیں۔ مجھے اپنی جوانی اور حُسن پر بہت ناز تھا اور میرے خواب بہت بلند تھے اور میری تمنا تھی کہ میں کسی بڑے گھر کی دُلہن بنوں۔ آس پاس کا کوئی شخص میرے حُسن کی بلندی کو نہیں چھُو سکتا تھا اور میری آنکھیں کسی محل کے خواب دیکھنے کی عادی ہو گئی تھیں پھر انھی دنوں ایک بانکا سجیلا جوان کسی دوسری بستی سے ہماری بستی میں آگیا اور جونہی میرا اس کا سامنا ہُوا، میں اُسے اپنا دل دے بیٹھی۔ ابھی ہماری ملاقات کی کوئی صُورت بھی نہیں نکلی تھی کہ اچانک فرنگیوں نے بستی پر حملہ کر دیا اور مجھے اغوا کر لیا۔ سارجنٹ فرینک اور اس کے ساتھی مجھے اپنے ساتھ غاروں میں لے گئے۔ وہ چھ آدمی تھے جو رات دن مجھے وحشیانہ انداز سے جھنجوڑتے رہے اور میرے جسم کے ریشے ریشے سے میری عصمت مآبی اور حسین ہونے کا انتقام لیتے رہے وہ رات کو الاؤ روشن کر کے مجھے رقص کا حکم دیتے۔۔۔ جب ناچتے ناچتے میری ٹانگیں تھک جاتیں اور میں بے دم ہو کر گر جاتی تو ان میں کوئی ایک درندہ آگے بڑھتا اور مجھ بے بس پر وحشیانہ حربے استعمال کرنے لگ جاتا۔ وہ اتنے گندے تھے کہ ان کے جسم سے اُٹھنے والی بدبُو سے مجھے اپنا سانس رُکتا ہُوا محسوس ہونے لگتا اور میں اپنے حواس کھو بیٹھتی مگر ان درندوں کو میری اس حالتِ زار پر بھی کوئی رحم نہیں آتا تھا۔ یکے بعد دیگرے وہ مجھے جھنجوڑتے اور اپنی وحشیانہ حرکتوں سے مجھے ادھ مُوا کر دیتے۔ دن رات کی اس درندگی نے مجھ سے زندگی کی جوان حرارتیں چھین لیں اور میرے جسم پر بے حد کراہت آمیز امراض حملہ کرنے لگے پھر انھی دنوں مجھ پر آتشک کے موذی مرض نے حملہ کر دیا اور یہی مرض بڑھ کر اب کوڑھ کی صُورت اختیار کر گیا ہے۔۔۔ میں نے زندہ رہنے کے لیے ایک ایک سانس کی بھاری قیمت ادا کی ہے اور ان فرنگی درندوں کا چہرہ ہر وقت میری آنکھوں کے سامنے گھومتا رہتا ہے۔ جو میری جوانی تباہ و برباد کر کے مجھے ایک اخباثی موذی مرض میں مبتلا کر گئے۔ اُن سے آزادی حاصل کرنے کے بعد میں نے ایک بستی کا رُخ کیا تھا مگر وہاں کے لوگوں نے میری بگڑی ہُوئی حالت دیکھ کر میرے ساتھ بہت بُرا برتاؤ کیا اور مجھے پتھر مار مار کر اپنی بستی سے نکال باہر کیا۔ اس کے بعد میں نے ایک دوسری بستی کا رُخ کیا اور وہاں کے ایک مشہور طبیب سے اپنا علاج کرانے کے لیے منت سماجت کی مگر اس نے یہ کہہ کر میرا دل توڑ دیا کہ میرا مرض اب لا علاج ہو چکا ہے۔ اب موت کے خوف ناک اور سرد ہاتھ ہی میری جسمانی اذیتوں کا خاتمہ کر سکتے ہیں۔"

عورت اپنی دردانگیز داستان سُنا کر خاموش ہو گئی مگر اس کی بھیانک اور تاثر انگیز باتوں کی بازگشت دیر تک میرے ذہن میں گونجتی رہی۔

"تم وادیِ خوف کے سردار داؤد کی بیٹی زرینہ تو نہیں ہو؟" میں نے اس کی داستان سُن کر اچانک ہی ایک سوال کر دیا۔

"ہاں۔۔۔" اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہُوئے جواب دیا: "میں سردار داؤد خان کی بدنصیب بیٹی زرینہ ہی ہوں مگر تم نے میرا نام کہاں سے سُن لیا؟ کیا اس ملاقات سے پہلے کبھی وادیِ خوف کا سفر کر چکے ہو؟"

"نہیں" میں نے نفی میں سر ہلاتے ہُوئے کہا: "میرا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

باباشالیار خان وادیِ خوف کا سفر کر چکا ہے۔ تمھارے باپ نے مرتے وقت میرے باباشالیار خان کو ایک امانت سونپی تھی جسے اس نے تمھارے سپرد کرنے کی تلقین کی تھی وہ امانت آج بھی میرے پاس موجود ہے۔ کیا تم اپنے باپ کی امانت وصول کر کے میرے کندھوں سے ایک بوجھ اُتارنے کا موقع دے سکتی ہو؟"

"میں اپنے پیارے بابا کا تحفہ ضرور وصول کروں گی۔" اس نے سوگوار انداز میں مُسکراتے ہُوئے جواب دیا: "مگر اس سے پہلے میں تمھارے بارے میں جاننا چاہتی ہوں کہ تم کون ہو۔ یہ باباشالیار کون تھا اور اس نے کس کے کہنے پر وادیِ خوف کا سفر کیا تھا۔ یہ سب کچھ ذرا تفصیل سے بتاؤ۔"

اس کی آواز میں ایک انجانی سی مسرت کی جھلک موجود تھی۔ وہ اپنے باپ کا ذکر سُن کر اپنی جسمانی تکلیف بھول گئی تھی۔

"میں مگوری قبیلے کے ایک معزز شخص، شالیار خان کا بیٹا ہُوں۔ والدین نے میرا نام شہباز رکھا تھا۔ جب ذرا بڑا ہُوا تو معلوم ہُوا کہ ماں باپ کے سائے سے محروم ہو چکا ہُوں اور مگوری قبیلے کا سردار میری پرورش کر رہا ہے۔ میری ماں موت کی میٹھی نیند سو رہی ہے اور میرا باپ باباشالیار فرنگیوں کی قید میں اپنی زندگی کے اذیت ناک دن گزار رہا ہے۔ مجھے اپنے بابا کے ہاتھوں کی لکھی ہُوئی ایک دستاویز ملی تھی جس میں وادیِ خوف کا ذکر شامل تھا اور اسی میں اس امانت کا ذکر بھی تھا جو تمھارے والد نے مرتے وقت بابا شالیار کو دی تھی۔" میں نے اختصار سے اسے اپنے بارے میں بتایا اور اس کی اُداس آنکھوں میں زندگی کی رمق تلاش کرنے لگا۔

"تم نام کے شہباز ہی نہیں ہو بلکہ حقیقتاً شہباز ہو۔" اس نے مجھے مخاطب کرتے ہُوئے کہا: "تم نے آج ایک طویل عرصے بعد میرے بابا کا نام لے کر میرے سوئے ہُوئے دُکھ کو پھر سے جوان کر دیا ہے۔" اچانک اس کی آواز بھرا گئی اور آنکھیں برسنے لگیں: "اب تم میرے بابا کی امانت مجھے دے دو۔ میں اپنی آنکھوں کی پیاس بجھانا چاہتی ہُوں۔"

"میں تمھاری یہ آرزو ضرور پوری کروں گا" میں نے مُسکراتے ہُوئے جواب دیا اور دیوار کے ساتھ رکھا ہُوا تھیلا ٹٹول کر برسوں سے رکھی ہُوئی امانت اس کی آنکھوں کے سامنے کر دی۔

یہ ایک رائفل کی گولی تھی جو برسوں سے میرے پاس امانت تھی۔ میں نے رائفل کی گولی اس کی پھیلی ہُوئی ہتھیلی پر رکھ دی جسے دیکھ کر اس کی آنکھیں مسرت سے چمکنے لگیں اور اس کا بگڑا ہُوا چہرہ مختلف رنگ بدلنے لگا۔۔۔ چند ساعتیں وہ اس گولی کو بڑی محبت اور عقیدت کے ساتھ دیکھتی رہی پھر اچانک کھسک کر آگ کے قریب ہو گئی۔

میں اس کی بدلتی ہُوئی کیفیت بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اسے خوش دیکھ کر میری افسردگی دُور ہونے لگی، جو چند لمحے پہلے اس کی دردناک داستان سُن کر میرے وجود میں سرایت کر گئی تھی۔

وہ لپکتے ہُوئے شعلوں کی روشنی میں بڑے غور سے گولی کا جائزہ لے رہی تھی جو اس کے باپ نے باباشالیار کو امانت کے طور پر دی تھی۔

اچانک اس نے کروٹ بدلی اور اپنی مٹھی کھول کر گولی مُنہ میں رکھ لی۔۔۔ اور اس کے ساتھ ہی بھڑکتی ہُوئی آگ میں کُود گئی۔۔۔

مجھے حیرت تھی کہ اتنی چستی اس کے ناتواں جسم میں کیسے آگئی۔۔۔ چند لمحوں تک میں ساکت کھڑا رہا پھر اچانک ہی مجھے ہوش آگیا۔ میں نے اُسے آگ سے بچانے کے لیے قدم اُٹھایا ہی تھا کہ ایک خوف ناک دھماکا ہُوا اور اس کی کھوپڑی کے ٹکڑے سارے غار میں پھیل گئے۔ اس کے ساتھ ہی اس کے جسم کے جلنے کی ناگوار بُو نتھنوں میں گھسنے لگی۔ اس کا جسم سُوکھی لکڑی کی طرح دھڑا دھڑ جل رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی گوشت کے جلنے کی تیز بدبُو سارے ہی ماحول کو کثیف بنانے لگی۔

اس کی موت نے مجھے سوگوار کر دیا۔

میں تھکے ہُوئے قدموں سے باہر نکل آیا۔

آسمان کی چھت ننھے مُنّے ستاروں سے بھری ہُوئی تھی اور چاندنی کی نرم روشن کرنیں ساری وادی میں موت کی خوف ناک پرچھائیوں کی طرح رقص کرتی ہُوئی محسوس ہُوئیں

زرینہ کے مصائب کی داستان بہت ہولناک اور بھیانک تھی اس کے ہیبت ناک انجام نے اسے اور بھی لرزہ خیز بنا دیا تھا۔

وادی میں چلتی ہوئی ہوائیں جب چٹانوں سے ٹکراتیں تو یوں محسوس ہوتا جیسے پوری وادی میں سسکیاں گونج رہی ہوں۔ زرینہ کی موت کا آخری منظر میری آنکھوں میں اس وقت تک پھرتا رہا... جب تک میں نے ڈھلوان عبور نہ کر لی...

ڈھلوان سے آگے ایک ٹیلے کے عقب میں کچھ سایوں کی نقل و حرکت دیکھ کر مجھے وہ دو فرنگی یاد آ گئے جنھیں جنرل ڈوگ نے میری نگرانی اور تعاقب کے لیے روانہ کیا تھا۔ میں بپھرے ہوئے شیر کی طرح دھاڑتا ہوا اچانک ان کے عقب میں پہنچ گیا اور دونوں کو اپنے ریوالور کی زد میں لے کر کہا۔ "اگر تم دونوں میں سے کسی نے بھی ہیرو بننے کی کوشش کی تو میں اسے زندگی کی قید سے آزاد کر دوں گا!"

میری زخمی شیر کی سی دھاڑ سن کر خوف اور دہشت سے ان دونوں کے چہرے منجمد ہو گئے... وہ آنکھیں پھاڑ کر مجھے حیرت سے گھورے جا رہے تھے جیسے ابھی ابھی کوئی بھیانک خواب دیکھ کر ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی ہوں۔

پھر اچانک ان میں سنبھلنے کے سے آثار پیدا ہوئے۔

ان میں سے ایک نے پشتو میں کہا: "ہم تو تمھارے بھائی ہیں۔ یہیں کے ایک قبیلے سے ہمارا تعلق ہے۔ ہم نے تمھارا کیا بگاڑا ہے جو تم ہمارے ساتھ اس طرح پیش آ رہے ہو؟"

میں نے گھوم کر اس کی پشت پر ریوالور کا دستہ مارا اور بلند آواز میں چلایا: "بزدلو! میں تمھارے منہ سے اصل بات سن چکا ہوں۔" میں نے سنبھلتے ہوئے دوسرے آدمی کو اپنے بھاری ہاتھ کا نشانہ بنایا تو وہ ریت کے تودے کی طرح دھپ سے زمین پر گرا اور التجائیں کرنے لگا۔

"تم سمجھتے تھے کہ میں گھوڑے سے گر کر بے ہوش ہو گیا ہوں مگر ذلیل انسانو! یہ سارا کھیل ایک سوچے سمجھے منصوبے کا نتیجہ تھا۔ تم لوگ ایک عیار قوم کے فرد ہو، جو کمزور قوموں کے سامنے بے حد زبردست اور طاقتور بن جاتے ہیں اور بھیگی بلی بن جاتے... تم ذہانت اور بہادری کو اپنی قوم کا بہترین ورثہ خیال کرتے ہو۔ حالانکہ تم بہادر نہیں بلکہ بزدل اور ظالم ہو۔ تمھارے سینوں میں دل کی جگہ پتھر کے ٹکڑے رکھے ہوئے ہیں جو صلح و آشتی کے جذبے سے محروم ہیں۔ تمھیں اپنی بہادری اور ذہانت پر بہت ناز ہے۔ میں تم دونوں کو میدان میں للکارتا ہوں۔ بزدلو! میں تمھیں غیر مسلح کر کے اور خود بھی غیر مسلح ہو کر تمھیں اپنے بازوؤں کی قوت سے کیفرِ کردار تک پہنچاؤں گا!"

اس کے ساتھ ہی میں نے ان کے ہولسٹر ہلکے کر دیے اور اپنا ریوالور بھی نکال کر کچھ دور پھینک دیا اور انھیں للکارا۔

دونوں بزدل میرے غیر مسلح ہوتے ہی نفرت کی آگ آنکھوں میں لیے آگے بڑھے اور مجھے گھیرے میں لینے کی کوشش کرنے لگے۔

میں نے ان کی آنکھوں میں عیار لومڑی کی سی چمک محسوس کر لی تھی۔

ان میں سے ایک اچانک جھکا اور ایک پتھر اٹھا کر میری جانب زور سے اچھال دیا... بھاری پتھر میری پیشانی کو زخمی کرتا ہوا نشیب میں لڑھک گیا۔

ابھی میں اس اچانک چوٹ سے سنبھلنے بھی نہیں پایا تھا کہ دونوں مجھ سے چمٹ گئے۔

... پھر انھوں نے مجھ پر گھونسوں کی بارش کر دی۔

اس اچانک افتاد سے میری آنکھوں کے سامنے نیلے پیلے دائرے رقص کرنے لگے اور سر کے پچھلے حصے میں بے پناہ درد کی ٹیسیں کروٹیں لینے لگیں۔

میں گرتے گرتے سنبھلا اور اپنے ایک حریف کے جبڑے پر ایک گھونسا رسید کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

گھونسا کھا کر وہ جونہی پلٹا میں نے شانے کی ہڈی پر کڑی ہتھیلی کا وار کر کے اس کا شانہ ہمیشہ کے لیے ناکارہ کر دیا۔

اس کے حلق سے ایک دلخراش چیخ ابھری اور کٹے ہوئے درخت کی طرح زمین چاٹنے لگا۔

دوسرا اس وقفے سے فائدہ اٹھا کر مجھ سے چند قدم دور چلا گیا اور چلا کر کہنے لگا: "ہم لوگوں نے تمھارے ساتھ احسان کیا ہے۔ کیا تم لوگ اپنے محسنوں کا بدلہ اسی طرح اتارتے ہو؟"

"احسان تم نے نہیں، میں نے تم پر کیا تھا کہ تمھیں پہلی مرتبہ اپنے تعاقب میں پا کر زندہ چھوڑ دیا مگر تم لوگ احسان ناشناس قوم کے فرد ہو۔ عیاری اور مکاری کو ذہانت کا نام دے کر دوسری قوموں کو مستقل فریب میں مبتلا کیے ہوئے ہو۔ میں تم دونوں کی جان لے کر اس معصوم اور بے گناہ عورت کا انتقام لینا چاہتا ہوں جنھیں تمھاری قوم کے افراد نے زندہ درگور کر دیا تھا۔ اس کے ساتھ اس قدر وحشیانہ سلوک کیا گیا کہ وہ کوڑھ کے موذی مرض میں مبتلا ہو کر اپنی زندگی سے مایوس ہو گئی اور بالآخر موت کی دہلیز پار کر گئی!"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے آگے بڑھ کر ایک گھونسا اس کی کنپٹی پر رسید کیا اور جونہی وہ زمین پر گرا، میری پے در پے ٹھوکریں اس کے وجود کو ریزہ ریزہ کرنے لگیں۔

اس نے نیم بے ہوشی کے عالم میں دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی کوشش کی لیکن وہ اپنے قدم نہ جما سکا اور ڈھیر ہو گیا۔

اب اس کا دوسرا ساتھی بھی آہستہ آہستہ اپنے وجود کو حرکت دے رہا تھا۔ غالباً وہ ہوش میں آ رہا تھا۔

میں نے اسے حواس بحال کرنے کا پورا موقع دیا۔

ہوش میں آنے کے بعد اس کی پھٹی پھٹی آواز میری سماعت سے ٹکرائی، وہ کہہ رہا تھا۔

"شہباز! ہمیں معاف کر دو۔ ہمیں جان سے نہ مارو، ہم وعدہ کرتے ہیں کہ تمھارا تعاقب نہیں کریں گے اور واپس چلے جائیں گے، چاہے جنرل ہمارا کورٹ مارشل ہی کیوں نہ کر دے۔"

"بزدلو... تمھاری قوم جہاں بھی فاتح کی حیثیت سے قدم رکھتی ہے۔ وہاں کے مظلوم انسانوں کو کبھی معاف نہیں کرتی۔ ان کے ساتھ ایسا بھیانک اور ہولناک سلوک روا رکھتی ہے کہ انسانیت شرم سے اپنا منہ چھپانے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ تم لوگ موت کے سوداگر ہو۔ اگر آج تقدیر کی خوبی یا خرابی سے تمھارا موت سے سامنا ہو گیا ہے تو بزدلوں کی طرح جان بچانے کی فکر کرنے لگے ہو؟" میں نے عالمِ جنوں میں دونوں کو اپنی ٹھوکروں پر رکھ لیا۔

ان کی چیخیں گونجنے لگیں...

"مجھے موت کی نیند سلائے بغیر تم لوگ یہاں سے زندہ نہیں جا سکتے... آگے بڑھو اور مردانہ وار موت کا مقابلہ کرو۔ التجائیں کرنا عورتوں کا کام ہے!"

میرے اکسانے پر دونوں میں نہ جانے کہاں سے قوت آ گئی اور وہ ایک بار پھر مجھ پر اندھا دھند گھونسوں کی بارش کرتے ہوئے مجھے زیر کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ جونہی ان میں مقابلے کی سکت بڑھی، میں نے ان میں سے ایک کی ناک پر گھونسا رسید کر کے اس کی ناک کی ہڈی توڑ دی۔

ناک کا بانسا ٹوٹتے ہی اس کے نتھنے خون اگلنے لگے۔

اسی دوران دوسرے کو ایک مرتبہ پھر میری جانب پتھر اچھالنے کا موقع مل گیا۔

پتھر میری کھوپڑی سے دھپ کی آواز کے ساتھ ٹکرایا۔

مجھے اپنے سر سے چنگاریاں پھوٹتی محسوس ہوئیں۔

چند لمحوں میں میں نے اپنے اوسان بحال کیے...

اس مختصر وقفے میں وہ دوسرا پتھر میری جانب اچھالنے ہی والا تھا کہ میں نے پھرتی سے دائیں جانب ہو کر اس کے جبڑے پر ایک زوردار گھونسا جما دیا۔

تڑاخ کی آواز کے ساتھ اس کا جبڑا لٹک گیا۔

وہ لڑکھڑاتا ہوا دوبارہ زمین بوس ہو گیا۔

میں نے ان دونوں کے گریبان پکڑے اور انھیں گھسیٹا اور اسی غار کی جانب بڑھنے لگا، جہاں زرینہ نے آگ میں جل کر خودکشی کی تھی۔

ان میں سے ایک کا جبڑا کھول کر میں نے ریوالور کی ایک گولی اس کے حلق میں ٹھونس دی اور بھڑکتے ہوئے الاؤ میں پھینک دیا۔

ایک دلخراش چیخ ابھری...

ساتھ ہی ایک ہلکا سا دھماکا سنائی دیا۔

اس کی کھوپڑی کے چیتھڑے اڑ چکے تھے۔

... پھر یہی سلوک میں نے دوسرے کے ساتھ بھی کیا۔

ان دونوں کو موت کے سپرد کر کے میں نے خود کو خاصا پرسکون محسوس کیا تھا۔ ان کے جسم دھڑا دھڑ جل رہے تھے اور گوشت جلنے کی ناگوار بو فضا میں ایک بار پھر پھیل رہی تھی۔

جب میں دوبارہ اس غار سے باہر آیا تو رات اپنا آدھے سے زائد سفر طے کر چکی تھی۔

ہر طرف ایک گھپ گھٹا ٹوپ اندھیرا مسلط تھا۔

گھوڑے کی کمی بڑی شدت سے محسوس ہونے لگی۔

یخ بستہ جھاڑیوں میں اُترنے لگی تو میں نے پہاڑ کی ایک کھوہ کو اپنا مسکن بنا کر آگ روشن کر لی اور اس کی زندگی بخش حرارت سے اپنے وجود کو سردی کی تیز لہروں سے محفوظ رکھتے ہوئے صبح کا انتظار کرنے لگا۔ میں ایک پتھر سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گیا اور بھڑکتی ہوئی آگ کے شعلوں کو گھورنے لگا۔

اس وقت میرا ذہن ناخوشگوار یادوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ یہ رات مجھے عام راتوں کی نسبت سے زیادہ تاریک اور طویل محسوس ہوئی۔ تمام رات خوف ناک پرچھائیاں شعلوں کی صورت میں میری آنکھوں کے سامنے تیرتی رہیں اور ماضی کی دلخراش یادوں کا زہر وجود میں گھلتا رہا۔

فضا میں دودھیا اُجالا نمودار ہونے لگا مگر میری آنکھیں نیند سے محروم رہیں۔

رات بھر جاگتے رہنے کی وجہ سے سر میں ہلکا سا درد ہونے لگا تھا۔ میں غار سے باہر نکل آیا اور ایک بلند ٹیلے پر کھڑے ہو کر میں نے وادی کی جانب نظریں دوڑائیں تو مجھے اپنا گھوڑا کافی فاصلے پر درختوں کے درمیان نظر آ گیا۔

اچانک مجھے خیال آیا کہ میں نے جن فرنگیوں کو رات موت کے گھاٹ اتارا تھا، ان کے گھوڑے یہیں کہیں قریب ہی ہونے چاہئیں۔ میں ایک دوسرے ٹیلے کی جانب بڑھا، جہاں مجھے یہ شک تھا کہ دشمن نے اپنے گھوڑے اس بلند ٹیلے کے عقب میں ہی چھپائے ہوں گے۔

میں چکر کاٹ کر اوپر پہنچا تو اچانک گھوڑے کی ہنہناہٹ سُن کر میری رفتار میں تیزی آ گئی۔

قریب ہی ایک جھاڑی سے بندھے ہوئے دونوں گھوڑے موجود تھے...

ان میں سے ایک میں نے اپنے لیے منتخب کر لیا اور دوسرے کو آزاد کر کے اسے دوسری جانب ہنکا کر میں گھوڑے پر سوار ہوا اور گھاٹیوں کی سمت چل پڑا جن سے کچھ فاصلے پر ایک بستی موجود تھی اور یہی بستی میری پہلی منزل تھی۔

تقریباً دو گھنٹے کے تیز رفتار سفر کے بعد بستی کے آثار نمودار ہوئے۔ میں نے بستی کے کنارے ایک چشمے پر اپنا گھوڑا روک لیا اور لباس اُتار کر رات بھر کی تھکن اپنے بدن سے دور کرنے لگا۔

جب بستی کی سرائے کے دروازے پر میں نے اپنا گھوڑا روکا تو میری طبیعت بشاش تھی۔ چشمے کے پانی میں نہانے سے میری ساری تھکن اُتر چکی تھی۔ گھوڑا میں نے سرائے کے ملازم کے حوالے کیا اور اسے چارہ ڈالنے کی تاکید کرتا ہوا سرائے کے وسیع کمرے میں آ گیا، جہاں خاصی رونق نظر آ رہی تھی اور مختلف میزوں کے گرد بیٹھے ہوئے لوگ قہوے کے گھونٹ اپنے حلق میں اُتارتے ہوئے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔

اچانک مجھے محسوس ہوا جیسے کچھ لوگوں کی آنکھیں میرا گہری نظروں سے جائزہ لے رہی ہیں۔

میں نے روپوں سے بھرا ہوا تھیلا ایک چارپائی پر رکھا، اور اسے سرہانے کے طور پر استعمال کرتے ہوئے ان اجنبیوں کے چہروں کا جائزہ لینے لگا۔

ان کی نظریں میرے وجود کو چھید رہی تھیں۔

اچانک مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں ان لوگوں کو پہلے بھی کہیں دیکھ چکا ہوں۔

... پھر میرے ذہن میں ایک دھماکا ہوا اور مجھے یاد آ گیا کہ یہ وہی لوگ ہیں، جنھیں میں رہزن اور لٹیرے سمجھ کر ایک ٹیلے کے عقب میں روپوش ہوتے دیکھا تھا۔

ان میں سے ایک شخص اپنی اکڑی ہوئی مونچھوں کے ساتھ مسلسل میری سمت گھورے جا رہا تھا اور اس کے چہرے پر خطرناک تاثرات منجمد ہو گئے تھے۔

میں نے سرائے کے ملازم کو قہوہ اور ناشتہ لانے کے لیے کہا اور بے نیازی سے چارپائی پر اپنے پاؤں پھیلا کر سرائے کی دوسری دلچسپیوں میں ڈوبنے لگا۔

سرائے میں ان کے علاوہ دوسرے لوگ بھی موجود تھے جو قہوہ پینے کے دوران باتوں میں مشغول تھے۔

قہوے کے گرم گھونٹ اپنے حلق میں اُنڈیلتے ہوئے میں چور نظروں سے ان لوگوں کی حرکات و سکنات کا جائزہ لیتا رہا جو سرائے کے پُرسکون ماحول میں کسی ہنگامے کا باعث بن سکتے تھے۔ اس وقت ان کے کچھ ساتھی موجود نہیں تھے۔ ان میں سے چار کہیں گئے ہوئے تھے اور باقی چاروں سرائے میں قہوے سے اپنا دل بہلانے کی کوشش کر رہے تھے... ان کی بھٹکتی نظریں بار بار سرائے کے دروازے کی طرف اُٹھ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رہی تھیں۔ اس طرح میں نے اندازہ لگایا کہ ان کے کچھ ساتھی کسی مہم کا کوئی خطرناک مرحلہ طے کرنے کہیں گئے ہوئے ہیں، اور سرائے میں بیٹھے بقیہ ساتھی بڑی بے چینی سے ان ساتھیوں کا انتظار کر رہے ہیں۔ ان میں سے ہر شخص کے چہرے پر درندگی اور سفاکی کی سینکڑوں داستانیں تحریر نظر آتی تھیں۔ ان میں بھاری مونچھوں والا دراز قد آدمی بار بار میری جانب گھورتا ہوا اپنے ساتھیوں کی جانب معنی خیز نظروں سے دیکھنے لگتا۔ اس کی گستاخ نگاہیں میرے غصے میں برابر اضافہ کر رہی تھیں۔

میں نے امن پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی توجہ ان لوگوں کی جانب سے ہٹا دی اور قہوے کے برتن ایک طرف سمیٹ کر سرائے کے مالک کی طرف دیکھنے لگا... جو ایک جانب براجمان ہر طرف چوکنی نظروں سے ... نگرانی جاری رکھے ہوئے تھا۔

اچانک کچھ گھوڑوں کی ٹاپیں سرائے کے دروازے پر آ کر رُک گئیں۔

چار گھڑ سوار اُتر کر سرائے کے اندر آ گئے۔

ان کے درمیان ایک سفید ریش بوڑھا، ایک سات سالہ بچے کا ہاتھ تھامے ہوئے ان کے ساتھ ہی اندر آیا۔

بوڑھے کی حالت بہت خستہ تھی۔

اس کی پگڑی اُتر کر گلے میں پڑی ہوئی تھی اور سارا لباس دھول میں اَٹا ہوا تھا۔ بوڑھے کی خاموش آنکھوں سے افسردگی کے آثار جھلک رہے تھے۔

اس کی یہ کیفیت دیکھ کر میرے دل میں ہمدردی کی ایک تیز لہر اُبھری... بوڑھے اور بچے کو ایک چارپائی پر جگہ دے دی گئی۔ دوسرے تمام لوگ گھیرا ڈال کر ان دونوں کے اردگرد بیٹھ گئے۔

بوڑھے کو ان خطرناک لوگوں کے حصار میں دیکھ کر میرے ذہن میں خطرے کی سُرخ بتی روشن ہو گئی۔

اچانک میں نے یوں محسوس کیا جیسے سرائے کا ہنگامہ خیز ماحول گہری خاموشی اور سکوت میں ڈوب گیا ہے... سرائے میں موجود ہر شخص کی نظریں ان خطرناک لوگوں پر جمی ہوئی تھیں جیسے کسی متوقع حادثے کے منتظر ہوں۔

میری دلچسپی ان لوگوں میں بڑھتی جا رہی تھی۔

سرائے کے ملازم نے ان سب لوگوں کے آگے قہوہ رکھا اور وہ قہوے سے لطف اندوز ہونے لگے۔ اب رفتہ رفتہ سرائے کا وسیع کمرہ خالی ہوتا جا رہا تھا۔ لوگ مالک کو ادائیگی کر کے خاموشی سے کھسکتے جا رہے تھے۔

... پھر وہ کمرہ خالی ہو گیا۔

میں اپنی چارپائی پر پاؤں پھیلائے سرائے کے خالی کمرے کو گھورتا ہوا اپنی جگہ پر جما رہا...

خاموشی اور سکوت کا وقفہ طویل ہوتا جا رہا تھا...

اچانک بدمعاشوں میں سے ایک نے میدان صاف کر سفید ریش بوڑھے سے سلسلۂ کلام شروع کیا۔

ان کے ایک جسیم ساتھی نے اپنی موٹی گردن کو حرکت دیتے ہوئے بوڑھے کو مخاطب کر کے کہا۔

"جلال بابا! اب بھی وقت ہے کہ تم ہمیں حاضر خان کا خفیہ ٹھکانا بتا کر اپنی جان کو محفوظ کر سکتے ہو اور حاضر خان کا یہ کمسن بیٹا گلریز خان اس وقت تک ہمارے پاس یرغمال رہے گا، جب تک حاضر خان خود ہم سے ملنے کا ارادہ نہیں کر لیتا۔" اس کے پست لہجے میں درندگی اور سفاکی جھلک رہی تھی، جو اس بات کی غماز تھی کہ یہ شخص اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کسی بے گناہ انسان کے خون سے اپنے ہاتھ رنگین کرنے سے بھی گریز نہیں کرے گا۔

میری ہمدردیاں اس سفید ریش بوڑھے کے ساتھ تھیں مگر پہلے میں اس صورتِ حال کے پس منظر سے آگاہ ہونا چاہتا تھا، جس کے تحت یہ لوگ کسی حاضر خان کو تلاش کر رہے تھے، اپنی تلاش میں ناکام ہو کر ایک بوڑھے اور کمسن بچے کو پکڑ لائے تھے۔

"گل مست خان!" بوڑھے جلال بابا نے جواب دیتے ہوئے کہا "یہ بات میں ہی نہیں تم بھی جانتے ہو کہ حاضر خان کبھی اپنی سرگرمی سے کسی کو قبل از وقت آگاہ نہیں کرتا۔ اس کے مخصوص ساتھیوں کے علاوہ کوئی بھی اس بات سے آگاہ نہیں ہے کہ وہ اس وقت کہاں ہو گا۔ تم نے اس کی غیر موجودگی میں اس کے بچے گلریز خان کو اٹھا کر مستقل دشمنی کی بنیاد ڈالی ہے تو یاد رکھو، اگر تم لوگوں نے مجھے یا اس بچے گلریز کو کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو حاضر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کا انتقام بہت خوف ناک ہوگا اور تمھیں اپنے خاندان کے بہت سے لوگوں کی زندگیوں سے ہاتھ دھونا پڑیں گے۔"

بوڑھے جلال بابا کا شجاع چہرہ جذبات کی شدت سے سُرخ ہو رہا تھا اور اس کی تھکی ہُوئی بوڑھی آواز بتدریج بلند ہو رہی تھی۔

"ابھی تک کسی ماں نے ایسا فرزند پیدا نہیں کیا جو گل مست خان کی بندوق کا سامنا کر سکے۔" موٹی گردن والے جسیم آدمی نے اپنے تنے جیسے موٹے بازو فضا میں بلند کرتے ہُوئے جواب دیا۔ "میں دیکھوں گا کہ حاضر خان کیسے آپ تم دونوں کو میری گرفت سے آزاد کراتا ہے۔ میں نے تمھارے ساتھ رحم دلی کا سلوک کرنے کا فیصلہ کیا تھا مگر تم نے دھمکیاں دے کر اپنے لیے خود ہی ایک سزا تجویز کر لی ہے۔"

"گل مست خان! ابھی وقت ہے، جو کچھ تم کر رہے ہو، اس کے نتائج پر خوب اچھی طرح غور کر لو۔ طاقت کے نشے میں یہ مت بھولو کہ خدا بہت بڑا اور بڑی طاقت والا ہے۔ اگر تم بے گناہ انسانوں کو ستانے پر اُتر آئے ہو تو سمجھ لو کہ تمھارے دن گنے جا چکے ہیں۔" بوڑھے جلال نے بے خوف ہو کر جواب دیا۔ "اگر تم نے بے گناہوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگین کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے تو اس بات کو یاد رکھنا کہ قدرت کا انصاف پسند ہاتھ تم سے زیادہ دُور نہیں ہے۔"

اچانک گل مست خان کے ایک ساتھی نے اپنے ہاتھ بڑھا کر بوڑھے جلال کے گلے میں پڑی ہُوئی پگڑی کو جھٹکا دے کر اپنی جانب کھینچا۔

بوڑھے جلال کا سر چارپائی کے پائے سے ٹکرا کر رنگین ہو گیا اور اس کے چہرے پر خون کی دھار بہنے لگی۔

اچانک سرائے کے مالک کے بھدے بدن میں جنبش ہُوئی۔ وہ اپنی مخصوص کرسی سے اُٹھا اور ان لوگوں کے قریب آ کر بولا۔ "اپنے سارے جھگڑے سرائے کے باہر جا کر طے کرو۔ تم لوگوں کی حرکتوں کی وجہ سے میرا کاروبار متاثر ہو رہا ہے۔ جلال بابا اس بستی کا ایک معزز انسان ہے۔ میں تمھیں اس بات کی اجازت نہیں دے سکتا کہ تم سرائے کی چار دیواری میں بوڑھے جلال کی توہین کرو اور میں خاموش رہوں۔"

سرائے کے سارے ملازم بھی اس کے قریب آ کر کھڑے ہو گئے اور اپنے مالک کی تائید میں بولنے لگے۔

"تم شاید اپنی زندگی سے تنگ آ چکے ہو، افسر خان۔ . ." گل مست خان زہریلے ناگ کی طرح پھنکارتا ہُوا بولا اور اس نے اپنا ریوالور نکال کر سب کو اپنے ریوالور کی زد میں لے لیا۔

صورتِ حال دلچسپ اور خطرناک شکل اختیار کرتی جا رہی تھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے گل مست خان ان میں سے کسی کو ہلاک کر دے گا لیکن اچانک اس کے چہرے کا تناؤ کم ہُوا۔ اس نے اپنا ہاتھ نیچے کرتے ہُوئے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "اس بوڑھے اور بچے کو باندھ کر گھسیٹتے ہُوئے بستی میں گھماؤ۔ میں دیکھوں گا کہ اس بستی میں کون میرا راستہ روکنے کی کوشش کرتا ہے۔" پھر وہ سرائے کے مالک سے مخاطب ہُوا۔ "اور تم خاموشی سے اپنے ملازموں کی فوج لے کر دوبارہ اپنے کاموں میں مشغول ہو جاؤ۔ ہم تمھارے ساتھ کوئی زیادتی کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے اور نہ ہی تمھاری مداخلت ہمارے ارادے تبدیل کر سکتی ہے لیکن۔ . . اگر ہمارے ارادوں میں تبدیلی آ گئی تو ہم تمھاری لاشیں گرانے اور سرائے کو آگ لگانے سے گریز نہیں کریں گے۔ وقت کے تقاضوں کو سمجھو اور ہم سے اُلجھنے کی کوشش نہ کرو ورنہ سرائے کسی ویران اور سنسان قبرستان کی طرح ہمیشہ کے لیے غیر آباد ہو جائے گی۔"

سرائے کا مالک افسر خان اپنے کندھے جھٹکتا ہُوا دوبارہ اپنی مخصوص کرسی پر جا بیٹھا اور اس نے ہاتھ کے اشارے سے اپنے ملازموں کو منتشر ہونے کے لیے کہا۔

"افسر خان۔ . ." گل مست خان نے ایک مکروہ قہقہہ فضا میں منتشر کرتے ہُوئے کہا۔ "مجھے اس بات سے دلی مسرت ہُوئی ہے کہ تم نے ہمارے معاملات میں مداخلت کرنے کا ارادہ ترک کر دیا ہے، ورنہ شاید یہاں خون کی ندیاں بہہ جاتیں مگر تمھارے دانش مندانہ فیصلے نے سرائے کو جہنم بننے سے بچا لیا۔"

گل مست خان اور اس کے ساتھی اپنی اس عارضی فتح پر بہت خوش نظر آ رہے تھے۔

"چلو دوست!" گل مست خان نے اپنے ساتھیوں کو اُٹھنے کا اشارہ کرتے ہُوئے کہا۔ "بہت دن ہو گئے ہیں میری آنکھوں نے کوئی دلچسپ تماشا نہیں دیکھا۔"

ان کے ایک ساتھی نے پگڑی کو جھٹکا دے کر جلال بابا کو زبردستی اُٹھا دیا۔

سہما ہُوا بچہ اس کے اُٹھتے ہی خاموشی سے اُن کے ساتھ چل پڑا۔ وہ اپنی خوب صورت اور معصوم آنکھوں سے کبھی حیرت سے بوڑھے جلال کا چہرہ گھورنے لگتا اور کبھی اس کی خوف زدہ نظریں اُن بدمعاشوں کی جانب یُوں اُٹھ جاتیں جیسے اسے یقین ہو کہ یہ لوگ اس کے ساتھ رحم دلی اور محبت سے پیش آئیں گے۔

بدمعاشوں کی خطرناک ٹولی جونہی سرائے کا دروازہ پار کر کے باہر نکلی، میں ایک دم حرکت میں آ گیا۔

میں نے روپوں کا بھرا ہُوا تھیلا اُٹھا کر سرائے دار کی میز کے اوپر رکھ دیا اور کہا۔

"میری امانت سنبھال کر رکھو۔ میں ابھی ان لوگوں سے نمٹ کر واپس آؤں گا اور اپنی امانت لے لوں گا۔"

"نوجوان۔ . ." سرائے دار سرگوشی میں بولا۔ "میں نہیں جانتا کہ تم کون ہو۔ گل مست اور اس کے ساتھیوں نے ایک عرصے سے اس علاقے کے لوگوں کا جینا حرام کر رکھا ہے۔ وہ اپنے مقابلے پر آنے والے لوگوں کے ساتھ بڑی عیاری اور سنگ دلی کا سلوک کرنے کے عادی ہیں۔ تم تنہا ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ بے کار اپنی زندگی خطرے میں کیوں ڈال رہے ہو؟"

"تمھاری نصیحت کا شکریہ۔" میں نے سرائے کے باہر نکلتے ہُوئے جواب دیا۔ "کسی مظلوم انسان کی مدد کرتے ہُوئے میں دشمنوں کی کثرت اپنے لیے کوئی خطرہ نہیں سمجھتا۔"

اُس نے میرا تھیلا اُٹھا کر میز کے پیچھے چھپا لیا۔

میں اپنا ریوالور سنبھالتا ہُوا باہر آ گیا۔

سرائے کے باہر ان ظالموں نے بوڑھے اور بچے دونوں کے ہاتھ ایک رسّی سے باندھ کر ایک گھوڑے کی زین سے باندھ دیے تھے اور اپنے گھوڑے دوڑاتے ہُوئے انھیں گھسیٹ رہے تھے۔ بستی کے بوڑھے اور بچے سب دُور کھڑے ان ظالموں کو خوف زدہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

میں نے اپنا ریوالور نکال کر رسّی کو نشانہ بناتے ہُوئے بوڑھے اور بچے کو ایک ساتھ آزاد کر دیا۔

. . . پھر میں نے اُسی گھڑ سوار کی پُشت میں گولی اُتار دی جو انھیں اپنے گھوڑے کے ساتھ باندھ کر بڑے فخر سے گھسیٹ رہا تھا۔

ابھی اس کے دوسرے ساتھی اس اچانک صورتِ حال کو سمجھ بھی نہ پائے کہ میں نے ان کے مزید تین آدمی گرا دیے اور بقیہ اپنے گھوڑے بھگاتے ہُوئے میرے پستول کی زد سے نکل چکے تھے۔

میں فوراً اپنے گھوڑے کی طرف بڑھا اور اس پر سوار ہو کر بھگوڑے بدمعاشوں کا پیچھا کرنے لگا۔

کچھ دور جا کر وہ اچانک پلٹے۔ . .

پھر اپنے ریوالور نکال کر انھوں نے مجھ پر اندھا دُھند فائرنگ شروع کر دی۔

فائرنگ کی وجہ سے بستی کا میدان ویران ہو گیا۔

لوگ اپنے گھروں میں چھُپ کر دروازے بند کرنے لگے۔

میں نے اپنا گھوڑا ایک درخت کی آڑ میں کر لیا اور گل مست خان کی موٹی گردن کا نشانہ لے کر دو فائر کیے۔ . .

پہلی گولی اس کی گردن کے پار ہو گئی۔

اور دوسری گولی نے اس کی کھوپڑی کے پرخچے اُڑا دیے۔

گل مست خان کے ساتھیوں نے جب اس کی لاش گھوڑے سے گرتی دیکھی تو وہ سب خوف زدہ ہو کر بھاگ نکلے۔

. . . میں نے بھاگتے ہُوئے دشمنوں پر اپنا ریوالور خالی کر دیا اور اپنا گھوڑا روک کر خالی چیمبر دوبارہ گولیوں سے بھرنے لگا۔

میں نے دُور تک اُن کا پیچھا کیا۔

آخرکار وہ گھوڑے بھگاتے ہُوئے وادی کی ڈھلوانوں میں غائب ہو گئے۔

پھر میں نے ریوالور ہولسٹر میں ڈالا اور اپنے گھوڑے کا رُخ بستی کی طرف موڑ لیا۔

میرے واپس آنے تک سرائے کے سامنے لوگوں کا ایک ہجوم لگ چکا تھا۔ بوڑھا جلال اور ننھا گلریز ان لوگوں کے درمیان موجود تھے اور گل مست خان کی لاش کو نفرت و حقارت سے گھور رہے تھے۔

"تم کون ہو نوجوان؟" بوڑھا جلال گرم جوشی کا اظہار کرتے ہُوئے میری جانب لپکا۔ "تم نے گل مست اور اس کے ساتھیوں کو جہنم رسید کر کے آس پاس کی بستیوں پر بہت بڑا احسان کیا

ہے۔ تمھاری بروقت مداخلت نے میری اور گلریز خان کی جان بچا کر میرے بوڑھے کندھوں پر احسان کا ایک بھاری بوجھ لاد دیا ہے کیا میں اپنے محسن کا نام دریافت کرسکتا ہوں؟"

"مجھے شہباز کہتے ہیں۔ گکھڑی قبیلے سے تعلق رکھتا ہوں۔" میں نے لوگوں کی ستائشی نظروں کو نظر انداز کرتے ہوئے جواب دیا۔ "مگر یہ حاضر خان کون ہے اور تمھارا اُس سے کیا رشتہ ہے؟"

"حاضر خان!" بوڑھے نے فخریہ لہجے میں کہا۔ "میرا داماد اور میرے مرحوم بھائی کی نشانی ہے۔ آج کل اس نے انگریزوں کے خلاف اپنا علمِ جہاد بلند کر رکھا ہے۔ حاضر خان اور اس کے ساتھی فرنگیوں کو نقصان پہنچانے کے لیے آئے دن سفر کرتے رہتے ہیں۔ گل مست خان فرنگیوں کا پالتو کتا تھا جو حاضر خان کو گرفتار کرنے کے لیے دن رات اپنی سر توڑ کوششوں میں لگا ہوا تھا مگر جس طرح کسی خوشبو کو ایک مقام پر قید نہیں کیا جاسکتا، اسی طرح بہادر لوگ بھی خدا کے سائے میں بستے ہیں۔"

"اب مجھے ان کی موت کا کوئی افسوس نہیں ہے۔" میں نے پُرسکون انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ "جو لوگ اپنی قومیت بھول کر اپنے خون کے ساتھ غداری کرنے پر اُتر آئیں، ان کی موت پر کوئی بھی آنسو نہیں بہایا کرتا۔ یہ غدار تھے اور آج قدرت کے ابدی قانون کے مطابق اپنے انجام کو پہنچ گئے۔"

اتنے میں سرائے دار نے باہر آکر مجھے اندر آنے کی دعوت دی اور میں جلال بابا کو ساتھ لے کر دوبارہ سرائے کے پُرسکون ماحول میں آگیا۔

سرائے دار قہوے کے ساتھ کچھ پھل بھی لے آیا اور میرے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ "تم نے جس دلیری اور ثابت قدمی سے خطرناک دشمنوں کا صفایا کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تم کوئی نامور جنگجو ہو۔ میں تمھاری اس امداد پر ساری بستی کی طرف سے تمھارا شکریہ ادا کرتا ہوں اور تمھارے مجاہدانہ عزم کو سلام کرتا ہوں۔ اگر جلال بابا کو کوئی نقصان پہنچ جاتا تو ساری بستی کے لیے یہ نقصان عظیم ہوتا۔ تمھاری بروقت مداخلت نے بستی کے ایک بزرگ کی جان بچائی ہے۔ ساری بستی گل مست خان اور اس کے ساتھی بدمعاشوں کی موت سے خوش ہے اور تمھاری ذات کو خراجِ تحسین پیش کرتی ہے۔"

"افسر خان!" میں نے اسے سنجیدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "ایک معزز انسان کو ذلیل ہونے سے بچانا میرا فرض تھا۔ تم لوگ میری اس قدر تعریف نہ کرو کہ میں خود کو فوق الفطرت انسان سمجھ کر غلط فہمی کا شکار ہو جاؤں۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ میں نے دو بے گناہوں کو ظلم کا نشانہ بننے سے بچا لیا ہے۔ میں دشمنوں کی طرف سے غفلت برتنے کا عادی نہیں ہوں۔ یہی میری کامیابی کا راز ہے۔ اب میں تم لوگوں سے رخصت ہو جانا چاہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ کچھ دُور جا کر جب گل مست خان کے بھگوڑے ساتھی سنبھلیں گے اور اپنے نقصان کا جائزہ لیں گے تو مجھ سے انتقام لینے کا وحشت انگیز خیال انھیں بے چین کر دے گا۔ میں اس پُرسکون بستی کی فضا میں آگ اور بارود کا کثیف دُھواں نہیں دیکھنا چاہتا۔ میری منزل ابھی دُور ہے اور میں جلد از جلد اپنی منزل کے قریب تر ہونا چاہتا ہوں۔"

میری بات ختم ہوتے ہی سرائے دار اٹھا اور دروازے کے پیچھے سے افغانی روپوں سے بھرا تھیلا اٹھا لایا اور بولا۔ "شہباز خان تمھاری دوبارہ اس بستی میں آمد ہمارے لیے مسرت کا باعث ہوگی مگر روانہ ہونے سے پہلے اپنی امانت کی اچھی طرح جانچ پڑتال کر لو تاکہ بعد میں تمھیں کوئی شکایت پیدا نہ ہو۔"

"افسر خان..." میں نے مسکرا کر روپوں کا تھیلا اپنے قریب رکھتے ہوئے جواب دیا۔ "میں دوست اور دشمن کی پہچان کرنا خوب جانتا ہوں اور جن لوگوں کو اپنا دوست سمجھتا ہوں، ان سے کبھی بدگمان نہیں ہوتا۔ اگر مستقبل قریب میں کبھی دوبارہ میرا اِدھر سے گزر ہوا تو میں تمھاری سرائے میں ضرور آؤں گا۔"

جلال بابا اور سرائے دار نے بڑے خلوص سے مجھے رخصت کیا۔

میں نے بستی کی چکردار گھاٹی عبور کرکے اپنے گھوڑے کو زیریں جانے والے راستے پر ڈال دیا اور تیز رفتاری سے اپنی منزل کی طرف بڑھتا رہا...

شام کے سائے آہستہ آہستہ فضا میں اپنا تسلط جما رہے تھے کہ میں بلندی سے ڈھلوان کی طرف اپنا سفر طے کرنے لگا۔ اب میری نظریں آس پاس کے ماحول کا گہرے انداز سے جائزہ لے رہی تھیں اور ابھی تک مجھے کوئی ایسی موزوں جگہ نظر نہیں آئی تھی، جہاں دن بھر کا سفر تمام کر کے قیام کروں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اچانک ایک ٹیلے پر درختوں کے درمیان مجھے ایک جھونپڑی نما مکان نظر آیا... میں آہستہ روی سے اس جھونپڑی کی جانب بڑھتا رہا... پھر درختوں اور گھاس کے درمیان سے گزرتا ہوا جھونپڑی کی پشت پر پہنچ گیا۔

جھونپڑی سنسان اور غیر آباد تھی۔

میں نے ایک چکر کاٹ کر جھونپڑی کا جائزہ لیا...

یہ جھونپڑی مجھے ایک قلعے کی طرح محفوظ نظر آئی۔

میں نے گھوڑا ایک درخت سے باندھا اور ٹیلے پر پھیلی ہوئی گھاس کھود کر گھوڑے کے آگے ڈال دی اور محتاط انداز میں جھونپڑی میں داخل ہو گیا۔

جھونپڑی میں ایک طرف سوکھی لکڑیاں پڑی تھیں، جن کے قریب ہی کھانے پینے کی کچھ اشیا اور برتن نظر آرہے تھے۔ جھونپڑی کے ایک طرف کھدا ہوا گڑھا موجود تھا جس میں جلی ہوئی لکڑیوں کی راکھ موجود تھی۔ میں نے چند لکڑیاں گڑھے میں ڈال کر ماچس کی تیلی سے آگ روشن کر دی اور جھونپڑی میں گھاس کے بچھے ہوئے فرش پر دراز ہو کر اپنی تھکن اتارنے لگا۔ آگ کے لپکتے شعلوں کی حرارت نے جھونپڑی کی یخ بستہ فضا میں زندگی کی ایک نئی رُوح پھونک دی تھی۔ اب میں نے ان برتنوں کا جائزہ لیا تو ان میں قہوہ مل گیا۔ پاس ہی مٹی کے ایک برتن میں پانی بھی موجود تھا۔

میں نے گھڑے کا برتن اٹھا کر دیکھا تو پانی سے بدبو اور سڑاند اٹھ رہی تھی۔ میں نے جلدی سے اسے دوبارہ ڈھک دیا اور جھونپڑی سے باہر آگیا۔

پھر چاندنی کی روشنی میں آس پاس کوئی چشمہ تلاش کرنے لگا۔ یہاں چشمے کی موجودگی لازمی تھی کیوں کہ جھونپڑی بنانے والے نے انسانی ضرورتوں کا جائزہ لے کر ہی اسے بنایا ہوگا۔

جھونپڑی کی پشت پر لمبی لمبی گھاس اُگی ہوئی تھی... میں گھاس کے درمیان سے گزرتا ہوا ٹیلے کے دوسرے کنارے تک پہنچ گیا۔

نیچے چند قدم کے فاصلے پر قدرتی چشمہ اُبل رہا تھا۔

اس کا نتھرا ہوا پانی چاندنی کی نرم نرم کرنوں کو اپنے آپ میں سمو رہا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے چاندنی کی ایک چادر زمین پر بچھی ہوئی ہو...

میں نے واپس جھونپڑی میں آکر مٹی کے برتن سے غلیظ پانی پھینک دیا اور برتن لے کر دوبارہ چشمے پر آگیا۔

چند لمحوں بعد میں گرم قہوے سے لطف اندوز ہوتا ہوا صبح کے خونی واقعات کے بارے میں غور کرتا رہا۔ گل مست کے چار ساتھی فرار ہونے میں کامیاب ہو چکے تھے اور مجھے یقین تھا کہ اپنے دوسرے ساتھیوں کو جمع کر کے دوبارہ میری تلاش میں نکل آئے ہوں گے۔ ممکن ہے میری لاعلمی میں وہ میرے آس پاس ہی کہیں منڈلا رہے ہوں... سامنے آکر للکارنے کی تو ہمت نہیں کر سکتے مگر وہ تاریکی کا فائدہ اٹھا کر مجھ پر اچانک وار کر سکتے تھے۔ قہوہ ختم کر کے میں نے جھونپڑی سے باہر آکر آس پاس کا اچھی طرح جائزہ لیا اور گھوڑے کو پیار سے تھپکی دیتا ہوا دوبارہ جھونپڑی میں آگیا۔

گھوم پھر کر میں نے وہ جگہ منتخب کر لی تھی جہاں ہنگامی حالت کے تحت پناہ لی جاسکتی تھی۔ اس ٹیلے کے عقب میں ایک بلند چٹان موجود تھی جو حملہ آوروں سے بچنے کے لیے کسی قلعے کی طرح محفوظ تھی۔ میں نے ٹھنڈی پڑتی ہوئی آگ میں چند سوکھی ہوئی لکڑیاں اور ڈال دیں پھر اپنا روپوں سے بھرا ہوا تھیلا گھاس میں چھپا کر الاؤ کے قریب ہی دراز ہو گیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔

میں گہری نیند میں تھا...

اچانک گھوڑے کی مسلسل ہنہناہٹ نے مجھے بیدار کر دیا۔ گھوڑا ہنہناتے ہوئے بڑی بے قراری سے زمین پر ٹاپیں مار رہا تھا۔

عام طور پر سدھائے ہوئے گھوڑے اسی وقت ہی ایسی دُہری آوازیں نکالتے ہیں، جب اچانک ہی اپنے قریب کوئی خطرہ محسوس کریں۔

میں نے گھاس میں چھپا ہوا تھیلا نکالا اور پوری توجہ سے اپنی رائفل کے مختلف حصّوں کا جائزہ لیا... اور تھیلا اپنی پشت پر باندھ کر رائفل تھام کر گھوڑے کے قریب آگیا۔ گھوڑا بڑے وحشیانہ انداز میں اپنی گردن پر زور دے کر خود کو آزاد کراتے ہوئے ہنہنا رہا تھا۔ میں نے گھوڑے کو آزاد کر دیا اور خود ٹیلے کے ایک کنارے پر کھڑا ہو کر چاند کی روشنی میں نیچے وادی میں دیکھنے لگا۔

اچانک پتھر کی اوٹ سے ایک سائے نے حرکت کی۔

وہ محتاط انداز میں اس ٹیلے کی طرف بڑھ رہا تھا جہاں میں موجود تھا۔

اس کے قریب ہی چند اور سائے اُبھر کر میری نظروں کے سامنے آ گئے، تب میں نے دیکھا کہ وہ تعداد میں چھ تھے جو مختلف سمتوں سے جھونپڑی پر اچانک دھاوا بولنے کی نیت سے آگے بڑھ رہے تھے۔

پھر کچھ دُور وادی میں دو دہکتے ہُوئے انگارے دیکھ کر میری نظریں ان پر جم کر رہ گئیں۔ ان کے عقب میں کچھ اور انگارے حرکت کرتے دکھائی دیے۔ ابھی میں ان انگاروں کا معمہ حل کرنے میں مصروف تھا کہ اپنے قریب گھوڑے کی ہنہناہٹ سُن کر نامعلوم دُشمنوں کی نقل و حرکت کا جائزہ لینے لگا۔ میں لمبی گھاس سے گزرتا ہُوا اس چٹان کی چوٹی پر آ کر اپنے نامعلوم حملہ آوروں کا انتظار کرنے لگا۔

پھر سینکڑوں کی تعداد میں روشن انگارے آگے بڑھتے ہُوئے دکھائی دیے۔ . .

میرے ہونٹ سختی سے بھینچ گئے۔

یہ روشن انگارے بھیڑیوں کی آنکھیں تھیں۔

بھیڑیوں کی اتنی بڑی تعداد دیکھ کر میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بج اُٹھی۔ اب میں اپنے ان چھ حملہ آوروں سے بالکل خوف محسوس نہیں کر رہا تھا مگر بھیڑیوں کی کثیر تعداد دیکھ کر میری آنکھیں فکر انگیز انداز میں سُکڑنے لگیں۔

اُدھر گل مست کے ساتھی ٹیلے کے اس قدر قریب آ گئے کہ جھونپڑی کا فاصلہ ان سے چند گز رہ گیا۔ تب میں نے اپنے حلق سے بھیڑیوں کے غرّانے کی آوازیں نکالیں۔ بھیڑیوں کا غول اچانک یہ آوازیں سنتے ہی تیزی سے حرکت میں آ گیا۔ . . یہ حملہ کرنے کا اشارہ تھا جو ان کو اچانک حرکت میں لے آیا۔ میری نظریں بھیڑیوں کے غول پر جمی ہُوئی تھیں جو تیزی سے بھاگتے ہُوئے ہر آن میرے دُشمنوں سے قریب تر ہو رہے تھے۔ میرے لیے یہ تجربہ ایک انوکھی مسرت کا حامل بن گیا۔ میں نے ایک دُشمن کو دوسرے دُشمن سے ٹکرا دیا تھا اور اب اس تصادم کے نتائج دیکھنے کے لیے چٹان پر لیٹا ہُوا اپنے دونوں دُشمنوں کی نقل و حرکت کا بڑی دلچسپی سے جائزہ لے رہا تھا۔ وہ چھ کے چھ حملہ آور اس ناگہانی آفت سے بے خبر اپنی کامیابی کے نشے میں جھومتے ہُوئے جھونپڑی کا محاصرہ کرنے میں مصروف تھے۔

اچانک ایک بھیڑیا ٹیلے کے عقب سے نمودار ہُوا۔

پھر میرے ایک دُشمن پر چھلانگ لگائی اور اُسے گھوڑے پر سے لیتا ہُوا دوسری جانب جا گرا۔ وہ اپنے خوفناک دانتوں اور پنجوں سے اس کے جسم کو بھنبھوڑنے لگا۔ چند منٹ تک تو میرا دُشمن جدوجہد کرتا رہا پھر وہ ساکت ہو گیا۔ شاید بھیڑیے نے اس کا نرخرہ اُدھیڑ ڈالا تھا۔ اب وہ بڑے مزے سے جلدی جلدی اس کا گوشت اپنے پیٹ میں منتقل کر رہا تھا۔

پھر اچانک دو بھیڑیے اور نمودار ہُوئے۔ . .

اب وہ لوگ سنبھل چکے تھے اور پتھروں میں اپنے مورچے بنا کر اپنے قدرتی دُشمنوں کا مقابلہ کرنے کے لیے مستعد ہو گئے۔

ان کی رائفلوں نے شعلے اُگلنے شروع کر دیے۔

لاتعداد بھیڑیے زخمی ہو کر گرنے لگے۔ . .

مگر اتنی بڑی تعداد کو ختم کرنا آسان نہیں تھا۔

مثلاً ایک بھیڑیا زخمی ہو کر اُچھلا اور اپنے شکاری کو ساتھ لیتا ہُوا وادی میں جا گرا۔ وادی میں گرنے سے میرے دونوں دُشمن ایک ساتھ ختم ہو گئے۔

اپنے دو ساتھیوں سے محروم ہونے کے بعد ان کی فائرنگ میں شدت آ گئی۔ وہ بھیڑیوں کی خاصی تعداد کو زخمی کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ بھیڑیے غرّاتے ہُوئے دوبارہ آگے بڑھتے تو رائفلوں کی گولیاں ان کے جسموں سے ٹکراتیں، وہ جھٹکے سے اُچھلتے اور دوسری طرف اُلٹ جاتے۔ . . میں نے دیکھا کہ بہت سے بھیڑیے اپنے مُردہ ساتھیوں پر پل پڑے اور انھیں چیر پھاڑ کر کھانے لگے۔ گولیوں کی شدت سے بھیڑیوں کی پیش قدمی رُک گئی اور وہ ڈھلوان میں اُتر کر مختلف ٹیلوں کی آڑ میں کھڑے ہو کر غرّانے لگے۔ پھر اچانک ہی ایک گھوڑا وادی کی ڈھلوان میں نمودار ہُوا تو دو بھیڑیے اس کو ترنوالہ سمجھ کر غرّاتے ہُوئے اس پر حملہ آور ہو گئے۔ گھوڑا بھیڑیوں کو چھلانگ لگاتے دیکھ کر اچانک اپنی جگہ سے گھوما اور حملہ آور بھیڑیوں کی طرف دولتی اُچھال دی۔

ایک زوردار آواز گونجی۔

یوں لگا جیسے دو پتھر آپس میں ٹکرائے ہیں۔

بھیڑیا ہوا میں اُچھلا۔ . .

پھر ایک چٹان سے ٹکرا کر ساکت ہو گیا۔

گھوڑا اپنے ایک دُشمن سے نجات حاصل کر کے بجلی کی سی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تیزی سے اپنا رُخ بدل چکا تھا پھر اُسی تیزی سے اپنے دُشمن کا جائزہ لے کر اپنے عقب میں نمودار ہونے والے بھیڑیے پر حملہ کر دیا۔ اس کے دونوں پچھلے پیر کسی ستون کی طرح بھیڑیے کی پسلیوں سے ٹکرائے۔ وہ بھی ہوا میں اُچھل کر دُور جا گرا۔

گھوڑے نے جس قدر پھرتیلے پن سے اپنے دونوں سفاک دُشمنوں سے نجات حاصل کی وہ میرے لیے دلچسپی اور حیرت کا باعث تھا پھر مزید خطرے کی بُو پا کر گھوڑا ایک جانب تیزی سے بھاگ نکلا۔

گل مست کے ساتھی بھی فائرنگ روک کر گھوڑے اور بھیڑیوں کی خوفناک لڑائی دیکھنے لگے تھے۔ اس وقت میرے وہ چھپے ہُوئے دُشمن میری رائفل کی زد پر تھے مگر میں نے فی الحال انھیں بھیڑیوں کے حوالے کر دیا تھا اور خود بڑے سکون سے بھیڑیوں کی غرّاہٹیں سن رہا تھا۔ بھیڑیے دُور جا کر پھر ایک جگہ جمع ہو رہے تھے۔ ان چاروں کی فائرنگ بھی رُک چکی تھی اب صرف بھیڑیوں کی وحشت ناک غرّاہٹیں ہی فضا میں گونج رہی تھیں۔ اچانک گھوڑا پھر وادی میں ایک جگہ نمودار ہُوا۔ بھیڑیے اس کو دیکھ کر اِدھر اُدھر دوڑے۔ . . میں یہ سمجھا کہ وہ گھوڑے سے ڈر کر بھاگ رہے ہیں لیکن چند لمحوں بعد وہ گھوڑے کے آس پاس کی جھاڑیوں سے نمودار ہُوئے۔ اب ان کی چال میری سمجھ میں آئی وہ اس کے چاروں طرف اپنی لمبی لمبی زبانیں نکالے کھڑے غرّا رہے تھے۔ گھوڑا تیزی سے اُچھلا اور ہوا میں دولتیاں اُچھالتا ہُوا بھیڑیوں کا محاصرہ توڑ کر ایک طرف بھاگ نکلا۔ بھیڑیے گھوڑے کو فرار ہوتے دیکھ کر اس کے ساتھ ساتھ دوڑنے لگے۔ گھوڑے نے دوڑتے دوڑتے اچانک ایک قریبی بھیڑیے پر دولتی چلائی۔

گھوڑے کا حملہ کامیاب رہا۔ . .

بھیڑیا زخمی ہو کر ایک طرف گرا اور جانکنی کے عالم میں قلابازیاں کھانے لگا۔

آخر گھوڑا ان وحشی درندوں کے درمیان ہر طرف سے محصور ہو گیا۔ . . بھیڑیے غرّاتے ہُوئے اس پر پل پڑے۔ دو بھیڑیے گھوڑے کی گردن میں دونوں طرف کسی جونک کی طرح چمٹ گئے اور اس کی پیٹھ، رانوں اور سر پر اپنے پنجے گاڑ لیے۔

چند لمحوں میں گھوڑا لہولہان ہو گیا۔

اس نے بھیڑیوں سے آزاد ہونے کی بہت کوشش کی مگر آہستہ آہستہ زمین کی طرف جھکتا گیا اور زمین پر گر گیا۔

زمین پر ایک سُرخ دھبا کافی بڑا ہو چکا تھا۔

پھر تمام بھوکے بھیڑیے غرّاہٹوں کے ساتھ گھوڑے کا گوشت نوچنے لگے۔ . . گوشت کا جو بھی لوتھڑا جس کے مُنہ میں آتا، وہ اُسے ہڑپ کر جاتا۔ . .

گھوڑے نے جس بہادری سے اپنے دُشمنوں کا مقابلہ کیا تھا یہ اس کی فطرت کا ایک حصہ تھا۔

اچانک پھر کہیں قریب ہی کچھ اور گھوڑوں کے خوف زدہ انداز میں ہنہنانے کی آوازیں ماحول کے سناٹے میں اتر کر اپنی زندگی کا ثبوت مہیا کرنے لگیں۔ مجھے یقین تھا کہ یہ گھوڑے بھی ان درندوں کے ہتھے چڑھ جائیں گے۔ گھوڑوں نے شاید موت کے ان خوفناک ہرکاروں کو اپنے بہت قریب محسوس کر لیا تھا اور اب وہ اپنے آپ کو ہر افتاد سے بچانے کے لیے بار بار وادی کے چکر کاٹ رہے تھے۔ اچانک چند بھیڑیوں کا غول دوبارہ نمودار ہُوا اور چند لمحوں تک ان بھاگتے گھوڑوں کا جائزہ لیتا رہا۔ . . پھر چند بھیڑیے غرّاتے ہُوئے آگے بڑھے اور ان گھوڑوں میں سے ایک کو گرانے میں کامیاب ہو گئے۔ اس گھوڑے سے نمٹ کر وہ دوبارہ وادی میں پھیل گئے۔

ماحول ایک بار پھر پُرسکون ہو گیا مگر یہ سناٹا عارضی تھا اچانک میری چھٹی حس کسی نئے خطرے کی نشان دہی کرنے لگی۔

مجھے اپنے عقب میں بھیڑیے کی غرّاہٹ سُنائی دی۔

میں بڑی پھرتی سے پستول نکال کر پلٹا۔

اور اپنے عقب میں نمودار ہونے والے بھیڑیے کی کھوپڑی میں گولی اُتار دی۔

فائر کی آواز سن کر گل مست کے ساتھیوں نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے گھورا اور اس چٹان کی طرف دیکھنے لگے جہاں سے میں نے فائر کیا تھا۔ اب تک تو وہ بھیڑیوں سے اُلجھ کر میری موجودگی نظر انداز کر چکے تھے مگر فائر کی گونج نے میری موجودگی کا راز کھول دیا۔ . . اب وہ میری کمین گاہ سے آگاہ ہو چکے تھے۔ میں آہستہ آہستہ کھسکتا ہُوا چٹان کی دوسری جانب پتھروں کی آڑ میں بیٹھ گیا اور وادی میں موجود اپنے دُشمنوں پر نظریں جما دیں۔

پھر اچانک مجھے لاتعداد بھیڑیوں کی غرّاہٹیں سُنائی دیں۔

میں نے فوراً گھوم کر اپنے عقب میں دیکھا۔ . .

دُور بلند چٹان پر مجھے بھیڑیوں کا غول غرّاتا ہُوا نظر آیا۔

ان کی غرّاہٹیں سُن کر نیچے دُبکے ہُوئے گُل مست کے ساتھی بھی خوف زدہ ہو گئے۔

پھر وہ بھیڑیے پیچھے ہٹے اور چٹانوں میں غائب ہو گئے۔

ایک مرتبہ پھر خاموشی چھا گئی۔

اسی دوران بادلوں کے ایک سیاہ ٹکڑے نے چاند کو اپنی آغوش میں لے لیا اور سارے ماحول پر سیاہی کی دبیز تہہ غالب آ گئی۔ تاریکی میرے لیے خطرناک تھی۔ اندھیرا دُشمن کی نقل و حرکت کو چھپا لیتا ہے۔ مجھے بھیڑیوں کے اس غول سے خطرہ محسوس ہونے لگا۔ جنھیں میں نے چاند کی دُودھیا روشنی میں بلندی پر غرّاتے دیکھا تھا۔۔۔ اندھیرا جُوں جُوں گہرا ہوتا گیا، خاموشی اور سناٹے میں اضافہ ہونے لگا۔ اب سردی بھی آہستہ آہستہ میرے جسم پر اثر انداز ہو رہی تھی۔ اگر میں چاہتا تو اس ٹیلے پر آگ روشن کر کے سردی اور بھیڑیوں دونوں سے محفوظ رہ سکتا تھا مگر گُل مست کے ساتھیوں کی موجودگی کو نظر انداز کرنا حماقت تھی، جو اپنے ساتھیوں کی موت کا بدلہ لینے آئے تھے لیکن بھیڑیوں کے وحشیانہ حملوں کا شکار ہو گئے تھے۔

میں نے تھیلے سے ایک سوتی چادر نکال کر اپنے جسم پر لپیٹ لی اور پُشت ایک پتھر کے ساتھ ٹکا لی اور رائفل اپنی گود میں رکھ لی۔ اب میں دوبارہ چاند کے نمودار ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ وقت کی رفتار جیسے رُک چکی تھی۔ سردی میرے وجود میں اپنی جڑیں پھیلانے لگی مگر میں بڑی کامیابی سے سردی کا مقابلہ کر رہا تھا۔۔۔ اب سردی اتنا زور پکڑ چکی تھی کہ مجھے محسوس ہونے لگا جیسے اگر سردی کا یہی عالم رہا تو وقت پڑنے پر ہاتھ رائفل چلانے کی سکت کھو بیٹھیں گے۔

ابھی میں اس صورتِ حال کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اپنے قریب بھیڑیوں کی غرّاہٹیں سُن کر ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ مسلسل آہٹیں پیدا ہو رہی تھیں۔ بھیڑیے اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر میرے بہت قریب آ گئے تھے اور کسی بھی وقت حملہ کر سکتے تھے۔

میں نے اپنے ہاتھ پیروں کو مسلسل جھٹک کر اپنے سرد پڑتے وجود کو بیدار کیا اور ان بھیڑیوں سے نمٹنے کے لیے تیار ہو گیا۔

چند فٹ کے فاصلے پر ایک تیز غراہٹ بلند ہوئی۔

پھر انگارے کی طرح دہکتی آنکھیں اپنے قریب دیکھ کر میں نے ایک چھلانگ لگائی اور چٹان کے دوسرے کنارے پر آ گیا۔

جونہی بھیڑیے نے میری طرف چھلانگ لگائی، میں چٹان سے کُود کر جھونپڑی کی چھت پر جا گرا۔

بھیڑیا بھی چھلانگ لگا کر جھونپڑی کی چھت پر آ گیا۔

گھاس پھونس کی چھت ہمارا بوجھ نہ سہار سکی اور نیچے بیٹھتی چلی گئی۔ اس کے ساتھ ہی جھونپڑی آگ کی لپیٹ میں آ گئی۔

آگ کے بلند شعلے دیکھ کر بھیڑیا ایک دم اُچھلا اور ٹیلہ پار کر کے ڈھلوان میں لڑھکتا چلا گیا۔ اس وحشت سے چھٹکارا حاصل کرنے میں سرکتا ہُوا جھونپڑی کے اس حصے میں آ گیا جو ابھی تک آگ سے محفوظ تھا۔ میں جھونپڑی سے چند قدم دُور ہٹ کر شعلوں کی روشنی میں دُشمن کی نقل و حرکت کا جائزہ لینے لگا۔ پھر سیاہ بادلوں کا ٹکڑا غائب ہو گیا اور چاند کی نرم کرنیں ماحول کو اُجاگر کرنے لگیں۔ روشنی ہوتے ہی میں نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔۔۔ بالآخر وہ چاروں بدمعاش دُور ایک چٹان کی آڑ میں دُبکے بیٹھے دکھائی دیے۔ اچانک ہی ایک بھیڑیے نے ان میں سے ایک پر چھلانگ لگائی۔۔۔ وہ لڑکھڑا۔ ساتھ ہی بھیڑیے نے انتہائی پھرتی سے اس کا نرخرا چبا ڈالا۔ اس کے ساتھیوں نے بھیڑیے کے جسم کو گولیوں سے چھلنی کر دیا مگر اپنے ساتھی کے اُدھڑے ہُوئے وجود میں زندگی کے آثار پیدا نہ کر سکے۔

ماحول دوبارہ موت کے المناک سکوت کا شکار ہو گیا۔

آگ کی حرارت نے میری جسمانی طاقت بحال کر دی اور میری توجہ دوبارہ اپنے دُشمنوں کی طرف مرکوز ہو گئی جو اپنے تین ساتھیوں کو کھو کر اپنا مستقبل تاریک کر چکے تھے۔ وہ اگر بھیڑیوں سے بچ جاتے تو میری رائفل ان کی زندگی کا چراغ گُل کرنے کے لیے تیار تھی مگر اب میں ان بدمعاشوں پر بارُود ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ مجھے یقین تھا۔۔۔ کہ جلد ہی وہ سب بھیڑیوں کی غذا بن جائیں گے۔

۔۔۔ پھر میرا یقین حقیقت کی صورت اختیار کرنے لگا۔

اچانک بھیڑیوں کا ایک غول نمودار ہُوا اور اُن کی طرف بڑھنے لگا۔

مجھے احساس تھا کہ ان کی فائرنگ بھیڑیوں کے اس غول کو روکنے میں ناکام ہو جائے گی۔

بھیڑیے پتھروں کی آڑ میں چھپ کر آگے بڑھنے لگے۔

گُل مست کے ساتھیوں کی رائفلیں آگ اُگلنے لگیں۔

مگر یہ آگ بھیڑیوں کی پیش قدمی نہ روک سکے۔

اچانک چاروں طرف سے بھیڑیوں نے چھلانگیں لگائیں۔۔۔

پھر دیکھتے ہی دیکھتے ان کے وہ اور ساتھی زندگی سے محروم ہو کر ان بھوکے بھیڑیوں کے جسم کا ایک حصہ بن چکے تھے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

محاذ پر ایک مرتبہ پھر گہری خاموشی مسلط ہو گئی۔

اب صرف ایک تنہا آدمی ایک جانب زخمی پڑا کراہ رہا تھا۔

اچانک ایک گھوڑا ہنہناتا ہُوا اس زخمی کے قریب آ کر رُکا۔

زخمی آدمی اپنی تکلیف بھول کر اپنی جگہ سے ایک دم اُچھلا اور گھوڑے کی لگام تھام کر سوار ہونے ہی والا تھا کہ میں جلدی سے پتھروں کو پھلانگتا ہُوا آگے بڑھا اور اس کی ایک ٹانگ پکڑ کر گھوڑے سے گھسیٹ لیا۔

وہ اس اُفتاد کے لیے تیار نہیں تھا۔۔۔ پتھروں پر گرتے ہی بے ہوش ہو گیا۔

میں چند لمحے اس کے بے ہوش جسم کو دیکھ کر یہ سوچتا رہا کہ اس کے ساتھ کیا سلوک کروں؟ میں نے اس کے شانے تھام کر اسے سیدھا لٹا دیا۔ اس کی پوری قمیص خون سے تر ہو رہی تھی۔ اس کا ایک شانہ کسی بھیڑیے نے مُنہ مار کر زخمی کر دیا تھا۔ جہاں چار انچ گہرا زخم تھا۔ اس سے ابھی تک خون رس رہا تھا۔ میں نے اس کی حالت کا جائزہ لیا تو مجھے یہ احساس ہونے لگا کہ اگر چند منٹ اور اس کے زخموں سے خون بہتا رہا تو یہ بے ہوشی کی حالت میں ہی مر جائے گا۔

میں نے رائفل ایک پتھر کے سہارے رکھی اور اس بے ہوش جسم کو اُٹھا کر آگ کے قریب لا کر ایک جگہ لٹا دیا۔ جھونپڑی آگ لگنے کی وجہ سے ابھی تک سلگ رہی تھی۔ پھر میں نے اس کی خون میں بھیگی ہُوئی قمیص اُتار کر زخم اچھی طرح صاف کیا اور اپنی پُشت پر بندھے ہُوئے تھیلے سے ایک دوا نکال کر اس کے زخم پر لیپ کر دیا پھر اس کی قمیص پھاڑ کر پٹی باندھ دی۔

اپنے اس کام سے فارغ ہو کر میں نے فضا کا جائزہ لیا تو دُودھیا اُجالا ہر طرف تیرتا ہُوا نظر آیا۔

فضا میں صبح کے آثار دیکھ کر میرے ہونٹوں پر ایک تھکی تھکی سی مسکراہٹ آ گئی۔

گزری ہُوئی رات کے بھیانک مناظر تصوّر کی آنکھوں کے سامنے اُبھرنے لگے۔۔۔

اُبھرتے ہوئے سورج کی سُنہری کرنیں پہاڑوں کی برفیلی چوٹیوں سے نشیب کی جانب اُتر کر زمین پر اپنے قدم گاڑنے میں کامیاب ہو گئیں تو میں نے اپنے قریب لیٹے ہُوئے بے ہوش آدمی کو غور سے دیکھا اس کی حالت پہلے سے خاصی بہتر تھی۔

میرے لگائے ہُوئے مرہم نے اسے بے ہوشی کی نیند سے نکال کر فطری نیند سُلا دیا تھا۔ میں نے اپنی رائفل ایک پتھر سے ٹکا کر ٹیلے کے ایک کنارے پر آ کر نشیب میں وادی پر اپنی نظریں جما دیں۔

وادی کا سارا حُسن تباہ و برباد ہو چکا تھا۔

ہر طرف گوشت کے لوتھڑے پڑے اور گاڑھے خون کے چھینٹے نظر آ رہے تھے اور یہ چیزیں اس حسین وادی کے ماتھے پر ایک بدنما داغ معلوم ہو رہا تھا۔

میری نظریں کسی زندہ گھوڑے کی تلاش میں بھٹک رہی تھیں جس کی مجھے بہت کم اُمید تھی کیوں کہ چند گھوڑوں کا عبرت ناک انجام میرے سامنے تھا مگر پھر بھی ایک آخری کوشش کر لینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ میں نے وادی میں اُتر کر اس جگہ کا جائزہ لیا جہاں گُل مست کے ساتھی اپنے مورچے میں رات بھر بھیڑیوں کا مقابلہ کرتے رہے تھے۔

ہر طرف بکھرے ہُوئے گوشت کے ٹکڑوں اور ہڈیوں کے علاوہ کوئی شے میری نظروں کی گرفت میں نہ آ سکی۔

اچانک ایک چمکتی ہُوئی رائفل کی نال دیکھ کر میرے قدموں میں تیزی آ گئی۔ میں دوڑتا ہُوا اس کے قریب پہنچ گیا۔ رائفل ایک پتھر کے سہارے ٹکی ہُوئی تھی۔ اس کے قریب ہی ایک اُدھڑا ہُوا انسانی وجود بھیڑیوں کی سنگ دلی اور سفاکی کی داستان سُنا رہا تھا۔ میری نظریں چند لمحوں تک اس اُدھڑے ہُوئے وجود پر جمی رہیں جس کی شناخت اب ناممکن ہو چکی تھی۔ اس کا اوپری دھڑ بھیڑیوں کے پیٹ کا ایندھن بن چکا تھا۔ میں نے رائفل اُٹھالی اور جھکے ہُوئے قدموں سے ٹیلہ پار کر کے گھوڑے کی تلاش میں اپنی نظریں اِدھر اُدھر دوڑانے لگا۔ اچانک ایک ہلکی سی ٹاپ سُنائی دی تو میں چونکنا ہو کر دوسری آواز سُننے کا منتظر ہو گیا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ گھوڑا کسی ٹیلے کے پیچھے ہی موجود ہے پھر گھوڑا بڑے زور سے ہنہنایا اور پتھریلی زمین پر ٹاپیں مارنے لگا۔

میں ایک دم اُٹھا اور ٹیلے کے دوسری جانب چکر کاٹ کر گھوڑے کے سامنے پہنچ گیا۔

گھوڑے نے مجھے اچانک اپنے سامنے دیکھا تو بدک کر ایک جانب بھاگنے لگا۔

میں نے اپنے حلق سے ایک مخصوص آواز نکالی جسے سُنتے

ہی گھوڑا ٹھٹک کر اپنی جگہ پر رہ گیا۔

میں نے آگے بڑھ کر اُس کی باگیں تھام لیں۔

چند لمحے اُس کی پیٹھ پر محبت سے تھپکی دیتا رہا پھر کود کر اُس پر سوار ہو گیا اور پھر رُخ دوبارہ اُسی جھونپڑی کی جانب کر دیا جہاں میں اُس زخمی کو بے ہوشی کی حالت میں چھوڑ آیا تھا۔ گھوڑے کی ٹاپیں سُن کر اُس نے اپنی آنکھیں کھول دیں اور پریشان نظروں سے میری جانب دیکھنے لگا۔

اُس کی آنکھوں میں حیرت اور خوف کی ملی جلی کیفیت دیکھ کر میرے ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ آ گئی۔ مجھے مسکراتے پا کر اُس کے چہرے پر پھیلی ہوئی زردی میں کمی آ گئی اور آنکھوں سے تشکر کے جذبات جھلکنے لگے۔

"تمھاری یہ بات مجھے حیرت زدہ کر رہی ہے کہ تم نے مجھے قتل کرنے کے بجائے میری تیمارداری کی ہے۔ یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ تمھیں قتل کرنے آیا تھا۔" اُس کی کمزور آواز نقاہت کی نشاندہی کر رہی تھی۔

"میں لوگوں کے ساتھ سنگ دلی کا سلوک ہی نہیں محبت اور دوستی کا رشتہ... نبھانا بھی جانتا ہوں۔" میں نے پُرمزاح لہجے میں جواب دیا اور گھوڑے کو ایک درخت کے ساتھ باندھ کر اُس کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔

"تمھاری ہر بات مجھے انوکھی اور نرالی معلوم ہو رہی ہے۔" اُس نے رواں پشتو میں اپنے خیالات کی ترجمانی کرتے ہوئے جواب دیا۔

"جس طرح میری کچھ باتیں تمھارے لیے حیرت اور اُلجھن کا باعث بن رہی ہیں، اسی طرح تم لوگوں کی دشمنی میرے لیے ایک زبردست اُلجھن کا باعث ہے مگر ابھی تمھاری حالت اس قابل نہیں ہے کہ تم سے زیادہ باتیں کی جائیں۔ رات بھر موت سے نبرد آزما رہنے سے تمھارے وجود تھکے ہوئے ہیں۔ انھیں آرام اور خوراک کی ضرورت ہے مگر تمھاری حالت اس قابل نہیں ہے کہ تمھیں تنہا چھوڑ دیا جائے۔ ابھی میں کوئی ایسی موزوں جگہ کے بارے میں سوچ رہا ہوں جہاں دونوں چیزیں ہمیں آسانی سے میسر آ جائیں۔" [illegible] سے آ گا ہوں۔

"ہمارا ٹھکانا یہاں سے قریب ہے مگر میں اپنا شکست خوردہ چہرہ لے کر اپنے ڈیرے پر واپس نہیں جانا چاہتا۔ تم نے مجھے زندہ کیوں چھوڑا ہے؟ اپنی ایک گولی ضائع کر کے میری زندگی کا چراغ گُل کیوں نہیں کر دیتے۔ اس احسان کا بوجھ میری بقیہ زندگی کو اذیت ناک بنا دے گا۔" اُس کے لہجے میں شکست کا گہرا احساس موجود تھا۔

"گرے ہوئے دشمن پر وار کرنے والے بہادر نہیں کہلاتے۔" میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "میں تمھاری زندگی کے لیے جدوجہد اس لیے کر رہا ہوں کہ اپنی ذات سے تمھاری دشمنی کی وجہ معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے، زندگی کے کسی بھی حصے میں میری تم سے ملاقات نہیں ہوئی۔ پھر تم اپنے ہاتھوں میں رائفل لے کر میری موت کا سامان کرنے کیوں نکل کھڑے ہوئے ہو؟"

میری باتوں کے جواب میں اُس کے چہرے پر دوبارہ موت کی زردی چھا گئی اور وہ اُداس نظر آنے لگا۔

"مجھے زندگی بھر یہ تمنا رہی کہ کبھی میری ملاقات تم جیسے کسی بہادر انسان سے ہو جائے جو دشمنی کی وجہ معلوم کیے بغیر کسی انسان کے خون سے اپنے ہاتھ رنگین کرنے کا عادی نہ رہا ہو جس کے قول و فعل میں کوئی تضاد نہ ہو جو دشمن کو بزدلانہ عیاری سے موت کے گھاٹ اُتارنا نہ جانتا ہو۔ مگر یہ میری انتہائی بدنصیبی ہے کہ میری ملاقات اس بہادر سے اُس وقت ہوئی جب میں خود اس کی موت کی سازش میں شریک ہو کر اُسے لوٹنے کے لیے روانہ ہو چکا تھا۔ تم جیسے بہادر اور اعلیٰ ظرف انسان نظر آتے ہو۔ کیا میری اس کوتاہی کو نظر انداز کر سکتے ہو کہ میں کبھی تمھارے دشمنوں کا ساتھی رہ چکا ہوں؟"

اُس کی سوالیہ نظریں میرے چہرے پر اپنی باتوں کا ردِعمل تلاش کرنے لگیں۔ اُس کی باتوں میں خلوص اور سادگی کی گہری جھلک موجود تھی۔ مگر میں یہ بات اتنی جلدی کیسے بھول جاتا کہ چند گھنٹے پہلے یہ شخص اُن لٹیروں کے ساتھ مل کر مجھے لوٹنے آیا تھا۔

"تمھاری باتیں سُن کر مجھے اس بات کا یقین ہو گیا ہے کہ تم کسی اچھے خاندان کے فرد ہو۔ مگر حالات کی گردش نے تمھیں اُن لٹیروں کا ساتھ دینے پر مجبور کر دیا تھا جو آس پاس کی بستیوں میں وحشت و بربریت کا بازار گرم کیے ہوئے تھے۔" میں اپنا سوال ایک مرتبہ پھر دُہرا رہا ہوں۔ "تم مجھے یہ بتاؤ کہ تم اور تمھارے ساتھی میری موت کے خواہاں تھے اور کس کے اشارے پر مجھے لوٹنے آئے تھے؟" میرا سوال سُن کر وہ اُداس اور سوگوار نظر

آنے لگا۔

"میرے ساتھیوں کو کسی نے یہ اطلاع دی تھی کہ پشاور چھاؤنی سے تم بہت سا روپیہ لے کر کہیں جا رہے ہو۔ دراصل اطلاع دینے والے نے یہ کہا کہ شکار اچھا ہے کہیں موقع مناسب دیکھ کر ہاتھ ڈال دو۔ ہم تمھیں اپنے ارادے کے مطابق اسی جنگل میں گھیر کر مارنا چاہتے تھے۔ مگر گل مست خان نے اچانک بوڑھے جان بابا کو پکڑ کر حاضر خان کا خفیہ ٹھکانا معلوم کرنے کی ٹھان لی۔ ہم نے اُس کے اس پروگرام کی مخالفت کی تو اُس نے ہمیں سرائے میں ٹھہرنے کے لیے کہا اور خود جا کر حاضر خان کے کمسن بچے اور بوڑھے سسر کو پکڑ لایا۔ اُن کے ساتھ ظلم ہوتے دیکھ کر بستی والوں کے دل بہت دُکھے تھے۔ مگر گل مست اور اُس کے ساتھیوں کا خوف اُس قدر غالب تھا کہ وہ اس کا مقابلہ کرنے کے لیے بھی تیار نہیں تھے مگر تمھاری اچانک مداخلت نے جیتی ہوئی بازی ہار میں بدل دی۔ تم نے تنہا گل مست خان اور اُس کے گروہ کا خاتمہ کر دیا۔ ہمیں تمھارے بارے میں بتایا گیا تھا کہ تم بہت خطرناک اور پھرتیلے انسان ہو اور اپنے دشمنوں کے خون سے ہاتھ رنگین کر کے تمھیں ایک خاص لذت محسوس ہوتی ہے۔ ہمیں یہ سب باتیں اس وقت ایک افسانہ معلوم ہوتی تھیں... مگر تمھاری دلیری اور پھرتی دیکھ کر ابھی تک مجھے یہ یقین کرنا مشکل ہو رہا ہے کہ تم نے وقتی تنہا اتنے دشمنوں کو موت کی نیند سُلا دیا ہے۔ اس پوری کارروائی میں کوئی دوسرا مددگار نہیں تھا۔" اُس کے لہجے میں حیرت تھی۔

"وہ شخص کون تھا؟" میں نے دوبارہ اپنے مطلب کی بات اُگلوانے ہوئے کہا۔

"کون شخص؟"

"جس نے تمھیں اس بات کی اطلاع دی تھی کہ میں پشاور چھاؤنی سے روپیہ لے کر آ رہا ہوں۔"

"یہ اطلاع ہمارے ایک ساتھی کو ایک طوائف ریشم جان کے کوٹھے سے ملی تھی۔ اُسی نے ہمیں تمھاری آمد سے باخبر کیا تھا۔ مگر ان لوگوں نے تمھاری صلاحیتوں کا اندازہ لگانے میں غلطی کی تھی اور یہی غلطی اُن کی زندگی کی آخری غلطی ثابت ہوئی۔"

ریشم جان کا نام سُن کر میرے دل و دماغ سے دھواں اُٹھنے لگا دیر تک غم و غصے کی حالت میں جکڑا ہوا خلا میں گھورتا رہا۔

"مگر ریشم جان کو یہ خبر کس نے دی تھی کہ میں پشاور چھاؤنی سے بہت سا روپیہ لے کر جا رہا ہوں؟" میں خودکلامی کے انداز میں بڑبڑایا۔

تب میں نے سوچا، ہو سکتا ہے ریشم جان کے ہاں یہ اطلاع پہنچانے والا جنرل ڈوگ کا کوئی آدمی ہو اور جنرل ڈوگ کے ایما پر ہی یہ سازش ترتیب دی گئی ہو۔ وہ بڑی عیار اور مکار قوم ہے جو اپنے دوستوں کو بھی ہمیشہ اپنا دستِ نگر دیکھنا پسند کرتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جنرل ہر طرف سے مجھے گھیرے میں لینے کی کوشش کر رہا ہے۔ اگر یہ قوم عیار اور وعدہ فراموش نہ ہوتی تب بھی دُنیا پر حکمرانی کرنے کی حق دار کہلائی جا سکتی تھی مگر اس قوم نے اخلاقی اصولوں کو پسِ پشت ڈال دیا اور طاقت، دھونس، دھاندلی کو اپنا شعار بنا لیا ہے۔ ایک دن وہ آئے گا جب اس قوم کا ظلم انتہا کو پہنچ جائے گا۔ تب مظلوم اپنی بے سروسامانی کے باوجود اُٹھ کھڑے ہوں گے پھر انھیں کہیں پناہ نہیں ملے گی اور وہ دن ان کے زوال کا پہلا دن ہو گا اور کبھی نہ کبھی وہ دن ضرور آئے گا جب ان کی وسیع سلطنت سُکڑ کر دوبارہ اپنی اصلی سرحدوں تک محدود ہو جائے گی اور دُنیا میں ان کی حریف قومیں پیدا ہو جائیں گی جو دن رات اس سلطنت کو ملیامیٹ کرنے کی جدوجہد جاری رکھیں گی۔ ان کی سازشیں دُوسری قوموں سے زیادہ دن تک چھپی نہ رہ سکیں گی۔ یہ کسی کے دوست نہیں ہو سکتے کیونکہ یہ ایک خودغرض اور حریص قوم کے افراد ہیں۔ میری سوچ کے دھاگے ابھی اُلجھے ہی تھے کہ اُس نے مجھے ٹوکتے ہوئے کہا۔

"میری باتیں سُن کر تمھارے چہرے کے تاثرات کیوں بدل گئے؟" اُس نے بوکھلائی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے سوال کیا تو میں خیالات کی دُنیا سے حقیقت کی ٹھوس دُنیا میں واپس آ گیا۔

"میں زندگی کی کچھ ٹھوس صداقتوں کے بارے میں غور کر رہا تھا۔" میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "مگر تمھیں میرے بدلتے ہوئے رویے سے خوفزدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ یہ بات پہلے بھی دُہرا چکا ہوں کہ میں ان لوگوں کے خون سے ہولی کھیلنے کا عادی نہیں ہوں جو مجھ سے ذہنی طور پر مغلوب ہو کر اپنی شکست تسلیم کر چکے ہوں۔ میں تمھارے اس انکشاف کے بارے

میں سوچ رہا تھا کہ میرے دشمنوں نے میرے دوستوں کی سادگی سے کس طرح فائدہ اُٹھایا ہوگا اور اُن کے مستقبل کے لیے کیا ارادے ہو سکتے ہیں؟

"مگر تمھاری نظروں میں میرا مستقبل کیا ہے؟" اُس نے میرا تبصرہ سُن کر ایک نیا سوال کر دیا۔

"تمھارے مستقبل سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔" میں نے ٹھوس لہجہ اختیار کرتے ہوئے جواب دیا۔ "یہی وجہ ہے کہ ابھی تک میں نے تمھارا نام تک جاننے کی ضرورت محسوس نہیں کی ہے۔"

"ایسی بے نیازی میں نے بہت کم لوگوں میں دیکھی ہے۔" اس کی آنکھوں میں دوبارہ حیرت کے سائے اُتر آئے۔

"مگر پھر بھی تمھیں میرے مستقبل کے بارے میں کوئی نہ کوئی فیصلہ ضرور کرنا پڑے گا۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں اپنا مستقبل تمھاری ذات کے ساتھ وابستہ کر لوں۔ اس طرح مجھے بے پایاں مسرت ملے گی کیا مجھے اپنا دوست سمجھ کر اپنے قریب رہنے کی اجازت دے سکتے ہو؟"

"اس کا فیصلہ آنے والا وقت کرے گا۔" میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "ابھی میں اپنے مستقبل کے بارے میں کوئی ٹھوس لائحہ عمل مرتب نہیں کر سکا ہوں اور جس دن کوئی ایسا منصوبہ میرے ذہن میں آگیا میں تمھاری اس پیش کش سے فائدہ اُٹھانے کی ضرور کوشش کروں گا۔ پہلے یہ بتاؤ کہ تمھارا ڈیرا یہاں سے کتنی دُور ہے تاکہ میں تمھیں وہاں پہنچانے کی کوئی تدبیر کروں۔"

"یہ میری زندگی کا پہلا واقعہ ہے کہ کوئی حیرت خان کو اس طرح تذلیل کر رہا ہے۔" اُس نے ایک طویل سانس اپنے سینے سے خارج کرتے ہوئے جواب دیا۔ "اگر تمھیں میری رفاقت گوارہ نہیں ہے تو پھر مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ اگر زندگی کی کچھ سانسیں باقی ہیں تو کوئی دوسری سبیل نکل آئے گی۔ تم ہی وقت ایک بیکار آدمی کے لیے کیوں ضائع کر رہے ہو؟" اُس کے لہجے میں کچھ ایسی بات تھی کہ میں اپنے جذبات میں ایک ہلچل محسوس کیے بنا نہ رہ سکا۔

"حیرت خان!" میں نے اپنے لہجے میں نرمی پیدا کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے تمھاری باتیں پسند آرہی ہیں مگر اپنی زندگی کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ کرنا میرا کام ہے۔ میں تمھیں زیادہ وقت نہیں دے سکتا مگر میں یہ بھی برداشت نہیں کر سکتا کہ تم یہاں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرو اور میں تمھارے لیے کچھ نہ کروں۔ میں اپنی ذات کی پیچیدگیوں سے خود بھی ابھی تک پوری طرح آگاہ نہیں ہو سکا۔ میری زندگی حادثات کی ایک لمبی زنجیر کی طرح اُلجھی ہوئی ہے اور اس کے سرے کی تلاش میں بھٹک رہا ہوں۔ اب تک میری زندگی کا ہر لمحہ ایک یادگار حادثہ بن کر گزرا ہے اور میں نہیں جانتا کہ ابھی مجھے کن کن راستوں کا سفر طے کرنا پڑے گا۔ تم بے شک ان جذباتی باتوں میں وقت نہ گنواؤ اور اپنی بگڑتی ہوئی حالت پر بھی غور کر لو۔ میری پیش کش ابھی تک قائم ہے۔ تم مجھے اپنا ٹھکانہ بتا دو۔ پھر وہاں تمھیں پہنچانے کے بعد میرا کام ختم ہو جائے گا۔"

"ہمیں چند میل شمال کی طرف سفر کرنا پڑے گا۔" اُس نے اُنگلی سے ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا اور کھوئی ہوئی نظروں سے اس راستے کو گھورنے لگا جو اُس کے ڈیرے کی جانب جا رہا تھا۔

میں نے اُسے سہارا دے کر اُٹھایا اور گھوڑے پر سوار کرا دیا اور خود گھوڑے کی باگیں پکڑے اُس کے آگے چلنے لگا۔ ابھی چند گز کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ حیرت خان کراہتا ہوا بولا۔

"شہباز تم بھی سوار ہو جاؤ۔ یہ گھوڑا ہمیں بآسانی بٹھانے پر رضامند ہو جائے گا اور اس کی رفتار میں بھی کوئی فرق نہیں آئے گا۔"

"تمھاری تکلیف کے پیشِ نظر میں نے پیدل چلنے کا فیصلہ کیا ہے۔" میں نے نرمی سے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "تیز رفتاری تمھارے زخموں کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔"

"یار شہباز خان!" اُس نے اپنی تکلیف بھول کر بے تکلفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ "تمھیں سمجھنے کے لیے واقعی ایک طویل عرصہ درکار ہوگا۔ تمھاری ہر بات اپنی جگہ پر انوکھی اور اٹل ہے۔"

پُرپیچ گھاٹیوں کے درمیان چلتے ہوئے ہمیں دوپہر ہو گئی مگر ابھی تک حیرت خان نے اپنے ڈیرے سے قریب ہونے کا اعلان نہیں کیا تھا۔ اچانک ایک ٹیلہ پار کر کے ہم ایک سرسبز میدان میں آنکلے۔ جہاں ایک چشمے کے کنارے ہمیں بستی کے مکان نظر آگئے۔

ہمارے وہاں رُکتے ہی کچھ لوگ ہماری سمت بڑھے اور زخمی حیرت خان کو گھوڑے سے اُتار کر ایک جھونپڑی کی طرف

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چل پڑے۔ حیرت خان نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا تو میں بھی اس جھونپڑی میں آگیا۔ جہاں میں حیرت خان کے قریب بیٹھ کر اُس کی حالت کا جائزہ لینے لگا۔

حیرت خان تکلیف کی شدت سے کراہتا ہوا بے چینی سے کروٹیں بدل رہا تھا۔

کچھ دیر بعد دو آدمی ایک باریش بوڑھے کے ساتھ نمودار ہوئے۔ اُنھوں نے کھانے کی کچھ چیزیں ہمارے آگے رکھ دیں۔ توقع کے مطابق کھانے میں وہ میرا ساتھ دے رہا تھا لیکن تکلیف کی وجہ سے وہ تو صرف ٹھونگ رہا تھا۔ مگر میں نے ان اشیا کے ساتھ انصاف کیا۔

پیٹ کی آگ بجھی تو آنکھوں میں رتجگے کی تھکن خمار بن کر اُتر آئی۔ کھانے کے بعد میں حیرت خان کے قریب گھاس کے بچھے ہوئے نرم فرش پر دراز ہو گیا۔ اپنی آنکھیں بند کر لیں اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔

میں گہری نیند میں تھا کہ اچانک کسی نے مجھے جھنجوڑ کر بیدار کرتے ہوئے کہا۔ "شہباز خان! اُٹھو شام ہو گئی ہے۔"

میں نے آنکھیں کھولیں۔ سورج کی دھندلائی ہوئی کرنیں زمین سے سمٹ رہی تھیں۔ حیرت خان میرے بیدار ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ میں اُٹھ بیٹھا... تو اُس نے قہوے کی بھری ہوئی ایک پیالی میرے ہاتھوں میں تھما دی۔ قہوے کے چند گھونٹ حلق میں اُترتے ہی سارے وجود میں حرارت کا احساس پھیل گیا اور میں خود کو قدرے ترو تازہ محسوس کرنے لگا۔

"میرا خیال ہے۔ اب مجھے سفر پر روانہ ہو جانا چاہیے۔" میں نے حیرت خان کو مخاطب کر کے کہا تو اس کا مسکراتا ہوا چہرہ اچانک سنجیدہ ہو گیا۔

"ان وادیوں میں رات کے وقت لوگ اپنے دشمنوں کو بھی گھر سے نہیں نکالتے۔" اُس نے صاف گوئی سے جواب دیا۔ "اور تم تو محسن اور دوست ہو۔ جس نے اپنا قیمتی وقت برباد کر کے میری مسیحائی کی ہے۔ میں تمھارے ان احسانات کو اتنی جلدی کیسے فراموش کر دوں۔ کم از کم ایک رات تو مجھے بھی اپنی میزبانی کا حق ضرور دو۔ ویسے تم جانا کہاں چاہتے ہو؟"

"میں زمیر کے ملک سکندر سے ملنے جا رہا ہوں۔" میں نے بنا راز رکھتے ہوئے جواب دیا۔

"میں کل تک ضرور اس قابل ہو جاؤں گا کہ تمھارے ساتھ زمیر تک جا سکوں۔ اس بستی سے کچھ ہی فاصلے پر ایک بہت بڑا اصطبل ہے۔ وہاں سے ہم لوگ دو تیز رفتار گھوڑے لے کر چلیں گے۔ وہ اصطبل ہماری مشترکہ ملکیت ہے۔ مگر اب گل مست کے مرنے کے بعد میں تنہا اس اصطبل کا مالک ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ گھوڑے دیکھ کر تمھاری طبیعت خوش ہو جائے گی۔"

صبح ہوتے ہی ناشتہ کر کے ہم لوگ اصطبل کی طرف چل پڑے۔ اصطبل دیکھ کر واقعی میری طبیعت خوش ہو گئی۔ ایک سے ایک اعلیٰ نسل کا گھوڑا موجود تھا۔

ہم نے دو گھوڑے پسند کیے جن پر اصطبل کے کارندوں نے کاٹھیاں کس دیں اور ہم آہستہ روی سے اپنا سفر طے کرتے ہوئے سہ پہر کے بعد زمیر پہنچ گئے۔

ملک سکندر مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوا اور مسرت کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔

"واہ کیا اچھے موقعے پر آئے ہو۔ میں نے تمھاری امانت تمھارے قبیلے کے لوگوں تک پہنچا دی ہے اور وہ لوگ ابھی یہیں موجود ہیں۔ میں ابھی اس کام سے نمٹ کر واپس آیا ہوں۔ آج وہ شکار کھیلنے گئے ہوئے ہیں۔ شام ہوتے ہی آجائیں گے اور تمھارے دشمنوں سے بھی چھ ہزار روپے وصول کر کے بھجوا دیے ہیں۔"

میں نے روپوں کا بھرا ہوا تھیلا اُس کے سامنے اُلٹ دیا۔ دس ہزار افغانی چمکتے ہوئے سکے دیکھ کر ملک سکندر کا چہرہ مسرت کے جذبات سے دمکنے لگا۔

رات کے کھانے پر اُن لوگوں سے بھی ملاقات ہو گئی جو میری امانت میرے قبیلے کے لوگوں تک پہنچانے آئے تھے۔ رات کو ملک سکندر نے میری دوسری امانت اُن کے سپرد کر دی اور صبح ہونے سے پہلے ہی ان لوگوں کو دوبارہ میرے قبیلے کی طرف روانہ کر دیا۔

صبح ہونے تک ساری بستی میں ہمارے آنے کی خبر پھیل چکی تھی۔

دوسرے دن ہر کام سے نمٹ کر میں حیرت خان کے ساتھ اُن جنگلوں کی طرف نکل گیا جہاں پہاڑی بکرے اور ہرن بکثرت پائے جانے کے امکان تھے۔

اچانک ایک ٹیلے پر مجھے پہاڑی بکرے کے نوکیلے سینگ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نظر آ گئے۔ میں نے رائفل سیدھی کر کے اُن سینگوں سے ذرا نیچے نشانہ لیا اور گولی چلا دی۔

ایک دھماکا ہوا، بکرا تڑپ کر ٹیلے کی اوٹ سے نکلا اور ڈھلوان میں لڑھکتا ہی چلا گیا۔

"تمہارا نشانہ بہت سچا ہے۔" حیرت خان نے زخمی بکرے کی جانب تیزی سے اپنے گھوڑے کو دوڑاتے ہوئے کہا۔

حیرت خان نے زخمی بکرے کو جلدی سے ذبح کیا اور زین کے ساتھ ایک طرف لٹکا لیا۔

سہ پہر تک ہم نے چار بکرے شکار کر لیے اور واپسی کا راستہ اختیار کرتے ہوئے دوبارہ زمیر کی طرف چل پڑے۔ اچانک ایک سنسان راستے سے گزرتے ہوئے مجھے ایک درخت کے پتوں میں رائفل کی نال کی جھلک دکھائی دی۔

"حیرت خان!" میں اچانک اضطراری حالت میں چلّایا۔ "اپنا گھوڑا روک لو۔ آگے دشمن ہماری گھات میں بیٹھا ہوا ہے۔"

حیرت خان نے کافی دُور جا کر اپنا گھوڑا روکا اور ایک درخت کی آڑ میں کر لیا۔

اچانک ایک گولی سنسناتی ہوئی آئی اور آ کر اُس تنے میں پیوست ہو گئی جس کی آڑ میں میرا گھوڑا کھڑا تھا۔

پھر سارا جنگل فائرنگ کے دھماکوں سے گونج اُٹھا۔

دشمن درختوں کے پتوں میں چھپا ہوا بلندی سے فائر کر رہا تھا۔

اچانک ایک گولی حیرت خان کے گھوڑے کی پشت میں اُتر گئی۔ گولی کھاتے ہی گھوڑے کے قدم اپنی جگہ سے اُکھڑ گئے اور وہ سوار سمیت پیچھے کی جانب اُلٹ گیا۔ پھر سوار کو گراتا ہوا ایک کھائی میں جا گر کر اپنی زندگی کا افسانہ تمام کر گیا۔

میں نے گھوڑے کو درخت کی آڑ میں چھوڑا اور رینگتا ہوا حیرت خان کے پاس پہنچ گیا۔ اس کے شانے کے زخم سے خون رسنے لگا تھا اور پتھریلی زمین پر گرنے کی وجہ سے اُس کی پیشانی میں ایک نوکیلا پتھر چبھ گیا۔ اس کے سر سے بھی خون بہنے لگا۔

میں نے حیرت خان کو اپنے کندھوں پر لادا اور بمشکل تمام اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر ان درختوں سے اتنی دُور نکل آیا جہاں اُن کی فائرنگ ہمیں نقصان نہ پہنچا سکے۔ میں نے ایک پتھر کی اوٹ میں حیرت خان کو لٹا دیا اور چکر کاٹ کر دوبارہ انہی درختوں کے جھنڈ میں پہنچ گیا جہاں سے نامعلوم حملہ آور ہم پر فائرنگ کر رہے تھے۔

ایک شعلہ میری جانب تیزی سے لپکا۔

میں پلک جھپکنے سے پہلے وہ جگہ چھوڑ چکا تھا، ورنہ دشمن کی گولی کارگر ثابت ہو سکتی تھی۔

میں نے اُن شاخوں پر مسلسل دو فائر جھونک دیئے جہاں سے مجھے فائرنگ کا شبہ ہوا تھا۔

میرے دوسرے فائر کے جواب میں ایک چیخ اُبھری اور کوئی قلابازیاں کھاتا ہوا دھپ سے زمین پر گرا اور ساکت ہو گیا۔

اپنے ایک دشمن کو ختم کر کے میرے ہونٹوں پر ایک آسودہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ اب مجھے بلی اور چوہے کے اس بھیانک کھیل میں مزا آنے لگا تھا۔ درخت کی آڑ میں میری نظریں بلندیوں پر اُن شاخوں پر جمی ہوئی تھیں جہاں دشمن کی موجودگی کے امکانات تھے۔ اپنے ایک ساتھی کے گرتے ہی اُن کی فائرنگ میں شدت آ گئی۔ یہی میری حکمتِ عملی تھی۔ اس طرح مجھے اُن کے پوشیدہ ٹھکانوں اور اُن کی تعداد کا اندازہ ہو گیا۔ میں نے ایک شاخ کو تاکا اور نشانہ لے کر مسلسل دو فائر کر دیے جو دونوں ضائع چلے گئے۔ شاید دشمن اس شاخ پر نہیں تھا۔ اچانک پھر ایک اور شاخ کے پتے ہلے میں نے فائر کر دیا۔ اس مرتبہ پھر ایک ہولناک چیخ اُبھری اور کوئی سرکس کے بازی گر کی طرح قلابازیاں کھاتا ہوا دھماکے کے ساتھ گرا اور زندگی کا سفر تمام کر گیا۔

اپنے ایک گھوڑے کا انتقام لیتے ہوئے میں دشمن کے دو آدمیوں کو ٹھکانے لگا چکا تھا۔ دوسری لاش گرتے ہی جنگل میں گہری خاموشی چھا گئی۔ میں آہستہ آہستہ درخت کی آڑ سے نکل کر اُن بکھرے ہوئے جسموں کے قریب پہنچ گیا جو مجھ سے دشمنی کی پاداش میں اپنی زندگیاں بھینٹ دے چکے تھے۔

میں نے دونوں رائفلیں اُٹھا کر گھوڑے کی خرجی میں ڈال دیں... اور دوبارہ حیرت خان کے پاس پہنچ گیا جو اب ہوش میں آ چکا تھا اور ایک پتھر کے سہارے بیٹھا ہوا میری واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔

"یہ لوگ کون تھے؟" حیرت خان نے مجھے دیکھتے ہی سوال کیا۔

"میرا خیال ہے کہ یہ شیر خان اور مگل زمان کے آدمی تھے؟" میں نے مسکرا کر جواب دیتے ہوئے کہا۔ "ان میں دو آدمیوں کو میں ٹھکانے

لگا آیا ہوں اور باقی خاموشی سے پسپائی اختیار کر چکے ہیں۔ تم کہو! کیا حال ہے؟ کیا دوبارہ سفر کرنے کے قابل ہو یا ابھی کچھ دیر دشمن کا انتظار کر لیا جائے؟"

"ہم لوگوں نے ان پتھروں کے درمیان جنم لیا اور یہی پتھر ہمیں مرتے ہوئے بھی دیکھیں گے۔" حیرت خان فلسفی ہو گیا۔ "تم میرے زخموں کی پروا نہ کرو۔ اپنے دشمن کو مزید کوئی نقصان پہنچانے کا موقع نہ دو۔ بھگوڑے دشمن کا تعاقب کر کے اور اُن میں سے کسی کو پکڑ کے آسانی سے یہ راز اگلوا سکتے ہو کہ وہ کس کے آدمی ہیں!"

"شیر خان کے علاوہ اور کوئی شخص میری موت کا خواہاں نہیں ہو سکتا!" میں نے مکمل اعتماد سے اعلان کیا۔

میں نے اسے سہارا دے کر گھوڑے پر سوار کرایا اور ہم ایک بار پھر اُسی منظر کو دُہرانے لگے۔ حیرت کے اصرار پر میں نے گھوڑے کی راسیں تھام لیں اور سوار ہو کر دونوں تیزی سے زمیر کی طرف بڑھنے لگے۔

جب ہم زمیر پہنچے فضا میں ہلکی سی دھند پھیل رہی تھی۔

میں نے زخمی حیرت خان کو ملک سکندر کے سپرد کر دیا اور کہا۔ "اسے فوری طور پر کسی اچھے طبیب کی ضرورت ہے۔ جنگل میں شکار کھیلتے ہوئے اچانک کچھ لوگوں نے ہم پر حملہ کر دیا تھا۔ حیرت خان پہلے ہی زخمی تھا مگر جب دشمن کی ایک گولی سے گھوڑا زخمی ہوا۔ تو اُس نے اُچھل کر حیرت خان کو گرا دیا۔ جس سے اس کے زخم دوبارہ رسنے لگے ہیں اور سر میں بھی خاصی چوٹ آئی ہے۔ میں ذرا چشمے پر جا کر دن بھر کا گرد و غبار صاف کر کے آتا ہوں۔"

حملہ آوروں کا ذکر سنتے ہی ملک سکندر کا چہرہ غصے سے سُرخ ہو گیا۔

"سکندر خان!" میں نے مسکراتے ہوئے مزید وضاحت کی۔ "میں نے گھوڑے کی موت کا بدلا اپنے دو دشمنوں کو جہنم کا ایندھن بنا کر لے لیا ہے۔ مگر یہ راز پانے میں ناکام رہا ہوں کہ وہ کس کے بھیجے ہوئے آدمی تھے۔ اُن کی لاشیں جنگل میں اُسی حالت میں چھوڑ آیا ہوں۔ کل اپنے کچھ آدمی وہاں بھیج کر اس بات کا سراغ لگانا کہ مرنے والے کون تھے اور کس نے میرا خون بہانے کے لیے انھیں بھیجا تھا؟"

ملک سکندر کے چہرے پر لاتعداد شکنوں کا جال پھیل گیا۔

میں نے ایک نظر ملک سکندر کے چہرے پر ڈالی اور خاموشی سے چشمے کی طرف چل پڑا۔

چشمے کے ٹھنڈے پانی میں غسل کر کے طبیعت کی ساری سستی دُور ہو گئی اور میں اپنے اندر ایک حرارت آمیز تازگی محسوس کرنے لگا۔

رات کے کھانے پر پتہ چلا کہ ملک سکندر کے کچھ مہمان آئے ہوئے ہیں اور وہ اُن کی خاطر داری میں مصروف ہے اور میرا قیام اُن لوگوں سے الگ تھلگ ایک دوسری جگہ کیا گیا ہے۔ میں کھانے سے فارغ ہو کر اُس جگہ آ گیا جہاں میرے رات کے ٹھہرنے کا انتظام کیا گیا تھا۔

قہوہ پیتے ہوئے اچانک مجھے بابا شاپیار یاد آ گئے... اور جیل خانے میں اُن کے پاگل پن کا منظر میری آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا۔ میں نے قہوے کی پیالی زمین پر رکھ دی اور بابا شاپیار کے بارے میں سوچتا رہا۔ فرنگی کی قید میں اُنھوں نے اپنے جسم و جان پر جو اذیتیں برداشت کی تھیں، اُس کا ہلکا سا احساس میری رُوح میں گردش کرنے لگا۔ احساس کی آگ اس قدر تیز تھی کہ مجھے اپنا وجود شعلوں میں لپٹا ہوا محسوس ہُوا۔ یہ ایک عجیب کرب تھا جس نے میرے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا... اور میں بے چینی سے کروٹیں بدلنے لگا۔

اچانک کمرے کے دروازے کے سامنے قدموں کی چاپ سنائی دی تو میں چونک کر آنے والے کو دیکھنے لگا۔ ملک سکندر کا مسکراتا چہرہ دیکھ کر اچانک میں اپنے خیالات کے بھنور سے باہر آ گیا۔

"کیا بات ہے شہباز خان۔ آج تم بہت خاموش اور سنجیدہ نظر آ رہے ہو؟" اُس نے چارپائی کے ایک طرف بیٹھتے ہوئے کہا۔ "کیا سوچ رہے تھے؟"

"کوئی خاص بات نہیں خان بابا!" میں نے اپنے چہرے پر پھیکی مسکراہٹ لاتے ہوئے محبت سے جواب دیا۔

"شہباز خان! ابھی تک تم نے اپنے سفر کی رُوداد نہیں سنائی۔ کیا اپنے بزرگوں پر سے تمھارا اعتماد اُٹھتا جا رہا ہے؟ یا اس کی کوئی خاص وجہ ہے۔ تم جب سے آئے ہو میں تمھارے عادات و اطوار میں کافی تبدیلی پا رہا ہوں۔ اس مرتبہ تمھاری حالت اُس شخص کی سی ہے جو اچانک اپنی کوئی قیمتی شے گم کر بیٹھا ہو اور یہ سوچ رہا ہو کہ اب اُسے کہاں اور کیسے تلاش کیا جائے؟"

ملک سکندر کی تجربے کی باتیں سن کر مجھے اُس کی ذہانت

اور قیافہ شناسی کا قائل ہونا پڑا۔

"خان بابا!" میں نے اپنے لہجے میں گمبھیرتا پیدا کرتے ہوئے کہا "آپ ایک دانا اور راست باز انسان ہیں۔ آپ نے یہ کیسے خیال کر لیا ہے کہ کوئی خاص بات مجھے پریشان کر رہی ہے؟" میں نے سوال کیا تو ملک سکندر کے شجاع چہرے پر شفقت آمیز مسکراہٹ آ گئی۔

"شہباز خان!" ملک سکندر سنجیدہ ہو گیا۔ "میں نے آدھی صدی سے زیادہ عرصہ بدلتے ہوئے موسموں کے تیور پہچاننے میں گزار دیا ہے۔ تم میرے تجربے کو نہیں جھٹلا سکتے۔ مگر میں فی الحال اپنی بات پر اصرار نہیں کروں گا کہ تم مجھے وہ بات ضرور بتاؤ جو تمہارے لیے فکر و تشویش کا باعث بنی ہوئی ہے۔ پہلے تم یہ بتاؤ کہ یہ دس ہزار افغانی روپے تم نے کیسے اور کہاں سے حاصل کیے؟" اُس نے اپنی آخری بات پر زور دیا۔

"یہ دس ہزار افغانی روپے میں نے پشاور چھاؤنی سے حاصل کیے ہیں۔" میں نے وضاحت کی۔

"جب میں پولیٹیکل ایجنٹ کا دیا ہوا صداقت نامہ لے کر پشاور پہنچا تو مجھے جنرل ڈوگ کے سامنے پیش کیا گیا۔ جس نے بڑے دوستانہ انداز میں مجھے یہ پیشکش کی کہ اگر میں درہ طورخم کی چوکی پر کمک پہنچا دوں تو وہ پانچ ہزار افغانی روپوں کے بجائے دس ہزار روپے دے گا۔ میں نے اُس کی پیشکش قبول کر لی اور درہ طورخم کی مہم کے دوران مجھے رہزنوں کا صفایا کرنے کا موقع مل گیا۔ میں نے واپسی پر اپنے انعام کی رقم کا مطالبہ کیا اور رقم لے کر آپ کے پاس آ گیا۔" میں نے تفصیل کے ساتھ راستے میں پیش آنے والے تمام چھوٹے بڑے واقعات ملک سکندر کے سامنے دہرا دیے۔

"اگر مجھے اس بات کا پہلے سے علم ہو جاتا کہ یہ دس ہزار افغانی روپے تم نے اپنے ہم وطنوں کی لاشیں بیچ کر حاصل کیے ہیں تو میں کبھی تمہاری مدد نہ کرتا۔ میں تمہیں ایک بہادر اور غیور انسان سمجھتا تھا۔ مگر تم تو بزدل اور غدار نکلے۔" ملک سکندر کی آواز میں زخمی شیر کی گرج تھی۔

"خان بابا!" میں نے بلند لہجے میں احتجاج کرتے ہوئے جواب دیا۔ "مجھے غداری اور بزدلی کے طعنے نہ دو۔ میں فرنگیوں سے بے پناہ نفرت کرتا ہوں۔ مگر اپنی ایک مجبوری کے تحت ان کے ساتھ تعاون کرنے پر مجبور تھا۔ یہ سب کچھ میں نے ان کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے کیا ہے۔ اگر کسی کا باپ بیس برس سے فرنگی کی قید میں ہو اور بیس برس کے بعد اچانک کسی بدنصیب بیٹے کو اپنے گم شدہ باپ کا سراغ مل جائے تو اُسے کیا کرنا چاہیے؟"

"اوہ!" ملک سکندر نے ایک طویل سانس لی اور اُس کے چہرے پر دوبارہ بشاشت لوٹ آئی۔ اُس کی غضیلی آنکھیں دوبارہ شفقت کا اظہار کرنے لگیں۔

"اگر تمہیں بیس برس کے بعد اپنے باپ کا سراغ مل گیا تھا تو تم نے اسے آزاد کیوں نہیں کرا لیا۔ اگر تم کہو تو میں اپنے آدمیوں کو تیاری کا حکم دے دوں؟ ہم اچانک اس جیل پر حملہ کر کے تمہارے باپ کو آزاد کرا لیں گے۔ اب میں نے تمہاری پُراسرار خاموشی کا راز پا لیا ہے۔ شاید تمہیں اپنے باپ کا خیال پریشان کر رہا ہے؟"

"خان بابا!" میں نے دھیمی آواز میں نرمی سے جواب دیا۔ "آپ میری رُوح کا زخم جان گئے ہیں۔ مگر اس زخم کا مداوا اس طرح نہیں ہو سکتا جس طرح آپ تجویز کر رہے ہیں۔ اس کام کے لیے باقاعدہ ماحول سازگار بنا کر کوئی منصوبہ بنایا جا سکتا ہے۔ وہ فرنگیوں کی قید میں ہیں جو ہر طرح کے جدید اسلحے سے لیس ہیں۔ ہمیں اپنے عیار دشمن کی قید سے بابا شالیار کو نکالنے کے لیے وقت کا انتظار کرنا ہو گا۔ کیوں کہ بابا ذہنی توازن کھو چکے ہیں۔ انگریز ڈاکٹر پوری توجہ سے اُن کا علاج کر رہے ہیں کیوں کہ فرنگیوں کو یقین ہے کہ بابا نے بہت بڑا خزانہ کہیں چھپا دیا ہے۔ اگر میں فرنگیوں کا اعتماد حاصل نہ کرتا تو اپنے بابا کو کبھی اتنی آسانی سے تلاش نہیں کر سکتا تھا۔ اب میں نے اُن کا اعتماد حاصل کر لیا ہے۔ فرنگی جنرل نے مجھے فوج میں ایک مستقل عہدہ پیش کیا تھا جسے میں نے حقارت سے ٹھکرا دیا اور آپ کے پاس چلا آیا۔ اب میں دوبارہ پشاور چھاؤنی واپس جانا چاہتا ہوں۔ آپ ایسا کریں ... کہ مجھے کوئی ایک ایسا بھروسے کا آدمی دے دیں جو بوقتِ ضرورت میرے منصوبے سے آپ کو آگاہ کر سکے۔ اس بات کا خاص خیال رکھنا ہو گا کہ ہر کام میرے منصوبے کے مطابق ہونا چاہیے ورنہ سارا بنا بنایا کھیل ایک ذرا سی غلطی سے بگڑ بھی سکتا ہے۔"

"شہباز خان! اپنے بوڑھے بابا پر بھروسہ رکھو۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ ہر ممکن طریقے سے تمہارے منصوبے پر عمل

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کروں گا۔ چاہے اس کے لیے مجھے اپنے خون کا آخری قطرہ بھی کیوں نہ بہانا پڑے۔" ملک سکندر کا باوقار چہرہ سچائی کا آئینہ دار تھا اور مجھے یقین ہو گیا کہ ہر کام میری حسبِ منشا ہو گا۔

ملک سکندر کے جانے کے بعد میں نے پورے حالات کا جائزہ لیا تو میں خاصا مطمئن اور پُرامید تھا۔

★★

"معلوم ہوتا ہے اس مرتبہ تم اپنا سکون و اطمینان پشاور چھاؤنی میں ہی چھوڑ آئے ہو؟" دوسرے دن ناشتے سے فراغت پا کر میں اپنے ذہن میں مستقبل کا کوئی واضح خاکہ مرتب کر رہا تھا کہ اچانک ملک سکندر نے مجھے گہری سوچ میں ڈوبا ہوا پا کر اپنی آمد کا اعلان مجھ پر فقرہ چست کرتے ہوئے کیا۔ وہ مسکراتے ہوئے آگے بڑھا اور میرے قریب بیٹھتے ہوئے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "تمہاری سوچ میں ڈوبی ہوئی آنکھیں کسی خوفناک طوفان کی آمد کا پتہ دے رہی ہیں۔ یوں لگتا ہے شہباز خان، جیسے مستقبل میں بہت خونریزی کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟"

"خان بابا!" میں نے تلخی سے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "جب میرے شعور نے آنکھ کھولی تو آس پاس موت کی آگ برس رہی تھی۔ وہ آگ آج بھی میرے سینے میں روشن ہے۔ برس ہا برس سے بے بسی، نفرت اور انتقام کی آگ میں جل رہا ہوں۔ میں ہر طرف سے اپنے دشمنوں میں گھرا ہوا ہوں۔ ایک طرف ملک نواز میری جان کے درپے ہے اور دوسری طرف عیار فرنگی اپنی شطرنج کی خطرناک بازی جمائے بیٹھا ہے۔ اب میں نے سوچا ہے کہ میں فرنگی جنرل کو اپنے مقاصد کے لیے آلۂ کار بناؤں گا اور کسی طرح سے یہ یقین دلانے کی کوشش کروں گا کہ ملک نواز کی زندگی فرنگی حکومت کے لیے ایک زبردست چیلنج کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ درپردہ تمہاری حکومت کے خلاف سازشوں میں مصروف ہے۔ ملک نواز کو اگر میں ایک بار حکومتِ برطانیہ کے دشمن کی حیثیت سے پیش کرنے میں کامیاب ہو گیا تو جنرل اس کے خلاف بہت بڑے پیمانے پر کارروائی کرنے پر تیار ہو جائے گا اور اس طرح ہمارا دشمن کیفرِ کردار کو پہنچ جائے گا۔" میں نے اپنے منصوبے کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

"شہباز خان!" ملک سکندر نے کسی فلسفی کی طرح کھوئے ہوئے انداز میں میری باتوں پر غور کرنے کے بعد کہا۔ "ہو سکتا ہے مستقبل میں وہ نہ ہو جو تم سوچ رہے ہو۔ اپنے دشمن کو کمزور اور احمق سمجھنا حماقت ہے۔ میں تمہارے منصوبے کی مخالفت کر کے تمہاری حوصلہ شکنی نہیں کرنا چاہتا کیوں کہ تم مجھے اپنے بچوں کی طرح عزیز ہو۔ تمہارے انتقام کی آگ اگر دشمنوں کا خون بہانے سے سرد ہو سکتی ہے تو اپنے اس خوفناک کھیل کو جاری رکھنے کے لیے تمہیں خطرناک سے خطرناک عمل کر گزرنے کی مکمل آزادی ہے۔ مگر جو دشمن دھوکے سے چھری مارنے کا عادی ہو اُس کی عیاری سے غفلت برتنا نادانی ہے۔ فرنگی ایک عیار قوم ہے۔ اُنھوں نے اگر ایک مرتبہ تمہیں اپنے جال میں پھانس لیا تو ساری زندگی کفِ افسوس ملتے رہو گے۔ اپنے دو دشمنوں کو ٹکرانے کا منصوبہ بناتے وقت یہ بات ہمیشہ اپنے ذہن میں رکھنا کہ وہ لوگ تم سے زیادہ ذہین اور خون ریزی کے عادی ہیں۔"

"خان بابا! آپ مجھے کیا سمجھانا چاہتے ہیں؟" میری اُلجھی ہوئی نظریں ملک سکندر کے چہرے پر جم گئیں۔

"میں چاہتا ہوں کہ تم دشمن کو کمزور اور غبی خیال نہ کرو۔ ہو سکتا ہے تمہاری طرح وہ بھی اپنے مستقبل کا کوئی خطرناک منصوبہ رکھتے ہوں اور تمہیں اپنا آلۂ کار بنا کر تمہیں ہلاکت کے دروازے تک پہنچا دیں۔ تم نے اپنی بہادری اور ذہانت کی دھاک اُن پر بٹھا دی ہے۔ اب جب بھی تم اُن سے علیحدگی کی کوئی معمولی سی بھی کوشش کرو گے تو اُن کی نظروں میں خطرناک اور باغی قرار پاؤ گے۔ آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اُنھوں نے کسی کو اپنی سازش کا نشانہ بنایا ہو اور اُس نے جیتے جی اُن سے روگردانی کی ہو۔ وہ تمہیں اسی طرح اپنی خطرناک چالوں میں اُلجھا سکتے ہیں۔"

"خان بابا! تمہاری فکر انگیز باتیں سچائی اور حقائق پر مبنی ہیں۔" میں نے اس کی باتوں سے اتفاق کرتے ہوئے جواب دیا۔ "دشمن کو آلۂ کار بنانے کا کام اگرچہ بظاہر بہت خطرناک اور مشکل نظر آتا ہے مگر مجھے خدائے لازوال کی ذات سے اعانت کی پوری اُمید ہے کیونکہ میں سچائی پر ہوں۔ اور اپنے باپ کے بدلے درندوں سے انتقام لینے میں حق بجانب ہوں۔"

میری باتوں کے جواب میں ملک سکندر کا سنجیدہ چہرہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ چند لمحات دونوں اپنی جگہ پر مستقبل میں پیش آنے والے بھیانک خطرات کے بارے میں غور کرتے رہے۔

"خان بابا!" اچانک میں نے دوبارہ اُسے مخاطب کرتے ہوئے

کہا: "اب تک آپ نے مجھے اس شخص کے بارے میں کچھ نہیں بتایا جو میرے اور آپ کے درمیان پیغام رسانی کے فرائض انجام دے گا۔"

"ریحان گل کو میں نے پیغام بھیج دیا ہے کہ وہ جب بھی پشاور سے لوٹ کر آئے تو مجھ سے ضرور ملے۔" اُس نے جواب دیا۔ "ریحان گل فرنگیوں کو بھیڑیں مہیا کرنے کا کاروبار کرتا ہے اور ہفتے میں دوبارہ اپنے باڑے میں بھیڑیں لینے کے لیے ضرور آتا ہے۔ وہ ایک آدھ روز میں واپس آنے والا ہے۔ میں تمھاری اس سے ملاقات کرا دوں گا تو تمھیں اُس سے اپنا کام لینے میں کافی آسانی پیدا ہو جائے گی۔ وہ ایک قابلِ اعتماد، قوم پرست اور بھروسے کا آدمی ہے۔ ان حالات میں وہ ہمارے درمیان بہترین رابطے کا کام دے سکتا ہے۔" ملک سکندر نے تفصیل سے ریحان گل کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا۔

"حیرت خان کی حالت اب کیسی ہے؟" وہ مجھے اچانک یاد آگیا۔

"اُس کی حالت پہلے سے بہت بہتر ہے۔ طبیب نے اُسے کچھ دن چلنے پھرنے سے منع کیا ہے مگر وہ ہوش میں آنے کے بعد تم سے ملنے کے لیے مسلسل اصرار کر رہا ہے۔ وہ تمھارے لیے بہت جذباتی ہو رہا ہے۔ شاید تمھاری شخصیت کے کچھ پہلو اسے بہت پسند آگئے ہیں اور وہ تم سے گہری عقیدت کا اظہار کرنے لگا ہے۔ تم نے اس کے بارے میں کیا سوچا ہے؟" ملک سکندر کا سوال سن کر میں بڑی متانت سے مسکرا دیا۔

"دراصل جب سے شالیار بابا کا سراغ ملا ہے۔ میرے سینے میں ہر وقت انتقام کی طوفانی لہریں اٹھتی رہتی ہیں۔ جب تک شالیار بابا کی عظیم شخصیت عیار فرنگیوں کی قید سے رہائی حاصل نہیں کر لیتی، میرے پاس کسی دوسرے آدمی کے بارے میں سوچنے کا وقت نہیں ہے۔ اپنے مستقبل کا فیصلہ وہ خود کرے۔" میں نے فیصلہ کن انداز اختیار کرتے ہوئے جواب دیا۔

پھر [illegible] مجھے ریحان گل کا انتظار کرتے ہوئے گزر گئے۔ تیسرے روز میں شام کے وقت اُس کی آمد کا شور سن کر اپنی قیام گاہ سے نکل کر اس جگہ آگیا جہاں ملک سکندر اپنے نوجوان مہمان سے بغل گیر ہوتے ہوئے مسرت کا اظہار کر رہا تھا۔

"خان بابا!" ریحان گل نے اپنی گھنی مونچھوں کو پیار سے

نامور مصنف محمود احمد مودی
وہی تحریر اور وہی انداز
کے ساتھ، اپنے چاہنے والوں
کے لئے ایک نئی سوغات لئے
بہروپ
خوبصورت سرورق، بہترین
طباعت و کتابت، سفید کاغذ
قیمت =/180
مکتبہ القریش
سرکلر روڈ اردو بازار لاہور
7668958

دیتے ہوئے کہا: "میں نے جب سے آپ کا پیغام سنا تھا۔ میں اچانک جلدی پر فکر مند ہو گیا تھا۔ پہلے یہ بتائیں کہ مجھے آپ نے کس خدمت کی بجا آوری کے لیے یاد کیا ہے؟"

آدمی خاصا بے تکلف تھا۔ مجھے اس کی بے باکی پسند آئی تھی۔

"ریحان گل، یہ شہباز خان ہے۔ آئندہ ایک دو روز میں پشاور جانے والا ہے۔ شہباز خان فرنگیوں کی فوج میں ایک اعلیٰ عہدیدار ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ جب بھی تمھیں کوئی پیغام دے تو تمھارا فرض ہوگا کہ اپنے سارے کام چھوڑ کر اس کا پیغام مجھ تک فوراً پہنچا دو۔ یہ کام کوئی اتنا مشکل بھی نہیں ہے مگر اس بات کے لیے تمھیں انتہائی رازداری سے کام لینا ہوگا۔ کیا تم یہ کام کر سکتے ہو؟" ملک سکندر نے تنقیدی نظروں سے ریحان گل کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے سوال کیا۔

"خان بابا!" ریحان گل اچانک اداس نظر آنے لگا۔ "میرے باپ زمان گل نے مرتے وقت میرا ہاتھ آپ کے ہاتھوں میں دیا تھا اور آپ نے مجھے اپنے بچوں کی طرح پالا ہے۔ آج میں جو کچھ بھی ہوں وہ آپ کی عنایت اور محبت کا صلہ ہے۔ میں آپ کے حکم سے کس طرح رو گردانی کر سکتا ہوں۔"

اچانک اُس کی آواز بھرا گئی۔

"مجھے تمھاری سعادت مندی سے یہی امید تھی۔ مگر میرے کام کی نوعیت اس قدر اہم ہے کہ تمھیں مجھ سے یہ وعدہ کرنا ہوگا خواہ حالات کوئی بھی صورت اختیار کر لیں، تم اس راز کو کبھی بے نقاب نہیں کرو گے کہ تم ہمارے لیے پیغام رسانی کے فرائض انجام دے رہے ہو۔" ملک سکندر نے اُسے دوبارہ تنبیہ کی۔

"خان بابا!" ریحان گل نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "ان شاء اللہ! ریحان گل مرتے دم تک آپ کے اس راز کو اپنے سینے میں دفن رکھے گا۔"

اس دوران میں بڑی توجہ سے اُن کی باتیں سن رہا تھا۔ میں نے درمیان میں مداخلت کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

ریحان گل کی باتوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے اُس پر آخری حد تک عمل کرنے کی کوشش کرے گا۔ میرے لیے یہی اطمینان کافی تھا کہ ملک سکندر اس پر اعتماد کرتا ہے اور وہ بھی ہمارے ساتھ تعاون کرنے پر تیار ہے۔ اس کام سے فراغت پاتے ہی میں نے پشاور چلنے کی تیاری شروع کر دی۔

دوسرے دن ناشتہ کرنے کے بعد میں نے ملک سکندر سے رخصتی مصافحہ کیا اور گھوڑے کو ایڑ لگا کر اپنے سفر کا آغاز کر دیا۔

★★

شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے جب میں نے ایک گھاٹی کو پار کر کے اپنا گھوڑا روکا اور اپنے قیام کے لیے کوئی موزوں جگہ تلاش کرنے لگا۔ حیرت خان کا ڈیرا یہاں سے قریب تھا مگر میں اب وہاں قیام کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ رخصت ہوتے وقت میں نے حیرت خان سے ملنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی تھی مگر موسم کی تبدیلی کے آثار دیکھ کر میرے ذہن میں تشویش کے سائے لہرانے لگے۔

سرد ہوا میں ایک خوفناک گھن گرج کے ساتھ تیزی آگئی تھی اور برف باری کے امکانات بڑھتے جا رہے تھے۔ میں نے ایک چٹانی کھوہ میں اپنے گھوڑے کو روکا اور درختوں کی ٹوٹی ہوئی شاخیں اکٹھی کر کے ان کو ماچس کی تیلی دکھا دی۔ ملک سکندر نے میرے لیے چلتے وقت کھانے کی کچھ چیزیں تیار کرا دی تھیں۔ میں نے تھیلے سے ان اشیا کو نکالا اور ایک پتھر پر بیٹھ کر اپنے پیٹ کا دوزخ بھرنے لگا۔

اچانک گھوڑے کی ٹاپیں اپنے قریب گونجتی ہوئی پا کر میں اپنی کمین گاہ سے نکل آیا اور آنے والے سوار کو گھورنے لگا جو آگ کی روشنی کی جھلک دیکھ کر تیر کی طرح سیدھا میرے قریب آ رہا تھا۔

"حیرت خان!" میں نے آنے والے سوار کو پہچانتے ہوئے کہا۔ "تمھیں ابھی آرام کی ضرورت تھی اسی لیے میں نے تمھیں آتے ہوئے ساتھ نہیں لیا تھا؟"

"شہباز خان!" حیرت خان نے اپنا گھوڑا میرے قریب روکتے ہوئے جواب دیا۔ "تمھارا یہ سلوک میرے لیے کسی صدمے سے کم نہیں ہے۔ اگر تم مجھے اپنے ساتھ نہیں لے جانا چاہتے تو کم از کم ایک رات کے لیے مجھے میزبانی کا حق دینے سے محروم نہ رکھو۔"

"میں کسی ایک کام کو انجام دیتے وقت دوسری الجھنیں پالنے کا عادی نہیں ہوں۔" میں نے سنجیدگی سے خلا میں گھورتے ہوئے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جواب دیا۔ "جب میں تمھیں وہیں چھوڑ آیا تھا تو یہ بات تمھیں سمجھ لینا چاہیے تھی کہ اب میرے اور تمھارے راستے الگ الگ ہیں۔ میں دن رات جن راستوں پر چلنے کا عادی ہوں اُن میں ہر طرف انسانی خون کی بُو رچی ہوئی ہے۔ موت کے دہشت ناک سائے ہر لمحے میرے گھوڑے کی ٹاپوں کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ تمھارا جسم میرے کسی دشمن کی چلائی ہوئی گولی کا نشانہ بن جائے۔ اس لیے موت کا تعاقب کرنے کی حماقت نہ کرو اور اپنے خیالات پر قابو رکھو جو تمھاری ذات کو ہلاکت میں ڈالنے کا سبب بن سکتے ہیں۔"

"شہباز خان! مجھے اس بات کا قلق ضرور رہے گا کہ تم نے میری بے لوث پیش کش کو ٹھکرا کر ایک اجنبی انسان کی طرح میری ذات سے بے تعلقی اختیار کر لی۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ زندگی بھر تمھارے لیے کبھی کسی اُلجھن کا باعث نہیں بنوں گا۔"

حیرت خان نے رنجیدہ لہجے میں میری باتوں کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ "مگر ایک وعدہ ضرور لینا چاہتا ہوں کہ اگر تمھیں زندگی میں انسانی خون کی ضرورت پڑ جائے تو مجھے ضرور یاد کر لینا۔ میری تمنا ہے کہ میں تمھارے کسی کام آؤں!" حیرت خان بہت جذباتی ہو رہا تھا مگر میری مجبوریوں سے بے خبر تھا۔ اس لیے جھجکا نہ جمد کیے جا رہا تھا۔ میں دوبارہ اُس چٹان کی اوٹ میں آ گیا جہاں میں نے آگ روشن کر رکھی تھی۔ حیرت خان بھی میرے پیچھے چلا آیا تھا۔

دو روز مسلسل سفر میں گزر گئے۔ تیسرے دن شام کے سائے گہرا رہے تھے... کہ میں پشاور شہر کے مضافات میں پہنچ گیا۔ دل و دماغ میں ہزار وطن جانے انجانے جذبے بڑی شدت سے مچل رہے تھے۔ تصور کی آنکھ سے میں بابا شالیار کو آزاد اور صحت مند گھومتا پھرتا دیکھ رہا تھا۔ انھوں نے ایک طویل عرصے تک اپنے جسم و جان پر جو ہولناک عذاب برداشت کیے تھے اُن کی تلافی ضروری تھی۔ میں اپنے بوڑھے بہادر باپ کی آزادی کا تصور کرتے ہوئے رُوحانی طور پر بہت مسرت محسوس کر رہا تھا۔ غرضیکہ جذبات کی شدت سے تپتی ہوئی رُوح لے کر میں چھاؤنی کے علاقے میں داخل ہو گیا۔ میرا رُخ سیدھا اُسی سمت تھا جدھر میں پہلے قیام کر چکا تھا۔ میں نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور پھاٹک پار کرنے کی کوشش کی تو دروازے پر موجود ایک گارڈ نے اچانک مجھ پر اپنی رائفل تان لی اور مجھے رُکنے کا حکم دیا۔

میں نے غصّے سے بھناتے ہوئے اپنا گھوڑا روکا اور اُتر کر گارڈ کے قریب آ گیا۔ اچانک پھاٹک کی اوٹ سے کچھ فوجی... نمودار ہوئے اور مجھے اپنی حراست میں لے لیا۔

غصّے کی شدت سے میرا چہرہ سُرخ ہو گیا۔

"میں وہی شہباز ہوں جو جنرل ڈوگ سے انتہائی خصوصی تعلقات رکھتا ہے۔ میں نے دُرّہ حور جم کی مہم سَر کر کے جنرل سے دس ہزار افغانی روپے انعام حاصل کیے تھے۔ وہ روپے میں اپنے قبیلے کے لوگوں میں پہنچا کر آ رہا ہوں۔ کیا یہ تعارف کافی نہیں ہے؟" میرے لہجے میں بپھرے ہوئے شیر کی دھاڑ تھی۔

مگر یہ دیکھ کر میرے ذہن میں اُلجھنیں اُتر آئیں کہ وہ میری تقریر سُننے کے باوجود خاموش اپنی رائفلیں تانے کھڑے رہے اور وہ میرے غصّے اور دھاڑنے سے ذرہ برابر بھی متاثر نہیں نظر آ رہے تھے۔

اچانک پھاٹک پر ایک سارجنٹ نمودار ہوا جو مجھے اچھی طرح پہچانتا تھا۔ مجھے دیکھ کر اُس کے ہونٹوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ ناچ اُٹھی۔

"سارجنٹ روز! ان لوگوں سے کہو کہ میرے ساتھ خطرناک مذاق کا سلسلہ ختم کر دیں اور اپنے غیر مناسب رویے پر مجھ سے معذرت طلب کریں۔ ورنہ میں ان سب کو..."

میری دھمکی کے جواب میں اس عیّار فرنگی کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ اور گہری ہو گئی۔ ابھی تک مجھے شعوری طور پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ لوگ مجھے حراست میں لے چکے ہیں۔ مگر اُن کی زہریلی مسکراہٹوں نے مجھے چونکا دیا۔

"شہباز خان!" سارجنٹ روز نے کرخت لہجے میں اپنی گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ "تمھاری حراست ہماری کسی غلط فہمی کا نتیجہ نہیں ہے۔ تمھاری گرفتاری کے احکامات جنرل ڈوگ کی طرف سے موصول ہوئے ہیں اور ہم اپنے جنرل کے حکم کی تعمیل کر رہے ہیں۔"

اُس کے دھماکا خیز انکشاف نے اچانک میری جسمانی قوتوں کو سلب کر دیا اور میرے دل و دماغ میں دھوئیں کے مرغولے اُٹھنے لگے۔

"اپنے ہتھیار ہمارے حوالے کر دو اور اپنی کرنی کا پھل بھگتنے کے لیے تیار ہو جاؤ!" اُس نے بڑے توہین آمیز انداز میں تلاشی لے کر میرے ہتھیار اپنے قبضے میں کر لیے۔

میں اگر چاہتا تو سارجنٹ کو اپنی ڈھال بنا کر فرار ہونے میں کامیاب ہو سکتا تھا مگر یہ بات میرے حلق سے نیچے نہیں اُتر رہی تھی کہ میری گرفتاری کے احکامات جنرل ڈوگ نے جاری کیے ہیں۔

یہ سب کچھ اچانک کیسے ہو گیا؟

چھاؤنی سے رُخصت ہونے سے پہلے اُس نے مجھے دوبارہ آنے کی پیش کش کی تھی اور اس کے لب و لہجے سے دوستانہ جذبات ظاہر ہو رہے تھے۔ میرے جانے کے بعد یہ واقعات پیش آئے ہوں گے جو اس وقت میری گرفتاری کا سبب بن گئے ہیں۔

"شہباز خان! اگر تمھیں اپنی زندگی عزیز ہے تو کوئی شرارت کرنے کی کوشش نہ کرنا ورنہ ہم تمھارا جسم گولیوں سے چھلنی کر دیں گے کیونکہ جنرل بہادر کا حکم ہے کہ مزاحمت کی صورت میں تمھیں موت کے حوالے کر دیا جائے۔ کل صبح تمھیں جنرل کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ اس لیے رات تمھیں اُس حوالات میں گزارنا پڑے گی جو یہاں سے چند قدم کے فاصلے پر ہے۔"

اُس نے فوجیوں کو ایک مخصوص اشارہ کیا۔ انھوں نے اپنی رائفلوں کی نالیں میری پسلیوں میں چبھوتے ہوئے مجھے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ میں اُلجھے ہوئے خیالات لیے اُن کے ساتھ چل پڑا۔

وہ مجھے ایک ایسے کمرے میں قید کر چکے تھے جس کی دیواریں پتھروں سے تعمیر کی گئی تھیں اور کمرے کے در و دیوار سے بدبو اور سڑاند اُٹھ رہی تھی۔ میں نے دروازے کا جائزہ لیا جو مضبوط تختوں سے بنایا گیا تھا۔ اُسے توڑنا ناممکن تھا۔ فرار ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کیونکہ مجھے اس بات کا یقین تھا کہ میری گرفتاری کسی زبردست غلط فہمی کے نتیجے میں عمل میں آئی ہے مگر فرنگی فوجیوں کا اہانت آمیز رویّہ میرے ان خیالات کی حوصلہ شکنی کر رہا تھا۔

کچھ دیر بعد کمرے کے دروازے پر قدموں کی چاپ اُبھری اور کسی نے دروازہ کھول کر کھانے کے برتن میری طرف بڑھا دیے اور ایک چھوٹا چراغ بھی جلا کر اُس خلا سے اندر رکھ دیا جس سے کھانا رکھا گیا تھا۔ پھر وہ خلا بند ہو گیا۔

میں نے کھانے کے چند نوالے زہر مار کیے اور پانی کا برتن ہونٹوں سے لگا کر اُسے خالی کر دیا۔ پھر پتھریلے فرش پر دراز ہو کر اس اُفتاد کے بارے میں غور کرنے لگا۔

★★

صبح ان لوگوں نے مجھے قیدیوں کا ناشتہ دیا۔ ناشتے کے بعد سنگینوں کے سائے میں وہ مجھے جنرل ڈوگ کے دفتر کی طرف لے چلے۔ مجھے زیرِ حراست پا کر بہت سے جانے پہچانے چہرے طنزیہ انداز میں گھورتے ہوئے خاموشی سے میرے قریب سے گزر گئے۔

مجھے ان تمام لوگوں کے بدلے ہوئے رویے دیکھ کر گہرا صدمہ ہوا۔ مجھے اس بات کا یقین ہوتا جا رہا تھا کہ میں کسی بڑی مصیبت کا شکار ہو چکا ہوں۔ اَن گنت زہریلے خدشات خون میں بچھوؤں کی طرح اُتر کر جسم کو اندر سے ڈنک مارنے لگے۔

جنرل اپنے دفتر میں موجود تھا جب وہ لوگ مجھے حراست میں لیے ہوئے اُس کے سامنے پہنچ گئے تو میں نے جنرل کی طرف دیکھا جو مجھے زیرِ حراست دیکھ کر اجنبی بنا بیٹھا رہا۔ ایک لمحے کے لیے میری نظریں اُس کی نیلی آنکھوں سے ٹکرائیں مگر ان میں دوستی کے کوئی آثار موجود نہیں تھے۔

"جنرل!" میں نے کھنکار کر اُسے اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا۔ "کیا میری گرفتاری تمھارے حکم سے عمل میں لائی گئی ہے؟ کیا تم اپنے دوستوں اور محسنوں کے ساتھ یہی سلوک کرنے کے عادی ہو؟ اگر میری گرفتاری تمھارے حکم سے عمل میں لائی گئی ہے تو میں اس کی وجہ ضرور جاننا چاہوں گا کہ دوستوں کی طرح رُخصت کرنے کے بعد یہاں لوٹ کر آنے پر دشمنوں جیسا رویّہ کیوں اختیار کیا گیا؟" میری بلند آواز میں بھرپور احتجاج تھا۔ "یاد رکھو جنرل!" میں نے اُسے خاموش پا کر دوبارہ کہا۔ "اگر تم اور تمھاری قوم اپنے دوستوں کے ساتھ اسی طرح اہانت آمیز رویّے کے ساتھ پیش آتی رہی تو تمھاری مضبوط حکومت کے سارے ستون اندر سے کھوکھلے ہو کر گرتے چلے جائیں گے۔ برائے مہربانی یا تو میری گرفتاری کی کوئی معقول وجہ بتاؤ یا پھر اس خطرناک مذاق کا سلسلہ ختم کرو۔ میرے دل میں اگر کوئی کھوٹ ہوتا تو تمھارے آدمی آسانی سے مجھے گرفتار کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے تھے۔ گرفتاری کے اس ڈھونگ کو جلد از جلد ختم ہو جانا چاہیے ورنہ میں تمھیں اپنا بدترین دشمن قرار دینے پر مجبور ہو جاؤں گا۔"

مگر جنرل ڈوگ کے چہرے پر میری اس تقریر کے جواب میں

کوئی ردِ عمل نہیں اُبھرا۔

اُس کی آنکھیں بدستور سرد مہری کا اظہار کرتی رہیں۔ جنرل ابھی تک خاموشی سے مجھے گھورے جا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اُس نے اپنا بُجھا ہُوا سگار اُٹھا کر ماچس کی تیلی سے جلایا اور دو تین گہرے کش لیتے ہُوئے اپنے حلق سے کثیف دُھواں خارج کرنے لگا۔

میں اُس کے رُوبرو مجرموں کی طرح کھڑا تھا۔ اُس نے مجھے بیٹھنے کے لیے بھی نہیں کہا تھا۔

"ہم دُشمنوں پر ہی نہیں بلکہ اپنے دوستوں پر بھی نگاہ رکھتے ہیں اور اُن کی مکمل نقل و حرکت سے باخبر رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔" اُس نے سگار کی راکھ جھاڑتے ہُوئے رعونت آمیز لہجے میں اپنی زبان کھولی۔ "یہی اصول ہماری سلطنت کی مسلسل کامیابیوں کا راز ہے کہ ہم ایک لمحے کی غفلت بھی برداشت نہیں کرتے۔ تمہیں گرفتار کرتے ہُوئے مجھے خود بھی افسوس ہو رہا ہے کیونکہ تمہاری گرفتاری سے میں ایک بہادر نوجوان کی خدمات سے محروم ہو جاؤں گا۔"

جنرل ڈوگ کا پُراسرار لہجہ مجھے موت کے سکوت میں غرق کر گیا۔ جنرل کی باتیں پگھلے ہُوئے سیسے کی طرح میرے کانوں میں اُتر گئیں۔

غصّے کی زیادتی سے میرے اعصاب کھنچنے لگے مگر میں ضبط کیے خاموشی سے جنرل ڈوگ کے چہرے کو گھورتا رہا جس کے لہجے سے مکمل اجنبیت کا اظہار ہو رہا تھا۔

"جنرل! ابھی تک اس بات کی وضاحت نہیں ہُوئی کہ مجھے کس جُرم کی پاداش میں اِس ذلت آمیز سلوک کا مستحق سمجھا گیا ہے؟" میرے لہجے میں شدید تلخی آ گئی۔ "کیا یہ میرا جُرم تھا کہ میں فوراً تمہارے اُکسانے پر چند سِکّوں کی خاطر اپنے ہم وطنوں کا خون بہانے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ تم میری گرفتاری ہی نہیں میری موت کے پروانے پر بھی دستخط کرنے کے مجاز ہو کیونکہ تم حکمران ہوتے ہو مگر اس کی وضاحت بہت ضروری ہے کہ مجھے کیوں گرفتار کیا گیا ہے؟"

"ہر چند کہ میں وضاحت کے لیے مجبور نہیں ہُوں۔" جنرل ڈوگ کی سرد آواز اُبھری۔ "مگر یہ ظاہر کرنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتا کہ میں نے تمہارے تعاقب میں اپنے دو جوانوں کو روانہ کیا تھا جب تک وہ واپس آ کر مجھے اپنی رپورٹ پیش نہیں کر دیتے تم جیل میں رہو گے۔ تمہاری آزادی کا دارومدار اس بات پر ہے کہ وہ تمہاری سرگرمیوں کے بارے میں کیا رپورٹ دیتے ہیں۔" یہ بھیانک انکشاف سُن کر میں سرتاپا لرز گیا۔

اچانک مجھے اپنا مستقبل تاریک نظر آنے لگا۔

"جنرل!" میں نے حتی الامکان پھر پُورا اعتماد کا مظاہرہ کرتے ہُوئے اُسے مخاطب کر کے کہا۔ "اگر مجھے اس بات کا ذرا سا گمان ہوتا کہ میں تمہاری نظروں میں مشکوک حیثیت رکھتا ہوں تو کبھی تمہارے ساتھ تعاون کرنے پر آمادگی کا اظہار نہ کرتا۔ مگر تمہارے اس انکشاف نے مجھے اپنی رائے بدلنے پر مجبور کر دیا ہے تم لوگ دُوسروں کو اس بات پر مجبور کرتے ہو کہ وہ تم پر اعتماد کرتے رہیں مگر تم خود کسی پر بھی اعتماد نہیں کرتے۔ کیا اس بات کی وضاحت نہیں کرو گے کہ میری نگرانی کی ضرورت کیوں محسوس کی گئی تھی؟"

"ہم اپنے قریب رہنے والے لوگوں کی زندگی کھنگال کر اچھی طرح چھان بین کرتے ہیں تب کوئی فیصلہ کرتے ہیں۔ اب اُس وقت تک تمہاری رہائی ممکن نہیں جب تک ڈوان اور ارنسٹ تمہارے بارے میں مکمل رپورٹ پیش نہیں کر دیتے۔" یہ کہہ کر وہ محافظوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ "اِسے لے جاؤ اور خطرناک قیدیوں کی جیل میں ڈال دو۔ آنے والا وقت اس کے مستقبل کا خود ہی کوئی فیصلہ کر دے گا۔"

میں نے احتجاجاً کچھ کہنا چاہا مگر محافظوں کی سنگینوں نے مجھے کچھ کہنے سے روک دیا اور میں ناچار خاموشی سے اُن کے ساتھ چل پڑا۔

ڈوان اور ارنسٹ تو قیامت تک اپنی کوئی رپورٹ پیش نہیں کر سکتے تھے کیونکہ انہیں میں نے خود اپنے ہاتھوں موت کی نیند سُلا دیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اب مجھے اپنی ساری زندگی تیرہ و تار جیل کی پتھریلی دیواروں کے درمیان گزارنی ہوگی کیونکہ وہ کٹ کر ارنسٹ دو لاشوں میں تبدیل ہو گئے تھے... اور قیامت تک اُن کی واپسی ممکن نہیں تھی۔ میں سنگینوں کے سائے میں جیل کی طرف بڑھتے ہُوئے میرے سر پر بہت ہی خوب صورت چکنا چُور ہو گئے تھے اور میں ایک شاید ہو کر تدبیر کرنے کی بجائے خود بھی درندوں کی بھینٹ چڑھ بے بس ہو کر رہ گیا تھا۔

جیل خانے کا محافظ مجھے حراست میں دیکھ کر بُری طرح چونک پڑا اور دیر تک مجھے پریشان نظروں سے گھورتا رہا... اس نے کچھ کہنے کے لیے مُنہ کھولا مگر دُوسرے لوگوں کی موجودگی محسوس کر کے مصلحتاً خاموش ہی رہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جیل خانے کا محافظ مجھے اچھی طرح پہچانتا تھا کیونکہ میں چند روز پہلے جنرل ڈوگ کی بھتیجی بینی ایلس کے ہمراہ اسی جیل خانے میں اپنے خیرہ دل باپ کی تلاش میں آ چکا تھا۔ ایلس نے میرا تعارف ایک ذمہ دار ہستی کے طور پر کرایا تھا مگر اب بالکل ایک خطرناک قیدی کی حیثیت سے مجھے اپنے سامنے پا کر اس کی تنقیدی نظریں میری بدولت ہی اس حیرت انگیز خوفناک تبدیلی کا سبب دریافت کر رہی تھیں۔

اس نے خاموشی سے ایک کوٹھڑی کا دروازہ کھول کر مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا اور دروازہ مقفل کر کے جانی اپنی پیٹی میں آویزاں کرتا ہُوا ان لوگوں کو رخصت کرنے چلا گیا جو جنرل ڈوگ کے حکم پر مجھے خطرناک قیدیوں کی جیل تک لائے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ انہیں رخصت کر کے پلٹا اور کوٹھڑی کے دروازے کے بیرونی جنگلے سے اندر جھانکتے ہُوئے بولا۔

"شہباز! کل تک تو تمہارا ستارہ بہت عروج پر تھا اور اپنی چمک سے دیکھنے والوں کی آنکھیں خیرہ کر رہا تھا۔ آج وہی ستارہ یکایک نحوست کے اندھیرے میں چھپ گیا ہے۔" اس کے ٹھہرے ہُوئے لہجے میں حیرت اور افسوس کا گہرا تاثر تھا۔

"جب ستارے اپنی چال بدلتے ہیں تو بہت سے انسان اس کی گردش سے متاثر ہو کر ناگہانی مصیبت، حال اور افتاد کا شکار ہو جاتے ہیں۔ تمہیں میری اس بدلی ہُوئی حالت پر کسی حیرت کا اظہار نہیں کرنا چاہیے کیونکہ تم لوگ ایسے ہولناک مناظر آئے دن دیکھتے رہنے کے عادی ہو چکے ہو۔" میں نے تلخی سے جواب دیا۔ "تمہارے آقا بدلتے ہُوئے موسم کے ساتھ ساتھ پیادوں کو تبدیل کرنا ضروری خیال کرتے ہیں لہٰذا میں بھی اس شخص کے مزاج کی تبدیلی کا شکار ہُوا ہُوں جو مجھے اپنا آلۂ کار بنانے کے لیے مختلف ہتھکنڈے استعمال کر رہا ہے۔"

محافظ نے میری یہ تلخ باتیں سُن کر گھبرائی ہُوئی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا اور مجھے تنہا چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔

اس کے جانے کے بعد تفکرات نے دل و دماغ کو گھیر لیا اور میں جنرل ڈوگ کے بدلے ہُوئے رویے پر غور کرنے لگا۔ جنرل ڈوگ کے حوصلہ شکن رویے سے ظاہر ہوتا تھا کہ مجھے اپنے شکنجے میں جکڑ کر وہ یہ باور کرا چکا تھا کہ اس کی نظروں میں میری کوئی خاص حیثیت نہیں ہے۔ وہ میں وہ نہ تھا جو ہر قسم کے جوڑ کی تمنا کر سکتا تھا۔ وہ مجھے فوج میں منتقل کرنے کے لیے کافی تھا... مگر اب وہ شکی مزاج مجھے شک و شبہے کی نظر سے دیکھنے لگا تھا۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو

جنرل کو میری نگرانی کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ یہ میری پہلے کی وفاداری کے خلاف نفرت سے بھرا ہُوا تھا اور اب تو سینہ میں سوالوں کی تپش سے جلا جا رہا تھا۔

حالات کی اس بھیانک تبدیلی کے سبب یکایک مجھے اپنی ساری صلاحیتیں ماند پڑتی محسوس ہُوئیں۔ میں بزدل یا کمزور اعصاب کا مالک نہیں تھا کہ موت کو سامنے پا کر زندگی کی بھیک مانگنے کے لیے آمادہ ہو جاتا... مگر حالات اس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ میرا دشمن کس قدر عیار اور ذہین ہے کہ مجھ جیسے چالاک سے بھی کام لینا ہو گا۔ فریب کھا کر فریب کار بننا ضروری ہو گیا تھا۔

میں چاہتا تو اس جیل سے خود بھی فرار ہونے کے امکانات پیدا کر سکتا تھا اور اپنے ساتھ بوڑھے باپ کو بھی برسوں کی طویل قید سے رہائی دلا سکتا تھا... مگر یہ کام میں اس وقت تک نہیں کر سکتا تھا جب تک کہ میرا باپ شالیار دوبارہ ذہنی طور پر صحت یاب نہ ہو جاتا۔ مانک ٹالہ کے کہنے کے مطابق بہترین انگریز ڈاکٹر دن رات اس کا علاج کر رہے تھے اور اس کی ذہنی صحت کے بارے میں بہت پُرامید تھے۔ یہی ایک مجبوری تھی جو مجھے دوبارہ پشاور چھاؤنی تک لے آئی تھی اور اسی مجبوری کے تحت میں نے ابھی تک اپنی گرفتاری کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی تھی۔ میں طویل اعصابی جنگ سے بچنا چاہتا تھا اور اس اعصابی جنگ سے بچنے کی ایک ہی صورت تھی کہ میں حتی الامکان اس عیار قوم کے فرزندوں کو یہ یقین دلاتا رہوں کہ میں تاج برطانیہ کا مکمل وفادار ہوں اور اپنے اندر ان کے خلاف کسی قسم کے معاندانہ جذبات نہیں رکھتا۔

اچانک فضا میں زنجیروں کی مسلسل جھنکار سن کر میں چونک پڑا اور الجھنوں کے دائرے سے نکل کر اس طرف دیکھنے لگا جدھر سے زنجیروں کی جھنکار مسلسل ایک گونج پیدا کر رہی تھی... اور پھر مجھے اپنا بوڑھا شیر دل باپ جیل کے محافظوں کے درمیان نظر آ گیا۔

زنجیروں کی جھنکار اسی کے چلنے سے پیدا ہو رہی تھی۔

میں نے اس کے انداز خرام کا گہری نظروں سے جائزہ لیا۔ اس کے بوڑھے چہرے پر خوفناک سنجیدگی کی گہری تہ جمی ہوئی تھی اور وہ بڑے اعتماد اور وقار سے قدم اٹھاتا ہوا اپنی کوٹھری کی طرف چلا جا رہا تھا۔ معاً وہ میری کوٹھری کے سامنے رکا اور شفقت آمیز نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بڑے عجیب انداز سے مسکرانے لگا... پھر وہ ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گیا۔

اس کی مسکراہٹ میں مجھے بے پناہ اپنائیت محسوس ہوئی تھی۔ کیا میرے بوڑھے باپ نے مجھے اپنے بیٹے کی حیثیت سے پہچان لیا ہے؟ یہ سوال بار بار میرے دل و دماغ کے دروازوں پر دستک دیتے ہوئے جواب طلب کرنے لگا۔ میرا مشاہدہ دھوکا نہیں کھا سکتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں محبت اور اپنائیت کا گہرا تاثر موجود تھا۔

میرے شعور اور لاشعور میں ایک خوفناک جنگ شروع ہو گئی اور میرا ذہن الجھتا چلا گیا۔

شام کے سائے گہری تاریکی کا روپ دھار کر جیل کے در و دیوار پر محیط ہو کر اندھیرے کی لامتناہی سلطنت کا اعلان کرنے لگے تو دل و دماغ پر یاس آمیز برف سی جمنے لگی۔ آزادی چھن جانے کا رنج فرسا خیال نفرت و انتقام کے شعلوں کو ہوا دیتا ہوا میرے وجود کو جھلسانے لگا۔

جیل کی کوٹھری کے باہر دیوار پر مٹی کے تیل کے لیمپ روشن ہوئے تو میں اٹھ کر سلاخوں کے قریب آ بیٹھا۔ جیل کا محافظ کرتار سنگھ اپنے دو سپاہیوں کی رفاقت میں قیدیوں کا کھانا لے کر نمودار ہوا اور میری کوٹھری کے آگے کھانے کا برتن رکھتے ہوئے بولا: "کھانے کے بعد برتن یہیں چھوڑ دینا۔"

"میں کھانا نہیں کھاؤں گا، کرتار سنگھ!" میں نے قیدیوں کے کھانے کو حقارت سے دیکھتے ہوئے کہا: "میں تمھارے سنگدل اور عیار آقا کا نمک کھا کر پہلے ہی زبردست بدہضمی کا شکار ہو رہا ہوں۔"

"جیل کی دیواروں کے درمیان آنے والا ہر قیدی چند روز تمھاری طرح کھانے سے انکار کرتا رہتا ہے مگر جب بھوک کا بھیانک اژدہا اس پر موت کا سوگ طاری کر دیتا ہے تو یہ بد ذائقہ کھانا بڑی رغبت سے کھانے لگتا ہے۔" کرتار سنگھ میرے انکار کے باوجود کھانے کا برتن وہیں چھوڑ کر چلا گیا۔

بھوک اور پیاس کی شدت سے میری آنتیں سلگ رہی تھیں... مگر قیدیوں کا کھانا کھانے کو میرا جی نہیں چاہ رہا تھا۔ میں نے پانی کا بھرا ہوا برتن اٹھایا اور اسے حلق میں انڈیل کر برتن واپس وہیں رکھ دیا۔

کچھ دیر بعد کرتار سنگھ اپنے کاموں سے فراغت پا کر واپس آیا اور میری کوٹھری کے آگے کھانے کا برتن دیکھتے ہی ٹھٹک کر رہ گیا۔ "تمھیں کچھ کھا لینا چاہیے شہباز! ورنہ کوئی فیصلہ کن مرحلہ آنے سے پہلے زندگی کی توانائیوں سے محروم ہو جاؤ گے۔" اس کے نرم لہجے میں ہمدردی کی جھلک موجود تھی۔

"اب میں فرنگیوں کا نمک نہیں کھاؤں گا۔" میں نے سختی سے جواب دیتے ہوئے کہا: "کیونکہ پہلے کھائے ہوئے نمک کی مجھے بھاری قیمت ادا کرنا پڑ رہی ہے۔ کھانا اٹھا کر لے جاؤ، ورنہ میں ٹھوکر مار کر اسے ضائع کر دوں گا۔"

کرتار سنگھ نے الجھی ہوئی نظروں سے میری جانب دیکھا اور کھانے کا برتن اٹھا کر واپس لے گیا۔

اس کے جانے کے بعد دوبارہ قبرستان جیسی گہری خاموشی جیل کے در و دیوار پر اپنی نحوست زدہ پرچھائیاں ڈالنے لگی۔ اچانک مجھے جنرل ڈوگ کی چہیتی بیٹی ایلس یاد آ گئی۔ وہ میری وجیہ شخصیت سے بے حد متاثر تھی اور اپنی قہر خیز رعنائیاں مجھ پر نچھاور کرنا چاہتی تھی۔ اگر میں کسی طرح اس پر اپنی بے گناہی ظاہر کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو عین ممکن ہے کہ وہ اپنے باپ سے میری رہائی کی پُرزور سفارش کرے۔ ایلس میری امیدوں کے ڈوبتے ہوئے سورج کی آخری کرن

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بن کر ابھرنے لگی مگر اس قید خانے میں محبوس رہتے ہوئے اس کی ذات تک رسائی ایک لاینحل مسئلہ تھا۔

میں دیر تک ایلس کے بارے میں سوچتا رہا اور مستقبل کے منصوبے بناتا رہا۔

یہ اس جیل میں میری پہلی رات تھی جو پریشانی کے عالم میں جاگتے ہوئے ہی گزر گئی۔ صبح کی پہلی کرن روزن زنداں میں اتری تو میں جنگلے کے قریب نیم دراز ہو کر ابھرتے ہوئے سورج کا نظارہ کرنے لگا۔ مجھے یقین تھا کہ ایلس کو میری گرفتاری کی خبر مل گئی تو وہ میری خبر گیری کے لیے ضرور آئے گی۔

... کرتار سنگھ قیدیوں کا ناشتہ لے کر نمودار ہوا تو سارے قیدی جنگلوں کے ساتھ لٹک کر اس سے اپنا ناشتہ وصول کرنے کے لیے بے چین ہو گئے۔ کرتار سنگھ میرا ناشتہ جنگلے کے سامنے رکھتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا کہ اچانک میں نے آواز دے کر اسے روک دیا۔

"کرتار سنگھ!" میری آواز میں بھرپور اعتماد تھا۔ "میں یہ کھانا نہیں کھاؤں گا۔ آئندہ تم میرے لیے کھانا لانے کی زحمت نہ کرنا۔"

اس نے ایک نظر میری جانب دیکھا اور ناشتے کا برتن اٹھا کر چل دیا۔

مجھے اس خوفناک جیل میں آئے ہوئے چوبیس گھنٹے سے زائد وقت گزر چکا تھا اور اس دوران میں نہ میرا کوئی ہمدرد میرا حال پوچھنے آیا تھا اور نہ ہی اناج کا کوئی دانہ میرے حلق سے نیچے اترا تھا۔ حتیٰ کہ میں نے ابھی تک جیل کا کھانا جو عام طور پر قیدیوں کو تقسیم کیا جاتا ہے، اسے کھانے سے انکار کر دیا تھا مگر اب خالی پیٹ معدے میں آگ لگی ہوئی تھی اور فی الحال مجھے اس آگ کو بجھانے کی کوئی دوسری سبیل نظر نہیں آ رہی تھی۔

میں کوٹھری کے دروازے کے قریب نڈھال سا پڑا تھا کہ اچانک ایک مانوس آواز سن کر چونک پڑا اور آنے والے کو دیکھنے لگا۔

"بدھا کی قسم! تمھیں اس حال میں دیکھ کر میرے دل کو بہت صدمہ ہو رہا ہے۔ تم جیسے سچے اور بہادر انسان کی اس طرح تذلیل نہیں ہونی چاہیے تھی۔" مانک ٹالہ مجھے سلاخوں کے پیچھے بیٹھے ہوئے دیکھ کر اچانک بلند آواز میں چلا اٹھا تھا۔

"مانک ٹالہ!" میں نے گہری سنجیدگی سے جواب دیتے ہوئے کہا: "اگر تم اسی طرح بلند آواز میں میرے ساتھ ہونے والے ظلم کے خلاف تبصرہ کرتے رہے تو بہت جلد تم خود بھی ان سلاخوں کے پیچھے پہنچ جاؤ گے۔"

"شہباز!" مانک ٹالہ بے حد اداس نظر آنے لگا: "مجھے بتاؤ کہ میں تمھاری رہائی کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟ مانک ٹالہ تم سے عقیدت رکھتا ہے اور تم پر جان دینے کا حوصلہ بھی رکھتا ہے۔"

"مانک ٹالہ!" میں نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا: "اگر تم میری مدد کرنا ہی چاہتے ہو تو پھر جنرل ڈوگ کی بیٹی ایلس تک میری گرفتاری کی خبر پہنچا دو اور میرا یہ پیغام بھی دے دو کہ شہباز خان جیل کی سلاخوں کے پیچھے تمھارے قدموں کی آہٹ کا منتظر ہے۔ کیا تم میرا یہ کام کر سکو گے؟" میں نے سوالیہ نظروں سے اس کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

"کیوں نہیں!" اس نے پُراعتماد انداز میں مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "تمھاری رہائی کے لیے تو میں آگ اور خون کے سمندر سے بھی گزرنے کے لیے تیار ہوں۔"

"ٹھیک ہے مانک ٹالہ! تم اپنی پہلی فرصت میں ایلس سے مل کر اسے میرے حالات سے باخبر کر دو... اور اگر ہو سکے تو آتے ہوئے میرے کھانے کے لیے بھی کچھ لیتے آنا کیونکہ میں نے جیل کا کھانا کھانے سے انکار کر دیا ہے۔"

مانک ٹالہ اثبات میں سر ہلاتا ہوا واپس چلا گیا اور میں ایک طویل سانس اپنے سینے سے خارج کرتے ہوئے ایلس کے بارے میں سوچنے لگا جو اس وقت میری امیدوں کا مرکز بنی ہوئی تھی۔

کرتار سنگھ دوپہر کا کھانا جنگلے کے باہر رکھ کر آگے بڑھ گیا تو میں نے اس کھانے کو حقارت بھری نظروں سے دیکھا اور ہاتھ مار کر کھانے کا برتن فرش پر الٹ دیا۔ کرتار سنگھ اپنے کام سے فراغت پا کر واپس آیا تو کوٹھری کے باہر بکھرا ہوا کھانا دیکھ کر آگ بگولا ہو گیا۔

"شہباز خان!" اس نے کسی زہریلے ناگ کی طرح پھنکارتے ہوئے مجھے مخاطب کیا: "تم نے رزق کی توہین کر کے میری ہمدردیاں کھو دی ہیں۔ اب میں تمھیں اس وقت تک کھانا مہیا نہیں کروں گا جب تک تم اپنے رویے کی معافی نہیں مانگو گے۔"

"کرتار سنگھ!" میں نے لہجے میں سختی پیدا کرتے ہوئے جواب دیا۔ "شہباز جب تک اس جیل میں تمھارا مہمان رہے گا، تم سے کبھی کھانا طلب نہیں کرے گا۔"

"شہباز خان!" کرتار سنگھ نے گہرے طنز سے جواب دیتے ہوئے کہا: "فرنگیوں کے بارے میں تمھارے سارے اندازے غلط ثابت ہوں گے۔ یہ لوگ وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ اپنے رویے میں تبدیلی پیدا کرنے کے عادی ہیں۔ اب یہ لوگ اپنی شرائط منوائے بغیر کبھی تمھیں اس قید خانے سے باہر نہیں نکالیں گے۔ اگر تمھاری کوئی خوش فہمی

باقی ہے تو اس کا گلا اپنے ہاتھوں سے گھونٹ کر حالات کے ساتھ سمجھوتہ کرلو۔ ورنہ زندگی اس سے بھی زیادہ بھیانک اور اذیت ناک ہوجائے گی۔" کرتار سنگھ نے مشورہ دیا۔ اس کا لہجہ ایک بار پھر نرم ہوگیا تھا۔

وہ مجھے حقیقت پسند بننے کا مشورہ دے کر میری نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ اس کی یہ باتیں مجھے نہ جانے کیوں بہت بری لگی تھیں... میں اپنی زندگی ہمیشہ اسی تاریک جیل خانے میں گزارنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس لیے میں اپنے طور پر خود کو حق بجانب سمجھتا تھا کہ اپنے پرجوش احتجاج کے ساتھ جیل کے منتظمین سے تعاون کرنے سے انکار کردوں تاوقتیکہ جنرل ڈوگ اپنا فیصلہ بدل کر مجھے دوبارہ اپنے دوستوں کے حلقے میں شامل نہیں کرلیتا۔

سہ پہر کے قریب مانک ٹالا اپنی بغل میں کچھ دبائے ہوئے نمودار ہوا تو میں نے اپنی پوری توجہ اس کی طرف مرکوز کردی۔ "جنرل ڈوگ کی بیٹی تک تمھاری گرفتاری کی اطلاع پہنچا دی گئی ہے۔" مانک ٹالا نے خاموشی سے کھانے کی چیزیں میرے آگے رکھتے ہوئے کہا...

"تمھاری گرفتاری کی خبر سن کر چند لمحوں تک تو اسے میری بات پر یقین ہی نہیں آیا... لیکن جب میں نے کہا کہ وہ خود خطرناک قیدیوں کی جیل میں جاکر تم سے ملاقات کرسکتی ہے اور دیکھ سکتی ہے کہ تم اس وقت صرف شہباز رہ گیا ہے۔ اس سے اعتماد کا تمغہ واپس لے لیا گیا ہے... اور اس تبدیلی کا ذمے دار خود اس کا باپ جنرل ڈوگ ہے جو چند حاسدوں کی باتوں میں آکر ایک بہادر انسان کو زبردستی مجرم بنانے پر تلا ہوا ہے۔"

مانک ٹالا اپنی کارگزاری سنا رہا تھا اور میں تشکر کی نگاہوں سے اس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔

"شہباز! اسے تمھاری گرفتاری سے بھاری صدمہ پہنچا ہے۔ وہ تمھاری رہائی کے لیے بھرپور کوشش کرے گی۔" مانک ٹالا کہہ رہا تھا۔

وہ اپنی سرگزشت سنا کر خاموش ہوا تو میں نے اپنے ہونٹوں پر طمانیت بھری مسکراہٹ بکھیر لی۔ میں باپ بیٹی کے تصادم پر غور کررہا تھا۔ جانے کیوں مجھے اس بات کا یقین تھا کہ ایلس مجھے رہا کرانے میں کامیاب ہوجائے گی۔

شام کا دھندلکا زنداں کے در و دیوار پر تیزی سے یورش کررہا تھا کہ قدموں کی ہلکی سی آواز سن کر میں نے اپنی کوٹھڑی سے جھانک کر دیکھا تو ایلس جیل کے محافظ کرتار سنگھ کے ساتھ آتی دکھائی دی۔

اس نے میری کوٹھڑی کے سامنے رکتے ہوئے ایک نظر کرتار سنگھ کی طرف دیکھا جو سلام کرتا ہوا فوراً پیچھے ہٹ کر اتنی دور کھڑا ہوگیا کہ وہاں سے وہ ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو نہیں سن سکتا تھا۔ ایلس کے چہرے پر ہلکی سی اداسی جھلک رہی تھی۔

"شہباز! ابھی تک میری اپنے ڈیڈی سے ملاقات نہیں ہوئی ورنہ تمھاری گرفتاری کا سبب ان سے ضرور دریافت کرتی۔" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "تمھیں گرفتار کرتے وقت تم پر کیا الزام عائد کیا گیا ہے؟"

"ایلس ڈوگ!" میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "جب حکمران کسی شخص کو ناپسندیدہ شخصیت قرار دیتے ہیں تو پھر اس کی آزادی سلب کرکے اسے ناکردہ گناہوں کے صلے میں جیل بھیج دیتے ہیں۔ تمھارے باپ نے میرے ساتھ بھی سلوک کیا ہے جو تمھاری قوم کے دوسرے لوگ محکوم قوموں کے وفاداروں کے ساتھ کرتے ہیں۔ اس بات کا انکشاف بھی ہیں پر ہوا... کہ میں اپنے ان گنت ہم وطنوں کا خون بہانے کے باوجود حکمران طبقے کی نظروں میں ایک مشکوک آدمی تھا۔ میں تو جرگی مہم سے واپس آکر اپنا انعام وصول کرکے اپنے قبیلے کے لوگوں کو بہتیا کر واپس آیا تو مجھے جنرل ڈوگ کے حکم پر چھاؤنی کے دروازے پر روک کر میرے ہتھیار مجھ سے لے لیے گئے اور مجھے بتایا گیا کہ یہ گرفتاری جنرل ہی کے حکم پر عمل میں لائی جارہی ہے۔ میں اگر چاہتا تو ان لوگوں میں سے کوئی بھی مجھے گرفتار نہیں کرسکتا تھا۔ میں ان سے لڑتا ہوا ان کا گھیرا توڑ کر فرار ہونے میں کامیابی حاصل کرسکتا تھا... مگر میں نے ایسا کرنے کے بجائے مفاہمت کا راستہ اختیار کیا اور اپنی گرفتاری سے لے کر اب تک کوئی کوشش نہیں کی۔ مجھ سے قیدیوں جیسا سلوک کرتے ہوئے مجھے ان کا کھانا دیا گیا جسے میں نے کھانے سے انکار کردیا۔" میں اپنی روداد سنا کر خاموش ہوگیا۔

"کیا اس دوران تمھیں ڈیڈی کے سامنے پیش نہیں کیا گیا۔" اس نے وضاحت طلب نگاہوں سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"تمھارے ڈیڈی نے مجھ پر جو الزام لگایا ہے، انصاف کی رو سے مجھے اس الزام کے تحت مجرم قرار نہیں دیا جاسکتا۔" میرے لہجے میں ہلکی سی تلخی آگئی۔ "ان کا کہنا ہے کہ جب میں پشاور چھاؤنی سے انعام لے کر اپنے قبیلے کی طرف روانہ ہوا تھا تو فرنگی جاسوس میرے تعاقب میں روانہ کیے گئے تھے۔ وہ جب تک میری نقل و حرکت کے بارے میں اگر انھیں سب کچھ نہیں بتلادیتے اس وقت تک مجھے جیل کی خوف ناک دیواروں میں مقید رہنا ہوگا۔ ان کی رپورٹ ملنے کے بعد ہی میرے بارے میں کوئی فیصلہ کیا جائے گا۔ مجھے اگر یہ بات پہلے سے معلوم ہوتی کہ تم لوگ اپنے مخلص دوستوں کے ساتھ بھی ایسا بھیانک سلوک کرنے کے عادی ہو تو میں کبھی تعاون کا بڑھا ہوا ہاتھ قبول نہ کرتا۔ تم لوگوں نے میری وفاداریوں کے صلے میں میری آزادی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سلب کرلی ہے۔ کیا یہ میرے ساتھ سراسر زیادتی نہیں ہے؟"

میری آواز بتدریج بلند ہورہی تھی۔

"یقین کرو ایلس اگر تمھارے ڈیڈی نے میرے ساتھ انصاف پسندی سے کام نہ لیا تو جیل کی یہ دیواریں مجھے زیادہ دیر تک مقید نہیں رکھ سکیں گی۔ پھر میں تمھارا دوست نہیں بلکہ ایک دشمن کہلاؤں گا۔ تمھاری ایک معمولی سی کوشش مجھے انتقام کی آگ سے محفوظ رکھ سکتی ہے اور تمھارے ایک دوست کے ساتھ جو زیادتی ہورہی ہے اس کی تلافی ہوسکتی ہے۔"

ایلس میری جذباتی باتوں کے جواب میں پریشان نظروں سے دیکھتی ہوئی کسی مجسمے کی طرح ساکت کھڑی تھی۔

"شہباز!" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "مجھے یقین ہے کہ تمھاری گرفتاری کسی غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔ میں ڈیڈی سے تمھاری رہائی کے لیے ضرور بات کروں گی۔ مگر اس دوران تم کوئی ایسی حرکت نہیں کروگے جس سے میری سفارش کے بے اثر ہونے کا اندیشہ ہو۔"

"ٹھیک ہے ایلس!" میں نے مفاہمت کی راہ ہموار کرتے ہوئے جواب دیا۔ "میں اس وقت تک اپنا لائحہ عمل مرتب نہیں کروں گا جب تک تم اپنی کوششوں سے مایوسی کا اعلان نہیں کردیتیں۔"

میری یہ بات سن کر ایلس کا چہرہ اندرونی جوش و مسرت سے گلنار ہوگیا اور وہ خدا حافظ کہتی ہوئی رخصت ہوگئی۔

مانک ٹالا کی لائی ہوئی اشیا زہر مار کرنے کے بعد مجھے اپنے حواس دوبارہ بحال ہوتے محسوس ہوئے۔ اس ساڑھے چار فٹ کے نوجوان نے ان حالات میں بھی میرے لیے خاصا اہم کردار ادا کیا تھا۔ اب مجھے اس کی عقیدت اور سچائی میں کوئی شبہ نہیں رہا تھا۔ اس نے ایلس سے میری ملاقات کراکے میرے نزدیک اپنی ایک خاص حیثیت پیدا کرلی تھی۔

میں نے اپنی کارکردگی کا جائزہ لیا تو حوصلہ افزا نتائج نے مجھے بڑی حد تک مطمئن کردیا۔

اگرچہ اپنی گرفتاری کے وقت سے لے کر اب تک میرے اندر فرنگی قوم کے خلاف نفرت اور انتقام کے شعلے بھڑکتے ہوئے محسوس ہورہے تھے... مگر میں اپنے اس انتقام کی آگ کو مصلحت کی دبیز تہوں کے نیچے دبانے میں کامیاب ہورہا تھا۔ ابھی تک میری یہی کوشش تھی کہ حالات اس حد تک نہیں بگڑنے چاہییں کہ مجبوراً فرنگیوں کے خلاف ہتھیار اٹھاکر اعلان جنگ کردوں۔ فرنگیوں سے دور ہونے کے بعد میں اپنے باباشاہ کی ذات سے بھی دور ہوجاتا... جبکہ میری یہاں آمد کا مقصد ہی اس کی رہائی تھا... مگر چونکہ میرا بابا دماغی عارضے کا شکار تھا اور اس کے مکمل صحت یاب ہونے تک اس کا فرنگی ڈاکٹروں کے زیر علاج رہنا ضروری تھا۔ اس لیے مجھے مصلحت کے تقاضے ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہییں تھے۔

مجبوری کے اس زخم کے سامنے مجھے اپنے ساتھ جیل کے در و دیوار تک جلتے ہوئے محسوس ہورہے تھے۔ اگر بابا شاہیار کا معاملہ درمیان نہ ہوتا تو نہ جانے کتنے فرنگی میری گرفتاری کے وقت سے لے کر اب تک گولیوں کا نشانہ بن چکے ہوتے اور میں سنگلاخ چٹانوں میں واپس پہنچ چکا ہوتا۔

میں نے آنکھیں بند کرلیں اور اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنے لگا جو اچانک ہی خوفناک طوفانوں کی زد میں آگیا تھا۔

سہ پہر ہوگئی مگر جنرل کی طرف سے میرے لیے کوئی نیا حکم جاری نہ ہوا تو میری روشن امیدیں یاسیت کی تاریکی سے دھندلانے لگیں۔ میں امید و بیم کے دوراہے پر بیٹھا آہستہ روی سے گزرتے ہوئے وقت کی آہٹیں سنتا رہا۔

مجھے اپنی امیدیں دم توڑتی ہوئی محسوس ہورہی تھیں۔

شاید ایلس اپنے باپ کو مطمئن نہیں کرسکی تھی ورنہ اب تک جنرل کا بلاوا آجانا چاہیے تھا۔ جوں جوں دن ڈھلتا جارہا تھا میری تشویش بھی برابر بڑھتی ہی جارہی تھی۔

شام کے سائے گہرے ہوگئے تو دل و دماغ سے خوش فہمی کے بادل بھی کافور ہوکر غائب ہوگئے اور میں ان گنت الجھنوں کے بھنور میں گھرا ہوا حالات کی اس ہولناک تبدیلی کا ماتم کرتا رہ گیا جو میری آزادی کی دشمن بن کر اچانک ہی ظہور پذیر ہوئی تھی۔

طبیعت میں اس قدر گھٹن اور بے چینی تھی کہ اپنی قید کا ایک ایک لمحہ مجھے ایک ایک صدی کے برابر طویل اور بھاری لگنے لگا تھا۔

✸ مجھے آج اس ہولناک قید خانے میں تیسرا روز تھا۔ ایلس سے ملاقات ہوئے چھتیس گھنٹے گزر چکے تھے۔ اب اپنی رہائی کی مجھے کوئی امید نظر نہیں آ رہی تھی۔ حالات جوں کے توں تھے۔ مجھے اپنے وجود میں اس قدر گھٹن اور بےچینی محسوس ہونے لگی کہ اس قید خانے میں وقت گزارنا مشکل نظر آنے لگا۔

دوپہر کے قریب قدموں کی آہٹ سن کر میں نے جنگلے کے باہر نظر ڈالی تو کرنل رستگو چار رائفل بردار جوانوں کے ساتھ اپنی کوٹھری کی طرف آتا دکھائی دیا۔

اس نے خاموشی سے قفل کھول کر مجھے باہر آنے کا اشارہ کیا۔ میں جیسے ہی کوٹھری سے نکلا، رائفل بردار جوانوں نے مجھے اپنے گھیرے میں لے لیا۔ "چلو جنرل ڈوگ سے اپنی قسمت کا فیصلہ سن لو۔" ان چاروں میں سے ایک نے کہا۔

میں ان کے جلو میں غوطے کھاتا ہوا، محافظوں کی نگرانی میں جنرل ڈوگ کے دفتر کی طرف چل دیا۔ راستے میں مجھے ایسے ان گنت افراد بھی ملے جنھوں نے چند روز قبل میری خوش قسمتی اور جنرل ڈوگ کی نگاہِ خاص کے سلسلے میں مبارک باد دی تھی۔۔۔ لیکن آج وہ سب کے سب سرسری نظر سے مجھے حراست میں دیکھ کر یوں خاموشی سے گزر گئے جیسے زندگی میں اس سے پہلے ہماری کوئی ملاقات ہی نہیں ہوئی تھی۔

میں نے ابھی تک اپنے قدموں میں کوئی لغزش نہیں آنے دی تھی اور میں روایتی وقار کے ساتھ قدم اٹھاتا ہوا جنرل ڈوگ کے دفتر کے سامنے پہنچ گیا۔

اردلی نے دروازہ کھول کر ہمیں اندر جانے کا اشارہ کیا اور میں رائفل کی نوک پر چلتا ہوا جنرل ڈوگ کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ ایک جانب کرسی پر ایلس بیٹھی مجھے ہمدردی کی نگاہ سے دیکھ رہی تھی۔ جنرل ڈوگ منہ میں سلگتا ہوا سگار دبائے گہری نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

اس کی سرد اور جذبات سے عاری، بے رحم نیلی آنکھیں میرے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا جائزہ لیتی رہیں۔۔۔ پھر اس نے سگار کا ایک کش لے کر اپنے حلق سے کثیف دھواں اگلتے ہوئے کہا۔

"شہباز خان! اگر ارنسٹ اور ڈان مجھے واپس آ کر تمھارے بارے میں کوئی رپورٹ دے دیتے تو مجھے تمھارے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ کرنے میں آسانی ہو جاتی۔ میں حیرت زدہ ہوں کہ انھیں گئے ہوئے آج تیسرا روز ہے۔ آخر وہ ابھی تک اپنی رپورٹ لے کر میرے سامنے کیوں نہیں آئے۔ وہ میرے آزمودہ نوجوان تھے۔ ان سے کسی کوتاہی کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ ان کے اس طرح لاپتہ ہونے پر مجھے بےحد تشویش ہے۔ مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے تم نے اپنی سرگرمیوں کو ہماری نظروں سے پوشیدہ رکھنے کے لیے ان دونوں کو حادثاتی موت کا شکار بنا دیا ہے۔ تم ابھی تک بہت الجھی ہوئی اور پراسرار شخصیت ثابت ہوئے ہو اور تمھارے بارے میں یہ یقین سے کہنا مشکل ہے کہ تمھارا اگلا قدم کیا ہو گا؟"

جنرل ڈوگ ایش ٹرے میں سگار کی راکھ جھاڑتے ہوئے خاموش ہو گیا۔

میں نے سنجیدگی سے اس کی باتوں پر غور کرتے ہوئے جواب دیا۔ "تم نے ابھی تک میرے سامنے یہی ثابت کیا ہے کہ تم پر اعتماد کر کے میں نے اپنی زندگی کی سب سے بھیانک غلطی کی ہے۔ تمھارے پاس آنے سے پہلے مجھے اس بات کا احساس تک نہیں تھا کہ تم نے کسی کو میری نگرانی سونپ رکھی ہے۔ جب میں ان کے بارے میں کچھ جانتا ہی نہیں تو مجھ پر یہ الزام کس طرح عائد کیا جا سکتا ہے کہ میں ان کی گمشدگی کا ذمے دار ہوں؟"

"پھر ابھی تک وہ تمھارے بارے میں مجھے کوئی رپورٹ کیوں نہیں دے سکے۔ وہ دونوں تجربہ کار اور جنگجو نوجوان تھے۔ اس سے پہلے ان کی خدمات کی شاندار مثالیں میرے سامنے ہیں۔ مجھے سو فیصد اس بات کا یقین ہے کہ وہ تمھارے ہاتھوں بدترین انجام کو پہنچ چکے ہیں۔ ورنہ ان کے اس طرح غائب ہونے کی کوئی وجہ ممکن نہیں۔" جنرل ڈوگ نے خشک لہجے میں جواب دیا۔

"جنرل! جس علاقے میں میرا قبیلہ آباد ہے وہاں تمھاری قوم کے کسی فرد کا جانا ممکن نہیں۔ معلوم نہیں وہ کہاں تک میرا تعاقب کرنے میں کامیاب ہوئے ہوں گے۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ رہزنوں کا شکار ہو گئے ہوں۔ مجھے اپنے سفر کے دوران بھیڑیوں کے ایک زبردست غول سے واسطہ پڑا تھا۔ ممکن ہے بے خبری میں وہ انھی بھیڑیوں کا شکار ہو گئے ہوں۔۔۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ عیاشیوں میں پڑ کر تمھارے احکامات بھول چکے ہوں۔ غرضیکہ تمھارے بیان کردہ حالات کے مطابق ان کی زندگیوں کے بارے میں کوئی حتمی بات نہیں کہی جا سکتی۔ ممکن ہے کسی حادثے کا شکار ہو کر وہ کہیں بے بس پڑے ہوں۔ میں ان کے کسی فعل کا ذمے دار نہیں ہو سکتا کیونکہ میں اس حقیقت سے مکمل طور پر بے خبر تھا کہ وہ تمھارے جاسوسوں کا کردار ادا کرتے ہوئے میری نگرانی کر رہے ہیں۔ تم نے مجھے حراست میں لے کر میرے ساتھ ناانصافی کی ہے اور اپنا ایک ایسا قابلِ اعتماد دوست کھو دیا ہے جس نے تمھارے لیے ایک خطرناک مہم

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کامیاب بنانے کے لیے اپنا خون تک بہانے سے بھی دریغ نہیں کیا تھا۔ مجھ پر الزام عائد کرتے وقت تم نے ذرا سی بھی ہچکچاہٹ سے کام نہیں لیا اور میں تمھاری نظروں میں ایک مشکوک شخصیت کا مالک بن گیا۔ کیا تم اپنے اس دعوے کی دلیل میں کوئی ٹھوس ثبوت پیش کر سکتے ہو جس کی رو سے مجھے مجرم قرار دیا جا سکے؟"

میں اس وقت بےحد جذباتی ہو رہا تھا۔ میرے لہجے میں وقار اور ٹھہراؤ تھا جو میرے اعتماد میں مسلسل اضافہ کر رہا تھا۔

"جنرل۔۔۔!" میں نے اس کی نیلی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اپنے دلائل جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "اگر تمھارے اس الزام کو تسلیم کر لیا جائے کہ میں یہاں سے جانے کے بعد کچھ مشکوک سرگرمیوں میں ملوث رہا ہوں تو پھر مجھے واپس پشاور چھاؤنی آنے کی کیا ضرورت تھی؟ میں تم سے دور رہ کر بھی اپنی سرگرمیاں جاری رکھ سکتا تھا۔ یہاں آ کر خود کو خواہ مخواہ مصیبت میں ڈالنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ پھر اس بات کو بھی ذہن میں رکھو کہ گرفتار ہوتے وقت میں نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ حالانکہ میرے ساتھ بہت توہین آمیز سلوک کیا گیا تھا۔ اگر میرے دل میں کوئی کھوٹ ہوتا تو میں مار دھاڑ کرتا ہوا فرار بھی ہو سکتا تھا، مگر میں نے کوئی مزاحمت نہیں کی اور خود کو خاموشی سے حراست میں دے دیا۔ کیا یہ ساری باتیں میری بےگناہی ظاہر نہیں کرتیں؟"

"اگر میں تمھاری بےگناہی تسلیم کر لوں تو ان لوگوں کی گمشدگی کو کس خانے میں ڈالوں؟" اس نے اپنا بجھا ہوا سگار دوبارہ سلگاتے ہوئے سوال اٹھایا۔

"اس کا مطلب ہے کہ تم خود بھی مجھے بےگناہ سمجھتے ہو۔۔۔ اور ارنسٹ یا اس کے ساتھی کے واپس نہ آنے کی ذمے داری مجھ پر ڈال رہے ہو جبکہ مجھے اس کا گمان تک نہیں تھا کہ میرا تعاقب ہو رہا ہے۔"

جنرل نے ہاتھ کے اشارے سے ان جوانوں کو کمرے سے جانے کے لیے کہا جو مجھے وہاں لائے تھے اور اس کی نیلی آنکھیں دیر تک تنقیدی انداز میں میرے چہرے پر جمی رہیں۔ ایک نظر اس نے ایلس کی طرف بھی دیکھا جو میرے اور جنرل کے درمیان ہونے والی گفتگو کو غور سے سن رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے جھلکتی ہوئی اپنائیت اس بات کا پتہ دے رہی تھی کہ وہ میری بےگناہی تسلیم کر چکی ہے۔

"ڈیڈی!" ایلس نے پہلی مرتبہ مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ "شہباز کی یہ دلیل بہت ٹھوس اور وزنی ہے۔ جن لوگوں کے بارے میں اسے کوئی خبر نہیں تھی کہ کب آپ نے ان کو اس کے پیچھے روانہ کیا۔ ان کی گمشدگی کا ذمے دار یہ کسی طرح بھی نہیں ٹھہرایا جا سکتا کیونکہ یہ ان کی اصل حیثیت سے بےخبر تھا۔ میں نے یہ بھی سنا ہے کہ علاقہ غیر کے بسنے والے قبائلی بہت جنگجو اور بڑی خونخوار فطرت کے مالک ہیں۔ وہ اپنے علاقے میں کسی غیر آدمی کی موجودگی کو بھی اپنے لیے بےحد خطرناک تصور کرتے ہیں۔ ان خطرناک پہاڑوں کے پیچھے ان کے ساتھ کوئی بھی ہولناک حادثہ پیش آ سکتا ہے۔ کسی معمولی سے شبے کی بنا پر اپنے بہترین دوست کو اپنا بدترین دشمن قرار دے کر اس کے ساتھ مجرموں جیسا برتاؤ کرنا انصاف کے تقاضوں کے خلاف ہے۔"

ایلس بڑے موثر انداز میں اپنے باپ کے سامنے میری وکالت کر رہی تھی۔ اس نے جس انداز سے میری رہائی کی پرزور سفارش کی تھی، اس کے لیے میں دل ہی دل میں مسکرا کر رہ گیا۔

"ایلس!" جنرل نے نیلی نیلی آنکھیں اپنی چہیتی بیٹی کے چہرے پر گاڑتے ہوئے جذبات سے عاری لہجے میں جواب دیا۔ "حکومتوں کے فیصلے جذباتی سطح پر طے نہیں کیے جاتے۔ میرے پاس اس بات کی ٹھوس شہادت موجود ہے جو شہباز کو مشکوک ظاہر کر رہی ہے۔ مجھے شبہ ہے کہ یہ کسی خاص مقصد کے تحت ہمارے ساتھ تعاون پر آمادگی کا اظہار کر رہا ہے۔"

جنرل کا یہ الزام سن کر مجھے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد سی تیز لہر اترتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس کا انکشاف بےحد چونکا دینے والا تھا۔ اس نے جس یقین اور اعتماد کے ساتھ مجھے ایک مشکوک شخصیت قرار دیا تھا، اس نے مجھے الجھن میں ڈال دیا۔ اس واشگاف الزام کو سن کر خاموش رہنا خود کو مجرم کی حیثیت سے پیش کر دینے کے مترادف تھا۔

"جنرل۔۔۔!" میں نے لہجے کی تلخی کو دباتے ہوئے جواب دیا۔ "اگر میں تمھاری نظروں میں ایک مشکوک انسان تھا تو پھر تم نے میری مشکوک شخصیت کو اس وقت کیوں نظرانداز کر دیا تھا جب مجھے تورخم کی مہم کی سربراہی سونپی جا رہی تھی۔ میں نے تم سے اس سلسلے میں کوئی درخواست نہیں کی تھی کہ مجھے اپنے جانبازوں کے ٹولے میں شامل کر لو۔ میں تو اپنے انعام کی رقم وصول کرنے آیا تھا، مگر جب تم نے دوستانہ انداز میں مجھ سے مدد مانگی تو میں نے حامی بھر لی۔ شاید یہی میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی کہ میں نے ایک شریف انسان سمجھ کر تمھاری ذات پر اعتماد کر لیا تھا۔ اس وقت میں تمھارا قیدی ہوں۔ تم جو چاہو مجھ سے سلوک کرنے کے مختار ہو۔ چاہے قید کر دو، چاہے توپ کے دہانے سے بندھوا دو۔ یہ سب کچھ تمھارے قبضۂ اختیار میں ہے۔ وقت پڑنے پر کسی کو دوست قرار دینا یا اسے

دشمن کہہ کر تیرہ و تاریک قید خانے میں ڈال دینا تمھارا پرانا کھیل ہے مگر تاریخ کے خونیں صفحات اس بات کو چھپانے میں ناکام رہیں گے کہ جس شخص نے تاجِ برطانیہ کا وقار بڑھانے کے لیے اپنا خون بہانے سے گریز نہیں کیا، اسے بلا کسی جواز کے قید میں ڈال کر اس کے پُرخلوص جذبات کی تذلیل کی گئی۔ میں تم سے زندگی کی بھیک نہیں مانگوں گا کیونکہ یہ میرے خاندان کی روایت کے خلاف ہے اور میں اپنے خاندان کی اس روایت کو توڑنا کبھی گوارا نہیں کروں گا۔ میں نے ابھی تک حتی الامکان مفاہمت سے کام لیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میں سچا ہوں اور سچائی کی لافانی قوتیں میری حفاظت کریں گی۔ موت کا خوف میرے حوصلے کی مضبوط دیواروں میں شگاف پیدا نہیں کر سکتا۔ اب بھی وقت ہے کہ میری بے گناہی تسلیم کر لو ورنہ تاریخ تمھیں ظالموں کا ساتھی قرار دے گی۔ یا پھر اس بات کا کوئی ٹھوس ثبوت دو کہ مجھے یکایک دوستوں کی صف سے نکال کر دشمنوں کی صف کی طرف دھکیلنا ضروری ہے۔"

میرے لہجے میں بڑی تلخی آ گئی تھی۔

میرے خاموش ہوتے ہی جنرل نے گھنٹی کی طرف ہاتھ بڑھایا اور اردلی کو طلب کر کے کہا۔

"سارجنٹ فلپ کو فوراً حاضر کیا جائے۔"

سارجنٹ فلپ کا نام سن کر میں الجھن میں پڑ گیا۔ مجھے حیرت تھی کہ آخر اس نے میرے خلاف کوئی ایسا ثبوت کہاں سے حاصل کر لیا جس کی رو سے مجھے مشکوک قرار دیا جا سکے۔

سارجنٹ فلپ نے دفتر میں داخل ہو کر جنرل کو سیلوٹ کیا اور مؤدب ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

"سارجنٹ فلپ!" جنرل نے نیا سگار سلگا کر حلق سے دھواں اگلتے ہوئے اس کے چہرے پر اپنی نظریں جما کر کہا۔ "شہباز ایک دلیر اور بہادر نوجوان ہے جس کا مشاہدہ تم تورخم کی مہم کے دوران خوب اچھی طرح کر چکے ہو۔ تم نے تورخم سے واپسی پر اپنی رپورٹ میں لکھا تھا۔ تمھیں شہباز کا چہرہ دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے تم اسے برسوں پہلے سے جانتے ہو اور بارہا تمھارا اور اس کا آمنا سامنا ہو چکا ہے۔ اب اس بات کی وضاحت بہت ضروری ہو گئی ہے کہ تمھیں اس کا چہرہ دیکھ کر یکایک یہ احساس کیوں ہوا کہ تم اس چہرے کو برسوں سے دیکھتے چلے آئے ہو۔"

جنرل ڈوگ کا سوال بہت واضح تھا۔ یہ بات مہم کے دوران سارجنٹ فلپ خود بھی مجھ سے کہہ چکا تھا اور میرے سامنے اس نے جب عقیدت اور محبت کے جذبات ظاہر کیے تھے، ان کو سامنے رکھتے ہوئے میں کبھی بھول کر بھی یہ بات نہیں سوچ سکتا تھا کہ وہ میرے ساتھ اپنی دشمنی کا اظہار اس طرح کرے گا اور میری آزادی سلب کرنے کے سلسلے میں جنرل ڈوگ کا بہترین مہرہ ثابت ہوگا۔

"جناب!" سارجنٹ فلپ نے مجھ سے نظریں چراتے ہوئے جواب دیا۔ "میں جب سے شہباز سے متعارف ہوا ہوں، مسلسل یہی سوچتا رہا ہوں کہ میں نے اس چہرے کو اس سے پہلے کہاں دیکھا ہے؟ مگر اس سلسلے میں ابھی تک مجھے ناکامی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے، تمھارے پاس اس بات کا کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ہے کہ جس شخص سے برسوں پہلے تمھارا کوئی واسطہ پڑا تھا، وہ یہی ہے یا کوئی اور تھا؟" جنرل نے اس کے بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے، تم جا سکتے ہو۔"

سارجنٹ ایڑیاں بجاتا ہوا رخصت ہو گیا۔

"شہباز خان!" جنرل ڈوگ نے اپنی بیٹی کے چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے ایک خوش گوار مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر بکھیر لی۔ "میں تم سے معذرت خواہ ہوں۔ اب تم دوبارہ کھلی ہوا کے جھونکے کی طرح آزاد ہو اور اس کے ساتھ ہی تمھارا مقام بحال کیا جاتا ہے اور تمھیں لداخ کی مہم کی سربراہی بھی سونپی جاتی ہے۔ مہم سے کامیاب واپس آنے پر تمھیں دس ہزار افغانی روپے بطور انعام دیے جائیں گے۔"

"جنرل! اب دنیا کا کوئی لالچ یا خوف مجھے اس قسم کے کام کے لیے آمادہ نہیں کر سکتا۔ اس لیے میں تمھارے اس اعزاز کو قبول کرنے سے انکار کرتا ہوں۔ تم نے مجھے بے گناہ قید کر کے میرے خلوص اور اعتماد کی دھجیاں اڑا دی ہیں۔ اب مجھے اجازت دو کہ میں اپنے قبیلے کی طرف واپس چلا جاؤں۔ مجھے تمھارا عطا کیا ہوا پہلا انعام ہی ہضم کرنا مشکل نظر آ رہا ہے۔"

میں نے کسی زخمی سانپ کی طرح پھنکارتے ہوئے اس کی پیش کش ٹھکرا دی۔

"تمھاری برہمی اپنی جگہ جائز ہے۔" جنرل نے سگار کا کش لیتے ہوئے جواب دیا اور میری جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔ "شہباز! ابھی تک کھڑے کیوں ہو۔ اطمینان سے بیٹھ کر بات کرو۔ تمھیں اس بات سے بے خبر نہیں رہنا چاہیے کہ حکمران طبقے کو اپنے دوستوں کے بارے میں گہری چھان بین سے کام لینا پڑتا ہے۔ دشمن کی طرح ہاتھ جھٹکنے کے بجائے دوست بن کر ہماری مجبوریوں پر غور کرو اور اپنا فیصلہ سنانے میں جلد بازی سے کام نہ لو۔ تم نہیں جانتے، میں تاجِ برطانیہ کا وقار بلند رکھنے کے لیے کن تفکرات میں گھرا ہوا ہوں۔ تمھارا انکار میری مشکلات میں اضافہ کر دے گا۔ دوستوں کے درمیان کبھی کبھی ایسی غلط فہمی پیدا ہو ہی جایا کرتی ہے، اس کا مطلب یہ تو نہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوتا کہ آدمی اس غلط فہمی کو بنیاد بنا کر ہمیشہ کے لیے اپنے دوستوں سے علیحدگی اختیار کر لے۔"

"جنرل!" میں نے قدرے نرمی اختیار کرتے ہوئے جواب دیا۔ "میں محسوس کرنے لگا ہوں کہ ان حالات میں میں اپنے فرائض صحیح طور پر انجام نہیں دے سکوں گا۔ اس لیے لداخ کی مہم کی ذمہ داری کسی اور کے سپرد کر دو۔" میں بدستور اپنے انکار پر ڈٹا رہا۔

جنرل کی نیلی آنکھیں تشویش آمیز انداز میں مجھے گھورنے لگیں۔ پھر وہ بڑی آہستگی سے اٹھا اور دوستانہ انداز میں میرا بازو تھام کر مجھے پہلو والی کرسی پر بٹھاتے ہوئے اردلی کو بلا کر قہوہ لانے کے لیے کہا اور قہوہ آنے تک دونوں ہاتھ پشت پر باندھے دفتر کے وسیع کمرے میں ٹہلتا رہا۔ اس دوران ایلس حیرت انگیز طور پر خاموش تھی۔ اچانک اس نے میری جانب دیکھا تو اس کی آنکھیں جذبات کے نشے سے چھلک رہی تھیں۔ اس کی نظریں جوانی کی ان کہی سرگوشیوں... داستانیں دہرا رہی تھیں مگر اپنے باپ کی موجودگی کا احساس اسے ابھی تک خاموش رکھے ہوئے تھا۔

اچانک جنرل دوبارہ اپنی کرسی پر بیٹھ گیا اور قہوے کا گھونٹ پیتے ہوئے ایلس کی جانب جھک کر بولا۔ "ایلس! شہباز کو سمجھاؤ کہ یہ ہمارے ساتھ تعاون کے لیے آمادہ ہو جائے۔ اگر یہ اسی طرح انکار پر مصر رہا تو ہمیں بہت بڑے نقصان سے دوچار ہونا پڑے گا اور ممکن ہے ہماری ناکامی کی صورت میں ہمیں انگلستان واپس بلا لیا جائے۔ حکومت کی نظروں میں یہ علاقہ بہت اہمیت اختیار کر چکا ہے۔ اگر ہم اپنی قائم کی ہوئی چوکیوں پر جلد کمک نہ پہنچا سکے تو سیکڑوں جوانوں کی زندگیاں خطرے میں پڑ جائیں گی۔ اس طرح میرے ذاتی وقار کو بھی زبردست دھچکا لگے گا۔"

"شہباز!" ایلس نے اپنی نشیلی آنکھوں کے تیر میری جانب پھینکتے ہوئے مترنم لہجے میں مجھے مخاطب کیا۔ "تمھیں ڈیڈی کی پیش کش قبول کر لینی چاہیے۔ ڈیڈی تم پر بے پناہ اعتماد کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں تمھارے علاوہ کوئی بھی اس خطرناک مہم میں کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔ اگر انعام کی رقم کم ہے تو اس میں اضافہ بھی کیا جا سکتا ہے۔"

"ایلس! انعام کا لالچ مجھے اس کام پر آمادہ نہیں کر سکتا۔" میں نے انکار کی صورت میں اپنے سر کو منفی جنبش دیتے ہوئے جواب دیا۔ "تمھارے باپ نے مجھے قید میں ڈال کر مجھے جو اذیت دی ہے، اس کی تلافی معذرت کے چند الفاظ نہیں کر سکتے۔ میں ساری چھاؤنی میں مجرم کی حیثیت سے دیکھا گیا ہوں۔ اب دوست کی حیثیت سے ان سے مل کر کیسے کام کر سکوں گا۔ میرا ضمیر اس بات کو گوارا نہیں کرتا کہ ان لوگوں کے درمیان رہوں جو میرے ساتھ مجرموں جیسا سلوک کر چکے ہیں۔"

"تم جس طرح چاہو میں اس کی تلافی کرنے کے لیے تیار ہوں۔" جنرل نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ "مگر میں تمھارا انکار سننے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ تم جیسا گوہرِ نایاب میں کہاں سے لاؤں گا۔ اب زیادہ دیر تک انکار کر کے ہمیں بے چین کرنے کی کوشش نہ کرو۔ ایلس تمھاری گرفتاری کی خبر سن کر بہت پریشان تھی۔ تمھارا یہ اجنبی سلوک کیا اس کا دل نہیں توڑ دے گا۔ پھر یہ بھی تو سوچو کہ ہو سکتا ہے تمھاری گرفتاری محض ایک امتحان ہو۔"

اب زیادہ انکار ممکن نہیں تھا۔ انھیں کیا خبر تھی کہ میں تو خود ان کے ساتھ تعاون کا منصوبہ بنا کر ہی آیا تھا تاکہ ان پر کاری ضرب لگائی جا سکے مگر یہاں آتے ہی جب حالات کا رخ یک دم پلٹ گیا تو ذہن پریشانیوں میں گھر گیا۔ اگر بابا شیدا ذہنی طور پر صحت مند ہو چکے ہوتے تو میں کبھی اس عیار فرنگی کے ساتھ تعاون کرنے پر آمادگی ظاہر نہ کرتا۔ باپ بیٹی کے مسلسل اصرار کے سامنے بالآخر میں نے ہتھیار ڈال دیے اور لداخ کی مہم کی سربراہی قبول کر لی۔ تب جنرل نے اپنے خوش گوار موڈ کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھے اپنے ساتھ رات کے کھانے کی دعوت دی جسے میں رد نہ کر سکا۔

"لداخ کی مہم تمھاری پہلی مہم سے کچھ مختلف ہے۔" کھانا ختم ہونے کے بعد جنرل نے اس مہم کی تفصیل بیان کرتے ہوئے اپنی گفتگو کا آغاز کیا۔ "اس مہم میں جو کچھ بھیجا جا رہا ہے اس کی مالیت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ ان اشیا میں خاص قسم کے آلات بھی ہیں جو اسلحے سے زیادہ قیمتی ہیں۔ ان آلات کو ہم اپنی چوکی پر نصب کر کے دور دور تک دشمنوں کی نقل و حرکت سے آگاہ ہو سکتے ہیں۔ ہم لداخ کی اس چوکی کو ایک مضبوط قلعے کی شکل میں تعمیر کر کے آس پاس کے علاقے میں اپنی طاقت کی دھاک بٹھا دینا چاہتے ہیں۔ تمھاری یہ کوشش ہونی چاہیے کہ آلات کسی بھی صورت میں دشمن کے ہاتھوں تک نہ پہنچنے پائیں۔ اگر راستے میں کسی بڑے گروہ سے ٹکراؤ ہو جائے اور تمھارے آدمی ان حملہ آوروں کے سامنے بے بس ہو جائیں تو ان آلات کو اپنے ہاتھوں سے تباہ کر دینا مگر دشمن کو ان آلات کے بارے میں خبر نہ ہونے دینا۔ آج سے ایک ہفتے تک تمھیں سیر و تفریح کی مکمل آزادی ہے لیکن اس دوران میں مہم کی تیاری

پر بھی نگاہ رکھنا۔ اس مہم کو کامیاب بنانے کے لیے میں تمہیں جھولی سے لے کر ہوائی جہاز تک مہیا کر سکتا ہوں مگر ناکامی برداشت نہیں کر سکتا۔" آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے جنرل بے حد جذباتی نظر آنے لگا۔

"جنرل! جب میں اس کام میں ہاتھ ڈال چکا ہوں تو پھر ہر قیمت پر اسے پورا کرنے کی کوشش کروں گا۔" میں نے وفاداری جتاتے ہوئے اس کی جذباتی تقریر کا جواب دیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

جنرل شاید ابھی کچھ دیر رکنا چاہتا تھا مگر مجھے ایک ہی قسم کی باتیں سنتے ہوئے وحشت ہو رہی تھی۔

"شہباز!" جنرل ڈوگ نے مجھے روکتے ہوئے کہا۔ "میں محسوس کر رہا ہوں کہ ابھی تک تمہارے دل میں کم دخشے کے جذبات پرورش پا رہے ہیں۔ تمہارا اکتایا ہوا انداز میرے لیے تشویش کا باعث ہے۔"

"جنرل! میں نے پچھلے دو روز سخت اذیت کے عالم میں گزارے ہیں اور دو راتوں سے نیند پوری نہ ہونے کی وجہ سے میں بے حد تھکا ہوا ہوں۔ اس لیے آرام کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے سنجیدگی سے جواب دیا اور باہر آ کر اسی بیرک کی طرف چل دیا جہاں میرے قیام کا بندوبست دوبارہ کر دیا گیا تھا۔

بیرک کے باہر ہی ہانگ ٹار بڑی بے چینی سے میری واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔ اسے دیکھ کر میرے ہونٹوں پر ایک پُرخلوص مسکراہٹ پھیل گئی۔ جونہی ہانگ ٹار کی نظر مجھ پر پڑی، وہ تیزی سے میری جانب لپکا۔

"رہائی پر میری دلی مبارکباد قبول کرو شہباز۔" ہانگ ٹار نے خوشی سے باچھیں پھاڑتے ہوئے کہا۔ "خوش نصیب ہو جو موت کے خوفناک جبڑوں سے زندہ باہر آ گئے ہو۔ ورنہ جو بھی ایک بار منگولوں کی نظروں میں مشکوک ٹھہرایا گیا، موت کا خوفناک عفریت اسے نگل ہی جاتا ہے۔"

"ہانگ ٹار!" میں نے بستر پر نیم دراز ہو کر سرگوشی میں جواب دیا۔ "تم نے ان لوگوں کی ذہنیت کا صحیح تجزیہ کیا ہے۔ جنرل ڈوگ بڑی مکاری سے کام لے رہا ہے۔ میرا یہاں واپس آنے پر کھلا کہ میں اتنی بڑی قربانی دینے کے باوجود بھی ان کی نظروں میں ایک مشکوک انسان ہوں۔ اگر مجھے یہ خبر ہوتی کہ اس بار میرے [illegible] مشکوک کیا جائے گا تو کبھی لوٹ کر یہاں [illegible] جنرل نے [illegible] مجھے آزاد کر کے میرا وقتی بحالی کر دیا ہے مگر میں یہ بات کبھی نظر انداز نہیں کر سکتا کہ اس کے کچھ جاسوس ہر وقت میری نگرانی کرتے رہیں گے۔ اس نے میری رہائی کا حکم صادر کرتے ہوئے ڈرامائی انداز میں مجھے ایک نئی خطرناک مہم کی ذمے داری بھی سونپ دی ہے۔ میرے انکار کے باوجود اس کی بیٹی نے [illegible] کر کے مجھے اس مہم میں شرکت پر آمادہ کر لیا ہے۔

میری موجودگی اور عدم موجودگی میں اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھنا۔ اب میں ہر لمحے فرنگیوں کی شاطرانہ چالوں سے باخبر رہنا چاہتا ہوں۔ دشمن کے اس جنگل میں تمہاری ذات سے میری بہت سی امیدیں وابستہ ہو چکی ہیں۔"

"میں سب سمجھ گیا شہباز کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو۔" ہانگ ٹار نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "میں ہوا کے بدلتے ہوئے رُخ سے آگاہ رہنے کی ہر ممکن کوشش کروں گا۔ تمہاری گرفتاری اور پھر ڈرامائی رہائی کا حکم صادر کر کے جنرل نے دراصل تمہیں یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ وہ جب چاہے محکوم انسانوں کی تقدیر بدلنے کی طاقت رکھتا ہے۔ یہ ڈراما پہلے بھی کئی بار دہرایا گیا ہے۔ اس کے اعصاب شکن مظاہرے میں تمہاری یہاں آمد سے پہلے بھی بہت دیکھ چکا ہوں۔"

"اسے یہ شبہ پیدا ہو گیا ہے کہ میں اپنے کسی خاص مقصد کی خاطر اس کی طرف دستِ تعاون بڑھا رہا ہوں۔" میں نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔

ہانگ ٹار خاموشی سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

"ہانگ ٹار! تم نے ابھی تک مجھے یہ نہیں بتایا کہ جس قیدی کے بارے میں میں نے تمہیں ہدایات دی تھیں، ان پر تم نے کہاں تک عمل کیا ہے۔ یاد رکھو! وہ قیدی میرے لیے بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ وہ ایک بہادر اور محبِ وطن انسان ہے جو فرنگیوں کی شاطرانہ سیاست کا شکار ہو کر اپنی زندگی کے اذیت ناک دور سے گزر رہا ہے۔ فرنگیوں نے اس پر بے پناہ تشدد کیا ہے۔ اس کے لیے تم جتنی زیادہ سہولتیں مہیا کرو گے، مجھے اتنی ہی خوشی ہوگی۔" میں نے زور دیتے ہوئے کہا۔

"میں نے تمہاری ہدایات پر پورا پورا عمل کیا ہے۔" ہانگ ٹار نے یقین دہانی کراتے ہوئے کہا۔ "اس کے لیے بہت سی سہولتیں پیدا کر دی ہیں۔ دن میں ایک بار اسے گھر کا کھانا دیا جاتا ہے جو جیل کے ایک محافظ کے گھر سے آتا ہے۔ اس کے علاوہ دن میں ایک بار اسے ٹہلانے کے لیے بھی ایک محافظ کو رضامند کر لیا ہے جو پابندی کے ساتھ اسے کوٹھری سے نکال کر کھلے میدان میں لے جاتا ہے اور دو گھنٹے کھلی فضا میں رکھتا ہے۔ ڈاکٹروں کی [illegible] کے مطابق اس کی ذہنی حالت پہلے سے کافی بہتر ہے بلکہ میں نے تو یہ بھی سنا ہے کہ ڈاکٹر اس کا دماغی آپریشن کرنے والا ہے۔ اس آپریشن کے بعد امید ہے کہ شانیار خان مکمل طور پر صحت مند ہو جائے گا۔"

"ہانگ ٹار!" میں نے ایک طویل سانس سینے سے خارج کرتے ہوئے خوشی کا اظہار کیا۔ "تمہاری یہ معلومات میرے لیے بے حد

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خوش گوار اور قیمتی ہیں۔ میں تمہارا شکر گزار ہوں کہ تم نے وفاداری کا ثبوت دیتے ہوئے اس کام کو بڑے احسن طریقے سے انجام دینے کی کوشش کی ہے۔"

ہانگ ٹار اچانک ہی بے حد سنجیدہ نظر آنے لگا۔ "میں نے شانیار خان کی مدد اس لیے نہیں کی کہ میں تمہاری زبان سے چند تعریفی الفاظ سننے کا خواہش مند تھا۔ یہ میرا ایک فرض تھا جسے میں نے ہر ممکن طریقے سے انجام دینے کی کوشش کی ہے۔ شکریے کے چند الفاظ ادا کر کے مجھے اس خوشی سے محروم نہ کرو جو مجھے شانیار خان کی مدد کرتے ہوئے حاصل ہوئی ہے۔"

ہانگ ٹار کی یہ ادا مجھے بے حد پسند آئی۔

اس کے جانے کے بعد میں اپنے بابا شانیار خان کے بارے میں سوچنے لگا۔ مجھے اپنے بابا کے صحت مند ہونے کی اطلاع سن کر دلی خوشی کا احساس ہوا تھا لیکن اچانک ہی ایک خیال میرے ذہن سے سرسراتا ہوا گزر گیا کہ جب میرے شیر دل باپ کو فرنگی کی طویل قید سے رہائی نصیب ہوگی اور اس پر یہ انکشاف ہوگا کہ میں اس کا بیٹا شہباز خان ہوں تو وہ اپنے بوڑھے جسم میں ایک نئی طاقت محسوس کرے گا۔

اگلے روز میں ناشتے سے فارغ ہی ہوا تھا کہ جنرل ڈوگ کی بیٹی ایلس شہسواروں جیسا لباس پہنے ہوئے ایک نوجوان کے ساتھ میرے کمرے میں داخل ہوئی اور مجھے دیکھتے ہی بڑے دلنواز انداز میں مسکرانے لگی۔ نیلا اسکرٹ اور برجس پہنے ہوئے وہ مجھے ایک معصوم سی گڑیا نظر آئی۔ اس کا ساتھی ایک انگریز نوجوان تھا جو بڑے غور سے میرا اور کمرے کا جائزہ لے رہا تھا۔

"ہیلو ایلس!" میں نے استقبال کرتے ہوئے کہا۔ "غریب خانہ کیسے یاد آ گیا؟"

"ہم آج شکار پر جا رہے ہیں۔" اس نے بغیر کسی تمہید کے اپنا مافی الضمیر بیان کرتے ہوئے مترنم انداز میں کہا۔ "اس لیے میں چاہتی ہوں کہ تم بھی ہمارا ساتھ دو۔ میں نے اپنے ساتھی آرتک کے سامنے تمہارے نشانے کی بہت تعریف کی ہے۔ اسے یقین دلانے کے لیے تمہارا ساتھ چلنا بے حد ضروری ہے۔ چلو تیار ہو جاؤ۔"

ایلس نے میری جانب مسکراہٹ کے پھول پھینکتے ہوئے اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دی تو میں ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔

"ایلس!" میں نے ان دونوں کو ہاتھ کے اشارے سے بیٹھنے کی دعوت دیتے ہوئے جواب دیا۔ "مجھے افسوس ہے کہ میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکوں گا کیونکہ آج مجھے کچھ اور کام بھی نمٹانے ہیں جن کا تذکرہ تمہارے سامنے ضروری خیال نہیں کرتا۔ [illegible] کا ضرور ساتھ دوں گا۔"

مجھے کوئی مصروفیت نہیں تھی مگر میں ایلس کی اداؤں کے جال سے محفوظ رہنا چاہتا تھا۔ میرا انکار سن کر ایلس کا مسکراتا ہوا چہرہ اچانک اداس نظر آنے لگا جیسے اسے میرے انکار سے دلی صدمہ پہنچا ہو۔ اس کا ساتھی آرتک بے چینی سے پہلو بدلنے لگا۔

"میرے انکار کو اپنی انا کا مسئلہ نہ بناؤ۔" میں نے نرمی اختیار کرتے ہوئے اسے دوبارہ مخاطب کیا۔ "تم ہر بات کو جذباتی انداز میں پرکھنے کی عادی ہوتی جا رہی ہو ورنہ اس مسئلے میں رنجیدہ ہونے کی کوئی بات نہیں تھی۔"

ایلس کا بجھا ہوا چہرہ اچانک چمکنے لگا۔

"شہباز! تمہارا انکار میرے لیے صدمے کا باعث بن رہا ہے کیونکہ اس پروگرام میں میرے کئی اور دوست بھی حصہ لے رہے ہیں اور وہ تمہارے نشانے کا مظاہرہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ تمہارا انکار میرے لیے سبکی کا باعث بنے گا۔ تم اپنی مصروفیت کو کل پر کیوں نہیں ٹال دیتے؟ اس طرح مجھے اپنے دوستوں کے سامنے شرمندہ ہونا نہیں پڑے گا۔"

اس اصرار پر میں سوچ میں پڑ گیا۔ اس کا مطلب تھا کہ میرے اس انکار سے بہت سے لوگ آگاہ ہو جائیں گے اور یہ بات واقعی جنرل ڈوگ کی بیٹی کے لیے ندامت کا باعث بنے گی کہ اتنے بڑے باپ کے ایک ماتحت نے جنرل کی بیٹی کی ایک معمولی سی خواہش پوری کرنے سے صاف انکار کر دیا...

"ٹھیک ہے ایلس! میں تمہیں رنجیدہ ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ تمہارے وہ دوست کون ہیں ایلس؟" میں نے تھکے تھکے انداز میں پسپائی اختیار کرتے ہوئے سوال کیا۔

میری رضامندی پر ایلس کا بجھا ہوا چہرہ دوبارہ اندرونی مسرت سے دمکنے لگا اور اس کا ساتھی آرتک بھی پُرسکون نظر آنے لگا۔ ایلس مجھے اپنے دوستوں کی تفصیل بتانے لگی۔ وہ خوشی سے کھلی پڑ رہی تھی۔

چھ آدمیوں کا مختصر قافلہ جب شکار پر روانہ ہوا تو میں اپنے ساتھ تین فرنگی عورتوں کو گھڑ سواری کرتے دیکھ کر عجیب سے جذبات کا شکار ہو گیا۔ میرے علاوہ تین عورتیں اور دو مرد شامل تھے۔ جس سمیت ان عورتوں نے جس [illegible] سے [illegible] سوار کیا تھا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ جیسے ہم لوگ جنگل میں شکار کھیلنے نہیں بلکہ وہ [illegible] منانے جا رہے ہوں۔ [illegible] میرے ذہن سے ٹکرایا اور میرے ذہن میں حصے کی [illegible] ایک ساتھ

بج اٹھیں۔

مجھے ایلس کے ارادے بہت خطرناک نظر آ رہے تھے شاید آج وہ اپنے سارے ہی حربے مجھ پر استعمال کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔

"شہباز!" اچانک ایلس نے عقب سے آواز دے کر مجھے مخاطب کیا۔ اس کی آواز سن کر میں نے فوراً اپنا گھوڑا روکا۔ ہمارے دوسرے ساتھی بکھر کر جنگل میں داخل ہو چکے تھے۔ تب میں نے محسوس کیا کہ وہ موقع قریب آ پہنچا ہے جب ایلس اپنے نادیدہ ہتھیاروں کے ساتھ مجھ پر حملہ آور ہو گی۔ "میں تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔" اس نے اپنا گھوڑا میرے قریب لاتے ہوئے کہا۔

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا اور دوبارہ اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا کر گھنے جنگل میں گھستا چلا گیا۔ ایلس کا گھوڑا میرے گھوڑے سے چند قدم پیچھے پیچھے دوڑ رہا تھا۔

ایک ٹیلے سے گزرتے ہی مجھے جھاڑیوں میں ہلکی سی سرسراہٹ سنائی دی۔

میں نے یکے بعد دیگرے ان جھاڑیوں پر دو فائر جھونک دیے۔ فضا میں دو دھماکے ہوئے اور ایک پہاڑی بکرا اچھل کر چٹان پر گرا اور بری طرح تڑپنے لگا۔ میں نے گھوڑا بڑھایا اور چٹان کے قریب اتر کر اپنا شکاری چاقو نکال لیا پھر اسے ذبح کر کے گھوڑے کی پیٹھ پر ڈال لیا۔

"حیرت ہے تم نے ان گھنی جھاڑیوں میں اس کی موجودگی کیسے محسوس کر لی؟" ایلس نے توصیفی نظروں سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ دوسرے ساتھی بھی دھماکے سن کر ہمارے قریب آ گئے اور شکار کیے ہوئے پہاڑی بکرے کو دیکھنے لگے۔

"ہمیں تو ابھی تک اس جنگل میں چیونٹی تک نظر نہیں آئی۔ تم نے اتنا بڑا بکرا کہاں سے تلاش کر لیا؟" ٹرنر نے پہلی مرتبہ پشتو زبان میں میری تعریف کی تو میں اس کے لہجے میں پختگی محسوس کر کے حیرت زدہ رہ گیا۔

دوپہر ہونے تک میں نے تین بکرے بڑی آسانی سے شکار کر لیے جبکہ دوسرے ساتھی ابھی تک شکار کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے تھے۔

سہ پہر کے بعد ہم نے ایک چشمے کے کنارے بیٹھ کر کھانا کھایا اور تھکن اتارنے لگے۔ میں ان لوگوں سے الگ ہو گیا اور ایک چٹان کے سہارے نیم دراز ہو کر ماحول کی خوبصورتی سے لطف اندوز ہونے لگا۔ اچانک مجھے اپنے قریب ہی بے ترتیب سانسوں کی آواز سنائی دی تو میں چونک پڑا۔

ایلس میرے قریب ہی موجود تھی۔ اس کی نیلی آنکھیں عجیب سی مستی کا اظہار کر رہی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں جذبات کی روشنی پا کر میں نے اس کے چہرے سے اپنی آنکھیں ہٹائیں اور چشمے کے شفاف پانی کو گھورنے لگا۔

"شہباز! تم کسی فلسفی کی طرح ہر وقت کیا سوچتے رہتے ہو؟" اس نے اٹھلاتے ہوئے سوال کیا اور سرک کر اور قریب ہو گئی۔ "میں جب بھی تم سے دل کی بات کہنا چاہتی ہوں تم رخ پھیر لیتے ہو۔ کیا تم میرے سامنے ہمیشہ ایک شریف آدمی ہی بنے رہو گے؟"

"ایلس!" میں نے نرمی سے اس کا ہاتھ اپنے شانے سے ہٹاتے ہوئے جواب دیا۔ "ہمارا مذہب غیر محرم عورتوں سے ایسی باتوں کی اجازت نہیں دیتا جن سے بہک جانے کا اندیشہ ہو۔ ہمارے درمیان مذہب کی بلند دیواریں حائل ہیں۔ میں ان دیواروں کو گرا کر اپنے مذہبی وقار کو خاک میں نہیں ملا سکتا۔ ہم اچھے دوستوں کی طرح مل سکتے ہیں۔ تم ایک خوبصورت اور ہوشیار لڑکی ہو تمہیں اپنے مقام کا خیال کرتے ہوئے آلودگی کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔"

"جذبات فطرت کی امانت ہیں شہباز!" ایلس کے لہجے میں اداسی آ گئی۔ "نسل، قوم اور مذہب کی دیواریں آج تک جذبات کا دھارا روکنے یا بدلنے میں کامیاب نہیں ہو سکیں۔ میرا مذہب خوبصورت چیزوں سے محبت کرنا سکھاتا ہے۔ تم ایک خوبصورت اور وجیہہ نوجوان ہو اور دنیا کی بیشتر لڑکیاں محض تمہارے ایک اشارے پر اپنا سب کچھ قربان کر سکتی ہیں۔ اس لیے اپنا آپ مذہب کی دیواروں کے پیچھے پوشیدہ رکھنے کی کوشش نہ کرو۔ وقت کی آواز سنو اور وقتی تقاضوں کو سمجھنے کی کوشش کرو۔"

اچانک اس نے اپنا نازک ہاتھ میرے شانے پر رکھ دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ میں نے بڑی آہستگی سے اس کا ہاتھ شانے سے ہٹا دیا۔ میں پریشان نظروں سے ایلس کو دیکھنے لگا۔ اس کی سسکیاں اب باقاعدہ رونے میں تبدیل ہو رہی تھیں۔

اچانک ایک بچھو چٹان کی اوٹ سے نمودار ہوا اور رینگتا ہوا ایلس کے قریب پہنچ گیا۔ میں نے بچھو کو دیکھتے ہی سانس روک لی اور جسم کے عضلات ایک دم اکڑا لیے۔

"ایلس!" میں نے سرگوشی کی۔ "سانس روک کر اپنا جسم ساکت کر لو ورنہ خطرناک بچھو کا نشانہ بن جاؤ گی۔"

ایلس نے گھبرا کر بچھو کی طرف دیکھا لیکن فوراً ہی سنبھل گئی اور میری ہدایات پر عمل کرتے ہوئے ساکت ہو گئی۔

بچھو ہمارے ساکت جسموں کے قریب آ کر رک گیا۔ اس کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رکتے ہی میں نے اپنا ہاتھ بڑھا کر اسے انگلیوں کی گرفت میں لے لیا اور چٹان سے رگڑ کر اس کا سر کچل دیا۔

خطرناک بچھو سے نجات پاتے ہی ایلس خوفزدہ ہو کر میرے گلے کا ہار ہو گئی۔

"تم... تم نے میری جان بچا کر ثابت کر دیا ہے کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے۔" ایلس اپنی شکست بھول گئی تھی۔ "کیا اب بھی اس بات سے انکار کرو گے کہ تمہارے دل میں میرے لیے کوئی جگہ نہیں ہے؟" اس کے لہجے میں اچانک شگفتگی آ گئی۔

"ایلس!" میں نے گمبھیر سنجیدگی سے جواب دیا۔ "میری زندگی کا ایک خاص مقصد ہے۔ میں جب تک اپنی زندگی کے اس اہم مقصد کو پورا نہیں کر لیتا۔ اس وقت تک میں اپنے مستقبل کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔"

"کیا تمہاری اس مہم میں میں تمہارے کسی کام نہیں آ سکتی؟" اس نے محبت پاش نظروں کے تیر برساتے ہوئے سوال کیا۔

"میں اس بارے میں فی الحال یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا کہ تم کہاں تک معاونت کر سکتی ہو؟" میں بدستور سنجیدہ تھا۔

"آخر کچھ پتہ بھی تو چلے کہ تمہاری اس مہم کی نوعیت کیا ہے؟" اس کے لہجے میں مزید رسیلا پن آ گیا۔

"میں ایک طویل عرصے سے اپنے ایک خاص دشمن کی تلاش میں ہوں جس نے ایک روز ہماری بستی پر حملہ کر کے اسے تباہ و برباد کر دیا تھا۔ آجکل تمہاری حکومت کے خلاف اس کی باغیانہ سرگرمیاں زور پکڑتی جا رہی ہیں۔ میں نے قسم کھائی تھی کہ جب تک اپنے دشمن اور اس کے ساتھیوں کو موت کے گھاٹ اتار کر اپنی بستی کے بے گناہ انسانوں کے خون کا بدلہ نہیں لے لیتا دنیا کا ہر عیش و سکون میرے لیے حرام ہے۔"

"تم اس کی تلاش میں ٹیڈی سے مدد کیوں نہیں طلب کر لیتے؟" ایلس نے پرخلوص مشورہ دیا۔

"صرف اس خوف سے کہ جنرل کہیں یہ نہ سمجھے کہ میں اپنے دشمنوں سے نمٹنے کے لیے حکومت کو آلۂ کار بنانا چاہتا ہوں۔" میں نے جواب دیا اور عقب میں قدموں کی آواز سن کر اٹھ کھڑا ہوا۔

ٹرنر کی آمد سے باتوں کا رخ بدل گیا اور ہم نہ جانے کن کن موضوعات پر باتیں کرنے میں مصروف ہو گئے۔

**

لداخ جانے والے قافلے کی تیاریاں بڑے زور و شور سے جاری تھیں۔ اس مہم میں جوان میری تحویل میں دیے گئے تھے اور انھیں یہ حکم دیا گیا تھا کہ حالات خواہ کوئی بھی صورت کیوں نہ اختیار کر لیں میرے احکامات کی پابندی کریں۔ حکم عدولی کی صورت میں انھیں سخت سزا دی جائے گی۔ اس مرتبہ تین گھوڑا گاڑیاں تیار کی گئیں۔ جن میں سے دو میں غذائی اشیاء اور دیگر سامان رکھا تھا جبکہ تیسری میں وہ آلات لادے گئے جن کے بارے میں جنرل ڈوگ نے مجھے خاص طور پر ہدایات دی تھیں۔ اس مہم میں کچھ پرانے لوگ بھی شامل کیے گئے تھے جو میرے ساتھ تورخم کی مہم پر جا چکے تھے۔ سارجنٹ فلپ کی جگہ سارجنٹ ڈرٹ کو دی گئی تھی جسے میں نے پسند کیا تھا۔

جب سب تیاریاں مکمل ہو گئیں اور قافلہ دوسرے دن صبح روانہ ہونے والا تھا تو اچانک جنرل ڈوگ کی طرف سے طلبی کا حکم آ گیا۔ جب میں اس کے دفتر میں داخل ہوا تو وہ سلگتا ہوا سگار ہونٹوں میں دبائے دیوار پر آویزاں نقشے کو گھور رہا تھا۔

مجھے دیکھتے ہی اس نے پلٹ کر بید کی پتلی چھڑی اٹھا کر نقشے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "کل صبح تم اپنی اس نئی مہم پر روانہ ہونے والے ہو مگر ابھی تک تم نے اس بات کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا کہ تم لداخ کی اس مہم کو انجام تک پہنچانے کے لیے کون سا راستہ اختیار کرو گے۔ میرے خیال میں یہ وضاحت بہت ضروری ہے کہ تم کس راستے سے اپنا قافلہ گزرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟ اور ہاں اس دستاویز پر دستخط کر دو۔ اب تم سے دوبارہ ملاقات شاید اسی وقت ہو گی جب تم مہم سے واپس آؤ گے۔"

میں نے اس دستاویز پر دستخط کر دیے تو جنرل نے دس ہزار روپے ادا کرنے کا صداقت نامہ میرے ہاتھوں میں تھما دیا جسے میں نے اپنی واسکٹ کی اندرونی جیب میں منتقل کر لیا اور جنرل کی طرف گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"میں سیدھا اور آسان سا راستہ اختیار کر کے اپنی مہم کو ناکامی سے دوچار نہیں کر سکتا کیونکہ اسی راستے میں جنگجو لٹیروں سے مڈبھیڑ کا امکان رہتا ہے۔ حکمت عملی کا تقاضا یہ ہے کہ کسی سے ٹکرائے بغیر اپنا سفر جاری رکھا جائے۔ میں لداخ جانے کے لیے کشمیر کی سمت سے جانا زیادہ مناسب خیال کروں گا۔ یہ راستہ طویل اور دشوار گزار ضرور ہے مگر اصل راستے کی نسبت کم خطرناک ہے۔"

"تم نے راستہ منتخب کرنے میں کافی دانش مندی کا ثبوت دیا ہے۔" جنرل نے کچھ دیر سوچنے کے بعد خوشی کا اظہار کرتے مسکراتے ہوئے کہا۔

"شکریہ جنرل! اب مجھے اجازت دیجیے کیونکہ سورج نکلنے سے پہلے ہی میں قافلے کو لے کر روانہ ہو جانا چاہتا ہوں۔"

جنرل ڈوگ نے بڑی گرمجوشی سے مصافحہ کر کے مجھے رخصت کر دیا۔

**

ابھی سورج نکلنے میں دو گھنٹے باقی تھے کہ میں تیس آدمیوں کا قافلہ لے کر ایک طویل سفر کے لیے روانہ ہو گیا۔ سفر کے لیے میں نے ترتیب وہی رکھی تھی جو ورخر کی مہم کے دوران سفر کو کامیابی سے طے کرنے میں بہترین معاون ثابت ہوئی تھی۔

حالانکہ دو روز مجھے پُرامن علاقے سے گزرنا تھا مگر میں کسی بھی ناگہاں خطرے کو نظر انداز کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ میں نے چار گھڑ سوار جوانوں کو قافلے سے دو فرلانگ آگے چلنے کے لیے کہا تھا اور انھیں یہ تاکید کر دی تھی کہ ہر دو گھنٹے بعد مجھے راستے کی دشواریوں سے آگاہ کرتے رہیں۔ ان کے درمیان رائفل بردار قبائلی جوان تھے اور پیچھے تینوں گھوڑا گاڑیاں تھیں۔ ہر گاڑی پر چار چار جوان موجود تھے جن میں سے دو دو رائفل بردار تھے اور چار چار آدمی گاڑی کے دائیں بائیں چل رہے تھے۔

میں اور سارجنٹ آرٹ گاڑیوں کے پیچھے تھے۔

تین روز تک کسی حادثے سے دوچار ہوئے بغیر ہم جنت نظیر وادیوں میں داخل ہو گئے۔ ان وادیوں کا قدرتی حسن دل کو کھینچ رہا تھا۔ قافلے میں ہر جوان کی یہی تمنا تھی کہ وہ زیادہ سے زیادہ دیر تک بھی وادیوں میں موجود رہے مگر میرے نادان دوست شاید نہیں جانتے تھے کہ میں اس سفر کو جلد از جلد پایۂ تکمیل تک پہنچانا چاہتا تھا کیونکہ مائک تھارنے ابھی کل ہی مجھے بتایا تھا کہ میرے بابا کو جیل سے نکال کر اسپتال میں منتقل کر دیا گیا ہے اور ڈاکٹر اس کے آپریشن کی تیاری کر رہے ہیں۔ اس لیے میری کوشش تھی کہ اس مہم سے جلد از جلد واپس جاؤں تاکہ اپنے بابا کے بدلتے ہوئے حالات سے مکمل طور پر باخبر رہوں۔

خوبصورت وادیوں سے گزرتے ہوئے ہم پانڈا پورستی کے سامنے پہنچ گئے۔ ہم جوں جوں بلندی کی جانب سفر کر رہے تھے سردی اور موسم کی خرابیوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

پانڈا پور کی جھیل کے قریب پہنچ کر میں نے چیڑ کے درختوں کے درمیان قافلے کو پڑاؤ ڈالنے کا حکم دے دیا کیونکہ ہلکی ہلکی برفباری شروع ہو چکی تھی۔

درختوں کے درمیان گاڑیاں چھپا کر کھڑی کر دی گئیں اور مستعد جوانوں نے فوراً ہی خیمے گاڑ کر الاؤ روشن کر دیا۔ جوگندر سنگھ اپنے ماتحتوں کے ساتھ گھوڑوں کو چارہ ڈالنے لگا جب تک میں نے کھانے کی تیاری شروع ہو گئی تو میں اپنے خیمے میں آ گیا۔

کھانے سے فارغ ہونے تک برفباری زور پکڑ گئی۔ اس کے ساتھ ہی سیاہ بادلوں سے سارا آسمان ڈھک گیا۔ اندھیرا چھاتے ہی لالٹینیں روشن کر دی گئیں اور میں نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کر کے کہا۔ "دوستو! خدا کا شکر ہے کہ ابھی تک اس سفر میں ہمیں کسی تکلیف دہ دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا ہے مگر جس علاقے میں ہم اس وقت موجود ہیں یہاں سب سے بڑا دشمن موسم ہر ساعت رنگ بدلتا رہتا ہے۔ جس کے علاوہ ان وادیوں میں کسی گروہ سے بھی سامنا ہو سکتا ہے جو عام حالات میں موسم کی اس تبدیلی سے فائدہ اٹھا کر یہاں سے گزرنے والے قافلوں کو لوٹنے میں مہارت رکھتا ہو۔ اس لیے الاؤ مزید تیز کر دیا جائے اور رات کے پہرے داروں کی تعداد بھی بڑھا دی جائے۔"

میں نے چار آدمیوں کو گاڑیوں کی حفاظت پر مامور کر دیا۔ دو آدمی الاؤ کے قریب بیٹھ کر وادی پر نگاہ رکھ سکتے تھے۔ ہر چار گھنٹے بعد ان کی جگہ دوسرے آدمیوں کو مقرر کرنے کا کہہ کر میں نے باقی تمام لوگوں کو خیموں میں چلے جانے کا حکم دے دیا۔

"شہباز خان!" اچانک ایک قبائلی جوان نے کہا۔ "اگر تمھیں اعتراض نہ ہو تو ہم بھی الاؤ کے قریب ہی رہنا چاہتے ہیں۔"

میں نے بادلوں سے ڈھکے ہوئے آسمان کی طرف دیکھا اور نفی میں سر ہلا دیا۔ "موسم میں زبردست طوفان کے آثار پائے جاتے ہیں۔ اپنے گھوڑے مضبوطی سے باندھو اور خیمے میں چلے جاؤ۔ میں کوئی خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں ہوں۔"

سب لوگ اپنے اپنے خیموں میں چلے گئے مگر سارجنٹ آرٹ میرے قریب کھڑا حیرت سے گھورتا رہا۔ "سارجنٹ! تمھیں بھی اس وقت اپنے خیمے میں چلے جانا چاہیے ورنہ برف کی سِل کی طرح منجمد ہو جاؤ گے اور تمھارے اعضا حرکت کرنے سے محروم ہو جائیں گے۔ ہم اس وقت سب سے بڑے اور خطرناک پہاڑ کے ایک گوشے میں ہیں جہاں وحشی ریچھ اور چیتے بھی پائے جاتے ہیں۔ سردی سے ٹھٹھرے ہوئے انسان ان کے لیے بے حد آسان شکار ثابت ہوتے ہیں۔"

"مجھے ایسے برفانی علاقوں میں رہنے کا ایک طویل تجربہ ہے۔" سارجنٹ آرٹ نے اپنے چہرے پر خوشگوار مسکراہٹ لاتے ہوئے جواب دیا۔ "مگر میں اس بات پر حیرت زدہ ہوں کہ اتنی کم عمری کے باوجود تمھارا ہر فیصلہ کسی سن رسیدہ شخص جیسا دانش مندانہ کیونکر ہوتا ہے۔ میں نے اب تک کے اس سفر میں تمھارے ہر فیصلے کو اپنے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تجربے کی بنیاد پر تولا اور پرکھا تو اسے بروقت اور برمحل پایا۔ ہر فیصلہ بالکل درست ثابت ہوا۔ اب مجھے اچھی طرح احساس ہو گیا ہے کہ جنرل ڈوگ نے کئی اہم افسروں کو نظر انداز کر کے صرف تمھیں ہی کیوں اس مہم کا سربراہ بنایا ہے۔"

میں اس کی باتیں سن کر ہلکی سی مسکراہٹ سے مسکرایا اور خاموشی سے آگ کے لپکتے ہوئے شعلوں کو گھورتا رہا۔ پھر ہلکے ہلکے قدم اٹھاتا ہوا اپنے خیمے کی طرف چل پڑا۔

بابا کا خیال آتے ہی میری طبیعت اچانک مضطرب ہو گئی اور آنکھوں کے سامنے ان کا بوڑھا اور پُروقار چہرہ گھومنے لگا۔ میں ایک تہ ہو جانے والی کرسی پر بیٹھ کر اپنے بابا کے بارے میں سوچتا رہا۔

اگرچہ سردی شدت اختیار کر رہی تھی مگر بستر پر لیٹنے کو میرا جی نہیں چاہتا تھا۔

اچانک سارجنٹ ایک جوان کے ساتھ اندر آ گیا۔ اس کے ساتھ آنے والا قہوے کے برتن اٹھائے ہوئے تھا۔ مجھے کرسی پر بیٹھے دیکھ کر وہ مسکرانے لگا۔ "میں نے محسوس کیا تھا کہ تم میری باتوں سے کچھ رنجیدہ ہو گئے ہو۔" اس نے پیالی میں قہوہ انڈیلتے ہوئے کہا۔

"سارجنٹ! یہ تم نے کیسے سمجھ لیا کہ میں اپنی تعریف سن کر رنجیدہ ہو گیا ہوں۔" میں نے قہوے کا ایک گھونٹ بھرتے ہوئے نرمی سے سوال کیا۔ "ویسے یقین کرو ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

"پھر تم نے خاموشی کیوں اختیار کر لی تھی؟ جب تم اپنے خیمے میں چلے آئے تو مجھے اس وقت کسی گہری الجھن میں نظر آئے تھے۔ یہ میرا وہم بھی ہو سکتا ہے۔" اس نے کہا۔

"اس وقت تم کسی سارجنٹ کی بجائے کوئی فلسفی نظر آ رہے ہو۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "تمھارا یہ تجزیہ سو فیصد درست ہے کہ میں اس وقت ایک زبردست الجھن سے دوچار ہوں کیونکہ موسم کے آثار ایسے نہیں ہیں کہ ان پر اعتبار کر کے کوئی لائحہ عمل تیار کیا جا سکے۔ اپنی مہم کو کامیابی کی آخری منزل تک پہنچانے کے لیے ان قدرتی دشواریوں کے سبب میری فکرمندی بے جا نہیں ہے کیونکہ اس مہم کی کامیابی پر ہی میرے مستقبل اور میری بقا کا دارومدار ہے۔"

سارجنٹ آرٹ چند لمحوں تک میری باتوں پر غور کرتا رہا پھر سگریٹ سلگا کر دھوئیں کے کش لیتے ہوئے بولا۔ "تمھارا جواب اپنی جگہ پر معقول اور درست ہے مگر میں نے تو تمھاری آنکھوں میں کسی سوگواری کی کیفیت محسوس کی تھی جو ان مسائل سے قطعاً تعلق نہیں رکھتی۔

مجھے یہ حق تو نہیں ہے کہ میں تمھاری ذات کے بارے میں کوئی ایسا سوال کروں مگر ایک مخلص ساتھی ہونے کی حیثیت سے پوچھنے میں کوئی عار بھی محسوس نہیں کرتا۔ کیا میں تمھاری کوئی مدد نہیں کر سکتا؟"

اس کے لہجے سے گہرا خلوص جھلک رہا تھا مگر میں کسی سفید فام پر اعتبار کرنے کے لیے تیار نہیں تھا کیونکہ اس سے پہلے فلپ نے میرے سامنے اپنی عقیدت کا اظہار کرنے کے باوجود جنرل کی نظروں میں میری شخصیت کو مشکوک قرار دینے کا جو مظاہرہ کیا تھا۔ اس تجربے کی تلخی ابھی تک میری سوچوں میں باقی تھی۔

"سارجنٹ!" میں نے نرم لہجہ اختیار کرتے ہوئے جواب دیا۔ "اس دنیا میں کوئی ایک بھی فرد ایسا نہیں ہے جسے زندگی میں الجھنوں کا سامنا نہ کرنا پڑا ہو۔ ہمیں اس وقت ذاتی گفتگو کرنے کے بجائے مہم کی کامیابی کے لیے سوچنا چاہیے۔ ذاتی باتوں کے لیے کافی وقت پڑا ہے اور پھر یہ ضروری تو نہیں کہ ہر الجھن دوسروں کے سامنے بیان کی جا سکے۔ انسان کی زندگی میں بارہا ایسے مقامات آ جاتے ہیں جہاں اسے ذاتی الجھنوں سے بے نیاز ہو کر دوسروں کے مفاد کے لیے سوچنا پڑتا ہے۔ تم یہ بتاؤ کہ زندگی میں اب تک کتنے عشق کر چکے ہو اور تمھیں کہاں کہاں کامیابی حاصل ہوئی ہے۔" میں نے بات کا رُخ بدلنے کے لیے شگفتگی کا سہارا لیا۔

"تم بہت زیرک اور دانا ہو۔ چلنے والی ہوا کا رُخ بھانپ لیتے ہو۔" اس نے جھینپ مٹاتے ہوئے جواب دیا۔ "بہرحال میں اب تک کی زندگی میں پندرہ عشق کامیابی سے کر چکا ہوں مگر اسے تم میری بدنصیبی کہہ سکتے ہو کہ ہر بار کامیابی کے آخری مرحلے پر منگنی کی منحوس انگوٹھی مجھے واپس کر دی گئی۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تم بہت مستقل مزاج واقع ہوئے ہو ورنہ اس مختصر زندگی میں اتنی عورتوں کو نہیں چاہا جا سکتا۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"ہم، تمھاری طرح لکیر کے فقیر رہنا پسند نہیں کرتے۔" اس نے ڈھٹائی سے کہا۔ "ہم تو ہر نیا سال شروع ہونے کے ساتھ ساتھ محبت کا نمونہ بدلنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتے۔ ہمارے ہاں یہ قول مشہور ہے کہ 'لڑکی اور بس کے گزر جانے کا کبھی افسوس نہ کرو۔ ایک گئی ہے تو دوسری آتی ہی ہوگی'۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تمھارا معاشرہ اخلاقی پابندیوں کو خیرباد کہہ چکا ہے۔" میں نے فوراً ہی اندازہ کر لیا۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم لوگ ان پابندیوں سے نجات

حاصل کر چکے تھے جن کو مشرقی ممالک اپنی زندگی کا ایک اہم حصّہ سمجھ کر اپنائے ہوئے ہیں۔" اس نے میرا طنز نظر انداز کرتے ہوئے جواب دیا۔ "پابندیاں عائد کرنا بوڑھے لوگوں کا کام ہے۔ جوانی تو جذبوں کی سرمستی کا دوسرا نام ہے۔"

اچانک ہوا کے ایک تیز جھونکے سے لالٹین بجھ گئی اور ہماری یہ دلچسپ گفتگو ادھوری ہی رہ گئی۔ اس کے ساتھ ہی گھوڑے خوفزدہ انداز میں ہنہناتے ہوئے پتھریلی زمین پر پاؤں مارنے لگے۔ سارا ماحول لمحوں میں تاریکی کی زد میں آ گیا تھا۔ تیز ہوا کی گونجتی آواز یہ خوفناک طوفان کی آمد کا پیش خیمہ بن کر کسی نگہبان کو انجانی محسوس ہونے لگی۔

سارجنٹ آرتھ نے یکے بعد دیگرے ماچس کی کئی تیلیاں ضائع کر دیں مگر ہوا کی تیزی نے لالٹین روشن کرنے کی مہلت نہیں دی۔ خیمے کے پردے طوفانی انداز میں پھڑپھڑانے لگے تھے۔

"سارجنٹ اپنی ضائع نہ کرو۔" میں نے مشورہ دیا۔ "ہوا کی تیزی طوفانی بارش کا پتہ دے رہی ہے۔ کیا تمہیں ایسے طوفانوں کا سامنا کرنے کا پہلے بھی کبھی موقع ملا ہے؟"

"نہیں!" اس نے صاف گوئی سے اعتراف کیا۔ "میں نے برفانی علاقوں کا سفر ضرور کیا ہے مگر ابھی تک کسی ایسے طوفان کا سامنا کرنے کا یہ پہلا اتفاق ہے۔"

میں نے اٹھ کر خیمے کا پردہ تھام کر باہر کا جائزہ لیا۔ الاؤ ہوا کی تیزی کے باعث بھڑک رہا تھا۔ گھوڑے تیزی سے بے ہنگم آوازیں نکالتے ہوئے خود کو آزاد کرانے کی کوششوں میں زمین پر ٹاپیں مار رہے تھے۔

اچانک بادل خوفناک انداز میں گرجے اور تیز بارش شروع ہو گئی۔ بارش کا پہلا ریلا بہت زوردار تھا۔ ہر طرف موت کا گہرا سکوت طاری ہو گیا۔ میں نے خیمے کا پردہ درست کیا اور سارجنٹ آرتھ نے ہوا کے دباؤ میں کمی پاتے ہی لالٹین دوبارہ روشن کر دی... پھر میرے خیمے سے نکل کر بارش میں بھیگتا ہوا اپنے خیمے میں چلا گیا۔

میں نے بستر پر دراز ہو کر دو موٹے کمبلوں میں اپنے وجود کو سردی سے محفوظ کر لیا اور بارش کی ٹپ ٹپ کی آوازوں کے درمیان سونے کی کوشش کرنے لگا۔

❦

صبح جب بیدار ہوا تو فضا میں ہلکا ہلکا اجالا موجود تھا اور خیمے سے باہر الاؤ کے قریب بہت سے ساتھیوں کی ملی جلی آوازیں کانوں کو سنائی دے رہی تھیں۔ میں نے اٹھ کر خیمے کا پردہ ہٹاتے ہوئے باہر کا جائزہ لیا۔ کچھ ساتھی ناشتے کی تیاری میں مصروف تھے۔ بقیہ مستعد اور ہوشیار۔ پا کر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ یہ اس اعتماد کی دلیل تھی جس کے تحت میں نے بہترین ساتھیوں کا انتخاب کیا تھا۔

ہر شخص ایک نئے ولولے اور جوش کے ساتھ ابر آلود دن کا استقبال کرتا ہوا نظر آیا۔ میں نے برساتی پہنی اور سر ڈھانپتا ہوا اس طرف نکل گیا جہاں درختوں کے درمیان تینوں گاڑیاں چھپا کر کھڑی کی تھیں۔ گاڑیاں ترپالوں سے اچھی طرح ڈھانپ دی گئی تھیں اور چار نگران سپاہی گاڑیوں کے نیچے چھپے بیٹھے تھے۔ ان کے سردی کھائے ہوئے چہرے نیلے دکھائی دے رہے ہیں۔

"جیک!" میں نے ان میں سے ایک سفید فام کو مخاطب کیا۔ "تم لوگ الاؤ کے قریب چلے جاؤ تاکہ تمہاری سردی دور ہو جائے۔ دن کی روشنی ہمارے لیے اتنی خطرناک نہیں ہو سکتی کہ کوئی دشمن اچانک ہم پر حملہ کر کے ان گاڑیوں کو کوئی نقصان پہنچا سکے۔"

وہ میرا اشارہ پاتے ہی اٹھے اور ہاتھوں پیروں کو جھٹکتے ہوئے الاؤ کے قریب پہنچ کر اس کی حرارت اپنے وجود میں جذب کرنے لگے۔

میں نے اس جانب رخ کیا جہاں جوگندر سنگھ اپنے ساتھیوں سمیت گھوڑوں کی نگرانی کر رہا تھا۔ "جوگندر سنگھ! کہو رات کیسے گزری ہے؟"

"رات کی طوفانی بارش نے میرے دو بہترین گھوڑے زخمی کر دیے ہیں۔ جن کے بارے میں مجھے بے حد تشویش ہو رہی ہے۔"

"فکر مت کرو جوگندر سنگھ!" میں نے جواب دیا۔ "ہمارے پاس فالتو گھوڑے موجود ہیں۔ اس کے باوجود زخمی گھوڑوں کی دیکھ بھال کرو۔ ممکن ہے سفر شروع ہونے تک وہ ٹھیک ہو جائیں۔"

"اس کا مطلب ہے آج آگے سفر کرنے کا کوئی ارادہ نہیں؟" اس نے سادگی سے سوال کیا۔

"ان پہاڑوں کے درمیان بارش میں سفر کرنا بے حد خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ ہم اس وقت تک یہیں رہیں گے جب تک موسم خوشگوار نہیں ہو جاتا۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں جواب دیا اور مڑ کر الاؤ کی جانب آ گیا جہاں آگ کی زندگی بخش حرارتیں موجود تھیں۔

ناشتے کے بعد میں نے چار جوانوں کو درختوں کی شاخیں کاٹ لانے کا حکم دیا اور اپنے خیمے میں آ گیا۔ ہلکی ہلکی بارش ابھی تک تواتر کے ساتھ برس رہی تھی جس نے قافلے والوں کے حوصلے بھی سرد کر دیے تھے۔ دوپہر کے بعد جب بارش تھم گئی تو جیک اپنے ایک ساتھی کے ساتھ میرے خیمے میں آیا اور بولا۔ "اگر تم اجازت دو تو کچھ شکار کر لیں۔ اس موسم میں تازہ شکار بہت مزہ دے گا۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے نرمی سے جواب دیا۔ "ہم یہاں شکار کرنے کے لیے نہیں آئے ہیں۔ اگر اسی شکار کے دوران کسی کو کوئی نقصان پہنچ گیا تو اس کی تلافی کون کرے گا؟ یہ علاقہ درندوں سے بھرا پڑا ہے اس لیے میرا مشورہ ہے کہ کوئی دوسری مصروفیت نکال کر وقت گزاری کر لو۔"

"ہم بلندی کی طرف جانے کے بجائے ڈھلوان میں اتر کر شکار کریں گے۔ میرا خیال ہے اس میں خطرے کی کوئی بات نہیں۔"

"اگر تم اتنے ہی بے چین ہو تو ضرور جاؤ لیکن۔ محتاط رہنا۔" میں نے بادلِ ناخواستہ کہہ دیا۔

وہ مسکراتا ہوا رخصت ہو گیا۔ جوگندر سنگھ کا ایک ساتھی جو موسیقی کا بہت شوقین معلوم ہوتا تھا ایک پنجابی لوک گیت بلند آواز میں گانے لگا۔ جیک کے جاتے ہی میں نے دوربین سے وادی کا جائزہ لیا۔

رات بھر بارش کی وجہ سے وادی دھلی دھلی سی معلوم ہوتی تھی۔ ماحول میں اگرچہ دھندلاہٹ موجود تھی مگر پھر بھی وادی کا حسن دل و دماغ میں ایک عجیب سی تازگی کا احساس اجاگر کر رہا تھا۔

اچانک مجھے وادی میں ایک سیاہ دھبہ تیزی سے بلندی کی جانب حرکت کرتا نظر آیا تو میں چونک کر اس کی حقیقت جاننے کی کوشش کرنے لگا۔ فوراً ہی سیاہ دھبہ چھوٹی سی ایک گھوڑا گاڑی کی صورت اختیار کر گیا۔ گھوڑا گاڑی ناہموار راستے پر ہچکولے کھاتی ہوئی انھی نشانات پر چلی آ رہی تھی جو ہمارے قافلے کی وجہ سے پیدا ہوئے تھے۔

گاڑی ابھی ہم سے کافی دور تھی مگر اس نے مجھے الجھن میں ڈال دیا تھا۔

... اور پھر اس گھوڑا گاڑی کے عقب میں کچھ گھڑ سوار بھی نمودار ہوئے۔ یہ سوار گھوڑا گاڑی کو گھیرے میں لے کر اسے رکنے پر مجبور کر رہے تھے۔

گاڑی سے دو آدمی سروں سے ہاتھ بلند کیے ہوئے اترے تو ان کے بہت دیکھ کر میں اچھل پڑا۔ "سارجنٹ آرتھ!" میں نے منظر پر نگاہ رکھتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔

وہ الاؤ کے قریب کھڑا پنجابی ماہیا سن رہا تھا۔ "کیا بات ہے شہباز خان! تمہاری آواز میں تشویش کیوں ہے؟" اس نے تیزی سے میری جانب بڑھتے ہوئے سوال کیا۔

"سارجنٹ! کچھ لٹیرے ایک گھوڑا گاڑی کو گھیرے میں لیے ہوئے ہیں۔ میرا خیال ہے ہمیں ان لوگوں کی مدد کرنی چاہیے جو اس وقت لٹیروں کے درمیان گھرے ہوئے ہیں۔"

سارجنٹ آرتھ نے دوربین سے وہ منظر دیکھا اور تبصرہ کرتے ہوئے بولا۔ "لٹیرے انھیں گھیر کر واپس لے جا رہے ہیں۔"

"میرے ساتھ آؤ!" میں نے مداخلت کا فیصلہ کرتے ہوئے اپنے خیمے کی جانب لپکا اور اپنی رائفل سنبھال کر اس طرف بڑھا جہاں گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔ جب تک دوسرے ساتھی اس صورتِ حال سے باخبر ہوتے، ہم دونوں کافی فاصلہ طے کر چکے تھے۔

... لٹیرے ہماری مداخلت سے بے خبر گاڑی کو زنجیروں کے سہارے یرغمال بنائے کسی خفیہ مسکن کی جانب واپس جا رہے تھے۔ جونہی مجھے محسوس ہوا کہ وہ میری رائفل کی زد میں آ گئے ہیں، میں نے ایک چٹان کی اوٹ میں گھوڑا روکا اور ایک لٹیرے کا نشانہ لے کر گولی چلا دی۔ فضا میں گولی کا دھماکا گونجا اور اس لٹیرے کی کھوپڑی کے چیتھڑے اڑ گئے۔ جب تک دوسرے اس صورتِ حال سے باخبر ہوتے، میں ان کے ایک اور ساتھی کو گرا چکا تھا۔ ان میں سے ایک سارجنٹ کی رائفل کی زد میں آ کر اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ دو لٹیرے گھوڑا گاڑی پر گولیاں چلاتے ہوئے تیزی سے ایک چٹان کی اوٹ میں روپوش ہو گئے۔

میں نے رائفل کی نال آسمان کی طرف اٹھا کر گولی داغ دی۔ پھر اپنا گھوڑا بڑھا کر اس گاڑی کے قریب لے گیا اور تیزی سے چیخا۔ "گاڑی روک دو، موت کا خطرہ ٹل چکا ہے۔"

کسی نے گاڑی کی نشستوں کے درمیان بڑی آہستگی سے اپنا سر ابھارا اور باگیں تھام کر گھوڑوں کو روکنے کی کوشش کرنے لگا۔

"تم کون ہو... اور کہاں جا رہے ہو؟" میں نے گاڑی میں بیٹھے ہوئے سفید فام سے سوال کیا۔

"میں اور میرا ساتھی۔ ہم دونوں سنہری جھیل کی طرف جا رہے ہیں۔ شاید اسے ان لٹیروں نے ہلاک کر دیا ہے۔"

میں نے گاڑی میں جھانک کر دیکھا تو ایک سفید فام بوڑھا گٹھری کی شکل میں مردہ پڑا دکھائی دیا۔ اس کے تازہ خون کے چھینٹے گاڑی کے چوبی تختوں کو رنگین کر رہے تھے۔

"سنہری جھیل ان پہاڑوں کے درمیان کہاں واقع ہے؟" میں نے مشکوک نظروں سے اسے گھورتے ہوئے سوال کیا کیونکہ مجھے یہ شک ہو گیا تھا کہ کہیں یہ جنرل ڈونگ کے آدمی نہ ہوں جو خفیہ رہ کر ہمارے قافلے کی نگرانی کر رہے ہوں۔

"انھی پہاڑوں میں کہیں موجود ہے۔" اس نے پُر اعتماد انداز میں جواب دیا اور اپنے ساتھی کی لاش کو سوگوار نظروں سے دیکھنے لگا۔

اچانک ہی اس کی نظر سارجنٹ آرٹ پر پڑی تو اس کا افسردہ چہرہ مسکراہٹ سے کھل اٹھا: "اپنے ساتھی کی لاش دیکھ کر مجھے جس قدر دکھ ہوا ہے، تمھیں اپنا ہم وطن پا کر مجھے اتنی ہی خوشی ہوئی ہے۔ کیا تم لوگ سنہری جھیل پہنچنے میں میری کوئی مدد کرسکتے ہو؟" اس کی سوالیہ نظریں سارجنٹ آرٹ کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

"تمھارے بارے میں ابھی کوئی فیصلہ کرنا مشکل ہے۔" میں نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ "بہرحال تمھیں مایوس نہیں کیا جائے گا۔ یہاں سے کچھ دور ہمارا قافلہ موجود ہے۔ اپنے ساتھی کی لاش نکال کر پتھروں کے درمیان کہیں دفن کردو اور ہمارے ساتھ چلو۔ تمھاری داستان سننے کے بعد ہی یہ فیصلہ کیا جائے گا کہ ہم تمھاری کس حد تک مدد کرسکتے ہیں۔"

سارجنٹ آرٹ نے اس سفید فام کے ساتھ مل کر لاش کو گاڑی سے نکالا اور ایک چٹان کی اوٹ میں لے جا کر دفن کردیا۔ جب ہم اس سفید فام کو اپنے ساتھ لے کر پڑاؤ میں پہنچے تو جیک اور اس کے ساتھی شکار سے واپس آچکے تھے۔

"شکار کیسا رہا؟" سارجنٹ آرٹ نے دور سے ہی انھیں دیکھ کر نعرہ لگایا۔

"دو ہرن مل گئے تھے فی الحال انھی پر اکتفا کرلیا اور واپس آگئے۔" جیک نے شگفتگی کے ساتھ جواب دیا اور حیرت سے اس گھوڑا گاڑی کو گھورنے لگا جس میں اس کا ایک ہم وطن بیٹھا ہوا تھا۔

"معلوم ہوتا ہے تم لوگ بھی شکار کے لیے نکل گئے تھے۔" جیک نے زیرلب کہا۔

"تم لوگ شاید باغیوں کی سرکوبی کے لیے جارہے ہو۔" سفید فام نے ایک اچٹتی نظر میرے ساتھیوں پر ڈالتے ہوئے خیال آرائی کی۔

"تم یہ بتاؤ کہ اس ہولناک ویرانے میں تمھارا کیا کام ہوسکتا ہے؟ ہمارے بارے میں غیر ضروری باتیں کرنے سے پرہیز کرو اور گاڑی سے اتر کر الاؤ کے قریب آجاؤ تاکہ تمھارے ٹھٹھرے ہوئے جسم کو آگ کی زندگی بخش حرارت کچھ سکون پہنچا سکے اور تم بہتر طریقے سے اپنی سرگزشت سنا سکو۔" میرا لہجہ ہر قسم کے تاثر سے خالی تھا: "ابھی یہ فیصلہ ہونا باقی ہے کہ تمھیں کیا حیثیت دی جائے۔"

سفید فام اپنا بھاری جسم سنبھالتا ہوا گاڑی سے اتر کر الاؤ کے قریب بیٹھ گیا اور سر سے اونی ٹوپی اتار کر اس پر جمی ہوئی برف صاف کرنے لگا۔ میں نے جوگندر کو گھوڑے کھولنے کا اشارہ کیا اور آسمان پر منڈلاتے ہوئے سایوں کو دیکھتے ہوئے قہوہ تیار کرنے کا حکم دیا۔

سفید فام نے اپنا بھاری کوٹ اتار کر خیمے کی ترپال پر ڈال دیا اور پتلون کی جیب سے ایک بجھا ہوا سگار نکال کر سلگانے لگا... پھر دو تین کش لینے کے بعد حلق سے دھواں اگلتے ہوئے وہ ہلکے سے مسکرایا اور دھیمے لہجے میں بولا: "شاید تم اس مہم کے سربراہ ہو؟ تمھاری عقابی نظریں میرا وجود چھیدتی ہوئی میری روح کی گہرائیوں تک جھانک کر میری شخصیت کا مشاہدہ کرنے میں مصروف ہیں حالانکہ اس وقت میری حیثیت کسی مشکوک نہیں بلکہ ایک مظلوم انسان کی ہے۔" وہ بڑے ناپ تول کر بولنے کا عادی معلوم ہوتا تھا۔

"تم کس قدر ظالم ہو اور کس حد تک مظلوم ہو؟ اس کا فیصلہ تو تمھارے متعلق جاننے کے بعد ہی کیا جاسکتا ہے۔" میرے لہجے میں سختی آگئی۔ مجھے اس کا اندازِ گفتگو پسند نہیں آیا تھا۔

میرے لہجے میں سختی محسوس کرکے اس کا مسکراتا ہوا چہرہ دوبارہ سنجیدہ ہوگیا اور اس کی نیلگوں آنکھیں گہری سوچ میں ڈوب گئیں۔ میرے سارے ساتھی غور سے اس کی پرکشش شخصیت کا جائزہ لے رہے تھے اور ان کے کان ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو پر لگے ہوئے تھے۔

میرے ایک ساتھی نے قہوے کے برتن لاکر ہمارے سامنے رکھ دیے۔

سفید فام اجنبی نے قہوے کی پیالی اٹھالی۔ پھر چند گھونٹ اپنے حلق میں انڈیلنے کے بعد مجھ سے مخاطب ہوا: "نوجوان! تمھارے لہجے میں تلخی کا عنصر بہت زیادہ ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ تمھیں اپنی زندگی اچھے لوگوں میں گزارنے کا موقع نہیں ملا اور تم اپنے ماضی میں بہت زیادہ اذیتیں اٹھا چکے ہو۔" یہ کہہ کر اس نے قہوے کی پیالی دوبارہ ہونٹوں سے لگالی اور جرعہ جرعہ کرکے اپنے حلق میں اتارنے لگا۔

"اجنبی! ہمارے پاس کافی وقت ہے۔ تم اپنی سرگزشت تفصیل کے ساتھ بیان کرسکتے ہو۔ میرے بارے میں اظہارِ خیال کرنے کے بجائے اپنے متعلق بتاؤ کہ تم کس قماش کے انسان ہو اور تمھاری سماجی حیثیت کیا ہے؟"

"میں کاؤنٹ ہیلڈر ہوں۔" سفید فام نے بڑے موثر لہجے میں جواب دیا۔ "اور میں ان لوگوں میں سے ہوں جن پر قسمت کی دیوی ہمیشہ سایہ فگن رہتی ہے۔ یوں سمجھو کہ میرا شمار دنیا کے ان چند گنے چنے لوگوں میں سے ہے جن کے بارے میں لوگ یہ تصور کرتے ہیں کہ وہ منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا ہوتے ہیں لیکن ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی... میں خود کو دنیا کا بدنصیب انسان

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تصور کرنے لگا ہوں۔ یہ میرے لیے دنیا کا منحوس ترین خطہ ثابت ہورہا ہے۔ جس کا اندازہ فادر ہیٹی کی اچانک موت سے لگایا جاسکتا ہے۔ فادر ہیٹی کی یہ تمنا تھی کہ وہ ایک مرتبہ سنہری جھیل تک پہنچنے میں کامیاب ہوجائیں اور سنہری جھیل پر موجود حضرت مسیح کے دور کے درختوں کے پتوں پر لکھی ہوئی مقدس انجیل کی زندگی میں ایک مرتبہ زیارت کرلیں مگر افسوس زندگی نے ان سے وفا نہیں کی اور لٹیروں نے اچانک جان لے کر ان کی زندگی کا مقدس مقصد ناکام بنادیا۔"

اس کے لہجے میں گہرا تاسف ابھر آیا تھا۔ کچھ دیر وہ سانس لینے کے لیے رکا اور نیا سگار سلگا کر کش لیتے ہوئے دوبارہ اپنی سیاحت کی داستان سنانے لگا۔

"باپ کی ورثے میں چھوڑی ہوئی بے شمار دولت کا میں تنہا وارث تھا۔ اپنے جرمنی محل میں ایک ملاقات کے دوران جب فادر ہیٹی نے اس مقدس انجیل کا تذکرہ کیا اور اس کی زیارت کرنے کی حسرت ظاہر کی تو میں سمجھ گیا کہ فادر ہیٹی درپردہ مجھے مقدس انجیل کے اس نایاب نسخے کو محفوظ کرنے کے لیے اکسا رہے ہیں۔ میں نے ان کی معلومات سے فائدہ اٹھانے کا ارادہ کرلیا اور فادر ہیٹی کو اپنے ساتھ لے کر ہندوستان آگیا۔ سرینگر میں، میں نے چند مقامی لوگوں سے رابطہ قائم کیا اور بھاری معاوضہ دے کر انھیں سنہری جھیل تک اپنے ساتھ چلنے پر آمادہ کرلیا۔ فادر ہیٹی جلد از جلد اپنا سفر طے کرکے مقدس انجیل کی زیارت کرنے کے لیے بے چین اور مضطرب ہوگئے تھے۔ اس لیے جلدی ہی ہم چھ محافظوں کے ساتھ ہی سنہری جھیل کی طرف چل پڑے۔ راستے ہمارے لیے اجنبی تھے اس لیے بھٹکتے ہوئے ہم چین کی سرحد تک جا پہنچے مگر سنہری جھیل کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔ سرحد سے واپسی پر ہماری ملاقات ایک بوڑھے سے ہوئی جو پہاڑی کے ایک ٹیلے پر ایک کٹیا میں تنہا رہتا تھا۔ اس سے ہم نے سنہری جھیل کے بارے میں دریافت کیا تو وہ بڑے پراسرار انداز میں مسکراتے ہوئے بولا: 'سنہری جھیل تک پہنچنا بہت مشکل ہے۔ وہ دنیا کے سب سے خطرناک اور دشوار گزار علاقے میں واقع ہے۔ ان اطراف میں بسنے والے قبائلی اجنبی لوگوں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتے۔ اگر کسی لٹیرے گروہ کے ہتھے چڑھ گئے تو یہ آدھی درجن محافظ تمھاری زندگیاں ان کی دسترس سے محفوظ نہیں رکھ سکیں گے۔ اس لیے میرا مشورہ مانو اور سنہری جھیل پر جانے کا ارادہ ترک کرکے اپنے وطن واپس چلے جاؤ۔' لیکن ہمیں اپنا سفر جاری رکھنے پر مصر پاکر اس نے بتایا کہ سنہری جھیل چترال اور چیلاس کی پہاڑیوں میں واقع ہے اور وہاں تک ہمارا زندہ پہنچ جانا کسی معجزے سے کم نہیں ہوگا کیونکہ اس علاقے میں درندے بھی کثرت سے پائے جاتے ہیں جو انسانوں کے ساتھ رحم دلی کا سلوک کرنا ہی نہیں جانتے۔ تب ہم اپنا قافلہ لے کر چترال کی طرف چل پڑے... اور پھر ایک روز... جب رات کا ہولناک سناٹا اپنے انجام کو پہنچ رہا تھا، اچانک ہم پر اس تلخ حقیقت کا انکشاف ہوا کہ ہمارے سارے محافظ بہت سا ضروری سامان سمیت رات کی تاریکی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے فرار ہوچکے ہیں۔ میں نے تنہا رہ جانے پر فادر ہیٹی کو مشورہ دیا کہ ہمیں تاج برطانیہ کی کسی چوکی سے رابطہ قائم کرکے اپنے ساتھ محافظوں کی نئی کھیپ لینی چاہیے ورنہ کوئی بھی ناگہانی ہمیں زندگیوں سے محروم کردے گی... مگر فادر ہیٹی قدم آگے بڑھا کر پیچھے ہٹانے کے عادی نہیں تھے۔ وہ اپنی ضد پر اڑے رہے اور کہنے لگے کہ اس میں ضرور مسیح کا کوئی بھید ہے ورنہ ہمارے محافظ ہمیں چھوڑ کر کبھی الگ نہ ہوتے۔ مسلسل تین ہفتوں سے ان ہولناک چٹانوں میں بھٹکتے ہوئے یہاں پہنچے تو اچانک یہ حادثہ پیش آگیا... لٹیروں نے فادر ہیٹی کی جان لے کر میری مہم کو تباہی کے کنارے پہنچا دیا ہے۔"

کاؤنٹ ہیلڈر اپنی داستان سنا کر خاموش ہوگیا۔ اس کے لب و لہجے سے جھلکتی ہوئی سچائی نے اس کے گرد پھیلے ہوئے شکوک کے بادل صاف کردیے اور میں نے اطمینان کے اظہار میں گردن ہلادی۔

"مگر ابھی تک تم نے یہ نہیں بتایا کہ مستقبل قریب میں تمھارے کیا ارادے ہیں۔ اپنا سفر جاری رکھنا چاہتے ہو یا یہیں سے واپس چلے جاؤ گے؟" میں نے سوال کیا اور نظریں اس کے وجیہہ چہرے پر گاڑ دیں۔

"اپنی زندگی میں مجھے کسی معاملے میں شکست کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔" اس کا لہجہ بے حد پراسرار ہوگیا۔ "مگر اب میں شکست تسلیم کرنے پر مجبور ہوگیا ہوں۔ تنہا آگے سفر کرنا خودکشی کے مترادف ہے مگر تم لوگوں کے قافلے کو دیکھ کر میری تھکی ہوئی امیدیں دوبارہ بیدار ہورہی ہیں اور میں..."

کاؤنٹ ہیلڈر اپنی بات ادھوری چھوڑ کر خاموش ہوگیا اور آگ کے حرارت بخش شعلوں کو گھورنے لگا۔ جیک اور اس کے ساتھیوں کے شکار کیے ہوئے ہرن آگ پر بھونے جارہے تھے اور نتھنوں میں گھستی ہوئی اشتہا انگیز بو سے ماحول میں خوشگواری کی لہر دوڑ رہی تھی۔

کاؤنٹ ہیلڈر نے دہکتے ہوئے شعلوں سے نگاہ ہٹا کر میرے چہرے پر گاڑ دی اور خوشگوار لہجے میں بولا: "تم لوگ کون ہو اور کدھر جانے کا ارادہ رکھتے ہو؟ اگر تم چیلاس تک مجھے بھی اپنا ہم سفر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بیٹھنے کی اجازت دے دو تو یہ بات میرے لیے ذاتی خوشی کا باعث ہو گی۔"

میں نے سارجنٹ اور فرنگی سپاہیوں کی طرف دیکھا۔ سب کی آنکھوں سے رضامندی جھلک رہی تھی، اس لیے میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں نے اسے اپنا نام بتاتے ہوئے کہا۔ "ہم لداخ جا رہے ہیں۔ اگر تم ہمارے ساتھ سفر جاری رکھنا چاہتے ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ مگر تمہیں اس بات کا یقین دلانا ہو گا کہ جب تک تم ہمارے ساتھ رہو گے تمہیں میرے احکامات کے مطابق عمل کرنا ہو گا۔ حکم عدولی کی صورت میں تمہاری حفاظت کی ذمہ داری قبول نہیں کی جا سکتی۔"

"شہباز خان!" اس کی آنکھیں ممنونیت کا اظہار کرنے لگیں۔ "میں پاک دامن کی قسم کھا کر یقین دلاتا ہوں کہ تمہارے احکامات کو کبھی نظر انداز نہیں کروں گا اور اس نیکی کا بدلہ لڑائی میں ضرور دوں گا۔"

کاؤنٹ کے لہجے میں سچائی کی گہری جھلک پوشیدہ تھی۔ نہ جانے کیوں میرا دل چاہتا تھا کہ میں اس کی بات سُن لوں اور اس پر اعتبار کروں اور اسے ان مشکل حالات سے نکلنے کا موقع دوں جو اس کی خواہشات کے راستے میں دیوار بن کر حائل تھے۔

کھانے کے دوران کاؤنٹ بیلدھن نے خوب پیٹ بھر کر ہرن کا گوشت بھی کھایا۔

"اگر اس بات کی اجازت دو تو میں اپنی گاڑی میں جا کر سونا چاہتا ہوں۔ مسلسل سفر کی تکلیفیں اُٹھاتے اُٹھاتے میرے اعصاب جواب دے گئے ہیں۔ آج جی بھر کے کھانے کو ملا ہے تو نیند کی پری اخلاقی پابندیوں سے ماورا ہو کر اپنا قصاص طلب کر رہی ہے... اور ہاں! میری گاڑی میں چند ایسی بڑی ترپالیں بھی موجود ہیں۔ جنھیں درختوں سے باندھ کر اس میدان کو برف باری اور بارش کے پانی سے محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ خشک دودھ اور گوشت کے ڈبے بھی موجود ہیں۔ اس لیے میرا وجود تم لوگوں پر بوجھ نہیں بنے گا۔"

"ٹھیک ہے... لیکن تم گاڑی کی بجائے میرے خیمے میں رہو گے۔" میں نے کہا۔

میں نے دو آدمیوں کو اپنے خیمے میں کاؤنٹ کے لیے بستر لگانے کی تاکید کی اور سارجنٹ آرٹ کو اُٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کاؤنٹ کی طرف بڑھا۔ میں نے سارجنٹ آرٹ کی مدد سے ترپالیں نکال کر ان کا جائزہ لیا اور اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "ان ترپالوں سے کام لیا جائے۔ انھیں مختلف درختوں سے باندھ کر سردی اور ہوا کے دباؤ میں کمی پیدا کی جا سکتی ہے۔"

کچھ لوگوں نے ان گراں ترپالوں سے الاؤ کو بارش اور ہوا سے محفوظ [illegible] تب ان کاموں سے فراغت پا کر اپنے خیمے میں پہنچا تو کاؤنٹ گہری نیند سو چکا تھا اور اس کے گلے سے خرخر کی آوازیں نکل رہی تھیں۔

❖

رات کا آخری پہر تھا۔ میں موٹے کمبلوں کی تہ میں دبکا ہوا گہری نیند میں تھا کہ اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے اپنا سر کمبل سے نکال کر خیمے کا جائزہ لیا۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں کاؤنٹ بیلدھن کے خراٹے سن کر میں نے دوبارہ اپنا منہ کمبل میں چھپا لیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا... مگر نہ جانے نیند اچانک ہی کیوں روٹھ گئی تھی۔ ماحول پر چھایا ہوا گہرا سکوت غیر فطری محسوس ہونے لگا۔ اچانک کسی انجانے خطرے کے مبہم احساس نے میرے وجود کو اپنی گرفت میں لے لیا۔

میں نے کڑاکے کی سردی کے باوجود بستر چھوڑ دیا اور بھاری کوٹ پہن کر اونی ٹوپی سے سر اور کان ڈھانپتا ہوا خیمے سے باہر آ گیا۔ رائفل میرے دائیں ہاتھ میں موجود تھی۔

فضا زبردست کہر آمیز دھوئیں کی لپیٹ میں تھی۔ الاؤ کے قریب دو نوجوان اپنی رائفلیں کاندھوں سے لگائے سرگوشیوں میں نہ جانے کس تبادلۂ خیال میں مصروف تھے۔ میرے قدموں کی چاپ سنتے ہی دونوں ایک دم اپنی رائفلیں سیدھی کرتے ہوئے میری جانب گھوم گئے... پھر مجھے پہچان کر ان میں سے ایک بولا۔ "شہباز خان! رات اپنا آخری سفر طے کر رہی ہے۔ شاید فرائض کی مجبوریوں نے تمہیں بھی ہماری طرح آرام سے محروم کر دیا ہے۔"

"تمہارا خیال درست ہے۔" میں نے ماحول کا جائزہ لیتے ہوئے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "میں یہ دیکھنے کے لیے اُٹھا ہوں کہ میرے ساتھی اپنے فرائض کس طرح ادا کر رہے ہیں۔ کوئی غیر معمولی آواز سنتے ہی اپنے ساتھیوں کو ضرور خبردار کر دینا۔ میں ہوا میں کسی خطرے کی بو محسوس کر رہا ہوں۔"

"اگر ہم نے کوئی غیر معمولی بات محسوس کی تو سب کو چوکنا کرنا نہیں بھولیں گے۔" ان میں سے ایک نے پُرسکون انداز میں جواب دیا اور مجھے اُلجھی ہوئی نظروں سے گھورنے لگا۔

میں ان کے قریب سے گزرتا ہوا ڈھلان کی جانب چل دیا جہاں کچھ نوجوان گھوڑوں کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔ میرے قدموں کی ہلکی سی آہٹ پاتے ہی طاقتور ٹارچ کی روشنی میرے چہرے پر پڑی اور مجھے پہچان کر وہیں ساکت کر دی گئی۔

"ہزارہ سنگھ! تمہارا کیا حال ہے؟" میری آواز پُرسکوت رات میں گونج اٹھی۔ میں نے اپنی رائفل زمین پر ٹیکا دی۔

"سب ٹھیک ہے!" ہزارہ سنگھ نے جواب دیا۔ "تمہیں اس شدید سردی میں اپنا گرم بستر چھوڑ کر نہیں آنا چاہیے تھا۔ کیا تمہیں ہماری صلاحیتوں پر اعتماد نہیں ہے شہباز خان؟"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے ہزارہ سنگھ!" میں نے اس کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے پُراعتماد لہجے میں جواب دیا۔ "مجھے اس خوفناک سناٹے میں خطرے کی ان گنت پرچھائیاں اپنے پڑاؤ کی جانب بڑھتی محسوس ہو رہی ہیں۔ اس لیے میں تم لوگوں کو آگاہ کرنے آیا ہوں۔"

میں اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر گاڑیوں کی طرف بڑھا جہاں جیک اپنے ساتھیوں کے ساتھ مستعد بیٹھا تھا۔ اس نے رات کے آخری پہر میں مجھے پڑاؤ کا معائنہ کرتے دیکھ کر کسی تاثر کا اظہار نہیں کیا۔ میں درختوں کے درمیان سے گزرتا ہوا الاؤ کی طرف بڑھ رہا تھا کہ اچانک اپنے سامنے ایک چٹان پر سیاہ دھبہ دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ یہ دھبہ بڑی آہستگی سے کیمپ کی جانب سرکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے ایک نظر جھپکتے ہوئے الاؤ کی طرف دیکھا جس کے نیلگوں شعلے عجیب سی روشنی منعکس کر رہے تھے۔ میری نظریں گھومتی ہوئی دوبارہ اسی دھبے پر جم گئیں جو اب بہت قریب آ گیا تھا۔ میں نے اپنی رائفل سیدھی کی اور سیاہ دھبے پر مسلسل دو گولیاں داغ دیں۔

گولی کا دھماکا گونجتے ہی ایک کریہہ چیخ سناٹے میں اُبھری اور ایک بھاری بھرکم سیاہ وجود اپنی جگہ سے اچھل کر مجھ پر یوں گرا کہ اس کے نوکیلے پنجوں میں سے ایک میرے کوٹ کی آستین چیرتا ہوا میرا شانہ زخمی کر گیا۔ میرے ایک دم گر جانے سے وہ بھی اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا اور ڈھلوان کی جانب لڑھکتا چلا گیا۔

یہ سب کچھ ایک لمحے کا کھیل ثابت ہوا۔

میں نے خطرہ ٹلتے ہی بڑی آہستگی سے خود کو سنبھالا اور ڈھلوان میں اس سیاہ وجود کو گھورنے لگا جو اب ساکت ہو چکا تھا۔ دھماکا سنتے ہی پڑاؤ میں زبردست ہیجان کی لہر دوڑ گئی۔

"یہ ایک ریچھ تھا جو رات کی تاریکی کا فائدہ اُٹھا کر ہم میں سے کسی کو اپنا شکار کرنے نکلا تھا مگر خود شکار ہو گیا!" میں نے سارجنٹ آرٹ کو اپنے عقب میں موجود پا کر تبصرہ کیا۔ اس وقت تک سب لوگ اپنی اپنی رائفلیں تھامے اپنے گرم بستر چھوڑ کر میرے قریب جمع ہو گئے تھے۔ "تمہاری آستین خون سے بھیگی ہوئی ہے۔ اپنا کوٹ اتار کر الاؤ کے قریب آ جاؤ۔ میں [illegible] کو بلاتا ہوں۔ وہ تمہاری مرہم پٹی کر دے گا!" سارجنٹ نے کہا۔

میرے زخمی شانے سے آگ کی چنگاریاں سی اُبھر رہی تھیں۔ میں نے الاؤ کے قریب آ کر اپنا کوٹ اتار دیا اور قمیض ہٹا کر اپنے شانے کا جائزہ لینے لگا جہاں ریچھ کے نوکیلے پنجے کی خراشیں موجود تھیں۔

ڈائمنڈ نے آتے ہی میری قمیض اُتار دی اور زخم پر مرہم لگا کر پٹی باندھ دی۔ اس سے کچھ سکون محسوس ہوا۔

"سارجنٹ! اپنے آدمیوں کو حکم دو کہ وہ قہوہ تیار کریں۔ اور دوسرے تمام ساتھی پڑاؤ کے آس پاس پھیل جائیں۔ میں اس ریچھ کی نسلی خصوصیت سے واقف ہوں۔ اس کا کوئی نہ کوئی ساتھی ہم میں سے کسی کو بڑی عیاری سے اپنا شکار بنانے کی کوشش کرے گا۔ اس لیے جہاں بھی کوئی سیاہ دھبہ نظر آئے کوئی خطرہ مول لیے بغیر اسے گولی کا نشانہ بنا دو۔"

میرا حکم سنتے ہی کچھ لوگ قہوہ تیار کرنے اور دوسرے ساتھی پڑاؤ کے گرد پھیل کر ریچھ کو تلاش کرنے لگے۔ میں گرم قہوے کے گھونٹ حلق سے اتار ہی رہا تھا کہ اچانک رائفلوں کے دھماکوں سے ماحول کا عارضی سکوت ختم ہو گیا۔ پے در پے فائرنگ کی آوازیں سُن کر میں نے قہوے کی پیالی زمین پر رکھی اور اپنی رائفل سنبھالتا ہوا اس طرف چل پڑا جدھر سے مسلسل فائرنگ کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔

"کیا بات ہے سارجنٹ؟" میں نے اسے دُور سے پہچان کر سوال کیا۔

"ہمارے شیر دل ساتھیوں نے ایک ساتھ تین ریچھوں کو موت کے حوالے کر کے کارنامہ انجام دیا ہے، مگر مجھے ابھی تک حیرت ہو رہی ہے، تم نے یہ کیسے محسوس کر لیا کہ اچانک کچھ خطرناک درندے پڑاؤ کی طرف بڑھ رہے ہیں؟ تمہاری قبل از وقت خطرہ محسوس کرنے کی قوت بہت تیز ہے۔"

اس کی آنکھوں میں حیرت کی مشعلیں روشن پانے کے باوجود میں نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ اس ڈھلوان میں جھانکنے لگا۔ جدھر سے میرے ساتھی ریچھ کی ایک لاش گھسیٹ کر روشنی میں لا رہے تھے۔

فضا میں آہستہ آہستہ دودھیا اُجالا اپنا تسلط جما رہا تھا اور ہم سب الاؤ کے گرد بیٹھے ہوئے سورج کی سنہری کرنیں زمین پر اترنے کے منتظر تھے تاکہ آگے اپنا سفر جاری رکھ سکیں۔

دُھند صاف ہوتے ہوتے دس بج گئے۔ میں نے سورج کی کرنیں جاندار ہونے کا انتظار نہیں کیا اور قافلہ آگے بڑھ گیا۔ ڈھلان میں ایک ریچھ کی کچلی ہوئی لاش دیکھ کر مجھے اپنے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شانے میں درد کی نئی لہر اٹھتی محسوس ہوئی۔ راستے میں برف کی دبیز تہ بچھی ہوئی تھی جس کی وجہ سے گاڑی کے پہیے بار بار اس میں دھنس جاتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ سفر کی رفتار بے حد سست تھی۔ پھر بھی کسی نہ کسی طرح شام کا دھندلکا پھیلنے تک ہم نے پانڈا پور کا جنگل عبور کر لیا۔ اچانک ہی میری نگاہ ایک کشادہ غار پر پڑی اور میں نے رات اسی غار میں گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔ گاڑیوں کو دھکیل کر غار میں پوشیدہ کر دیا گیا اور غار کے دہانے کے قریب الاؤ روشن کر کے میرے ساتھی دوسرے انتظامات میں مشغول ہو گئے۔

غار میں بیک وقت چند عدد لالٹینیں روشن ہوئیں اور تیرگی نے دم توڑ دیا۔ غار کا دہانہ اس قدر وسیع تھا کہ نصف درجن آدمی ایک ساتھ اس میں سے گزر سکتے تھے۔ کاؤنٹ ہیلڈر کی گاڑی، ایک مورچے کی شکل دے کر دہانے کے ایک کونے میں کھڑی کر دی گئی اور چار جوان وہاں پہرے پر کھڑے کر دیئے۔

رات کے کھانے سے فارغ ہو کر میں اپنے بستر کی طرف آ گیا جہاں کاؤنٹ ہیلڈر ایک تہ ہو جانے والی کرسی پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ میرے قدموں کی آہٹ سن کر اس نے اپنی نیلی آنکھیں کھول دیں اور ہونٹوں پر مصنوعی مسکراہٹ لاتے ہوئے گہری نظروں سے میرا جائزہ لینے لگا۔

"کاؤنٹ! میرے چہرے پر کیا تلاش کر رہے ہو؟" میرے لہجے میں ہلکی سی تلخی تھی۔ اس کا یوں مسلسل گھورنا مجھے اچھا نہیں لگا تھا۔

"میں تمھارے چہرے پر وہ عزم و حوصلہ تلاش کر رہا ہوں، جس سے میں اب تک محروم رہا ہوں۔" اس نے لہجے میں مصنوعی شگفتگی پیدا کرتے ہوئے جواب دیا۔

"دُنیا کی ہر شے دولت سے نہیں خریدی جا سکتی۔ عزم و حوصلہ نظر آنے والی مادی چیزیں نہیں ہیں۔ عزم و حوصلے کا خمیر انسان کے احساسات سے اٹھتا ہے۔ تمھیں شاید ہر وقت لوگوں کا نفسیاتی تجزیہ کرتے رہنے کی عادت ہو گئی ہے یہ ایک اچھی عادت ہے بشرطیکہ کبھی کبھی آدمی خود اپنے گریبان میں بھی جھانک لے۔ ورنہ یہ ایک بد عادت ہے جو انسانوں کو آزار پہنچانے کا سبب بھی بن سکتی ہے۔"

میرا فلسفیانہ جواب سن کر کاؤنٹ کی آنکھوں میں حیرت کے آثار ابھر آئے۔ شاید اسے مجھ سے اس جواب کی توقع نہیں تھی۔ میں نے اپنا کوٹ اتارا اور گرم بستر میں دراز ہو گیا۔ کاؤنٹ چند لمحے خاموشی سے کچھ سوچتا رہا پھر انگڑائی لیتا ہوا اُٹھا سونے کے ارادے سے اپنے بستر پر چلا گیا۔

کچھ دیر تک میرے شانے میں ہلکا ہلکا درد کروٹیں [illegible] رہا پھر اچانک مجھ پر غفلت کی نیند طاری ہو گئی اور درد [illegible] احساس رات کے اندھیرے میں پوشیدہ ہو کر ماحول کے [illegible] کا ایک حصہ بن گیا۔

میں گہری نیند میں تھا کہ اچانک کسی بھاری شے کے گرنے کی آواز سن کر میری آنکھ کھل گئی۔ اس کے ساتھ [illegible] کے اندر گھوڑوں کی خوفزدہ اور بے ہنگم آوازیں گونج [illegible]

میں نے اُٹھ کر اپنی رائفل تھامی اور دوڑتا ہوا اُس طرف بڑھا جہاں گھوڑے باندھے گئے تھے۔ گھوڑے ابھی تک زمین پر ٹاپیں مارتے ہوئے خوفزدہ انداز میں ہنہنا رہے تھے... پھر جو نہی گھوڑوں کے خوفزدہ ہونے کا راز مجھ پر کھلا، میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور میں چند لمحوں تک مبہوت ہو کر یہ ہولناک منظر دیکھتا رہا۔

ایک جسیم اژدہا اپنے وجود کے پیچ و خم میں ایک گھوڑے کو لپیٹے ہوئے آہستگی کے ساتھ غار کے اندرونی حصے کی جانب رینگتا دکھائی دے رہا تھا۔ نیم تاریکی میں اس کی دو شاخہ زبان بجلی کے کوندے کی طرح لہراتی دکھائی دے رہی تھی۔ گھوڑا اژدہے کے خمدار جسم کا شکار بن کر دم توڑ چکا تھا۔

میں نے رائفل کا کلپ ہٹایا اور اژدہے کی کھوپڑی کا نشانہ لے کر گولی چلا دی۔ اژدہا اچانک پلٹا اور اپنی سرخ آنکھوں سے مجھے گھورتا ہوا میری جانب لپک پڑا۔ میں نے دوسری بار گولی چلائی۔

اژدہا زخمی ہو کر تڑپنے لگا اور مُردہ گھوڑا اس کے آہنی شکنجے سے نکل کر زمین بوس ہو گیا۔ اس کے بعد بیک وقت کئی لالٹینیں روشن ہو گئیں۔ سب لوگ بیدار ہو گئے تھے۔

اژدہا زندگی سے محروم ہو کر ساکت ہو چکا تھا مگر میرے ساتھی ہیجانی حالت میں اس پر اب بھی گولیاں برسانے پر آمادہ نظر آ رہے تھے۔

"بھول جاؤ اسے۔" میں نے حلق کے بل چیخ کر کہا۔ "یہ مُردہ ہو چکا ہے اور ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔"

"تمھارے اندر کچھ وجدانی قوتیں کام کر رہی ہیں۔ جو خطرے کا احساس ہوتے ہی دشمن کا پتہ بتا دیتی ہیں۔" کسی نے کہا۔ میری نظریں اس گاڑھے سیال مادے پر جمی ہوئی تھیں جو ابھی تک اژدہے کے زخمی جسم سے بہہ بہہ کر ماحول میں تعفن پیدا کر رہا تھا۔

"خطرہ محسوس کرنے کی قوت ہر انسان میں یکساں ہوتی ہے مگر ہر شخص اس قوت سے فائدہ اُٹھانے میں کامیاب نہیں ہوتا۔" میں نے کاؤنٹ کی نیلگوں آنکھوں میں جھانکتے ہوئے جواب دیا اور دوبارہ اپنے ساتھیوں کی طرف گھوم گیا۔ "فوراً اس غار سے نکل چلو۔ یہ غار موذی سانپوں اور اژدہوں کا مسکن معلوم ہوتا ہے۔"

سب نے میری اس تجویز کو پسند کیا اور ہم نے مل کر سامان غار سے باہر منتقل کرنا شروع کر دیا۔ الاؤ دوبارہ روشن کر کے ترپالیں ڈال کر مصنوعی چھت کے نیچے سب لوگ جمع ہو گئے اور دن نکلنے کا انتظار کرنے لگے کیونکہ اس ہنگامے کی وجہ سے سب کی نیند اُڑ گئی تھی۔ باقی رات الاؤ کے گرد بیٹھے ہوئے جاگتے گزار دی گئی۔ ابھی باقی ہی تھی کہ ہم نے ناشتے سے فراغت پا لی۔

اگرچہ رات کا باقی ماندہ حصہ جاگ کر گزارنے کی وجہ سے سب کے چہروں پر تھکن کے آثار تھے مگر جب میں نے دوبارہ سفر کا حکم دیا تو کسی نے بھی میرے اس فیصلے کو سن کر ہٹ دھرمی نہیں کی بلکہ اطمینان کی سانس لی۔ ویسے بھی ایسی ویرانے میں دیر تک قیام کرنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ ایک گھنٹے بعد ہم نے بستی میں داخل ہونے سے گریز کیا اور اسے پیچھے چھوڑتے ہوئے کنگن گاؤں پہنچ گئے کنگن پہنچ کر بھی ہم وہاں کے قبائلیوں کو کسی شکایت کا موقع نہیں دینا چاہتے تھے اس لیے ہم نے کنگن سے کافی آگے جا کر پڑاؤ ڈال دیا اور سرد ہواؤں سے محفوظ رہنے کی تدبیریں کرنے لگے۔

کھانے سے فراغت پا کر جب میں اپنے خیمے میں پہنچا تو سارجنٹ آرنٹ وہاں پہلے سے موجود تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ سنجیدگی سے مسکرا کر بولا۔ "ہمارے ہراول دستے کے دو جوان سردی کی وجہ سے بیمار پڑ گئے ہیں اور اپنی زندگی سے مایوسی کا اظہار کر رہے ہیں۔"

اس انکشاف نے چند لمحوں کے لیے مجھے متفکر کر دیا۔ "ڈاکٹر منڈ نے ان دونوں کو کوئی دوا کھلا کر گہری نیند سلا دیا ہے میرا خیال ہے صبح تک وہ سفر کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔" سارجنٹ نے وضاحت کی۔

"سارجنٹ!" میں نے قدرے مسکراتے ہوئے کہا۔ "یہ مہم میری زندگی کی سب سے خطرناک مہم ثابت ہو رہی ہے۔ اگر ہم اپنے سابقہ تجربے کو سامنے رکھتے ہوئے احتیاط سے کام لیں تو ہمیں مزید کسی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ اپنے ساتھیوں کے حوصلے بلند رکھنا ہمارا اوّلین فرض ہے۔ دراصل کل رات کے حادثے نے سب لوگوں کے ذہنوں کو پراگندہ کر رکھا ہے۔ وہ غیر معمولی اژدہا اُن کے اعصاب پر ابھی تک اثر انداز ہے۔ اپنے آدمیوں میں بلندی کی کچھ بوتلیں تقسیم کر دو تو ان کے اعصاب خوف کے شکنجے سے آزاد ہو جائیں گے۔"

سارجنٹ اثبات میں سر ہلاتا ہوا اُٹھا اور خیمے سے نکل گیا۔ میں اپنے شانے کے درد میں ڈوبا ہوا گرم بستر پر دراز ہو گیا۔ کاؤنٹ ہیلڈر کے لیے میں نے جیک کے ساتھیوں کے ساتھ سونے کا انتظام کر دیا تھا۔ میں اپنی انتظامی پیش بندیوں سے کافی حد تک مطمئن تھا۔ آٹھ آدمی بیک وقت کیمپ کی حفاظت پر مامور تھے۔

بستر پر دراز ہوتے ہی مجھے اپنے بابا شالیار یاد آ گئے خُدا جانے ان کا علاج اب کس مرحلے میں پہنچ چکا ہو گا۔

سونے سے پہلے دیر تک بابا شالیار کا پُر اعتماد چہرہ میری آنکھوں کے سامنے گھومتا رہا اور میری رُوح کو کچوکے دیتا رہا۔ ان کی طویل نظربندی کا تلخ احساس دل میں اُبھرتے ہی مجھے اپنی شریانوں میں خون کی حدت بڑھتی محسوس ہونے لگی۔ موسم شدید سرد ہونے کے باوجود میرا جسم حرارت آمیز پسینے میں ڈوب گیا۔

رات گئے جاگتے رہنے کی وجہ سے صبح دیر سے آنکھ کھلی میں نے جب کمبلوں سے سر نکالا تو سورج کی دل کش سنہری کرنیں خیمے میں جھانک رہی تھیں۔

کچھ ہی دیر بعد ہمارا خطرناک سفر دوبارہ شروع ہو گیا۔ سورج کی تیز روشنی میں ہم نے سفر کی رفتار خاصی تیز رکھی۔ شام کے سائے دھندلانے لگے تو اچانک راستے میں ایک دریا آ گیا اب ہم بجتن کے قریب پہنچ چکے تھے۔

دریا کے کنارے درختوں اور جھاڑیوں کی بہتات تھی۔ میں نے ایک مناسب جگہ دیکھ کر پڑاؤ ڈالا [illegible] انتظامی امور کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"سارجنٹ!" میں نے انتظامی امور سے نمٹ کر اسے مخاطب کیا۔ وہ الاؤ کے قریب مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر موجود تھا۔ "ہم اس وقت خطرناک ترین خطے سے گزر رہے ہیں۔ ان پہاڑوں

اور جنگلوں میں طاقت کے قانون کی حکمرانی ہے۔ پہرہ دینے والوں کی تعداد میں اضافہ کر دو۔ کھانے کے بعد باقی لوگ اپنے اپنے خیموں میں چلے جائیں۔ ان میں برابر تقسیم کی دو بوتلیں آج بھی تقسیم کر دینا۔"

سارجنٹ نے اثبات میں سر ہلا دیا اور میں مطمئن ہو کر کاؤنٹ بیلڈر کی طرف متوجہ ہو گیا جو پچھلے چند منٹ سے خاموش تھا اور کسی گہری سوچ میں تھا۔

"کاؤنٹ جوں جوں تمہاری منزل قریب آتی جا رہی ہے تمہاری خاموشی میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اگر کوئی نئی الجھن درپیش ہے تو مجھے بتاؤ۔ میں تمہارے کام آنے کی کوشش کروں گا۔"

میں نے نرم لہجے میں کہا۔

کاؤنٹ بیلڈر ایک طویل سانس لیتا ہوا سوگوار انداز میں مسکرایا اور سگار کا کش لے کر بولا۔ "شہباز خان! تمہاری رفاقت نے میری الجھنوں کو ختم کر دیا ہے... مگر نہ جانے کیوں مجھ پر ایک سوگواری کیفیت غلبہ پاتی جا رہی ہے۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی ہولناک حادثہ پیش آنے والا ہو۔ یقین کرو میں کوئی بزدل آدمی نہیں ہوں پھر بھی ایک نامعلوم خوف مجھے اپنے شکنجے میں جکڑتا جا رہا ہے۔"

اس کے لہجے میں گہری مایوسی پا کر میں بھی سوچ میں پڑ گیا۔

"کاؤنٹ! اگر سنہری جھیل پر پہنچا جانے میں کوئی خطرہ محسوس کرتے ہو تو وہاں جانے کا خیال ترک کر دو اور ہمارے ساتھ لداخ چلے چلو۔" میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ "ویسے بھی مجھے شبہ ہے کہ اس علاقے میں کوئی ایسی جھیل موجود ہے۔"

"میرے ارادے کو متزلزل نہ کرو۔ میں اسے تلاش کر کے رہوں گا اور سنہری جھیل تک جانے کے ارادے میں کوئی تبدیلی نہیں کروں گا۔" کاؤنٹ نے پُراعتماد لہجے میں میری پیشکش مسترد کرتے ہوئے جواب دیا۔

میں نے اس سلسلے میں مزید بات چیت کا ارادہ ترک کر دیا۔

دریا کا کنارہ ہونے کی وجہ سے ہوا کے جھونکے سرد لہروں کی طرح وجود کو متاثر کر رہے تھے۔ پچھلے دنوں کے مقابلے میں آج سردی کا احساس رگوں میں خون کی حرارت میں تلاطم کر رہا تھا۔ کھانے سے فراغت پاتے ہی اپنے خیمے میں آ گیا اور کمبلوں میں دبک کر اپنے ٹھٹھرتے ہوئے وجود کو گرم کرنے لگا کہ اچانک میرے خیال کی رو ان جوانوں کی طرف چلی گئی جو آج رات مختلف اوقات میں پہرہ دیتے ہوئے سردی کی لپیٹ میں آنے والے تھے۔ مثلاً ایک نیا خیال میرے ذہن میں

اُبھرا کیوں نہ مزید الاؤ روشن کر دیے جائیں اس طرح پہرہ دینے والے جوان سردی سے محفوظ رہ سکتے تھے۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو پیش آنے والی تکلیف کا احساس کرتے ہی اپنا بستر چھوڑ دیا اور کوٹ پہن کر خیمے سے باہر آ گیا۔

"کرن سنگھ!" میں نے ایک سکھ نوجوان کو آواز دی۔ "تم اپنے ایک ساتھی کو لے کر خشک شاخیں جمع کر کے لاؤ اور پڑاؤ کے ہر کونے پر الاؤ روشن کر دو۔ آج کی رات پچھلی تمام راتوں سے زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔"

کرن سنگھ نے ایک گروپ کو ساتھ لیا اور الاؤ کے قریب سے جلتے ہوئے کلہاڑے کو سنبھالتا ہوا درختوں کے جھنڈ کی طرف چلا گیا۔

پڑاؤ کے ہر کونے پر الاؤ دہک اٹھے تو ماحول میں خوشگوار حرارت پھیل گئی۔ ٹھٹھرا دینے والی ہوائیں کم تکلیف دہ ہو گئیں۔ اس طرح پہرہ دینے والے نوجوان سردی سے بڑی حد تک محفوظ ہو گئے تھے۔

میں واپس اپنے خیمے میں آ گیا اور کوٹ اتار کر رائفل بستر میں چھپا کر سونے کی تیاری کرنے لگا لیکن معلوم ہوتا تھا کہ سونا اپنے نصیب ہی میں نہیں تھا۔

اچانک گھوڑوں کی ہنہناہٹ کے ساتھ رائفلوں کے دھماکے سن کر میری آنکھ کھل گئی۔

میں جلدی سے اٹھا اور رائفل سنبھالتا ہوا خیمے سے باہر آ گیا۔ جلدی میں میں نے کوٹ پہننے میں وقت ضائع نہیں کیا تھا۔ دائیں جانب روشن الاؤ کے قریب کچھ جوان مورچے میں کسی نامعلوم دشمن کی گولیوں کا جواب دے رہے تھے۔

فضا میں ہلکی سی چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے مورچے کے قریب رکتے ہوئے وادی میں جھانک کر دیکھا جدھر سے فائرنگ ہو رہی تھی۔ اچانک ایک سنسناتی ہوئی گولی میرے کان کے قریب سے گزر گئی۔ میں نے ایک دم خود کو دائیں جانب گرا دیا۔ چند چنگاریاں اڑیں اور میں بال بال بچ گیا۔ میں نے دوڑ کر ایک درخت کی آڑ لی اور اپنی رائفل سے مخالف سمت میں دو فائر کیے۔ دھماکے کے فوراً ہی بعد ایک چیخ ابھری اور ایک حملہ آور کی زندگی کا چراغ گل ہو گیا۔

چند لمحوں تک اندھا دھند فائرنگ ہوتی رہی پھر اچانک ہی ہمارے نامعلوم دشمنوں کے مورچے میں خاموشی چھا گئی۔ شاید حملہ آوروں کے حوصلے پست ہو گئے تھے اور اب وہ فرار کی راہ اختیار کر رہے تھے۔

"اگر اجازت ہو تو انھیں تلاش کر کے ٹھکانے لگایا جائے۔" ایک آریک نوجوان نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

"نہیں..." میں نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ "رات کے اندھیرے میں فرار ہوتے ہوئے دشمن کو تلاش کرنا خودکشی کرنے کے مترادف ہوگا۔ تم اپنے مورچے پر ڈٹے رہو اور صبح ہونے کا انتظار کرو۔"

میں اپنے خیمے کی طرف چل پڑا تو راستے میں سارجنٹ آرٹ سے مڈبھیڑ ہو گئی۔

"مجھے حیرت ہے کہ اس ہنگامے میں تم کیوں نظر نہیں آئے؟ تم بیدار ہو گئے تھے؟" میں نے غصے کا اظہار کیا۔

"میں اس وقت دوسرے مورچوں کی نگرانی کر رہا تھا۔" اس نے جواب دیا اور سگریٹ سلگا کر لمبے لمبے کش لینے لگا۔ "حملہ آور کون ہو سکتے ہیں؟ میرا خیال ہے تعداد میں بہت کم تھے ورنہ اتنی جلدی پسپا نہ ہوتے۔"

"تمہارا خیال درست ہے۔" میں نے کہا۔

"اس ہنگامے نے آنکھوں سے نیند غائب کر دی ہے۔"

"جبکہ میں سوتے میں بھی جاگنے کا عادی ہوں۔"

"شہباز خان! تم بڑے عجیب و غریب انسان ہو۔" اس نے مسکرا کر کہا۔ "میں کوشش کروں گا کہ تمہیں میری طرف سے کسی شکایت کا موقع نہ ملے میں سارجنٹ فلپ کی طرح تمہاری خفیہ نگرانی نہیں کروں گا۔ یہ عمل تمہاری دلیری اور جانبازی کی توہین ہے۔"

"نوخیم کی مہم کے دوران سارجنٹ فلپ نے بھی تمہاری طرح جذبۂ پُرخلوص جذبات کا یقین دلایا تھا۔ مگر پشاور میں پیش آنے والے واقعات اس کے شاہد ہیں کہ اس نے اپنے خلوص کی کس طرح دھجیاں اڑا دی تھیں اور جنرل کی نگاہوں میں مجھے مشکوک بنا دیا تھا۔" میرے لہجے میں سی تلخی آ گئی۔

"ہر انسان یکساں نہیں ہوتا۔ میں تمہاری ذات سے کسی بدگمانی کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتا اور نہ ہی میں کسی جاسوس کا کردار ادا کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ظاہر ہے ان سفید جھوٹی تسلیوں کی باتوں کے جواب میں کہا جا سکتا ہے۔

ہم دیر تک ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے... پھر اس کے جانے کے بعد دیر تک اس کے رویے پر غور کرتا ہوا جاگتا رہا۔

سورج کی دھلی دھلی کرنیں چٹانوں کی چوٹیوں پر پھیلا رہی تھیں اور ہمارے کیمپ میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ میں باہر میدان میں اپنے ساتھیوں کی آوازیں سن کر انگڑائی لیتا ہوا اٹھا اور کوٹ پہن کر رائفل سنبھالتا ہوا خیمے سے باہر آ گیا۔

سارجنٹ آرٹ مجھے دیکھ کر بڑے معنی خیز انداز میں مسکرایا اور بولا۔ "ان برفیلی چوٹیوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے ہم آئس لینڈ کے جنگلوں کو عبور کر کے بحرِ منجمد شمالی کے کسی دور دراز علاقے میں داخل ہونے والے ہیں۔" اس نے دریا کے تیز بہاؤ پر اپنی نظریں جما کر مجھے مخاطب کیا۔

میں نے کوئی جواب دینے کے بجائے دوربین آنکھوں سے لگا لی اور ان چٹانوں کو دیکھنے لگا جہاں ایک پُل کے نشانات نظر آ رہے تھے اور اس پر کچھ چلتے پھرتے سائے بھی دکھائی دے رہے تھے۔ میں دیر تک اس پُل کا جائزہ لیتا رہا۔ لوگوں کے چلنے پھرنے کا انداز اس بات کی شہادت تھا کہ ان کی نقل و حرکت بے معنی نہیں ہے وہ لوگ اس پُل کی کڑی نگرانی کر رہے تھے۔ ان کی نگرانی سے یہ بات صاف ہو گئی تھی کہ وہ ہمارا راستہ روکنے کی کوشش کریں گے۔ گویا وہ ہماری آمد سے باخبر تھے۔ میں نے دوربین آنکھوں سے ہٹا لی اور تشویش آمیز نظروں سے دریا کی گہرائی کا اندازہ کرنے لگا۔

"کیا بات ہے شہباز؟" اچانک مجھے اپنے عقب میں کاؤنٹ بیلڈر کی آواز سنائی دی۔ "تمہاری آنکھوں سے فکرمندی جھلک رہی ہے۔"

"میں گاڑیوں کو دریا کے اس پار لے جانے کا کوئی آسان راستہ تلاش کر رہا ہوں۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"اس جگہ سے تو دریا عبور کرنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔" اس نے دریا کا جائزہ لیتے ہوئے جواب دیا۔ "تم اس پُل سے دریا کو پار کرنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟"

"پُل پر کچھ مسلح آدمی موجود ہیں جو یقیناً ہمارا ہی انتظار کر رہے ہیں۔ ان کی طرف سے ہونے والا حملہ ہمارے لیے بہت سی مشکلات پیدا کر سکتا ہے۔ جبکہ میں چاہتا ہوں کہ مزید کسی خون ریزی کے بغیر ہم اپنی منزل تک پہنچ جائیں۔ مگر ان لوگوں کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس خیال کو ذہن سے جھٹکنا ہی پڑے گا۔"

"زندگی کے لیے ہتھیار اٹھا لینا کوئی گناہ نہیں۔" کاؤنٹ بیلڈر نے خیال آرائی کی۔

میں دوبارہ اپنے خیمے کی طرف بڑھا تو کاؤنٹ بیلڈر میرے ساتھ تھا۔

ناشتے کے بعد پڑاؤ اٹھا لیا اور دوبارہ سفر شروع ہو گیا۔ اس بار میں نے سب سے آگے لدی ہوئی گاڑیوں کو عقب میں رکھا اور قافلے کی رہبری کرتا ہوا ان چٹانوں کی طرف بڑھا جہاں پُل کی موجودگی کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دریا کے آس پاس کا منظر انتہائی خوبصورت اور دلفریب تھا۔ برفیلی چوٹیوں اور خودرَو پودوں کی بہتات دیکھ کر محسوس ہوتا تھا جیسے فطرت اپنے حُسن کی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ ان برف پوش پہاڑوں کے درمیان جلوہ گر ہو۔۔۔ مگر میں فطرت کے ان حسین اور دلکش مناظر سے پوری طرح لُطف اندوز نہ ہو سکا کیونکہ دریا کا پانی مجھے انسانی خون کی طرح بہتا محسوس ہو رہا تھا۔

میرا سابقہ تجربہ اس بات کا شاہد تھا کہ پُل پہ موجود تمام جوان اگر مسلح تصادم پر اتر آئے تو وہ سب ہمارے لیے سیسہ پلائی دیوار ثابت ہوں گے۔ ہو سکتا ہے اس خوفناک تصادم کے نتیجے میں وہ قافلے کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچانے میں بھی کامیاب ہو جائیں جبکہ میں پُرامن انداز میں دریا عبور کر کے آگے نکل جانا چاہتا تھا۔

"شہباز! اچانک مجھے سارجنٹ آرٹ کی سرگوشی سنائی دی۔ "شاید تم اس پُل سے گزرنے کے بارے میں غور کر رہے ہو؟"

"اس کے علاوہ کوئی اور راستہ بھی تو ہمارے سامنے موجود نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"پُل پر مسلح لوگوں کا اجتماع میرے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجا رہا ہے۔" اُس کے لہجے میں گہری تشویش تھی۔

"خطرات سے کھیلنا ہمارا پیشہ ہے۔" میں نے گھوڑے کو روکتے ہوئے جواب دیا۔ "موت کا انتہائی خوف بھی ہمیں راستہ بدلنے پر مجبور نہیں کر سکتا۔" میرے لہجے میں فطری جوش و خروش لوٹ آیا تھا جس نے سارجنٹ آرٹ کو چونک جانے پر مجبور کر دیا۔۔۔

"خود شناسی اچھی چیز ہے۔۔۔ مگر خود فریبی انسان کی زندگی میں المیہ بن کر ظاہر ہوتی ہے۔" سارجنٹ آرٹ نے تبصرہ کیا۔

میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا اور میں نے دوبارہ اپنا گھوڑا آگے بڑھا دیا۔ ابھی ہم نے چند گز کا فاصلہ طے کیا تھا کہ اچانک ایک ٹیلے کی اوٹ سے ایک رائفل بردار آدمی نے اپنا سر ابھارتے ہوئے دھاڑ کر کہا۔

"اجنبی! اپنا قافلہ روک لو۔ آگے موت کا عفریت تمھارا انتظار کر رہا ہے۔" اس کے ساتھ ہی اُس نے ایک ہوائی فائر کر دیا۔

آن کی آن میں آس پاس کے ٹیلوں نے کئی مسلح انسان اُگل دیے۔ وہ اَن گنت تھے۔ میں نے ماحول کا جائزہ لیتے ہی محسوس کر لیا کہ یہ لوگ ہمارے قافلے کو گھیرے میں لے چکے ہیں اور قافلے کا ہر جوان رائفلوں کی زَد میں ہے۔

میں نے ہاتھ بلند کرتے ہوئے قافلے کو رُکنے کا حکم دیا اور اس رائفل بردار شخص کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ اپنی رائفل تھامے ہوئے ایک خاص انداز سے پتھروں کو پھلانگتا ہوا اچانک میرے سامنے آ کر رُک گیا۔ اُس کی جسامت دیکھتے ہوئے اس کی پھرتی اور تیزی ہم سب کے لیے حیرت انگیز تھی۔

"خانا! میں نے تیکھے لہجے میں اُسے مخاطب کیا۔ "تم نے جس لہجے میں ہمیں رُکنے کا حکم دیا ہے، وہ ہم دشمنوں کے لیے استعمال کرتے ہیں، دوستوں کے لیے نہیں۔ تم لوگ کون ہو اور ہمیں آگے بڑھنے سے کیوں روک رہے ہو؟"

"اجنبی! تمھارے لب و لہجے سے معلوم ہوتا ہے کہ تم ایسے علاقوں میں اکثر سفر کرتے رہنے کے عادی ہو۔ کیا تمھیں آج تک کسی نے یہ نہیں بتایا کہ غیرت مند قبائل اپنے علاقے میں کسی غیر کی موجودگی کو ایک لمحے کے لیے بھی برداشت نہیں کرتے اور آنے والے کو موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔ اگر تمھیں اپنی زندگی عزیز ہے تو آگے بڑھنے کا خیال ترک کر کے واپس چلے جاؤ۔ ورنہ قیامت تک تمھاری لاشیں بے گور و کفن پڑی رہیں گی۔"

اُس کے لہجے میں سختی پا کر میرا خون کھول اٹھا مگر یہ وقت جذباتیت کے شکار ہونے کا نہیں تھا۔ چند لمحوں تک میں اُس کی باتوں پر غور کرتا ہوا اپنے اندر کے درندے کو باہر آنے سے روکتا رہا۔

"خانا!" میں نے بمشکل تمام اپنے غصے کی تیز آگ کو مصلحت کے بھاری پتھروں میں دفن کرتے ہوئے کہا۔ "اگر تم لوگ ہمیں دریا پار کرنے کی اجازت دے دو تو ہم پُل سے گزرنے کا معاوضہ ادا کرنے کے لیے تیار ہیں کیونکہ اُس کے علاوہ دریا پار کرنے کا کوئی دُوسرا راستہ ہمیں معلوم نہیں ہے۔"

"ہم اجنبی لوگوں سے تعاون کرنے کے عادی نہیں ہیں۔ بہتر ہوگا کہ تم واپس چلے جاؤ۔ تم سے پہلے بھی کچھ لوگ سُنہری جھیل کی تلاش میں اِدھر آئے تھے۔ مگر ہمارے جوانوں نے اس علاقے کو اُن کا قبرستان بنا دیا۔ ہمارا سردار بہت خونخوار اور وحشی ہے۔ وہ تمھیں قبیلے کی روایت توڑنے کی اجازت کبھی نہیں دے گا۔ کیا تم لوگ سونے کی تلاش میں نہیں آئے ہو؟"

"خان! خدا شاہد ہے کہ ہمیں اس سے پہلے یہ بات معلوم نہیں تھی کہ اس علاقے میں کوئی ایسی جھیل بھی موجود ہے جہاں لوگ سونا تلاش کرنے کے لیے آتے ہیں۔ ہماری منزل تو لداخ ہے۔ اگر تم اس بات کی تصدیق کرنا چاہو تو اپنے آدمی ہمارے ساتھ روانہ کر سکتے ہو جو ہمیں لداخ پہنچا کر واپس آ سکتے ہیں اور میں اُن کی اس خدمات کا بھاری معاوضہ بھی ادا کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

"اگر تم لوگ سردار کو یہ یقین دلانے میں کامیاب ہو جاؤ کہ تم اس علاقے میں سونا تلاش کرنے نہیں آئے ہو تو شاید سردار تمھیں پُل سے گزرنے کی اجازت دے دے۔ اس کے علاوہ فی الحال کوئی دُوسری صُورت موجود نہیں ہے۔" اُس کے لہجے میں ابھی تک کھردراپن موجود تھا۔

"تمھارا سردار کون ہے؟" میں اس سے فوراً ملنا چاہتا ہوں کیونکہ ہمارا وقت بہت قیمتی ہے۔" میں نے اپنی بات پر زور دیا۔ مجھے حیرت تھی کہ ابھی تک اُس نے گاڑیوں کے سلسلے میں کوئی سوال کیوں نہیں اُٹھایا۔

"سردار سے ملنے کی خواہش رکھتے ہو تو وہ یہیں آ جائے گا۔ اس کے لیے تمھیں کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔" اُس کے لہجے میں بدستور درندوں جیسی غُراہٹ تھی جو گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ ساتھ میرے غصے میں مسلسل اضافہ کرنے کا سبب بن رہی تھی۔

اُس نے اچانک رائفل اُٹھائی اور ہوائی فائر کیا تو ایک ٹیلے کی اوٹ سے چند رائفل برداروں کی ٹولی نکل کر ہمارے سامنے آ گئی۔ ان میں ایک ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ وہ خوب تن کر چل رہا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے یوں لگا جیسے میں کسی آدم زاد کو نہیں بلکہ کوئی عفریت دیکھ رہا ہوں۔ اس کے چہرے پر زخموں کے متعدد نشانات تھے جو اس بات کے مظہر تھے کہ اُس کی زندگی کا طویل حصہ اپنے دشمنوں کے خلاف جنگ کرتے ہوئے گزرا ہے۔ سب سے نمایاں اُس کی نشے میں ڈوبی ہوئی سُرخ سُرخ آنکھیں تھیں جو کسی خونخوار چیتے کی طرح مجھے اپنی طرف گھورتی محسوس ہوئیں۔

"حشمت خان یہ لوگ کون ہیں اور کہاں جانے کا ارادہ رکھتے ہیں؟" اُس نے کھُردرے لہجے میں آتے ہی اپنے ساتھی سے سوال کیا۔ "کیا تم نے انھیں واپس جانے کے لیے نہیں کہا؟"

"کہا تھا!" حشمت خان نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ "مگر ان کے سردار کا کہنا ہے کہ قافلہ لداخ جا رہا ہے۔ اس لیے یہ دریا پار کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اگر ہم انھیں معاوضہ لے کر گزر جانے دیں تو یہ یقین دلاتے ہیں کہ یہ سونا تلاش کرنے کے لیے اس علاقے میں قیام نہیں کریں گے۔"

"ہوں!" اُس نے کسی درندے کی طرح غُراتے ہوئے کہا۔۔۔ "تم لوگ کون ہو اور پُل سے گزرنے کا کیا معاوضہ ادا کر سکتے ہو؟" اس کی شکرے جیسی آنکھوں میں لالچ کی بھرپور چمک اُبھر آئی۔

میں دل ہی دل میں ہنسے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ لوگ واقعی اپنے رسم و رواج کے پابند لگتے تھے ورنہ اتنی بڑی تعداد میں ہونے کی وجہ سے ہمیں لُوٹ لینا ان کے لیے کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ میں نے چلتے وقت اچھا ہی کیا تھا کہ تمام فرنگیوں کو بھی قبائلی لباس پہنا دیا تھا ورنہ اب تک شاید ہم میں سے آدھے تو مارے ہی جا چکے ہوتے۔

"سردار!" میں نے اُسے براہِ راست مخاطب کیا۔ "اگر تمھیں اس بات کا یقین دلا دیا جائے کہ ہمارے قافلے کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی جائے گی تو میں ایک سَو افغانی روپے ادا کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

ایک سَو افغانی روپے کا ذکر سُنتے ہی سردار بڑے بھیانک انداز میں مُسکرایا اور بولا۔ "نوجوان! اس سے پہلے کہ میں تمھارے ساتھ کوئی سمجھوتا کروں۔ پہلے میں تمھاری ذات کے بارے میں مکمل طور پر جاننے کا خواہش مند ہوں کیونکہ تمھارا لب و لہجہ مجھے بہت متاثر کر رہا ہے۔"

"میرا نام شہباز خان ہے اور میں مگوری قبیلے سے تعلق رکھتا ہوں۔" میں نے اپنا مختصر تعارف کرایا۔

"لداخ کیوں جا رہے ہو؟" اس نے سوال کر دیا۔

"اپنے کچھ دوستوں کے لیے سامانِ رسد لے جا رہا ہوں۔" میں نے دلیرانہ جواب دیا۔ "میں نے تمھیں معاوضے کی پیش کش صرف اس لیے کی ہے کہ میرے دوستوں کے سامان کو کوئی نقصان نہ پہنچنے پائے بصورتِ دیگر وقت اور ماحول کے ساتھ ساتھ میں اپنا فیصلہ بدلنے کے لیے آزاد ہوں۔ تمھارے ساتھیوں کی کثیر تعداد مجھے خوفزدہ نہیں کر سکتی۔ بہتر یہی ہے کہ میری پیش کش منظور کر لو اور قافلے کو پُل سے گزر جانے دو۔ ورنہ دریا کا یہ شفاف پانی ہو رنگ ہو جائے گا۔"

"نوجوان! تمھارا یہ گستاخانہ لہجہ میرے غصے کو ہوا دے رہا ہے مگر میں تمھاری دلیری اور ثابت قدمی کو سراہتے ہوئے تمھاری پیش کش اس شرط کے ساتھ قبول کرنے کے لیے تیار ہوں کہ تم یا تمھارے قافلے کا کوئی آدمی سُنہری جھیل کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حرف نہیں جانے گا۔ اگر ایسا ہُوا تو ہمارے درمیان امن کا معاہدہ ٹوٹ جائے گا۔"

"ٹھیک ہے سردار!" میں نے جواب دیا۔ "میرے قافلے کا جو آدمی تمہیں جھیل کی طرف جاتا ہُوا دکھائی دے، تم اسے اپنے قانون کے مطابق قیدی بنا سکتے ہو۔"

میں نے سارجنٹ کو رقم لانے کا اشارہ کیا جو اپنا گھوڑا دوڑاتا ہُوا گھوڑا گاڑی کی طرف پلٹ کر چلا گیا۔ چند لمحوں کے بعد اس نے ایک سو افغانی روپے سردار کے حوالے کر دیے۔ جنہیں دیکھ کر سردار کسی شاہین کی طرح ان پر جھپٹ پڑا اور انھیں اٹھا کر اپنی واسکٹ کی جیب میں منتقل کرنے لگا۔

"شہباز خان! اپنا وعدہ یاد رکھنا۔ ورنہ تمھاری یہ رقم بیکار جائے گی۔ حشمت خان! اپنے ساتھیوں سے کہو کر وہ اپنے مورچوں میں چلے جائیں اور قافلے کو گزر جانے دیں۔"

حشمت خان کی رہبری میں قافلہ دوبارہ چل پڑا۔

جونہی ہم نے پُل پار کیا، میں نے اطمینان کی سانس لی۔ ورنہ مجھے ہر لمحے حملے کا دھڑکا لگا ہُوا تھا۔ سردار بہت حریص اور خود غرض معلوم ہوتا تھا اور ایسے لوگ کسی ضابطہ اخلاق کی پابندی کرنے کے عادی نہیں ہوتے۔

پُل پار کرتے ہی میں نے قافلے کی ترتیب دوبارہ بدل دی۔ اب گاڑیاں ہمارے درمیان چل رہی تھیں۔ کچھ دیر تک ایک چٹان کے ساتھ ساتھ ہمارا سفر جاری رہا۔ جونہی وہ چٹان ختم ہوئی، راستہ گھوم کر ڈھلان کی طرف جاتا دکھائی دیا۔ اچانک ڈھلان کا منظر دیکھ کر میری آنکھوں میں بے پناہ حیرت اُتر آئی۔

ساری وادی سُنہری دُھول میں اَٹی ہوئی تھی۔ ہر چٹان اور ہر ٹیلے پر سونے کا رنگ موجود تھا اور ان ٹیلوں کے درمیان ایک جھیل بھی موجود تھی۔ جس پر بھی ہوئی کائی سونے کا رنگ اختیار کر چکی تھی۔ اس انوکھے منظر کو دیکھ کر یوں محسوس ہونے لگا جیسے میں کوئی دلکش خواب دیکھ رہا ہوں... مگر نہیں یہ کوئی خواب نہیں تھا بلکہ ایک ٹھوس حقیقت تھی جو ہم سے اپنی دلکشی کی بنیاد پر خراج تحسین طلب کر رہی تھی۔

ہم جوں جوں ڈھلانوں پر اُترتے ہوئے سفر کرتے رہے حسین وادی کے مناظر کی دلکشی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اب ہم خطرے کی حدود پار کر چکے تھے اور ہمارے سفر کی رفتار میں سُستی آتی جا رہی تھی۔

درختوں کے ایک جھنڈ کی طرف دیکھتے ہوئے میری نظریں رات بھر قیام کے لیے کوئی موزوں جگہ تلاش کر رہی تھیں۔ بالآخر وہ مناسب جگہ مجھے نظر آ گئی۔ جہاں ایک چھوٹا سا چشمہ موجود تھا جس میں سُنہرے ذرات رقص کرتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ یہ سب کچھ سونا نہیں تھا بلکہ ہر چیز سُنہری تھی۔

میں نے اسی چشمے کو اپنی عارضی قیام گاہ منتخب کر کے سارجنٹ آرٹ سے کہا کہ وہ سب لوگوں کو سختی سے اس بات کی تاکید کر دے کہ کوئی شخص چشمے کا پانی استعمال نہ کرے۔ کیونکہ رنگت کی تبدیلی کے باعث یہ پانی نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔

پڑاؤ ڈالتے ہی ہر شخص کو سختی سے ہدایت کر دی گئی کہ وہ سُنہرا پانی استعمال نہ کرے۔ ضرورت کے لیے ہمارے پاس پانی موجود تھا۔ اُس سے گزارا ہو سکتا تھا۔ میں نے احتیاطاً مورچہ بندی کرنا بھی ضروری خیال کیا اور ایک پُرانی ترکیب استعمال میں لاتے ہوئے میں نے درختوں میں بلندی پر مورچے قائم کرنے کا حکم دیا۔ جسے میرے ساتھیوں نے کھانا تیار ہونے تک مکمل کر لیا۔

اس دوران میں میں نے کاؤنٹ بیلڈر کو بہت خاموش اور کسی گہری اُلجھن میں ڈوبا ہُوا پایا۔ میں نے اُسے دیکھتے ہی کہا۔ "میرا خیال ہے، تمھارا سفر اب اختتام تک پہنچ چکا ہے اور سارے خطرات تمھارے سامنے ہیں۔ وہ لوگ جھیل کی کڑی نگرانی کر رہے ہوں گے۔ جونہی تم نے جھیل کی طرف قدم بڑھایا، اَن دیکھی موت تمھارا نوشتہ تقدیر بن جائے گی۔ میری مانو! اپنا ارادہ ملتوی کر دو۔ ہم واپسی میں جب اس طرف سے گزریں گے تو تمھیں یہاں چھوڑ جائیں گے... پھر تم اطمینان سے مقدس انجیل تلاش کر لینا۔ بصورت دیگر حالات تمھارے سامنے ہیں۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس بھیانک سفر کے دوران کب کوئی خوفناک حادثہ پیش آ جائے۔"

کاؤنٹ نے میری باتوں کو گہری توجہ سے سُنا لیکن انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "تمھاری ہمدردی کا شکریہ! مشکلات سے میرے ارادوں میں کمی نہیں آ سکتی۔ اگر یہ مہم میری زندگی کی بھینٹ طلب کر رہی ہے تو میں موت کے خوف سے اپنی مہم ادھوری نہیں چھوڑ سکتا!"

وہ عزم و حوصلے کی ایک ٹھوس چٹان کی مانند نظر آ رہا تھا۔ میں نے اسے تنہا چھوڑ دیا اور دُوسرے کاموں میں مصروف ہو گیا۔

اندھیرے کی لامتناہی چادر پھیلتے ہی برف باری میں شدت آ گئی اور اس کے ساتھ ہی تیز ہوا کی گونج کسی آنے والے طوفان کا اعلان کرنے لگی۔ اس خطرناک موسم میں جہاں درجہ حرارت نقطہ انجماد سے بھی کم ہو چکا تھا، کسی طوفان کے خدشے نے بہر سے تھکے ہوئے اعصاب کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔

میں نے ہوا میں طوفان کی گونج سنتے ہی اپنا گرم بستر چھوڑ دیا اور خیمے سے باہر آ کر اپنے ساتھیوں کو احتیاطی تدابیر کرنے کے لیے کہا اور ہم سب مل کر ممکنہ طوفان کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔

رات اپنا آخری سفر طے کر رہی تھی کہ اچانک بہت سی غیر انسانی آوازیں سُن کر میری آنکھ کھل گئی۔ اپنی رائفل تھامے میں خیمے سے نکلا تو نیم تاریکی میں عجیب صورتِ حال آنکھوں کے سامنے تھی۔ اَن گنت بندر جانے کہاں سے نکل کر کسی منظم فوجی دستوں کی طرح ہمارے پڑاؤ کی طرف بڑھتے چلے آ رہے تھے۔

میں نے متعدد گولیاں چلائیں۔ پہرے پر مستعد سپاہیوں نے بھی بے پناہ گولیاں برسا ڈالیں۔ اس شور نے خیموں میں خوابیدہ سپاہیوں کو جھنجوڑ ڈالا اور ہر کوئی افراتفری کے عالم میں رائفل سنبھالے باہر آ گیا۔ درختوں کی شاخوں میں چھپے ہوئے جوانوں نے صورتِ حال بھانپ کر جو دھماکے کیے تو بندروں کی پیش قدمی رُک گئی اور وہ بہت سی نعشیں چھوڑ کر پلٹ پڑے پھر حلق سے غیر انسانی آوازیں بلند کرتے ہوئے دوبارہ ڈھلانوں میں اُتر کر رُوپوش ہو گئے۔ جب مجھے اس بات کا یقین ہو گیا کہ اب بندروں کا یہ غول لوٹ کر نہیں آئے گا تو میں نے اطمینان کی ایک گہری سانس لی۔

جب دُودھیا اُجالا پہاڑوں کی برفیلی چوٹیوں سے اُتر کر ماحول میں گھُل گیا تو میں نے قافلے کو تیاری کا حکم دیا۔

قافلہ چلنے کو تیار تھا، سارجنٹ آرٹ نے انکشاف کیا کہ کاؤنٹ بیلڈر رات کے اندھیرے میں کہیں غائب ہو چکا ہے۔

"کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ کسی حادثے کا شکار ہو کر ہمارے آس پاس ہی کہیں موجود ہو۔ ورنہ ہم یہ تصور کر کے آگے بڑھ جائیں کہ وہ اپنی مرضی سے کہیں غائب ہُوا ہے؟" میں نے سوالیہ نظریں سارجنٹ آرٹ کے چہرے پر گاڑ دیں۔

"خیمے سے اُس کا سامان غائب ہے، میرا خیال ہے وہ رات کی تاریکی کا فائدہ اُٹھا کر جھیل کی طرف جانے میں کامیاب ہو گیا ہے۔" اُس نے جواب دیا۔

کاؤنٹ بیلڈر کے اس طرح چھپ کر چلے جانے سے مجھے افسوس ہُوا۔ اب اُس کے زندہ ملنے کی اُمید کم تھی۔

ہمیں اپنا سفر شروع کیے چند لمحے ہی ہوئے تھے کہ اچانک کوئی چمکتی ہوئی شے میری آنکھوں کے سامنے لہرائی۔ میں نے فوراً قافلے کو رکنے کا حکم دیا اور سارجنٹ آرٹ کو ساتھ لے کر اُس ٹیلے کی جانب بڑھا جہاں رائفل کی نالی دکھائی دی تھی۔ ایک پتھریلی چٹان کے سہارے ٹوٹی ہوئی رائفل پڑی تھی اور اس سے چند قدم کے فاصلے پر کاؤنٹ بیلڈر کا بے حرکت جسم خون میں لتھڑا ہُوا نظر آ رہا تھا۔ میں گھوڑے سے اُترا، اور کاؤنٹ کے خون آلود جسم کے قریب جا پہنچا۔ اس... کی رُوح اپنی مہم ادھوری چھوڑ کر آسمان کی نیلگوں وسعتوں میں پرواز کر چکی تھی۔ میں نے اُس کا جسم پتھروں سے اچھی طرح ڈھانپ دیا اور خاموشی سے اپنے ساتھیوں کی طرف لوٹ آیا۔ کاؤنٹ اپنے ایک بازو اور ایک ٹانگ سے بھی محروم ہو چکا تھا۔

"میرا خیال ہے جب بندروں کے غول پڑاؤ کی طرف بڑھ رہے تھے تو کاؤنٹ اپنے سفر کا آغاز کر چکا تھا۔ بندروں نے اُسے تنہا دیکھا تو اس پر ٹوٹ پڑے اور اُس کا جسم نوچ ڈالا۔ اُس کی ایک ٹانگ اور بازو تک چبا گئے!"

"تمھارا خیال درست ہے سارجنٹ!" میں نے تائید

نئے افق کا مقبول سلسلہ
سرفروش
نامور مصنف اظہر کلیم
کے ایڈونچرس قلم سے
دو حصوں میں مکمل سیٹ =/100
مکتبہ القریش سرکلر روڈ اردو بازار لاہور
فون 7668958

نے اُسے یہ خطرناک ارادہ ترک کرنے کے لیے
ہا تھا مگر وہ بلا خوف و خطر اپنے مقصد پر قربان ہو گیا۔ افسوس
بے چارہ اس مقدس نسخے کو بھی تلاش نہ کر سکا اور دُنیا
سے نامُراد اُٹھ گیا۔"

سارجنٹ بھی افسردہ نظر آنے لگا تھا۔

"قافلہ دوبارہ چل پڑا۔ ہم نے جیسے ہی سُنہری جھیل کی
س وادی کو عبور کیا ہمارا سفر دوبارہ بلندیوں کی جانب
شروع ہو گیا۔ چیلاس کی پہاڑیاں پیچھے چھوڑ کر ہم لداخ کی
سرحدوں میں داخل ہو گئے تو ہمارا سفر ایک آدھ روز کی مسافت
کے بعد ختم ہونے والا تھا۔ بالآخر حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے
قافلہ لداخ کی اس وادی تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا جہاں
ماں بلب زندگی ہماری آمد کا انتظار کرتے ہوئے تیزی سے
رت کے دہانے کی جانب سفر کر رہے تھے۔

اس وادی میں قدم رکھنے سے پہلے مَیں نے کوئی ناصے
قافلہ روک لیا حالانکہ فرنگی سارجنٹ اور اس کے ساتھی بلا تاخیر
آگے بڑھ جانا چاہتے تھے۔ میری یہ احتیاطی تدبیر ہی کام آگئی
ورنہ میں یہ داستان سُنانے کے لیے زندہ نہ بچتا۔

یہ وادی تین سمتوں سے باغیوں نے گھیرے میں لے
رکھی تھی... ابھی میں صورتِ حال کا جائزہ ہی لے رہا تھا کہ
ایک جانب سے فائرنگ شروع ہو گئی۔ میں نے قافلے کو آگے
بڑھنے کا حکم دیا اور پہلی بار ہمارے گھوڑے سرپٹ دوڑنے
لگے۔ ایک فرلانگ کا فاصلہ طوفانی رفتار سے طے کرنے کے بعد
وادی میں اُتر گئے اور دشمن مُنہ دیکھتا رہ گیا۔ دراصل اس
سمت سے کسی قافلے کی آمد ان کے لیے غیر متوقع تھی۔ یہی وجہ
تھی کہ میں قافلے کو صاف بچا کر منزلِ مقصود تک لے جانے
میں کامیاب ہو گیا۔"

پشاور چھاؤنی واپس پہنچنے پر ہمارا شاندار استقبال کیا
گیا تھا اور فرنگیوں کا جنرل میرے سامنے بچھا جا رہا تھا۔ اُس
نے میری عزت افزائی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا اور
انعام و اکرام سے بھی نوازا۔

سارے ہنگاموں سے نمٹنے کے بعد میں خوب مزے
سے سو رہا تھا لیکن لطف کی یہ حالت زیادہ دیر برقرار نہیں رہ
سکی۔ کسی نے مجھے جھنجھوڑ کر اُٹھا دیا تھا۔

"کیا بات ہے، مانک شاہ! تم ہانپ کیوں رہے ہو؟" مَیں
نے تیز سرگوشی میں پوچھا۔

"تم نے جس قیدی کے لیے مجھے ہدایات دی تھیں۔ وہ
مکمل طور پر صحت یاب ہو چکا ہے اور اُسے ابھی کچھ دیر بعد
جنرل ڈوگ کے سامنے پیش کیا جانے والا ہے۔"

"بابا شالیار...؟" مَیں نے بے ساختہ کہا۔

"ہاں، وہی۔" اُس نے پُرجوش لہجے میں تائید کی۔

زندگی میں پہلی بار میرا دل اتنی شدّت سے دھڑکا تھا۔
یوں لگ رہا تھا جیسے پہلو چیر کر نکل جائے گا۔ برسوں بعد
اپنے باپ کے بارے میں ایک خوشخبری سُنی تھی اس لیے
میرا اس قدر جذباتی ہونا بے جا بھی نہیں تھا۔

مَیں باہر آگیا اور میری نگاہ جنرل ڈوگ کے دفتر کی
طرف اُٹھ گئی۔ چند مسلح سپاہیوں کے درمیان بابا شالیار زنجیروں
میں جکڑا ہُوا کسی مست ہاتھی کی طرح جھومتا چلا جا رہا تھا۔
مَیں نے مٹھیاں بھینچ لیں اور تیزی سے واپس ہُوا... اگلے
ہی لمحے مَیں اپنے آپ کو ہر طرح سے مسلح کرنے میں ہر ممکن
سُرعت سے کام لے رہا تھا۔

میرا دل اتنی تیزی سے دھڑک رہا تھا کہ شاید ہی اس سے
پہلے کبھی ایسی نوبت آئی ہو گی۔ رگوں میں خون یُوں موجیں مار رہا تھا
جیسے نسوں میں طغیانی آگئی ہو۔ مَیں نے خود کو سنبھالنے کی کوشش
میں حد کر دی، تب کہیں خود کو آپے میں لا سکا۔ میری یہ ہیجانی حالت
میرے لیے ہی نہیں، میرے بابا کے لیے بھی مہلک ثابت ہو سکتی
تھی۔ اُف! انسان کی زندگی میں جب شجاعت کو چھوڑ کر مصلحت
کا دامن تھامنے کی نوبت آتی ہے تو خون کے کئی گھونٹ پی کر چپ
آتا ہے۔ مَیں نے بھی یہ دامن تھام لیا لیکن میرے ہاتھوں میں اب
بھی لرزش تھی اور خدشہ تھا کہ کسی بھی لمحے میرے ہاتھ کپکپا سکتے
ہیں... لیکن جب مَیں جنرل ڈوگ کے دفتر کے سامنے پہنچا تو
اس وقت تک میں ہر طرح سے اپنے آپ میں تھا اور صبر کا دامن
بڑے اعتماد سے تھامے ہُوئے تھا گویا اب مَیں جذباتی بہاؤ میں اندھا
دُھند نہیں بہہ سکوں گا۔ یہ سوچتے ہُوئے مجھے اپنی خود اعتمادی پر
بے پناہ فخر محسوس ہونے لگا۔

جنرل ڈوگ کے دفتر پر متعدد مسلح جوانوں کا پہرہ تھا اور
ایک عجیب سی پُراسرار خاموشی در و دیوار پر ناچتی محسوس ہو رہی
تھی۔ مجھے کسی نے روکنے کی کوشش نہیں کی کیوں کہ سبھی جانتے
تھے کہ میں جنرل ڈوگ کی آنکھوں کا تارہ ہُوں۔ دفتر میں قدم رکھتے
ہی مجھے ٹھٹک جانا پڑا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جنرل کا دفتر اس وقت ایک فوجی عدالت کا منظر پیش کر رہا
تھا۔ جنرل کی میز کے گرد اعلا افسران براجمان تھے جن کی سربراہی
اس وقت جنرل ڈوگ کر رہا تھا۔ طویل میز کے دونوں طرف
کرسیوں کی قطاریں تھیں۔ جن پر سارجنٹ فلپ اور جنرل ڈوگ
کی چہیتی بیٹی ایلس بھی دوسرے لوگوں کے ساتھ موجود تھی۔ ایلس،
برہنہ شمشیروں کے درمیان میرے شیر دل باپ کو پا بجولاں حیرت
اور تجسس آمیز نظروں سے دیکھنے میں محو تھی۔

برہنہ شمشیروں کے درمیان میرا بابا شالیار خان کسی سنگی
مجسمے کی طرح ساکت اور خاموش کھڑا تھا۔ اس کے خاموش چہرے
پر سنجیدگی کی گہری تہ چڑھی ہُوئی تھی جو اسے دوسرے لوگوں سے
منفرد اور باوقار ظاہر کر رہی تھی۔ اپنے باپ کو ان سنگدل اور وحشی
فرنگیوں کے سامنے مجرم کی حیثیت سے دیکھ کر میری آنکھوں میں خون
اُتر آیا اور میرا جی چاہا کہ وہاں موجود ایک ایک شخص کو بھون کر رکھ
دوں مگر میں اپنے اس ارادے کو عملی جامہ نہ پہنا سکا۔ اگر میں جذبات
کی رَو میں آ کر یہ حرکت کر گزرتا تو میرے ساتھ میرے مظلوم باپ کی
زندگی بھی خطرے میں پڑ جاتی۔ بمشکل تمام میں نے اپنے سینے میں انتقام
کی بھڑکتی ہُوئی آگ پر قابو پایا اور آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا ہُوا آگے بڑھ
کر ایک خالی کُرسی پر بیٹھ گیا۔ بیٹھتے ہی میری نظریں اچانک سامنے
کی قطار میں موجود سارجنٹ فلپ سے ٹکرائیں تو اُسے کینہ توز نظروں
سے اپنی جانب گھورتے ہُوئے پایا۔ میں نے اس کی آنکھوں سے اُٹھتے
ہُوئے نفرت اور بغض کے بخارات کو نظر انداز کر دیا اور جنرل ڈوگ
کی طرف دیکھنے لگا جو اپنے ایک ماتحت افسر کے ساتھ سرگوشیوں
میں مصروف تھا پھر اچانک ایک سارجنٹ کے آنے سے ان کی
گفتگو کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔

سارجنٹ نے سیلوٹ کرتے ہُوئے بڑے ادب سے ایک
فائل اس کے سامنے رکھ دی اور خود ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ جنرل ڈوگ
نے سگار کا ایک طویل کش لیتے ہُوئے اپنے ایک ہاتھ کو حرکت دی اور
فائل کھول کر پڑھنے لگا۔ فائل کافی ضخیم تھی جس کے کاغذ پُرانے ہونے
کے باعث اپنی اصل رنگت بھی بدل چکے تھے۔ جنرل ڈوگ مُنہ میں
سگار دبائے دیر تک گہری نظروں سے میرے بابا کے بارے میں ترتیب
دی ہُوئی فائل پڑھتا رہا۔ اچانک اس نے سر اُٹھایا اور سگار کا کش
لیتے ہُوئے شالیار خان کو گہری نظروں سے دیکھ کر سپاٹ لہجے میں
بولا۔ "شالیار خان! اس فائل کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ تمہارے
جرائم کی فہرست بہت طویل اور سنگین ہے۔ تم گزشتہ کئی برس
سے تاجِ برطانیہ کے لیے ایک زبردست چیلنج بنے ہُوئے ہو اور
اس دوران بھی تم نے اپنے متعدد محافظوں پر حملہ کر کے انھیں شدید
زخمی کر کے فرار ہونے کی ناکام کوشش کی جس کی وجہ سے تمہارا
شمار وقت کے سب سے خطرناک قیدیوں میں ہوتا ہے۔ تم اس قدر
خطرناک ہو کہ تم نے اپنے معالجوں پر بھی تشدد کرنے سے گریز نہیں
کیا جو دن رات تمھیں ذہنی طور پر صحت مند بنانے کی سرتوڑ کوششیں
کر رہے تھے مگر ان جرائم سے قطع نظر تمھارے کچھ جرائم بے حد سنگین
نوعیت کے ہیں۔" جنرل ڈوگ شالیار خان کے چہرے پر اپنی باتوں
کا ردِ عمل تلاش کرتے ہُوئے اچانک خاموش ہو گیا۔

اس دوران یہ بات میں نے بڑی شدت سے محسوس کی
کہ سارجنٹ اپنی کرسی پر بیٹھا ہُوا بار بار اضطراری حالت میں پہلو
بدل رہا ہے۔ وہ کبھی میرے چہرے پر نظریں گاڑ دیتا اور کبھی اس
کی نگاہوں کا ہدف شالیار خان کا چہرہ بن جاتا۔ شاید وہ میرے اور
شالیار خان میں مشابہت تلاش کر کے ہم دونوں کے درمیان
کوئی نیا رشتہ ڈھونڈ رہا تھا۔ اس کی بھٹکتی ہُوئی بے چین نظریں
اس بات کی دلیل تھیں کہ وہ میرے بارے میں اپنے شکوک کو مزید ہوا
دے رہا ہے۔

جاسوسی ڈائجسٹ کے مقبول سلسلے
ناگ
اقلیم علیم
300 روپے
PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk
مکتبہ القریش
فون 7668958

"پہلا جرم تم نے اس وقت کیا جب تاجِ برطانیہ سے وفاداری کا عہد کر کے توڑ دیا اور ایک فوجی بھگوڑے کی حیثیت اختیار کر لی۔" جنرل ڈوگ دوبارہ شالیار خان کے جرائم کی فہرست سُنانے لگا۔

میں سارجنٹ فلپ کے مشکوک رویّے کو نظر انداز کرتے ہُوئے گہری توجہ سے وہ الزامات سُننے لگا جو میرے باپ کی آزادی کو سلب کرنے کا سبب بنے ہُوئے تھے۔

"تمھارا دوسرا جُرم یہ ہے کہ تم نے ایک انگریز فوجی افسر کو قتل کر دیا اور فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے مگر تمھارا تیسرا جُرم سب سے زیادہ سنگین اور ناقابلِ معافی ہے۔ تم نے فوج سے تاجِ برطانیہ کے خلاف اپنی بغاوت کا علم بلند کر دیا اور اپنے اردگرد مسلح باغیوں کی کثیر تعداد جمع کر لی پھر تمھاری باغیانہ سرگرمیاں روز بروز تیز تر ہوتی چلی گئیں۔ تم نے اپنے باغی ساتھیوں کے ساتھ مل کر حکومتِ برطانیہ کے خزانے پہ ڈاکا ڈالا اور بھاری مالیت کا سونا لُوٹ کر فرار ہونے میں کامیابی حاصل کر لی۔ جب تمھیں بہت سی خون ریزی کے بعد گرفتار کیا گیا تو تم نے تاجِ برطانیہ سے عدم تعاون کا مظاہرہ کرتے ہُوئے خاموشی اختیار کر لی۔ لُوٹے ہُوئے خزانے کا کوئی اتہ پتہ بتانے سے انکار کر دیا اور اپنے محافظوں پر قاتلانہ حملے شروع کر دیے۔ اس دوران کچھ سرکاری افسران نے اپنی تحقیقات کے دوران تم پر اذیّت کے ہتھیار آزمانے شروع کیے مگر کوئی بھی جسمانی تشدد تمھیں زبان کھولنے پہ مجبور نہ کر سکا۔ عین ممکن تھا کہ تمھاری یہ طویل خاموشی تمھاری موت کی پیغامبر ثابت ہوتی اور حکومتِ برطانیہ تمھیں فائرنگ سکواڈ کے حوالے کر دیتی مگر اچانک تم پر پاگل پن کے دَورے پڑنے لگے۔ تمھارے اس پاگل پن کو ایک ڈھونگ قرار دیتے ہُوئے جیل کے حکام تمھارے ساتھ پہلے سے زیادہ سخت برتاؤ کرنے میں خود کو حق بجانب سمجھنے لگے کیوں کہ تم نے اپنے پاگل پن کی بدولت متعدد بار اپنے محافظوں پر قاتلانہ حملہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ تم نے جیل کے حکام کے سامنے جس وحشت کا مظاہرہ کیا، ممکن تھا کہ اس نئی بغاوت کے جُرم میں تم سے زندگی کی حرارت چھین لی جاتی اور اس طرح تمھاری یہ خطرناک داستان اپنے نقطۂ انجام کو پہنچ جاتی مگر۔ . . مگر ڈاکٹروں کے ایک بورڈ نے تمھیں مکمل طور پر خطرناک پاگل قرار دے دیا اور پھر یہی پاگل پن تمھاری زندگی کی ضمانت بن گیا۔"

جنرل ڈوگ جب اپنا سانس دُرست کرتے ہُوئے چند لمحات کو خاموش ہُوا تو میری بھٹکتی ہُوئی نظریں شالیار خان کے چہرے کا طواف کرتی ہُوئی سارجنٹ فلپ کے چہرے پر رُک گئیں جو ابھی تک بے چینی سے پہلو بدلتے ہُوئے بار بار میرے اور شالیار خان کے چہرے کا معائنہ کر رہا تھا۔ جنرل ڈوگ نے اس وقفے کے دوران اپنا بُجھا ہُوا سگار ایش ٹرے میں مسل دیا اور ایک نیا سگار سلگا کر کش لیتے ہُوئے دوبارہ اپنی گفتگو کا آغاز کیا۔

"تاجِ برطانیہ نے تمھارے اس پاگل پن کو تشویش کی نظر سے دیکھتے ہُوئے خصوصی معالجوں کا انتظام کر دیا تاکہ تم جلد از جلد دوبارہ ذہنی طور پر صحت مند ہو جاؤ مگر تمھاری یہ پاگل پن کی بیماری بہت طویل ثابت ہُوئی جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ اس پاگل پن کے عرصے میں تمھارے کئی قیمتی سال ضائع ہو گئے۔ تمھاری تنومند جوانی، بڑھاپے کی صورت اختیار کرنے لگی تو ذہنی امراض کے ماہرین نے اپنی کوششوں کو تیز تر کر دیا اور تم بالآخر آج کئی برس بعد ایک نارمل انسان کی حیثیت سے ہمارے سامنے موجود ہو۔ حکومتِ برطانیہ تمھاری اسی طویل بیماری پر خاصی دولت خرچ کر چکی ہے۔ اب تک تمھیں زندہ رہنے کی مہلت صرف اس لیے دی جاتی رہی ہے کہ حکومت اپنے لُوٹے ہُوئے خزانے کی بازیابی چاہتی ہے۔ آج جبکہ تم مکمل طور پر دوبارہ ایک صحت مند انسان بن چکے ہو تو یقیناً تم اپنا بڑھاپا اپنے قبیلے کی آزاد فضاؤں میں گزارنے کی خواہش رکھتے ہو گے۔ ایسی صورت میں تم وہ لُوٹا ہُوا خزانہ واپس کر کے آزادی حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہو بصورتِ دیگر تمھاری زندگی کی کوئی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔ اب یہ فیصلہ کرنا تمھارا کام ہے کہ تم کیا چاہتے ہو، عزت کی زندگی یا ذلت کی موت۔ . . اگر تم نے ہمیں اس لُوٹے ہُوئے خزانے کا پتہ بتا دیا تو حکومتِ برطانیہ تمھاری اس وفاداری کے صلے میں تمھارے سارے جرائم معاف بھی کر سکتی ہے۔"

جنرل ڈوگ اپنی طویل تقریر ختم کر کے خاموش ہو گیا اور اپنی عیار آنکھیں شالیار خان کے چہرے پر گاڑتے ہُوئے اُسے جواب طلب نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ اس وقت جنرل ڈوگ سمیت سب لوگوں کی نظریں بوڑھے شالیار خان کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں مگر شالیار خان ان کی تنقیدی نظروں سے بے نیاز کسی سنگی مجسمے کی طرح خاموش اور بے حس نظر آ رہا تھا۔ اس کا جھرّیوں بھرا چہرہ ہر قسم کے تاثرات سے بے نیاز تھا۔ وہ اپنے چہرے پر خاموشی اور سنجیدگی کی گہری تہ چڑھائے اپنی ساکت نظروں سے مسلسل ان لوگوں کو گھورتا رہا جو اس کی زندگی اور موت کا فیصلہ کرنے کے لیے جمع ہُوئے تھے۔ اس کی خاموشی اس بات کی شاہد تھی کہ جنرل

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ڈوگ کی رہائی کی پیش کش اس کے لیے ایک دلچسپ مذاق سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی اور وہ جنرل کے اس وعدے پر اعتبار کرنے کے لیے خود کو آمادہ نہیں کر پا رہا ہے۔ خاموشی کے اس وقفے کے دوران میری نظریں اچانک سارجنٹ فلپ کی حرکات و سکنات کا جائزہ لینے میں معروف ہو گئیں۔ سارجنٹ بے چینی سے پہلو بدلتا ہُوا اچانک اپنی کرسی سے اُٹھا اور جنرل ڈوگ کے قریب جا کر سرگوشیوں میں کچھ کہنے لگا۔

جنرل نے اس کی بات سُن کر اثبات میں سر ہلا دیا اور دوبارہ اپنی عیار آنکھیں شالیار خان کے چہرے پر گاڑتے ہُوئے کسی زہریلے سانپ کی طرح پھنکارنے لگا: "شالیار خان! ابھی وقت ہے، اپنی زبان کھول دو اور ہمیں لُوٹے ہُوئے خزانے کے دفن سے آگاہ کر دو۔ اگر تم ہمارے سامنے اسی طرح خاموش کھڑے رہے تو موت کی تاریکیاں تمھارا مقدر بن جائیں گی۔ بولو! جواب دو! تم نے اس لُوٹے ہُوئے خزانے کو کہاں چھپا رکھا ہے۔ تمھارا مثبت جواب تمھارے بدن سے لپٹی ہُوئی آہنی زنجیروں کو کاٹ سکتا ہے۔"

. . . مگر شالیار خان اس کی ترغیب سے بے نیاز خاموش کھڑا رہا۔ اچانک ہی اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہُوئی تو مجھے یوں محسوس ہُوا جیسے کسی نے ٹھوس چٹان کے درمیان ایک لکیر کھینچ دی ہو۔ شالیار خان کی یہ مسکراہٹ مجھے خود بھی بہت عجیب اور انوکھی محسوس ہُوئی۔ اس کی یہ ہلکی سی مسکراہٹ اس کے عزم و استقلال کی ایک روشن دلیل تھی کہ اس قدر طویل ترین تشدد بھی اسے فرنگیوں کے ساتھ کسی بھی مصالحت پر آمادہ نہیں کر سکا ہے۔

"شالیار خان!" جنرل ڈوگ کسی وحشی درندے کی طرح چنگھاڑتے ہُوئے بولا: "تمھاری یہ طویل خاموشی تمھارے لیے مہلک اور سنگین نتائج برآمد کر سکتی ہے۔ . . اگر تم نے یہ آخری موقع بھی کھو دیا تو اس کا خمیازہ تمھیں ہی نہیں تمھارے قبیلے کے لوگوں کو بھی بھگتنا پڑے گا۔ حکومتِ برطانیہ فیصلہ کر چکی ہے کہ عدم تعاون کی صورت میں تمھارے ساتھ پورے قبیلے کو جمع کر کے فائرنگ اسکواڈ کے حوالے کر دیا جائے گا۔"

جنرل ڈوگ نے انتہائی غصّے کے عالم میں شالیار خان کو خوفناک نتائج کی دھمکی دی مگر وہ عزم و استقامت کا پیکر کسی پتھر کے مجسمے کی طرح خاموش کھڑا جنرل ڈوگ کی عیار آنکھوں میں جھانکتا رہا۔ اس کے حوصلوں میں ابھی تک کوئی لغزش نہیں آئی تھی۔

"شالیار خان! تم سے آخری مرتبہ یہ دریافت کیا جا رہا ہے۔ کیا تم ہمارے ساتھ تعاون کرنے کے لیے آمادہ ہو یا ابھی تک اسی مؤقف پر ڈٹے ہُوئے ہو کہ تم نے ہمارے خلاف کوئی جُرم نہیں کیا ہے؟" شدید غصّے کے عالم میں جنرل ڈوگ کے مُنہ سے جھاگ اُڑنے لگی تھی: "اگر تم مظلوم اور بے گناہ ہو تو تمھاری یہ خاموشی ان جرائم کی پردہ پوشی نہیں کر سکتی۔ تم خود بھی جانتے ہو کہ کسی سے وفاداری کا عہد کر کے توڑنا کتنا سنگین جُرم ہے اور کسی انسان کو زندگی سے محروم کر دینا کتنا گھناؤنا اور مکروہ فعل ہے مگر تمھارے ان سارے جرائم کو معاف کیا جا سکتا ہے، بشرطیکہ تم وہ لُوٹا ہُوا خزانہ واپس کر دو۔ تمھاری زندگی اور موت کے درمیان اقرار و انکار کا فاصلہ قائم ہے، ورنہ ایک خطرناک مجرم کی حیثیت سے تمھاری زندگی کا یہ آخری دن ہو گا۔ کل کا اُبھرنے والا سورج تمھیں زندگی کی حرارتوں سے محروم کر دے گا اور تمھاری خاموشی موت کے ابدی سکوت میں بدل جائے گی۔"

اچانک بوڑھے شالیار خان نے زنجیروں کی جھنکار کے ساتھ اپنا ایک بازو فضا میں بلند کیا اور ساکت نظروں سے فرنگیوں کا جائزہ لیتے ہُوئے کسی زخمی شیر کی طرح گرج اُٹھا: "جنرل! کئی برس کا طویل تشدد بھی میرے اندر موت کے خوف کو جنم نہیں دے سکا۔ تم مجھے بار بار موت کی سزا کا حوالہ دے کر خوف زدہ نہیں کر سکتے کیوں کہ میں مجرم نہیں ہُوں بلکہ حالات کا ستایا ہُوا ایک بے گناہ اور مظلوم انسان ہوں۔ میری بے گناہی کا تمھیں خود بھی یقین ہے مگر تم نے اپنے چہرے پر مصلحت کی نقاب چڑھا رکھی ہے۔ اس لیے تم آج تک میرے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔" شالیار خان کی آواز میں ایک ایسا دبدبہ تھا، جیسے اچانک دو پہاڑ آپس میں ٹکرا گئے ہوں۔

آواز میں شیر جیسی للکار سُن کر مجھے اپنے بوڑھے باپ پر فخر محسوس ہونے لگا۔ وہ آج بھی ان قزاقوں کو آقا ماننے کے لیے تیار نہیں تھا، جو سات سمندر پار کر کے ہم پر حکمران تھے۔

"کیا تمھیں اس بات سے انکار ہے کہ تم فوج کے بھگوڑے اور ایک انگریز سارجنٹ کے قاتل ہو؟ کیا تم نے تاجِ برطانیہ کا خزانہ نہیں لُوٹا؟" جنرل ڈوگ کے سوالیہ لہجے میں زخمی درندے کی چنگھاڑ اُبھر آئی تھی: "چلو میں تمھاری اس دلیل کو تسلیم کر لیتا ہوں کہ دوسرے تمام جرائم تم سے غیر معمولی حالات میں سرزد ہُوئے تھے مگر سرکاری خزانہ لُوٹنے کا منصوبہ تمھاری گہری سوچ و بچار کا نتیجہ تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سرکاری خزانہ لُوٹنے کا الزام تم پر ثابت ہو چکا ہے۔ ہم تمھارے سارے جرائم کو نظرانداز کرنے کے لیے تیار ہیں بشرطیکہ تم لُوٹا ہُوا خزانہ واپس کر دو۔ اب تمھاری رہائی کی یہی ایک صورت باقی رہ گئی ہے۔"

بوڑھا شالیار خان دیر تک جنرل ڈوگ کی ترغیب آمیز باتوں پر غور کرتے ہُوئے خاموشی سے سوچتا رہا پھر اچانک ہی بول اُٹھا: "میں جانتا ہُوں کہ میری آزادی کا دل کش خواب کبھی حقیقت کا جامہ نہیں پہن سکے گا کیوں کہ معتوب کا کوئی مستقبل نہیں ہوتا۔ تاہم میں اپنی مظلومیت کی داستان تمھارے سامنے ضرور دُہراؤں گا جو آج مجھے تمھارے سامنے ایک مجرم کی حیثیت دینے کا سبب بن رہی ہے۔ میں اپنی بے گناہی کی دل خراش داستان سُنا کر تمھارے اس دعوے کی حقیقت جاننا چاہتا ہوں کہ تم کہاں تک انصاف پسند واقع ہُوئے ہو۔"

بوڑھے شالیار خان کا بے خوف لہجہ مجھے ہی نہیں، ہر شخص کو متاثر کر رہا تھا۔ ہر شخص ہمہ تن گوش اُس کی باتیں سُن رہا تھا۔

"شالیار خان! میں تمھاری داستان بڑے شوق سے سُنوں گا بشرطیکہ تم اپنی اس داستان طرازی کے دوران وہ تمام حقائق بھی بیان کر دو جنھیں میری حکومت جاننے کی خواہش مند ہے۔ اپنی سرگزشت سُناتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھنا کہ موت کا عفریت تم سے چند قدم کے فاصلے پر موجود ہے۔ تمھارے لیے اپنی صفائی پیش کرنے کا یہ آخری موقع ہے۔"

جنرل کی اس یاد دہانی کو سُن کر بوڑھے شالیار خان کا چہرہ غصّے سے سُرخ ہو گیا اور اس کے جھرّیوں بھرے چہرے پر سینکڑوں سلوٹیں نمودار ہو گئیں پھر اچانک وہ شیر کی طرح دھاڑنے لگا۔ "تم لوگ محکوم قوم کے لوگوں کو خرید کر انھیں شاندار مستقبل کے سُنہرے خواب دکھانے کے عادی ہو۔ گزشتہ کئی برس کا طویل اور تشدد آمیز عرصہ اس بات کا گواہ ہے کہ تم لوگ ظالم و مظلوم کی تخصیص کیے بغیر میری قوم کے مجبور لوگوں کے ساتھ کس قدر درندگی سے پیش آتے رہے ہو اور یہ روایت تمھاری قوم صدیوں سے اپنائے ہُوئے ہے۔ تم لوگ جو قانون بناتے ہو اس پر خود کبھی عمل نہیں کرتے۔ اس کے برعکس تمھاری یہ کوشش ہوتی ہے کہ محکوم قوموں کے لوگ تمھارے اس بنائے ہُوئے قانون پر سختی سے عمل کریں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ تم نے آج تک میری صداقت پر کبھی یقین نہیں کیا۔ میں مظلوم ہونے کے باوجود تمھاری نظروں میں ایک خطرناک مجرم ہُوں۔ کئی برسوں کی ان صعوبتوں کے درمیان تم لوگوں نے مجھے اس لیے ابھی تک فائرنگ اسکواڈ کے حوالے نہیں کیا کہ تمھیں اس بات کی قوی اُمید تھی کہ تمھارا تشدد آمیز سلوک مجھے تمھاری طرف تعاون کا ہاتھ بڑھانے پر مجبور کر دے گا... میں تمھارے ظلم و ستم کے سامنے زندگی کی بھیک مانگنے پر مجبور ہو جاؤں گا اور اس طرح تم اپنا گم شدہ خزانہ دوبارہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤ گے مگر تمھارا یہ طویل ترین منصوبہ ناکام ہو گیا اور میں تمھارے اس ظلم و ستم کے باعث اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھا۔ میں اپنی اصل داستان سُنانے سے پہلے تم پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ تم نے اپنی اس لاعلمی کے باعث میرے ساتھ کتنی بڑی زیادتی کی ہے۔ تمھیں اگر وہ خزانہ واپس مل گیا تب بھی تم میرے ساتھ کی گئی زیادتیوں کی تلافی نہیں کر سکو گے۔ آج میری خوب صورت جوانی بدہیئت بڑھاپے کی صورت اختیار کر چکی ہے اور مجھے تمھارے اس دراز ظلم کا سلسلہ ابھی تک ٹوٹتا ہُوا نظر نہیں آتا۔ تمھاری نیلی آنکھوں میں اُبھری ہُوئی بے اعتباری کی چمک مجھ پر میرا مستقبل واضح کر رہی ہے مگر پھر بھی میں اپنی حجت پوری کرنے کے لیے تمھیں اپنی مظلومیت کی داستان ضرور سُناؤں گا تاکہ کئی برس کی اس خوفناک قید کے دوران جو عذاب میں نے اپنی آزاد روح پر محسوس کیے ہیں۔ ان کی ہلکی سی آنچ سے تم بھی باخبر ہو جاؤ۔"

بوڑھا شالیار کسی زخمی شیر کی طرح گرجتے گرجتے اچانک اپنا سانس دُرست کرنے کے لیے خاموش ہُوا تو مجھے ایک دم یوں محسوس ہُوا جیسے بوڑھے شیر کے خاموش ہوتے ہی سارا ماحول اچانک سنّاٹے میں ڈوب گیا ہو۔ جنرل ڈوگ کے دفتر میں موجود ہر شخص کی آنکھیں جھرّیوں بھرے بوڑھے شالیار کے چہرے پر لگی ہوئی تھیں۔ خاص طور سے اس کی تمہیدی تقریر کا اثر جنرل ڈوگ کے چہرے پر جھلک رہا تھا۔ اُسے شاید میرے بوڑھے باپ سے اتنی بیباکی کے ساتھ الزام تراشی کی توقع نہیں تھی۔

... اس کے چہرے پر رقص کرتی ہُوئی ناگوار لکیریں اتنی تیزی سے واضح ہُوئیں کہ مجھ سمیت ہر شخص نے اس کی برہمی محسوس کر لی مگر شیر دل شالیار خان، جنرل ڈوگ کے ان ناگوار احساسات سے بے نیاز اپنی دردناک داستان شروع کر چکا تھا۔

وہ اُسی کہانی کو دُہرا رہے تھے جسے میں پڑھ چکا تھا۔ واقعات کی ترتیب بھی وہی تھی لیکن اندازِ بیان اُس تحریر سے کہیں زیادہ جذباتی تھا۔ کسی لختِ جگر کے لیے اپنے باپ کو ایسے موقعے پر اجنبی ظاہر کرنا کس قدر تکلیف دہ کام ہے... اس کا اندازہ صرف انھی لوگوں کو ہو سکتا ہے جو

اس قسم کے حالات سے عملی طور پر گزر چکے ہوں۔ میں جُوں جُوں اپنے بوڑھے باپ کی داستان سُن رہا تھا میرے تن بدن میں چنگاریاں بھرتی جا رہی تھیں۔ داستان سے اندازہ ہوتا تھا کہ اُنھوں نے بے پناہ دُکھ اُٹھائے تھے اور بے انتہا مصیبتیں برداشت کی تھیں۔ ان کا لہجہ اس قدر مؤثر تھا کہ ہر بات دل میں اُتر رہی تھی... لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ فرنگی جنرل بے حس بیٹھا ہے۔ میرے بابا کی بوڑھی آواز میں طویل قید و بند کی صعوبتیں جھیلنے کے باوجود آج بھی وہ انوکھا وقار اور دبدبہ موجود تھا جو ہر سچے اور بہادر انسان کی فطرت کا ایک نمایاں جوہر کہلاتا ہے۔

میرا باپ وادیِ خوف کی مُہم کے دوران میں پیش آنے والے واقعات تفصیل سے بتا رہا تھا اور مجھے یاد آ رہا تھا کہ میں ان واقعات کو تفصیل سے جانتا ہوں۔ یہ وہی واقعات تھے جنھیں میں اپنے باپ کی خفیہ دستاویز میں پڑھ چکا ہُوں لیکن آج یہ داستان سُنتے ہُوئے میرے دل و دماغ پر ایک عجیب سا سنّاٹا طاری تھا۔ یُوں محسوس ہو رہا تھا، جیسے کوئی سوگوار احساس میرے دل و دماغ پر اپنا غلبہ جما رہا ہو اور میں حیرت و سکوت کے سمندر میں ڈوبتا جا رہا ہُوں۔ ایک سُلگتا ہُوا احساس تھا جس نے میری آزاد رُوح کو اچانک بھاری زنجیریں پہنا دی تھیں۔

بوڑھا شالیار خان اپنی سرگزشت سُنا کر خاموش ہُوا تو چند لمحوں کے لیے کمرے میں قبرستان کی سی گہری خاموشی چھا گئی۔ موت کا بوجھل سنّاٹا فوجی عدالت کے در و دیوار پر رقص کرنے لگا۔ تب اچانک سارجنٹ فلپ جُھک کر جنرل ڈوگ کے کان میں کچھ کہنے لگا۔ اس کی آنکھوں کے اشارے سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ میرے بارے میں ایک بار پھر اپنی بھرپور نفرت کا اظہار کر رہا ہے اور وہ جنرل کے ذہن میں کوئی خاص بات ڈالنے کی کوشش میں مصروف ہے۔

جنرل نے تیزی سے اپنا سر انکار میں ہلایا اور سارجنٹ فلپ کو سخت نظروں سے گھورتے ہُوئے خاموش رہنے کی تلقین کی۔ وہ دوبارہ بوڑھے شالیار کی طرف دیکھنے لگا جو اپنی سرگزشت سُنا کر خاموشی اور سنجیدگی کا پیکر بنا، اپنی ساکت آنکھوں سے خلا میں گھور رہا تھا۔ اس کے سپاٹ اور جھرّیوں بھرے چہرے پر دوبارہ سلوٹیں نمودار ہو رہی تھیں۔

"شالیار خان، تمھاری داستان ادھوری ہے۔" جنرل نے اپنی عیار آنکھیں میرے مظلوم باپ کے چہرے پر گاڑتے ہُوئے اعتراض کیا۔ "اس میں تمھاری بے گناہی کا اظہار تو موجود ہے مگر تم نے بڑی چالاکی سے لُوٹے ہُوئے خزانے کا ذکر گول کر دیا ہے۔ تمھاری دردناک داستان سُن کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ واقعی اب تک تم سے بہت زیادتی ہُوئی ہے۔ تمھیں طرح طرح کی جسمانی اور رُوحانی تکلیفوں سے گزرنا پڑا ہے۔ بہرحال اب تم اس لُوٹے ہُوئے خزانے کے بارے میں بتاؤ کہ تم نے اُسے کہاں چُھپا رکھا ہے۔ یاد رکھو! میرے اس اہم سوال کا تسلّی بخش جواب ہی تمھاری آزادی کی ضمانت بن سکتا ہے۔"

یہ سوال سُن کر بوڑھے شالیار کے چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ نمودار ہُوئی جس میں سوگواری کا گہرا تاثر شامل تھا۔

"جنرل! میں اس بات کا اقرار کرتا ہُوں کہ میں نے تمھارا خزانہ لُوٹا ضرور تھا مگر حالات کی ستم ظریفی ہے کہ مجھے خود بھی ایک لٹیرے سے واسطہ پڑ گیا۔ وہ سارا خزانہ مجھ سے ڈاکو بگولا سنگھ چھین کر لے گیا اور میں گناہ گار کہلانے کے باوجود تہی دست رہ گیا۔" بوڑھے شالیار نے سنجیدہ لہجے میں انکشاف کیا تو بوڑھا جنرل غصّے سے بھڑک اُٹھا۔

"یہ بگولا سنگھ کون ہے؟ اور تم نے اس سے چھینا ہُوا مال واپس لینے کی کوشش کیوں نہیں کی؟"

"بگولا سنگھ وادیِ فرغان کا بے تاج بادشاہ کہلاتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ وادیِ فرغان کی آس پاس کی آبادیوں کے لوگ اپنے تنازعات جرگے کے سامنے پیش کرنے کے بجائے بگولا سنگھ کے سامنے پیش کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ لٹیرا ہونے کے باوجود بہت سچّا اور انصاف پسند ہے۔ اس نے جب سے خزانہ چھینا ہے حالات نے مجھے اتنی مہلت ہی نہیں دی کہ میں اپنی لُٹی ہُوئی دولت اس سے واپس لینے کی مہم شروع کرتا۔ اگر تمھیں اپنا خزانہ اتنا ہی عزیز ہے تو مجھے اتنی مہلت دو کہ میں وہ دولت اس کی دسترس سے نکال کر تمھارے حوالے کر دوں۔"

"مکّار بُڈھے!" میں نے اچانک مداخلت کرتے ہُوئے چیخ کر کہا۔ "تُو اعلیٰ درجے کا فریبی اور دروغ گو ہے مگر تمھاری یہ دروغ گوئی اور فسانہ طرازی یہاں کسی کو متاثر نہیں کر سکتی۔ کیا تم یہ سمجھے ہوئے ہو کہ جو لوگ اپنی بے پناہ طاقت اور ذہانت کے بل پر آج آدھی دنیا پر حکمرانی کر رہے ہیں، وہ اتنے ہی غبی اور کُند ذہن ہیں کہ جھوٹ اور سچ میں کوئی تمیز نہیں کر سکتے؟ تمھارا یہ بیان ایک بھونڈا فریب ہے کہ تاجِ برطانیہ کا لُوٹا ہُوا خزانہ تم سے وادیِ خوف میں بگولا سنگھ نے چھین لیا تھا اور پھر تمھیں مہلت ہی نہیں ملی کہ خزانہ اس سے واپس لے سکتے۔ اگر تمھارے اس بیان کو سچ سمجھ لیا جائے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ خزانہ تمھارے ہاتھ سے نکل چکا ہے اور اب تم بگولا سنگھ کو اپنا ذاتی دشمن قرار دینے کے بجائے تاجِ برطانیہ کا خطرناک دشمن ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔ میں تم پر یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ تمھارا یہ جھوٹ ہمارے سامنے زیادہ دیر تک نہیں چل سکے گا۔ اس طرح تمھیں رہائی نصیب

نہیں ہو سکتی۔ تمہیں اس وقت رہائی نصیب ہوگی جب تم جھوٹ کی ملاوٹ کیے بغیر سچائی اُگل دوگے۔"

یہ سب کچھ کہتے ہوئے میں نے دل پر پتھر رکھ لیا تھا۔

میں اس وحشت کا مظاہرہ کرتا ہوا اچانک اپنی کرسی سے اُٹھ گیا اور تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا بوڑھے شایار خان کے سامنے پہنچ گیا پھر جواب طلب نگاہوں سے اس کی ساکت آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں غصّے کی ہلکی ہلکی لہریں اُبھر رہی تھیں مگر میں نے اس کے اندرونی جوش و خروش کو نظر انداز کرتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"یہ بجولا سنگھ کون تھا جو تجھ جیسے درندے سے اپنی طاقت کا لوہا منوا کر سب کچھ چھین لے گیا۔ تمہاری بات ہمارے حلق سے نیچے نہیں اُترتی کہ کوئی تم جیسے درندے سے بڑا عفریت بھی ہو سکتا ہے۔ اگر تمہاری بات کو سچ مان لیا جائے کہ بجولا سنگھ تم سے بھی بڑا درندہ اور وحشی آدمی ہے۔ تب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ تم نے اس راز کو اٹھارہ سال تک اپنے سینے میں کیوں پوشیدہ رکھا۔ کیوں نہ اپنی قید کے ابتدائی دنوں ہی میں تم نے تاج برطانیہ پر یہ واضح کر دیا کہ تم اس لوٹے ہوئے خزانے سے محروم ہو چکے ہو؟ اس طرح تم اتنی طویل مدت تک جیل کی سختیاں برداشت سے بچ سکتے تھے۔ تمہارے سُکوت اور پُراسرار رویّے سے اندازہ ہوتا ہے کہ تم تاج برطانیہ کا لوٹا ہوا خزانہ خود ہضم کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے پھر تم خاموشی سے ان حالات کا انتظار کرتے رہے اور اپنے ذہن میں اس منصوبے کو ترتیب دیتے رہے کہ حکام کو کس طرح فریب دے کر رہائی حاصل کی جا سکتی ہے۔ یاد رکھو بڈھے!"

میں نے ہاتھ اُٹھا کر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا "میرے ہوتے ہوئے تمہارا یہ فریب اور ڈھونگ زیادہ دیر تک نہیں چل سکتا۔ تم ہمیں ایک فرضی اور من گھڑت داستان سُنا کر مطمئن نہیں کر سکتے۔"

"نوجوان! تم یقیناً بہادر اور بے خوف نظر آتے ہو۔" بوڑھے شایار نے اپنے پتھریلے چہرے پر نرمی کے آثار پیدا کرتے ہوئے پاٹ دار آواز میں جواب دیا۔ "مگر ابھی تمہارے تجربے میں بہت سی کمی ہے۔ جو تمہیں جھوٹ اور سچ میں تمیز کرنے کی اہلیت سے محروم کیے ہوئے ہے۔ تم کسی ٹھوس ثبوت کے بغیر مجھے جھوٹا قرار دے کر میرے بڑھاپے کی توہین کر رہے ہو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میری غیرت کا امتحان ہو۔ میں بوڑھا ہونے کے باوجود تم جیسے گستاخ کو کسی حقیر چیونٹی کی طرح موت کی ابدی نیند سُلا دینے کی قوت رکھتا ہوں لیکن طاقتور دوستوں کے نرغے میں بیٹھ کر کسی قیدی کی غیرت پر حملے کرنا بہت آسان کام ہے مگر میں تمہیں ایک ناعاقبت اندیش نوجوان سمجھ کر اس توہین کے لیے معاف کرتا ہوں کیونکہ ایک ناسمجھ نادان اور ناعاقبت اندیش لڑکے پر ہاتھ اُٹھانا میں اپنی شان کے خلاف سمجھتا ہوں۔"

بوڑھے شایار خان کی بھاری پاٹ دار آواز جذبات کی شدت سے لرز رہی تھی اور اس کے پتھریلے چہرے کے تیور بے حد خطرناک نظر آنے لگے تھے۔

"مکار بوڑھے!" میں نے ایک بار پھر دل پر پتھر رکھ کر اپنے لہجے میں سختی پیدا کرتے ہوئے کہا۔ "شاید تجھے اپنی جسمانی قوت پر بہت ناز ہے۔ مگر میں تمہارے بوڑھے جسم کو للکارنا اپنی جوانی اور شہ زوری کی توہین سمجھتا ہوں۔ اگر تمہارا کوئی بیٹا ہوتا تو میں اسے سر میدان للکار کر بتاتا کہ میری رگوں میں گردش کرنے والا خون کس قدر غیرت مند ہے۔ تجھ جیسے بوڑھے سے اپنی دشمنی کا اظہار کرنا میرے قبیلے کی روایت کے خلاف ہے۔"

اچانک بوڑھے شایار خان کا اُٹھا ہاتھ زنجیروں کی جھنکار کے ساتھ بلند ہوا اور میری دائیں کنپٹی پر گہری خراش چھوڑتا ہوا واپس چلا گیا۔

وہ مجھ پر دوسرا وار بھی کرنے میں کامیاب ہو جاتا مگر اچانک محافظوں نے رائفل کے کندے مارتے ہوئے اسے بے بس کر دیا۔

بوڑھے شایار خان کا ہاتھ کسی وزنی ہتھوڑے کی طرح میری کنپٹی پر لگا تھا۔ آہنی ہتھکڑی کی نوک دار ضرب نے کافی گہرا زخم لگایا تھا اور مجھے اپنے سر کے دائیں حصے سے آگ کی چنگاریاں سی پھوٹتی محسوس ہو رہی تھیں اور میری آنکھوں کے سامنے سینکڑوں سیاہ دائرے رقص کرنے لگے تھے۔

دیر تک مجھے اپنے کانوں میں سائیں سائیں کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ میں نے مضبوطی سے اپنے قدم زمین پر جما لیے اور سنبھلنے کی کوشش کرتے ہوئے اپنا ایک ہاتھ زخمی کنپٹی پر رکھ لیا۔

چند لمحات مجھے اپنے گمشدہ حواس درست کرتے ہوئے گزر گئے۔ جب ذرا حواس بحال ہوئے تو میری نظریں اپنے حریف کی طرف اُٹھ گئیں جسے اس وقت چار جوان سنبھالے کھڑے تھے۔ اس کی پیشانی اور رخسار زخمی نظر آ رہے تھے اور ان سے رستا ہوا خون اس کے بوسیدہ لباس کو داغ دار کر رہا تھا۔ جونہی میری آنکھیں اس کی آنکھوں سے ٹکرائیں میں اس کی کبوتر کے خون کی طرح سُرخ سُرخ آنکھیں دیکھ کر کانپ گیا۔ اس کی خوفناک سُرخ آنکھیں دیکھ کر یوں محسوس ہوا جیسے شاید غصّے کی حالت میں آنکھوں کی باریک باریک رگیں پھٹ گئی ہوں اور ان سے خون بہہ کر آنکھوں میں تیرنے لگا ہو۔ اس کی آنکھوں میں نفرت و حقارت کی آگ جلتی پا کر میرا سارا وجود تلملا اُٹھا اور میں شدید کرب کے عالم میں چلا اُٹھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"جنرل! اسے چند لمحوں کے لیے آزاد کر دو تاکہ میں اسے یہ بتا سکوں کہ جوانی کی کاری ضرب کیسی ہوتی ہے۔ اس نے مجھ پر ہاتھ اُٹھا کر کبھی نہ ختم ہونے والی دشمنی کا آغاز کر دیا ہے۔ اب میرے طاقتور ہاتھ اس دشمنی کو انجام تک لے جائیں گے۔" میں غصّے کے عالم میں زہریلے سانپ کی طرح بل کھاتا ہوا بوڑھے شایار خان کی طرف بڑھا۔

"شہباز خان! جہاں ہو وہیں رُک جاؤ۔"

اچانک جنرل ڈوگ کی تیز آواز مجھے پگھلے ہوئے سیسے کی طرح اپنے کانوں میں اُترتی محسوس ہوئی۔

میں ایک دم پلٹا اور وحشت آمیز نظروں سے جنرل ڈوگ کو دیکھنے لگا۔ میرے چہرے پر اتنے شدید غصّے کے آثار تھے کہ جنرل بھی چونک پڑا۔

اچانک سارجنٹ فلپ ایک بار پھر جنرل ڈوگ کی طرف جھک کر اس کے کان میں کچھ کہنے لگا۔ معاً جنرل نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا اور اس کا بایاں ہاتھ زنّاٹے کے ساتھ سارجنٹ کے چہرے پر پڑا اور وہ تھپڑ کھا کر قالین پر گر گیا۔

"بکواس بند کرو اور عدالتی کارروائی میں مداخلت نہ کرو میں تمہاری وجہ سے پہلے ہی ایک بار اپنے عزیز دوست کو استحان میں ڈال کر اس کی نظروں میں سُبک ہو چکا ہوں۔ اگر اب تم نے عدالتی کارروائی میں مداخلت کرنے کی جسارت کی تو میں تمہارا کورٹ مارشل کر دوں گا۔"

جنرل کی جھاڑ سُن کر سارجنٹ فلپ خاموشی سے اُٹھا اور دوبارہ اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"شہباز خان! میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ واپس آ کر اپنی کرسی پر بیٹھ جاؤ اور عدالتی کارروائی کو آگے بڑھانے میں ہمارا ہاتھ بٹاؤ۔"

میں نے بڑے حوصلے کا مظاہرہ کرتے ہوئے جنرل کا حکم سُنا اور بادلِ ناخواستہ میں چلتا ہوا اپنی کرسی پر آ گیا... پھر جنرل ڈوگ کو مخاطب کر کے کہا۔

"جنرل! یہ بڈھا بے حد شاطر اور عیّار ہے۔ اس نے دروغ گوئی کا سہارا لیتے ہوئے ہمیں ایسی حیرت انگیز داستان سُنائی ہے جس پر اعتبار کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ اگر تم اس عیّار بوڑھے کو میرے حوالے کر دو تو میں اس کی جھوٹی داستان کی دھجیاں اُڑا کر رکھ دوں گا یقین کرو اگر یہ واقعی مکار اور دروغ گو ثابت ہوا تو پھر دنیا کی کوئی طاقت مجھے اس کو موت کے گھاٹ اُتارنے سے نہیں روک سکے گی۔"

میں خاموشی سے شایار خان کو سخت نظروں سے گھورنے لگا۔

عدالت میں موجود ہر شخص کی نگاہیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔

اچانک بوڑھے شایار کی گرجتی ہوئی آواز نے لوگوں کی توجہ دوبارہ اپنی طرف مبذول کرالی۔ "گزشتہ کئی برس سے میرے سینے میں نفرت و انتقام کا جو آتش فشاں اُبل رہا ہے۔ تم میں سے کوئی اس کی ہلکی سی آنچ بھی برداشت کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتا۔ نوجوان! مجھے افسوس ہے کہ اچانک تجھ پر ہاتھ اُٹھ گیا اور میں نے تمہارے سینے میں چھلکتی ہوئی نفرت کو باہر آنے کا موقع دے دیا۔ مجھے تمہاری جرأت اور بے باکی کا یہ انداز بہت پسند آیا اور میں اس بات پر فخر کر سکتا ہوں کہ میں نے اپنا دشمن منتخب کرنے میں غلطی سے کام نہیں لیا۔ شایار خان بہادر اور دلیر انسانوں کا پُرانا مداح ہے۔ تم یقیناً کسی بڑے باپ کے بیٹے ہو اور تمہاری شہ زوری پر مجھے کسی قسم کا شبہ نہیں رہا۔ تم نے میرے اس اچانک حملے کو جس صبر و تحمّل سے برداشت کیا ہے کوئی شہ زور ہی ایسی کاری ضرب کو برداشت کر سکتا تھا۔ مگر آفرین ہے اس ماں پر جس نے تم جیسے دلیر اور بہادر بیٹے کو جنم دیا۔ تم نے جس آسانی سے میرے اس وار کو برداشت کر لیا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تمہاری رگوں میں گردش کرتے ہوئے خون میں بہادری اور دلیری کے ذرات موجود ہیں جو تمہارے روشن مستقبل کی ضمانت بن سکتے ہیں۔"

اپنے بارے میں بابا شایار خان کے تاثرات سُن کر مجھے بے پناہ رُوحانی مسرت ہوئی حالانکہ یہ ایک باپ کے خیالات نہیں تھے بلکہ ایسے بظاہر دشمن کے خیالات تھے جسے اگر محافظ بروقت مداخلت کر کے قابو میں نہ کر لیتے تو میرے مستقبل کا نقشہ ہی کچھ اور ہو جاتا مگر اس نے جس انداز میں میرے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کیا تھا اس نے اور اس کی رائے نے مجھے ہی نہیں فوجی عدالت

اے حمید
کے ایڈونچرس قلم سے
گنگا کے
پجاری ناگ
جلد اول =/150
جلد دوم =/200
دو جلدوں میں
مکتبہ القریش سرکلر روڈ اردو بازار لاہور
فون 7668958

میں موجود ہر شخص کو متاثر کر دیا۔ اس نے ایک اعلیٰ ظرف دشمن کا کردار ادا کرتے ہوئے میری دلیری اور قوت کی تعریف کی مگر میں نے مصلحت کا سہارا لیتے ہوئے اس کے ان تعریفی الفاظ کو یکسر نظرانداز کر دیا اور حسبِ سابق اپنی برہمی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"مکار بوڑھے! تمہاری یہ تعریفی باتیں میری اس دشمنی کو ختم نہیں کر سکتیں جس کی ابتدا تمہاری طرف سے ہوئی ہے۔ میرا باپ اپنے وقت کا بہت بڑا انسان تھا۔ وہ اتنا بڑا تھا کہ تمہاری سوچ اور تصور سے بھی بلند تھا مگر تمہاری طرح کم ظرف نہیں بلکہ اعلیٰ ظرف انسان تھا۔ وہ دشمن کو للکارے بغیر حملہ کرنا گناہِ عظیم خیال کرتا تھا مگر تم جو خود کو طاقت کا پہاڑ ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہو، مجھ پر اچانک حملہ کر کے اپنی عیاری کا ثبوت دیا ہے اور عدالت میں موجود ہر شخص پر ثابت کر دیا ہے کہ وقت آنے پر گرگٹ کی طرح رنگ بدلنا تمہاری فطرت ہے۔ میں تمہاری بہادری اور سچائی کا پول کھول کر رہوں گا اور تمہیں مجبور ثابت کر کے ایسی عبرت ناک موت دوں گا کہ آنے والی نسلیں تمہارے انجام کا ذکر کرتے ہوئے دہشت سے لرز اٹھیں گی۔"

میں فوجی عدالت کی ساری توجہ دوبارہ اپنی جانب مبذول کروانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔

"شہباز خان: تمہاری سابقہ کارکردگی کو سامنے رکھتے ہوئے میں شایار خان کو تمہارے حوالے کرنے کو تیار ہوں۔" اچانک جنرل ڈوگ نے اپنے مخصوص انداز میں ایک ہاتھ بلند کرتے ہوئے کہا۔

جنرل ڈوگ کی زبان سے نکلے ہوئے یہ چند الفاظ مجھے اپنی کے منصوبے نکال کر کامیابی کے ساحل تک لے گئے تھے۔ شایار خان کو اپنی تحویل میں لینے کے لیے ہی میں نے اس جذباتی دشمنی کا ڈھونگ رچایا تھا۔ اگر ایک بار میں اپنے بوڑھے باپ کو لے کر چھاؤنی کی حدود سے نکل جاتا تو میرا واپس آنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اب تک عدالت کی ساری کارروائی میرے اسی منصوبے کے تحت تھی۔ سارجنٹ فلپ میرے بارے میں جنرل کے سامنے اپنے شکوک کا اظہار کر کے منہ کی کھا چکا تھا اور جنرل ڈوگ نے شایار خان کو میری تحویل میں دینے کا حکم جاری کرتے ہوئے میرے لیے اچانک کامیابی کے سارے دروازے کھول دیے تھے۔

"مگر اس سے پہلے کہ خزانے کی بازیابی کی مہم تمہارے سپرد کی جائے یہ واضح کر دینا وقت کی ایک اہم ضرورت خیال کرتا ہوں کہ شایار خان ایک مرتبہ تمہاری گرفت سے آزاد ہو گیا تو پھر ساری عمر تم اس کا نقش پا بھی تلاش نہیں کر سکو گے اور نہ ہی تاجِ برطانیہ کے اس نقصان کی تلافی ہو سکے گی جو اس کے فرار ہونے کی صورت میں واقع ہو گا۔ اس لیے تم اپنی منزل پر پہنچنے تک اس کی طرف سے ہوشیار اور چوکنا رہنا۔ اس کے فرار ہونے کی صورت میں تم سے بازپرس بھی ہو سکتی ہے کیونکہ ہمارے پاس اس بات کی کوئی ضمانت نہیں کہ یہ تمہیں راستے میں کہیں فریب دے کر فرار ہو گیا تو اس نقصان کی تلافی بھی ہو سکے گی۔ اس کے ساتھ میں تمہیں یہ کہنا بھی ضروری خیال کرتا ہوں کہ تم اس وقت تک شایار خان کے ساتھ دشمنی کے اس عہد کو بھول جاؤ گے جب تک ہمیں لوٹا ہوا خزانہ واپس نہیں مل جاتا اور تم بجولا سنگھ جیسے طاقتور باغی کا خاتمہ کرنے میں کامیابی حاصل نہیں کر لیتے۔ تب تک اس کا زندہ رہنا بہت ضروری ہے۔ اپنی مہم پر روانہ ہونے کے بعد تمہیں ہر قدم پر اس کی ذات سے محتاط رہنا ہو گا۔ اس مہم کو کامیابی کی منزل تک پہنچانے کے بعد تاجِ برطانیہ کی نظروں میں تمہارا وقار بہت بلند ہو جائے گا اور حکومت نقد رقم کے علاوہ ایک بڑی جاگیر تمہیں انعام کے طور پر دے گی۔ میری ان تمام باتوں کو اچھی طرح ذہن پر نقش کر لو اور آج سے اپنی اس مہم کی تیاریاں شروع کر دو۔"

جنرل ڈوگ اپنا طویل حکم نامہ سنا کر خاموش ہوا تو میری روحانی مسرت اپنے نقطۂ عروج کو چھو رہی تھی۔ میں نے ایک نظر بوڑھے شایار خان کو دیکھا پھر جنرل ڈوگ کی جانب جھکتے ہوئے جواب دیا۔

"جنرل! میں تمہاری توقعات پر پورا اترنے کی ہر ممکن کوشش کر چکا ہوں اور کرتا رہوں گا۔ میں وقت کی اس مصلحت کے سامنے اپنا سر جھکاتے ہوئے شایار خان کے ساتھ اپنی دشمنی اس وقت تک بھول جاؤں گا جب تک میں تمہارے اس حکم پر حرف بہ حرف عمل کر کے اپنی کامیابی کی کوئی ٹھوس ضمانت حاصل نہیں کر لیتا۔ میں شایار خان سے کسی بھی لمحے غفلت نہیں برتوں گا۔ اگر اس نے دیانت داری اور سچائی سے تعاون برقرار رکھا تو ہو سکتا ہے اپنی کامیابی کی خوشی میں میں اپنی یہ توہین بھی معاف کر دوں اور اس کے ساتھ دشمنی ختم کر دوں مگر اس بات کا انحصار اس بات پر ہے کہ یہ کہاں تک سچائی اور دیانت داری سے کام لیتا ہے بصورتِ دیگر اس کا انجام بہت دردناک ہو گا۔"

میں نے جنرل کو مطمئن کرنے کے لیے اپنی پوری لسانی قوت استعمال کر ڈالی تھی۔

میری باتیں سن کر جنرل ڈوگ نے ایک طویل سانس لی اور جب

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوا سگار جلا کر فوجی عدالت کی کارروائی ختم کرنے کا اعلان کرتے ہوئے کہا۔ "شایار خان بدستور جیل کے حکام کی تحویل میں رہے گا۔ تمہیں بوقتِ ضرورت اس سے ملاقات کی اجازت ہے۔ اس کے ساتھ ہی عدالت کی کارروائی ختم کی جاتی ہے اور اجلاس میں شریک حضرات کو اس بات کی تنبیہ کی جاتی ہے کہ وہ سرِعام اس عدالتی کارروائی پر تبصرہ کرنے سے گریز کریں۔"

جنرل کا حکم سن کر سب نے اثبات میں سر ہلائے اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

شایار خان نے اپنے محافظوں کے ساتھ جانے سے قبل میری جانب گہری نظروں سے دیکھا اور زنجیروں کی جھنکار کے ساتھ باوقار انداز میں قدم اٹھاتا اپنے محافظوں کے درمیان گھرا ہوا کمرے سے رخصت ہو گیا۔

آج کی غیر متوقع کامیابی میری زندگی میں ایک انقلاب آفریں تبدیلی کا باعث بن گئی تھی۔ میں اپنے عیار دشمنوں پر اپنا رنگ جمانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اپنے اس منصوبے کو حقیقت کا رنگ دینے کے لیے یہ ضروری ہو گیا تھا کہ اگلا ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھایا جائے اور اپنی اس مہم کی تیاری کے دوران ہر ممکن احتیاط سے کام لیا جائے۔ میری معمولی سی بے احتیاطی اس عظیم کامیابی کو عبرت ناک شکست میں بدل سکتی تھی۔ عدالتی کارروائی کے دوران سارجنٹ فلپ اپنی مشکوک حرکتوں سے یہ ثابت کر چکا تھا کہ اس کا ذہن میری جانب سے صاف نہیں ہے۔ شبہات کی آگ اس کے ذہن کو جھلس رہی تھی جو میرے لیے خطرناک علامت تھی۔ پھر میں نے فیصلہ کیا کہ اگر اب اس نے میرے خلاف کوئی حماقت کرنے کی کوشش کی تو میں اسے سزا دیے بغیر نہیں رہوں گا۔

جب میں جنرل ڈوگ کے دفتر سے نکلا تو بہت خوش تھا۔ میری برسوں کی محنت آج ٹھکانے لگ رہی تھی۔ میں اپنے شیر دل بوڑھے باپ کو فرنگیوں کی قید سے نکالنے میں پہلی کامیابی سے ہمکنار ہو چکا تھا۔ جب میں اپنے کمرے کا دروازہ کھول رہا تھا تو اچانک مانک ٹالر آ گیا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی مسکرا کر بولا۔

"شہباز: کیا کوئی گمشدہ خزانہ مل گیا ہے جو اس قدر خوش دکھائی دیتے ہیں؟"

"ہاں: میں نے مسرت کا اظہار کرتے ہوئے جواب دیا۔ "آج مجھے وہ نایاب شے دوبارہ حاصل ہونے کی امید ہوئی ہے جسے میں گزشتہ اٹھارہ برس سے کھو چکا تھا۔ آج مجھے اپنے خدا کے حضور نذرانۂ شکر ادا کرنا چاہیے۔ جس نے میرے لیے دوبارہ مسرتوں کے دروازے کھول دیے ہیں۔"

مانک ٹالر میری مبہم باتیں سن کر حیرت زدہ ہو گیا مگر اس نے میرے ساتھ خوشی کا اظہار کرنے میں کسی بخل سے کام نہیں لیا۔

"مانک ٹالر! اس مرتبہ میں اپنی مہم میں تمہیں بھی شامل کرنے کا ارادہ کر چکا ہوں کیونکہ تم کافی سوجھ بوجھ سے کام لینے کے عادی ہو۔ تمہاری اسی احتیاط پسندی نے مجھے اس بات پر مجبور کر دیا ہے کہ میں تمہیں بھی اپنی زندگی کی سب سے مشکل مہم میں شمولیت کی دعوت دوں۔ اس طرح تمہارا وہ دیرینہ مطالبہ بھی پورا ہو جائے گا۔ میں تمہیں اپنی مہم میں ایک خاص حیثیت دوں گا۔ مہم کے دوران میرے بعد یہ تمہاری ذمے داری ہو گی کہ بوڑھے شایار خان کو ایک لمحے کے لیے بھی اپنی آنکھوں سے اوجھل ہونے کا موقع نہ دینا۔ تمہیں اس کی نگرانی کرتے وقت بہت محتاط رہنا ہو گا۔ اسے یہ احساس تک نہیں ہونا چاہیے کہ تم خفیہ طور پر اس کی حرکات و سکنات پر اپنی گہری نظریں رکھے ہوئے ہو۔"

"اگر دیوتاؤں نے چاہا تو میں تمہارے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہا دینے سے بھی دریغ نہیں کروں گا۔ اگر اس نے میرے سامنے فرار ہونے کی کوشش کی تو میں اسے دونوں ٹانگوں سے محروم کر دوں گا تاکہ زندگی بھر اپنے قدموں سے چلنے کے قابل نہ رہے۔" مانک ٹالر نے فخر سے اپنا سینہ پھلاتے ہوئے مستقبل کے ارادوں کو ظاہر کیا۔

"مجھے یقین ہے کہ ایسی نوبت نہیں آئے گی کہ تمہیں اپنے ہتھیار استعمال کرنے کی ضرورت محسوس ہو۔ اس کے علاوہ تمہیں اس کے خفیہ محافظ کا کردار ادا کرنا ہو گا۔ تمہاری ہر ممکن کوشش یہ ہونی چاہیے کہ بے خبری کے عالم میں اسے کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔ البتہ اس پر حملہ کرنے والے کو تم بے دریغ موت کے گھاٹ اتار سکتے ہو۔ خواہ وہ اپنے عہدے اور مرتبے کے اعتبار سے کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو۔"

مانک ٹالر نے میری ان ہدایات کو بڑے غور سے سنا اور اس پر عمل کرنے کا یقین دلاتے ہوئے کہا۔

"تمہاری ہر بات میں نے اچھی طرح ذہن نشین کر لی ہے شہباز۔ تم چاہتے ہو کہ شایار خان فرار ہونے میں کامیاب نہ ہو اور کوئی دوسرا بھی اس پر اچانک حملہ کر کے اسے کوئی نقصان نہ پہنچانے پائے۔"

"تم ٹھیک سمجھے ہو مانک ٹالر!" میں نے خلا میں گھورتے ہوئے جواب دیا۔ "اس کی زندگی کی حفاظت تمہارا اولین فرض ہو گا اور یاد رکھو! اگر اسے کوئی نقصان پہنچ گیا تو پھر میں بھی زندہ نہیں رہوں گا۔ تم نہیں جانتے ہو کہ اس کی زندگی میری ذات کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے کس قدر اہم ہے اور میں بار بار کیوں اس کی حفاظت کے مرکزی نقطے پر زور دے رہا ہوں۔"

دانک تا لے نے پُرخلوص سے اپنے بھرپور تعاون کا یقین دلایا اور رخصت ہو گیا۔

●

میرے خیالوں کی رَو ایک بار پھر اپنے شیر دل باپ کی طرف چلی گئی۔ آج کی عدالتی کارروائی نے اُس کے دل و دماغ پر کیا اثرات مرتب کیے ہوں گے؟ آج کا عدالتی اجلاس جس انداز میں اختتام پذیر ہوا تھا، اُس نے شاناپار خان کو یقیناً اُلجھن میں ڈال دیا ہو گا۔ اس وقت اُس کی اُلجھن دو چند ہو گئی ہو گی جب جنرل ڈوگ نے مُہم کی سربراہی مجھے سونپتے ہوئے شاناپار خان کو میری تحویل میں دینے کا حکم سُنایا تھا۔ اٹھارہ برسوں کے دوران اُس نے اپنے جسم و رُوح پر جو اذیتیں برداشت کی تھیں، اُن کا ازالہ ہونا ممکن نہیں تھا کیوں کہ ماضی کی دہلیز پر اپنا سر پھوڑنے سے کچھ حاصل ہونے کی توقع نہیں ہوتی۔

میرا دل چاہا کہ میں تنہائی میں اپنے باپ سے کچھ دیر گفتگو کر کے مستقبل کے بارے میں اس کے خیالات معلوم کروں۔ اس کے لیے ضروری نہیں تھا کہ میں ابھی سے اُس کے سامنے کُھل کر آ جاتا اور یہ راز فاش کر دیتا کہ میرے اور اُس کے درمیان ایک ابدی اور لافانی رشتہ ہے۔ مُہم کا سربراہ ہونے کی حیثیت سے میں اُس سے مشورہ کرنے کے لیے ہر وقت آزاد تھا۔ رات کے کھانے کے بعد میں میجر نیلسن سے ملا اور اُسے ساتھ لے کر اُس قید خانے میں پہنچ گیا جہاں فرنٹیئر کے خطرناک قیدی رکھے جاتے تھے۔ میجر نیلسن جیل کے محافظوں کو جنرل ڈوگ کی تازہ ہدایات سے آگاہ کرنے کے بعد رخصت ہو گیا تب میں نے شاناپار خان کی کوٹھری کا دروازہ کھول کر اُس محافظ کو بھی رخصت کر دیا جو وہاں تک میرے ساتھ آیا تھا۔ اُسے میں نے رخصت کرتے وقت خاص طور سے یہ ہدایت کر دی تھی کہ جب تک میں خود آواز دے کر کوٹھری میں آنے کا حکم نہ دوں وہ ہماری گفتگو میں مُخل ہونے کی کوشش نہ کرے۔

وہ میری ہر لحظہ بدلتی ہوئی شخصیت سے خاصا متاثر نظر آ رہا تھا۔ اُس نے پورے خلوص سے اس بات کا یقین دلایا کہ وہ میری ہدایات پر حرف بہ حرف عمل کرے گا۔ جب تک وہ موڑ سے گھوم کر آنکھوں سے اوجھل نہیں ہو گیا، میں کوٹھری کے دروازے کے باہر کھڑا رہا۔ اُس کے جاتے ہی میں نے مشعل کی روشنی کے ساتھ کوٹھری کا دروازہ کھولا اور اندر قدم رکھ دیا۔

مشعل کی مدھم روشنی میں میری نظریں سب سے پہلے اپنے باپ کی آنکھوں سے ٹکرائیں جو حیرت اور اُلجھن کی تصویر بنی مجھے دیکھ رہی تھیں۔

میں اُس کے قریب پہنچ کر رُک گیا تاکہ اس کے تاثرات کا اندازہ لگا سکوں کہ میرا استقبال کس انداز میں کرنا چاہتا ہے۔ ابھی تک مجھے یہ فوقیت حاصل تھی کہ میں اس راز سے آگاہ تھا کہ وہ میرا باپ ہے جب کہ وہ اس بات سے بالکل بے خبر تھا کہ میرے اور اُس کے درمیان باپ بیٹے کا رشتہ ہے۔۔۔ اور پھر آج کی فوجی عدالت کی کارروائی کے دوران ہم دونوں ایک دوسرے کو اپنا دشمن قرار دے چکے تھے مگر اب صورتِ حال بدل چکی تھی اور اس صورتِ حال کا تقاضا تھا کہ میں اپنے شیر دل باپ شاناپار خان پر اپنے رشتے کا انکشاف کیے بغیر اُسے قائل کرنے کی کوشش کروں کہ اس مُہم کی کامیابی ہی اُس کی آزاد زندگی کی ضمانت بن سکتی ہے۔

"شاناپار خان!" میں نے اس خاموشی کا گمبھیر جال توڑتے ہوئے کہا۔ "جب دو دشمن مل کر کسی دُور دراز علاقے کا سفر کرنے پر مجبور ہو جائیں تو وہ اپنی دشمنیوں کو وقتی دوستی میں بدل دیتے ہیں۔ اُن کے درمیان ایک عارضی امن کا دروازہ کُھل جاتا ہے اور وہ اپنے اختلافات اُس وقت تک بالائے طاق رکھ دیتے ہیں جب تک اس سفر سے لوٹ کر نہیں آ جاتے۔ سفر کے دوران وہ ایک دوسرے کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بجائے، ایک دوسرے کی زندگی کے محافظ بن جاتے ہیں۔"

میں اپنی باتوں کا اثر دیکھنے کے لیے کچھ دیر خاموش رہا تو اُس نے زنجیروں کی جھنکار کے ساتھ اپنا ایک ہاتھ فضا میں بلند کیا اور مجھ پر گہری نظریں ڈالتے ہوئے بولا۔

"نوجوان! کئی برس کی طویل قید کے دوران یہ پہلا موقع ہے کہ کوئی انسان اپنے کسی محافظ کو ساتھ لیے بغیر میری کوٹھری میں آنے کی جرأت کر سکا ہو۔ کیا تم زندگی سے اس قدر اُکتا گئے ہو کہ مجھے اپنا دشمن قرار دینے کے باوجود میرے پاس تنہا آئے ہو۔ تمھارے بارے میں سوچتے ہوئے مجھے خاصی اُلجھن ہو رہی ہے۔"

بوڑھے شاناپار خان کی آواز میں خوفناک گرج تھی جو میرے اعصاب پر اثر انداز ہونے لگی۔

"خان بابا!" میں نے اپنے لہجے میں نرمی پیدا کرتے ہوئے جواب دیا۔ "میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اس مُہم سے فارغ ہونے

کے بعد اس کا موقع ضرور دوں گا کہ تم میرے بارے میں کوئی فیصلہ کُن رویّہ اختیار کر سکو۔ اس وقت میں صرف یہ کہنے آیا ہوں کہ مُہم کے دوران اگر تم اپنے مشتعل مزاج اور تلخی پر قابو پانے میں کامیاب رہے تو میں تمھیں رہائی دلانے کے لیے جنرل ڈوگ سے پُرزور سفارش کروں گا۔ اگر تمھیں اپنا آزاد مستقبل عزیز ہے تو تمھیں میرے ساتھ مکمل تعاون کرنا ہو گا۔"

"نوجوان! شاید تم اس بات سے آگاہ نہیں ہو کہ کسی قیدی کا کوئی مستقبل نہیں ہوتا۔"

بوڑھے شاناپار خان نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ اپنے باپ کو دُکھی اور غم زدہ محسوس کر کے میرا دل تڑپ اُٹھا۔ اس کے اس مختصر جواب میں معنویت کا ایک سمندر موجزن تھا جو اُس کی ذہنی اذیتوں کا عکاس تھا۔ میں خاموشی سے کچھ دیر اس کی باتوں کی پرتیں کھولتا رہا جس نے میرے بوڑھے باپ کے جسم کو زخمی اور رُوح کو نڈھال کر رکھا تھا۔ چند لمحے ہم دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے گھورتے رہے۔

"دشمنی کی ابتدا کر کے تعاون کی خواہش رکھنا، مجھے بہت عجیب سا سوال محسوس ہو رہا ہے۔ کیا تم اس بات کی وضاحت نہیں کر سکتے کہ تمھیں کس نوعیت کا تعاون درکار ہے؟" بوڑھے شاناپار خان نے خلا میں گھورتے ہوئے سوال کیا۔

"اگر تم اس بات کا یقین دلاؤ کہ مُہم پر روانہ ہونے کے بعد دورانِ سفر کوئی ایسی ویسی حرکت نہیں کرو گے جو قافلے کو نقصان پہنچانے کا سبب بن سکتی ہو تو دورانِ سفر تمھارے بدن سے لپٹی ہوئی زنجیریں اُتار لی جائیں گی تاکہ تمھیں گھوڑے پر بیٹھ کر سفر کرنے میں کوئی دشواری نہ پیش آئے مگر ایسا اُس وقت ہو گا جب ہمارا قافلہ چھاؤنی کی حدود پار کر جائے گا اور میں اس مُہم کا مکمل سربراہ بن جاؤں گا۔ چھاؤنی کی حدود میں جنرل کا حکم چلتا ہے اور یہاں میرے پاس اتنا اختیار نہیں ہے کہ میں اپنے ذاتی فیصلوں کو نافذ کر سکوں۔ میری باتیں گہری توجہ سے سمجھنے کی کوشش کرو۔ اس طرح تمھاری عزتِ نفس مجروح ہونے کا احتمال ختم ہو جائے گا اور تم احساسِ کمتری میں مبتلا ہونے سے بچ جاؤ گے۔ میں تمھیں ایک بہادر اور دلیر انسان سمجھتا ہوں۔ تم ایک پختہ عمر کے باشعور اور تجربے کار انسان ہو۔ میری ان باتوں پر غور کر کے مجھے جواب دو کہ کیا تم یہ نہیں چاہتے کہ تمھارے مستقبل کے خلاف چھایا ہوا دبیز کُہر چھٹ جائے اور تم آزادی کی سنسنی گنگناتی ہوئی صبح کی لطیف ہواؤں کے رازدار بن جاؤ۔"

میری باتیں سُن کر بوڑھا شاناپار خان بے اختیار مسکرانے لگا اور چند لمحوں کے لیے اُس کے پتھریلے چہرے پر چھائی ہوئی سنجیدگی کی گہری تہ اچانک دُھندلا گئی اور وہ مکمل طور پر انسان نظر آنے لگا۔

"نوجوان! تمھاری باتیں مجھے بہت عجیب لگ رہی ہیں۔ تم نے ایک سپاہی ہونے کے باوجود جس شاعرانہ انداز میں مجھے آزادی کا خوبصورت باغ دکھایا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تم نے اپنے پیشے کا انتخاب کرنے میں اپنے ذوق کو ملحوظِ خاطر نہیں رکھا۔ تمھیں ایک سپاہی کی بجائے شاعر ہونا چاہیے تھا جو اپنی دل شکستہ قوم کو مستقبل کے خوبصورت اور انوکھے خواب دکھانے کا کام انجام دے سکتا۔" اس کی پاٹ دار آواز میں ایک خوشگوار احساس جھلک اُٹھا تھا۔

"خان بابا! میری باتوں پر سنجیدگی سے غور کرو اور ان پر عمل کرنے کا یقین دلاؤ تاکہ میں تمھاری طرف سے مطمئن ہو کر اس مُہم کی تیاریوں میں مشغول ہو جاؤں۔" میں نے سنجیدگی سے اپنی باتوں پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"نوجوان! تم ایک فراخ دل دشمن معلوم ہوتے ہو، میں تمھیں یقین دلاتا ہوں کہ میں اُس وقت تک کسی پر ہاتھ نہیں اُٹھاؤں گا جب تک کوئی خود میرے ساتھ چھیڑ چھاڑ نہیں کرتا۔۔۔ اور اگر دورانِ سفر کسی نے مجھے قیدی سمجھ کر میری غیرت کو للکارنے کی ادنیٰ سی بھی کوشش کی تو پھر میں اپنے ہاتھ استعمال کرنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔ سفر کے دوران اپنے فرنگی ساتھیوں کو سمجھا

اے حمید
کے ایڈونچرس قلم سے
گنگا کے
پجاری ناگ
دو جلدوں میں
جلد اول =/150
جلد دوم =/200
مکتبہ القریش سرکلر روڈ اردو بازار لاہور
فون 7668958

سے دُور رکھنا انھیں دیکھ کر میرے حواس رُخصت ہو جاتے ہیں اور میرے سینے میں انتقام کا جہنم روشن ہو جاتا ہے۔"

"خان بابا! میں اس بات کا خاص خیال رکھوں گا کہ کوئی ایسی ناخوشگوار بات نہ ہونے پائے جو تمھارے غصّے کی آگ کو بھڑکانے کا سبب بنے۔ مگر تم خود بھی اپنے آپ پر قابو رکھنا۔"

جب میں شالیار خان کی کوٹھری سے نکلا تو میری ذہنی حالت بہت عجیب ہو رہی تھی۔ شالیار خان نے مجھ سے وعدہ کر لیا تھا کہ دورانِ سفر وہ قافلے کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا ... اور مکمل تعاون کرے گا مگر ایک بات کا خدشہ ضرور تھا کہ اگر اُس نے ایک مرتبہ فرار ہونے کا ارادہ کر لیا تو پھر دُنیا کی کوئی طاقت اس کے پاؤں میں دوبارہ زنجیریں ڈالنے میں کامیاب نہیں ہو سکے گی اور میں اس پر کسی بات کا انکشاف کیے بغیر دوبارہ جُدائی کے خوفناک جنگل میں بھٹکنے کے لیے تنہا ہی رہ جاؤں گا۔

اس قسم کے سینکڑوں خدشات تھے جو تمام رات میرے دل اور دماغ کو گھیرے رہے۔

رات کو دیر تک جاگتے رہنے کی وجہ سے صبح میری آنکھ دیر سے کھلی۔ ضروریات سے فراغت پاتے ہی میں نے اپنے منصوبے کے مطابق جنرل ڈوگ کے دفتر کا رُخ کیا اور اس کے ہاتھوں میں اپنی مطلوبہ اشیا کی فہرست تھما دی اور یہ مطالبہ کیا کہ تمام تیاریاں اگلے روز شام تک مکمل ہو جانی چاہئیں تاکہ تیسرے روز سُورج طلوع ہوتے ہی ہم اپنی مُہم پر روانہ ہو جائیں۔

"تمھاری مطلوبہ اشیا آج شام تک مہیا کر دی جائیں گی۔ مگر اپنے ساتھیوں کا انتخاب تمھیں خود ہی کرنا پڑے گا کیونکہ میں اس خطرناک مُہم کو ناکام ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ تاجِ برطانیہ کو اس وقت سونے کی شدید ضرورت ہے اور یہ ضرورت وہ گُم شُدہ خزانہ ہی پوری کر سکتا ہے۔ میرا خیال ہے اب تمھیں کسی نصیحت کی ضرورت نہیں ہے تم موقعے کی مناسبت سے کوئی بھی فیصلہ کرنے کے مجاز ہو۔ تمھیں شالیار خان کی طرف سے بے حد چوکنّا اور ہوشیار رہنا پڑے گا۔ یہ بپھرا ہُوا وحشی اگر ایک بار تمھارے ہاتھوں سے نکل گیا تو حکومتِ برطانیہ کے لیے بہت سی مشکلات پیدا کر سکتا ہے۔ تم اس کے ہاتھوں ہونے والے نقصان کا اندازہ ابھی سے نہیں لگا سکتے۔"

جنرل ڈوگ کی باتوں میں خاصا وزن تھا۔

"میں اس بپھرے ہُوئے وحشی کو سیدھا کرنے کی قوت رکھتا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ "مگر میری یہ حتی الامکان کوشش ہو گی کہ مجھے اپنی صلاحیتوں کو آزمانے کی ضرورت پیش نہ آئے اور اس سفر کے دوران کوئی ایسا ناخوشگوار واقعہ نہ پیش آئے جو ہماری کامیابی پر اثر انداز ہو سکے۔"

میرا جواب سُن کر جنرل ڈوگ بہت پُرجوش نظر آنے لگا۔ وہ سگار کا کش لے کر اپنے حلق سے کثیف دُھواں خارج کرتے ہُوئے بولا۔

"میری بہترین تمنّائیں تمھارے ساتھ ہیں کیوں کہ تم تاجِ برطانیہ کے لیے عظیم خدمات انجام دینے جا رہے ہو۔ جہاں تمھارا خوبصورت وجود گوشت کے ایک بے جان لوتھڑے میں بھی تبدیل ہو سکتا ہے۔ تم مہذب معاشرے سے نکل کر وحشی درندوں کی سرزمین کی طرف جا رہے ہو۔ جہاں ہر قدم پر سینکڑوں خطرات پیش آ سکتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ تم اپنی ذاتی کوششوں سے حوصلہ افزا نتائج برآمد کرنے میں کامیاب ہو جاؤ گے ورنہ تمھاری ناکامی تاجِ برطانیہ کی ناکامی کہلائے گی۔"

میں اس بات پر بہت خوش تھا کہ یہ سنگدل اور عیار حریف میرے ارادوں کو بھانپنے میں ناکام رہا ہے اور مجھ پر بے پناہ اعتماد کا اظہار کر رہا ہے۔

اس کے دفتر سے رُخصت ہو کر میرے سامنے اب ان جوانوں کے انتخاب کا مسئلہ تھا جو آزمودہ اور تجربہ کار جنگجو ہوں۔ نیز ہر قسم کے خطرات سے نمٹنے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہوں۔ ویسے میرا اصل منصوبہ کچھ اور ہی تھا۔ میں بگولا سنگھ سے نمٹنے کے بعد اُن لوگوں کا معاملہ بھی نمٹانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ مگر یہ سب کچھ اُسی وقت ہوتا جب میری مُہم اپنے اختتامی حصّے تک پہنچ جاتی اور مجھے اُن لوگوں کی کوئی ضرورت باقی نہ رہ جاتی۔ اس طرح میں اپنے باپ کے ساتھ خزانے پر قبضہ کر کے اپنے قبیلے کی طرف لوٹ جانا چاہتا تھا۔

میں نے سارجنٹ آرٹ کو اپنا نائب منتخب کیا اور اس کے ساتھ مل کر بیس جوانوں کا انتخاب کرنے کے بعد انھیں ایک دن کی مُہلت دے دی کہ وہ سفر پر روانہ ہونے سے پہلے مکمل تیاری کر سکیں۔

اس طرح سفر شروع کرنے سے قبل سارے مسائل ایک ایک کر کے حل کر لیے گئے۔

تیسرے روز چوبیس آدمیوں کا قافلہ سُورج طلوع ہونے کے ساتھ ہی وادیٔ فرغان کی طرف اپنے سفر کا آغاز کر چکا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چھاؤنی کی حدود سے باہر آتے ہی میں نے اپنا گھوڑا روکا اور اُس گھوڑا گاڑی کی طرف پلٹ کر چل پڑا جس میں میرا باپ زنجیروں میں جکڑا ہُوا ہماری تحویل میں سفر کر رہا تھا۔ میں نے گاڑی روکنے کا حکم دیا اور گھوڑے سے اُتر کر گاڑی پر کُود گیا اور پھر اپنے طاقت ور ہاتھوں سے اُس کی زنجیروں کے قفل کھولتے ہُوئے اُس کا جسم بھاری زنجیروں سے آزاد کر دیا۔

شالیار خان بھاری زنجیروں سے آزاد ہو کر چند لمحے اپنے جسم کے مختلف اعضا کو حرکت دیتا رہا پھر اپنے ایک ہاتھ سے لہراتی ہُوئی سفید داڑھی میں انگلیوں سے کنگھی کرتے ہُوئے مجھے گہری نظروں سے دیکھنے لگا۔

"شالیار خان! میں نے اپنا وعدہ پُورا کرتے ہُوئے تمھارا وجود بھاری زنجیروں سے آزاد کر دیا ہے۔ اب تم بھی اپنا وعدہ یاد رکھنا اور مجھے اپنے ساتھیوں کے سامنے شرمندہ ہونے کا موقع نہ دینا۔"

"مجھے اپنا وعدہ یاد ہے۔" اُس نے بھاری آواز میں جواب دیا۔ "مگر تم بھی اپنے ساتھیوں کو تلقین کر دینا کہ وہ مجھ سے دُور رہیں اور میرے ساتھ کوئی بے ہودہ مذاق نہ کریں ورنہ میرے انتقام کی آگ اچانک ہی بھڑک اُٹھے گی اور مجھے خود پر قابو نہیں رہے گا۔"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا اور گاڑی سے دوبارہ اپنے گھوڑے پر کُود گیا۔

قافلہ آہستہ روی سے دوبارہ چل پڑا۔

شام ہونے تک ہم اس گھوڑا گاڑی کی کڑی نگرانی جاری رکھتے ہُوئے سفر کرتے رہے۔ شالیار خان نے اپنے وعدہ کی مکمل پابندی کی تھی اُس نے ایک بار بھی چلتی گاڑی سے باہر جھانکنے کی کوشش نہیں کی۔

شام کے سائے پھیلنے سے پہلے پہلے ہم نے اندازاً بیس کوس سفر کر لیا تھا۔ اب ہم گھنے جنگل سے گزر رہے تھے جب اندھیرا گہرا ہونے لگا تو میں نے درختوں کے درمیان قافلے کو رُکنے کا حکم جاری کیا اور پڑاؤ ڈال دیا۔

پڑاؤ ڈالتے ہی جوگندر سنگھ اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر گھوڑوں کو چارہ ڈالنے میں مشغول ہو گیا۔ سارجنٹ آرٹ اپنے فرنگی ساتھیوں کی مدد سے خیمے نصب کرنے لگا، کچھ لوگوں نے درختوں کی سُوکھی ہُوئی لکڑیاں اکٹھی کیں اور آگ روشن کر کے کھانا تیار کرنا شروع کر دیا۔

خیمے نصب ہوتے ہی میں نے ایک خیمہ شالیار خان کے لیے مخصوص کر دیا اور اس کے ساتھ والا خیمہ اپنے لیے منتخب کر لیا۔ کھانے کے بعد قہوے کا دَور چلا اور قافلے کے لوگ ٹولیوں میں بٹ کر باتوں میں مصروف ہو گئے۔ قہوہ پینے کے بعد میں اپنے خیمے میں داخل ہو رہا تھا کہ مانک ٹالہ کو نگرانی کے سلسلے میں مستعد پا کر اُسے ہاتھ کے اشارے سے اپنے پاس بُلا لیا۔

"مانک ٹالہ!" میں نے خیمے کے اندر ایک تہ ہو جانے والی کُرسی کھول کر اُس پر بیٹھتے ہُوئے کہا۔ "تمھارے اس قیدی کا کیا رنگ ڈھنگ ہے؟ کیا وہ رات بھر اسی طرح صبر و سکون سے گزار دے گا؟ یا کسی اچانک ہنگامے کے آثار متوقع ہیں تم نے دن بھر اُس کی حرکات و سکنات سے یہ بخوبی اندازہ لگا لیا ہو گا کہ وہ کیا ارادے کر رہا ہے؟"

مانک ٹالہ میرا سوال سُن کر عجیب سے انداز میں مُسکرایا اور بولا۔ "شہباز خان! ہر شخص کی یہ فطری خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنے دُشمنوں سے مکمل طور پر رہائی حاصل کر لے۔ اُس نے آج سالہا سال بعد سُورج کی آزاد کرنوں سے اپنی آنکھوں کو روشن کیا ہے۔ وہ ہر شے کو بڑے غور سے دیکھتا ہے اور ماحول کی خوبصورتی دیکھ کر اچانک اُداس ہو جاتا ہے۔ ہر وقت اُس کے چہرے پر ایک غمناک اُداسی کی گہری تہ چڑھی رہتی ہے جیسے کوئی انسان اپنی متاعِ حیات سے محروم ہونے کے بعد بے بسی کے احساس میں مُبتلا ہو۔"

مانک ٹالہ کا یہ فلسفیانہ تجزیہ سُن کر میں چونک اُٹھا اور اپنے باپ کی ذہنی حالت جان کر میرے وجود میں غم و اندوہ کی آندھیاں سی چلنے لگیں۔ یوں محسوس ہُوا جیسے میرے اندر کا انسان زخموں سے چُور چُور ہو کر بے اختیار کراہنے پر مجبور ہو گیا ہو۔ دل و دماغ چند لمحے ایک عجیب سے حشر خیز ہنگامے سے دوچار [illegible] میں نے مانک ٹالہ کی جانب جھکتے ہُوئے سرگوشی میں کہا۔

"مانک ٹالہ! اب تک تمھاری کارکردگی بہت شاندار ہے۔ میں تمھیں تمھاری اس کڑی مشقت کا پھل ضرور دُوں گا کیونکہ تم میرے لیے ایک عظیم خدمت انجام دے رہے ہو۔ جاؤ اور سارجنٹ آرٹ [illegible] فرنگی ساتھیوں سے خاص طور پر ہوشیار رہنا کہ وہ شالیار خان کے ساتھ کوئی چھیڑ چھاڑ نہ کرنے پائیں۔"

مانک ٹالہ میرا جواب سُن کر سنجیدہ ہو گیا اور [illegible] میں سر ہلاتے ہُوئے بولا۔ "کسی معاوضے کا ذکر کر کے میری [illegible] لالچ کے زہر سے آلودہ نہ کریں۔ میں پہلے بھی یہ بات [illegible]

کہہ چکا ہوں کہ مَیں تمھاری ذات سے گہری عقیدت رکھتا ہوں اور مجھے تمھارا کوئی معمولی سا کام بھی انجام دیتے ہوئے روحانی مسرت حاصل ہوتی ہے۔ براہِ کرم کسی معاوضے کا لالچ دے کر مجھے اس خوشی سے محروم نہ کرو۔"

"ٹھیک ہے مانک!" مَیں نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ "اب تم سارجنٹ آرٹ کے ساتھ مل کر شالیار خان کو دوبارہ زنجیریں پہنا دو تاکہ اُس کے فرار کے ظاہری امکانات ختم ہو جائیں۔"

اُس کے جانے کے بعد مَیں نے اُٹھ کر چاقو کی نوک سے خیمے کا پردہ چیر دیا تاکہ اس جھری سے شالیار خان کی نقل و حرکت پر نگاہ رکھ سکوں۔ مجھے اس کے وجود پر دوبارہ غلامی کی زنجیریں پہنانے کا حکم دیتے ہوئے انتہائی دُکھ ہو رہا تھا مگر مَیں مجبور تھا کہ اس کے فرار کے سارے راستے مسدود کر دوں۔ اگر مَیں ایسا نہ کرتا تو پڑاؤ کے دوسرے لوگوں کو اس بات کا موقع ملنے کے امکانات تھے کہ وہ شالیار خان کو دیکھتے ہی گولی مار دیں۔ اس کے علاوہ اس بات کی بھی توقع کی جا سکتی تھی کہ کچھ لوگ جنرل زورآور سنگھ کے حکم پر ہمارے نقشِ پا پر چلتے ہوئے ہمارے پیچھے آ رہے ہوں اور پڑاؤ کی کڑی نگرانی کر رہے ہوں۔ کوئی خطرہ مول لینے سے یہ کہیں بہتر تھا کہ کچھ دنوں کے لیے اپنے اندر رُوح میں اُٹھنے والے دُھوئیں کو نظر انداز کر دیا جائے اور معاملات کو جذباتی سطح پر جانچا اور پرکھا جائے اور پھر اپنے طے شدہ لائحہ عمل کے تحت ہر کام انجام دیا جائے۔ مگر جذباتی کمزوریاں انسان کا ایک ازلی اور ابدی رشتہ ہیں۔ ان سے مکمل انصاف کرنے کے لیے انسان کو پتھر کا دل اور فولاد کے کلیجے کی ضرورت ہوتی ہے۔

اپنے باپ کو زنجیریں پہنانے کا حکم دیتے ہوئے میرے دل و دماغ جذبات کی آندھیوں کی زد میں آ گئے تھے ساتھ والے خیمے سے زنجیروں کی جھنکار بلند ہوئی تو مَیں تکلیف دہ خیالات کے نرغے سے نکل کر حقائق کی دُنیا میں واپس آ گیا۔

مَیں شگاف سے شالیار خان کے خیمے میں جھانکنے لگا۔

سارجنٹ آرٹ زنجیریں پہنانے کے بعد خاموشی سے اُس کے خیمے سے نکل کر میرے خیمے میں آ گیا تو بے حد سنجیدہ تھا۔ "قیدی نے زنجیریں پہنتے وقت کوئی مزاحمت تو نہیں کی؟" مَیں نے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے اس سے سوال کیا۔

"نہیں!" وہ دھیمی آواز میں بولا۔

"پھر تمھارا چہرہ کیوں بجھا بجھا نظر آ رہا ہے؟ تمھارے چہرے پر گہری اُلجھن کے آثار نظر آ رہے ہیں۔ آخر اس کی کوئی وجہ تو ضرور ہو گی؟" میری سوالیہ نظریں اُس کی طرف اُٹھی ہوئی تھیں۔

"میک اور راجر اس وقت شراب کے نشے میں اندھے ہو رہے ہیں اور ضابطوں کی پروا کیے بغیر کوئی ہنگامہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اُن سے بک بک جھک جھک کرتے ہوئے مجھے غصہ آ گیا۔"

سارجنٹ آرٹ کی اس اطلاع نے اُن خطرناک اندیشوں کی تصدیق کر دی تھی جن کا مجھے پہلے ہی سے دھڑکا لگا ہوا تھا۔ مَیں جانتا تھا کہ فرنگی بڑی ہی متعصب اور قوم پرست قوم ہے۔ ان لوگوں نے شالیار خان کی آزادی کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا تھا اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اس متوقع ہنگامے کے پیچھے سارجنٹ فلپ کا خطرناک ذہن کام کر رہا ہو اور اس نے کچھ لوگوں کو شالیار خان پر حملہ کرنے کے لیے اُکسایا ہو...

"تم نے اُن کے ارادے جان کر پیش بندی کے طور پر کیا اقدامات کیے ہیں؟" مَیں نے اُسے تشویش سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"مَیں نے اُن کی بوتلیں چھین کر شراب بہا دی ہے اور دونوں کو ایک درخت سے باندھ دیا ہے۔ دوسرے لوگوں کو بھی اس بات کی تنبیہہ کر دی ہے کہ کوئی میری اجازت کے بغیر انھیں آزاد نہ کرے۔"

"کچھ اس بات کی بھی خبر ہے کہ وہ کیا ہنگامہ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے؟" مَیں ابھی تک اس کے جواب سے مطمئن نہیں ہُوا تھا۔ "اگر یہی صُورتِ حال رہی تو ہم کب تک ان کی نگرانی کر سکیں گے؟ اُن کی معمولی سی شرارت ہماری مُہم کی کامیابی اور کارکردگی کو مفلوج کر سکتی ہے۔ ہمیں اس صُورتِ حال سے جلد از جلد چھٹکارہ حاصل کرنا ہو گا۔ میرا خیال ہے اگر انھیں واپس بھیج دیا جائے تو ہماری مجموعی طاقت پر کوئی خاص اثر نہیں پڑے گا۔ انھیں کوئی سزا دینے سے کہیں بہتر ہو گا کہ انھیں جنرل کے سامنے پیش کر دیا جائے؟"

"تمھاری بات میں خاصا وزن ہے... مگر ابھی صُورتِ حال اس قدر خراب نہیں ہوئی کہ انھیں واپس بھیج دیا جائے۔ شراب کا نشہ اُترنے کے بعد جب انھیں اس بات کا احساس ہو گا کہ اُن کی معمولی سی شرارت اُن کے لیے موت کا دہانہ کھول سکتی ہے مَیں قوم پرستی کے جنون میں مبتلا ہو کر انھیں سزا دینے میں کوئی کوتاہی نہیں کروں گا۔ ضابطے کی پابندی سب پر یکساں عائد

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوتی ہے خواہ کوئی کسی بھی نسل اور قوم سے تعلق کیوں نہ رکھتا ہو۔"

"سارجنٹ!" مَیں نے لہجے میں نرمی پیدا کرتے ہوئے جواب دیا۔ "ابھی تک تمھاری کارکردگی انتہائی شاندار رہی ہے۔ مگر اس مُہم پر تم نے اپنے ساتھی منتخب کرنے میں غلطی کی ہے مَیں خود بھی کچھ نہیں کہوں گا۔ مجھے یہ ڈر ہے کہ انھیں شرارت پر آمادہ پا کر مجھے غصہ آ جائے گا اور مَیں ضابطہ توڑنے کے جرم میں موت سے کم سزا دیے بغیر نہیں رہوں گا۔"

"اگر واقعی مجھے اس مُہم کے لیے خطرناک نظر آئے تو تمھارے طاقتور ہاتھوں کا سہارا نہیں لوں گا بلکہ انھیں خود ہی جہنم رسید کر دوں گا مگر غالب امکان یہی ہے کہ وہ سیدھے ہو جائیں گے اور ہمیں اُن کے لیے کوئی سزا تجویز نہیں کرنا پڑے گی۔"

سارجنٹ آرٹ مجھے بے انتہا سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔

اُس کے جانے کے بعد مَیں پڑاؤ کا جائزہ لینے کے لیے خیمے سے نکل آیا۔

پتھریلی زمین پر آگ روشن تھی اور جوگندر سنگھ اپنے ساتھیوں کے درمیان گھرا ہُوا کوئی انتہائی پُرلطف داستان بیان کر رہا تھا۔ مَیں نے اُن کی محفل نظر انداز کر دی اور اُس طرف نکل آیا جہاں موہن داس اور گپتا گھوڑا گاڑی کی نگرانی کر رہے تھے۔ مجھے اچانک اپنے سامنے پا کر وہ چونکے پھر مُسکراتی ہُوئی نظروں سے دیکھنے لگے۔

"موہن داس!" مَیں نے اپنی رائفل کی نال پتھریلی زمین پر ٹکاتے ہوئے کہا۔ "تم دونوں جا کر میک اور راجر کی نگرانی کرو۔ نشے میں مدہوش ہو کر کوئی بھی گڑبڑ کر سکتے ہیں۔"

"مگر کیا اس طرح ان کے دوسرے ساتھی ہم سے ناراض نہیں ہو جائیں گے؟" اُس کے لہجے میں نسلی احساسِ کمتری شامل ہو گئی۔

"اگر انھوں نے مداخلت کی کوشش کی تو تمھیں اس بات کا حق ہو گا کہ انھیں جہنم کی سرزمین کی طرف باجماعت روانہ کر دو۔ اور مجھے آ کر اس کی اطلاع دے دو۔" مَیں نے سخت لہجے میں حکم دیتے ہوئے کہا۔

دونوں نے ایک لمحے کے لیے حیرت سے میری طرف دیکھا پھر اپنی رائفلیں سنبھالتے ہوئے اُس طرف چلے گئے جہاں میک اور راجر بندھے ہوئے تھے۔ مَیں اپنا دورہ مکمل کر کے دوبارہ خیمے میں آ گیا اور سونے کی تیاریاں کرنے لگا۔

لاڈو

قمراجنالوی قیمت:=/90

سونے سے پہلے مَیں نے شالیار خان کے خیمے میں جھانک کر دیکھا۔ وہ لالٹین کی مدھم روشنی میں بیٹھا خلا میں نظریں جمائے کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہُوا تھا۔ اُس کے چہرے پر پھیلے شکنوں کا بکھرا ہُوا جال اُس کے انتہائی دُکھ کا غماز تھا۔ مَیں نے اُسے خاموش اور افسردہ پا کر ایک طویل سانس لی اور کمبل اوڑھ کر بستر پر دراز ہو گیا۔

رات کسی ہنگامے کے بغیر گزر گئی۔

صبح آنکھ کھلی تو چمکیلے سُورج کی تابناک کرنیں پہاڑوں کی برف پوش چوٹیوں پر اپنی عظمت کے جھنڈے گاڑ چکی تھیں۔ مَیں اُٹھ کر خیمے سے باہر آ گیا اور ان لوگوں کو دیکھنے لگا جو ناشتہ تیار کرنے میں مصروف تھے۔

مَیں نے شالیار خان کے خیمے میں جھانک کر دیکھا تو اُسے جاگتے ہوئے پایا۔ اُسے گہری سوچ میں ڈوبا ہُوا پا کر میرا دل غم سے بے چین ہو گیا۔

مَیں نے سارجنٹ آرٹ کو آواز دے کر بُلایا اور شالیار خان کو زنجیروں سے آزاد کر دینے کے لیے کہا۔

سارجنٹ نے فوراً شالیار خان کو زنجیروں کی قید سے آزاد کر دیا اور میرے خیمے میں آ گیا۔

"تمھارے دوسرے قیدی کس حال میں ہیں اور مستقبل کے بارے میں کیا ارادے رکھتے ہیں؟" مَیں نے سنجیدگی سے سوال کیا۔

"دونوں ہوش میں آنے کے بعد متعدد مرتبہ اپنی غلطی کی معافی مانگ چکے ہیں۔" اُس نے مُسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "ایک رات کڑاکے کی سردی میں گزار کر اُن کے سارے کس بل نکل گئے ہیں۔ انھوں نے آئندہ شراب کو ہاتھ لگانے سے اُس وقت تک توبہ کر لی ہے جب تک مُہم سے واپس پشاور نہیں پہنچ جاتے وہ شراب کا ایک قطرہ تک نہیں چکھیں گے۔ مَیں نے انھیں معاف کر دیا ہے مگر اُن کے ہتھیار واپس کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ اب وہ اپنے ہتھیاروں کے لیے اپنے دوسرے ساتھیوں سے سفارشیں کروا رہے ہیں۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

● قافلہ دوبارہ چلنے کے لیے تیار تھا کہ اچانک شالیار خان نے گاڑی پر سوار ہونے سے انکار کر دیا۔ وہ گھوڑے کا مطالبہ کر رہا تھا ہمارے پاس فالتو گھوڑے موجود تھے مگر میں نے احتیاطاً اُسے گھوڑے پر بیٹھنے کی اجازت نہیں دی تھی کیونکہ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ کب اس کا مزاج بگڑ جائے اور وہ اس رعایت سے کوئی ناجائز فائدہ اُٹھانے کا ارادہ کرے لیکن میں نے سوچا کہ اب اس کا یہ مطالبہ پورا کر دینا چاہیے۔

"سارجنٹ! شالیار خان کا مطالبہ پورا کر دو" میں نے اپنے بوڑھے باپ کے چہرے پر ناگوار شکنوں کا جال دیکھ کر حکم دیا۔

شالیار خان نے چونک کر میری جانب گہری نظروں سے دیکھا اور اس گھوڑے کو محبت پاش نظروں سے دیکھنے لگا جو اس کی سواری کے لایا جا رہا تھا۔

گھوڑے پر سوار ہوتے ہوئے وہ عجیب سے انداز میں مسکرایا جس میں کوئی دیرینہ آرزو پوری ہونے کی جھلک موجود تھی۔ قافلہ چل پڑا۔ شالیار خان کا گھوڑا میرے برابر چل رہا تھا۔ حالانکہ میں نے بے شعوری کوشش کی تھی کہ ہمارے درمیان چند قدم کا فاصلہ قائم رہے کیوں کہ مجھے اپنے باپ کو آنکھوں کے سامنے پا کر دلی جذبات مخفی رکھنے میں بڑی دقت پیش آ رہی تھی... مگر نہ جانے کیوں اس نے مجھ سے پیچھے رہنا گوارا نہیں کیا۔ راستہ ناہموار ہونے کے باوجود اس کا گھوڑا میرے گھوڑے سے قدم ملا کر چل رہا تھا۔

جنگل عبور کرتے ہی ہم برفیلے پہاڑوں کے دامن میں آ گئے اور سفر کرنے کی رفتار میں تیزی آ گئی اچانک ایک موڑ سے گھومتے ہی ہمارا قافلہ ایک بستی کے سامنے پہنچ گیا تو بستی کے متعدد لوگ ہمارے قافلے کو دلچسپی اور حیرت سے دیکھنے لگے۔

میں نے اس بستی میں رکنا مناسب نہیں خیال کیا بلکہ قافلے کو آگے بڑھتا ہوا ایک ندی کے کنارے پہنچ گیا اور ندی کے کنارے پڑاؤ ڈالنے کا حکم دے دیا میں گھوڑے سے اتر آیا۔ شالیار خان نے ندی کا شفاف پانی دیکھ کر ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا اور خود کلامی کے عالم میں نہ جانے کیا کہتا ہوا گھوڑے سے اتر کر ندی میں کود گیا۔

جب تک وہ ندی سے نکل کر اپنے خیمے میں نہیں آ گیا میری آنکھیں مسلسل اس کی جانب نگراں رہیں۔ اس وقت تک باقی خیمے بھی لگائے جا چکے تھے۔ سارجنٹ نے اُسے میرے برابر والے خیمے میں جانے کے لیے کہا اور خود دوسرے کاموں میں مشغول ہو گیا تھا۔

میں نے خیمے میں آ کر اپنے سامان سے ایک قمیص اور شلوار نکالی پھر شالیار خان کے خیمے میں آ گیا۔ مجھے اچانک اپنے خیمے میں دیکھ کر اس نے حیرت سے بھویں سکیڑ کر میری جانب دیکھا پھر اپنی پرانی اور بوسیدہ قمیص نچوڑنے لگا جو نہانے کے بعد گیلی ہو گئی تھی۔

"خان بابا! اپنے بھیگے ہوئے لباس سے نجات حاصل کر کے فی الحال یہ کپڑے پہن لو۔ ورنہ بیمار پڑ جاؤ گے۔"

"نوجوان میں معمولی معمولی باتوں کے لیے دوسروں کا احسان لینے کا عادی نہیں ہوں۔ تمہارے دیے ہوئے کپڑے میرا بدن تو ڈھانپ سکتے ہیں مگر وہ خوشی نہیں دے سکتے جو مجھے یہ بوسیدہ اور بھیگے کپڑے پہن کر ہو رہی ہے۔ یہ برسوں سے میرے ساتھ ہیں اور ان میں میرے ماضی کے پسینے کی بو رچی ہوئی ہے جو میرے لیے سکون اور طمانیت کا باعث بن رہی ہے" جو اس کے لہجے میں گہرا اعتماد تھا۔

"خان بابا!" میں نے اپنی سنجیدگی برقرار رکھتے ہوئے جواب دیا "یہ جذباتی باتیں سردی کے اس موسم میں تمہارے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہیں۔ اگر ان کپڑوں سے اتنی ہی گہری وابستگی محسوس کرتے ہو تو سوکھ جانے کے بعد دوبارہ پہن لینا۔ مگر اس وقت یہی بہتر ہے کہ میرا مشورہ مان لو اور بھیگے ہوئے لباس سے نجات حاصل کر لو۔"

"نوجوان! تمہاری دلیل کافی مضبوط ہے۔ اس وقت تم ایک اعلا ظرف دشمن کا کردار ادا کر رہے ہو۔ تمہارا خیال ہے کہ تمہاری اس مہربانی کے صلے میں میں اپنی دشمنی نظر انداز کر دوں گا۔ اگر ایسا سوچ رہے ہو تو خود کو فریب دے رہے ہو۔ میں آزادی حاصل کرتے ہی سب سے پہلے تم سے اپنی توہین کا بدلہ لوں گا۔ تم نے میرے سامنے میرے بیٹے کی توہین کی تھی اور میری غیرت کو للکارا تھا۔ میں اپنی غیرت پر ضرب لگانے والوں کو کبھی معاف نہیں کیا کرتا۔"

شالیار خان کا کرخت جواب سن کر میری روح میں کرب کا سمندر جاگ اٹھا اور اس کی تلملاتی ہوئی پھریلی سوچیں میرے وجود کی دیواروں سے ٹکرانے لگیں۔

"شالیار خان! مجھے اس وقت تمہارے صحت مند جسم کی ضرورت ہے جب تک ہم بگولا سنگھ سے نہیں نمٹ لیتے۔ اپنے اس دشمن کا صفایا کرنے کے بعد ہم دونوں اپنے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔ اس وقت تک اپنی ذاتی دشمنی بھول جاؤ۔" میں نے حتی الامکان اپنے اندرونی کرب کو چھپاتے ہوئے جواب دیا۔

"نوجوان! تمہاری دلیرانہ باتیں سن کر تمہارے حوصلے کی تعریف کرنی پڑتی ہے تم یقیناً کسی بہادر اور جری انسان کے بیٹے ہو اور تمہاری رگوں میں غیرت مند خون گردش کر رہا ہے لیکن تمہاری ہستی بک چکی ہے اور تم فرنگیوں کے غلام بن کر رہ گئے ہو۔"

"میرا باپ یقیناً ایک بڑا آدمی ہے وہ اپنی شخصیت کے اعتبار سے اس قدر بڑا ہے کہ تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔" میں نے ڈرامائی انداز اختیار کرتے ہوئے جواب دیا اور گہری نظروں سے اس کے پتھریلے چہرے کو گھورنے لگا۔

"نوجوان! تمہاری باتیں سن کر محسوس ہوتا ہے کہ تمہیں اپنے باپ کی شہ زوری پر بہت ناز ہے۔" اس نے گھورتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ جواب دیا "میں تمہاری اس بات پر یقین کرنے کے لیے تیار ہوں کہ تمہارا باپ دنیا کا بہت بڑا آدمی ہے لیکن کہ وہ تمہاری طرح قوم فروش اور غدار نہیں ہو سکتا... کوئی انسان اس وقت تک بہادر اور دلیر کہلائے جانے کا مستحق قرار نہیں پاتا جب تک وہ مظلوموں کا ساتھ دیتا ہے۔ مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ تم اپنی محکوم قوم کے لوگوں پر ظلم و زیادتی کا سکہ جمانے کے لیے ظالموں اور طاقت ور لوگوں کا ساتھ دے رہے ہو... کیا اس صورت میں تمہارے پاس کوئی ایسی گنجائش باقی رہ جاتی ہے کہ تم اپنی بہادری کے جھنڈے گاڑتے ہوئے اپنی خاندانی شجاعت پر فخر کرو۔"

شالیار خان کی سخت اور کھردری باتیں سن کر مجھے اپنا وجود ندامت کے پسینے میں بھیگتا ہوا محسوس ہوا۔

"میرے ذاتی کردار پر تبصرہ کرنے سے گریز کرو۔" میں نے جواباً کرخت لہجے میں کہا "ہر شخص اپنی ذاتی زندگی میں کسی حد تک آزاد ضرور ہوتا ہے کہ وہ اپنے مستقبل کا فیصلہ خود کرے میں جانتا ہوں کہ میں ایک عظیم کا ہم سر نسب ہو دینے جا رہا ہوں یہ ایک بہت بڑا راز ہے اگر میں اس وقت تم پر اس راز کا انکشاف کر دوں کہ میں اپنے مظلوم بھائیوں کا ساتھ دینے کی بجائے کیوں ظالموں کا ساتھ دے رہا ہوں تو مجھے یقین ہے کہ حیرت کی زیادتی کی وجہ سے تمہاری زبان گنگ ہو جائے گی اور تم پر دوبارہ پاگل پن کے دورے پڑنے لگیں گے۔"

میرا یہ جواب سن کر شالیار خان اپنی سفید بھویں سکوڑ کر میری جانب حیرت سے دیکھنے لگا۔

میں جب اس کے خیمے سے نکلا تو وہ اپنا بھیگا ہوا لباس اتار کر میرا لباس پہن چکا تھا جو اس کے بدن پر پورا آ گیا تھا۔

رات کے کھانے کے بعد میں نے موہن داس اور گپتا کو شالیار خان کا محافظ مقرر کر دیا اور اپنے خیمے میں لوٹ آیا سونے سے پہلے سارجنٹ آرٹ نے دوبارہ شالیار خان کو زنجیروں میں جکڑ دیا اور اپنے انتظامات سے مطمئن ہو کر واپس چلا گیا۔ اس کے باوجود کہ شالیار خان زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا اور دو مستعد جوان پہرہ دے رہے تھے، جب کبھی زنجیروں کی جھنکار میرے کانوں تک آتی تھی تو میں کروٹ بدل کر اس کے خیمے میں جھانکنے کے لیے مجبور ہو جاتا تھا اور چند لمحات کے لیے میرا وجود خوف کی زیادتی سے منجمد ہو جاتا۔

رات اپنا آدھا سفر طے کر چکی تھی کہ اچانک خوفناک چیخیں میرے کانوں سے ٹکرائیں اور میری آنکھ کھل گئی۔

ابھی میں پوری طرح بیدار نہیں ہوا تھا کہ کسی کی دلخراش چیخیں دوبارہ میری سماعت میں اتر کر زہر گھولنے لگیں اس کے ساتھ ہی زنجیروں کی ایک تیز جھنکار بلند ہوئی اور کوئی دھپ کی آواز کے ساتھ میرے خیمے کے قریب آ کر گرا پھر کسی کے بھاگنے کی بھاگتی آوازیں مجھے اپنے خیمے سے دور ہوتی محسوس ہوئیں۔

میں ایک دم ہڑبڑا کر اٹھا اور تکیے کے نیچے رکھا ہوا ریوالور نکال کر شالیار خان کے خیمے میں جا پہنچا جو خالی اور سنسان پڑا تھا۔ ریشم لپ کا خالی خیمہ دیکھ کر میرے جسم کے رونگٹے میں وحشت اور خوف کے بچھو رینگنے لگے۔ خیمے کے ایک طرف موہن داس بے ہوش پڑا تھا جس کا سر یقیناً کسی نوکیلے پتھر سے ٹکرا کر زخمی ہو گیا تھا اور زخم سے خون جاری تھی۔

اتنی دیر میں پڑاؤ کے دوسرے لوگ بھی میرے پاس

پہنچ کر موہن داس کے زخمی جسم کو گھورنے لگے تھے۔

"سب لوگ کھڑے منہ کیا دیکھ رہے ہو؟ ابھی یہ زندہ ہے اور صرف بے ہوش ہے۔ اسے اُٹھا کر اس کی مرہم پٹی کرواؤ۔ کچھ لوگ میرے ساتھ آؤ۔ وہ ابھی زیادہ دُور نہیں گیا ہوگا۔" میں نے اپنے ایک ساتھی سے اس کی رائفل چھین لی اور دوڑتا ہُوا نشیب میں اترتا چلا گیا۔

میرے عقب میں میرے کچھ ساتھی چیخیں کرندی کے کنارے کی طرف دوڑے چلے آ رہے تھے۔

جونہی میں ندی کے کنارے پہنچا، رائفل کے دھماکے سے اچانک قرب و جوار کا سارا ماحول گونج اُٹھا۔ میں نے ایک پتھر کی اوٹ میں پناہ لے لی اور چھٹکی ہوئی چاندنی میں ندی کے دوسرے کنارے کی طرف دیکھنے لگا۔ اچانک پھر رائفل کا ایک دھماکا ہُوا اور کوئی دلخراش چیخ حلق سے بلند کرتا ہُوا اس دُنیا سے سدھار گیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک عورت کے چیخنے چلّانے کی آوازیں رات کے گہرے سنّاٹے کے قالب میں اترتی چلی گئیں۔ اس نسوانی آواز کو میں نے پہچان لیا تھا۔ یہ وہی آواز تھی جو اچانک میری بیداری کا سبب بنی تھی مگر پہلے میرا ذہن یہ فیصلہ کرنے سے قاصر رہا تھا کہ یہ آواز کس کی ہے۔

یہ آواز پہچانتے ہی اچانک ساری صورتِ حال مجھ پر واضح ہو گئی اور میرے احساس کا متلاطم سمندر دوبارہ پُرسکون ہو گیا۔ ورنہ موہن داس کی بے ہوشی یہی ظاہر کر رہی تھی کہ میرا باپ شالیار خان موہن داس کو زخمی کرکے اس کی رائفل چھین کر فرار ہو چکا ہے۔ مگر ان نسوانی چیخوں نے خدشات کو ختم کر دیا جو اسے اچانک غائب پا کر میرے دل و دماغ میں پیدا ہوئے تھے۔

میں پتھر کی اوٹ سے نکل آیا اور اپنے عقب کی طرف مُڑ کر بلند آواز میں چلّایا۔

"کوئی شخص شالیار خان پر گولی نہ چلائے۔ ہمیں اس کے مُردہ جسم کی نہیں بلکہ زندہ جسم کی ضرورت ہے۔"

اچانک سارجنٹ آرٹ ایک پتھر کی اوٹ سے نکل کر میرے قریب آ گیا اور ندی کے کنارے پر نظریں ڈالتے ہوئے بولا۔ "یہاں تو کچھ بھی نظر نہیں آتا پھر تم نے فائر بندی کا حکم کیوں دیا ہے؟" سارجنٹ آرٹ نے گہری سنجیدگی سے سوال کیا۔ "مجرم ہمارے ایک جوان کو زخمی کرکے فرار ہونے میں کامیاب ہو چکا ہے اور تم ہمیں اس کا تعاقب کرنے سے روک رہے ہو۔ آخر کیوں؟"

"وہ فرار نہیں ہُوا!" میں نے اعتماد سے جواب دیا۔ "اس نے کسی مظلوم عورت کی ہولناک چیخیں سن کر اپنی زندگی خطرے میں ڈال دی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ابھی واپس آ جائے گا اور موہن داس کے زخمی ہو جانے پر ندامت کا اظہار کرے گا۔"

"میں نے آج تک کسی قاتل کو فرار ہو کر واپس آتے نہیں دیکھا۔" سارجنٹ کے لہجے میں گہرا طنز تھا۔ "تم بہت بڑا خطرہ مول لے رہے ہو۔ مجھے یقین ہے کہ تمہاری یہ خوش فہمی بہت جلد رخصت ہو جائے گی اور جب تمہیں اس بات کا احساس ہوگا تو شالیار خان تمہارے طاقت ور ہاتھوں کی گرفت سے بہت دُور جا چکا ہوگا اور تمہاری وادیٔ فرغان کی جانب سفر کرنے کی مہم ابتدا ہی میں ناکامی کے گڑھے میں اتر جائے گی۔"

اس کی باتیں اپنی جگہ ایک ٹھوس حقیقت رکھتی تھیں مگر وہ اصل صورتِ حال سے آگاہ نہیں تھا۔ اس لیے میں نے اس کے خدشے کو نظرانداز کر دیا اور اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے ندی کے یخ بستہ پانی میں اتر گیا۔ ندی کا پانی برف کی طرح ٹھنڈا تھا۔ ندی پار کرنے میں ہمیں چند لمحوں سے زائد کا وقت نہیں لگا تھا۔ مگر اس مختصر وقفے نے پورے وجود کو ایک دم شل کر دیا۔

ندی کے دوسرے کنارے پہنچ کر میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ شالیار خان کا سارا جسم زنجیروں سے جکڑا ہوا تھا۔ اس نے اس یخ بستہ ندی کے پانی میں اترنے کے بعد کیا محسوس کیا ہوگا اور اسے یہ فاصلہ طے کرنے میں کس قدر دقّت کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔ میں نے ایک نظر سارجنٹ آرٹ کی طرف دیکھی جو اپنی ٹانگوں سے سردی کے اثرات دُور کرتے ہوئے عقابی نظروں سے کنارے کے قریب درختوں کے ایک جھنڈ کو گھورے جا رہا تھا۔

میرا دھیان اس کی اُلجھن کا باعث بنا ہُوا تھا۔ مثلاً درختوں کے قریب چاندنی میں کچھ سائے حرکت کرتے نظر آئے... سارجنٹ آرٹ ان سایوں پر نظر پڑتے ہی قدم اُٹھانے والا تھا کہ اچانک میں نے لپک کر اس کا بازو تھام لیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"سارجنٹ! بنے بنائے کھیل کو بگاڑنے کی کوشش نہ کرو۔ کیا تم شالیار خان کے قدآور سائے کو کنارے کی جانب بڑھتے ہوئے نہیں دیکھ رہے ہو۔ وہ اپنی مہم ختم کرکے پڑاؤ کی طرف واپس آ رہا ہے۔ اگر اس کا اس موقعے سے کوئی ناجائز فائدہ اُٹھانے کا ارادہ ہوتا تو اسے روکنے والا کون تھا۔ تم نے دیکھا نہیں کہ ندی کے جس یخ بستہ پانی نے چند لمحے قبل ہماری جسمانی صلاحیتوں کو متاثر کیا تھا وہ اُسے متاثر نہیں کر سکا۔ حالانکہ اس وقت بھاری زنجیریں اس کے وجود کا ایک حصہ بن چکی ہیں مگر اس نے بھاگتے وقت ان بھاری زنجیروں کی کوئی پروا نہیں کی اور ایک مظلوم عورت کی چیخیں سن کر اس نے اپنے انجام کی پروا کیے بغیر اس کی مدد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔"

"تمہاری بات درست ثابت ہو رہی ہے کہ وہ کنارے کی طرف آ رہا ہے کیوں کہ اس کے چلنے سے زنجیروں کی جھنکار مسلسل اُبھر رہی ہے۔ مگر کیا تم اس بات کی وضاحت کرنا پسند کرو گے کہ تمہارے اس یقین کی بنیاد کیا تھی کہ وہ موقعے سے ناجائز فائدہ اُٹھا کر فرار نہیں ہوگا اور ہنگامی صورتِ حال سے نمٹ کر واپس آئے گا؟" سارجنٹ آرٹ کی متجسس نظریں میرے چہرے پر جم گئیں۔

"تمہارا خیال درست ہے کہ ہر یقین کی کوئی نہ کوئی بنیادی وجہ ضرور ہوتی ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے پُراعتماد لہجے میں جواب دیا اور اپنی بات ادھوری چھوڑ کر شالیار خان کی طرف دیکھنے لگا جسے میں نے ہوائی فائر کرکے اپنی موجودگی کا احساس دلایا تھا اور اس نے یہ اشارہ سمجھ لیا تھا۔

شالیار خان کھنکھناتی ہوئی زنجیروں سے مسلسل گونج پیدا کرتا ہُوا باوقار انداز میں ہمارے سامنے آ کھڑا ہُوا اور مجھے پہچانتے ہی اپنی گونج دار آواز میں بولا۔ "نوجوان! مجھے افسوس ہے کہ میں نے اس مظلوم عورت کی مدد کا فیصلہ کرتے وقت تم سے کیے ہوئے وعدے کا خیال نہیں رکھا۔ مجھے یقین ہے کہ میری غیر موجودگی کے یہ لمحات تمہارے پڑاؤ کے لیے بے حد ہنگامہ خیز ثابت ہوئے ہوں گے۔ یہ سب کچھ اچانک ہی ہُوا اس لیے اس میں میرے کسی ارادے کو دخل نہیں تھا۔"

"تمہاری یہ وضاحت اپنی جگہ پر ایک ٹھوس حقیقت رکھتی ہے مگر تمہیں موہن داس پر حملہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ تمہاری اس حرکت سے میرے ساتھی بھڑک اُٹھے ہیں اگر عین وقت انھیں فائر بندی کا حکم نہ دیتا تو یہ معمولی سی غلط فہمی نہ جانے تمہارا سینہ چھلنی کر سکتی تھی۔"

میں نے کرخت لہجے میں جواب دیا اور اس نسوانی وجود کو گھورنے لگا جو اس ہنگامے کا باعث بنا تھا۔ "یہ کون ہے؟ اور تم نے دونوں ابھی کس بدنصیب پر کیے تھے؟"

"وہ بدنصیب نہیں! بدقماش لوگ تھے۔" شالیار خان نے نسوانی وجود پر اپنی نظریں ڈالتے ہوئے جواب دیا۔ "میں نے ان شیطانوں کے وجود سے دھرتی کو پاک کر دیا ہے اور اس بدنصیب عورت کی زندگی بچانے میں کامیاب رہا ہوں۔ وہ لوگ اسے بستی سے اغوا کرکے لائے تھے اور اسے داغ دار کرکے موت کے گھاٹ اتارنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ یہ ان کی بدقسمتی ہی تھی کہ اسے اچانک ہوش آ گیا اور یہ ہوش میں آتے ہی چیخنے چلّانے لگی۔ اس کی دردناک آوازیں میرے کانوں تک پہنچیں تو میں خود پر قابو نہ رکھ سکا اور میں نے ایک جوان سے اس کی رائفل چھین لی۔ اس نے میرا راستہ روکنے کی کوشش کی جس کے نتیجے میں اُسے زخمی ہونا پڑا۔ وہ میرے ایک ہی دھکّے سے مُنہ کے بل گرا اور زخمی ہو گیا۔"

شالیار خان کی یہ وضاحت میں نے بڑے صبر و سکون کے ساتھ سُنی۔ "جوان! انسان فرشتہ نہیں اپنی غلطی کی تلافی کر دے تو دُنیا کے انصاف پسند لوگ اس کی اتفاقیہ غلطی کو اخلاقی طور پر نظرانداز کرنے کے لیے مجبور ہو جاتے ہیں۔ مجھے تمہارے اس اقدام کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ کرنے میں بڑی دُشواری پیش آ رہی ہے۔ اگر تم اس بات کا وعدہ کر دو کہ آئندہ اس غلطی کو نہیں دُہراؤ گے تو میں اپنے ساتھیوں کے سامنے یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکوں گا کہ شالیار خان آئندہ ان کے لیے کسی دردِ سر کا سامان پیدا نہیں کرے گا۔ بصورتِ دیگر میں تمہیں اس وقت تک زندہ رکھنے کے لیے مجبور ہوں جب تک بگرز سنگھ کا معاملہ طے نہیں ہو جاتا... مگر تمہیں دی گئی رعائتیں تم سے چھینی بھی جا سکتی ہیں۔"

میں نے یہ دھمکی دی تو پتھریلے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ آ گئی۔

"نوجوان! میں تم سے پہلے بھی کسی رعایت کا طلب گار نہیں تھا۔" اس کے کرخت لہجے میں سرکشی تھی۔ "تم بدقماشوں کے خلاف سخت اقدامات کرکے اپنے ساتھیوں کے سامنے...

سے سربلند کرسکتے ہو۔ یہ بھاری زنجیریں تو بہادر انسانوں کا زیور کہلاتی ہیں۔ میں زنجیریں پہن کر تمھارے آقاؤں کو برسوں پہلے بھی یہ ثبوت دے چکا ہوں کہ مجھے غلامی کا طوق پہنا کر غلام نہیں بنایا جاسکتا... اگر میں تم سے تعاون کرنے کا وعدہ نہ کرچکا ہوتا تو دنیا کی کوئی طاقت میرے راستے کی دیوار نہیں بن سکتی تھی۔ مگر میرا ظرف ہی میرے پاؤں کی زنجیر بن گیا۔"

اس نے خاموش ہوتے ہی رائفل پھینک دی جسے سارجنٹ آرٹ نے فوراً اُٹھا لیا۔ ندی کے دوسرے کنارے پر موجود میرے ساتھی شالیار خان کی جرأت آمیز وضاحت سُن کر مجسموں کی طرح خاموش اور ساکت نظر آرہے تھے۔

ہم نے دوبارہ ندی پار کی اور اپنے پڑاؤ میں آگئے۔ خیمے میں آکر میں نے لالٹین کی روشنی میں اس عورت کے سراپا کا جائزہ لیا۔ وہ خوف زدہ ہرنی کی طرح گھبرا کر بار بار چونک اُٹھتی تھی پھر حیرت سے مجھے اور میرے ساتھیوں کو گھورنے لگتی تھی۔ اگرچہ ابھی کافی رات باقی تھی مگر اس ہنگامے کے باعث سبھی بے قرار ہوگئے تھے۔

میں نے قہوہ بنانے کا حکم دیا اور اپنے ساتھیوں کو منتشر ہونے کے لیے کہا کیوں کہ میں دیکھ چکا تھا کہ اتنے بہت سے آدمیوں کی موجودگی اس لڑکی کو خوف زدہ کر رہی ہے۔ وہ بار بار میرے ہتھیار بند ساتھیوں کو گھورتی اور ہلکی ہلکی سسکیاں لینا شروع کر دیتی تھی۔ شاید وہ ہمیں بھی کوئی لٹیرے ہی سمجھ رہی تھی۔

میں نے گرم قہوہ اس کے سامنے رکھتے ہوئے شالیار خان کی طرف دیکھا جو زنجیروں میں جکڑا ہوا خیمے میں ایک طرف خاموش بیٹھا سارجنٹ آرٹ کو اور مجھے دیکھ رہا تھا۔ لڑکی نے جھجکتے ہوئے قہوے کا پیالہ تھام لیا اور سر جھکا کر سسکیاں بھرتی ہوئی قہوے کے ہلکے ہلکے گھونٹ اپنے حلق میں اتارتی رہی...

"تمھاری موجودگی میرے ساتھیوں کے لیے اُلجھن کا باعث بن رہی ہے۔" میں نے نرمی سے اس عورت کو مخاطب کیا "مجھے بتاؤ کہ تم کون ہو۔ تاکہ تمھیں تمھارے قبیلے تک پہنچا دیا جائے۔"

"میں... میں نوشی ہوں۔" اس نے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں اپنے بارے میں وضاحت کی "میرا باپ زردار خان مرچکا ہے۔ میں اپنی ماں اور اکلوتے بھائی سخت خان کے ساتھ رہتی تھی۔ آج صبح میرا بھائی اپنے ایک کام سے کسی دوسری بستی میں گیا تھا۔ شام ہونے تک اس کی واپسی نہیں ہوسکی۔ میں اپنی بوڑھی ماں کے ساتھ اپنے گھر میں سورہی تھی کہ اچانک مجھے اپنے قریب آہٹ سُنائی دی۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھنا چاہا تو میرے مُنہ میں کپڑا ٹھونس کر مجھے خاموش کر دیا گیا۔ اپنے ساتھ یہ حرکت کرنے والوں کو میں نے پہچان لیا تھا۔ یہ کریم خان اور اس کا بدمعاش ساتھی دادل تھا۔ انھوں نے یہی حرکت میری ماں کے ساتھ بھی کی۔ اُسے کنپٹیوں پر چوٹ مار کر بے ہوش کر دیا... اور پھر رسیوں سے جکڑ کر وہیں چھوڑ آئے۔ اچانک راستے میں دادل خان، جو مجھے اُٹھائے ہوئے تھا ٹھوکر کھا کر گرا تو میرے ہاتھ آزاد ہوگئے۔ ندی کے کنارے میں نے تمھارے پڑاؤ میں روشنی دیکھی تو اپنے مُنہ میں ٹھنسا ہوا کپڑا نکال کر مدد کے لیے چیخنے چلّانے لگی۔ اگر یہ خان بابا اچانک میری مدد نہ کرتے تو میں بدنصیب مر چکی ہوتی۔ خدا جانے میری غیر موجودگی میں میری ماں پر کیا کیا قیامتیں گزر گئی ہوں گی؟"

وہ اپنی ماں کا تصور کرکے ہچکیاں لے کر رونے لگی۔

"اچھی لڑکی!" میں نے اس کی سرگزشت سُن کر کہا "ایک قیامت وہ ہے جو تم پر اور تمھاری ماں پر گزری ہے۔ مگر اس ہنگامہ خیز قیامت کی لپیٹ میں اچانک میں اور میرے ساتھی بھی آگئے ہیں۔ بہرحال تم حوصلہ رکھو۔ میں سُورج نکلنے سے پہلے ہی تمھیں تمھارے قبیلے میں پہنچا دوں گا۔ میرا خیال ہے چند گھنٹے گزار لو تو زیادہ اچھا رہے گا... اگر رات کے اس پہر میں ہم نے بستی میں داخل ہونے کی کوشش کی تو ساری بستی ڈاکو سمجھ کر ہمارے خلاف اُٹھ کھڑی ہوگی اور اُنھیں سمجھانا مشکل ہوجائے گا۔ تمھیں اغوا کرنے والے بدمعاش موت کی آغوش میں پہنچ کر ہمیشہ کے لیے خاموش ہوچکے ہیں۔ صبح ہوتے ہی میں اُن کی لاشیں خود بستی والوں کے حوالے کر دوں گا اور تمھاری عزت وآبرو پہ کوئی حرف نہیں آئے گا۔"

میری حوصلہ افزا باتیں سُن کر اس کی سسکیاں رُک گئیں اور وہ حیرت کے سمندر میں ڈوبتے ہوئے بولی۔

"کیا تم اتنے بہادر ہو کہ ساری بستی کو قائل کرنے میں کامیاب ہوجاؤ گے۔ میری بستی کے لوگ بہت لڑاکے و جنگجو ہیں۔ معمولی سی غلط فہمی پر کسی کو زندگی سے محروم کر دینا ان کے لیے روزمرّہ کا ایک کھیل ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ تم ان بدمعاشوں کی لاشیں وہیں چھوڑ دو اور خاموشی سے مجھے میرے گھر چھوڑ آؤ۔ اس طرح تم اپنا قیمتی وقت خراب کرنے سے بچ جاؤ گے۔ کریم خان کے پانچوں بھائی بہت لڑاکے اور زن خوار انسان ہیں۔ وہ اپنے بھائی کے قاتل کو کبھی معاف نہیں کریں گے اور تم لوگ ایک کبھی نہ ختم ہونے والی جنگ میں اُلجھ کر رہ جاؤ گے۔"

اس جاہل لڑکی کے دلائل سُن کر میں سوچ میں پڑ گیا۔

"اس کا مطلب ہے تم اپنے گھر پہنچ کر بھی کریم خان کے بھائیوں کی دسترس سے دور نہیں رہو گی۔ وہ جب چاہیں گے تمھیں اپنے بھائی کی موت کا ذمے دار ٹھہرا کر تمھارے ساتھ یہی حرکت دوبارہ بھی کرسکتے ہیں۔"

یہ سُن کر اس کا خوبصورت اور معصوم چہرہ خوف سے زرد پڑ گیا اور اس کی رُکی ہوئی سسکیاں پھر جاری ہوگئیں۔

"عزیز لڑکی! رونے دھونے سے کبھی ایسے سنگین مسئلے حل نہیں ہوا کرتے۔" میں نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا "میرا یہ فیصلہ درست ہے کہ ہم تمھیں ان دونوں بدمعاشوں کی لاشوں سمیت بستی میں لے کر داخل ہوں گے اور اگر ہم نے کریم خان کے بھائیوں کا رویہ مشکوک دیکھا تو انھیں نیست و نابود کرتے ہوئے دوبارہ اپنی راہ لیں گے۔ ہم تمھاری اور تمھاری ماں کی زندگی خطرے میں ڈالنا کبھی پسند نہیں کریں گے۔"

لڑکی میری باتیں سُن کر خاموش ہوگئی تو شالیار خان ہلکا سا ایک قہقہہ لگاتے ہوئے درمیان میں مداخلت کرتے ہوئے بولا "نوجوان! تمھارا یہ فیصلہ بروقت اور صحیح ہے۔ کسی مظلوم بیٹی کو بھیڑیوں کے غول میں بے آسرا نہیں چھوڑا جاسکتا۔ خدائے ذوالجلال کی قسم! اگر تم اس مظلوم لڑکی کی مدد کرنے کا فیصلہ نہ کرتے، تو میں تمھیں بزدل اور بے حس خیال کرتا اور مجھے یہ یقین کرنے میں کوئی تامل نہ ہوتا کہ تم ایک موقع پرست اور غدار آدمی ہو۔ مگر تمھارے دلیرانہ فیصلے نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ تم ایک بیدار مغز اور بہادر نوجوان ہو اور جنرل ڈوگ نے تمھارا انتخاب کرنے میں کوئی غلطی نہیں کی ہے۔ اگر تم مناسب خیال کرو تو اس غریب اور مظلوم لڑکی کو میری تحویل میں دے دو۔ میں تنہا اس کا مسئلہ نمٹا کر واپس آنے کا وعدہ کرتا ہوں۔"

"شالیار خان! دشمن کی طاقت کا اندازہ ہونے کے باوجود کوئی خطرہ مول لینا دانشمندانہ اقدام نہیں کہلائے گا۔ میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بابا تمھاری زندگی کو خطرات میں ڈالنے کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ کیوں کہ تمھاری زندگی ہمارے لیے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ تم اگر چاہو تو میں تمھیں اپنی اس چھوٹی سی مہم میں شریک کرنے کے لیے تیار ہوں۔ میں نے تمھاری ذہانت اور بہادری کی بہت تعریف سُنی ہے۔ اور یہ تازہ واقعہ میری آنکھوں کے سامنے ایک ٹھوس شہادت بن کر موجود ہے۔ مگر یہ کوئی حیران کن واقعہ نہیں ہے۔ میں خود تمھارے ساتھ رہوں گا مگر اس میں مرکزی کردار تمھیں ادا کرنا ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ تم اپنی بزرگی اور دانشمندی کا احترام قائم رکھو گے۔"

میرا یہ فیصلہ سُن کر شالیار خان حیرت سے اُچھل پڑا اور اس کے پتھریلے چہرے پہ ایک نرم مسکراہٹ نمودار ہوگئی۔

"نوجوان! تم نے میری بزرگی کا احترام کرکے ایک اعلا ظرف انسان ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ میں اس غریب بچی کی ذمے داری قبول کرتا ہوں۔ مگر تمھیں میرے ہر فیصلے کا احترام کرنا ہوگا۔"

اس کی سوالیہ نظریں میرے چہرے پر ٹھہر گئیں۔

"میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمھارے کسی فیصلے کو نظرانداز نہیں کیا جائے گا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور اس کے خیمے سے نکل کر باہر آگیا تاکہ جوگندر کو گھوڑے تیار کرنے کے لیے کہوں۔

سارجنٹ آرٹ اس دوران مکمل خاموشی سے ہماری باتیں سُنتا رہا اور اس کے چہرے کو دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ اس نے میرے اس فیصلے کو پسند کیا ہے۔

"سارجنٹ! اپنے تین ساتھیوں کو حکم دے دو۔ ہم چھ آدمی مل کر اس بستی میں جائیں گے... اگر تمھیں میرے اس فیصلے سے اختلاف ہے تو یہیں رہ کر نتائج کا انتظار کرسکتے ہو۔ میں اپنی قوم کی کسی لڑکی کو اپنی آنکھوں کے سامنے بے آبرو ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ اس کی آبرو کے ساتھ ساتھ اس کی زندگی بھی خطرات کی زد میں آگئی ہے۔ جس کی مکمل حفاظت کرنا ہر غیرت مند پٹھان کا اوّلین فرض ہے۔"

"شہباز خان! مجھے اس قدر بے حس نہ خیال کرو۔ میں بھی تمھارے ساتھ چلوں گا اور پھر دیکھوں گا کہ کون سا ظالم خان ہمارے راستے کی دیوار بننے کی کوشش کرتا ہے۔" اس نے سنجیدگی سے جواب دیا اور مجھ سے الگ ہو کر چلا گیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں خفیہ طور پر اپنے باپ کا اعتماد بحال کرنے کے لیے ایک خطرناک فیصلہ کر چکا تھا کریم خان کے پانچوں بھائی ہمارے لیے خطرناک ثابت ہو سکتے تھے مگر مجھے سچائی کی قوتوں پر مکمل بھروسہ تھا کہ ہم یہ معرکہ ہم چند ساعتوں میں نمٹا کر واپس اپنے پڑاؤ میں آ جائیں گے اور ہمیں اپنی مہم جاری رکھنے کے لیے کوئی سنگین صورت حال پیش نہیں آئے گی۔

"شالیار خان! میرے ساتھی بستی میں داخل ہونے کے لیے تیار ہیں۔ اب یہ فیصلہ تمہیں کرنا ہے کہ بستی میں داخل ہونے کے لیے کون سا وقت مناسب رہے گا؟" میں نے سارے کام نمٹانے کے بعد دوبارہ اس کے خیمے میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"میرے خیال میں سورج طلوع ہوتے ہی ہم بستی کی جانب چل پڑیں گے۔" شالیار خان نے جواب دیا۔ "رات کے آخری پہر، بستی میں داخل ہونا مناسب نہیں ہوگا۔ تم ان بدمعاشوں کی لاشیں یہیں منگوا لو۔ اب سورج نکلنے میں کون سی دیر رہ گئی ہے؟"

●

جب ہم خرم شاہ بستی میں داخل ہوئے تو چمکیلے سورج کی تیز کرنیں درختوں کی شاخوں سے جھانک رہی تھیں۔ شالیار خان شاہانہ وقار کے ساتھ ہمارے قافلے کے آگے چل رہا تھا۔ نوری کو اس نے اپنے پیچھے گھوڑے کی پشت پر بٹھایا تھا اور اسی کی نشان دہی پر چلتا ہوا بستی کے درمیان، ایک پنڈال سے گزر کر ایک وسیع و عریض حویلی کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔

جونہی اس نے گھوڑے سے اتر کر حویلی کے بھاری دروازے پر دستک دی کسی نے اس کی دوسری دستک کے جواب میں بڑبڑاتے ہوئے بھاری دروازہ کھول دیا۔ مگر اس وقفے میں کچھ لوگ ہمارے گھوڑوں کی ٹاپیں سن کر اپنے گھروں سے نکل آئے تھے اور ہمیں متجسس نظروں سے گھور رہے تھے۔ ابھی تک کسی کی بھی کریم خان اور داول کی لاشوں پر نظر نہیں پڑی تھی کیونکہ ہم نے ان کے مردہ جسموں کو ترپال میں لپیٹ کر ایک خالی گھوڑے پر لاد رکھا تھا۔ دور سے دیکھنے والے یہ اندازہ نہیں لگا سکتے تھے کہ اس ترپال کے اندر بستی کے دو جوانوں کی لاشیں بھی ہو سکتی ہیں۔ بستی کا ہر شخص بار بار نوری کے بگڑے ہوئے حلیے کو دیکھ کر دوسروں سے سرگوشیاں کرتا دکھائی دے رہا تھا۔

حویلی کا دروازہ کھلتے ہی ایک خمیدہ کمر بوڑھا حیرت زدہ ہو کر ہماری جانب دیکھنے لگا۔ پھر اچانک اس کی نظریں نوری کے چہرے پر ٹھہر گئیں۔

"نوری! بیٹا کیا بات ہے۔ تمہاری حالت بہت عجیب نظر آ رہی ہے یہ لوگ کون ہیں؟ کیا ان لوگوں نے تمہارے ساتھ کوئی زیادتی کی ہے؟" خمیدہ کمر بوڑھے نے ایک دم سوالات کی بوچھار کر دی۔

"بابا! سردار دلبر خان کو بلاؤ یہ لوگ اس سے ملنے آئے ہیں؟" اس نے بوڑھے سے کہا۔

"مگر یہ لوگ تو مجھے کوئی اجنبی نظر آ رہے ہیں اور تمہیں اس بات کی خبر ہے کہ سردار دلبر خان بستی میں اجنبی لوگوں کی آمد قطعاً پسند نہیں کرتا۔ اگر صبح صبح اس نے مجھ سے ناراضگی کا اظہار کیا تو میرا سارا دن لوگوں سے لڑتے اور جھگڑتے ہوئے گزرے گا۔ سردار ابھی کچھ دیر بعد خود ہی اٹھ جائے گا تو ان لوگوں سے ملاقات کرے گا۔" اس نے کسی ناٹک کے منجھے ہوئے اداکار کی طرح اطمینان سے جواب دیا اور شالیار خان کو گھورنے لگا۔

"ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ تمہارے سردار کے اٹھنے کا انتظار کریں۔ اس وقت گھوڑے کی پیٹھ پر اس بستی کے دو مردہ نوجوانوں کی لاشیں موجود ہیں۔ وہ لاشیں ہم تمہارے پاس چھوڑے جاتے ہیں۔ تم بعد میں خود ان کی جواب دہی کرتے رہنا۔"

شالیار خان کا نفسیاتی وار کارگر رہا۔ خمیدہ کمر بوڑھا بوکھلا کر اس گھوڑے کی جانب دیکھنے لگا مگر اتنی دیر میں ٹھایا ترپال زمین پر گرا کر اسے الٹ چکا تھا۔

جونہی اس کی نظر کریم خان اور داول کے مردہ جسموں پر پڑی، وہ خوف کی زیادتی سے گھبرا کر چند قدم ہٹ گیا پھر اچانک "سردار... سردار" پکارتا ہوا گھوم کر حویلی کے اندرونی حصے کی جانب دوڑنے لگا۔ "سردار! کریم خان اور داول مارے گئے۔ ان کے قاتل تمہاری حویلی میں موجود ہیں۔"

خمیدہ کمر بوڑھا ہم پر سنگین الزام لگاتا ہوا ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا... مگر اس کے شور و غل کی آوازیں مسلسل ہمیں حویلی کی دیواروں سے باہر بھی سنائی دے رہی تھیں۔

اس وقفے میں حویلی کے باہر کافی آدمی جمع ہو چکے تھے۔

وہ کریم خان اور داول کی لاشیں دیکھتے ہی ٹھٹک کر رہ جاتے تھے۔ کچھ دیر بعد اچانک ایک طویل قامت بوڑھا اپنے ساتھ دو مسلح جوانوں کو لے کر ایک عجیب سے طمطراق کے ساتھ اپنی رائفل زمین پر ٹیکتا ہوا نمودار ہوا اور کسی وحشی درندے کی طرح غراتے ہوئے بولا۔

"تم لوگ کون ہو؟ کریم خان اور داول کیسے مارے گئے؟" اس کے لہجے میں نفرت اور کرختگی پا کر اچانک میرے عضلات تن گئے اور میری انگلی رائفل کے گھوڑے پر سختی سے جم گئی۔

"اجنبی! میں اپنا سوال دہراتا ہوں، تم میں سے کریم خان اور داول کا قاتل کون ہے؟ تم جاؤ نوری! خاموش لڑکی میرا منہ کیا دیکھ رہی ہو؟ کیا کریم خان اور داول نے ان لوگوں کو تمہارے ساتھ کوئی زیادتی کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا؟ اسی لیے وہ مارے گئے یا ان کی موت کی وجہ کچھ اور ہے...؟"

میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا لیکن وہ خوف زدہ نوری کی طرف متوجہ تھا۔ "اگر ان لوگوں میں سے کسی نے تمہارے ساتھ کوئی زیادتی کی ہے تو اس بستی کے باہر ان کی قبریں بنانے کے لیے بہت سی زمین خالی پڑی ہے۔ مجھے بتاؤ کہ کریم خان اور داول کا قاتل کون ہے؟ پھر تم دیکھنا کہ میں اس کا کیا حشر کرتا ہوں۔"

"سردار دلبر خان! تمہاری اس بات کا جواب میں دوں گا۔ یہ بے چاری تم سے اس قدر خوف زدہ ہے کہ سچائی کا اظہار کرنے کی جرأت بھی نہیں رکھتی۔" شالیار خان نے اپنی گرج دار آواز میں مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ "کیا تم اس بستی کا سردار ہونے کے باوجود اتنی بصیرت بھی نہیں رکھتے ہو کہ اپنے مشاہدے سے اصل معاملہ بھانپ لو۔ اب تک تمہارے تجربے میں اتنی پختگی آ جانی چاہیے تھی کہ تم اپنا سوال دہرائے بغیر ہی صورتِ حال بھانپ لیتے، مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ تم نے اس لڑکی کی مظلومیت کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے اور تم کوئی طے شدہ فیصلہ ہم پر ٹھونسنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہو۔ اگر تم اس معصوم اور مظلوم لڑکی سے نرمی سے بات کرو گے تو یہ ضرور بتائے گی کہ تمہاری بستی کے یہ شہ زور نوجوان کیا کارنامہ انجام دیتے ہوئے موت کی وادی میں داخل ہو گئے۔"

شالیار خان کا کرخت لہجہ محسوس کر کے سردار دلبر خان کا چہرہ دہکتا سرخ پڑ گیا اور غصے کی زیادتی سے اس کی آنکھوں سے خون ٹپکنے لگا۔

"تمہاری باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ میری بستی کے جوانوں کے قاتل تم ہی ہو۔" اس نے اپنا ایک ہاتھ فضا میں بلند کرتے ہوئے کہا۔ "یہ لڑکی زندہ ہے اور اپنا بیان بعد میں بھی دے سکتی ہے۔"

"تم مجھے بے حد خود سر اور ضدی آدمی نظر آتے ہو۔ تمہیں شاید مہمانوں سے بات کرنے کا سلیقہ بھی نہیں ہے۔" شالیار خان نے لوہا گرم دیکھ کر ایک اور چوٹ لگائی۔

"کون کہتا ہے کہ تم مہمان ہو۔ اگر تم لوگ مہمان ہوتے تو میری بستی کے دو جوان کیوں مارے جاتے؟ تمہاری گفتگو تمہیں قاتل ثابت کر رہی ہے۔" سردار دلبر خان نے بھرپور نفرت کا اظہار کرتے ہوئے دوبارہ سنگین الزام عائد کیا۔

"سردار! خان بابا کی توہین نہ کرو۔" نوری صورتِ حال بگڑتے دیکھ کر چلائی۔ "انہی ان لوگوں نے میری جان بچائی ہے۔ اگر یہ خان بابا بروقت میری مدد نہ کرتے تو کریم خان اور داول میری آبرو لوٹنے کے بعد مجھے قتل کر دیتے۔ ان دونوں نے آج رات مجھے میرے گھر سے اٹھایا تھا اور اپنے ناپاک ارادے پورے کرنے کے لیے مجھے ندی کے پار لے گئے تھے۔ میری فریاد اور چیخیں سن کر یہ شخص اچانک میری مدد کو پہنچ گیا اور ان دونوں کو مجھے آزاد کرنے کے لیے کہا مگر انہوں نے مجھے آزاد کرنے کے بجائے اس بزرگ پر حملہ کر دیا جس کے نتیجے میں ان پر گولی چلانی پڑی اور وہ دونوں مارے گئے پھر یہ لوگ مجھے تمہارے پاس لے آئے۔"

نوری اپنی روداد سنا کر ہلکی ہلکی سسکیاں بھرنے لگی مگر میں دیکھ رہا تھا کہ نوری کی سرگزشت سننے کے باوجود سردار دلبر خان کی عیار آنکھوں میں ہمدردی کی ہلکی سی جھلک بھی نمودار نہیں ہوئی تھی۔

دیوتاؤں کے شہر نیپال میں بسنے والے
ایک درندے کی پراسرار داستان
درندہ
یعقوب جمیل کے ہوشربا قلم سے جس کا
قارئین کو برسوں سے انتظار تھا
مکتبہ القریش سرکلر روڈ اردو بازار لاہور
فون 7668958

"تو میرا شُبہ دُرست ہی نکلا" وہ کسی وحشی درندے کی طرح غرّا کر اپنی نفرت کا اظہار کرنے لگا "میری بستی کے دونوں جوانوں کو تم نے ہی خون میں نہلایا ہے۔ آج تک کوئی قاتل میری بستی سے فرار ہونے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ تم بھی اس بستی سے زندہ واپس نہیں جا سکو گے۔ اگر میں نے تمھیں یہاں سے زندہ واپس جانے دیا تو قدیم خان اور رحیم خان کو کیا مُنہ دکھاؤں گا۔ جب تک وہ سارے بھائی لوٹ کر نہیں آجاتے، تمھیں میری قید میں رہنا ہو گا۔ تمھاری زندگی اور موت کا فیصلہ ان لوگوں کے آنے کے بعد ہی کیا جائے گا۔"

سردار دلبر خان اپنی عیّار آنکھیں شالیار خان کے چہرے پر گاڑتے ہوئے زہریلے انداز میں مُسکرایا اور اپنی بستی کے لوگوں کو مخاطب کر کے بولا۔

"ان لوگوں کے ہتھیار چھین کر ان کی مُشکیں کس دو اور کریم خان کے بھائیوں کے آنے تک ان کی کڑی نگرانی کرو۔ وہ خود ہی اپنے بھائی کے قاتلوں کے لیے سزا تجویز کریں گے۔ اپنے انتقام کی پیاس بجھا لیں گے۔"

"سُنو... بستی کے لوگو سُنو" شالیار خان غصّے کی زیادتی سے دھاڑنے لگا "تمھارے سردار کا فیصلہ غلط ہے۔ یہ مظلوم کی داد رسی کرنے کی بجائے ظالموں کا ساتھ دے رہا ہے۔ اس نے اپنی بستی کی ایک بیٹی کی آبرو کو اس قدر ارزاں سمجھا ہے کہ اس کی فریاد سُننے کی بجائے اسے خاموش رہنے پر مجبور کر رہا ہے۔ کیا تمھاری غیرت اس قدر مُردہ ہو چکی ہے کہ بستی کی ایک بے آسرا بیٹی کی آبرو کو سستا اور گھٹیا خیال کرتے ہو اور تمھیں اس کی فریاد سُننا بھی گوارا نہیں ہے۔ مگر ہم تم لوگوں کی طرح بُزدل یا بے غیرت نہیں ہیں۔ یاد رکھو... اگر مجرموں کی حمایت کرتے ہوئے کسی نے ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو اس کا سینہ گولیوں سے چھلنی کر دیا جائے گا۔"

شالیار خان کی للکار سے حویلی میں موجود لوگوں کو جیسے سانپ سُونگھ گیا۔ شالیار خان کی بات مکمل ہوتے ہی میرے مستعد ساتھیوں نے اپنی رائفلیں سیدھی کر لیں اور ہر خطرے سے نپٹنے کے لیے تیار ہو گئے۔

سردار دلبر خان جس انداز سے پیش آیا تھا وہ اس کے کردار کی نمایندگی کر رہا تھا۔ وہ قدیم خان اور رحیم خان سے اس قدر خوفزدہ تھا کہ ایک مظلوم لڑکی کی سسکیاں بھی اس کی سماعت پر گراں گزر رہی تھیں۔ وہ لڑنے مرنے پر آمادہ نظر آ رہا تھا مگر شالیار خان کی دھاڑ سُن کر اس کا وجود بھی منجمد ہو گیا تھا۔ شاید یہ اس کی زندگی کا پہلا موقع تھا کہ کسی نے اس کی حویلی میں اور اس کے حواریوں کی موجودگی میں ایسا سخت رویّہ اختیار کیا ہو۔

مجھے کی نظریں سردار دلبر خان کے چہرے پر جمی ہُوئی تھیں۔ موت کو سامنے پا کر اس کی گویائی مفلوج ہو چکی تھی۔ شاید اس کو ابھی تک اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ کوئی اس کی حویلی میں داخل ہو کر اسے دھمکی دینے کا حوصلہ بھی کر سکتا ہے۔

"دلبر خان! ہم جا رہے ہیں مگر جانے سے پہلے تم پر یہ بات واضح کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ اگر تم میں سے کسی نے نوری یا اس کے خاندان کے کسی فرد کو انتقامی کارروائی کا نشانہ بنایا اور اس کا بال بھی بیکا ہُوا تو میں ساری بستی کو خاک و خون میں نہلا دوں گا اور بستی کے مکانوں کو آگ لگا کر راکھ کا ڈھیر بنا دوں گا۔ میرا نام شالیار خان ہے۔ میں ندی کے کنارے پر آج کا دن کریم خان کے بھائیوں کی فوج کا انتظار کروں گا۔ تم میں سے جو بھی مائی کا لال مجھ سے انتقام لینے کی خواہش رکھتا ہو، وہ ندی پر آ کر اپنے حوصلے نکال سکتا ہے۔ تم میں سے جو شخص مجھے پہلے سے جانتا ہے۔ وہ یہ بھی ضرور جانتا ہو گا کہ شالیار خان اپنے قول کا پکّا ہے۔ جو کہتا ہے اسے پُورا کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔ اگر تم لوگوں کو اپنی زندگیاں عزیز ہیں اور تم اپنے گھروں کو راکھ کا ڈھیر بنتے ہُوئے نہیں دیکھ سکتے تو میری واپسی تک نوری اور اس کے خاندان کے تمام افراد کی حفاظت کرنا ہو گی، بصورتِ دیگر میرا انتقام بہت بھیانک ہو گا۔"

شالیار خان کی آواز میں ایسا دبدبہ تھا کہ کسی کو بھی اس کی بات کا جواب دینے کا حوصلہ نہیں ہُوا۔ اگر کوئی اس وقت مقابلہ کرتا تو مجھے یقین تھا کہ وہ اپنی زندگی سے ضرور ہاتھ دھو بیٹھتا۔ ہم سلامتی کے ساتھ اس کے گھر کی دہلیز پار کر گئے اور نوری کو ساتھ لے کر اس کے گھر کی طرف چل پڑے جہاں اس کی بوڑھی ماں بستر سے بندھی ہُوئی کسی غیبی امداد کا انتظار کر رہی تھی۔

ہم نے اس بوڑھی عورت کو آزاد کیا اور اسے صورتِ حال سمجھا کر نوری کو اس کی تحویل میں دے دیا پھر اپنے پڑاؤ کی جانب چل پڑے۔ جونہی ہم ایک تنگ راستے سے نکل کر کھلے راستے پر آئے تو کچھ گھڑ سوار رائفلیں تھامے ہُوئے راستے کی نگرانی کرتے نظر آئے، وہ ہماری آمد کے منتظر تھے۔ میں نے اچانک حلق کے بل چیخ کر اپنے ساتھیوں کو ان کی موجودگی سے خبردار کیا اور خطرے کی بُو سُونگھتے ہی مستعد ہو گیا۔

شالیار خان ان مسلح گھڑ سواروں کو دیکھ کر بڑے عجیب انداز میں مسکرایا اور خود کلامی کے عالم میں بولا "صورتِ حال بہت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دلچسپ ہوتی جا رہی ہے۔ مجھے ان لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کا کبھی افسوس نہیں ہو گا کیوں کہ یہ مظلوم کی داد رسی کے لیے نہیں بلکہ ظالموں کی برتری ظاہر کرنے کے لیے جمع ہُوئے ہیں۔ کیا خیال ہے نوجوان! یہ خون خرابہ کیے بغیر ہمیں گزرنے کا راستہ نہیں دیں گے" شالیار خان نے اچانک مجھے اپنی جانب متوجہ کرتے ہُوئے کہا۔

"تمھارا خیال دُرست ہے" میں نے خیال آرائی کرتے ہُوئے جواب دیا "ان شُبہات کا اظہار میں پہلے ہی کر چکا ہوں۔"

جونہی ہم گلی کے موڑ تک پہنچے، وہ ہمارا راستہ روک کر کھڑے ہو گئے۔ ان میں سے ایک بھاری جسم کا آدمی جو اپنی وضع قطع سے چھٹا ہُوا بدمعاش نظر آ رہا تھا، کرخت لہجے میں بولا۔ "تم لوگ میرے بھائی کے قاتل کو ہمارے حوالے کر دو تو تمھاری زندگیاں ہمارے انتقام سے محفوظ رہ سکتی ہیں، ورنہ اس بستی کے در و دیوار تم سب کی موت کے سوگ میں ڈوب جائیں گے۔"

"تم اپنی خیر مناؤ نوجوان!" شالیار خان نے بپھرے ہُوئے شیر کی طرح گرجتے ہُوئے جواب دیا "اگر ایک لمحے کے اندر تم نے ہمارا راستہ نہ چھوڑا تو میری رائفل کی گولی تمھیں راستہ چھوڑنے پر مجبور کر دے گی۔"

اچانک ایک بدمعاش نے اپنی رائفل سیدھی کرتے ہُوئے ہاتھ کو حرکت دی تو میں نے پھُرتی سے اس کے بازو کا نشانہ لے کر گولی چلا دی۔

میری گولی اس کا بازو توڑتی ہُوئی نکل گئی۔

وہ ایک بلند آواز کے ساتھ چنگھاڑا اور رائفل اس کے ہاتھ سے نکل گئی... پھر وہ گھوڑے سے گر پڑا۔

اس کے ایک بھائی نے اسے گرتے دیکھ کر مجھے اپنی گولی کا نشانہ بنانا چاہا مگر سارجنٹ آرٹ کی ایک گولی نے اسے گھوڑے سے اُچھال کر چند قدم پیچھے پھینک دیا۔

ان دونوں کا انجام دیکھ کر ان کے ساتھی اچانک پیچھے ہٹے اور مورچہ بندی کرتے ہُوئے جوابًا گولیاں چلانے لگے مگر ان کی یہ بُزدلانہ حرکت میرے کسی ساتھی کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکی۔

ہم نے اپنے گھوڑے پیچھے ہٹائے اور ایک دیوار کی آڑ میں ہو کر ان کی فائرنگ کا جواب دینے لگے۔ اس ہولناک فائرنگ کے دوران میری ساری توجہ شالیار خان کی طرف تھی۔ جسے وہ ہر قیمت پر مُردہ دیکھنا چاہتے تھے اور میں اپنی زندگی کی بھینٹ دے کر بھی اس کی زندگی کی حفاظت کرنا چاہتا تھا۔

میں نے اپنی رائفل خالی پا کر ریوالور ہولسٹر سے نکالا اور اُس آدمی پر فائر کر دیا جو اپنے ایک بازو سے محروم ہونے کے باوجود ابھی تک میدان میں ڈٹا ہُوا تھا اور اپنی جان سے بے پروا شالیار خان کو ہلاک کرنے پر تُلا ہُوا تھا۔ میں یہ بات محسوس کر چکا تھا کہ جب تک یہ زخمی نوجوان میدان میں موجود ہے، جنگ کوئی فیصلہ کُن رُخ اختیار نہیں کر سکتی۔ ہم ایک مظلوم لڑکی کی داد رسی کے لیے آئے تھے مگر یہاں آتے ہی جنگ کے ہولناک شعلوں سے واسطہ پڑ گیا۔ میں نے ایک بار پھر اسی زخمی نوجوان پر فائر کیا جو اَب درخت کی آڑ لے کر ہم پر جوابی گولیاں چلا رہا تھا۔

اس نے میری گولیوں کا جواب بڑی دیدہ دلیری سے دیا اور اس وقت تک مسلسل فائر کرتا رہا جب تک اس کا ریوالور خالی نہیں ہو گیا۔

میں اس کا ریوالور خالی دیکھتے ہی دیوار کی آڑ سے نکل آیا۔ وہ اپنے ریوالور میں گولیاں بھر رہا تھا کہ میرے ریوالور سے نکلی ہُوئی گولی نے اس کے سینے میں سوراخ کر دیا۔ وہ چیختا ہُوا زندگی کی حدود پار کر کے ساکت ہو گیا۔ اس کے مرتے ہی اس کے ساتھی حوصلہ ہار بیٹھے اور گولیاں چلاتے ہُوئے فرار ہونے لگے۔

میرا اندازہ دُرست ہی نکلا تھا۔ میرے ہاتھوں سے مرنے والا یقینًا قدیم خان تھا۔ جو اپنے بھائی کے انتقام لینے کے لیے اپنی جان کی بازی لگانے آیا تھا۔

میدان صاف پاتے ہی سارجنٹ آرٹ نے خوشی کا ایک نعرہ بلند کیا اور دیوار کی آڑ سے نکل کر میری پیٹھ تھپکنے لگا "ہم نے اپنے دُشمنوں پر فتح حاصل کر لی ہے۔ اگر تم کہو تو پیچھا کر کے ان کے بوجھ سے زمین کو نجات دلا دی جائے، ورنہ ہو سکتا ہے یہ بھگوڑے دُشمن ہمارے جاتے ہی اس مظلوم لڑکی کے خون سے انتقام کی پیاس بجھانے کی کوشش کریں... اس بستی کے سارے ہی لوگ ان لٹیروں کے ساتھی ہیں۔ ورنہ اس مظلوم لڑکی کی باتوں پر سنجیدگی سے ضرور توجہ دیتے۔"

سارجنٹ آرٹ نے اپنے خدشات ظاہر کیے تو میں حیرت زدہ ہو کر اس کے چہرے کو گھُورنے لگا۔ شاید میری زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ ایک فرنگی نے محکوم قوم کی کسی بے آسرا لڑکی کے لیے ہمدردی ظاہر کی تھی۔

"معلوم ہوتا ہے اس بستی کو غلاظتوں سے پاک کرنے کے لیے ہمیں اپنا کچھ وقت یہاں گزارنا پڑے گا!" شالیار خان میرے قریب آ کر، گھوڑا روکتے ہوئے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"تمھارا خیال درست ہے، شالیار خان!" میں نے خوش گوار انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

"لیکن دشمن کے گھر میں گھس کر بیٹھ رہنا مصلحت کے خلاف ہے۔ جب انھیں اپنے مزید دو آدمیوں کے مرنے کی اطلاع ملے گی تو ان کے انتقام کی آگ . . . بھڑک سکتی ہے اور یہ لوگ ہمارے لیے خطرناک بھی ثابت ہو سکتے ہیں۔" شالیار خان نے اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے جواب دیا۔ "اس وقت اپنے پڑاؤ پر پہنچنا بہت ضروری ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ابھی اس جنگ کا خاتمہ نہیں ہوا۔ دشمن ہم پر بے خبری میں یلغار کرنے کی بھرپور کوشش کرے گا۔ جنگ اب دوسرے مرحلے میں داخل ہو چکی ہے۔ جب تک یہ دوسرا مرحلہ طے نہیں ہو جاتا۔ ہمارا آگے سفر کرنا خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے۔"

"نوری اور اس کے خاندان کے افراد ان دو آدمیوں کے مرنے کے بعد دوبارہ خطرے کی زد میں آ چکے ہیں۔ جب تک سردار دلبر خان اور کریم خان کے بھائیوں میں سے کوئی زندہ ہے، یہ خدشہ باقی رہے گا۔ وہ میدان صاف پاتے ہی ان بے گناہ لوگوں کو انتقام کا نشانہ بنائیں گے۔ مجھے تو اس نئی جنگ کا خاتمہ جلد ہوتا نظر نہیں آتا۔" میں نے کہا۔

ابھی میری بات ادھوری تھی کہ اپنے عقب میں دور کہیں سے رائفلوں کے دھماکوں کی آواز سنائی دی۔

میں نے چونک کر شالیار خان کی طرف دیکھا جو گھوم کر دیکھنے لگا تھا۔

دھماکوں کی آوازیں ایک بار پھر ابھری تھیں کہ اس نے مجھے سر کے اشارے سے پیچھے آنے کے لیے کہا اور خود گھوڑے کو دوڑاتا ہوا گلی پار کرنے لگا۔

میں ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر اس کے پیچھے چند قدم کے فاصلے پر موجود تھا اور میرے عقب میں سارجنٹ آرٹ دوسرے جوانوں کے ساتھ چلا آ رہا تھا۔ جونھی گلی ختم ہوئی، لوگوں کی پرشور آوازیں سماعت کے پردے پھاڑنے لگیں۔

شالیار خان گلی کے موڑ پر چند لمحوں تک اپنا گھوڑا روک کر ان آوازوں کی سمت کا اندازہ لگاتا رہا پھر دائیں طرف گھوڑا موڑ کر آہستگی سے چل پڑا۔ چند قدم کا فاصلہ طے کیا ہو گا کہ اچانک سامنے سے کچھ رائفل بردار ہمیں اپنی طرف آتے ہوئے نظر آنے لگے۔

ہم پر نظر پڑتے ہی وہ ایک دم ٹھٹک کر رہ گئے اور حیرت سے ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔

وہ جب تک حیرت کے غلبے سے نکل کر کوئی حرکت کرنے کے قابل ہوتے شالیار خان نے اپنی رائفل سیدھی کرتے ہوئے انھیں للکارا۔

"تم میں سے اگر کسی نے بہادر بننے کی کوشش میں کوئی احمقانہ حرکت کی تو میری گولیاں اس کے جسم میں سوراخ کر دیں گی۔ اپنی رائفلیں پھینک کر ایک طرف کھڑے ہو جاؤ۔" شالیار خان کی کھردری آواز میں نہ جانے کون سا تاثر تھا کہ ان لوگوں نے اس کے حکم کی تعمیل میں ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کی جیسے انھیں یقین ہو کہ شالیار خان ان کی زندگی کا سورج غروب کر دے گا۔

چار جوانوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر اپنی رائفلیں پھینک کر ایک طرف قطار میں کھڑے ہو گئے۔ ان میں سے ایک جو اُن میں قدرے دلیر نظر آتا تھا، بول پڑا۔

"تم لوگ کون ہو؟ تمھارے آتے ہی اس بستی کا سکون بگڑ گیا ہے۔ تمھاری ہم سے کیا دشمنی ہے؟ جو ایسا سلوک کر رہے ہو؟"

"ہماری تم سے کوئی دشمنی نہیں، نوجوان!" شالیار خان نے پرسکون انداز میں جواب دیا۔ "اس کے برعکس تمھاری بستی کے لوگ ہم سے الجھنے کے لیے طرح طرح کے بہانے تراش رہے ہیں۔"

"کیا تم لوگوں نے کریم خان اور داول کو قتل نہیں کیا؟ اور اب تم قدیم خان اور کلیم خان کو بھی موت کے گھاٹ اتار چکے ہو۔ تمھارے اس وحشیانہ سلوک کے باعث سردار دلبر خان نے ساری بستی کے جوانوں کو تمھارے خلاف اپنی جنگ میں شریک کر لیا ہے۔ ہم تیار ہو کر اس کی حویلی کی طرف جا رہے تھے کہ تم سامنے آ گئے۔ تمھاری ان قاتلانہ حرکتوں کا کوئی مطلب ضرور ہو گا یا اپنے گھر سے کسی تفریح کے ارادے سے نکلے ہو اور خلق خدا پر موت کی آگ برسا رہے ہو۔"

اس کی جرأت آمیز باتوں نے ہمیں بے حد متاثر کیا۔ اس بستی میں یہ پہلا آدمی تھا جس نے کسی معقول انسان کی طرح ہم سے سوال کیا تھا۔

"نوجوان! اگر تم کریم خان اور داول کی موت سے آگاہ ہو تو پھر اس کی وجہ بھی تمھارے سامنے واضح ہو چکی ہو گی۔ ہم نے ایک معصوم لڑکی کو جو اس بستی کی بیٹی ہے ان لٹیروں کی دسترس سے محفوظ رکھا تھا۔ مگر مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس بستی کے کسی شخص نے بھی اس مظلوم لڑکی کے ساتھ ہمدردی ظاہر نہیں کی جسے دونوں لٹیرے رات کی تاریکی میں اس کے گھر میں گھس کر اغوا کر کے اپنی ناپاک خواہشات پوری کرنے کے لیے لڑکا پر لے گئے تھے۔ یہ ان کی بدنصیبی تھی کہ اس مظلوم لڑکی کی چیخیں ہمارے کانوں سے ٹکرا گئیں۔ ہم اپنی آنکھوں کے سامنے ایک مظلوم اور بے بس لڑکی کے ساتھ یہ ظلم ہوتا نہ دیکھ سکے۔ نوجوان تمھاری بھی کوئی بہن ہو گی۔ اگر وہ وحشی تمھاری بہن کے ساتھ ایسا سلوک کرتے تو کیا تم اس زیادتی کو خاموشی سے برداشت کر لیتے؟"

شالیار خان نے کریم خان اور داول کی موت کا پس منظر تفصیل سے بیان کرتے ہوئے سوال کیا۔

"نہیں! میں ان بے غیرتوں کو فوراً موت کے گھاٹ اتار دیتا۔" نوجوان نے بڑے سکون کے ساتھ جواب دیا۔

"اس کے باوجود میں نے ان پر گولی چلانے میں پہل نہیں کی بلکہ انھیں للکار کر دور ہٹ جانے کے لیے کہا تھا مگر انھوں نے مجھے تنہا سمجھ کر حملہ کر دیا اور پھر میری رائفل سے نکلی ہوئی گولیوں نے انھیں جہنم کے راستے پر روانہ کر دیا۔"

شالیار خان نے پر اعتماد انداز میں اپنی کارگزاری سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

"جب ہم اس مظلوم لڑکی کے ساتھ ان بے غیرتوں کی لاشیں لے کر تمھارے کینہ پرور سردار کے پاس پہنچے تو اس نے ہماری بات سننے سے انکار کر کے کریم خان اور داول کے قاتل کا مطالبہ کرتے ہوئے ہمیں اس وقت تک اپنی حراست میں رکھنے کا فیصلہ کر لیا جب تک کریم خان کے بھائی نہیں آ جاتے۔ اب تم بتا رہے ہو کہ قدیم خان اور کلیم خان مارے جا چکے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ اس کے بھائیوں تک موت کی اطلاع پہنچ گئی ہے اور وہ دلبر خان کے ساتھ مل کر ہمارے خلاف بستی کے لوگوں کو منظم کر رہے ہیں۔ یاد رکھو نوجوان!" اس نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "جس طرح وہ اپنے ناپاک عزائم میں پہلے ناکام رہے تھے اسی طرح آئندہ بھی ان کی فتح مندی کے دور دور تک کوئی امکانات نہیں ہیں کیونکہ یہ لوگ راستی پر نہیں ہیں اور سچائی کی ان دیکھی قوتیں ان کی کوئی مدد نہیں کریں گی۔ تم دیکھو گے کہ ہم ان کا کیسا عبرتناک حشر کرتے ہیں۔ اب تم ہمیں وہاں لے چلو جہاں یہ سب گناہ گار لوگ انسانیت کے خلاف اپنی پرانی جنگ دوبارہ شروع کرنے کے لیے صفیں آراستہ کر چکے ہیں۔ اگر تم لوگ اس جنگ سے لاتعلقی کا یقین دلاؤ تو ہم تم پر اعتبار کر سکتے ہیں۔ تمھاری زندگیوں پر موت کے منڈلاتے ہوئے خوفناک سایوں کو دور کر سکتے ہیں کیونکہ ہم فاتح ہو کر اس بستی کے کسی شخص سے زیادتی نہیں رکھتے۔ یہ جنگ تم لوگوں نے اپنی احمقانہ حرکتوں سے ہم پر مسلط کی ہے اور جو بھی اس جنگ میں شریک ہونے کا ارادہ رکھتا ہے ہمارے فاتح ہاتھوں سے فنا کے گھاٹ اتر جائے گا کیونکہ ہم سچائی کے نمائندے ہیں اور اس وقت انسانیت کی ایک عظیم خدمت انجام دے رہے ہیں۔ یاد رکھو! بدی کی کوئی قوت ہمیں اس وقت تک گزند نہیں پہنچا سکتی جب تک ہم مظلوموں کی حمایت کرنے سے اپنا ہاتھ نہیں اٹھا لیتے۔" شالیار خان کی آواز میں ایک دبدبہ تھا! ایک انوکھا وقار تھا جس نے سب کو متاثر کیا۔

شالیار کی تقریر سن کر وہ چاروں جوان کچھ دیر اس کی طرف حیرت زدہ نظروں سے دیکھتے رہے۔ شالیار کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ انھوں نے ایسی شاندار تقریر کی تھی اور اپنے وقت کے ایک نامور بہادر سے گفتگو کرنے کا اتفاق ہوا تھا۔

"خان بابا! ہم پہلے بھی اس بدکار جنگ کے حق میں نہیں تھے مگر اس میں شریک ہونے کے لیے مجبور تھے۔ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ دلبر خان اور کریم خان کے بھائیوں کا ساتھ نہیں دیں گے اور اگر ان فتنہ پرور لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کا یقین دلاؤ تو ہم تمھارا ساتھ دینے کے لیے تیار ہیں کیونکہ تم مظلوموں کی حمایت کے لیے لڑ رہے ہو۔ دلبر خان اور اس کے ساتھیوں نے ساری بستی کو اپنی دہشت کی لپیٹ میں لے رکھا ہے اور کسی کی بہو بیٹی کو بے آبرو کرنا ان کا بہترین مشغلہ ہے۔ مگر خوف کی زیادتی سے کوئی ان کے سامنے زبان کھولنے کی جرأت نہیں کر سکتا کیونکہ یہ لوگ پشتہ در لٹیرے ہیں اور اپنے خلاف زبان کھولنے والے کو کبھی معاف نہیں کرتے۔ ان کے کردار کا ایک عکس تم خود

دیوتاؤں کے شہر نیپال میں بسنے والے
ایک درندے کی پراسرار داستان
درندہ
یعقوب جمیل کے ہوشربا قلم سے جس کا
قارئین کو برسوں سے انتظار تھا
مکتبہ القریش سرکلر روڈ اردو بازار لاہور
فون 7668958

بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہو۔"
اس نوجوان نے ہماری حمایت کرنے کا یقین دلایا تو شالیار دیر تک اس کے چہرے کو بڑے غور سے دیکھتا رہا۔
"ٹھیک ہے نوجوان!" اس نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے گرج دار آواز میں جواب دیا۔ "میں اس سچائی کی قدر کرتا ہوں اور تمھیں اس بات کا یقین دلاتا ہوں کہ دلبر خان کا قتل کیے بغیر یہاں سے نہیں جاؤں گا۔ اور اگر تم نے پوری دیانتداری سے ہمارا ساتھ دیا تو کوئی وجہ نہیں کہ ان کے مضبوط گروہ کو ختم کرنے میں کامیابی حاصل نہ کر سکیں۔ تم اپنی بستی کے لوگوں کو اس جنگ سے دور رہنے کے لیے آمادہ کر لو۔ اس سے ان لوگوں کی تعداد کم ہو جائے گی اور ہمیں مجرموں کے ساتھ کسی بے گناہ انسان کا خون بہانے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔"
"جب سردار دلبر اور کریم خان کے سارے بھائی اس دنیا سے رخصت ہو جائیں گے تو دوسرے لوگ تمھارے سامنے ہتھیار ڈال کر تمھیں اس بستی کا نجات دہندہ قرار دے دیں گے۔ میں خود بھی زخم خوردہ ہوں اور مجھے ان لوگوں سے انتقام لینے کی شدید خواہش ہے کیونکہ اس کے اشارے پر میری ایک بہن کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا... لیکن بعد میں خود اسی نے معاملہ رفع دفع کروا دیا۔ ممکن تھا میں ان کے خلاف ہتھیار اٹھا لیتا مگر جب میری ماں نے مجھ سے یہ کہا کہ میرے مرنے کے بعد باقی چار بہنیں بے آسرا ہو جائیں گی اور وہ تنہا ان کی آبرو کی حفاظت نہیں کر سکے گی تب میں نے یہ معاملہ خدا پر چھوڑ دیا۔ اور اس وقت کا انتظار کر رہا ہوں کہ جب کوئی اللہ کا بندہ اٹھے اور بستی سے کفر کا خاتمہ کر دے۔"
نوجوان کی آواز شدتِ جذبات سے بھرا گئی۔
ہم سب خاموشی سے سُن رہے تھے۔
"اگر تم واقعی انھیں ختم کرنے کا ارادہ کر چکے ہو تو اس بستی کے مغربی گوشے میں واقع اس حویلی کو گھیرے میں لے لو جہاں اس وقت بھیڑیوں کا غول جمع ہو رہا ہے اور جس میں سب لوگوں کو شامل ہونے کی ہدایت کی جا رہی ہے۔"
"تم ہمیں اس جگہ لے چلو جہاں وہ لوگ دلوں میں نفرت کی آگ جلائے اپنی مکروہ سرگرمیوں میں مصروف ہیں اس کے بعد تمھارا کام ختم ہو جائے گا۔" شالیار خان نے کہا۔
"مگر وہاں تو سو سے زائد آدمی موجود ہیں اور ندی پر جانے والے راستے کی نگرانی کر رہے ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ سردار کے حکم سے نوری اور اس کی ماں کو بھی وہیں بلوا لیا گیا ہے اور ان سے تم سب کے بارے میں بازپرس کی جا رہی ہے۔"
اس دھماکا خیز انکشاف پر شالیار خان کا پتھریلا چہرہ یکلخت غصے کی شدت سے سیاہی مائل ہو گیا۔ اس کی خوفناک آنکھوں سے خون ٹپکتا محسوس ہو رہا تھا۔
"نوجوان! تم نے یہ بتا کر اچھا کیا کہ نوری اور اس کی ماں ان درندوں کے نرغے میں ہیں۔ اب اتنا وقت نہیں ہے کہ اپنے دوسرے ساتھیوں کا انتظار کریں۔ ہمیں جو کچھ کرنا ہے ابھی کرنا ہے۔ ابھی کچھ نہیں بگڑا۔ ہم محاصرہ کر کے ان مظلوم عورتوں کو درندوں کی دسترس سے محفوظ رکھ سکتے ہیں۔"
میں اس دوران میں اپنے بابا کی طرف ہی متوجہ رہا تھا اور اس کے پُروقار انداز اور لہجے کی گھن گرج محسوس کرتے ہوئے چشمِ تصور سے وہ مناظر دیکھ رہا تھا جنھیں میں نے صرف کاغذات میں پڑھا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ سارے مناظر ماضی کے ملبے سے نکل کر حال میں میرے سامنے آ گئے ہوں۔ سارجنٹ بار بار کن انکھیوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔
ان چار جوانوں کو...... میرے ساتھیوں نے اپنے ساتھ بٹھا لیا اور ہم تیزی سے گھوڑے دوڑاتے ہوئے اس راستے پر چل پڑے جدھر اس نوجوان نے اشارہ کیا تھا۔ اس وقت ساری بستی میں ایک عجیب سے سناٹے اور ہُو کا سا عالم طاری تھا۔ جیسے اس بستی سے زندگی کے آثار معدوم ہو چکے ہوں اور بستی قبرستان بن چکی ہو۔
ایک چکر دار راستہ طے کر کے ہم دوبارہ ندی کی طرف جانے والے راستے پر آ نکلے۔ آبادی سے چند قدم ہٹ کر ایک حویلی دکھائی دی جس کے در و دیوار سے مضبوطی مگر بوسیدگی ٹپکتی تھی۔ یہ قلعہ نما حویلی خاصی وسیع تھی اور اپنے اندر سینکڑوں آدمی سمو کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔
جونہی ہمارا قافلہ حویلی کے سامنے پہنچا کسی نے چیخ کر اپنے ساتھیوں کو ہماری آمد سے خبردار کیا اور حویلی کا دروازہ بند کر کے قلعہ بندی کر لی۔
اچانک بلند دیوار سے کسی نے سر ابھار کر ہمارا جائزہ لیا۔ میں نے کسی تاخیر کے بغیر اس پر گولی جھونک ماری۔ نشانہ درست تھا۔ اس کی کھوپڑی چیتھڑوں میں بٹ کر پھیل گئی اور وہ کوئی آواز نکالے بغیر جہنم رسید ہو گیا۔
اس کے گرتے ہی گولیوں کی ایک باڑ ہماری سمت آئی۔ جس نے ہمیں آگے بڑھنے سے روک دیا۔ ہم پھیل کر اس حویلی کے گرد لگے درختوں کی آڑ میں ہو گئے اور گولیوں کا جواب دینے لگے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہمارے پاس بارود کی کمی نہیں تھی۔ اس کے باوجود میرے مستعد ساتھیوں نے اپنا بارود ضائع کرنا مناسب خیال نہیں کیا۔ اچانک ایک گولی آ کر اس درخت میں پیوست ہو گئی جس کے پیچھے میں پناہ لیے ہوئے تھا۔
میں نے فوراً اس گولی کا جواب دیا اور میری رائفل سے نکلی ہوئی گولی نے ایک آدمی کو چاٹ لیا۔ اس اثنا میں شالیار خان بھی اپنی رائفل سے نشانے بازی میں مصروف اپنے کمالات دکھا رہا تھا۔ اس نے اس وقفے میں تین آدمیوں کو موت کی سرحد تک پہنچا دیا تھا اور ابھی نہ جانے مزید کتنے لوگ ہم پر مسلط کی گئی جنگ کا ایندھن بننے والے تھے۔
اچانک شالیار خان نے ایک غیر معمولی حرکت کی اور اپنی جان کو خطرے میں ڈالتے ہوئے درخت سے زمین پر کود گیا۔ پھر وہ تیزی سے رینگتا ہوا اس دیوار کی طرف بڑھنے لگا جس کے پیچھے دشمنوں کی کثیر تعداد موجود تھی۔ اس نے چلتے چلتے سارجنٹ سے دستی بم لے لیے تھے۔
وہ ابھی دیوار سے چند گز دور ہی تھا کہ موت کے ہرکارے نے تاک کر آگ برسانے لگے۔ مگر وہ ان کی گولیوں سے بچتا ہوا تیزی سے آگے بڑھتا رہا پھر اچانک اس نے اپنا ایک ہاتھ فضا میں بلند کیا اور ایک دستی بم کی پن نکال کر اسے دیوار کی دوسری جانب پھینک دیا۔
بم ایک دھماکے سے پھٹا اور قلعہ نما حویلی میں موت کا شور گونجنے لگا۔
اس نے یکے بعد دیگرے تینوں دستی بم استعمال کیے ان تین بموں نے دشمن کے گھر میں زبردست تباہی پھیلا دی تھی۔ اس خوفناک تباہی نے ہمارے دشمن کی ساری مزاحمت ختم کر دی
اور دیوار گر جانے سے ان لوگوں میں سراسیمگی پھیل گئی۔
جب بموں کے کثیف دھوئیں کے بادل چھٹے تو اچانک ایک بار پھر ہمارے کان انسانی چیخوں اور کراہوں سے سنسنانے لگے مگر ابھی جنگ مکمل طور پر ختم نہیں ہوئی تھی۔
اب دشمن اپنی جانیں بچانے کے لیے دفاعی جنگ لڑنے پر مجبور ہو گیا تھا پھر جونہی شالیار خان لوٹ کر اپنی جگہ آیا میں نے اس کے قریب پہنچتے ہوئے کہا۔
"میں اس وقت تمھارے لیے بے حد فکرمند ہو گیا تھا جب تم گولیوں کی بوچھاڑ میں دیوار کی جانب بڑھ رہے تھے۔ تم نے تین دستی بم پھینک کر ان کی قوت بہت متاثر کر دی ہے۔ اب یہ چند لمحوں سے زیادہ ہمارے سامنے نہیں ٹھہر سکیں گے۔"
وہ جواباً خاموش نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا... پھر اس کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ رینگ آئی۔ اگلے ہی لمحے اس نے درخت کی اوٹ سے نکل کر ٹوٹی ہوئی دیوار کے سامنے پہنچ کر اپنا گھوڑا روکا اور بلند آواز میں بولا۔
"میں تم لوگوں کو چند لمحوں کی مہلت دیتا ہوں۔ اگر اس عرصے میں تم لوگوں نے ہتھیار ڈال کر ہم سے امان طلب نہ کی تو اس حویلی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے گی۔"
شالیار خان کی دھمکی کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ لوگ ڈرتے ڈرتے آگے بڑھے اور اپنے ہتھیار پھینک کر ٹوٹی ہوئی دیواروں سے نکلنے لگے۔ ان کے چہرے خاک و خون میں لتھڑے ہوئے تھے اور ہر چہرے پر موت کی ویرانیاں ناچ رہی تھیں۔
تقریباً تیس کے قریب نوجوان اور بوڑھے آدمیوں نے ہمارے سامنے ہتھیار ڈال کر امان طلب کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ مگر ان میں سردار دلبر خان نظر نہیں آ رہا تھا۔

ہولناک اور پُراسرار ماحول میں جنم لینے والی ایک حقیقت جو کہانی بن گئی
ایک آشفتہ حال کی داستانِ عبرت جسے قانون نے مجرم بنا دیا
رقصِ ابلیس
انوار صدیقی
قیمت:-/150
ناشر: مکتبہ القریش
اردو بازار لاہور

سنہری غول
اسلم راہی ایم اے
قیمت:-/150

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"تمھارا سردار کہاں ہے؟ اس کو ختم کیے بغیر خیر و شر کی یہ جنگ ختم نہیں ہو سکتی۔"

شالیار خان نے خوفناک لہجے میں دہشت زدہ لوگوں سے سوال کیا۔ مگر اُن کے چہروں پر موت کی سی سوگوار خاموشی طاری رہی وہ دہشت زدہ نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے "بستی کا سردار اور اس کے ساتھی مارے جا چکے ہیں۔"

ان میں سے ایک بوڑھے نے جواب دیا اور ہم لوگ تمھارے سامنے ہتھیار ڈال کر جنگ کے خاتمے کا اعلان کر چکے ہیں۔"

"اگر تم لوگ پُرامن رہنے کا وعدہ کرو تو تمھاری جانیں بخشی جا سکتی ہیں، ورنہ اپنے سردار اور اس کے ساتھیوں کا انجام تمھارے سامنے ہے۔" شالیار خان نے انھیں امن پسندی کی تلقین کرتے ہوئے پوچھا۔ "نوری اور اس کی ماں کہاں ہے؟"

"دونوں حویلی کے ایک کمرے میں محفوظ ہیں اور ہم تمھیں یقین دلاتے ہیں کہ تمھارے جانے کے بعد ہم لوگ اپنی جان سے بڑھ کر ان کی حفاظت کریں گے۔ شرپسندوں کا خاتمہ ہو چکا ہے اب اس بستی کی بہو بیٹیوں کی عزت بدکردار رنگیوں کی دسترس سے محفوظ ہو چکی ہے۔"

چند آدمی حویلی میں جا کر نوری اور اس کی ماں کو لے آئے۔ جنھیں زندہ و سلامت پا کر شالیار خان کا چہرہ پُرسکون ہو گیا۔

"بیٹی ہم نے مجرموں کی حمایت کرنے والے گروہ کو ختم کر دیا ہے۔ اب تم دوبارہ اپنے گھر میں بلا خوف و خطر تنہا رہ سکتی ہو۔" شالیار خان نے نوری کو دلاسہ دیتے ہوئے کہا اور واپس چلنے کے لیے تیار ہو گیا۔

"مگر دوست تم ہو کون؟" اسی بوڑھے نے نرم لہجے میں شالیار خان سے سوال کیا۔ "تم اس بستی کے معزز مہمان ہو۔ ہمیں کچھ خدمت کرنے کا موقع دو۔ ہم اپنے نجات دہندہ کو اس طرح اپنی بستی سے رخصت نہیں ہونے دیں گے۔"

"نہیں دوست!" شالیار خان نے خوشگوار انداز میں مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "ہمارا سفر بہت طویل ہے۔ ہمیں جانے دو۔ زندگی رہی تو ایک بار پھر اس بستی کا چکر لگائیں گے اور تم لوگوں کے حالات جاننے کی کوشش کریں گے۔ تم کسی شریف آدمی کو اپنا سردار مقرر کر کے بستی کو نمایاں شاندار ترقی دے سکتے ہو۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہمارے پاس اتنا وقت نہیں کہ تمھاری مہمان نوازی سے لطف اندوز ہو سکیں۔"

بستی والوں کے انتہائی اصرار کے باوجود شالیار خان نے بڑی خوبصورتی سے انھیں ٹال دیا اور ہم خدا حافظ کہہ کر دوبارہ اپنے قافلے سے آملے۔

پڑاؤ میں آتے ہی اناج کے چند تھیلے اپنے حلق میں ٹھونسنے کے بعد میں نے قافلے کو تیاری کا حکم دے دیا اور ندی پار کر کے ایک خاص ترتیب سے آگے بڑھنے لگے۔

شام ہونے تک ہم ایک بلند پہاڑ کے دامن میں پہنچ گئے جہاں راستہ اس قدر تنگ اور دشوار گزار ہو گیا کہ کوسوں تک بلندیوں کی جانب سفر کرتا دکھائی دیتا تھا۔

شالیار خان کا گھوڑا میرے گھوڑے کے ساتھ ساتھ بھاگ رہا تھا میں محتاط انداز میں پتھریلا راستہ پار کر رہا تھا کہ اچانک میرا گھوڑا بڑے زور سے ہنہنایا۔ اُسے ٹھوکر لگی اور وہ لڑکھڑا گیا۔ اس اچانک افتاد سے میں اُچھل پڑا۔ گھوڑا میری ٹانگوں سے نکل کر گہرائیوں میں جا گرا لیکن میں۔۔۔ میں اُچھل کر فضا میں جہاں تھا وہیں معلق ہو گیا تھا اور میری پھٹی پھٹی آنکھیں گھوڑے پر جمی ہوئی تھیں جو ہڈیوں اور گوشت کا ڈھیر بن گیا تھا لیکن میں فضا میں کیوں معلق ہوں؟ زندگی میں پہلی بار میرے جسم کے سارے ہی مسام ٹھنڈا ٹھنڈا پسینہ اگلنے لگے اور میں نے ایک لمحے کے لیے اسی حالت میں آنکھیں بند کر لیں۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

بات چند لمحوں کی تھی لیکن یہ لمحے صدیوں پر محیط محسوس ہو رہے تھے۔ میرا وجود ابھی تک فضا میں معلق تھا اور میری آنکھوں کے سامنے موت کا کہرآلود غبار رقص کرنے لگا تھا۔ میری نظریں سینکڑوں فٹ گہرائیوں پر جمی ہوئی تھیں جہاں میرا خوبصورت اور تربیت یافتہ گھوڑا موت کی دہلیز پار کر کے ٹکڑوں میں بٹ گیا تھا۔ اس کی نعش کا ڈھیر دیکھ کر میرے اندر عجیب سی ٹوٹ پھوٹ مچ گئی تھی۔ میرے کانوں میں سیٹیاں سی گونجنے لگیں۔ ان سیٹیوں کے شور میں میرے شعور اور لاشعور کے درمیان ایک خوفناک جنگ جاری ہو گئی۔

شعور ابھی تک یہ فیصلہ کرنے سے قاصر تھا کہ جب میرا گھوڑا اچانک ٹھوکر کھا کر بلندیوں سے گہرائیوں کی جانب گرا تھا اور چند ساعتوں میں اس کا طاقت ور وجود موت کی آگ چاٹنے پر مجبور ہو گیا تھا تو میں گرنے سے کیسے بچ گیا؟ ان گہرائیوں کی جانب لڑھکنے سے پہلے کس شے نے مجھے گرنے سے محفوظ رکھا جہاں موت کا بسیرا تھا، اور ابھی تک کس طاقت نے مجھے فضا میں معلق کر رکھا ہے؟

میں موت کے دہانے میں اُترنے سے بچ گیا تھا۔ مگر جب تک ہوا میں معلق تھا، میری زندگی کی کوئی ضمانت نہیں دی جا سکتی تھی۔ حواس بحال ہوتے ہی میرا وجود دہشت سے ٹھنڈے پسینے کی زبردست لپیٹ میں آ گیا اور میں نے گہرائیوں کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ تب اچانک یوں محسوس ہوا جیسے میرا وجود کسی ٹھوس چٹان سے چپکا ہوا ہے اور وہ چٹان آہستہ آہستہ پیچھے کی جانب سرک رہی ہے۔

اچانک ہی میرے وجود کو ایک زبردست جھٹکا لگا اور میرے پیروں نے دوبارہ زمین چھو لی۔ پاؤں زمین پر رکھتے ہی میں ایک دم سنبھلا۔۔۔ اور حیرت زدہ نظروں سے پلٹ کر دیکھنے لگا۔ شالیار خان اپنے گھوڑے پر سوار مجھے مسکراتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا جب اس نے میری پشت سے اپنا ہاتھ ہٹایا تو مجھ پر آن واحد میں یہ حقیقت منکشف ہو گئی کہ مجھے موت کے عفریت سے بچانے والا ہاتھ میرے ہی بابا کا ہاتھ تھا۔

"نوجوان! زندگی کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لیے جرأت اور دلیری کے ساتھ ساتھ احتیاط کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ خدا کا شکر ادا کرو کہ تم نے موت کے جبڑوں سے آزادی حاصل کر لی ورنہ گھوڑے کے ساتھ تمھاری ہڈیاں بھی سُرمہ بن گئی ہوتیں۔" یہ جملہ ختم ہوتے ہی اس کے چہرے سے اچانک ہی مسکراہٹ غائب ہو گئی اور اس نے اپنے مسکراتے ہوئے چہرے پر دوبارہ سنجیدگی کا پتھریلا غلاف چڑھا لیا۔

وہ ایک بار پھر مجھے خطرناک دشمن نظر آنے لگا۔ اس کے رویے میں یہ تبدیلی میرے لیے بے حد حیران کن تھی۔

"شالیار خان! تمھارے فولادی بازوؤں کی بروقت امداد نے مجھے موت کے منہ سے بچایا؟" میں نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔ "حالانکہ تمھارے لیے یہ بہترین موقع تھا کہ تم مجھے مر جانے دیتے۔ اس طرح تمھیں ایک طاقتور دشمن سے نجات مل جاتی مگر تم نے اس کے برعکس عمل کیا اور میری جان بچا کر مجھے زیر بار کر دیا۔ کیا میں اس نوازش کی وجہ دریافت کر سکتا ہوں؟ جان بچانے کا کردار صرف دوستوں کے لیے مخصوص ہے۔ دشمن تو موت کی دعائیں مانگا کرتے ہیں۔ مسیحا بن کر پذیرائی نہیں کیا کرتے؟"

میری باتیں سن کر شالیار خان دیر تک خاموش رہا۔ غصے کی زیادتی سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا اور اس کی آنکھیں نفرت کے شعلے اگلنے لگی تھیں۔ قافلہ رُک گیا تھا اور سارجنٹ آرث پلٹ کر دیکھ رہا تھا لیکن شاید ابھی تک صورت حال اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ اس نے دور ہی سے بلند آواز میں کہا: "کیا کوئی حادثہ پیش آگیا ہے؟" وہ گھوڑے کو ایڑ لگاتا ہوا تیزی سے ہماری جانب لپکا۔

"ایک خوفناک حادثہ۔۔۔ جواد مرتے مرتے بچا۔" میں نے بےخوفی سے جواب دیا۔

سارجنٹ آرث کی نظریں میری نظروں کا تعاقب کرتے ہوئے نیچے گہرائیوں کی جانب جھک گئیں تو اس کا سُرخ و سفید چہرہ دہشت سے پیلا پڑ گیا۔ اس نے بھی میرے گھوڑے کے بکھرے ہوئے ٹکڑے دیکھ لیے تھے۔

"اگر شالیار خان مجھے بروقت نہ تھام لیتا تو گھوڑے کی بکھری ہوئی ہڈیوں کے ساتھ میرے جسم کے ٹکڑے بھی تمھیں نظر آ جاتے۔۔۔ مگر میرا مہربان دشمن بہت دور کی سوچ رکھتا ہے۔ اس نے میری گردن پر ایک احسان کا بوجھ ڈال دیا ہے۔ تمھی بتاؤ سارجنٹ! اس خوفناک مرحلے سے گزرنے کے بعد میں اس شخص کا کیسے شکریہ ادا کروں؟"

اتنی دیر میں کچھ دوسرے ساتھی بھی ہمارے قریب آ گئے اور صورت حال دریافت کرنے لگے۔ میری باتوں کے جواب میں

شالیار خان خاموش نہ رہ سکا۔

"نوجوان! شالیار خان کم ظرف یا تنگ دل نہیں ہے کہ احسان کر کے کسی سے اپنی دشمنی بھول جانے کے لیے کہے۔ میری تمہاری دشمنی قائم ہے مگر میرا انتقام اس وقت شروع ہوگا جب ہم بگولا سنگھ سے نمٹ لیں گے۔ ابھی ہم ایک دوسرے کی حفاظت کے ذمے دار ہیں۔ تمہاری جان بچا کر میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا بلکہ اپنے اس قول کا ٹھوس ثبوت پیش کیا ہے کہ اس وقت تک ہم اپنی ذاتی دشمنی بھولے رہیں گے۔ جب تک ہم بخیر و خوبی نمٹ نہیں جاتی۔"

میں ایک فالتو گھوڑے پر سوار ہوگیا اور ہمارا قافلہ دوبارہ آگے چل پڑا۔

سورج اپنی آخری کرنیں نچھاور کرتا ہوا پہاڑوں کے پیچھے غائب ہو رہا تھا کہ ہم ایک بلند ٹیلے پر پہنچ گئے۔ میں نے اس ٹیلے کے قریب کشادہ جگہ دیکھ کر پڑاؤ ڈالنے کا حکم دے دیا اور خود گھوڑے سے اُتر کر کام کاج میں اپنے ساتھیوں کا ہاتھ بٹانے لگا۔

موت کا خوفناک مرحلہ گزر چکا تھا مگر میرا وجود ابھی تک اس ہولناک حادثے سے متاثر تھا۔ میرا ذہن بار بار یہی بات دُہرا رہا تھا کہ اگر شالیار خان کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس نے میری جان بچا کر اپنے دشمن پر نہیں بلکہ خود اپنی ہی ذات پر احسان کیا ہے تو اس کے تاثرات کیا ہوں گے اگر وہ مجھے نہ تھام لیتا تو شاید اسے کبھی معلوم نہ ہوتا کہ جسے اس نے دشمن سمجھ کر مرنے دیا تھا، وہ دشمن نہیں بلکہ اس کا اپنا لختِ جگر شہباز تھا۔

وہ ابھی تک مجھے اپنا دشمن ہی سمجھے ہوئے تھا اور میں اس کی اس غلط فہمی کو طول دینے پر مجبور تھا۔ اگر میں وقت سے پہلے یہ بھید کھول دیتا تو میرا منصوبہ ناکام ہو جانے کا خطرہ تھا اور پھر یہ بھی ڈر تھا کہ کہیں یہ انکشاف دوبارہ اس کی ذہنی حالت نہ خراب کر دے اور میں بازی جیت کر بھی کہیں شکست کے ہولناک دُکھ سے دوچار نہ ہو جاؤں۔

میرے تمام ساتھی اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے مگر میری توجہ کا مرکز شالیار خان کی ذات تھی۔ جس کے فولادی بازوؤں کی قوت نے مجھ سے "اپنی برتری کا لوہا منوا لیا تھا۔ اس کا فولادی جسم آج بھی اپنے اندر وہی قوتیں پوشیدہ رکھتا تھا، جو آج سے بیس سال پہلے اس کی شہرت اور ناموری کا باعث بنی ہوئی تھیں اس نے چیتے جیسی پھرتی کے ساتھ اپنے بازوؤں کی طاقت سے مجھ جیسے جسیم اور بھاری بھرکم جوان کو چند لمحوں تک فضا میں اس طرح معلق رکھا، میرے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا تھا کہ وہ کسی انسان کے ہاتھ بھی ہو سکتے ہیں... مگر حقیقت اپنا لوہا منوا کر رہتی ہے۔ میں یہ اعتراف کرنے پر مجبور تھا کہ شالیار خان اب بھی طاقت کا ایک خوفناک پہاڑ ہے جو اپنے اندر سینکڑوں زلزلے پوشیدہ رکھتا ہے۔

رات تک مجھ پر خاموشی طاری رہی اور میں اپنے خیمے میں بیٹھا، ماضی و حال کی سرحدوں سے گزرتا ہوا مستقبل کے دھندلکوں میں جھانکنے کی کوشش کرتا رہا۔ میں نے کھانا اپنے خیمے میں منگوا لیا اور چند لقمے زہر مار کر کے کہر آلود یادوں کو اپنے ذہن سے محو کرتا ہوا گھومنے نکل گیا۔

زندگی اب تک میرے ساتھ ایک بھیانک مذاق کرتی چلی آ رہی تھی اور یہ مرحلہ ان تمام مرحلوں پر بھاری تھا کہ میرا باپ میری آنکھوں کے سامنے موجود تھا مگر میں اسے سرِعام اپنا باپ نہیں کہہ سکتا تھا۔ گھومتے وقت بھی ایک درد آلود کہر میرے دل و دماغ پر محیط تھا جس کی خوفناکیاں میری رُوح کو جھلس رہی تھیں۔

میں نے واپس آتے وقت شالیار خان کے خیمے میں جھانک کر دیکھا تو وہ زنجیروں میں جکڑا کونے میں ایک طرف بیٹھا کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔

میری موجودگی محسوس کرتے ہی چونک کر اس نے نگاہ اُٹھائی، میری طرف دیکھا اور پھر نفرت سے مُنہ پھیر لیا کچھ دیر بعد اس نے دوبارہ میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"نوجوان! کیا یہ دیکھنے آئے ہو کہ آج سے بیس برس پہلے تمہارے آقاؤں نے میرے جسم کو جن خوبصورت زیورات سے آراستہ کیا تھا، وہ مجھے دوبارہ پہنا دیے گئے ہیں یا نہیں؟" اس کے کھردرے لہجے میں گہرا طنز تھا۔ "مگر یاد رکھو! تم میری رُوحانی پرواز سلب نہیں کر سکتے۔ میں نے آزاد فضاؤں میں آنکھ کھولی ہے اور میرا احساس ہمیشہ آزاد رہے گا کیونکہ اس میں کوئی کھوٹ نہیں ہے۔"

اس نے میری دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ میں تڑپ ہی تو اُٹھا۔

"شالیار خان! کیا بات ہے، تم اس قدر برہم کیوں نظر آ رہے ہو؟" میری آنکھوں میں اُلجھنیں اُتر آئی تھیں کیونکہ میں جانتا تھا کہ وہ دوبارہ زنجیریں پہنائے جانے پر برہم ہے اور مجھے پا کر مزید بھڑک اُٹھا ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"نوجوان! میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔ تم نے مجھ سے تعاون کی درخواست کی تھی جسے میں نے قبول کر لیا اور ابھی تک اپنے اس عہد کی پابندی کر رہا ہوں مگر تم نے اپنے عہد کی پابندی نہیں کی اور مسلسل میرے غصّے کی آگ بھڑکانے میں مصروف ہو۔" وہ غصّے کی زیادتی سے پھٹ پڑا۔

اس کی باتیں سُن کر مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اچانک کسی آتش فشاں کا دہانہ کھل گیا ہو اور مجھ پر مسلسل آگ برس رہی ہو۔

"شالیار خان!" میں نے مخلوص لہجے میں کہا۔ "جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، میں نے دانستہ کوئی ایسی حرکت نہیں کی، جس کے لیے مجھے تمہارے سامنے شرمندہ ہونا پڑے۔ اگر نادانستگی میں کوئی ایسی بات ہوگئی ہے تو اس کے لیے مجھے قصوروار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ تمہیں جو شکایت ہے، مجھے بتا دو میں اس کا ازالہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کروں گا۔"

میری ان باتوں کے جواب میں اس نے رُخ پھیر لیا اور خلا میں نظریں جما کر کسی گہری سوچ میں غرق ہو گیا۔ جب وہ دیر تک نہ بولا تو میں اپنے خیمے میں چلا آیا جہاں سارجنٹ آرتھر میری غیر موجودگی میں آ کر میرا انتظار کر رہا تھا۔

"آج کا دن بہت ہنگامہ خیز گزرا ہے اور مجھے یہ رات بھی خیریت سے گزرتی نظر نہیں آتی۔" اس نے مجھے دیکھتے ہی تبصرہ کیا۔

"ابھی سے تم نے یہ کیسے اندازہ کر لیا کہ یہ رات بھی کسی ہنگامے کے نذر ہو جائے گی؟" میری سوالیہ نظریں اس کے چہرے پر جم گئیں۔ "کیا کوئی ایسی علامت ظاہر ہوئی ہے جو اس بات کی نشان دہی کر رہی ہے یا ویسے ہی تمہارے دل و دماغ میں خدشات کے سانپ کلبلاتے پھر رہے ہیں؟"

"اس کا اندازہ تم خود ہی چل کر لگا سکتے ہو کہ جو کچھ میں نے دیکھا ہے، وہ کوئی عام سی بات ہے یا اس قدر اہم ہے کہ ہمارے لیے کسی پریشانی کا باعث بن سکتی ہے۔" اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"چلو! اگر کوئی فوری نوعیت کی بات ہے تو تمہارا اطمینان سے بیٹھے رہنا تعجب خیز ہے۔" میں فوراً اُٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے خیمے سے باہر آ گیا۔ وہ مجھے لے کر پڑاؤ کے اس طرف آیا جہاں ایک طرف گہری کھائی تھی۔ گہرائی میں نظریں دوڑاتے ہی مجھے وہ سب کچھ نظر آ گیا جو سارجنٹ آرتھر مجھے دکھانا چاہتا تھا۔

کھائی میں دُور دُور تک آگ لگی ہوئی تھی۔ بھڑکتی ہوئی آگ کے شعلے دیکھ کر مجھے یہ احساس ہوا کہ کہیں یہ میرا فریبِ نظر تو نہیں... مگر نہیں، آگ تیزی سے بڑھتی اور پھیلتی جا رہی تھی۔ جسے دیکھ کر مجھے یقین آ چکا تھا کہ جنگل کی یہ پھیلی ہوئی آگ صبح ہونے تک سرد نہیں پڑے گی۔

"صبح ہونے تک یہ آگ اس علاقے کا قدرتی حُسن برباد کر دے گی اور یہ ہرے بھرے درخت راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہو جائیں گے۔" میں نے سارجنٹ کی طرف دیکھتے ہوئے یہ تبصرہ کیا۔

"مگر یہ بات سمجھ نہیں آتی کہ اس قدر وسیع پیمانے پر یہ آگ کس نے لگائی ہے اس کا کیا مقصد ہے؟"

"یہ کسی انسانی ہاتھ کا کارنامہ لگتا ہے۔" میں نے کہا۔

"ناممکن، میں سمجھتا ہوں کہ زیرِ زمین کوئی آتش فشاں پھٹ پڑا ہے جس نے آناً فاناً آس پاس کی ہریالی چاٹ لی ہے انسانی ہاتھوں کی لگائی ہوئی آگ تو اس طرح نہیں پھیل سکتی۔ ہرے بھرے درخت جن کی شاخوں پر برف کی موٹی تہ جمی ہوئی ہے، کوئی معمولی آگ انھیں جلا کر راکھ نہیں کر سکتی۔" سارجنٹ نے پھیلی ہوئی آگ پر اظہارِ خیال کیا۔

"اس علاقے میں آج تک کوئی آتش فشاں دریافت نہیں ہوا۔" میں نے پورے وثوق سے اس کی یہ دلیل مسترد کرتے ہوئے کہا۔ "یہ آگ یقیناً انسانی ہاتھوں ہی کا کارنامہ ہے... مگر اس آتش زنی کے مقاصد جاننے کے لیے ہمیں اپنا کچھ وقت ضرور ضائع کرنا پڑے گا۔ میرا خیال ہے، یہ آگ ہمیں اپنی جانب متوجہ کرنے کے لیے لگائی گئی ہے۔"

سارجنٹ کے لیے میرا یہ جواب بے حد تعجب خیز ثابت ہوا۔ وہ چند لمحوں تک بھڑکتے ہوئے شعلوں پر نگاہ جمائے کچھ سوچتا رہا۔ پھر بولا۔ "ہو سکتا ہے، تمہارا خیال درست ہو... اور کوئی نامعلوم دشمن یہ چاہتا ہو کہ ہم اس آگ کی جانب متوجہ ہوں تو وہ ہماری بے خبری میں ہمیں نقصان پہنچائے۔ کیوں نہ اپنے کچھ جوانوں کو اِدھر بھیج کر حقیقت معلوم کروائی جائے۔"

"اس مرحلے پر میں اپنے کسی جوان کی زندگی خطرے میں نہیں ڈال سکتا۔" میں نے جواب دیا۔ "ہم صبح ہی ایک اعصاب شکن مرحلے سے گزر چکے ہیں۔ اس لیے رات کا اندھیرا بھی ہمارے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ بہرحال یہ معاملہ کل پر چھوڑ دو۔ سورج

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی روشنی میں صورتِ حال کا جائزہ لے کر ہی کوئی فیصلہ کریں گے۔"

دفعتہً ہمارے عقب میں زنجیروں کی مدھم جھنکار اُبھری تو ہم بے اختیار گھوم کر دیکھنے لگے۔ شالیار خان دو محافظوں کے درمیان چلتا ہُوا ہمارے قریب آکر رُک گیا اور خاموشی سے ان دُھلوانوں کو گھورنے لگا۔ جہاں بھڑکتے شعلے تیزی سے فضا میں زہریلا دُھواں پھیلا رہے تھے پھر وہ بھاری آواز میں بولا۔

"نوجوان! یہ آگ کسی گہرے راز کی غماز ہے۔ دُشمن ہمیں آگ کے بہانے اپنے قریب بُلانا چاہتا ہے۔ یہاں آس پاس ایسے لٹیروں اور قزاقوں کی بستیاں موجود ہیں جو اجنبی قافلوں کے ساتھ لُوٹ مار کرنا ایک قومی فریضہ خیال کرتے ہیں اور انھیں وہ کسی جال میں اُلجھا کر موت کی سرزمین کی طرف روانہ کر دیتے ہیں۔ تم اپنے پڑاؤ میں آرام کی نیند سو سکتے ہو۔ یہ آگ بہت دُور ہے اور تب تک ہمارے لیے کسی نقصان کا باعث نہیں بن سکتی جب تک ہم اس کے تجسّس میں قریب جا کر خود کو ہلاکت میں نہیں ڈال دیتے۔"

"مجھے تمھاری رائے سے اتفاق ہے، شالیار خان!" میں نے متجسس نظریں آگ پر جماتے ہُوئے جواب دیا۔ "میں تمھارے آنے سے پہلے سارجنٹ پر یہی واضح کر رہا تھا کہ یہ آگ کسی خاص مقصد کے تحت لگائی گئی ہے اور وہ خاص مقصد یہی ہو سکتا ہے کہ کوئی خونی گروہ ہمیں لُوٹنے اور ہلاک کرنے کا فیصلہ کر چکا ہے مگر ہم ان کے پھیلائے ہُوئے اس جال میں نہیں آئیں گے اور اپنے پڑاؤ میں رہ کر ان کے اگلے اقدام کا انتظار کریں گے۔ اگر ہم اپنے آدمی اس طرف روانہ نہیں کرتے ... تو وہ راستے کے کسی حصّے میں کوئی اور حرکت ضرور کریں گے جو ہماری مجموعی طاقت کو منتشر کرنے کا سبب بن سکتی ہے۔ سارجنٹ! اپنے سارے جوانوں کو ہوشیار کر دو۔ آج کی رات یقیناً ہنگامہ خیز ثابت ہو گی۔"

سارجنٹ نے اثبات میں سر ہلایا اور ہم سب واپس چل دیے۔

خطرے کی بُو سونگھتے ہی میں نے دفاعی اقدامات پر غور کرنا شروع کر دیا تھا۔ پڑاؤ میں پہنچتے ہی میں اپنے ساتھ کچھ جوانوں کو لے کر دیر تک مختلف انتظامات میں مصروف رہا۔ حالات گواہی دے رہے تھے کہ زندگی اور موت کا کھیل شروع ہو چکا ہے۔ اس لیے چوکنا رہنا ضروری ہے۔

انتظامات مکمل کر کے میں اپنے خیمے میں آگیا اور اُن دشمنوں کے بارے میں سوچنے لگا۔ جن سے ابھی واسطہ نہیں پڑا تھا مگر کسی بھی لمحے مڈبھیڑ کے امکانات نظر آرہے تھے۔ میں سونے کے لیے بستر پہ دراز ہونے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ اچانک شالیار خان کے خیمے میں زنجیروں کی مدھم جھنکار سُن کر میں نے بستر پہ لیٹنے کا ارادہ ترک کر دیا اور اپنے خیمے سے نکل کر شالیار خان کے خیمے کی طرف بڑھ گیا۔

شالیار خان نے قدموں کی چاپ سُن کر میری جانب دیکھا اور ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ لاتے ہُوئے بولا۔ "نوجوان! شاید تم میری طرف سے ابھی تک مطمئن نہیں ہُوئے تمھارے دونوں محافظ خیمے کے باہر موجود ہیں اور مسلسل میری نگرانی کر رہے ہیں۔ تم جا کر اطمینان کی نیند سو سکتے ہو کیونکہ آج کی رات میں فرار ہونے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔" میرے بابا کے لہجے میں طنز کی گہری کاٹ تھی جو میری رُوح بھی زخمی کر گئی۔

"یہ درست ہے کہ تمھاری مسلسل نگرانی میرا فرض ہے مگر اس وقت میں تمھارے پاس کسی اور ہی کام سے آیا ہُوں۔" میں نے چہرے پر بشاشت کے آثار پیدا کر لیے اور بھول گیا کہ یہ خوفناک بوڑھا جس کو میرا باپ ہونے کا شرف حاصل ہے مجھ پر طنز کر رہا تھا۔ یہ سب کچھ وہ بے خبری کے عالم میں کر رہا تھا مگر اس کی یہ بے خبری مجھے ایک ہولناک اذیت میں مبتلا کر رہی تھی جس کی شدت میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اضافہ ہو رہا تھا۔

"اس وقت رات گئے تمھیں مجھ سے کیا کام پڑ گیا ہے؟" اس نے سوال کیا اور اپنی خوفناک آنکھیں میرے چہرے پر گاڑ دیں۔

"مجھے اس مہم کی سربراہی کرتے ہُوئے تین روز گزر چکے ہیں مگر ابھی تک یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ ہم نے ان تین دنوں میں کتنا سفر طے کر لیا ہے اور ابھی کتنی مسافت باقی ہے؟ علاقے سے عدم واقفیت کی بنا پر میرے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا ہے کہ میں قافلے کو لٹیروں اور قزاقوں کی دسترس سے کیسے محفوظ رکھ سکتا ہُوں۔ اس آگ نے مجھے مجبور کر دیا ہے کہ تم سے راستے کے بارے میں تفصیل دریافت کروں، پھر اُس کی روشنی میں دفاعی انتظامات کروں تاکہ مستقبل قریب میں پیش آنے والے خطرات کا مقابلہ کیا جا سکے اور سارا قافلہ سلامتی کے ساتھ وادی فرقان میں داخل ہو سکے۔"

"وادی فرقان تک پہنچنے کے لیے ابھی دس روز کی مزید

مسافت باقی ہے۔" اس نے پاٹ دار آواز میں جواب دیا۔ "اور اس دوران راستے میں بہت سی ایسی بستیاں آئیں گی جہاں کے لوگوں کا آبائی پیشہ لُوٹ مار ہے۔ خاص طور سے منصوری قبیلے کے لوگ بے حد ظالم ہیں اور اپنے علاقے سے کسی قافلے کو سلامتی کے ساتھ گزرنے کا موقع نہیں دیتے۔ یہ لوگ لومڑی کی طرح عیار اور چیتے کی طرح خونخوار ہیں۔ کبھی کھل کر سامنے نہیں آتے، ہمیشہ چھُپ کر حملہ کرتے ہیں اور راہگیروں پہ موت کا خوف مسلط کر کے انھیں ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ اس وقت ہم منصوری قبیلے کی حدود میں داخل ہو چکے ہیں اور ابھی دو روز تک اسی علاقے میں سفر جاری رہنے کا امکان ہے۔ یہ جب تک اپنی عیاری سے ہماری مجموعی طاقت منتشر نہیں کر دیں گے براہِ راست ہم پر حملہ آور نہیں ہوں گے مگر تمھیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ تم ان کی پہلی چال ناکام بنا چکے ہو۔ مجھے یقین ہے کہ تم ایک ذہین جنگجو ہو اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ تم ان کی مزید چالوں کا شکار نہیں ہو گے کیونکہ تم پہلے ہی ہوشیار ہو چکے ہو۔ کسی ہوشیار اور چوکنے دشمن کو شکست دینا آسان کام نہیں ہوتا۔ اس بات کا خاص خیال رکھنا کہ تمھارے ساتھی اپنے مورچوں پہ ہوشیار اور مستعد رہیں اور کوئی معمولی سی آہٹ بھی نظرانداز نہ کریں۔ خاص طور سے مورچہ چھوڑ کر کسی کا پیچھا کرنے کی کوشش تو بالکل نہ کریں۔"

شالیار خان کا لہجہ غیر محسوس انداز میں خوشگوار ہو گیا۔

"تم نے بہت اچھا کیا جو مجھے منصوری قبیلے کے بارے میں تفصیل سے آگاہ کر دیا۔ تمھارا خیال درست ہے کہ جاگتے ہُوئے دشمن پہ حملہ کرنے والا ہمیشہ گھاٹے میں رہتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تمھارا بے مثال تجربہ اور طاقتور جسم اس قافلے کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ خود تمھاری سلامتی کا دارومدار بھی اسی بات پہ ہے کہ ہماری یہ خطرناک مہم کامیاب ہو جائے۔" میں نے پس منظر اور پیش منظر سامنے رکھتے ہُوئے اظہارِ خیال کیا۔

"تمھاری باتیں سُن کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں تمھیں ایک طویل عرصے سے جانتا ہوں۔ تمھاری گفتگو کے انداز سے احساس ہوتا ہے جیسے برسوں سے میں تمھاری باتیں سُنتا چلا آرہا ہُوں، اور تمھارا یہ لب و لہجہ میرے لیے اجنبی نہیں ہے۔" شالیار خان موضوع بدل کر ذاتی گفتگو کرنے لگا تو مجھے اپنے وجود میں زلزلے کی سی کیفیت محسوس ہونے لگی۔ میں خاموشی سے اس کے جھریوں بھرے چہرے پر شناسائی کے نقش تلاش کرنے لگا۔ اس کی پیشانی پر لاتعداد سلوٹیں نمودار ہو چکی تھیں اور وہ بھی گہری نظروں سے میرے چہرے پر اپنی باتوں کا ردِعمل تلاش کر رہا تھا۔ میرا دل ماہیِ بے آب کی طرح تڑپنے لگا مجھے یہ خوف محسوس ہُوا کہ اگر میں مزید چند لمحے اس کے سامنے بیٹھا رہا تو ضبط کھو بیٹھوں گا اور وہ راز بے نقاب کرنے پر مجبور ہو جاؤں گا جسے ظاہر کرنے کا ابھی وقت نہیں آیا تھا۔ باپ بیٹے کا تعلق اپنا رنگ ظاہر کرنے لگا تو میں خاموشی سے اُٹھ کر اپنے خیمے میں واپس آگیا جہاں ایک کرسی پر بیٹھ کر میں دیر تک اپنے قابلِ فخر باپ کے بارے میں سوچتا رہا۔ حقیقت آشنائی میرے لیے ایک عجیب تجربہ ثابت ہو رہی تھی۔ سردی آہستہ آہستہ جسم پر یلغار کر رہی تھی مگر میں جس آگ میں خود کو لپٹا ہُوا محسوس کر رہا تھا، اس نے میرے خون کو گرما رکھا تھا اور سرد ہوا میرے لیے تریاق کا کام انجام دے رہی تھی۔ اتنی ٹھنڈک نہ ہوتی تو شاید میرا وجود جل جاتا اور ہستی راکھ ہو جاتی۔

بستر پہ دراز ہونے سے پہلے میں نے پڑاؤ کا ایک چکر لگانے کا فیصلہ کیا اور ہاتھ پاؤں جھٹکتا ہُوا خیمے سے نکل کر میدان میں آگیا۔ دہکتے ہُوئے الاؤ کے پاس چند ساتھی ہتھیار سنبھالے باتوں میں مگن نظر آرہے تھے۔ میں انھیں نظرانداز کرتا ہُوا اس طرف بڑھ گیا جہاں درختوں کی بلندی پر تختے باندھ کر مورچہ بندی کی گئی تھی۔ میرے پیروں کی آہٹ سنتے ہی ان میں ایک نے مجھے پکار کر اطمینان کر لیا کہ میں کون ہُوں۔

میں آہستہ روی سے مورچے کے قریب پہنچ گیا تو ان میں سے ایک نے کہا۔ "ابھی چند لمحے قبل میں نے قریب ہی اُلّو کے بولنے کی آواز سُنی ہے۔ یہ آواز وقفے وقفے سے پیدا ہوتی ہے۔ ناتھو خوفزدہ ہو رہا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ یہ کسی اُلّو کی آواز نہیں بلکہ کسی بے چین رُوح کے بین ہیں جو ان جنگلوں میں بھٹکتی پھر رہی ہے۔ کیا خیال ہے، شہباز! کوئی رُوح اُلّو کے قالب میں اُتر کر بولنے کے قابل ہو سکتی ہے یا نہیں؟"

اس نے یہ بات مذاق میں کہی تھی لیکن درحقیقت یہ ایک چونکا دینے والی بات تھی۔ میں سمجھ چکا تھا کہ یہ آوازیں کسی خفیہ پیغام کا کام دے رہی ہیں اور ہمارے پڑاؤ کی مسلسل نگرانی ہو رہی ہے۔

"وشوا ناتھ!" میں نے اس جوان کو مخاطب کیا۔ "تمھیں ارجن سنگھ کی باتوں کا اثر نہیں لینا چاہیے! یہ تم سے مذاق کر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رہا ہے... مگر تمھیں اس اُلّو کی آواز سے مسلسل چوکنا رہنے کی ضرورت ہے کیونکہ یہ آوازیں خفیہ پیغام رسانی کا کام دے رہی ہیں۔ میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ کوئی دشمن گروہ ہم سے زیادہ دُور نہیں ہے اور اُلّو کی آوازیں نکال کر کوئی شخص اپنے ساتھیوں کو خبردار کر رہا ہے۔ بہرحال اگر تم کوئی غیر معمولی بات محسوس کرو تو بلا دریغ گولیاں برسانا شروع کر دینا مگر تمھیں مورچہ چھوڑ کر کسی کے تعاقب کی اجازت نہیں ہے۔ کچھ بھی ہوتا رہے، تم اپنا مورچہ خالی نہیں کرو گے۔ اگر ایسا ہُوا تو واپسی پر تمھیں وہ مورچہ دشمن کے قبضے میں ہی ملے گا۔ یہ لوگ ہمیں پڑاؤ سے دُور کرنے کے لیے مختلف حربے استعمال کر رہے ہیں۔ ایسے میں کسی کا تعاقب تمھارے لیے مہلک ثابت ہوگا۔ میری اجازت کے بغیر کوئی پڑاؤ سے دُور جانے کی کوشش نہ کرے۔"

انھوں نے میری ہدایات گہری توجہ سے سُنیں اور ارجن سنگھ نے ان پر عمل کرنے کا یقین دلاتے ہوئے کہا: "تمھاری ہدایات پر حرف بہ حرف عمل ہوگا۔ مگر تم کھوج لگانے کی کوشش کیوں نہیں کرتے کہ یہ آوازیں کون نکال رہا ہے اور اپنے ساتھیوں کو کیا پیغام دے رہا ہے؟"

"مجھے میرے فرائض سمجھانے کی کوشش نہ کرو۔" میرے لہجے میں سختی آ گئی۔ "تمھیں جو کچھ کہا جا رہا ہے اسی پر عمل کرو۔"

میں وہاں سے دوسرے مورچے پر پہنچ گیا جہاں چار قبائلی نوجوان مستعد بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی ان میں سے ایک نے ہاتھ فضا میں لہرا کر میرا استقبال کیا۔

"یہاں تو بہت سے اُلّو آ گئے ہیں۔ ایک مسلسل بول رہا ہے اور کبھی کبھی بہت سے اُلّو ایک ساتھ مل کر اپنے سُروں سے جُدائی کا گیت الاپنے لگتے ہیں۔ ان کی آوازیں میرے ساتھیوں کے اعصاب پر اثر کر رہی ہیں۔ ہمارا ایک ساتھی اُلّو کی آواز سُن کر خود بھی اُلّو بن کر چیخنا شروع کر دیتا ہے..."

ابھی اس کی بات اُدھوری ہی تھی کہ اچانک اُلّو کے بولنے کی آواز فضا میں اُبھری۔ میں نے اپنے ساتھی کو خاموش رہنے کی ہدایت کی اور اُلّو کی آواز سُننے میں محو ہو گیا۔ چند لمحوں تک میں یہ آوازیں سنتا رہا اور یہ یقین کرتا رہا کہ واقعی اُلّو بول رہا ہے یا کوئی انسان اپنے حلق سے یہ آوازیں بلند کرتا ہُوا میرے ساتھیوں کے اعصاب پر اثر انداز ہو رہا ہے؟

یکایک بہت سے اُلّو ایک ساتھ بول اُٹھے۔ وہ جس تنظیم اور تواتر کے ساتھ اپنی منحوس آوازیں فضا میں بلند کر رہے تھے اس نے میرا یہ یقین پختہ کر دیا کہ یہ آوازیں بعض انسانوں ہی کا کارنامہ ہیں، جو میرے ساتھیوں میں سراسیمگی پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ کئی لوگ اُلّو کی آواز کو بہت منحوس خیال کرتے ہیں اور وہم کا شکار ہو کر حوصلہ کھو بیٹھتے ہیں۔

یہ ایک ذہانت آمیز چال تھی۔ شاید ان لوگوں نے یہ سوچا ہوگا کہ اس طرح ہم لوگوں میں سراسیمگی کی لہر دوڑا دیں گے اور جب پڑاؤ پر حملہ ہوگا تو ہماری طرف سے زیادہ مزاحمت نہیں ہوگی... لیکن انھیں ایک بات کا علم نہیں تھا۔ پڑاؤ کا ہر شخص مقامی لباس میں ضرور تھا لیکن سب قبائلی نہیں تھے۔ دوسرے میں ان آوازوں کا مفہوم بہت اچھی طرح سمجھتا تھا۔

اچانک کئی اُلّو ایک خاص آہنگ کے ساتھ بُری طرح چیخے اور گہری خاموشی چھا گئی۔

"گستم خان!" میں نے ایک ساتھی کو مخاطب کیا۔ "اپنے ساتھیوں کو سمجھاؤ کہ اُلّو کی نحوست انھیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی... پھر یہ اُلّو نہیں ہیں بلکہ بہت سے لٹیرے ہیں جو وقفے وقفے سے آوازیں نکال کر انھیں اعصاب زدہ کر رہے ہیں۔"

گستم خان میری بات سُن کر بڑے زور سے ہنسا اور اپنے ساتھیوں کو متوجہ کر کے بولا: "سُنا تم نے شہباز کیا کہہ رہا ہے۔ یہ چیخنے والے اُلّو نہیں، اُلّو کے پٹھے ہیں۔"

"گستم خان!" میرا لہجہ یکایک سخت ہو گیا۔ "میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اس پر یقین کرو اور مخالفت کی کوشش نہ کرو۔ یہ ہمارے دشمن ہیں اور مختلف حرکتیں کر کے ہمیں مجبور کر رہے ہیں تاکہ ہم ان کی تلاش میں نکلیں اور کسی ناگہانی کا شکار ہو جائیں۔ اپنے دل سے یہ وہم نکال دو کہ اُلّو کی نحوست ہمیں کوئی نقصان پہنچا سکتی ہے... پھر ابھی تو صرف اُلّو ہی چیخ رہے ہیں۔ کچھ دیر بعد شیر اور چیتے بھی گرجنے لگیں گے۔ مگر تم ان آوازوں کو نظرانداز کر دو گے اور اپنے مورچے چھوڑ کر نہیں جاؤ گے۔ اگر تم میں سے کسی نے میری ہدایات کے برعکس عمل کیا تو ہولناک موت کا شکار ہو جائے گا۔"

"ٹھیک ہے، شہباز!" اس نے مستعدی سے جواب دیا۔ "ہم اپنے مورچے چھوڑ کر کہیں نہیں جائیں گے اور ان آوازوں کو بھی نظرانداز کر دیں گے جو ہمیں بار بار سُنائی دے رہی ہیں۔"

"گستم خان! دن کی روشنی میں ان آوازوں کا پول خود بخود کھل جائے گا۔" میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "رات کے اندھیرے

میں تعاقب کرنا حماقت ہوگی۔ تمھیں اس بات کا بھی خیال رکھنا ہوگا کہ پڑاؤ کا کوئی اور جوان بھی ان کا کھوج لگانے کی کوشش نہ کرے ورنہ بیشتر لوگ مارے جائیں گے اور باقی اندھیرے کی دہلیز پر اپنا سر پٹختے رہ جائیں گے۔"

جب میں گھوم پھر کر اپنے خیمے میں واپس آیا تو بہت سے اُلّوؤں کی منحوس آوازیں مسلسل پیچھا کرتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ دشمن کا یہ حربہ بھی ناکام رہا تھا اور ابھی رات کا پہلا پہر تھا۔ مجھے یقین تھا کہ صبح ہونے تک اگر میرے ساتھیوں نے ہدایات پر پورا عمل کیا تو ایسا کوئی ہولناک واقعہ پیش نہیں آئے گا جس کے منفی اثرات سارے قافلے پر پڑیں، مگر ابھی تین پہر رات پڑی تھی جو دشمن کو شب خون مارنے میں کامیاب کر سکتی تھی۔

میں نے اپنے خیمے کا پردہ ہٹا کر اس میدان کو دیکھا، جہاں الاؤ روشن تھا اور اس کے نیلگوں شعلوں کا انعکاس قریب بیٹھے لوگوں کے چہروں پر بھی دکھائی دے رہا تھا۔ اُلّو کے چیخنے کی آوازیں دم توڑ چکی تھیں اور فضا میں ہر طرف سناٹا طاری تھا۔ ہلکی ہلکی بوندا باری کے دوران مجھے اپنے پڑاؤ کی فضا بہت عجیب اور غیر فطری سی محسوس ہوئی۔ دشمن کے قریب ہونے کا احساس ہر جوان کے چہرے پر تشویش کی گہری تہ جما چکا تھا۔

"جوگندر سنگھ! تمھاری خاموشی قافلے کے لوگوں کو اعصاب زدہ کر رہی ہے۔ کوئی لوک گیت سُناؤ تاکہ یہ سناٹا دم توڑ جائے۔ اس دوران اپنے کسی ساتھی سے کہو کہ قہوہ تیار کرے۔"

میرے لہجے میں مزاح کی ہلکی سی جھلک پا کر جوگندر سنگھ بڑے پُرخلوص انداز میں مسکرایا اور بولا: "شہباز خان! تم ایک حوصلہ مند دلیر انسان ہو جو زندگی کے کٹھن لمحات کو بھی اپنے اعصاب پر اثر انداز نہیں ہونے دیتا مگر سُنا ہے ہمارا واسطہ لٹیروں کے ایک ایسے گروہ سے پڑا ہے جن کے مظالم کا ذکر سُن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور دل کے دھڑکنے کی رفتار میں تبدیلی آ جاتی ہے۔"

اس کے لہجے میں ہلکا سا ارتعاش تھا جو اس کو اعصاب زدہ ظاہر کر رہا تھا۔

"شاید اُلّو کی منحوس آوازوں کے سامنے تمھارے اعصاب بھی ٹوٹ چکے ہیں۔" میرا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔ "ایک سپاہی کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ محض جانور کی آوازیں سُن کر خوف زدہ ہو جائے اور اپنے اس خوف میں دوسروں کو بھی شامل کرے۔ میرا تعلق جس مذہب سے ہے، اس میں ان توہمات کی کوئی اہمیت یا گنجائش نہیں ہے۔ اگر مجھے اپنے ساتھیوں کو نقصان پہنچنے کا خطرہ نہ ہوتا تو میں انھیں دکھا دیتا کہ آوازیں اُلّوؤں کی نہیں ہیں بلکہ یہ لٹیروں کا ایک نفسیاتی حربہ ہے۔"

"تم ایک لاجواب شخصیت کے مالک ہو۔" جوگندر سنگھ نے مسکرا کر کہا۔ وہ میری باتوں سے بے حد متاثر ہُوا تھا۔ "جب میں دُنیا کی بادشاہت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا تو میرا وعدہ ہے کہ میں تمھیں اپنی مملکت میں ایک ممتاز حیثیت دوں گا۔ شاید تم نہیں جانتے ہو کہ مجھے ایک مہارشی جوگی نے بتایا تھا کہ میں عنقریب دُنیا کی بادشاہت کا تاج پہننے والا ہوں۔"

"وہ مہارشی کون تھا، جو تجھ جیسے گناہ گار پر اچانک مہربان ہو گیا اور تمھیں بزدلی کا تاج پہنا کر خواب دیکھنے کی عادت ڈال گیا؟ اگر وہ مہارشی اس وقت میرے سامنے ہوتا تو میں اس کا خون کر دیتا، جس نے ایک خوبصورت جوان کو محنت اور دلیری کے راستے سے ہٹا کر کاہلی اور بزدلی کی راہ پر گامزن کر دیا۔" میں نے فضا میں پھیلا ہُوا اعصاب شکن کھنچاؤ دور کرنے کے لیے اس کے مذاق سے لطف اندوز ہوتے ہوئے جواب دیا۔

"جب اس جوگی سے ملاقات ہوئی تھی تو میں بچہ تھا۔ اس نے مجھ سے ایک ٹکہ لے کر یہ خوبصورت اور دلکش باتیں بتائی تھیں۔" اس نے بڑی معصومیت سے جواب دیا جس پر سب ہی کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

جوگندر سنگھ نے ایک جوان کے ساتھ مل کر پانی کا برتن الاؤ پر رکھ دیا اور خود کان پر ہاتھ رکھ کر ماہیا گانے لگا۔ اس کے بول گونجتے ہی سارے پڑاؤ میں جوش و خروش کی لہر دوڑ گئی اور سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے اعصاب پُرسکون ہونے لگے۔

سارجنٹ آرٹ بھی اپنے دو فرنگی ساتھیوں کے ساتھ آ کر اس محفل میں شریک ہو گیا اور فضا مختلف زبانوں کی تانوں سے گونج اُٹھی۔

قہوہ تقسیم ہونے لگا تو اچانک مجھے شالیار خان کا خیال آ گیا۔ یہ احساس ہوتے ہی میرے خون میں ہلچل سی شروع ہو گئی اور خوشی کے یہ لمحات اداسی اور افسردگی کے دبیز بادلوں میں چھپنے لگے۔

"سارجنٹ!" میں نے گرم قہوے کا گھونٹ حلق میں انڈیلتے ہوئے کہا: "شالیار خان کو زنجیروں سے آزاد کر دو۔ اس کا تجربہ اس مرحلے پر ہمارے لیے بے حد مفید ثابت ہو سکتا ہے" اور جاتے ہوئے اس کے لیے قہوے کا پیالہ بھی لیتے جانا۔ تازہ دم گھوڑا اور پُرانا سپاہی ہمیشہ دشمن کے لیے خطرناک ثابت

ہوتا ہے۔ اس نے اس علاقے کے رہنے والے قبائل کا بڑا خوفناک نقشہ کھینچا ہے۔ اگر اس کی بتائی ہوئی باتیں پچاس فیصد بھی سچائی پر مبنی ہیں تو رات کا یہ گزرتا ہُوا سناٹا، موت کی سسکاریوں میں بھی بدل سکتا ہے۔"

سارجنٹ اُٹھ کھڑا ہُوا۔ اس نے اپنے دونوں ساتھیوں کو اُٹھنے کا اشارہ کیا اور شالیار خان کے خیمے کی طرف چل دیا۔

"سارجنٹ! شالیار خان سے کسی بحث میں اُلجھنے کی کوشش نہ کرنا۔ اس وقت اس کی ناراضگی ہمارے لیے بہت سی مشکلات پیدا کر سکتی ہے۔ وہ ایک بپھرا ہُوا شیر ہے۔ اس لیے اپنے ساتھیوں کو کوئی اور کام سونپ کر تنہا جا کر میری ہدایات پر عمل کرو۔"

میری بروقت تنبیہ نے سارجنٹ کو بے حد سنجیدہ کر دیا۔ وہ اپنے ساتھیوں کو رکنے کا اشارہ کرتے ہُوئے قہوے کا پیالہ لیے شالیار خان کے خیمے میں چلا گیا۔

"مانک ٹالہ!" میں نے اسے شالیار خان کے خیمے کے قریب دیکھ کر آواز دی۔ "تمھاری غیر موجودگی بہت دیر سے میرے ذہن میں کھٹک رہی ہے۔ تم اب تک کہاں تھے؟"

مانک ٹالہ مسکرا کر اپنے دانتوں کی نمائش کرتے ہُوئے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا، میرے قریب آ بیٹھا اور اپنی رائفل کی فولادی نال شانے سے لگاتے ہُوئے بولا۔ "مانک ٹالہ اپنے فرائض سے غافل نہیں ہے۔ میں تمھارے لیے نئی اور مفید معلومات حاصل کر کے آ رہا ہوں۔" اس کے لہجے میں اداکی کی جھلک موجود تھی۔

"وہ کیا؟" میں نے متجسس نظریں اس کے چہرے پر گاڑتے ہُوئے سوال کیا۔

"میں نے اس ٹیلے پر دشمن کی موجودگی کا سراغ پا لیا ہے۔" اس نے انکشاف کیا۔ "مگر دشمن اس بات سے بے خبر ہے کہ میں اس کی موجودگی کا راز پا چکا ہوں۔ وہ ہمارے عقب میں، اس ٹیلے سے قافلے کی نگرانی کر رہا ہے اور وقفے وقفے سے اُلّو کی آواز نکالنے لگتا ہے۔ پہلے میرا خیال تھا کہ اس پر اپنی ایک گولی ضائع کر کے قصہ ہی پاک کر دوں۔ مگر تمھاری ہدایات کا خیال آتے ہی میں ادھر چلا آیا تاکہ تمھیں اطلاع دے دوں۔"

"تم نے اچھا کیا، مانک ٹالہ!" میں نے اُسے اُٹھنے کا اشارہ کرتے ہُوئے کہا اور اسے لے کر اپنے خیمے میں آ گیا پھر سارجنٹ آسٹ کو آواز دے کر وہیں بُلا لیا تاکہ باہمی مشورے سے کوئی فیصلہ کیا جا سکے۔

میں اور سارجنٹ، مانک ٹالہ کے ساتھ اپنے خیمے سے نکل کر درختوں کی آڑ میں چلتے ہُوئے ٹیلے کے عقب میں پہنچ گئے۔ ماحول پر قبرستان کی سی گہری خاموشی مسلط تھی ہمارے قدموں تلے روندے جانے والے خشک پتّے، اچانک چیخ اٹھتے تو ہم چلتے چلتے رُک جاتے... پھر آہٹ لے کر آگے بڑھنے لگتے۔

مانک ٹالہ بلّی کی سی چال سے، چار قدم آگے آگے چل رہا تھا اور میرے دائیں جانب، سارجنٹ اپنی رائفل سنبھالے محتاط انداز میں چلتا ہُوا مانک ٹالہ کا تعاقب کر رہا تھا۔ جیسے ہی درختوں کی قطار ختم ہُوئی تو قدِ آدم جھاڑیوں کے طویل سلسلے نے ہمارا راستہ روک لیا۔ مانک ٹالہ کی اطلاع کے مطابق دشمن انھی جھاڑیوں میں پوشیدہ رہ کر کیمپ کی سرگرمیوں پر اپنی نظریں رکھے ہُوئے تھا۔

اب ہم پہلے سے بھی محتاط انداز میں، پنجوں کے بل چلتے ہُوئے ایک چھوٹے سے ٹیلے کے قریب رُک گئے۔ یہاں ٹیلے کے ساتھ ساتھ، جھاڑیاں کاٹ کر آگے نکلنے کے لیے راستہ بنایا گیا تھا۔ تازہ کٹی ہُوئی جھاڑیوں کی شاخیں ہمیں اسی ٹیلے پر پڑی نظر آگئیں۔ جو اس بات کا ثبوت تھیں کہ کسی نے ان جھاڑیوں کو پناہ گاہ بنا رکھا ہے۔ اچانک آدھی رات کا چاند بادلوں کی اوٹ سے نکل آیا اور ہمارے آس پاس کا علاقہ دودھیا چاندنی میں نہا گیا۔

ہم پتھریلی زمین پر بیٹھتے ہُوئے چند لمحوں کے لیے ساکت ہو گئے۔

ہماری نظر اس راستے پر جمی ہُوئی تھی، جہاں جھاڑیوں کے درمیان دشمن موجود تھا۔ ہم حتی الامکان محتاط ہو کر جھاڑیوں میں چھپے بیٹھے رہے اور اس بات کا انتظار کرتے رہے کہ کب سرکنڈوں کے پیچھے دشمن کوئی حرکت کرے اور ہم اس پر اچانک حملہ کر کے اسے جہنم کا ایندھن بنا دیں۔ انتظار کے لمحات طویل ہونے لگے تو میں نے سرگوشیوں میں سارجنٹ سے کہا...

"سارجنٹ تم یہیں رُک کر دشمن کی آمد کا انتظار کرو۔ میں جھاڑیوں میں گھس کر اس کا مسکن تلاش کرتا ہُوں۔"

میں کسی چوپائے کی طرح جھاڑیوں کے درمیان چلتا ہُوا اس راستے پر آگے بڑھنے لگا۔

ٹیلے کی اوٹ میں اندھیرا تھا۔ چند لمحوں تک میں اس چٹان

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے چپکا اس راستے کو گھورتا رہا جہاں موت کے عفریت ڈیرہ ڈالے بیٹھے تھے۔ پھر میں رینگتا ہُوا، بے آواز، اس نیم تاریک راستے پر چل دیا۔ تقریباً بیس قدم کا فاصلہ طے کر لیا تھا کہ اچانک ایک جھاڑی کی اوٹ میں خشک پتوں کے چرمرانے کی آواز سُنائی دی اور اس کے ساتھ کسی کے سانس کی ہلکی سی آواز اُبھری تو میں چلتے چلتے ایک دم ساکت ہو گیا۔ میری آنکھیں اس جھاڑی کو گھورنے لگیں جہاں کسی ذی روح کے آثار محسوس ہُوئے تھے۔

چاند کی دودھیا روشنی، گھنی جھاڑیوں سے چھن چھن کر زمین پر پڑ رہی تھی۔ اچانک پھر کسی نے ایک طویل سانس لی تو میں فوراً چوپائے کی مانند جھک گیا اور نوکیلی شاخوں سے اُلجھتا ہُوا جھاڑی میں گھس گیا جہاں جھاڑیاں کاٹ کر بیٹھنے کے لیے جگہ بنائی گئی تھی اور دو افراد وہاں موجود تھے جو اگر ہوشیار ہوتے تو میری آمد سے باخبر ہو جاتے مگر وہ اپنی رائفلیں کندھوں سے ٹکائے بے فکری کی گہری نیند سو رہے تھے۔

میں نے رائفل گھما کر ان میں سے ایک کی کھوپڑی کو نشانہ بنایا تو دھیمے سے دھماکے کے ساتھ اس کی کھوپڑی چٹخ گئی اور بھیجا نکل آیا۔ میں نے فوراً پینترہ بدلا اور رائفل گھماتے ہُوئے دوسرے شخص کی کھوپڑی کے بھی پرخچے اُڑا دیے۔ پہلی کھوپڑی پر لگنے والی ضرب کی آواز نے اسے ہوشیار کر دیا تھا مگر جب تک وہ صورتِ حال سمجھنے کے قابل ہوتا، میں نے اس سے زندہ رہنے کا حق چھین لیا۔ اس دوران میں ایک لمحے کے لیے اس سے نگاہیں چار ہوئی تھیں تو اس کی آنکھوں میں حیرت، خوف اور بے یقینی کے تاثرات نظر آئے تھے جو مرنے کے بعد بھی اس کی مُردہ آنکھوں میں منجمد رہے۔

میں نے ان کی رائفلیں اُٹھا کر گھنی جھاڑیوں میں پھینک دیں اور واپس چلنے کے ارادے سے قدم اٹھایا تھا کہ اپنی گردن کے قریب کسی کی سانسوں کی پھنکار سُن کر بے اختیار رائفل گھماتے ہُوئے پلٹا لیکن سارجنٹ پر نگاہ پڑتے ہی میرا ہاتھ رُک گیا۔ اگر ایک لمحہ اور تاخیر ہوتی تو سارجنٹ کا جوان جسم، لاش کا ڈھیر بن جاتا۔ مگر میرے بروقت ہاتھ کے رک جانے سے موت کا وہ خوفناک خطرہ ٹل گیا جو کسی دشمن کی آمد کے مغالطے میں نمودار ہوا تھا۔

میں سارجنٹ کو سخت نظروں سے گھورتا ہُوا آگے بڑھا اور اس نیم تاریک راستے پر چل پڑا جو دشمن نے اپنی خفیہ آمد و رفت کے لیے بنا رکھا تھا۔ اس کے ہلکے ہلکے قدموں کی آہٹ مجھے اپنی پشت پر برابر سُنائی دے رہی تھی۔ اچانک جھاڑیاں ختم ہوگئیں اور ڈھلوان کی جانب اترتی ہُوئی ایک پگڈنڈی دکھائی دی۔

میں یہ راستہ چھوڑ کر ایک چٹان کے ساتھ ساتھ شمال کی جانب بڑھنے لگا جہاں قدِ آدم جھاڑیاں موجود تھیں۔ تقریباً پچاس قدم کا علاقہ خاموش اور ویران پڑا تھا۔ ان جھاڑیوں سے کچھ دُور ایک ٹیلہ دکھائی دیا۔ جہاں دُشمن کی موجودگی کے امکانات ہو سکتے تھے۔ ابھی تک اپنے نامعلوم دشمنوں کے معاملے میں ہمیں یہ فوقیت حاصل تھی کہ ہم اس کی موجودگی سے آگاہ ہو چکے تھے، اور ان پر برتری حاصل کرتے ہُوئے ان کے دو ساتھیوں کو موت کا جام پلا چکے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ ہمارے یہ دشمن ابھی صرف ہمارے خلاف نفسیاتی جال ہی بُننے میں مصروف ہوں گے اس لیے میں ان کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر ان کا خطرہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دور کر سکتا ہُوں۔

میں کانٹوں سے اُلجھتا اور جھاڑیوں کے درمیان چلتا ہُوا ایک چٹانی دیوار کے قریب رُک گیا۔ ابھی چند ساعتیں گزری ہوں گی کہ انسانی سرگوشیاں سُن کر میری بھٹکتی ہُوئی نظریں، سرگوشیاں کرنے والے کو تلاش کرنے لگیں۔ سرگوشیاں برابر سُنائی دے رہی تھیں مگر سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہا جا رہا ہے اور اس کا مخاطب کون ہے؟

"سارجنٹ! اس ٹیلے کی دوسری جانب نامعلوم دشمن موجود ہیں۔ میرے پیچھے خاموشی سے چلے آؤ اور اس وقت تک کوئی کارروائی نہ کرنا جب تک میں تمھیں کوئی اشارہ نہ کروں۔ ہمیں پہلے صورتِ حال کا جائزہ لینا ہوگا۔ میرا اشارہ پاتے ہی دستی بم ان کی جانب اچھال کر ان کا قصہ تمام کر دینا۔"

سارجنٹ نے دستی بم نکال کر اپنے ایک ہاتھ میں تھام لیا اور خاموشی سے میری تقلید کرتا ہُوا اس چٹانی دیوار کے ساتھ ساتھ بے آواز آگے بڑھنے لگا۔ ہم گھوم کر جُونہی دیوار کی اوٹ سے نکلے ہمارے راستے میں ایک گہری کھائی حائل ہوگئی۔ بے خیالی میں میرا ایک پاؤں رپٹ گیا۔ میں چٹان کا سہارا لیتے ہُوئے ترچھا گر گیا اور میرے گرتے ہی سارجنٹ نے تیزی سے میرے جھکے ہُوئے کندھوں کو تھام لیا ورنہ یہ گہری کھائی مجھے زندہ نگل جاتی۔ سارجنٹ کی مستعدی میرے کام آئی اور میں طویل سانس لیتے ہُوئے خاموشی سے سنبھل کر اُٹھا اور چٹان کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا اور لڑھکتے ہُوئے ان پتھروں کو دیکھتا رہا جو بھاری آواز کے ساتھ ڈھلوانوں میں جا رہے تھے۔ حواس بحال ہوتے ہی میں نے اپنی رائفل سنبھالی اور کھائی کے دوسرے کنارے

واقع ان چٹانوں کو گھورنے لگا جہاں دشمن کثیر تعداد میں موجود تھے۔

"بادل خان اس چٹان کے پیچھے کوئی موجود ہے۔" ایک جوان نے اپنے ساتھی کو مخاطب کرتے ہوئے ٹیلے کی اوٹ سے سر ابھارتے ہوئے رواں پشتو میں خبردار کیا۔

"پتھر لڑھکنے کی آوازیں میں بھی سن رہا ہوں۔" کسی نے بھاری آواز میں جواب دیا۔ "میرا خیال ہے گل خان ہو گا۔ جو ہمیں کوئی نئی خبر سنانے آیا ہو گا۔"

"اگر گل خان یا اس کا ساتھی ہوتا تو اپنی آمد کا مخصوص اشارہ ضرور دیتا۔" پہلے نے اعتراض کیا۔

"تمہارا خیال درست معلوم ہوتا ہے، قادر خان، اگر ہمارا کوئی ساتھی ہوتا تو اسے خاموش رہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کا مطلب ہے قافلے کے لوگ ہماری موجودگی محسوس کر چکے ہیں اور ہمارا کھوج لگاتے ہوئے یہاں تک آ گئے ہیں۔" بادل خان نے بھاری آواز میں اپنے ساتھی کے خیالات کی تائید کی تو میں نے سارجنٹ کو بم پھینکنے کا اشارہ کر دیا۔

میرا اشارہ پاتے ہی اس کا دایاں ہاتھ بلند ہوا اور اس نے دستی بم کی پن نکال کر بم اس چٹان پر اچھال دیا جہاں ان لوگوں کی موجودگی میں نے پہلے ہی محسوس کر لی تھی۔

بم کا ہولناک دھماکا گونجتے ہی روشنی کا ایک جھماکا ہوا اور چٹان کا ایک حصہ ٹوٹ کر کھائی کی گہرائیوں میں پوشیدہ ہو گیا۔ چٹان کے اڑتے ہی کچھ انسانی اعضا اچھل کر کھائی کی جانب لپکے اور موت کے ابدی سناٹے کا حصہ بن گئے۔

دوسرا بم پھینکنے کی بظاہر کوئی ضرورت نہیں رہی تھی۔ دشمنوں کے مسکن کے پرخچے اڑتے ہی دوبارہ گہری خاموشی چھا گئی تھی مگر میں نے انہیں سنبھلنے کا موقع دیے بغیر سارجنٹ کو دوسرا بم پھینکنے کے لیے کہا اور ان چٹانوں کو گھورنے لگا جہاں بھی دشمن کی موجودگی کا امکان موجود تھا۔ بم گرتے ہی ہولناک دھماکا ہوا اور چٹان مختلف ٹکڑوں میں بٹ کر کھائی میں گرنے لگی جو دیر سے دشمن کے لیے ایک قدرتی پناہ گاہ کا کام دے رہی تھی۔ بارود کے دھوئیں کی بو پھیلتے ہی ہم چند قدم ہٹ کر کھڑے ہو گئے اور دشمن کے مسکن کا جائزہ لینے لگے جہاں دھماکوں کے بعد موت کا ہولناک سناٹا طاری ہو گیا تھا۔

دشمن کے مسکن پر خاموشی چھاتے ہی ہم دونوں پلٹ کر اسی رستے پر چل دیے جدھر سے آئے تھے اور جھاڑیوں کا جنگل عبور کر کے درختوں کے جھنڈ کے قریب پہنچ گئے جہاں

مانک ٹالہ رائفل لہرا کر ہمارے استقبال کے لیے موجود تھا۔ اس سے چند قدم کے فاصلے پر ایک درخت کی اوٹ میں مجھے شالیار خان بھی نظر آ گیا۔ جس کی عقابی نظریں ہم پر جمی ہوئی تھیں اور کان دشمنوں کی آہٹ سننے میں مصروف تھے۔

"نوجوان! کچھ دیر پہلے میں نے دھماکے سنے تھے۔ ان دھماکوں سے تمہارے کسی ساتھی کو تو کوئی نقصان نہیں پہنچا؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں!" میں نے کامیابی کے نشے میں مخمور لہجے میں جواب دیا۔ "اس کے برعکس ہم اپنے دشمن کو مغلوب کرنے میں خاصے کامیاب رہے۔ ان کے کم از کم چار افراد کو جہنم کی سرزمین کی طرف روانہ کر دیا ہے۔"

اس کامیابی کی خبر سن کر شالیار خان گہری سوچ میں مبتلا نظر آنے لگا۔ وہ بار بار ان چٹانوں کو گھورے جا رہا تھا۔ جہاں ہم بادل خان اور اس کے ساتھی کو ٹھکانے لگا کر آئے تھے۔ چند لمحے وہ خاموشی سے کچھ سوچتا رہا پھر میری جانب گھوم کر بولا۔

"دشمن کے کچھ آدمیوں کو ٹھکانے لگا کر بھی راستہ ابھی خطرات سے محفوظ نہیں ہوا۔ اپنے آدمیوں کی تباہی دیکھ کر وہ بپھرے ہوئے درندوں کی طرح ہم پر یلغار کر دیں گے۔ اپنے ساتھیوں کی جانیں گنوا کر انہیں جو تجربہ حاصل ہوا ہے، وہ اسے دہرانے کی آسانی سے اجازت نہیں دیں گے۔ خطرات کم ہونے کی بجائے بڑھ گئے ہیں۔ اب پہلے سے زیادہ ہوشیار اور چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔" شالیار خان نے کہا اور پلٹ کر پڑاؤ کی جانب چل دیا۔

ہم پر نظر پڑتے ہی چند ساتھی ہماری خیریت معلوم کرنے کے لیے دوڑتے آئے۔ سارجنٹ اور مانک ٹالہ انہیں مطمئن کرنے میں مصروف ہو گئے۔

آسمان پر چاند اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ روشن تھا اور رات اپنا تیسرا پہر ختم کر کے آخری مرحلے کو چھو رہی تھی کہ اچانک کسی الو کی منحوس آواز سن کر میں نے بے اختیار اپنی رائفل پر گرفت مضبوط کر لی اور الاؤ کے قریب سے اٹھ کر سامنے والی ڈھلوان میں جھانکنے لگا۔ اب ہر طرف گہرا سکوت طاری تھا۔ ماحول خواب ناک دھند میں لپٹا ہوا محسوس ہوا۔ الو کی آواز دوبارہ سنائی دی اور ساتھ ہی گھوڑے ہنہناتے ہوئے بے چینی سے پیر مارنے لگے۔ حساس جانوروں نے کسی دشمن کی موجودگی محسوس کر لی تھی اور ہمیں ان کی آمد سے آگاہ کر رہے تھے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تنہا الو بار بار اپنے حلق سے منحوس آوازیں نکالتا رہا مگر اس بار اس کی آواز میں آواز ملا کر بولنے والے دنیا سے سدھار چکے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ جب ہمارے دشمنوں پر اپنے ساتھیوں کی موت کا راز کھلے گا تو ہر چٹان ہمیں اپنی دشمن ملے گی اور ہمیں اس وقت تک آگے سفر کرنا دشوار ہو جائے گا۔ جب تک ہم ان کا مکمل صفایا نہیں کر دیں گے۔

"سارجنٹ!" میں نے گھومتے ہوئے اُسے مخاطب کیا۔ "اپنے ساتھیوں کو ہوشیار کر دو۔ یہ آواز ہم پر عام حملے کا اشارہ ہے۔ میں خطرے کی بو سونگھ رہا ہوں۔ شب خون مارنے کے لیے دشمن کے پاس یہ بہترین وقت ہے۔ ہمارے ساتھی فطری کمزوری کا شکار ہو رہے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں نیند اور چہروں پر تھکن کے آثار بہت واضح ہیں مگر یہ وقت اونگھنے یا آرام کرنے کا نہیں ہے۔"

میری باتوں کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ الاؤ کے گرد بیٹھے ہوئے تمام جوان ہوشیار اور چوکنا ہو گئے اور چٹکی ہوئی چاندنی میں اپنے دشمن کا سراغ ڈھونڈنے لگے۔

سارجنٹ دوسرے لوگوں تک میری ہدایات پہنچانے چلا گیا تو میں نے دوبارہ ڈھلوان پر نظریں جما دیں جہاں گہرا سکوت تھا اور ابھی تک کسی ذی روح کے آثار نمودار نہیں ہوئے تھے۔ قدموں کی چاپ سن کر میں نے اپنے دائیں جانب دیکھا تو شالیار خان رائفل اٹھائے میرے قریب اسی درخت کے تنے کے ساتھ آ کھڑا ہوا جہاں میں حملہ آوروں کے استقبال کے لیے موجود تھا۔ میں نے ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی اور دوبارہ اسی راستے کو گھورنے لگا جدھر سے دشمن کی آمد متوقع تھی۔ الو ایک بار پھر اپنی منحوس آواز میں بول اٹھا۔ اس کی آواز بھاپ کے کسی انجن کی سیٹی سے مشابہ تھی۔ شالیار خان یہ آواز سنتے ہی چوکنا ہو کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔

"کوئی دشمن ہمارے آس پاس ہی درختوں میں پوشیدہ ہے اور اپنے ساتھیوں کو ہمارے بارے میں آگاہ کر رہا ہے۔" اس نے سرگوشی کی۔

"میں تمہاری اس رائے سے اتفاق کرتا ہوں کہ کوئی نہ کوئی ہمارے قریب موجود ہے اور ہماری سرگرمیوں پر نگاہ رکھے ہوئے ہے۔" میں نے تائید کرتے ہوئے جواب دیا اور دوبارہ ڈھلوانوں پر نظر جما دی۔

شالیار خان رائفل تھامے کسی بپھرے ہوئے اور بھوکے شیر کی مانند نظر آ رہا تھا۔ اس کی عقابی نظروں سے جھانکتی ہوئی سرخی اس کے اندرونی جوش و خروش کی غماز تھی۔ وہ میرے احساسات سے بے خبر ان درختوں کو گھورے جا رہا تھا جو ہمارے پڑاؤ کے ارد گرد پھیلے ہوئے ایک قدرتی حصار کا کام دے رہے تھے۔

الو ایک بار پھر بڑے زور سے چیخا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے اپنے قریب رائفل کا ایک دھماکا سنائی دیا۔ شالیار خان ایک درخت کو نشانہ بنائے ہوئے تھا۔ اس کا پہلا فائر کوئی نتیجہ برآمد نہیں کر سکا۔ تاہم اس کی نگاہ درخت کی ایک شاخ پر جمی ہوئی تھی جہاں اسے کسی کی موجودگی کا شبہ رہا ہو گا۔ اچانک اس نے پھر اسی شاخ کو نشانہ بنایا اور گولی چلا دی۔ دوسرا دھماکا ہوتے ہی ایک کربناک چیخ ابھری، کوئی قلابازیاں کھاتا ہوا میرے ساتھیوں کے درمیان، پتھریلی زمین پر آ گرا اور لرکھتے ہی لمحے ساکت ہو گیا۔

شالیار خان اور میں تیزی سے اس کے قریب پہنچے مگر وہ دم توڑ چکا تھا۔ گولی اس کی پسلیاں توڑتی ہوئی نکل گئی تھی بلندی سے گرنے کے باعث اس کی گردن بھی ٹوٹ کر ٹیڑھی ہو چکی تھی۔ اس کی رائفل ابھی تک درختوں کی شاخوں میں الجھی ہوئی تھی۔

"نوجوان! میں نے آخری الو کا خاتمہ کر دیا ہے۔ اس کی خاموشی، دشمنوں کو سامنے آنے پر مجبور کر دے گی۔" اتنی دیر میں سارجنٹ اور کچھ دوسرے ساتھی بھی قریب آ کر منصوری قبیلے کے اس نوجوان کی لاش کو گھورنے لگے۔

"گپتا! مانک ٹالہ کے ساتھ مل کر یہ لاش بھی ڈھلوان میں پھینک دو تاکہ دشمن اس کی موت سے آگاہ ہو جائے اور ہم مزید انتظار کی کوفت سے آزاد ہو جائیں۔"

مانک ٹالہ اور گپتا نے لاش گھسیٹ کر ڈھلوان میں پھینک دی اور دوبارہ اپنے مورچوں پر چلے گئے۔ میں اسی درخت کے قریب جا کھڑا ہوا جہاں کچھ دیر قبل شالیار خان کھڑا تھا۔ اس وقت وہ بڑے رعب اور وقار سے چلتا ہوا مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر ایک درخت کی آڑ میں رک کر گہری نظروں سے آس پاس کے درختوں کا جائزہ لے رہا تھا جیسے اُسے شبہ ہو کہ دشمن کا کوئی اور جاسوس ہمارے درمیان موجود ہے۔ فضا میں ایک بار پھر ہولناک سکوت اپنا رنگ جمانے لگا تو میری بھٹکتی ہوئی نظریں لیڈے باپ کے چہرے پر جم گئیں جو آنا تش کی اس کٹھن گھڑی میں ہمارا ساتھ دے رہا تھا۔ اس کی خون میں ڈوبی ہوئی سرخ آنکھیں انتقام کی پیاسی نظر آ رہی تھیں۔ ایک طویل عرصے بعد اُسے رائفل تھامنے کا موقع ملا تھا تو وہ اس موقعے کو اپنے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مضبوط ہاتھوں کی گرفت میں رکھنے کی کوششوں میں سردھڑ کی بازی لگائے ہوئے تھا اسے شیر کی طرح میدانِ جنگ میں پاکر مجھے خوشی ہو رہی تھی مگر مسرت کے یہ لمحات بہت مختصر ثابت ہوئے۔ میری نگاہ درخت کے اس تنے پر جم گئی جہاں ایک خوفناک اژدہا اپنی دوشاخہ زبان لہراتا ہوا بل کھاتا تیزی سے نیچے کی جانب رینگ رہا تھا ابھی وہ تنے سے بلندی پر ہی تھا کہ میں نے رائفل تان کر اُسے نشانہ بنا دیا۔ گولی نشانے پر لگی اور اژدہا زخمی ہو کر تنے سے لٹک گیا اور اپنے جسم کو سینکڑوں بل دینے لگا۔ اپنی جانب رائفل کی نال اُٹھتے دیکھ کر شالیار خان کا چہرہ اچانک اپنا رنگ بدل گیا تھا۔ مگر گولی اس کے سر پر لٹکتے ہوئے اژدہے کو لگی تو اس کی حیرت زدہ آنکھیں گھوم کر اپنے اوپر تنے پر جم گئیں جہاں خوفناک اژدہا ابھی تک زندگی اور موت کے درمیان انتقامی وار کرنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ میں نے دوبارہ رائفل سیدھی کی اور اژدہے کی کھوپڑی کے پرخچے اڑا دیے۔

اپنے سر سے موت کا خطرہ ٹلتے ہی شالیار خان پُرسکون ہو گیا اور اس کے تنے ہوئے عضلات واپس اپنی حالت پر آ گئے وہ مُردہ اژدہے پر نظر ڈالتا ہوا میرے قریب آ گیا اور محبت کی ہاتھ سے میرا شانہ تھپکنے لگا۔ اس کے ہاتھ کا لمس محسوس کرتے ہی میرے جسم میں بجلی کی ایک لہر سی دوڑ گئی اور سردی کی شدت سے رگوں میں جمتا ہوا خون پگھل کر تیزی سے گردش کرنے لگا جب تک میرے باپ کا ہاتھ میرے شانے پر رہا میں دُنیا و مافیہا سے بے خبر ایک انوکھے جہان کی سیر کرتا رہا۔ یوں محسوس ہوتا رہا جیسے وقت کی گردش تھم گئی ہو اور میں حال سے ماضی کی جانب تیزی سے سفر کر رہا ہوں۔ ماضی و حال آپس میں گڈمڈ ہو رہے تھے کہ اچانک ایک شعلہ اپنی جانب لپکتے دیکھ کر ماضی میری گرفت سے نکل گیا اور میں حال کے اس لمحے میں واپس آ گیا جہاں موت کی آگ ایک بار پھر ہمیں یکجا دیکھ کر دائمی جدائی کی دیواریں بلند کرنے پر تلی ہوئی تھی۔

میں نے جذباتی کیفیت کو خیرباد کہا اور آن کی آن میں شالیار خان پر جا پڑا اور اُسے لیتا ہوا ڈھلان پر لڑھکنے لگا۔ اگر ایک لمحے کی بھی تاخیر ہو جاتی تو گولی شالیار خان کا کام کر چکی ہوتی۔ دشمن کی گولیاں ہمارے گرتے ہی درخت کے تنے میں آ کر دھنس گئی تھیں۔ وہ ہم دونوں کو موت کے راستے پر روانہ کر دیتیں مگر میری مستعدی کام آئی اور ہم دونوں لڑھکتے ہوئے ایک

چٹان کی اوٹ میں آ کر رک گئے آخری لمحے میں نے چٹان سے اپنا سر بچانے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ میرا سر ایک دھماکے سے ایک پتھر کے ساتھ ٹکرایا اور میرے دل و دماغ پر تاریکیاں مسلط ہو گئیں۔

خواب ناک اندھیرے چھٹ گئے تو آنکھیں کھولتے ہی میرے سامنے آسمان کی چھت تھی۔ جیسے ہی حواس بحال ہوئے، میرے سر کے پچھلے حصے میں شدید درد کروٹیں لینے لگا۔ تب اچانک شالیار خان کی سرگوشی سنائی دی: "نوجوان! خود کو سنبھالو۔ دشمن اپنی کمین گاہ چھوڑ کر پڑاؤ پر حملہ آور ہو چکا ہے۔"

میں اپنے حواس یکجا کرتا ہوا اُٹھ بیٹھا مگر چوٹ اس قدر شدید تھی کہ ابھی تک میری آنکھوں کے سامنے سیاہ دائرے رقص کر رہے تھے۔ ہولناک دھماکوں کی گونج سماعت سے ٹکرائی تو میں نے تیزی سے سر جھٹکا اور میرے ہاتھ بے اختیار اپنی رائفل تلاش کرنے لگے۔ شالیار خان نے پتھر کی اوٹ میں گری ہوئی رائفل اُٹھا کر میرے ہاتھوں میں تھما دی اور ہم اسی چٹان کو مورچہ بنا کر دشمن کی گولیوں کا جواب دینے کے لیے تیار ہو گئے۔ فضا میں ہولناک دھماکوں کی گھن گرج میں درندوں اور جانوروں کی چیخیں بھی شامل ہو گئیں۔ ہم اچانک موت کی برستی ہوئی آگ کی لپیٹ میں آ رہے تھے۔ معاً ایک جھاڑی کی اوٹ سے رائفل کا شعلہ بلند ہوتے ہی، اپنی رائفل کا دہانہ اس طرف کر دیا اور لگاتار دو گولیاں جھونک ماریں۔

رائفل کے دھماکے گونجتے ہی کوئی تیزی سے اُچھلا اور دلخراش چیخ بلند کرتا ہوا موت کی وادی میں اُتر گیا۔ اتنی دیر میں شالیار خان بھی ایک دشمن کو گولی کا نشانہ بنا چکا تھا۔ اچانک ایک گولی اس چٹان پر آ کر لگی اور چنگاریاں اُڑاتی ہوئی پتھروں میں رک گئی میں نے رائفل کا رُخ اس طرف کر دیا جدھر سے گولی آئی تھی لیکن رائفل سیدھی ہونے سے قبل ہی اُس نے مجھ پر دوسری گولی داغ دی مجبوراً میں نے اپنا سر فوراً نیچے کر لیا چند کنکریاں اُڑ کر میرے وجود پر برس پڑیں... مگر میں نے دشمن کو تیسری گولی چلانے کا موقع نہیں دیا اور گولیوں سے اس کے پیٹ میں کئی انچ چوڑا شگاف کر کے اُسے آگے بڑھنے سے روک دیا۔

دشمن اپنے چند ساتھیوں کی جانیں گنوا کر ہمارے مورچے پر مسلسل فائرنگ کر رہا تھا۔ رائفل کی لبلبی دباتے دباتے میری انگلیاں شل ہو گئیں مگر دشمن کی یلغار نہ رُک سکی۔ ہم اپنے پڑاؤ

سے قدرے نیچے ڈھلان میں تھے اور دشمن کے شدید حملوں نے ابھی تک ہمیں یہ موقع نہیں دیا تھا کہ ہم اس مورچے سے نکل کر اپنے ساتھیوں سے جا ملیں تاہم میں اپنے انتظامات اور جوانوں کی کارکردگی سے پوری طرح مطمئن تھا کہ وہ پڑاؤ سے میری دُوری محسوس نہیں کریں گے میرے ساتھی اپنی حفاظت کرتے ہوئے دشمن کی گولیوں کا مسلسل جواب دے رہے تھے۔ اچانک دشمن کی طرف سے دھماکوں میں خاصی کمی آ گئی غالباً وہ اپنے کئی آدمیوں کی جانیں گنوا کر پسپائی کا ارادہ کر رہا تھا... چاندنی پھیکی پڑتی جا رہی تھی اور فضا میں دودھیا اُجالے کے آثار پیدا ہونے لگے تھے دشمن ہمارے خلاف پھیلائے ہوئے اپنے جال کا خود ہی شکار ہو گیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میرے جوان اپنی جگہ جمے رہے تو نہ صرف دشمن کی گولیوں سے محفوظ رہیں گے بلکہ جنگ کا پانسہ بھی ہمارے حق میں پلٹ جائے گا۔ میں اور شالیار خان رینگتے ہوئے اس عارضی مورچے سے نکل کر اپنے ساتھیوں کی جانب بڑھ رہے تھے کہ اچانک دشمن نے عقب سے حملہ کر دیا۔ ان کی چلائی ہوئی گولیاں پتھروں سے چنگاریاں اُڑاتی ہوئی ہمارا تعاقب کرتی رہیں مگر ہم سلامتی کے ساتھ اپنے ساتھیوں تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے ہمیں زندہ اور سلامت دیکھ کر پڑاؤ میں جوش و خروش کی لہر دوڑ گئی۔ اور دشمن کے بچے کھچے افراد پر گولیوں کی بوچھاڑ تیز ہو گئی۔

جوں جوں اجالا پھیلتا گیا جنگ کے شعلے ماند پڑتے گئے۔ میرے ساتھی گزشتہ تیس گھنٹے سے مسلسل ہنگامی صورتِ حال سے دوچار تھے۔ مگر ان کی جواں مردی اور دلیری میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ سورج کی روشنی نے زمین پر اپنا تسلط قائم کیا تو دھماکے بھی دم توڑ گئے تھے۔

"سارجنٹ! چند ساتھیوں کو ناشتہ تیار کرنے کی ہدایت کرو اور مورچوں پر ڈٹے ہوئے جوانوں کو الاؤ کے نزدیک بلا کر کچھ دیر سردی اور تھکن دور کرنے کا موقع دو تاکہ اُن کے تنے ہوئے اعصاب قابو میں آ جائیں۔ ہمیں اس عارضی سکون سے فائدہ اٹھانا چاہیے، زخم خوردہ دشمن جب پلٹے گا تو اس کی رفتار بہت تیز ہو گی اور عزائم پہلے سے زیادہ خطرناک ہوں گے۔ ان کی واپسی تک سب ساتھیوں کو اپنی تھکن اُتار کر تازہ دم ہونے کا موقع ملنا چاہیے۔ ورنہ ان کے سردی سے اکڑے ہوئے ہاتھ رائفل تھامنے کے قابل نہیں رہیں گے۔"

"تمہارا کہنا درست ہے نوجوان!" شالیار خان نے چٹانی چہرے پر مسکراہٹ کی ہلکی سی لکیر نمودار کرتے ہوئے اچانک مداخلت کر دی۔ "اگر تم اپنے ساتھیوں کو آرام پہنچانے کے بجائے دشمن کے تعاقب کا فیصلہ کرتے تو تمہارا یہ فیصلہ ناقص ہوتا۔ مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ تم نے سفاک دشمن کے تعاقب کا خیال ترک کر دیا اور اپنے تھکے ہوئے جوانوں کو تازہ دم ہونے کا موقع دے کر ایک مفید فیصلہ کیا ہے۔"

میں نے اس کی تعریفی باتوں کو ہنس کر ٹال دیا اور پھر جوگندر سنگھ کی طرف بڑھ گیا جو گھوڑوں کو چارہ ڈالنے میں مشغول تھا۔ "جوگندر سنگھ رات کیسے گزری؟" میں نے رائفل کی نال زمین پر ٹکا کر اس کے دائیں شانے پر ایک ہاتھ سے تھپکی دیتے ہوئے سوال کیا۔

"شہباز خان! گزری ہوئی رات میری زندگی کی ایک خطرناک رات تھی۔ ہر لمحے مجھے یہی دھڑکا لگا رہا کہ کہیں ہمارے یہ بے زبان ساتھی دشمنوں کی گولیوں کا نشانہ نہ بن جائیں ویسے مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ جنگ مکمل طور پر ختم نہیں ہو سکی اگر جنگ ختم ہو جاتی تو میں چند گھنٹے آرام کی نیند سو لیتا۔ گزشتہ رات بھی میں نے جاگتے ہوئے گزار دی تھی مگر شومئی تقدیر کہ جنگ طول پکڑتی دکھائی دے رہی ہے جو ہمارے لیے خطرناک بھی ثابت ہو سکتی ہے۔"

"تمہیں آج کا دن مکمل آرام کرنے کی اجازت ہے۔" میں نے ہنس کر جواب دیا۔ "جنگ کے بارے میں خدشات کو دل میں جگہ نہ دو۔ مجھے یقین ہے کہ دشمن کافی دیر تک ہمیں یہ یقین دلانے کی کوشش کرے گا کہ اس نے پسپائی اختیار کرتے ہوئے ہمارا پیچھا چھوڑ دیا ہے۔ اسے اپنے شکست خوردہ ساتھیوں کے حوصلے بلند کرنے میں بہت وقت لگ جائے گا۔"

اس نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا تو میں اسے چھوڑ کر گھوڑا گاڑیوں کی طرف بڑھا جن کے پہیے برف میں دھنسے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ گاڑیاں بالکل درست تھیں۔ ادھر سے مطمئن ہو کر میں پڑاؤ کا جائزہ لیتا ہوا دوبارہ الاؤ کے قریب پہنچ گیا جہاں لوگوں سے الگ تھلگ شالیار خان بھی موجود تھا۔ وہ آگ کے لپکتے ہوئے نیلگوں شعلوں کو گھورتا ہوا شاید اپنا مستقبل تلاش کر رہا تھا۔ اس کی خوفناک سُرخ آنکھیں فکر و تشویش سے پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ قہوے کی پیالی اپنے سامنے رکھے دیر تک نیلگوں شعلوں کو اپنی آنکھوں کا مرکز بنائے رہا۔ پھر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اچانک ایک طویل سانس لیتے ہوئے اس نے دوبارہ قہوے کی پیالی اٹھا کر ہونٹوں سے لگالی اور ہلکے ہلکے گھونٹ لینے لگا۔

ناشتے سے فراغت پاتے ہی آنکھوں میں نیند کا خمار اتر آیا تو میں اُٹھ کر اپنے خیمے میں آگیا اور کچھ نیند پوری کرنے کے ارادے سے بستر پر لیٹ گیا۔ بستر پہ دراز ہونے سے پیشتر میں نے کچھ جوانوں کو نگرانی کا فرض سونپ دیا تھا اس لیے اطمینان سے بستر پہ دراز ہوا تو جلد ہی خوابناک دھندلکوں میں کھو گیا۔

میں گہری نیند میں تھا کہ اچانک گھوڑوں کے ہنہنانے اور زمین پر ٹاپیں مارنے کی آوازیں سن کر بیدار ہو گیا۔ آنکھیں کھولتے ہی کجلائے ہوئے سورج کی ... خیمے میں جھانکتی ہوئی پاکر میں نے دوبارہ سونے کی کوشش کی۔ مگر متعدد گھوڑوں کے ہنہنانے کی آوازیں اور برابر ٹاپیں مارنے کا عمل جاری رہا تو میں اُکتا کر اُٹھ گیا اور اپنا لباس درست کر کے بستر کی تہ میں رکھا ہوا ریوالور اُٹھا کر ہولسٹر میں اُڑستا ہوا، دوسرے ہاتھ میں رائفل تھامے خیمے سے باہر آگیا۔

الاؤ کے قریب سارجنٹ آرٹ ایک قبائلی جوان کے ساتھ بیٹھا باتوں میں مصروف، ایک ہاتھ سے سوکھی ہوئی شاخ سے آگ کرید رہا تھا۔

"سارجنٹ!" میں نے بلند آواز میں کہا۔ "یہ گھوڑے اس بُری طرح کیوں بے چین ہو رہے ہیں؟ اور ان کے آس پاس اس قدر دھواں کیوں پھیلا ہوا ہے؟"

"تشویش کی کوئی بات نہیں۔" اس نے جواب دیا۔ "گھوڑے پچھلے دو گھنٹے سے مسلسل چیخ رہے ہیں۔ مرطوب زمین نے اچانک ان گنت جونکوں کو اُگل دیا تھا۔ ایک ایک گھوڑے کے گرد سینکڑوں جونکیں خون پینے کے لیے جمع ہو گئیں تو میں نے شالیار خان کے مشورے سے ان کے گرد آگ جلا کر دھواں کر دیا تاکہ جونکیں گھبرا کر واپس چلی جائیں۔ ان میں کچھ تو آگ میں جل بھن کر جہنم کو سدھار گئی ہیں اور باقی دھوئیں کی زد سے بچنے کے لیے دُور ہٹ رہی ہیں۔"

یہ ہولناک انکشاف سن کر میں تیزی سے اس طرف بڑھا جہاں گھوڑے بے چینی سے ہنہناتے ہوئے اب بھی دولتیاں فضا میں اچھال رہے تھے۔ دھوئیں کی ناگوار بُو نتھنوں میں گھستی چلی جا رہی تھی۔ میں نے رومال نکال کر اپنا منہ اور ناک اچھی طرح ڈھانپ لیا اور اس حصے کو گھورنے لگا جہاں ان گنت مُردہ جونکیں موجود تھیں۔ میں یہ سوچ کر متفکر ہو گیا کہ اگر جونکیں پلٹ کر آگئیں اور اس مرتبہ انھوں نے جانوروں کے ساتھ ساتھ انسانی جسموں کے گرد بھی حصار قائم کر لیا تو سارا پڑاؤ مفلوج ہو کر رہ جائے گا۔ میری نظریں ایک ایک گھوڑے کا جائزہ لینے میں مصروف تھیں۔ ان کے جسم داغ دار اور زخمی نظر آرہے تھے اور زخموں سے خون رِس رہا تھا۔

"سارجنٹ!" میں گھوڑوں کو زخمی دیکھ کر حلق کے بل چیخا۔ "جوگندر سنگھ اور اس کے ساتھیوں کو بیدار کر دو تاکہ ان زخمی گھوڑوں کی مناسب دیکھ بھال کر سکیں۔ ورنہ یہ ایک دوسرے کو اپنی ٹاپوں سے زخمی کرنا شروع کر دیں گے۔"

میری دھاڑ سن کر کچھ ساتھی دوڑے اور میری مدد کے لیے پہنچ گئے۔

سب گھوڑے کھول کر ٹیلے کے دوسرے کنارے پر باندھ دیے گئے اور ان کی مناسب دیکھ بھال ہونے لگی۔ جوگندر سنگھ اور دوسرے جوانوں نے مل کر گھوڑوں کی اضطرابی کیفیت پر قابو پالیا اور یہ بے زبان ساتھی دوبارہ پُرسکون ہو کر چارہ کھانے لگے۔

میں سارجنٹ آرٹ کو لے کر شالیار خان کے خیمے میں آگیا۔

"شالیار خان! ابھی تین گھنٹے دن باقی ہے۔ سارے جوان تازہ دم ہو چکے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ دن کا بقیہ حصہ سفر کرتے ہوئے گزاریں۔ مجھے یقین ہے، شام ہونے تک ہم اپنا کافی سفر طے کر لیں گے اور ان خون آشاموں سے دور نکل جائیں گے جو حشرات الارض کی طرح اس ٹیلے کے آس پاس جمع ہو رہی ہیں۔"

"جب تم پڑاؤ اُٹھانے کا فیصلہ کر ہی چکے ہو تو پھر میرے مشورے کی کیا گنجائش باقی رہ جاتی ہے؟" شالیار خان نے گمبھیر آواز میں جواب دیا اور خیمے سے باہر دیکھنے لگا۔

"سارجنٹ! پڑاؤ اٹھانے کا حکم جاری کر کے جوانوں کو ہدایت کر دو کہ وہ فوراً چلنے کے لیے تیار ہو جائیں۔" میں نے گھوم کر اسے مخاطب کیا تو وہ اثبات میں سر کو جنبش دیتا ہوا خیمے سے نکل گیا۔ تب شالیار خان نے اپنی خوفناک سرخ آنکھیں میرے چہرے پر گاڑ دیں۔

"نوجوان! تم نے ایک رات کے قلیل وقفے میں دو مرتبہ میری جان بچا کر بہادروں کی تاریخ میں ایک نئی مثال کا اضافہ کر دیا ہے۔ اپنے دشمن کو بچانے کے لیے جس بلند حوصلگی سے تم نے اپنی جان شدید خطرے سے دوچار کر دی تھی، میں اس کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو گیا ہوں۔ مگر افسوس! تم نے اپنی بے پناہ صلاحیتیں اپنی قوم کے خلاف وقف کر رکھی ہیں۔ اگر تم اپنی طاقت اور جواں مردی، اپنی قوم پر مسلط حکمرانوں کے خلاف استعمال میں لاتے تو تمھاری قوم کے لوگ تمھاری وفاداری اور بہادری کا صلہ تمھیں یوں دیتے کہ رہتی دُنیا تک لوگ تمھارا نام یاد رکھتے اور تمھارا ذکر کرتے ہوئے ان کے سر فخر سے بلند ہو جاتے مگر تم نے اپنے ضمیر کی آواز دبا کر مصلحت کا لباس پہن لیا ہے جو بہادروں کے جسم پر زیب نہیں دیتا۔" اس کی گمبھیر آواز میں گہرا تاسف تھا۔ جس نے مجھے پریشان کر دیا۔

"شالیار خان! مجھے وفاداری کا فلسفہ سنا کر مرعوب کرنے کی کوشش نہ کرو۔ میرا ضمیر مطمئن ہے کیونکہ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ میں کیا کر رہا ہوں اور اس کے انجام سے بھی پوری طرح باخبر ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ میرے ضمیر پر کوئی بوجھ نہیں۔ اگر میری جگہ حالات تمھیں لا کر کھڑا کر دیتے تو تم بھی یہی فیصلہ کرتے اور یہی راستہ اختیار کرتے جس پر میں چل رہا ہوں۔ میں اپنا اچھا بُرا خود سوچ سکتا ہوں۔ تم اپنے انجام کی فکر کرو کیونکہ مستقبل قریب میں تم میرے طاقت ور ہاتھوں کی مضبوط گرفت میں آنے والے ہو۔" میں نے سخت نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا اور خیمے نکل کر اپنے جوانوں کی حرکات و سکنات کا مشاہدہ کرنے لگا۔

شالیار خان کی باتیں ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہی تھیں اور میرے وجود میں ایک بھونچال سا آیا ہوا تھا۔ کچھ لوگوں نے آکر شالیار خان کا آخری خیمہ بھی اکھاڑ کر سمیٹا تو قافلہ چلنے کے لیے تیار ہو گیا۔ میں نے گورکھا جوانوں کو ہراول دستے کے فرائض سونپ دیے اس کے بعد جوگندر سنگھ کو دونوں گاڑیاں آگے بڑھانے کے لیے کہا تو ان گاڑیوں میں چار مسلح نوجوان حفاظت کے لیے مقرر کر دیے۔ ان گاڑیوں کی آڑ لیتے ہوئے میں اور شالیار خان قافلے کی قیادت کرتے ہوئے ڈھلان میں اترنے لگے۔ جوگندر سنگھ بڑی چابکدستی سے پیچھے آنے والی گاڑی کے لیے راستہ بناتا جا رہا تھا۔ بلندی سے ڈھلان میں سفر کرنا دُشوار ثابت ہو رہا تھا۔ دو مرتبہ گاڑی راستے میں اچانک آنے والے ٹیلے سے بچ کر گزرنے میں کامیاب ہو چکی تھی اور کسی بھی لمحے تباہی کا امکان تھا۔ میں گھوڑا آگے بڑھا کر جوگندر سنگھ کے برابر پہنچ گیا۔ "جوگندر سنگھ گاڑی کی رفتار کم رکھو۔ ورنہ کسی چٹان سے ٹکرا کر ناکارہ ہو جائے گی۔"

جوگندر سنگھ نے میری آواز سنتے ہی لگامیں کھینچ کر گھوڑوں کو آہستہ چلنے پر مجبور کر دیا۔ مگر میں دیکھ رہا تھا کہ ڈھلان کے باعث وہ گاڑی کی رفتار پر قابو نہ رکھ سکا۔ گاڑی دائیں جانب نظر آنے والے ٹیلے سے ٹکرا کر رک گئی اور ایک مضبوط بانس ٹوٹ گیا۔ قافلہ رُکنے پر مجبور ہو گیا۔ جوگندر سنگھ بائیں اپنے ایک ساتھی کو تھما کر گاڑی میں کچھ تلاش کرنے لگا۔ جب اس کا ہاتھ باہر آیا۔ تو اس کی انگلیوں میں ریشم کی ڈوری کا ایک لچھا تھا۔ اس نے گاڑی سے اتر کر ٹوٹے ہوئے بانس کے گرد درخت کی دو ٹہنیاں رکھ کر مضبوطی سے ڈوری باندھ دی اور گاڑی کو تھوڑا پیچھے ہٹا کر راستہ بناتا ہوا دوبارہ چل پڑا۔

راستہ دُشوار ہونے کی وجہ سے ہم ایک قطار میں آگے بڑھتے رہے۔ ڈھلان ختم ہوتے ہی راستہ قدرے ہموار ہو گیا اور یہاں سے قافلے کی رفتار بھی تیز ہو گئی۔ دو کوس کا یہ ہموار راستہ جلد ہی ختم ہو گیا۔ اب ہم ایک بار پھر ایک پہاڑی سلسلے کے درمیان سے گزر رہے تھے۔ درّے کے قریب گورکھا نوجوان ہمیں راستہ صاف ہونے کی جھنڈی لہراتے ہوئے نظر آگئے تو میں نے جوگندر سنگھ اور گپتا کو گاڑیوں کی رفتار بڑھانے کے لیے کہا۔ پہاڑی سلسلے کے درمیان ایک ٹیلا مجھے خطرناک نظر آرہا تھا۔ میری نگاہ اس کی نوکیلی چوٹیوں پر جمی ہوئی تھی جہاں دُشمن ہماری پیشوائی کے لیے موجود ہو سکتا تھا۔

دونوں گاڑیاں ٹیلے تک آدھا راستہ طے کر چکی تھیں اچانک ہم پر موت کی آگ برسنے لگی۔ میں نے گاڑی کی آڑ لیتے ہوئے ایک چٹان پر مسلسل دو فائر جھونک دیے۔ میری دو ... گولی کارگر رہی اور ایک قد آور جوان دلخراش چیخ بلند کرتا قلابازی کھاتا ہوا نیچے آگرا اور زندگی کی جنگ ہار گیا۔ جوگندر نے گھوڑوں کو چابک دکھایا اور گھوڑے الف ہو کر تیزی سے بھاگتے ہوئے ٹیلے کے قریب سے گزر گئے۔ اسی ... سنسناتی ہوئی گولی آکر میرے گھوڑے کی گردن میں پیوست ہو گئی۔ گولی کھا کر گھوڑا اچھلا۔ مجھے گراتا ہوا ایک چٹان سے ٹکرایا اور ساکت ہو گیا۔ اس ہولناک سفر کے دوران یہ دوسرا موقع تھا کہ میں اپنے گھوڑے سے یوں محروم ہو گیا۔ میں جہاں گرا تھا، وہاں جھاڑیوں کے درمیان قدرتی گڑھا

زندگی کی ضمانت بن گیا۔ گھوڑے سے گرتے وقت رائفل میرے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ اس لیے میں نے ریوالور نکال کر موت کی برستی ہوئی آگ کے درمیان آہستہ آہستہ سر ابھارا اور گڑھے سے باہر جھانکنے لگا۔ رائفل گڑھے کے کنارے ایک پتھر سے ٹکی ہوئی تھی۔ میں نے گڑھے سے نکل کر اپنی رائفل تک پہنچنے کا ارادہ کیا تھا کہ اچانک کسی نے مجھ پر گولی داغ دی۔ گولی مجھ سے ایک بالشت کے فاصلے پر پتھر سے ٹکرا کر چنگاریاں چھوڑ گئی۔ میں نے فوراً ہی خود کو واپس گڑھے میں گراتے ہوئے دوسری گولی چلنے سے پہلے ہی اپنا وجود محفوظ کر لیا۔

میں نے اس چٹان کی طرف دیکھا جہاں سے مجھ پر نشانے برسائے گئے تھے۔ وہ خاصی بلندی پر تھا اور اس کی رائفل کی نال میری جانب جھکی ہوئی تھی۔ میں نے ریوالور بلند کیا اور بلندی کی جانب مسلسل گولیاں چلا دیں جو رائیگاں گئیں۔ دشمن خاصا محتاط تھا۔ اسی لمحے اچانک مجھ پر دونوں جانب سے موت کی آگ برسنے لگی۔ میرے ریوالور کی نال سے نکلنے والے شعلوں نے اس کے دوسرے ساتھی کو میری جانب متوجہ کر دیا... اور اب وہ مجھ پر بارود چلانے میں مصروف ہو گیا تھا۔

میں نے اپنا دوسرا ریوالور بھی نکال لیا اور اس ناگہانی سے نمٹنے کے لیے تیار ہو گیا۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ میرے گھوڑے کی ہلاکت کے بعد میرے ساتھی، دشمن کے ان غیر متوقع دھماکوں سے کیا کیا نقصانات اٹھا چکے ہیں اور موت کے خطرے سے کس طرح نمٹ رہے ہیں۔ قدرے سکون ہوا تو میں نے دوبارہ سر اٹھایا اور اپنے دائیں ہاتھ والے دشمن پر موت کا دہانہ کھول دیا۔ پہلی ہی گولی کارگر رہی اور وہ چیختا ہوا عقبی ڈھلوان پر [illegible] چلا گیا۔ اپنے ساتھی کو مرتے دیکھ کر دوسرے نے اندھا دھند گولیاں برسانا شروع کر دیں۔ اس کی گولیاں گڑھے کے آس پاس یا کناروں پر موجود پتھروں سے ٹکرا کر رک جاتی تھیں۔ ہر طرف ہولناک دھماکوں کی وجہ سے زمین لرز رہی تھی۔ اگر رائفل میرے ہاتھوں میں ہوتی تو دشمن کا خاتمہ جلد ہو جاتا مگر میری رائفل مجھ سے کچھ دور پڑی تھی اور دشمن مجھے اس تک پہنچنے سے پہلے ہی اپنی گولی کا نشانہ بنا دینا چاہتا تھا۔ چند لمحے زندگی اور موت کی اسی کشمکش میں گزر گئے۔ میرا دشمن مجھے مٹانے پر تلا ہوا تھا مگر میں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا کیونکہ وہ میرے ریوالور کی زد سے باہر تھا۔ اچانک ایک گولی گڑھے کے اندر آ گری تو میرا غصہ اپنی انتہا کو چھونے لگا لیکن اسی لمحے حالات نے پلٹا کھایا۔ مجھ پر فائرنگ کرنے والا میرے کسی ساتھی کی گولی کا نشانہ بن گیا۔ گولی اس کی کھوپڑی پھاڑتی ہوئی نکل گئی تھی۔ اس کے مرتے ہی مجھے اس اذیت ناک کیفیت سے آزاد ہونے کا موقع مل گیا۔ میں گڑھے سے نکل کر رینگتا ہوا اپنی رائفل کی طرف بڑھا اور اسے تھام کر دوبارہ اسی گڑھے میں آ گیا۔

"نوجوان، گڑھے سے باہر آ جاؤ۔" اچانک عقب سے شالیار خان کی بھاری آواز سنائی دی تو میں چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ جو گڑھے کے کنارے پر کھڑا فاتحانہ انداز میں مسکرا کر میری جانب دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک گھوڑے کی لگام نظر آ رہی تھی۔ "میں نے تمہارے گھوڑے کو مرتے ہوئے دیکھ لیا تھا مگر یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ تم کہاں گرے ہو ورنہ تمہیں اتنی دیر تک زندگی اور موت کی کشمکش کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ آؤ اب گھوڑے پر سوار ہو جاؤ۔ میں تمہیں کسی دشمن کی گولی سے مرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ میں وقت آنے پر بہادر دشمن کو اپنے ہاتھوں سے موت کا جام پلاتے ہوئے فخر محسوس کروں گا۔"

اس کے لہجے میں اس وقت بھی طنز کی گہری کاٹ تھی جسے میں نے نظر انداز کر دیا اور اپنی رائفل سنبھالتا ہوا گڑھے سے نکل کر گھوڑے پر سوار ہو گیا پھر گھوڑے کا رُخ اس طرف کر لیا جہاں میرے ساتھی اپنی گاڑیوں کو مورچے کی شکل دے کر اس ناگہانی حملے کا جواب دے رہے تھے۔ گھوڑا گاڑی کے قریب دو تربیت یافتہ گھوڑے مُردہ پڑے تھے اور گاڑی کے چاروں طرف خون کے بڑے بڑے دھبے پھیلے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی سارجنٹ آرٹ اپنا گھوڑا دوڑاتا ہوا میرے قریب آ کر رکا اور پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان بولا۔ "دشمن تعداد میں بہت زیادہ ہیں۔ انھیں گھیر کر ختم کرنا ہوگا۔ ورنہ وہ ہمیں آگے نہیں بڑھنے دیں گے۔"

"اپنے چند آدمی لے کر میرے ساتھ آؤ۔ ہمیں ان کے عقب سے حملہ کر کے اس جنگ کا خاتمہ کرنا ہوگا۔"

سارجنٹ فوراً چھ جوانوں کو لے کر آ گیا۔ ان کے پاس دستی بم بھی موجود تھے۔ میرے دوسرے ساتھیوں نے دشمن کو اپنی مسلسل فائرنگ میں اُلجھا رکھا تھا۔ اس لیے انھوں نے ہمارے اس قافلے کو دیکھ کر خاصے اطمینان کا مظاہرہ کیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میرے ساتھیوں پر فائرنگ تیز ہو گئی۔ کافی فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم اس ٹیلے کے عقب میں پہنچ گئے جس کی اوٹ میں دشمن مورچہ بنائے ہوئے تھا۔ میرے ایک ساتھی نے پن نکال کر دستی بم ان کی طرف پھینک دیا۔ ایک ہولناک دھماکے کے ساتھ ان کے جسموں کے چیتھڑے اڑ گئے۔ میرے ساتھی ان غاروں کی ہر طرف پھیل گئے اور یکے بعد دیگرے بموں کے کئی دھماکے کر کے انھوں نے دشمنوں کی خاصی تعداد ناکارہ بنا دی۔ ہماری غیر متوقع یلغار کے سامنے دشمن کی کوئی پیش نہ چل سکی۔ شام کا اندھیرا پھیلتے ہی دشمن اپنے بہت سے آدمیوں کی بے گور و کفن لاشیں چھوڑ کر میدان جنگ سے فرار ہونے لگا۔

نیچے درّے میں میرے دوسرے ساتھی موجود تھے جنھوں نے بدحواسی میں بھاگتے ہوئے دشمن کو تاک تاک کر نشانہ بنایا اور لٹیروں پر فتح حاصل کر لی۔ جنگ کے شعلے سرد ہوتے ہی میں نے درّے سے چند گز دور ایک چٹان کی آڑ میں پڑاؤ ڈال دیا۔ اور اس نقصان کا جائزہ لینے لگا جو جنگ کے دوران ہمیں اٹھانا پڑا تھا۔ میرا قافلہ اپنے چھ عدد تربیت یافتہ گھوڑے گنوا بیٹھا تھا اور میرے دو نوجوان کام آ گئے تھے۔ دشمن کے مقابلے میں اگرچہ یہ نقصان بہت کم تھا مگر ہمارے لیے بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ چھ گھوڑوں کو کھو کر قافلے کی حالت ایک لنگڑے سوار جیسی ہو گئی تھی جو دشمن کی گولیوں سے تو بچ نکلا ہو مگر اپنی ایک ٹانگ کھو کر ہمیشہ کے لیے اپاہج ہو گیا ہو۔ گاڑیوں میں جتے ہوئے گھوڑے ہمارے سواروں کے کام آ سکتے تھے مگر ان گاڑیوں کا مسئلہ اٹک جاتا اور میں یہ دونوں گاڑیاں کسی بھی قیمت پر چھوڑنے کے لیے آمادہ نہیں تھا کیونکہ ان گاڑیوں میں جو کچھ لدا ہوا تھا وہ میرے مستقبل کے لیے بہت اہمیت رکھتا تھا۔

رات کا کھانا کھاتے ہی میں اپنے بستر پر دراز ہو گیا اور وجود میں رچی ہوئی تھکن دور کرنے لگا۔ رات کی بڑھتی ہوئی سردی اور تاریکی میں مجھے اپنا گرم بستر اس وقت چھوڑ دینا پڑا جب شالیار خان کے برابر والے خیمے سے بھاری زنجیروں کی صدا کے ساتھ اس کی برہم آواز بھی سنائی دی۔ میں اس کی سارجنٹ کے ساتھ تکرار سنتے ہی بستر میں چھپا ہوا ریوالور نکال کر باہر آ گیا۔

میرے قدموں کی آواز سنتے ہی دونوں چونک کر خاموش ہو گئے اور ایک دوسرے کو خون آلود نظروں سے گھورنے لگے۔

"نوجوان، تمہارا نائب بدتمیزی سے پیش آ رہا ہے اگر یہ حرکت دُہرائی گئی تو میں تمہارے ساتھ کیے ہوئے معاہدے پر نظرثانی کرنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔" شالیار خان بپھرے ہوئے زخمی شیر کی طرح مجھے جواب طلب نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

میں دیکھ رہا تھا کہ اس کی دھاڑ سن کر سارجنٹ کا چہرہ غصے سے سُرخ ہو گیا اور اس کی آنکھوں میں جارحانہ تاثرات ابھر آئے۔ "سارجنٹ، یہ بات بڑی افسوس ناک ہے کہ تمہاری کسی احمقانہ حرکت نے شالیار خان کو ناراض کر دیا ہے۔ یاد رکھو! اگر اس نے ہمارے ساتھ تعاون کرنے سے انکار کر دیا تو نہ صرف ہماری مہم ناکام ہو جائے گی بلکہ ہماری جانیں بھی خطرات کی زد میں آ جائیں گی۔ ہم میں سے کوئی بھی شخص زندہ واپس جا کر جنرل ڈوگ کو کوئی رپورٹ دینے کے قابل نہیں رہے گا۔" میں نے سخت لہجے میں کہا اور شالیار خان کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"اس نے زنجیریں پہننے سے انکار کیا اور مجھے دھمکیاں دیں۔ اس لیے مجھے مجبوراً اپنے ساتھیوں سے مدد لینا پڑی۔ اگر سب مل کر اسے نہ پکڑ لیتے تو یہ مجھے جلتے الاؤ میں گرا دیتا۔" سارجنٹ آرٹ نے ناگوار لہجے میں وضاحت کی۔

"شالیار خان! تمہیں بھی ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ تم سے تعاون کرنے کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ تمہیں اس بات کا اختیار دے دیا گیا ہے کہ جب تمہارا جی چاہے، عدم تعاون کی دھمکیاں دینا شروع کر دو۔ دن بھر سفر کے دوران تمہاری زنجیریں اس لیے اتار دی جاتی ہیں کہ تمہیں سفر کرتے وقت کسی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ تم نے ہماری ان رعایتوں سے ناجائز فائدہ اٹھانے کا ارادہ کر لیا ہے۔ جو تمہارے حق میں بُری فال ثابت ہو سکتا ہے۔ جب تک تم ایک اچھے اور شریف انسان کی طرح سارجنٹ پر کیے گئے قاتلانہ حملے کی معذرت نہیں کرو گے تمہاری زنجیریں نہیں اتاری جائیں گی اور تم سے اسلحہ بھی واپس لے لیا جائے گا۔" میں کسی منصف کی طرح فیصلہ سُنا کر خاموش ہو گیا۔ اگر میں اس وقت سخت رویہ اختیار نہ کرتا تو میرے تمام ساتھی مجھ سے بدگمان ہو جاتے جب کہ دوسری طرف میں یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ میرے باپ کی کوئی توہین ہو اور اس کی سلامتی کو نقصان پہنچنے کا احتمال پیدا ہو جائے۔ حالات کی اس نہج پر پہنچ کر مجھے یہی فیصلہ بہتر نظر آیا تھا کہ دونوں سے جواب طلبی کی جائے اور جو قصوروار ہو وہ دوسرے سے اپنے رویے کی معذرت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

طلب کرے۔ تاکہ معاملہ رفع دفع ہو جائے اور ناخوشگوار صورتِ حال نہ پیدا ہونے پائے۔ شالیار خان میرا فیصلہ سُن کر دیر تک مجھے عجیب نظروں سے دیکھتا رہا۔ اس دوران میں اس کا سنگلاخ چہرہ لاتعداد سلوٹوں سے بھر گیا تھا۔ چند لمحے ایک دوسرے کو گھورتے ہوئے گزر گئے۔ میں نے دزدیدہ نظروں سے سارجنٹ کی طرف دیکھا تو اس کا چہرہ معمول پر آ چکا تھا اور وہ میرے فیصلے سے مطمئن نظر آ رہا تھا۔

"شالیار خان! تمھاری زبان سے نکلے ہوئے چند الفاظ یہ کشیدگی دُور کر سکتے ہیں! سارجنٹ آسٹ ایک اچھا آدمی ہے یہ تمھاری بزرگی کی توہین کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ اس کی خاموشی اعلا ظرفی کو ظاہر کر رہی ہے۔" میں نے سارجنٹ کے رویے کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔

"اگر یہ وعدہ کرے کہ آیندہ میرے ساتھ سخت لہجہ اختیار نہیں کرے گا تو میں اس ناخوشگوار واقعے کو بھول جاؤں گا اور اسے زنجیریں پہناتے وقت کوئی دُشواری پیش نہیں آئے گی۔ اس نے میرے ساتھ حقارت آمیز انداز اختیار کیا تھا۔ جس پر مجھے غصّہ آ گیا اور تم جانتے ہو کہ غصّے کی حالت میں انسان کو خود پر قابو نہیں رہتا۔ ورنہ اس سے پہلے میں نے زنجیریں پہننے میں کبھی مزاحمت نہیں کی تھی اگر خود میرا تم لوگوں کے ساتھ تعاون کا ارادہ نہ ہوتا تو تم لوگ کبھی مجھے اس کے لیے آمادہ نہیں کر سکتے تھے۔" شالیار خان نے کھردرے لہجے میں وضاحت کی۔

"آیندہ سارجنٹ تمھیں زنجیریں پہنانے نہیں آئے گا۔ یہ کام اب میں خود انجام دیا کروں گا۔ میں اس اہم سفر کے دوران کوئی خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں ہوں۔" میں نے نئی راہ اختیار کرتے ہوئے کہا اور اپنے خیمے میں آ گیا۔ سارجنٹ میرے پیچھے ہی پیچھے چلا آیا تھا۔

"سارجنٹ! ایسے وقت میں جب دُشمن کی یلغار ہم پر جاری ہے اپنے قافلے میں پھوٹ ڈالنا دانشمندی کی بات نہیں۔ تم جانتے کہ وہ اعلانیہ مجھے اپنا دُشمن سمجھتا ہے مگر اس کے باوجود میرے ساتھ تعاون کر رہا ہے۔ ہمیں کوئی ایسا موقع فراہم نہیں کرنا چاہیے کہ وہ عدم تعاون سے ہمارے لیے نئی نئی مشکلات کا باعث بن جائے۔ ابھی چند گھنٹے پہلے وہ جنگ کے دوران جس جوش و خروش سے دُشمنوں کا مقابلہ کرتے ہوئے مجھے گولیوں کی بوچھار سے زندہ نکال لایا تھا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ کسی غداری کا مرتکب نہیں ہونا چاہتا۔ میں پہلے بھی تمھیں ہدایت کر چکا ہوں کہ ہمیں حکمتِ عملی سے کام لینا ہو گا مگر تم نے میری ہدایات کو نظر انداز کر دیا۔ آیندہ تمھیں اس کے ساتھ بہتر اور دوستانہ رویّہ اختیار کرنا ہو گا۔ ورنہ تم جانتے ہو کہ وہ تشدد برداشت کرتے کرتے پاگل پن کی حدود میں داخل ہو گیا تھا مگر کوئی سختی اسے تعاون کرنے پر آمادہ نہیں کر سکی تھی۔ اس کی موت تاجِ برطانیہ کا عظیم نقصان ہو گا جس کی ہم سب مل کر بھی تلافی نہیں کر سکتے۔" میں نے دھیمی آواز میں اُسے سمجھایا تو وہ نادم نظر آنے لگا۔

دوسرے روز سپیدۂ سحر پھیلتے ہی میں نے اپنے ہاتھوں سے شالیار خان کو زنجیروں سے آزاد کیا اور ضروریات سے فراغت پاتے ہی ہمارا قافلہ دوبارہ چل پڑا۔ اپنے دونوں ساتھیوں کی لاشیں ہم نے پتھروں میں دفن کر دی تھیں اور جو لوگ اپنے گھوڑوں سے محروم ہو گئے تھے انھیں گاڑیوں میں بٹھا دیا گیا تھا۔ قافلہ پہاڑی سلسلے کے درمیان چلتا ہوا درّے سے کافی دور نکل آیا تھا۔ اور آج میں نے چلتے وقت اپنے ساتھیوں کی ترتیب میں خاصی تبدیلی کر دی تھی۔ وہ ایک قطار میں چلنے کے بجائے دونوں گاڑیوں کے گرد پھیل کر چل رہے تھے اور ان کی نگاہیں پہاڑیوں پر لگائے ہوئے تھے۔ چھ گھوڑوں سے بیک وقت محروم ہو جانے سے قافلے کی رفتار میں کوئی فرق نہیں آیا تھا البتہ طاقت کم ہو گئی تھی۔ شالیار خان جو گاڑیوں کی اوٹ میں میرے ساتھ ساتھ چل رہا تھا، اس کی خون میں ڈوبی ہوئی سُرخ آنکھیں راستے میں آنے والی ہر چٹان کو گہری توجہ سے گھورتی جا رہی تھیں۔ اچانک اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے یقین ہے کہ ہم آج شام تک بستی داؤد خان میں داخل ہو جائیں گے اگر وہ زندہ مل گیا تو ہمارا آیندہ سفر کافی آسانی سے کٹ جائے گا۔ میرے اس کے ساتھ کافی گہرے مراسم ہیں۔ اس کے آدمی ہمیں بگولا سنگھ اور اس کے بیٹے دلیپ سنگھ کی کمین گاہ تک لے جا سکتے ہیں۔ بگولا سنگھ نے بوڑھے ہونے کے بعد اپنی جگہ اپنے بیٹے دلیپ سنگھ کے لیے خالی کر دی ہو گی۔ جو اس سے بھی بڑا ظالم اور موقع پرست آدمی ہے بگولا سنگھ تک پہنچنے کے لیے سب سے پہلے ہمارے راستے میں وہی آئے گا کیونکہ بگولا سنگھ وادیٔ فرغان کے کسی دُور افتادہ گوشے میں پُرسکون بڑھاپا گزار رہا ہو گا' دلیپ سنگھ کی سربراہی میں یہ گروہ پہلے سے کہیں زیادہ طاقتور ہو گیا ہو گا۔"

اس وضاحت نے مجھے چونکا دیا اور مجھے اپنا منصوبہ خطرے میں نظر آنے لگا: "شالیار خان! تم نے پہلے اس بات کی وضاحت کیوں نہیں کی تھی کہ بگولا سنگھ کے بجائے ہمیں اس کے نامنجار بیٹے دلیپ سنگھ سے پنجہ آزمائی کرنی پڑے گی؟" میں نے سخت لہجے میں کہا: "اور یہ داؤد خان کون ہے؟ اور ہمارے کیا کام آ سکتا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ تمھارا ارادہ بدل گیا ہو اور تم ہمیں اپنے دوستوں سے ٹکرا دینے کا ارادہ رکھتے ہو۔"

"نوجوان! جنگ میں شرکت کرنے والا سپاہی اپنے دُشمن پر وار کرنے سے قبل یہ کبھی نہیں سوچتا کہ وہ باپ سے لڑ رہا ہے یا بیٹا اس کے سامنے ہے۔" شالیار خان نے میرے خیال کے برعکس بڑے پُرسکون انداز میں جواب دیا اور اپنی آنکھیں دوبارہ ان چٹانوں پر جما دیں جہاں دُشمن کے چھپنے کا امکان ہو سکتا تھا۔

"تم نے فلسفۂ جنگ و جدال کی وضاحت کے دوران میرا یہ سوال نظر انداز کر دیا کہ داؤد خان کی بستی یہاں سے کتنی دُور ہے اور وہ کیا حیثیت رکھتا ہے؟"

"داؤد خان کی بستی میں پہنچ کر اگر تم لوگوں نے مجھ سے قیدیوں جیسا سلوک روا رکھا تو وہ اشتعال میں آ سکتا ہے۔ اس کے برعکس اگر تم نے مجھ پر اعتبار کیا اور مجھے اس سے آزادانہ ملنے کا موقع دیا تو میں اسے مدد پر آمادہ کر سکتا ہوں۔ وہ اس بستی کا سوا ہے اور وہ میری بات کبھی نہیں ٹالے گا۔"

"ٹھیک ہے، شالیار خان! میں تمھاری بات مان لیتا ہوں۔ میں اس پر یہ ظاہر نہیں ہونے دوں گا کہ تمھاری حیثیت اس قافلے میں ایک قیدی کی ہے۔ مگر تم بھی اس بات کا وعدہ کرو کہ اپنے دوست کی طاقت کا سہارا لے کر کوئی غلط اقدام نہیں کرو گے۔"

"نوجوان، شالیار خان دھوکے باز یا موقع پرست نہیں ہے اور وہ بلا جواز عہد شکنی کرے۔ میں نے قافلے کے مفاد میں ایک تجویز تمھارے سامنے رکھی ہے۔ اگر تمھیں اس میں کوئی خطرہ محسوس ہوتا ہے تو ہم داؤد خان کی بستی میں داخل نہیں ہوں گے اور کوئی دوسرا راستہ منتخب کر لیں گے۔"

پہاڑی سلسلہ ختم ہو گیا اور اب ہم ایک ہموار خطّے سے گزر رہے تھے۔ اس ہموار زمین پر چلتے ہوئے قافلے کی رفتار میں خاصی تیزی آ گئی تھی۔ دو کوس کا یہ ہموار قطعہ ہم نے چند گھنٹوں میں طے کر لیا۔ اب ہم دوبارہ ایک چھوٹی سی وادی سے گزر رہے تھے۔ جس میں دونوں طرف قدِ آدم جھاڑیوں کی بہتات تھی۔

اچانک ہراول دستے کا گورکھا جوان پلٹ کر مجھے اپنی جانب آتا دکھائی دیا۔ وہ جب تک میرے قریب پہنچ کر اپنا گھوڑا روکتا آنِ واحد میں اس کی واپسی کی وجہ مجھ پر واضح ہو گئی۔ قدِ آدم جھاڑیوں نے اچانک ان گنت رائفل برداروں کو اُگل دیا تھا۔ اس سے قبل کہ قافلے کے لوگ کوئی مدافعت کرتے۔ وہ لوگ میرے تمام ساتھیوں کو اپنی رائفلوں کی زد میں لے چکے تھے۔ اس اچانک افتاد کی وجہ ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آ سکتی تھی اور نہ ہی پہچان سکا تھا کہ وہ کون لوگ ہو سکتے ہیں۔ قافلے کا ہر فرد رائفلوں کی زد میں آ کر کسی مجسمے کی طرح ساکت اور منجمد ہو چکا تھا۔

"اگر تم لوگوں میں سے کسی نے بھی کوئی غلط حرکت کی تو اس کا سینہ گولیوں سے چھلنی کر دیا جائے گا۔ ہتھیار پھینک کر گھوڑوں سے اتر آؤ اور میدان میں جمع ہو جاؤ۔" حملہ آوروں میں سے کسی نے کرخت آواز میں کہا تو اس کی آواز کانوں کو کچھ مانوس محسوس ہوئی۔ میں نے بے اختیار گھوم کر اپنے عقب میں دیکھا تو مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر ملک سکندر میری آنکھوں کے سامنے کھڑا تھا . . . مگر اس وقت اس کی آنکھوں میں دوستی کے جذبات نہیں تھے بلکہ اس کی آنکھیں بے پناہ نفرت کا اظہار کرتی ہوئی مجھے گھور رہی تھیں۔

"ملک سکندر تم!" میں نے حیرت کے سمندر سے اُبھرتے ہوئے کہا۔

"مجھے اچھی طرح پہچان لو شہباز خان! میں وہی ملک سکندر ہوں جو تمھارا دوست ہوا کرتا تھا۔" اس کے لہجے میں بڑی کی شدت تھی۔

"میں وہی ملک سکندر ہوں جو تمھیں ایک محبِ وطن انسان سمجھ کر تمھاری بہادری اور جوانمردی کا قدردان تھا۔ تم ایک طویل مدت تک میرے سامنے اپنی حب الوطنی کا ڈھنڈورا پیٹتے رہے مگر اب یہ راز بے نقاب ہو چکا ہے کہ تم اپنا ضمیر بیچ چکے ہو اور ہمارے دُشمنوں کے ہاتھ مضبوط کر رہے ہو . . . تم نے کہا تھا کہ فرنگیوں کا ساتھ محض اس لیے دے رہے ہو کہ انھیں بھاری نقصان پہنچانا چاہتے ہو اور ان کے اسلحے سے لدے ہوئے قافلے جس طرف سے گزریں گے تم ان راستوں کی پہلے سے نشان دہی کر دیا کرو گے مگر تم نے اپنا کوئی بھی وعدہ پورا کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ اب مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ شہباز خان کیونکہ کسی غدار کو مارتے ہوئے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

موت کے سوداگر
کے خالق

PVL
PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

خط و کتابت کے لئے
مکتبہ القریش سرکلر روڈ، اُردو بازار، لاہور

میرے ہاتھ کبھی کسی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کرتے۔"

ملک سکندر انتہائی غصے کے عالم میں میرا ہر راز بے نقاب کرنے پر تُلا نظر آ رہا تھا۔ میں سناٹے کے عالم میں اس کی طرف دیکھتا رہا۔

"اگر تم خود کو غداری پر آمادہ کر ہی چکے تھے تو پھر مجھے دھوکے میں رکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ تم نے شاید یہ سمجھا تھا کہ مجھے دھوکا دینا بہت آسان ہے اور میرے ہاتھ کبھی تم تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ مگر تم دھوکا دیتے وقت یہ بھول گئے کہ میرا نام ملک سکندر ہے اور میں فرنگیوں کے زر خریدوں اور غداروں کو کبھی معاف نہیں کرتا۔" ملک سکندر کے غصے میں مزید تیزی آ گئی۔

"ملک سکندر! میں نے تمھیں دھوکا نہیں دیا۔ میں وضاحت کرنے کے لیے تیار ہوں کہ میں نے ایسا کیوں کیا۔" میں نے نرمی سے اس کے الزامات کی تردید کرتے ہوئے جواب دیا۔ "مگر میں اپنا یہ راز سب کے سامنے ظاہر نہیں کر سکتا۔ ہم دونوں اچھے دوست رہے ہیں۔ کم از کم مجھے ایک موقع تو دو تاکہ میں علیحدگی میں تمھارے سامنے یہ وضاحت کر سکوں کہ میں کن حالات سے گزر رہا ہوں اور میرا وجود ابھی کتنے ہولناک طوفان کی زد میں ہے۔"

"نہیں!" ملک سکندر نے غصے سے بل کھاتے ہوئے جواب دیا۔ "تمھیں جو کچھ بھی کہنا ہے وہ ان سب لوگوں کے سامنے کہو گے۔ میں ایک مرتبہ فریب کھانے کے بعد دوسری بار یہ موقع نہیں دے سکتا کہ حب الوطنی کے نام پر مجھے کوئی تازہ فریب دو۔ تم جو کچھ بھی کہو گے ان سب کے سامنے کہو گے۔ میں علیحدگی میں تمھاری کوئی بات سننے کے لیے تیار نہیں ہوں!" اس کا لہجہ نفرت کے زہر میں بجھا ہوا تھا۔

"ملک سکندر! معاملہ بے حد اہم ہے۔ تم عمر کے جس حصے میں زندگی کا سفر طے کر رہے ہو وہاں یہ سستی قسم کی جذباتیت تمھیں زیب نہیں دیتی۔ جذبات کی آگ سرد کر کے چند لمحے صبر و سکون سے غور کرو گے تو ساری بات خود بخود تم پر واضح ہو جائے گی۔ تب تم میری دُور اندیشی اور دانائی کی تعریف کرنے پر مجبور ہو جاؤ گے۔"

میرے لہجے میں گہرے یقین کی جھلک پا کر ملک سکندر کے تیور کچھ ڈھیلے پڑ گئے اور وہ سوچنے پر مجبور ہو گیا... لیکن نہ جانے کیوں اگلے ہی لمحے وہ پھر بتھے سے اُکھڑ گیا۔

"شہباز خان! اب مجھ پر تمھارا کوئی حربہ کارگر نہیں ہو سکے گا کیونکہ میں تمھارے کردار کی اچھی طرح چھان پھٹک کر چکا ہوں۔" اس نے جذبات سے عاری لہجے میں جواب دیا۔ "تم نے پہلے بھی اپنی کسی مجبوری کا ذکر کرتے ہوئے مجھے مطمئن کرنے کی کوشش کی تھی اور میں نے تمھاری باتوں پر یقین کر لیا تھا مگر اب میرے پاس اس بات کا ٹھوس ثبوت موجود ہے کہ تمھیں اپنے ہم وطنوں سے کوئی ہمدردی نہیں اور تم ایک سرفروش کی بجائے ضمیر فروش ہو جو فرنگیوں کی عطا کی ہوئی دولت کے بل پر اپنا قد بڑھانے کی ناکام کوشش کر رہا ہے۔" وہ اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ "اسے گھوڑے سے باندھ دو۔ میں اسے ایک ہی مرحلے میں ہلاک نہیں کروں گا۔ مجھے اس سے اپنے بے گناہ ہم وطنوں کے خون کا انتقام لینا ہے۔ میں اسے اذیتیں دے دے کر ہلاک کرنا چاہتا ہوں۔ اگر یہ ایک دم مر گیا تو میرے انتقام کی آگ سرد نہیں ہو سکے گی!"

اس کے کچھ ساتھی آہستہ آہستہ میری جانب بڑھنے لگے تو میں ایک ہاتھ فضا میں بلند کرتے ہوئے حلق کے بل چیخ پڑا۔ "ملک سکندر! تمھارا فیصلہ ناعاقبت اندیشانہ ہے۔ تم جلد بازی سے کام لے رہے ہو جس کے لیے تمھیں بعد میں پشیمان ہونا پڑے گا اور تب بہت دیر ہو چکی ہو گی؟ اب بھی وقت ہے، مجھے موقع دو تاکہ تمھیں بتا سکوں کہ میں اپنے ضمیر کی عدالت میں مجرم نہیں ہوں۔ آخر چند لمحے علیحدگی میں بات سُن لینے میں تمھیں اعتراض کیوں ہے؟ میری وضاحت سننے کے بعد بھی رائفل تمھارے ہاتھوں میں موجود رہے گی اور تم اپنے فیصلے پر عمل درآمد کرنے کے لیے اخلاقی طور پر آزاد ہو گے؟"

میری آواز میں ہلکی سی تلخی بھی تھی اور اپنے منصوبے کی ناکامی کے افسوس کا رنگ بھی تھا جسے سکندر نے اپنی لاعلمی کے باعث تباہی کے کنارے تک پہنچا دیا تھا۔ اس کے کچھ ساتھی مجھے گھیرے میں لے چکے تھے اور میری باتیں سُن کر سوالیہ نظروں سے ملک سکندر کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"اگر تم اسی بات پر بضد ہو کہ ایک بار پھر مجھے ورغلانے میں کامیاب ہو سکتے ہو تو میں تمھیں ایک موقع دینے کے لیے تیار ہوں۔"

اس کا فیصلہ سُن کر میرے تنے ہوئے عضلات ڈھیلے پڑ گئے اور بے اختیار میرے ہونٹوں سے ایک طویل سانس نکل گئی۔ "آذر خان!" ملک سکندر نے اپنے ایک ساتھی کو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مخاطب کیا: شہباز خان کا گھیراؤ ختم کرکے اپنے ساتھیوں کے ساتھ بیس قدم دُور ہٹ جاؤ جہاں ہماری باتوں کی آواز تم تک نہ پہنچ سکے لیکن اس دوران میں باقی لوگوں کی نقل و حرکت پر گہری نگاہ رکھو۔"

اب صورت حال یوں تھی کہ میرے عقب میں بیس قدم دُور میرے ساتھی تھے اور میرے سامنے بیس قدم دُور ملک سکندر کے ساتھی پھیلے ہوئے میرے ساتھیوں کو اپنی رائفلوں کی زد میں لیے کھڑے تھے۔ ملک سکندر گھوڑا بڑھا کر میرے اس قدر قریب آ گیا کہ دونوں گھوڑے آمنے سامنے حریفوں کی طرح قدم جما کر کھڑے ہو گئے، تب ملک سکندر نے سرد آواز میں کہا: شہباز خان! اب تمھیں اپنی داستان سُنانے میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ میرے ساتھی بُری طرح بے تاب ہو رہے ہیں۔ یہ بات اب ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ تم غدار ہو اور کسی غدار کو سزا دینا ہر محب وطن کا پہلا فرض ہوتا ہے اور میں جلد از جلد اس فرض سے سبکدوش ہو جانا چاہتا ہوں۔ یاد رکھنا، اگر تمھاری داستان مجھے متاثر نہ کر سکی تو تمھارا انجام بہت ہولناک ہو گا۔ ملک سکندر دوستوں کی صف میں چھپ کر بیٹھنے والے بھیڑیوں کو معاف کرنے کا عادی نہیں ہے۔"

"ملک سکندر خان! میری وضاحت سننے سے پہلے تمھارا کوئی فیصلہ درست نہیں ہو سکتا۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا: "تمھیں یاد ہو گا کہ میں نے تمھیں ایک ملاقات کے دوران بڑی وضاحت سے بتایا تھا کہ میرا بوڑھا باپ کئی برسوں سے فرنگیوں کی قید میں ہے اور فرنگیوں نے قید کے دوران میں اس پر اتنا تشدد کیا ہے کہ وہ حواس کھو کر ایک خطرناک ذہنی مریض بن چکا ہے اور ڈاکٹر اس کے حواس واپس لانے کے لیے دن رات بڑی تندہی سے علاج کر رہے ہیں۔ میرا باپ قیدی ہونے کے باوجود فرنگیوں کے لیے ایک قیمتی آدمی کی حیثیت رکھتا ہے اور اب وہ ذہنی طور پر صحت یاب ہو چکا ہے۔ صحت یاب ہونے کے بعد اس نے بتایا کہ اس نے جو خزانہ لوٹا تھا اور جسے حاصل کرنے کے لیے تاجِ برطانیہ کے وفادار برسوں جدوجہد کر رہے تھے، وہ اس سے وادیِ خوف میں ڈاکو گولا سنگھ نے چھین لیا تھا تب میں نے اپنے ذہن میں ایک منصوبہ ترتیب دیا اور پھر فرنگی جنرل کو یہ یقین دلانے میں کامیاب ہو گیا کہ میں اس بوڑھے باغی کا زبردست دشمن ہوں اور وہ خزانہ گولا سنگھ سے چھین کر لے آؤں گا۔ جنرل ڈوگ نے مجھ پر بھروسہ کرتے ہوئے بوڑھے شالیار خان کو میری تحویل میں دے دیا اور میں اسے لے کر وادیِ قرفان کی طرف چل دیا تاکہ گولا سنگھ سے اپنے باپ کا چھینا ہوا مال واپس لے سکوں۔ یہ خزانہ مستقبل کے منصوبوں کے لیے بہت کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔ چنانچہ میرا منصوبہ یہ تھا کہ گولا سنگھ سے نمٹ کر فرنگیوں کے ان وفاداروں کو موت کے گھاٹ اتار دوں گا اور اپنے باپ کے ساتھ اس خزانے سمیت تمھارے پاس آ جاؤں گا تاکہ تم اس خزانے کو جدوجہدِ آزادی کے لیے استعمال میں لا سکو مگر تمھاری قبل از وقت مداخلت نے میرے سارے منصوبے کو غارت کر دیا۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے یہ راز پوشیدہ رکھنے کی کوشش کی تھی کہ میرے اور شالیار خان کے درمیان کوئی رشتہ بھی ہے بلکہ میں نے تو اس منصوبے کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لیے سب کے سامنے اپنے باپ سے مسلسل دُشمنی کا اظہار بھی کیا ہے۔ خود میرے بابا کو بھی اس بات کا علم نہیں کہ میں ہی اس کا بیٹا ہوں اور یہ سب کچھ اسے فرنگیوں کی طویل قید سے نجات دلانے کے لیے کر رہا ہوں۔ میں نے سارے حالات تفصیل سے تمھارے سامنے بیان کر دیے ہیں۔ اگر ان باتوں کے بعد بھی تمھارے دل میں یہ شبہ باقی رہ جاتا ہے کہ میں غداری کر رہا ہوں تو تم مجھے شوق سے گولی کا نشانہ بنا سکتے ہو۔ مجھے اپنی موت کا کوئی افسوس نہیں ہو گا کیونکہ میں اپنا فرض ادا کر چکا ہوں اور اپنے کسی فعل پر نادم نہیں ہوں۔ میں نے جو کچھ کیا ہے انتہائی مجبوری کے عالم میں کیا ہے۔ شالیار خان میرا باپ ہی نہیں، ایک عظیم محب وطن بھی ہے۔ جس نے آج سے بیس برس پہلے فرنگیوں کے خلاف اپنے جہاد کا علم بلند کیا تھا۔ اس کی جان بچانا میرا فرض تھا۔ اب میں تمھارا فیصلہ سُننے کے لیے تیار ہوں۔"

میری باتیں سُن کر ملک سکندر نے رائفل کی نال زمین کی جانب جھکا دی اور رنجیدہ نظر آنے لگا: "اس کا مطلب یہ ہُوا کہ میری اچانک مداخلت تمھارے منصوبے پر اثر انداز ہوئی ہے۔ تمھارے ساتھی میری باتیں سُن کر تم سے بدگمان ہو چکے ہوں گے اور یہ بدگمانی تم دونوں باپ بیٹے کے لیے خطرناک بھی ثابت ہو سکتی ہے۔" اس کا دوستانہ انداز واپس آ گیا... اور اس کے لہجے میں گہری سوچ کا تاثر محسوس ہونے لگا۔

"... اگر میں تمھاری اس وضاحت کو قبول کر لوں کہ جو بھی تم کہہ رہے ہو وہ سب کچھ سچ ہے، تو پھر اس کی تصدیق یوں ہو سکتی

ہے کہ میرے ساتھی تم سے کچھ فاصلے پر رہ کر تمھارے قافلے کی مکمل نگرانی کریں گے۔ اس طرح تمھیں اپنے ساتھیوں سے نمٹنے کا موقع بھی مل جائے گا۔ اگر وہ تمھاری جانب سے مشکوک ہو کر تمھارے خلاف کوئی قدم اُٹھائیں گے تو میرے ساتھی آسانی سے باخبر ہو جائیں گے۔"

میں نے اس سے اتفاق کیا کہ اس کے کچھ ساتھی ہمارا تعاقب جاری رکھیں لیکن نہ جانے کیوں دل سے یہ بات مجھے پسند نہ آئی۔

"شہباز خان! تم نے بڑی نادانی اور بے پروائی سے کام لیا ہے۔ اگر تم یہ سب کچھ پہلے ہی بتا دیتے تو مجھے اتنا بڑا قدم اٹھانے کی ضرورت نہ پڑتی۔ اب تم واپس جاؤ اور جا کر فرنگیوں کے پالتو کتوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کرو کہ یہ سارا معاملہ ایک غلط فہمی کا نتیجہ تھا۔ میرے ساتھی تمھارے قافلے پر گہری نگاہ رکھیں گے اور آڑے وقت میں تمھارے کام آئیں گے لیکن خیال رہے، یہ بھی کوئی سبز باغ نہ ہو۔"

"ملک سکندر! مجھے خوشی ہے کہ تم نے فی الحال میری وضاحت قبول کر لی ہے۔ تم نے سالہا سال کی دوستی کا بھرم رکھ کر مجھے زندہ رہنے کا ایک نیا حوصلہ دیا ہے۔ مگر مجھے دُکھ ہے کہ تم ابھی تک میری وضاحت کو شبہے کی نظر سے دیکھتے ہو۔ اگر تمھاری نگاہ میں میری شخصیت مشکوک نہ ہوتی تو اس نگران فوج کی کیا ضرورت رہ جاتی تھی۔ شاید تمھارے آس پاس میرے خلاف کان بھرنے والے لوگوں کا اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔" میرے لہجے میں گہرا تاسف تھا۔

"تمھارا یہ تجزیہ سو فی صد درست ہے کہ تمھارے قوم دشمن رویّے کی اطلاعات مجھے بہت سے لوگ فراہم کر رہے ہیں۔ تم جس تیزی سے اپنے ہم وطنوں کا خون بہا رہے ہو اُسی قدر محب وطن حلقوں میں تمھارے خلاف اشتعال بڑھتا جا رہا ہے۔ محض ایک نوجوان سے دوستی کے بدلے میں سینکڑوں ہم وطنوں کا خون بہتے نہیں دیکھ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ابھی تک میرا دل تمھاری طرف سے پوری طرح صاف نہیں ہُوا۔ اگر گولا سنگھ اور دلیپ سنگھ سے نمٹنے کی مہم کے دوران میرے آدمیوں میں سے کسی نے تمھاری سرگرمیوں کو مشکوک پایا تو تمھارا انجام بہت عبرت ناک ہو گا۔ حالات کا تقاضا تو یہی تھا کہ تمھیں طاقت کے بل پر اپنے ہم وطنوں کا خون بہانے سے روک دیا جاتا۔ مگر نہ جانے کیوں میرا دل چاہتا ہے کہ تمھیں اپنی خوبصورت شخصیت کے گرد چھائے ہوئے غبار کو دُور کرنے کا ایک موقع ضرور دینا چاہیے۔"

ملک سکندر کی صاف گوئی مجھے پسند آئی لیکن ایک دوست کا دل اپنی طرف سے میلا پا کر مجھے دُکھ ہو رہا تھا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ وہ جن لوگوں کو ہمارے تعاقب میں بظاہر میری مدد کے لیے بھیج رہا ہے، وہ درحقیقت میری کڑی نگرانی پر مامور کیے جائیں گے۔ مجھے یاد تھا کہ اس نے گزشتہ ملاقات کے دوران بھی میری ان سرگرمیوں پر اعتراض کیا تھا اور مجھ سے اپنی برہمی چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی اور صاف طور پر کہا تھا کہ اگر میں نے فرنگیوں کے ساتھ چاپلوسی کا رویّہ ترک نہ کیا تو وہ مجھے دوستوں کی بجائے دشمنوں کی صف میں کھڑا پائے گا۔ مگر میں نے اپنی مجبوریوں کا احوال سُنا کر اسے قائل کر لیا تھا اور یہ وعدہ بھی کیا تھا کہ میں جب بھی کسی مہم پر روانہ ہوں گا تو اُسے باخبر رکھوں گا۔ مگر بعد میں حالات میں تبدیلی کے تحت میں نے ارادہ بدل دیا کہ وہ اس قافلے کو لوٹے جس کی سربراہی میں خود کر رہا ہوں اگر میں اسے لداخ کی مہم سے باخبر کر دیتا اور وہ ایک لٹیرے کی حیثیت سے آ کر سارا مال و اسباب لُوٹ کر چل دیتا تو میری حیثیت جنرل ڈوگ کی نظروں میں مشکوک ہو جاتی اور ان کے ذہن پر چھایا ہُوا میرا یہ طلسم ٹوٹ جاتا کہ میں ناقابلِ تسخیر ہوں اور مجھے شکست دینا بہت مشکل ہے۔ مگر جب ایک مجبوری کے بطن سے دوسری مجبوری نے جنم لیا تو میری حیثیت ملک سکندر کی نظروں میں مشکوک ہو گئی اور وہ ذاتی تعلق کو نظر انداز کرتا ہوا مجھ پر چڑھ دوڑا۔ اور بیچ منجدھار آ کر میرے منصوبے کی کشتی میں شگاف کر کے میرے لیے ناقابلِ تلافی نقصان کا باعث بن گیا۔ یہ بات نہیں تھی کہ میں اس کے ساتھیوں کے گھیراؤ سے خوف زدہ ہو گیا تھا بلکہ میں اسے اپنی حفاظت کے لیے محض یوں ہلاک نہیں کرنا چاہتا تھا کہ اس کے دل میں میرے لیے شکوک پیدا ہو گئے تھے۔

میں تکلیف دہ خیالات میں جکڑا ہُوا انتہائی کرب کی حالت سے گزر رہا تھا کہ اچانک ملک سکندر کی آواز نے میرے خیالات کی رَو قطع کر دی۔

"تمھاری سوچ میں ڈوبی ہوئی آنکھیں یہ ظاہر کر رہی ہیں کہ تم نے میری اس تجویز کو کھلے دل سے قبول نہیں کیا۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تمھارے چہرے پر انتہائی ناگواری کی تہہ جم گئی ہے اور تمھارے دل و دماغ سے نفرت انگیز دھواں اُٹھنے لگا ہے۔ جو اس بات کی دلیل ہے کہ تم مجھ سے چھٹکارا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حاصل کرنے کا سوچ رہے ہو؟" اس کی آنکھوں سے ایک بار پھر بے اعتباری جھلکنے لگی۔

میں اس کا نیا الزام سُن کر چونک پڑا اور حیرت و افسوس کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"سکندر خان! اگر تم ایسا سوچ رہے ہو کہ میں تم سے یا تمہارے ساتھیوں کے ساتھ منافقانہ سلوک کرنے کا ارادہ رکھتا ہُوں تو تم غلطی پر ہو۔ میری خاموشی دراصل میرے اس منصوبے کا ماتم ہے جو تمہاری آمد سے بکھر کر فضا میں منتشر ہو گیا ہے اعتماد اور یقین کی جگہ بدگمانی اور ناکامی کا تلخ احساس ابھر آیا ہے۔ میں تمہاری نظروں میں ذلیل و رسوا ہو کر آج اچانک زندگی کے اس دوراہے پر آ گیا ہُوں جہاں میرے لیے دونوں طرف نفرت و عداوت کی آگ روشن ہے اور میں اس کی تپش سے جھلسا جا رہا ہوں۔ مرنا اور مار دینا میری زندگی کے شب و روز کا ایک ناقابلِ تردید حصہ بن چکا ہے۔ موت کی اس برستی ہُوئی آگ میں دوستوں کی بدگمانی انسان کے لیے انتہائی تکلیف کا باعث بن جاتی ہے۔ میں نے ہوش سنبھالنے کے بعد آج تک خود کو کبھی ناکام اور شکست خوردہ تصور نہیں کیا۔ مگر آج تمہاری مداخلت نے میری زندگی کی جیتی ہُوئی بازی اُلٹ کر رکھ دی ہے اور میں روشنی کا نمائندہ ہونے کے باوجود اندھیرے کا شیطان نظر آ رہا ہُوں۔"

"شہباز خان! جذباتی حصار سے نکل کر دیکھو کہ دُنیا کا رنگ بدل رہی ہے۔" ملک سکندر نے فلسفیانہ انداز میں جواب دیا۔ "میں اپنے کیے پر تمہارے سامنے نادم نہیں ہوں کیونکہ میری اپنی بھی کچھ مجبوریاں ہیں۔ جو کچھ ہو چکا ہے اسے بھول جاؤ اور جو کچھ پیش آنے والا ہے اس پر گہری نظر رکھو تاکہ تمہیں مستقبل کے آئینے میں اپنا چہرہ صاف اور شفاف نظر آئے۔ تم اپنی حب الوطنی کا کوئی ٹھوس ثبوت مہیا کرو تو میں اپنے شکوک پر کھلے عام تم سے معذرت طلب کروں گا اور تم پر پہلے سے بھی زیادہ اعتماد کرنا شروع کر دوں گا۔ تمہارا وجود آزادی کی تحریک کے لیے زبردست چیلنج بن چکا ہے ہم لوگ سر دھڑ کی بازی لگا کر فرنگیوں کو اپنے ملک کی حدوں سے نکال کر دوبارہ سمندر پار بھیج دینا چاہتے ہیں مگر تم ان کی جڑیں مضبوط کرنے میں لگے ہُوئے ہو۔ تمہاری اپنی کچھ مصلحتیں ہیں۔ تمہارے اپنے کچھ مسائل ہیں جو تمہیں رویّہ بدلنے پر مجبور کرتے ہیں مگر تمہاری اس مجبوری کا قصاص قوم کے لوگوں کا خون بہا کر ادا نہیں کیا جا سکتا۔ تمہیں اپنا طرزِ عمل بدلنا ہوگا کیونکہ یہ وقت کی انتہائی اہم ضرورت ہے۔ وقت کے ساتھ نہ چلنے والے لوگ پیچھے رہ جاتے ہیں اور اپنی ناکامی کی آگ میں سلگتے ہُوئے اس دُنیا سے سدھار جاتے ہیں۔ وقت کے دھارے کا ساتھ دو گے تو کوئی آنکھ تمہیں ذلت کی نظر سے نہیں دیکھ سکے گی اور کوئی ہاتھ تمہاری سلامتی کو مٹانے کے لیے نہیں اُٹھے گا۔ تم ایک بہادر اور زیرک انسان ہو اور مجھے آج بھی یقین ہے کہ تم امتحان کے ان کٹھن لمحوں کو خوش اسلوبی سے نبھا دو گے۔ اب تم ساتھیوں میں واپس جاؤ اور انھیں یہ یقین دلانے کی کوشش کرو کہ یہ سب کچھ محض ایک غلط فہمی کا نتیجہ تھا۔ اگلی ملاقات تک میری ان باتوں کو ذہن نشین رکھنا؟ خدا حافظ!"

ملک سکندر نے اچانک اپنے گھوڑے کا رُخ بدلا اور اُسے دوڑاتا ہُوا اپنے ساتھیوں سے جا ملا۔ وہ چند لمحوں تک اپنے قریبی ساتھیوں کو اس ملاقات کی اہمیت سے آگاہ کرتا رہا۔ پھر اپنے ان گنت ساتھیوں کو لے کر واپسی کے راستے پر چل دیا۔ جب تک اس کا قافلہ مجھے نظر آتا رہا، میں اسی جگہ کھڑا رہا جہاں ملک سکندر سے میری ملاقات ہُوئی تھی۔ جب اس کے قافلے کا آخری سوار بھی میری نظروں سے اوجھل ہو کر پہاڑوں میں پوشیدہ ہو گیا تو میں نے گھوڑے کا رُخ بدلا اور اپنے ساتھیوں سے آملا۔

سارجنٹ آرٹ اور شالیار خان کے گھوڑے سب سے آگے تھے اور ان سے پیچھے میرے باقی ساتھی اسلحہ گاڑیوں کو گھیرے میں لیے کھڑے تھے۔ قافلے کا ہر جوان خاموشی اور تجسس کے استادہ مجسمے کی مانند میرے چہرے پر اس ناگوار ملاقات کا سبب تلاش کر رہا تھا۔

"شہباز خان! یہ لوگ کون تھے اور تم سے کیا مطالبہ کرنے آئے تھے؟" سارجنٹ نے مجھے شُبہے کی نگاہ سے دیکھتے ہُوئے سوال کیا۔

اس کا جارحانہ انداز میرے لیے غیر متوقع نہیں تھا کیونکہ مجھے یقین تھا کہ مجھے بہت سے ایسے ناگوار سوالات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ جن کا جواب دیتے ہُوئے مجھے اپنی تمام تر ذہانت کو بروئے کار لانا پڑے گا۔

"سارجنٹ! میں تمھیں جواب دہ نہیں ہُوں؟" میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ "اس کے باوجود میں اپنے ساتھیوں کے تجسس کی تسکین ضرور کروں گا۔ ان کا سردار خود کو آزادی کی

تحریک کا ایک ادنیٰ سپاہی ظاہر کرتا ہے۔ ایک مرتبہ جب میں ان کے قبیلے کی طرف جا رہا تھا تو ان لوگوں نے مجھے اچانک گھیرے میں لے کر تاجِ برطانیہ کے خلاف ورغلانے کی کوشش کی تھی۔ میں نے جان بچانے کے لیے ان سے وعدہ کر لیا تھا کہ وقت آنے پر ان کا ساتھ دوں گا اور انھیں اپنی سرگرمیوں سے باخبر رکھوں گا لیکن بعد میں میں نے اپنی کہی ہُوئی باتوں کو نظر انداز کر دیا اور تاجِ برطانیہ سے وابستگی کے باعث جب میں نے تاجِ برطانیہ کو پیش آنے والی رکاوٹوں کو ایک ایک کر کے دور کرنا شروع کر دیا تو یہ لوگ میرے خون کے پیاسے ہو گئے۔ ان کا خیال تھا کہ میں ان کی کثرت سے ڈر جاؤں گا مگر میں نے ثابت کر دیا کہ ان کی طاقت مجھے خوفزدہ نہیں کر سکتی۔ میں نے اس موقع کو سمجھا کہ اگر میں نے ہمارا راستہ روکنے کی کوشش کی تو اسے ایک خوفناک انجام سے دوچار ہونا پڑے گا۔ خیریت اسی میں ہے کہ وہ کوئی نتیجہ تیار کیے بغیر واپس چلا جائے۔ اس نے کچھ دیر میری باتوں پر غور کیا اور مجھے دھمکیاں دیتا ہُوا واپس چلا گیا۔ اگر وہ کچھ دیر اور ٹھہر جاتا تو میں یقیناً اس کی کھوپڑی میں سوراخ کر دیتا کیونکہ اس کی باتیں میرے لیے اشتعال کا باعث بن رہی تھیں۔" مجھے یقین تھا کہ سارجنٹ اور دوسرے ساتھی میری مختصر سی وضاحت سے پوری طرح مطمئن نہیں ہو سکتے تاہم کوشش کر کے دیکھ لینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ وقت کے پہیے کی گردش میرے خلاف تھی۔ مگر میں خود کو حالات کے سامنے بے دست و پا ظاہر نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے میں نے ایک ایسی داستان کا سہارا لیا جسے کوئی بھی حتمی طور پر مسترد نہیں کر سکتا تھا مگر میں دیکھ رہا تھا کہ سارجنٹ آرٹ میری باتوں کے دوران بڑی بے چینی سے گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھا رکابوں میں پاؤں ٹھونس رہا ہے۔

"اگر یہ لوگ تاجِ برطانیہ کے وفادار نہیں تھے تو تم نے انھیں زندہ کیوں جانے دیا؟" اس نے تیکھے لہجے میں سوال کیا۔ "کیا اسے تمہاری مجرمانہ غفلت نہیں کہا جائے گا؟"

"میرے پاس کرنے کے لیے اس سے بھی زیادہ اہم باتیں تھیں اگر مٹھی بھر باغیوں کی طرف توجہ دیتا تو میں تاجِ برطانیہ کے لیے بیکار ہو جاتا اور کسی بھی مہم کو پورا کرنے کے قابل نہ رہتا۔"

میرے اس ذومعانی جواب پر سارجنٹ کے تاثرات تیزی سے بدل گئے۔ "کچھ بھی سہی! تم بہرحال ایک ایسی شخصیت ہو جس کی گہرائی کا اندازہ پہلے سے نہیں لگایا جا سکتا۔"

میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

"کیا دن بھر اسی طرح سوال جواب کرتے رہو گے یا آگے بڑھنے کا بھی ارادہ ہے؟" میں نے نرمی سے کہا اور شالیار خان کی طرف دیکھنے لگا جس کے چہرے سے نفرت و حقارت کے جذبات ہویدا تھے۔ "شالیار خان! داؤد خان کی بستی یہاں سے کتنی دور ہے؟" میں نے دوبارہ سفر کا آغاز کرتے ہُوئے سوال کیا۔

"اگر ہم اپنا وقت یہاں ٹھہرے ہوئے ضائع نہ کریں تو شام ہوتے ہوتے بستی میں پہنچ جائیں گے۔" اس نے سرد لہجے میں جواب دیا۔

"میں نے بستی میں قیام کا خیال ترک کر دیا ہے۔ ان حالات میں وہاں قیام کرنا کسی طرح بھی سود مند نہیں ہو سکتا۔" میں نے مڑ کر گھوڑا اس کے برابر کر لیا۔ سارجنٹ کے کان ہماری باتوں سے لگے ہُوئے تھے۔

"دریا پار کرنے کے لیے اس بستی کے بڑے بازار سے گزرنا پڑتا ہے۔" اس نے ایک پہاڑی ٹیلے پر نظر جماتے ہُوئے جواب دیا۔ "اگر ہم بستی چھوڑ کر کوئی اور راستہ اختیار کریں گے تو دریا تک پہنچنے کے لیے ہمیں پہاڑوں کا چکر کاٹ کر دریا پار کرنا پڑے گا۔ میں پہلے بھی کہہ چکا ہُوں کہ اس بستی کا سردار میرا ایک قابل اعتماد دوست ہے اگر وہ ابھی تک زندہ ہے تو ہم سے ضرور تعاون کرے گا۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ بستی گھوڑوں کی تجارت کے لیے دُور دُور تک مشہور ہے۔ جنگ کے دوران ہمارے جو گھوڑے ضائع ہو گئے ہیں ان کی کمی یہاں آسانی سے پوری ہو سکتی ہے۔"

"مگر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ان تین برسوں کے دوران تمہارا دوست کسی افتاد کا شکار ہو چکا ہو اور وہ اب اس بستی کا سردار نہ رہا ہو۔" میں نے ایک اہم نکتہ بات کی طرف اشارہ کیا۔

"اگر داؤد خان اس بستی کا سردار نہ ہُوا تو بھی موجودہ سردار ہمارے قافلے کا خوشگوار انداز میں استقبال کرے گا۔" شالیار خان نے لہجے سے گہرا یقین جھلک رہا تھا۔ "اگر اس نے ہمارے ساتھ اچھا برتاؤ نہ کیا تو اس سے وہاں کی ساکھ اور تجارت متاثر ہو گی۔ اس لیے ہم سے تعلقات بگاڑ کر وہ اپنے لیے مالی نقصان کا موقع نہیں پیدا کرے گا۔ ہم گھوڑوں کے تاجر کی حیثیت سے وہاں داخل ہوں گے تو ہمیں کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوگا۔"

"سارجنٹ! تمہارا کیا خیال ہے۔ شالیار خان کی تجویز

مان لی جائے یا پھر ہمیں کوئی دوسرا راستہ اختیار کرنا چاہیے؟" میں نے اُسے اعتماد میں لینے کے لیے سوال کر دیا۔

"میرا خیال ہے شالیار خان کی بات مان لینے میں کوئی حرج نہیں۔ ہمارے پاس فاضل رقم موجود ہے۔ گھوڑے خریدے جا سکتے ہیں۔" اس نے بلند آواز میں جواب دیا اور اپنا گھوڑا ہماے برابر لے آیا۔

ایک ٹیلے کو عبور کرتے ہی پہاڑیوں کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ ٹیلے سے چند گز دُور ایک سرسبز پہاڑ کی بلندی کی جانب راستہ گھومتا ہُوا جا رہا تھا۔ اسلحے سے لدی ہُوئی گاڑیاں اس اُونچے نیچے کھُردرے راستے پر زبردست ہچکولے کھاتی ہُوئی آگے بڑھنے لگیں۔ تقریباً دس ہاتھ بلندی کی جانب سفر طے کیا ہو گا کہ گھوڑے ہانپنے لگے۔ راستے کی بلندی اور کھُردراپن اس بات کا مظہر تھا کہ ہم اپنے سفر کا انتہائی خطرناک حصّہ طے کر رہے ہیں۔ خُدا خُدا کر کے ایک ٹیلہ عبور کیا تھا کہ دوسرا سامنے آ گیا۔ یہ ٹیلہ پہلے ٹیلے کی بہ نسبت زیادہ خطرناک نظر آ رہا تھا۔ اس کے ایک طرف بلند پہاڑ تھا تو دوسری جانب گہری کھائی تھی۔ یہاں پر ایک چٹان تراش کر تقریباً تین ہاتھ چوڑا راستہ آمدورفت کے لیے بنایا گیا تھا۔ جس پر گھڑسوار آسانی سے گزر سکتے تھے مگر اس راستے سے لدی ہُوئی گاڑیاں گزارنا ایک مشکل اور خطرناک مرحلہ تھا۔

گھوڑوں کے پیروں تلے کھُردری زمین ہونے کے باعث ان کے پھسل جانے کا خطرہ تھا۔ اس خطرناک ٹیلے کو اتنی آہستگی اور احتیاط سے طے کرنا پڑا کہ اس کٹھن مرحلے کے دوران سورج کا گولہ تیزی سے پھیکا پڑنے لگا۔ اس خطرناک کھائی کے ساتھ ساتھ چلتے ہُوئے دل کو ہر لمحے یہی دھڑکا لگا رہا کہ گھوڑے ٹھوکر کھا کر اب گرے کہ تب گرے۔ سورج کی روشنی کے ماند پڑتے ہی خطرے کی حدود پار کر کے قافلہ پہلے کے مقابلے میں نسبتاً کھُلے راستے پر پہنچ گیا۔ وہاں سے سفر کی رفتار دوبارہ تیز ہو گئی اور ہمارے گھوڑے اس پتھریلی زمین کو روندتے ہُوئے تیزی سے بستی داؤد خان کی طرف بڑھنے لگے جوں جوں تاریکی پھیلتی جا رہی تھی میری فکر و تشویش میں اسی تناسب سے مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔

"شالیار خان! میرا خیال ہے، ہم بستی میں قیام کا خیال ترک کر دیں۔" میں نے ہر لمحے بڑھتی ہُوئی تاریکی میں گھورتے ہُوئے کہا۔ "اندھیرا بڑھ جانے کی وجہ سے گاڑیوں کو کوئی حادثہ بھی پیش آ سکتا ہے۔ میں سمجھتا ہُوں کہ بستی داؤد خان میں، دن کے وقت داخل ہونا زیادہ اچھا ہے۔"

"بستی کے اس قدر قریب پہنچ کر قیام سے گریز مقامی لوگوں کو چونکانے کا سبب بھی بن سکتا ہے! مجھے یقین ہے کہ اس ٹیلے کو عبور کرتے ہی بستی کے آثار دکھائی دینا شروع ہو جائیں گے۔" اس نے ایک قریبی ٹیلے کی جانب اشارہ کرتے ہُوئے جواب دیا۔

چند ساعتوں میں ہم نے وہ ٹیلہ عبور کر لیا جس کی طرف شالیار خان نے اشارہ کیا تھا۔ ٹیلہ عبور کرتے ہی دور سے جھلملاتی ہُوئی چند روشنیاں نظر آنے لگیں لیکن اسی لمحے ایک ڈھلان میں اُترتے ہُوئے جوگندر سنگھ گھوڑوں پر گرفت مضبوط نہ رکھ سکا اور دو گھوڑے دائیں جانب جھکتے چلے گئے اور پھر راہ میں آنے والے ایک پتھر سے ٹھوکر کھا کر لڑکھڑا گئے۔ گاڑی توازن کھو کر اُلٹتے اُلٹتے اچانک ایک دھچکے سے رُک گئی۔ جوگندر سنگھ گاڑی سے اُچھل کر خودرو جھاڑیوں میں جا گرا اور دونوں گھوڑے چٹان سے ٹکرا کر ڈھیر ہو گئے۔ ان کے ساتھ جُتے ہُوئے دوسرے گھوڑے خوف زدہ ہو کر حلق سے عجیب عجیب آوازیں نکالنے لگے۔ گاڑی رُکتے ہی اس میں سوار جوان جلدی جلدی نیچے کُودنے لگے۔ میں گھوڑے سے اُتر کر اُن جھاڑیوں کی طرف بڑھا جہاں جوگندر سنگھ گرا تھا۔

وہ کانٹے دار جھاڑیوں سے لباس بچاتا ہُوا اُٹھا اور دو چار قدم لنگڑا کر چلنے کے بعد جب اس کی نگاہ اُلٹی ہُوئی گاڑی اور ... گاڑی کے مُردہ گھوڑوں پر پڑی تو وہ دہشت کی زیادتی سے چیخ اُٹھا۔ "گُرو دی سوہنہ! مجھے اچانک کسی نادیدہ ہاتھ نے اچھال کر ان جھاڑیوں میں پھینک دیا تھا ورنہ میری کہانی ختم ہو گئی تھی۔"

اتنی دیر میں دوسرے جوان گاڑی میں جُتے ہُوئے گھوڑے کھول چکے تھے۔ گاڑی کا سرسری جائزہ لینے سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کا ایک بانس جو پہلے ہی ٹوٹا ہُوا تھا، اس حادثے میں مختلف جگہوں سے ٹکڑے ہو چکا ہے۔ اب اس میں نیا بانس ڈالے بغیر گاڑی کا آگے سفر کرنا دُشوار تھا۔

"جوگندر سنگھ اوسان خطا نہ ہونے دو۔ ٹوٹی ہُوئی گاڑی بستی تک پہنچ کر دوبارہ چلنے کے قابل ہو جائے گی اور اب ہمیں اپنا سفر جاری رکھنے کے لیے نئے گھوڑے خریدنے ہی پڑیں گے۔" میں نے اُسے دلاسہ دیتے ہُوئے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"نوجوان! مجھے افسوس ہے کہ تم مزید دو بہترین گھوڑے گنوا بیٹھے۔" شالیار خان اچانک ہمارے درمیان آ کر رُک گیا۔ کسی درخت سے ایک مضبوط شاخ کاٹ لاؤ تا کہ اسے ٹوٹے ہُوئے بانس کے ساتھ باندھ دیا جائے۔ بستی میں پہنچ کر اُسے بدلوا لیں گے۔

ایک درخت سے مضبوط لمبی شاخ کاٹ کر ٹوٹے ہُوئے بانس کے ساتھ باندھ دی گئی۔ میں نے اس پر لدا ہُوا کچھ سامان اتروا کر دوسری گاڑی پر رکھوا دیا اور قافلہ قدم بہ قدم چلتا ہُوا داؤد خان کی بستی کی طرف بڑھنے لگا۔

٭ ٭

بستی کے باہر چار گھڑسوار ہمیں دیکھتے ہی ٹھٹکے اور رُخ پلٹ کر بستی کے اندرونی حصّے میں ایک گلی کا موڑ گھوم کر غائب ہو گئے۔ ان لوگوں نے ہمیں اتنا موقع نہیں دیا تھا کہ ان سے کچھ کہہ سکتے۔ شالیار خان بستی میں داخل ہوتے ہی یوں سینہ تان کر گھوڑا دوڑا رہا تھا جیسے وہی اس قافلے کا سربراہ ہو۔ ساری بستی ایک خوبصورت اور سرسبز پہاڑ پر بنی ہوئی تھی اور پتھروں کی چٹانوں سے بنے ہُوئے مکانوں میں روشنی کے آثار زندگی کی علامتیں ظاہر کر رہے تھے۔

"ہم اس جگہ سے گزر رہے ہیں جو اس بستی کا سب سے بڑا بازار کہلاتا ہے۔" شالیار خان نے راستے کے دونوں جانب لکڑی اور پتھروں سے تعمیر کی گئی دُکانوں پر نظر ڈالتے ہُوئے کہا۔ "دریا کے کنارے ایک بلند ٹیلے پر سردار کا مکان ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک بہت بڑا مہمان خانہ ہے جہاں درجنوں مہمان بیک وقت قیام کر سکتے ہیں۔"

بازار میں کئی قبائلی نظر آئے مگر کسی نے یہ جاننے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ ہم کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں؟ شاید ان لوگوں کی آنکھیں آئے دن نت نئے قافلوں کو دیکھنے کی عادی تھیں۔ پھر اچانک ایک مسجد کے مینار دیکھ کر شالیار خان بہت خوش نظر آنے لگا۔ "خُدا کے گھر کی بلندی دیکھ کر اس کی عظمتوں پر میرا یقین بڑھ گیا ہے۔ نوجوان! تم قافلے کو کچھ دیر کے لیے مسجد کے بڑے دروازے کے سامنے روک لینا۔ میں خُدا کے گھر میں داخل ہو کر شکرانے کے نفل ادا کرنا چاہتا ہُوں۔" اس کے لہجے میں عجیب سی سرشاری تھی۔

مسجد کے دروازے پر پہنچ کر شالیار خان نے گھوڑا روک کر اس کی باگیں میرے ہاتھوں میں تھما دیں اور خود مسجد میں چلا گیا۔

کچھ دیر بعد ایک بوڑھا نمازی مسجد کے دروازے میں آ کر رُک گیا اور قافلے کو دیکھ کر بولا۔ "اجنبی! بستی میں آنے والا ہر قافلہ سردار کا مہمان ہوتا ہے۔ تم بھی اپنے ساتھیوں کو لے کر مہمان خانے میں چلے جاؤ۔ سردار اپنے مہمانوں کی بڑی آؤ بھگت کرتا ہے۔ تم لوگ کون ہو؟ گھوڑوں کے تاجر ہو کیا؟" اس نے دروازے سے نکل کر میری طرف بڑھتے ہُوئے سوال کیا۔

"خان بابا! ہم اس بستی کی جانب پہلی مرتبہ آئے ہیں مگر ہمارا ایک ساتھی جو مسجد میں گیا ہے، وہ پہلے بھی اس بستی میں آ چکا ہے۔ بستی کا سردار کون ہے؟ پہلے تو داؤد خان ہُوا کرتا تھا؟" میں نے نرمی سے کہا۔

"سردار داؤد آج بھی بستی کا سردار ہے۔ تم کچھ آگے جاؤ گے تو دریا کے کنارے اس کا کوئی نہ کوئی آدمی استقبال کے لیے موجود ہو گا۔ سردار داؤد نے اس بستی کو امن کا گہوارہ بنا دیا ہے۔ اس کی وجہ سے آس پاس کی ساری بستیاں خوشحال ہو گئی ہیں۔" بوڑھے نمازی نے جواب دیا اور سلام کرتا ہُوا اپنے راستے پر چل پڑا۔

شالیار خان اس کے جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد مسجد کے دروازے میں نمودار ہُوا تو دروازے میں آویزاں مشعلوں کی روشنی میں مجھے اس کے چہرے پر ایک عجیب سے نکھار اور بزرگی کا احساس ہوا۔ وہ گھوڑے پر سوار ہُوا تو اس وقت بے حد خاموش مگر پُر وقار نظر آ رہا تھا۔ خُدا کے گھر میں حاضری دینے کے بعد اس کے چہرے پر بے پناہ طمانیت آ گئی تھی۔ اس کی سرخی مائل آنکھیں آئینے کی طرح روشنی منعکس کر ... رہی تھیں۔

تقریباً سو قدم کا فاصلہ طے کیا ہو گا کہ ہماری آنکھوں کے سامنے ایک قلعہ نما حویلی آ گئی۔ جس کے دروازے پر چند مسلح آدمی موجود تھے جو ہمیں دیکھتے ہی ہماری جانب بڑھے ان میں سے ایک نے ہمیں خوش آمدید کہا اور باقیوں نے ہمارے گھوڑے حویلی کے باہر کھونٹیوں سے باندھ دیے جہاں کافی مقدار میں چارہ موجود تھا۔ دونوں گاڑیاں حویلی کی دیوار کے ساتھ لگا کر کھڑی کر دی گئیں۔ وہاں پہلے بھی کچھ گاڑیاں کھڑی تھیں اور ہمیں مخاطب کر کے ایک نے کہا۔

"اجنبی! سارے خدشات ذہن سے محو کر کے حویلی میں چلے جاؤ۔ یہ سردار داؤد خان کی بستی ہے جہاں پرندہ بھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس کی اجازت کے بغیر پر نہیں مار سکتا۔ تمہارے سامان کی حفاظت کے لیے پوری بستی موجود ہے۔" خوش آمدید کہنے والے نے کہا اور آگے آگے چلتا ہوا حویلی کے دروازے میں داخل ہو گیا۔

حویلی کی دہلیز پار کرتے ہی ہمیں وہ کمرے نظر آ گئے جو مہمانوں کے لیے تعمیر کیے گئے تھے۔ وہاں جگہ جگہ روشن مشعلوں سے خاصا اُجالا ہو رہا تھا۔ حویلی کا صحن ایک بڑے میدان جیسا تھا جس کے درمیان ایک چبوترے پر بہت سے قبائلی جمع ہو کر کھانے میں مشغول تھے۔

شالیار خان پر نگاہ پڑتے ہی ایک دراز قد بوڑھا اُچھل کر کھڑا ہو گیا اور بے پناہ مسرت کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔

"خوش آمدید سردار شالیار خان! خوش آمدید۔" وہ شالیار خان سے لپٹ گیا۔ "شالیار خان میری آنکھیں تیرا راستہ تکتے تکتے بوڑھی ہو گئیں مگر تم نے پلٹ کر میری کوئی خبر نہیں لی کہ تمہارا دوست داؤد خان تمہاری اس طویل خاموشی پر کس قدر افسردہ اور نڈھال ہے؟" بوڑھے کی آواز میں بے پناہ خلوص تھا۔

"ماہ و سال کی گردش ہر انسان کو یکساں متاثر کرتی ہے۔ میں نے اپنی زندگی کا ایک طویل حصہ جس ابتلا میں گزارا ہے اگر تم اس کا معمولی سا حال بھی سن لو تو تمہارے سینے میں دھڑکتا دل حرکت کرنا چھوڑ دے۔" شالیار خان نے اپنی طویل خاموشی کا پس منظر بیان کرتے ہوئے جواب دیا۔

"خیر! پہلے کھانے سے فراغت پا لو، پھر جی بھر کے باتیں ہوں گی۔" داؤد خان نے خوش اخلاقی سے کہا۔

شالیار خان کا اشارہ پا کر سارے ساتھی دو قطاروں میں تقسیم ہو کر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ ہمارے بیٹھتے ہی بھنے ہوئے گوشت کے طشت لا کر ہمارے سامنے رکھ دیے گئے۔ خمیری روٹی اور بھنے ہوئے گوشت کی لذت حلق میں اُتری تو مزا آ گیا۔ ہم نے دل کھول کر ایک عرصے بعد اس قبائلی دعوت کا لطف اُٹھایا تھا۔ شالیار خان اور سردار داؤد کے درمیان کھانا کھانے کے دوران بھی بات چیت جاری رہی۔ ہمارے قافلے کو پہنچنے والے نقصان کا تذکرہ سنتے ہی سردار داؤد نے بے تکلفی سے ایک قہقہہ لگایا اور شالیار خان کا ایک شانہ جھنجوڑتے ہوئے بولا۔ "شالیار خان! مجھے تمہاری مہربانیاں یاد ہیں۔ میرے اصطبل میں اس وقت درجنوں گھوڑے موجود ہیں۔ جب تک تم ان میں سے اپنی پسند کے گھوڑے منتخب نہیں کر لیتے ان کی فروخت بند رہے گی اور تمہاری ٹوٹی پھوٹی گاڑی کی مرمت کے لیے میں ابھی لوہار بلوا دیتا ہوں۔ صبح ہونے تک تمہیں اپنی گاڑی پہلے سے زیادہ مضبوط اور پائیدار حالت میں ملے گی۔"

کھانا ختم ہوتے ہی لوگ مختلف ٹولیوں میں بٹ کر تمباکو سے شغل کرنے لگے تو سردار داؤد نے ہمیں ایک کمرے میں جانے کے لیے کہا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ شالیار خان سے ہماری غیر موجودگی میں کچھ باتیں کرنا چاہتا ہے۔

سردار داؤد نے ایک آدمی کو اشارہ کیا کہ وہ ہمیں کسی کمرے میں لے جائے۔ ہم اُٹھ کھڑے ہوئے لیکن اسی سمے میری نگاہ حویلی کے دروازے کی طرف اُٹھ گئی۔ میرا دایاں ہاتھ آہستہ آہستہ ریوالور کے دستے پر جا پہنچا اور میں دل کی بے ترتیب دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے ان تین آدمیوں کی طرف دیکھنے لگا۔ جنھوں نے چہرے سیاہ نقابوں میں چھپا رکھے تھے۔ ان تینوں کو دیکھ کر میرے ذہن میں منصوری بہن کے لٹیروں کا خیال پیدا ہوا اور میرے ذہن میں خطرے کی سرخ بتی روشن ہو گئی۔

ان نقاب پوشوں کی وجہ سے صحن میں موجود ہر شخص کے تیور بگڑ گئے تھے اور سردار داؤد خان کے بوڑھے چہرے کی لرزاں جھریاں تک ساکت ہو گئی تھیں۔ اس کی آنکھوں سے گہری تشویش عیاں تھی۔

سیاہ ڈھاٹے باندھے ہوئے ان پُراسرار آدمیوں کی وجہ سے اچانک ہی خوشگوار ماحول میں کشیدگی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ چبوترے پر موجود ہر شخص سنجیدہ اور محتاط نظر آنے لگا۔

میرا ہاتھ ریوالور کے دستے پر جم کر رہ گیا تھا۔

... لیکن میں اپنے طور پر کوئی جارحانہ قدم نہیں اُٹھا سکتا

تھا۔ میری حیثیت یہاں ایک مہمان کی تھی اور میں اس وقت تک کوئی کارروائی نہیں کرنا چاہتا تھا جب تک صاحب خانہ کی طرف سے ابتدا نہ ہو... میں نے کن انکھیوں سے سردار داؤد کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں سرخی تیرنے لگی تھی۔

میں ان تینوں کی طرف متوجہ ہو گیا جو بے تکے قدم اٹھاتے ہوئے سردار داؤد کے سامنے آ کھڑے ہوئے تھے۔ میں نے سردار داؤد کے انداز میں بے چینی محسوس کی۔ مجھے حیرت ہونے لگی کہ جس سردار کے بارے میں ابھی کچھ دیر پہلے تک بڑے بڑے دعوے سنے تھے، وہ صحن میں تین نقاب پوشوں کی وجہ سے اس قدر کیوں بے چین نظر آ رہا ہے؟

"لشکر خان! آج سے چند روز پہلے میں نے کہا تھا کہ تمہیں بستی میں آنے کی ضرورت نہیں، جب تک میں خود تمہیں یہاں آنے کی دعوت نہ دوں۔ جب تمہاری غذائی ضرورت کا سامان تمہیں وقت پہ پہنچا دیا گیا تھا تو پھر بغیر کسی اطلاع کے بستی میں آنے کی کیا ضرورت تھی؟ تمہارے یہاں آتے ہی ساری بستی کا امن و سکون تہ و بالا ہو جاتا ہے۔ میں تمہیں یہاں رُکنے کی اجازت دے کر مہمانوں کا سکون برباد نہیں کر سکتا۔ تم جلد از جلد اپنی آمد کی وجہ بیان کرو اور فوراً رخصت ہو جاؤ۔"

سردار داؤد خان کی ناگوار باتوں سے ان کے اطمینان اور سکون میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ان میں ایک جو گینڈے کی طرح تگڑا لیکن ہاتھی جیسا فراخ سینہ رکھتا تھا، طنزیہ انداز میں بولا۔ "سردار داؤد خان! معاملہ بڑا اہم ہے۔ تمہارے لہجے کی کرختگی آج ہمارے لیے متاثر نہیں کر سکتی اور نہ ہی ہم ناکام واپس جانے کے لیے آئے ہیں۔ آج تمہارے مہمان خانے میں ہمارے بھائیوں کے قاتل جمع ہیں۔ ہم تم سے مطالبہ کرنے آئے ہیں کہ ان قاتلوں کو اسی وقت بستی سے رخصت کر دو۔ ورنہ میرے قبیلے کے لوگ منتظر ہیں، ہمارے بھوکے لوگ ٹڈی دل کی طرح آئیں گے اور بستی کی بہشت تہ و بالا کر کے رکھ دیں گے۔"

یہ دھمکی سن کر سردار داؤد پہلے سے بھی زیادہ سنجیدہ نظر آنے لگا۔

"خاموش ہو جاؤ راتب خان! ورنہ تمہارا بالوں سے بھرا ہوا سر تمہارے کندھوں سے الگ کر دیا جائے گا اور اس زبان کو گدی سے کھینچ لیا جائے گا، جو میرے معزز مہمانوں کی آمد پر دھمکیاں دینے کے لیے کھل رہی ہے۔ لشکر خان اس خبیث کو لے کر فوراً میری بستی سے نکل جاؤ۔ میں ابھی تک تمہارے بزرگوں سے کیے گئے معاہدے کی پابندی کر رہا ہوں۔ خبردار! اگر تم میں سے کسی نے اب زبان کھولی ورنہ اس کی لاش بستی کے چوراہے پر لٹکا کر دوسروں کے لیے عبرت کا نمونہ بنا دی جائے گی۔"

راتب خان اور لشکر خان کے تیور بگڑنے لگے۔ بے اختیار ان کے ہاتھ اپنی کمر سے بندھے ہوئے پستولوں کی طرف بڑھے تھے۔ مگر اچانک ان کے تیسرے ساتھی نے جو ان دونوں سے زیادہ بھاری بھرکم تھا، ہاتھ اٹھا کر مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ "لشکر خان! ہم یہاں کوئی ہنگامہ کرنے نہیں آئے۔ تم دونوں کو سردار سے گفتگو کرتے وقت اس کے مرتبے اور بزرگی کا خیال رکھنا چاہیے تھا۔ ایک بگڑی ہوئی بات کو اور زیادہ بگاڑنے کی کوشش نہ کرو۔ اگر تم میں سے کسی نے اس

نامور مصنف محمود احمد مودی
وہی تحریر اور وہی انداز
کے ساتھ اپنے چاہنے والوں
کے لئے ایک نئی سوغات لئے
تلاش
حصہ اول =/150
PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk
سرکلر روڈ اردو بازار لاہور
7668958

حویلی میں ایک گولی بھی چلادی تو سردار داؤد ہماری غذائی امداد بند کردے گا۔ اس طرح قبیلے کے بچے اور عورتیں بھوک سے بلکنے لگیں گی اور ہم اپنی جنگ جیت کر بھی خسارے کا سودا کریں گے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو روشن خان!" سردار داؤد نے ان باتوں پر اُسے پسندیدگی کی نظروں سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ "اگر راتب خان اور لشکر خان نے بستی میں اسی طرح اپنی آمدورفت جاری رکھی تو میں صرف غذائی امداد ہی بند نہیں کردوں گا بلکہ ہر قسم کے لین دین پر بھی پابندی عاید کردوں گا۔ یہ احمق میری امن پسندی کو بزدلی تصور کرتے ہوئے مجھے دھمکیاں دینے پر اُتر آیا حالانکہ یہ خوب جانتا ہے کہ میں نے امن کی مخالفت کرنے والے کسی شخص کو اپنی بستی سے زندہ واپس جانے کا بہت کم موقع دیا ہوگا۔ آس پاس کی تمام بستیاں امن پسندی کی حمایت کرتے ہوئے تیزی سے خوشحال ہورہی ہیں۔ ان تمام لوگوں نے لُوٹ مار کا آبائی پیشہ ترک کردیا ہے اور محنت مشقت کو مشغلہ بنالیا ہے مگر ابھی تک لشکر خان کا قبیلہ ایسا ہے جو لُوٹ مار اور قتل و غارت سے باز نہیں آیا۔ مجھے یقین ہے کہ جب تک پُرانی نسل کے تمام لوگ ایک ایک کرکے فنا کے گھاٹ نہیں اُتر جائیں گے، یہ لوگ اپنے آبائی پیشے سے دستبرداری کا اعلان نہیں کریں گے۔ تم نے وہ مثال تو ضرور سُنی ہوگی کہ جب چیونٹی کی موت آتی ہے تو اس کے پر نکل آتے ہیں۔ اسی طرح لشکر خان اور راتب کی موت گھیرا ڈال کر انھیں بار بار بستی تک آنے پر اُکسا رہی ہے... مگر اب میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہوچکا ہے اور میں بھی اپنا طرزِ عمل بدلنے پر مجبور ہوگیا ہوں۔"

سردار داؤد خان غصے کے عالم میں بہت خوفناک نظر آرہا تھا۔ اس کے منہ سے مسلسل جھاگ اُڑ رہے تھے۔

"سردار داؤد خان! غصہ تھوک دو اور مجھے اتنا موقع ضرور دو کہ میں تمھارے سامنے بستی میں آنے کی مجبوری ظاہر کرسکوں۔ مجھے افسوس ہے کہ لشکر خان اور راتب خان نے تم سے ایسے لہجے میں بات کی جو کسی بزرگ کے سامنے زیب نہیں دیتا۔"

روشن خان کا انکسار آمیز لہجہ اپنا کام کرگیا اور داؤد خان اس کی باتوں سے متاثر نظر آنے لگا۔ اس کے بگڑے ہوئے جبڑے دوبارہ اپنی حالت پر آگئے۔

"روشن خان! میں تمھاری ہر بات سُننے کے لیے تیار ہوں۔ مگر ان دونوں کو اس بات کا پابند کردو کہ جب تک ہم دونوں کے درمیان بات چیت جاری رہے، یہ خاموش رہیں... ان لوگوں نے میرے معزز مہمانوں کی موجودگی میں مجھے ذلیل و رسوا کرنے کی کوشش کی ہے جسے کوئی بھی غیرت مند پٹھان برداشت نہیں کرسکتا لیکن میں ایک امن پسند آدمی ہوں اس لیے نظرانداز کرتا ہوں۔"

"سردار! تمھیں ان کی باتوں سے جو صدمہ پہنچا ہے، میں اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔" روشن خان نے نرمی سے کہا۔

"ٹھیک ہے! میں تمھاری معذرت قبول کرتے ہوئے تمھیں اس بات کی اجازت دیتا ہوں کہ رات کے اس وقت بستی میں آنے کا کوئی معقول عذر ظاہر کرنے میں دیر نہ کرو۔" داؤد خان نے سرد لہجے میں جواب دیا اور روشن خان کو گھورنے لگا۔

"سردار! ہم پر یہ الزام ہے کہ ہمارا قاتلوں اور لٹیروں کے گروہ سے تعلق ہے۔ مگر اس وقت ہم، تمھیں یہ بتانے آئے ہیں کہ اس امن پسند بستی میں ہم سے بھی بڑے اور سفاک قاتل گھس آئے ہیں اور تمھیں ان کے خوفناک عزائم کی کوئی خبر نہیں... یہ تاجروں کا بھیس دھار کر آنے والے لوگ ظالموں کی فوج کے ہراول دستے کا کام کررہے ہیں۔ تم ان کی سفاکی اور درندگی کا اس بات سے اندازہ لگاسکتے ہو کہ یہ لوگ چند گھنٹوں کے قلیل عرصے میں ہمارے اُنتیس ساتھیوں کو ہم سے ہمیشہ کے لیے جُدا کرچکے ہیں۔ ہم نے انھیں اپنی بستی سے دُور رکھنے کی کوشش کی تھی مگر ان کے پاس ایسے نئے اور انوکھے ہتھیار موجود ہیں جو ایک ہی دھماکے میں کئی آدمیوں کا صفایا کرسکتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ آخر یہ لوگ کون ہیں؟ جو اس قدر منظم اور خطرناک ہتھیاروں سے لیس ہوکر آزاد علاقے میں گھس آئے ہیں۔ ان کے پاس وہ ہتھیار موجود ہیں جو ہمارے علاقے میں کہیں نہیں پائے جاتے اور پھر ان کے گروہ میں مختلف قوموں کے لوگ موجود ہیں۔ جو بظاہر قبائلی لباس پہنے ہوئے ہیں۔ یہ ہمیں دھوکے میں رکھنے کے لیے ہمارے روایتی لباس کی توہین کررہے ہیں۔ ایسے لوگ جو بستی میں داخل ہونے سے پہلے ہی خون کا دریا بہاچکے ہوں، ان کی موجودگی میں بستی کے امن کی فضا کتنی دیر تک قائم رہ سکتی ہے؟ جذبات کے خول سے نکلو اور حقیقت پسند بن کر اس بات کی جانچ کرو کہ یہ لوگ نیک ارادے سے نہیں آئے ہیں ورنہ فرنگیوں جیسے ہتھیاروں سے لیس ہوکر ادھر کا رُخ نہ کرتے۔ میں ثابت کرسکتا ہوں کہ یہ لوگ فرنگیوں کے چمچے ہیں اور آزاد علاقے کو غلامی اور محکومی کی زنجیروں میں جکڑنے آئے ہیں۔ اگر میری باتوں پر یقین نہ آئے تو ان کی گھوڑا گاڑیاں کھلوا کر دیکھ لو۔ جن میں ہتھیار ہی ہتھیار بھرے ہوئے ہیں۔ اس سے تمھیں یہ اندازہ کرنے میں آسانی رہے گی کہ ان کے ڈانڈے کہاں تک پھیلے ہوئے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہیں۔ ہمارے چند آدمیوں نے ان کی مسلسل نگرانی کرکے اس راز کو پالیا ہے کہ یہ قبائلی نہیں ہیں... بلکہ مختلف قوموں کا ایک خون آشام جتھا ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے انھیں ان دونوں گاڑیوں سے ہتھیار اُتارتے دیکھا ہے۔"

روشن خان رواں پشتو میں اپنی تقریر ختم کرکے خاموش ہوا تو سردار داؤد خان گہری سوچ میں ڈوبا نظر آنے لگا... پھر اس نے نگاہ اٹھاکر کہا: "روشن خان! اگر یہ لوگ میرا خون بہانے کا منصوبہ بناکر آئے ہیں تب بھی میں انھیں اپنا مہمان قرار دے چکا ہوں اور میں اس وقت تک ان کے تحفظ کا پابند ہوں جب تک یہ میرے علاقے کی حدود سے نہیں نکل جاتے۔ اپنے طور پر میں پوچھ گچھ ضرور کروں گا کہ ان کے آنے کے مقاصد کیا ہیں مگر میں یہ معلومات دوستانہ انداز میں حاصل کروں گا۔ کسی دھمکی یا جبر سے کام نہیں لوں گا۔ اگر ان لوگوں نے تمھارے آدمیوں کا قتل عام کیا ہے تو اس کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوگی۔ تمھاری باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ تم اپنے آدمیوں کا انتقام لینے کے لیے مجھے اپنی کوششوں میں شریک ٹھہرانا چاہتے ہو جبکہ میں نے ایک جنگجو کا لباس اُتار کر امن پسندی کا لبادہ پہن رکھا ہے۔ میری ان کوششوں اور تقلید سے کئی بستیاں خوشحالی کے دور میں داخل ہورہی ہیں۔ میں تمھیں اس بات کی اجازت نہیں دے سکتا کہ اس علاقے کی حدود میں میرے مہمانوں سے کوئی اختلاف کرو اور انھیں انتقام کا نشانہ بناؤ۔ اگر تم میں سے کسی نے بھی میرے مہمانوں کے ساتھ انتقامی کارروائی کا آغاز کیا تو میری طاقت اپنے مہمانوں کے تحفظ کے لیے استعمال ہوگی اور تمھاری شروع کی ہوئی جنگ، میری ذاتی جنگ بن جائے گی جس کے نتائج خوفناک ہوں گے۔"

سردار داؤد خان نے صاف گوئی اختیار کرتے ہوئے فیصلہ کن انداز میں کہا تو میں اس کے دلیرانہ اور جرأت آمیز رویے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ان باتوں نے میرے ساتھیوں پر بھی اچھا اثر ڈالا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ روشن خان کی الزام تراشی کے دوران کسی چیتے کی طرح ہوشیار اور چوکنے ہوگئے تھے اور ہر خطرناک صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے خود کو تیار کرچکے تھے۔

"ٹھیک ہے سردار! اب یہ تمھاری ذمے داری ہے کہ تم ان کی دسترس سے اپنی بستی کا امن کس طرح محفوظ رکھتے ہو؟ ہم تمھارا یہ فیصلہ مان لیتے ہیں کہ ان سے تمھارے علاقے میں کوئی جھگڑا نہ کریں کیونکہ ہم تمھاری ناراضی مول نہیں لینا چاہتے۔ مگر ایک بات تمھیں اور تمھارے معزز مہمانوں کو ضرور یاد رکھنی چاہیے کہ ہم ان کے راستے میں آئیں گے اور انتقام ضرور لیں گے۔"

روشن خان نے خشک لہجے میں کہا... پھر لشکر خان اور راتب خان کو چلنے کا اشارہ کرتے ہوئے حویلی کے صدر دروازے کی جانب گھوم گیا۔ جب تک وہ تینوں حویلی سے نکل کر نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوگئے، میرے ساتھیوں سمیت سب مہمانوں کی آنکھیں ان کا تعاقب کرتی رہیں۔ ان کا جارحانہ انداز ظاہر کررہا تھا کہ وہ بظاہر تو سردار داؤد کا فیصلہ قبول کرکے جارہے ہیں لیکن درپردہ وہ کوئی ایسی کارروائی کرنے کا تہیہ کیے ہوئے ہیں جو ہمارے لیے ناقابلِ تلافی نقصان کا باعث بن سکتی تھی۔

سردار داؤد نے دُوسرے مہمانوں سے معذرت کی اور ہمیں لے کر ایک وسیع کمرے میں آگیا جہاں کم از کم پچاس آدمی بیک وقت بیٹھ سکتے تھے۔ کمرے میں ہر طرف دیواروں کے ساتھ چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں اور ان پر صاف ستھرے بستر لگا کر آرام دہ بنایا گیا تھا۔

سردار داؤد خان اور شالیار خان ایک چارپائی پر بیٹھ گئے اور میرے ساتھیوں نے ان کے آس پاس ڈیرہ جمالیا۔ ہمارے بیٹھتے ہی دو آدمی قہوے کا بھرا ہوا برتن اور پیالیاں لے آئے۔ دونوں ملازم قہوہ دے کر چلے گئے تو سردار داؤد نے قہوے کی پیالی اُٹھا کر ہونٹوں سے لگالی اور چند گھونٹ لینے کے بعد شالیار خان کی طرف متوجہ ہوگیا جو اس وقت خاموشی اور سنجیدگی کا مجسمہ نظر آ رہا تھا۔

"شالیار خان! اگر مناسب خیال کرو تو اپنے آنے کی اصل وجہ مجھ پر بھی ظاہر کردو تاکہ اس کشیدگی کا خاتمہ کیا جاسکے جو تمھارے قافلے کے آتے ہی بستی کی پُرامن فضا کو متاثر کرچکی ہے۔ یہ باتیں میں تم سے کسی دباؤ یا دھمکی کے تحت دریافت نہیں کررہا ہوں۔ مگر تم یہ خیال کرتے ہو کہ تمھاری خاموشی تمھارے مفاد کے لیے بہتر ہے تو میں تم سے کوئی سوال نہیں کروں گا۔ مگر میں جانتا ہوں کہ تم ایک دلیر اور راست باز آدمی ہو اور اپنے ذہن میں سنجیدہ خیالات کا بیش بہا خزانہ رکھتے ہو۔ تم بھی نہ چاہو گے کہ برسوں کی لگاتار محنت اور کوششوں سے میں نے اس علاقے کو جس پائیدار امن سے روشناس کرایا ہے تہ و بالا کرکے رکھ دو۔ تم میرے دوست ہی نہیں محسن بھی ہو۔ میں تمھارے کردار کو کبھی فراموش نہیں کرسکتا اور نہ ہی اپنی آنکھوں کے سامنے تمھیں کوئی گزند پہنچتے دیکھ سکتا ہوں۔ اگر تم نے مجھے حالات سے آگاہ کردیا تو میں تمھارا دفاع کسی دُوسرے انداز سے کروں گا۔ جس میں تمھارا تجربہ اور مشاہدہ دونوں شامل ہوں گے۔ بصورتِ دیگر تمھیں اس بات کا اختیار ہے کہ تم مجھے خاموش ہوجانے کا اشارہ کردو اور حالات کی ڈولتی اور ہچکولے کھاتی ہوئی کشتی کو بیچ منجدھار

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چھوڑ دو۔"

"داؤد خان!" شالیار خان نے اپنی خوفناک آنکھیں اس کے چہرے پر جماتے ہوئے جواب دیا۔ "جب تک تمہاری باتیں میرے مفاد کا تحفظ کرتی رہیں، میں نے ان میں دخل دینا مناسب خیال نہیں کیا۔ ورنہ وہ تینوں لٹیرے مجھ سے زندہ بچ کر نہیں جا سکتے تھے۔ میں نے قبائلی روایت کا احترام کرتے ہوئے اس بات کا موقع دیا تاکہ تم کوئی فیصلہ کن انداز اختیار کر سکو۔ مرنے جیتے ہو کر میدانِ جنگ کا سپاہی کسی مصلحت کا پابند نہیں ہوتا۔ میں آج بھی مصلحت کو اپنی زندگی کا مسلک نہیں بنا سکا کیونکہ مصلحتیں ناجائز ذہنیت کی پیداوار ہوتی ہیں۔ اگر تم یہ خیال کرتے ہو کہ ہماری آمد سے تمہاری ناجائز ساکھ متاثر ہو رہی ہے تو ہم ابھی اور اسی وقت تمہاری بستی چھوڑنے کو تیار ہیں۔ ویسے بھی میرا یہاں زیادہ دیر رکنے کا ارادہ نہیں تھا۔"

"شالیار خان! تمہاری صاف گوئی مجھے دہرا صدمہ پہنچا رہی ہے۔" سردار داؤد اچانک افسردہ نظر آنے لگا۔ "کس میں اتنی جرأت ہے جو میرے مہربان دوست کو میلی آنکھ سے دیکھ سکے۔ میری زندگی میں یہ بات ناممکن ہے کہ شالیار خان کو میری ضرورت ہو اور میں کسی مصلحت کا پابند ہو کر رہ جاؤں۔ سردار داؤد اس علاقے میں تمہارے تحفظ کا ذمے دار بن چکا ہے اور اس کے لیے وہ سارے جہان کی مخالفت مول لینے کے لیے تیار ہے۔ تم آگے کہاں جانے کا ارادہ رکھتے ہو؟ بتاؤ تاکہ میں اس راستے کو صاف کر کے تمہارے تحفظ کی ذمے داری پوری کر سکوں۔"

"میں وادیٔ فرغان میں بجولا سنگھ اور اس کے ڈاکو بیٹے دلیپ سنگھ سے اپنا ایک پرانا معاملہ طے کرنے جا رہا ہوں۔" شالیار خان نے مؤثر انداز میں جواب دیا۔ "آج سے بائیس سال قبل وادیٔ خوف میں بجولا سنگھ سے ایک بار میری ٹکر ہو چکی ہے۔ اس وقت حالات کچھ ایسے تھے کہ وہ فرنگیوں کا لوٹا ہوا خزانہ مجھ سے چھین لے جانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے بعد میرے حالات یکایک پلٹا کھا گئے اور میں اس قابل نہیں رہ گیا کہ بجولا سنگھ کا تعاقب کرتا اور اس سے اپنا چھینا ہوا مال واپس لے لیتا۔ آج زندگی نے مجھے دوبارہ مہلت دی ہے تو میں اس سے اپنا پرانا حساب چکانے جا رہا ہوں۔ میرے ساتھی بہترین تربیت یافتہ ہیں اور ہمارے پاس فرنگیوں سے چھینے ہوئے جدید ہتھیار بھی موجود ہیں۔ جب حوصلہ اور حالات دونوں ساتھ دے رہے ہوں تو پرانا حساب چکانے میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ بس یہ میرا ارادہ ہے کہ میں جلد سے جلد وادیٔ الماس پار کر کے وادیٔ فرغان میں داخل ہو جاؤں جہاں خونخوار بھیڑیئے منصف مزاج بن کر ساری وادی کو دہشت کی لپیٹ میں لیے ہوئے ہیں۔" شالیار خان کے لہجے میں کرختگی آ گئی اور اس کے خدوخال بگڑتے ہوئے نظر آنے لگے۔

داؤد خان جو اس کی باتیں سن کر متحیر دکھائی دے رہا تھا، اس کے خاموش ہوتے ہی بولا۔ "شالیار خان! ان مٹھی بھر آدمیوں کی قوت بجولا سنگھ اور اس کے بیٹے کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی۔ اگر اس سے ٹکرانے کا ارادہ تھا تو تمہیں اپنے ساتھ منظم فوج لانی چاہیے تھی۔"

"اگر میں لشکر لے کر اس طرف آتا تو میرے ہم وطن مجھے شبے کی نظر سے دیکھتے اور سیسہ پلائی دیوار کی طرح میرا راستہ روک کر کھڑے ہو جاتے... اور میرے لیے وادیٔ فرغان میں داخل ہونا مشکل ہو جاتا۔ بہرحال تمہارا شکریہ لیکن ہم اپنے دوست کو کسی کٹھن مشکل سے دوچار نہیں کرنا چاہتے۔"

شالیار خان کا مؤقف بہت واضح تھا۔

داؤد خان نے انکار میں سر کو جنبش دیتے ہوئے کہا۔ "اور میں بھی اپنے دوست کو موت کے منہ میں جاتے دیکھ کر اسے تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔ میں وادیٔ فرغان میں تمہارے ساتھ چلوں گا اور بجولا سنگھ سے نمٹنے کے لیے اپنی جان کی بازی لگانے سے بھی دریغ نہیں کروں گا۔"

"داؤد خان! میں تمہارے اس بے پناہ ایثار کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ ابھی تک ہماری یہی کوشش رہی ہے کہ بستیوں سے الگ تھلگ راستے پر سفر کیا جائے۔ اگر ہم بھاری جمعیت کے ساتھ وادیٔ فرغان کی جانب بڑھیں گے تو بجولا سنگھ کے جاسوس ہوشیار اور چوکنے ہو جائیں گے اور ہمارے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی دشمن باخبر اور مستعد ہو جائے گا۔ اسی طرح جنگ کا وقفہ طول کھینچ سکتا ہے۔ جنگ جس قدر طول کھینچتی جائے گی، ہماری فتح کے امکانات بھی معدوم ہوتے جائیں گے اور میں نہیں چاہتا کہ بجولا سنگھ مجھ پر دوبارہ برتری حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ حالات کا تقاضا ہے کہ اس بات سے اپنے دوستوں کو بھی بے خبر رکھا جائے کیونکہ دوستوں کے حلقے میں پھیلی ہوئی بات دشمن کے کانوں تک پہنچ سکتی ہے۔"

شالیار خان اپنے اٹل مؤقف پر ڈٹ گیا۔

"ٹھیک ہے شالیار خان!" داؤد خان نے اس کا فیصلہ سن کر جواب دیا۔ "میں اس مرحلے پر تمہاری مخالفت کر کے تمہارے منصوبے کو ناکام بنانے کا سبب نہیں بنوں گا۔ سورج نکلنے سے پیشتر تمہاری گاڑیاں مرمت ہو چکی ہوں گی اور میرے اصطبل کے دس بہترین گھوڑے تمہارے قافلے کا ایک حصہ بن چکے ہوں گے۔ انہیں میری طرف سے اپنے قافلے کے لیے تحفہ سمجھ کر قبول کر لو۔" یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "اب تم لوگ آرام کرو، صبح ملاقات ہو گی۔"

سردار داؤد چلا گیا۔

میں نے شالیار خان کو اپنی طرف متوجہ کر کے کہا۔

"شالیار خان! ہتھیاروں سے لدی ہوئی گاڑیاں اپنے بے خبر میزبانوں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑی جا سکتیں۔ ان کی حفاظت کے لیے ہمارے کچھ ساتھیوں کی موجودگی بہت ضروری ہے۔ کیا تم نے لشکر خان اور اس کے ساتھیوں کے تیور نہیں دیکھے؟ ان کی حرکات و سکنات سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ہمیں نقصان پہنچانے کا ارادہ رکھتے ہیں اور ان کا اصل ہدف ہماری گاڑیاں ہوں گی۔ یہ لٹیرے زیادہ دیر تک اخلاقی طور پر پابند نہیں رہ سکتے۔ ان حالات میں ہم اپنی گاڑیوں کو تنہا چھوڑ کر کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ اگر ان گاڑیوں کو کوئی نقصان پہنچ گیا تو اس کا ازالہ کرنا سردار داؤد کی قوت سے باہر ہو گا۔ مرنے والوں کے لیے نوجوانوں کی کھیپ ضرور مہیا کر سکتا ہے مگر جدید ہتھیاروں کی کمی دور کرنا اس کے بس کی بات نہیں۔"

میں نے اعتراض کیا تو شالیار خان حیرت زدہ ہو کر میری طرف دیکھنے لگا۔

"نوجوان! تمہاری خطرہ محسوس کرنے کی حسیات بہت تیز ہیں۔ حالات کے اس پہلو کو واقعی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ اپنے کچھ آدمی اس بہانے گاڑی کے پاس بھیج دو کہ وہ اپنی نگرانی میں گاڑی کی مرمت کرانا چاہتے ہیں۔ اس بات پر داؤد خان ناراض تو ضرور ہو گا مگر حالات اس قدر سنگین ہیں کہ گاڑیوں کی ذمے داری تنہا اس پر نہیں ڈالی جا سکتی۔"

"گستم خان!" میں نے ایک قبائلی ساتھی کو مخاطب کر کے کہا۔ "تم اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ باہر جا کر گاڑی کی نگرانی کرو۔ تھوڑی دیر بعد دوسرے چار آدمی تمہاری جگہ لے لیں گے۔"

گستم خان تین آدمی ساتھ لے کر حویلی کے صدر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

خطرات کے ہولناک سائے قریب پا کر نیند میری آنکھوں سے کافور ہو چکی تھی۔ میں آنکھیں بند کیے یونہی لیٹا رہا۔ میری تقلید کرتے ہوئے میرے دوسرے ساتھی بھی کمر سیدھی کرنے کی غرض سے چارپائیوں پر دراز ہو گئے۔

اچانک بہت سے لوگوں کی باتوں کا شور سن کر میں چونک پڑا۔ میری طرح شالیار خان اور سارجنٹ بھی ان آوازوں کو سن کر فوراً بیدار ہو گئے تھے۔ میں نے اٹھتے ہی اپنی رائفل سنبھالی اور چپل پہنتے ہوئے تیزی سے حویلی کے صدر دروازے کی طرف بھاگا۔ شالیار خان اور دوسرے ساتھی تیزی سے مجھے اپنے تعاقب میں آتے ہوئے محسوس ہوئے۔

حویلی سے باہر تقریباً تیس پینتیس آدمیوں کا ہجوم تھا۔ ایک طرف سردار داؤد اپنے کچھ ساتھیوں اور مافقوں کے ساتھ کھڑا تھا اور ان لوگوں کو آگے بڑھنے سے روک رہا تھا جو طاقت کے بل پر ہماری گاڑیاں اپنے قبضے میں لینے کی کوشش کر رہے تھے۔

"لشکر خان! جہاں ہو وہیں رک جاؤ ورنہ مجھے تمہارے سینے میں شگاف کرنے سے کوئی نہیں روک سکے گا۔ ابھی وقت ہے اپنے اٹھتے ہوئے قدم روک لو۔"

"ساتھیو! ہمیں ہر قیمت پر ان گاڑیوں کو اپنے قبضے میں کرنا ہے۔ آگے بڑھو اور مداخلت کرنے والوں کو روندتے ہوئے ان قیمتی گاڑیوں تک پہنچ جاؤ۔"

راتب خان نے کسی وحشی درندے کی طرح قدم آگے بڑھایا ہی تھا کہ سردار داؤد نے رائفل کی لبلبی دبا دی۔ ایک خوفناک دھماکا ہوا اور راتب خان ایک بھیانک چیخ کے ساتھ الٹ کر گرا اور موت کی دہلیز سے گزر گیا۔ اس کے ساتھ ہی سردار داؤد کے اور میرے ساتھی گاڑیوں کی آڑ لے کر دشمن کا مقابلہ کرنے کے لیے ڈٹ گئے۔ امن کی بستی میں راتب خان کی موت کے بعد بھونچال سا آ گیا۔ میں نے گاڑی کے ایک پہیے کے پیچھے پناہ لی تھی اور اگلے ہی لمحے میری ایک گولی سے لشکر خان کی کھوپڑی کے پرخچے اڑ گئے تھے۔ دوسرا ایک گولی مانک تالا کی گدی میں گھس گئی۔ اس سے پہلے کہ کوئی اس کی مدد کو پہنچتا، وہ دم توڑ گیا۔ اس عرصے میں میرے رفیق اپنا ایک ساتھی کھو کر دشمن کے آٹھ آدمی گرا چکے تھے۔

لڑائی فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو گئی۔ لشکر خان اور راتب

اے حمید
کے ایڈونچرس قلم سے
گنگا کے
پجاری ناگ
دو جلدوں میں
جلد اول =/150
جلد دوئم =/200
مکتبہ القریش سرکلر روڈ اردو بازار لاہور
فون 7668958

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خان کی موت نے جلد ہی جنگ کا فیصلہ کر دیا اور دشمن اندھیرے کا فائدہ اُٹھا کر دریا کی طرف فرار ہو گیا۔

اس جنگ میں سردار داؤد کے تین آدمی نشانہ بنے تھے۔ سردار داؤد جنگ بند ہونے کے بعد دیر تک بکھری ہوئی لاشوں کو دیکھتا رہا۔ وہ ان بدہ لاشوں کو خون میں لتھڑی دیکھ کر اپنی اصل عمر سے دس سال بوڑھا نظر آنے لگا۔ "حاکم خان!" اس نے اپنے ایک آدمی کو بھرائی ہوئی آواز میں پکارا۔ "تو یاروں سے کہو کہ وہ اپنا کام جلد از جلد مکمل کریں اور تم جا کر اصطبل سے وہ گھوڑے لے آؤ جو میں نے کچھ دیر پہلے اپنے دوستوں کے لیے منتخب کیے تھے۔" احکامات دینے کے بعد وہ اپنے دیرینہ دوست کی طرف متوجہ ہو گیا۔ "شاہباز خان! مجھے افسوس ہے تمہارا ایک ساتھی دشمن کی گولیوں کا نشانہ بن گیا۔ تم اپنے ساتھیوں کو تیاری کا حکم دے دو۔ میرے آدمی پل پر موجود ہیں۔ انھوں نے فرار ہوتے ہوئے دشمن کا راستہ روک کر انھیں اپنے کیے کی سزا دے دی ہو گی۔ ابھی صورت حال میرے قابو میں ہے اور میں چاہتا ہوں کہ تم تیزی سے سفر کرتے ہوئے ساتھی کے ساتھ وادی الماس کی حدود میں داخل ہو جاؤ۔"

شاہباز خان نے میری طرف دیکھا تو میں نے تائید میں سر ہلا دیا۔

تو یاروں نے جلد ہی گاڑی مرمت کر دی۔ ٹوٹا ہوا بانس بھی بدل دیا گیا۔ میں نے گاڑی کا جائزہ لیا اور اسے تسلی بخش پا کر سارجنٹ کو یاروں کی اُجرت ادا کرنے کے لیے کہا لیکن معاوضہ لینے سے انکار کر دیا گیا۔ اسی دوران اصطبل سے دس طاقتور گھوڑے بھی آ گئے۔

سردار داؤد ایک گھوڑے پر سوار ہو کر ہمارے ساتھ پل کی طرف چل پڑا۔ لکڑی کا پل مضبوط تختے باندھ کر بنایا گیا تھا لیکن اس سے ایک وقت میں صرف ایک گھوڑا ہی گزر سکتا تھا۔ پل پار کرتے ہی ہم دریا کے کنارے کنارے شمال کی جانب بڑھنے لگے۔ قافلے کا سفر جاری رہا حتیٰ کہ سپیدۂ سحر پھیلنے لگا۔

سردار داؤد نے اپنا گھوڑا روکا اور مسکرا کر شاہباز خان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "شاہباز خان! میں نے اپنا وعدہ تمھیں سلامتی سے پورا کر دیا ہے۔ اب آگے پیش آنے والے خطرات سے نمٹنا تمھارا کام ہے۔"

"ہمیں اجازت دو اور کوئی مناسب جگہ دیکھ کر پڑاؤ ڈال دو تاکہ تمھارے ساتھ تھکے ہوئے گھوڑے بھی کچھ دیر آرام کر کے دوبارہ سفر کرنے کے قابل ہو جائیں۔"

سردار داؤد رخصت ہو گیا تو میں نے اس ٹیلے کو پار کرتے ہی ایک ہموار جگہ پر پڑاؤ ڈال دیا۔ رات بھر آرام کا موقع نہیں ملا تھا اس لیے سبھی تھکے تھکے نظر آ رہے تھے۔ میں تو ناشتے کے فوراً ہی بعد اپنے خیمے میں بستر پر دراز ہو گیا اور میرا تھکن سے چور چور ذہن جلد ہی غفلت میں ڈوب گیا۔

نہ جانے کتنی دیر بعد دھوپ کی تیز کرنیں میرے چہرے کو چھو رہی تھیں کہ اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ آنکھیں کھولتے ہی سارجنٹ ایک زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ مجھے اپنی طرف متوجہ نظر آیا اور اس کے ساتھ ہی مجھ پر یہ خوفناک انکشاف ہوا کہ میرے جسم کا ایک ایک حصہ زنجیروں سے جکڑا ہوا ہے ..... اس کے ساتھ ہی صورت حال مجھ پر روشن ہو گئی کہ مجھے قید کر دیا گیا ہے اور اچانک ہی میری آزادی سلب کر دی گئی ہے۔ یقیناً یہ سب کچھ کسی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہوا ہے۔

★★

تفکر آمیز خیالات کے دائرے پھیل رہے تھے کہ اچانک کسی نے کھنکار کر گلا صاف کیا تو اس آواز سے یہ خیالی دائرے سمٹ کر ایک مرکز پر جمع ہو گئے۔ میں چونکا ہوا حقیقت کی دنیا میں واپس آ گیا۔ میری نگاہ خیمے کے دروازے کی طرف اُٹھ گئی۔ سارجنٹ آرٹ اپنے دو ساتھیوں کے قریب وہاں کھڑا تھا۔ وہ اپنے ہونٹوں پر زہر خند سجائے میرے قریب آ گیا اور میرے جسم کے گرد لپٹی ہوئی زنجیریں چھو کر دیکھنے لگا۔ اس کا انداز بے حد تاؤ دلانے والا تھا لیکن میں کھوپڑی ٹھنڈی رکھ کر بظاہر غصے سے بولا۔ "سارجنٹ! یہ مذاق ختم کر کے پیچھے ہٹ جاؤ۔"

"یہ مذاق نہیں ہے شہباز خان!" اس کی مسکراہٹ مزید نفرت انگیز ہو گئی۔ "یہ ایک تلخ حقیقت ہے جس کا تمھیں جلد یا بدیر سامنا کرنا ہی تھا۔ تمھاری سازش ناکام ہو چکی ہے اور تمھارا کردار آئینے کی طرح ہمارے سامنے آ گیا ہے۔"

"لیکن تم مجھ پر کیا تہمت لگا رہے ہو؟ مجھے کس جرم میں قید کیا گیا ہے؟" میں نے سخت لہجے میں دریافت کیا۔

"تم بڑے بھولے ہو شہباز!..... تمھارے دوست تم سے بھی زیادہ نادان ہیں اور تم سب نے مل کر شاید ہمیں احمقوں کا ٹولہ سمجھ رکھا ہے۔" اس کی آواز میں آہستہ آہستہ گھن گرج پیدا ہوتی جا رہی تھی۔ "سردار داؤد کی بستی میں داخل ہونے سے پہلے جو قبائلیوں کا لشکر ہمارے سامنے آیا تھا ان سے ہونے والی تمھاری سازباز کھل چکی ہے۔ ہم نے اس وقت تو عارضی طور پر تمھاری وضاحت مان لی تھی لیکن یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اب تم پر اندھا دھند اعتماد نہیں کریں گے۔"

"اگر وہ کوئی سازش تھی تو اس مرحلے پر بھی اسے کامیابی سے ہمکنار کیا جا سکتا تھا۔" میں نے گرج کر کہا۔

"یقیناً کیا جا سکتا تھا۔" سارجنٹ نے تائید کی۔ "لیکن اس طرح تم بھولا سنگھ کے خلاف ہماری فوجی طاقت استعمال نہیں کر سکتے تھے۔"

میں خاموش رہا۔ میری دھڑکنیں ایک لمحے کے لیے بے ترتیب ہوئی تھیں لیکن پھر میں سنبھل گیا۔ سارجنٹ واقعی احمق نہیں تھا۔ ملک سکندر نے راستے میں آ کر واقعی بہت بڑی غلطی کی تھی جس کا خمیازہ مجھے اس انداز میں بھگتنا پڑ رہا تھا۔

"تمھارا منصوبہ یہی تھا نا شہباز کہ تم فوجی طاقت کے ذریعے بھولا سنگھ اور اس کے بیٹے دلیپ کو شکست دے کر وہ خزانہ حاصل کر لو گے جس کے لیے یہ مہم سر کی جا رہی ہے؟ تم ہمیں قربانی کا بکرا بنا کر وہاں سے جانا چاہتے تھے لیکن اب ایسا نہیں ہو گا۔ ہم شکاری بن کر جا رہے ہیں اور یقیناً فتح ہماری ہو گی۔"

"تم احمق ہو سارجنٹ!" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "محض شک کی بنیاد پر تم نے اتنا بڑا قدم اُٹھا لیا۔ بہرحال اگر تم اب بھی سمجھ جاؤ اور مجھ سے معذرت کر کے مجھے آزاد کر دو تو میں فراخ دلی سے تمھاری معذرت قبول کر لوں گا۔"

سارجنٹ کا قہقہہ بے حد گرج دار تھا۔

کافی دیر بعد اس کی ہنسی تھم گئی تو وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ "شہباز خان!..... شک کیا نہیں جاتا، محبت کی طرح یہ بھی خود بخود ہی پیدا ہو جاتا ہے ..... اور میں تصدیق کیے بغیر اس قسم کے جذبے کبھی پروان نہیں چڑھنے دیتا۔ یاد رکھو! تمھارے ان ساتھیوں کا ایک جاسوس ہمارے ہاتھوں ہلاک ہو چکا ہے۔ جو فاصلہ رکھ کر ہمارے قافلے کا تعاقب کر رہے ہیں۔"

میں خاموش ہو گیا۔ بات انتہائی بگڑ چکی تھی اس لیے اپنی رہائی اور بے گناہی ثابت کرنے کے لیے اصرار بیکار تھا۔ مجھے غصہ آ رہا تھا نہ جانے ملک سکندر نے کس احمق کو جاسوسی کے لیے قافلے کے تعاقب میں لگا دیا تھا ..... جو خود کو پوشیدہ بھی نہ رکھ سکا اور گرفتار ہو گیا ..... پھر گرفتار ہونے کے بعد اس کی زبان بھی بند نہ رہ سکی اور اس نے سب کچھ اُگل دیا۔

"تمھاری غداری کا اس قدر ٹھوس ثبوت ملنے کے بعد تاجِ برطانیہ کا وفادار ہونے کی حیثیت سے میرا فرض تھا کہ تمھیں گرفتار کر لوں۔ تمھیں بھی یہ حقیقت تسلیم کر لینی چاہیے کہ تم واقعی غدار ہو۔ تم کسی مصلحت کے تحت ہماری نظروں میں ایک خاص مقام بنانے کی کوشش کر رہے تھے۔ بہرحال اب یہ میرا کام ہے کہ تمھاری اس گھناؤنی سازش کے تار و پود بکھیر دوں جو تم میری حکومت کے خلاف کرنا چاہتے تھے۔"

پرتھال
قمراجنالوی قیمت:- 125/

ہولناک اور پراسرار ماحول میں جنم لینے والی ایک حقیقت جو کہانی بن گئی
ایک آشفتہ حال کی داستان عبرت جسے قانون نے مجرم بنا دیا

رقص ابلیس

انوار صدیقی
قیمت:- 150/

اردو بازار لاہور

اُمید کی آخری کرن بھی اندھیرے میں ڈوب چکی تھی لیکن میں اپنی جگہ ایک مضبوط چٹان تھا۔ اب ہم میرے لیے مزید پریشان کن ہو گئی تھی لیکن نہ جانے کیوں مجھے توقع تھی کہ میں ان حالات سے نمٹ لینے میں کامیاب ہو جاؤں گا البتہ اب فرنگیوں کو کوئی فریب دینا میرے لیے ممکن نہیں رہے گا۔

"بھولا سنگھ اور اس کے بیٹے دلیپ سے نمٹنے کے لیے میری رہائی بے حد ضروری ہے۔" میں نے کرخت لہجے میں کہا۔ "اگر یہ مہم ناکام ہو گئی تو اس کی ذمہ داری تم پر عائد ہو گی۔ یہ ویرانہ قافلے کے لیے قبرستان ثابت ہو گا۔ میری گرفتاری سب کے لیے موت کا پیغام بن جائے گی۔"

"تمھاری ہر دلیل بیکار ہے شہباز خان! ہم کسی غدار کے لیے بنائے گئے ضابطے اور قانون کی خلاف ورزی نہیں کر سکتے۔ اب تمھاری آزادی ایک ناممکن سی بات ہے۔ تمھیں حقیقت پسند بن کر یہ بات قبول کر لینی چاہیے کہ تمھارے باوقار چہرے سے نقاب اُتر چکا ہے اور تمھاری اصلیت کھل کر سامنے آ گئی ہے۔ ہم اپنے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایک دُشمن سے دست و گریبان ہوتے وقت کسی دُوسرے دُشمن سے امداد طلب نہیں کیا کرتے۔" سارجنٹ نے طنز کا وار کرتے ہوئے جواب دیا۔

میرے دل و دماغ پر فکر انگیز برف جمنے لگی اور میں یہ سوچ کر خاموش رہا کہ اب واقعی میری کوئی دلیل مجھے ان کی نظروں میں بے گناہ قرار نہیں دلوا سکتی۔ اگرچہ مجھے قوی اُمید تھی کہ ملک سکندر میری مدد کو ضرور پہنچ جائے گا مگر یہ سوال کسی نوکیلے تیر کی طرح میرے دماغ کو چھید رہا تھا کہ میں ان لوگوں کو کیسے اور کس طرح باخبر کر سکوں گا؟ یقیناً اپنے جاسوس کی طرف سے کوئی اطلاع نہ پا کر وہ حالات سے باخبر ہو جائے گا۔ اس خیال سے مجھے بے حد تقویت ملی اور میں مُسکرانے لگا۔

سارجنٹ مجھ پر نفرت انگیز نظریں ڈالتا ہُوا اپنے ساتھیوں سمیت خیمے سے رُخصت ہو گیا تو میرے کانوں سے زنجیروں کی جھنکار ٹکرائی۔ میرے خیالات کی رَو شالیار خان کی شخصیت کا احاطہ کرنے لگی اور ایک نیا فکر انگیز خیال میری رُوح کو زخمی کرنے لگا۔ اگر یہ لوگ مجھے بیا قیدی بنانے کے بعد شالیار خان کے ساتھ سخت رویئے پر اُتر آئے تو میں اس کی زندگی کے گرد منڈلانے والے خطرات کیسے دُور کروں گا؟ اپنی بے بسی اور تنہائی کا احساس کرتے ہُوئے مجھے بے اختیار مانک تالہ یاد آ گیا۔ اگر وہ زندہ ہوتا تو یہ لمحات میرے لیے اتنے پریشان کُن نہ ہوتے۔ مانک تالہ میرے لیے بہت قیمتی تھا اس کی موت کا احساس ہوتے ہی میرے دل و دماغ ایک عجیب سے سناٹے سے دوچار ہو گئے۔

احساس کی جڑیں اس قدر گہرائی تک جا پہنچیں کہ وقت گزرنے کا احساس ہی ختم ہو گیا۔ پھر اس وقت مجھے چونکنا پڑا جب سارجنٹ آرٹ دوبارہ اپنے ساتھ بیک اور والٹر کو لے کر نمودار ہُوا۔ بیک کے ہاتھوں میں کھانے کا برتن تھا۔ سارجنٹ نے ریوالور کی نمائش کرتے ہوئے میرے دونوں ہاتھ آزاد کر دیئے تاکہ میں کھانے کے دوران کوئی خطرناک حرکت نہ کر سکوں۔ ابھی تک میرا نچلا دھڑ زنجیروں سے بندھا ہُوا تھا۔ میں اپنے ہاتھوں کو جھٹکتا ہُوا اُٹھ بیٹھا۔ بیک نے کھانا میرے قریب رکھ دیا۔ اچانک ایک نفرت انگیز احساس کوندے کی طرح لپکا اور یکلخت میرے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

"سارجنٹ! کھانا واپس لے جاؤ۔ ایک قیدی کی حیثیت سے مجھے تمہارا کھانا کھاتے ہُوئے شرم آ رہی ہے۔ بھیک میں دیئے ہُوئے ان نوالوں کو اپنے حلق سے نیچے نہیں اُتار سکتا۔" میرے لہجے میں اس قدر سختی تھی کہ بیک نے کھانے کا برتن اُٹھا لیا اور پیچھے ہٹ کر سارجنٹ کی طرف دیکھنے لگا۔

"شہباز خان! کھانے سے انکار کر کے مشکلات نہ پیدا کرو۔" سارجنٹ کے لہجے میں دھندول جیسی غرّاہٹ تھی "ہم تمھاری زندگی کی داستان یہیں ختم بھی کر سکتے ہیں۔"

"تم جو کچھ کر سکتے ہو کر گزرو۔" میں نے تلخی سے جواب دیا۔ "مگر بُزدلوں کی طرح دھمکیاں دینا بند کر دو۔"

"تم نے گالی دے کر میری ذاتی ہمدردی بھی ختم کر دی ہے۔ اب تمھیں اس وقت تک کھانے سے محروم رکھا جائے گا جب تک تم ہمارے سامنے گڑگڑا کر کھانا نہیں مانگو گے۔" اس نے خوفناک لہجے میں دھمکی دی "تمھیں اپنے رویئے پر ہمارے سامنے معذرت خواہ ہونا پڑے گا۔ میں نے تمھیں حقیقت پسند بننے کا مشورہ دیا تھا مگر شاید تمھیں میری وہ بات پسند نہیں آئی۔ اب تمھیں ذہن سے اس بات کو محو کر دینا چاہیے کہ تم دوبارہ اس قافلے کے سربراہ بن سکتے ہو۔"

"سارجنٹ میں تمہارے دان کیے ہُوئے لقمے نہیں کھاؤں گا۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔ جس کھانے کو دیکھ کر نفرت اور کراہت کا احساس ہوتا ہو اُسے کوئی اپنے حلق سے کیسے اُتار سکتا ہے؟ اطمینان رکھو! شہباز خان مانگی ہُوئی روٹیوں پر زندہ رہنے کا عادی نہیں ہے۔"

سارجنٹ غصے سے ہونٹ کاٹتا ہُوا پیچھے ہٹا تو اپنے عقب میں زنجیروں کی جھنکار سُن کر اس کی آنکھوں میں اُلجھنیں اُتر آئیں۔ شالیار خان زنجیروں میں جکڑا ہُوا میرے خیمے میں آ گیا۔

"نوجوان ساتھیو!" اس نے اپنے سنگی ہونٹوں پر مسکراہٹ کی ہلکی سی لکیر بنائے ہُوئے کہا۔ "میں دیکھ رہا ہُوں کہ دو انتہائیں ایک دُوسرے سے برسرِ پیکار ہو رہی ہیں۔ تم لوگوں کے ذاتی اختلافات نے ابتدا ہی میں اس مہم پر ناکامی کی مہر ثبت کر دی ہے۔ نوجوان! میں اب تم سے سوال کر رہا ہُوں۔" شالیار خان نے مجھے نشانہ بناتے ہُوئے کہا۔ "اگر تم نے اتنے کٹھن خطرات سے گزرنے کے بعد اس نوبت کو پہنچنا تھا تو اس قدر طویل ڈراما رچانے کی کیا ضرورت تھی؟ میرا مشورہ ہے کہ ان حالات سے سمجھوتہ کر لو اور اپنے ساتھ دُوسروں کی جانیں خطرے میں نہ ڈالو.... ورنہ موت کا عفریت سب کی زندگی کا سُورج تاریک کر دے گا۔ اگر تمھیں اپنی ذات پر بھروسہ ہے تو اس وقت کا انتظار کرو جب تمھیں اپنی صفائی میں کچھ کہنے یا ثابت کرنے کا موقع ملے گا۔ اپنی مجروح اَنا کا سفر روک کر حقیقت کے ہم سفر بن جاؤ۔ ورنہ میں اس بات کا افسوس کرتا رہوں گا کہ مجھے ایک بزدل اور نکمے انسان پر بہادر اور شہ زور انسان کا دھوکا ہُوا تھا۔"

شالیار خان خاموش ہو گیا مگر اس کا ایک ایک لفظ میرے ارادوں کے نقش و نگار مرتب کرنے لگا۔

"شالیار خان! یہ بات اب تم پر واضح ہو چکی ہے کہ سارجنٹ اور اس کے ساتھیوں کی نظروں میں میری آزادی کا سُورج غروب ہو چکا ہے۔ جس پر جنرل ڈوگ نے اعتماد کا اظہار کیا تھا، اُسے ایک اوباش افسر نے موقع غنیمت جان کر اچانک زنجیروں میں جکڑ دیا ہے۔ مجھے مشورہ دینے کے بجائے تمھیں سارجنٹ کو سمجھانا چاہیے کہ یہ مجھے زنجیروں میں جکڑ کر ایک بھیانک غلطی کر رہا ہے۔ اگر ان لوگوں کو اپنی ذات پر اس قدر بھروسہ ہے کہ یہ ہر قسم کے کٹھن حالات سے نمٹنے کا حوصلہ رکھتے ہیں تو انھیں اپنے ارمان پورے کر لینے کا موقع دو۔ دُشمن تعاقب میں لگا ہُوا ہے اور سارجنٹ نے مجھے زنجیروں میں جکڑ کر قافلے کی قیادت خود سنبھالنے کا فیصلہ کر لیا ہے تو میں اس وقت کا انتظار کرنے کے لیے تیار ہُوں جب اسے اپنے کیے پر خود ہی پشیمان ہونا پڑے گا۔ میں ان سب کی پیشانیوں پر بھیانک موت کا نقش دیکھ رہا ہُوں۔"

میرے لہجے میں یقین کی گہری جھلک پا کر سارجنٹ قدرے متغیر نظر آنے لگا۔ پھر رفتہ رفتہ اس کی آنکھوں میں تیرتی ہُوئی حیرت کی جگہ نفرت اور سختی کا رنگ جھلکنے لگا۔ "شہباز خان! اب تمھارے لیے دوسرے لوگوں کی فکر کرنے کا وقت گزر چکا ہے۔ شالیار خان کو سمجھاؤ کہ وہ مداخلت کر کے ہماری نفرت کا خریدار نہ بنے ورنہ اس کا مستقبل بھی تمھاری ذات کے ساتھ وابستہ کر دیا جائے گا۔ مہم ناکام ہو یا کامیاب، تمھاری ذات کے لیے کوئی پہلو بھی کارآمد ثابت نہیں ہو سکتا۔ تمھیں اب میرے فیصلوں کا پابند رہنا ہو گا ورنہ تم دونوں کی زندگی کی کوئی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔"

اس کا نفرت انگیز لہجہ میرے غصے کو ہوا دے رہا تھا مگر میں خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔

تنہا رہ جانے پر رات کا پھیلا ہُوا سکوت اور دردناک ہو گیا۔ درد و کرب کی اَن گنت منزلوں سے گزرنے کے بعد جب نیا سویرا طلوع ہُوا تو سورج کی طلائی کرنیں میرے لیے اپنی کشش کھو چکی تھیں۔ اندھیرا رُخصت ہوتے ہی وہ سورج بھی طلوع ہو گیا تھا جس کی روشنی میں میرے لیے ذلت کا سامان پوشیدہ تھا۔

قافلہ بیدار ہو چکا تھا۔ باہر میدان میں الاؤ کے قریب لوگوں کی باتیں کرنے کی دھیمی آوازیں کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ میں سمجھ گیا کہ کچھ لوگ ناشتے کی تیاری میں مصروف ہیں۔ اپنی گرفتاری کے بعد میرے خیمے میں سارجنٹ کے فرنگی ساتھیوں کے علاوہ شالیار خان مجھے زنجیروں میں بندھا ہُوا بے بسی کی حالت میں دیکھ چکا تھا۔ اب مجھے یہ احساس چوکے لگا رہا تھا کہ اگر سفر کے دوران بھی ان لوگوں نے مجھے ان بھاری زنجیروں سے آزاد نہ کیا تو کیا ہو گا؟ معاً کانوں سے زنجیروں کی ہلکی سی جھنکار ٹکرائی تو میں خیالات کے سمندر سے اُبھر کر زندگی کی تلخ اور زندہ حقیقتوں کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔

شالیار خان زنجیریں پہنے میرے خیمے کے باہر کھڑا اندر جھانک رہا تھا۔ اس کے پیچھے جوگندر سنگھ ناشتہ اُٹھائے ہُوئے تھا... جوگندر سنگھ اپنے سابق لیڈر کے ہاتھ زنجیروں سے آزاد کر دو تاکہ یہ اطمینان سے ناشتہ کر سکے۔" شالیار خان کا اشارہ پا کر وہ آگے بڑھا اور ناشتے کا برتن میز پر رکھ کر میرے ہاتھ آزاد کرنے لگا۔ اس دوران اس نے میرے چہرے کی جانب ایک بار بھی نہیں دیکھا بلکہ خاموشی سے اپنا کام سرانجام دے کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

"نوجوان! ناشتہ کر لو تاکہ قافلہ اپنی منزل کی سمت آگے بڑھ سکے۔" شالیار خان نے اپنے ہونٹوں کے درمیان مُسکراہٹ کی ہلکی سی لکیر نمودار کرتے ہُوئے مجھے مخاطب کیا۔

"شالیار خان! ابھی میرے جسم میں اتنی قوت باقی ہے کہ میں مسلسل کئی روز فاقہ کشی کے عالم میں گزر سکتا ہُوں۔" میں نے ایک طویل سانس لیتے ہُوئے جواب دیا۔ "تم واقعی ایک اعلیٰ ظرف دشمن ہونے کا ثبوت دے رہے ہو۔"

"نوجوان! اس سفر کا آغاز کرنے سے پہلے تم نے مجھ سے تعاون کی درخواست کی تھی اور تمھیں یہ بھی یاد ہو گا کہ میں نے تمہاری اس درخواست کو مسترد نہیں کیا تھا۔ اب ویسی ہی تعاون کی درخواست میں تم سے کر رہا ہوں۔ میری دلی تمنا ہے کہ میں اپنی ہاری ہُوئی جنگ جیت کر ایک طویل عرصے بعد اپنے قبیلے کے لوگوں سے جا ملوں اور

پراسرار اور خوفناک کہانیاں جنھیں
پڑھتے ہوئے آپ چونک اٹھیں گے
انوار صدیقی کے پراسرار قلم سے
آسیب زدہ قیمت =/110
دستک قیمت =/100
مکتبہ القریش سرکلر روڈ اردو بازار لاہور
فون 7668958

اپنی زندگی ایک نئے انقلاب کے سانچے میں ڈھال دوں۔ مگر تم نے اپنے ساتھ میری زندگی کے لیے بھی خطرات پیدا کر دیے ہیں۔ تمھاری گرفتاری نے سارے قافلے میں سخت ہیجانی حالت پیدا کر دی ہے میرا تجربہ کہتا ہے کہ تمھارے بغیر یہ قافلہ کبھی اپنی منزلِ مراد کو نہیں چھُو سکے گا۔ میں تمھیں اس وقت تک زندہ دیکھنے کا خواہش مند ہوں کہ جب یہ تباہ شدہ قافلہ دُشمن سے عبرت ناک شکست کھانے کے بعد دوبارہ تمھاری طرف دیکھنے پر مجبور ہو جائے گا۔ مجھے یقین ہے کہ سارجنٹ جو اس وقت خود کو بہت بڑا فاتح خیال کرتا ہے، دُشمن سے ایک جھڑپ کے بعد بے دست و پا ہو جائے گا۔ صرف اسلحے کے انباروں سے کوئی مہم کامیابی سے ہمکنار نہیں ہُوا کرتی۔"

"میں تمھاری ان دانش مندانہ باتوں کو بہت قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہُوں۔" میں نے تلخی سے جواب دیا۔ "مگر ایک قیدی کی حیثیت سے مجھے تمھاری باتیں قابلِ قبول نہیں ہیں۔ شالیار خان! تم نے صحرائی اونٹ کے بارے میں سُنا ہو گا۔ وہ چلچلاتی ہُوئی دھوپ میں ہفتوں بھُوکا پیاسا رہنے کے باوجود اپنی رفتار میں کمی نہیں آنے دیتا! میں نے پتھروں کے درمیان جنم لیا ہے اور جس ماں کی آغوش میں آنکھ کھولی ہے اس نے میرے وجود کو زمانے کی سختیاں برداشت کرنے کا عادی بنا دیا ہے۔ مرنا مارنا میرے لیے ایک معمولی کھیل ہے۔ میں بے دست و پا ہونے کے باوجود اپنے ایک دُشمن کو خود پر رحم کھاتے نہیں دیکھ سکتا۔ میں اس وقت تک اُن کا کھانا نہیں کھاؤں گا۔ جب تک اُن کو اپنی آنکھوں کے سامنے پشیمان ہوتے نہیں دیکھ لیتا۔"

میرے لہجے میں بے پناہ وحشت تھی۔ شالیار خان سنجیدگی کا پیکر بنا مجھے گہری نظروں سے دیکھتا رہا۔ پھر وہ اپنے جسم کے گرد لپٹی ہُوئی زنجیروں کی جھنکار بلند کرتا ہُوا گونج دار سسکیوں کے ساتھ خیمے سے نکل گیا۔

قافلہ سفر کا آغاز کرنے کے لیے تیار ہو گیا تو سارجنٹ اپنے ساتھ دو جوانوں کو لے کر آ گیا۔ اس نے آتے ہی میرے ہاتھ آزاد کر دیے۔ ہاتھ آزاد ہوتے ہی میں اُٹھ بیٹھا اور اپنے ہاتھوں کو خون کی گردش بحال کرنے کی غرض سے ہلکے ہلکے جھٹکے دینے لگا۔ دونوں ہاتھ رات بھر بندھے رہے تھے اس لیے ان پر زنجیروں کے نشان پڑ گئے تھے اور جلد کی رنگت ہلکی سی نیلاہٹ ظاہر کرنے لگی تھی۔

ایک نوجوان میری ٹانگوں کو زنجیروں کی قید سے آزاد کرنے کے لیے جھکا ہی تھا کہ سارجنٹ نے تیزی سے آگے بڑھ کر ایک بھاری زنجیر میرے گلے میں ڈال دی اور گردن کے گرد ایک بل دے کر مجھے گردن جھُکانے پر مجبور کر دیا۔ وہ زنجیروں کو آہستہ آہستہ حرکت دیتے ہُوئے میری پشت پر پہنچ گیا۔ غلامی کا طوق گردن میں پڑتے ہی میری رُوح میں انتقام کی طوفانی لہریں اُبھر آئیں۔ مگر حالات نے مجھے انتقام کی ان شدید لہروں کو اپنی ہی ذات میں دفن کرنے پر مجبور کر دیا۔ مجھے اس وقت مکمل صبر و تحمل کی ضرورت تھی تاکہ عیّار دُشمن کی گھناؤنی کارروائیوں سے اپنا وجود سلامت رکھ سکوں۔

میرا بالائی دھڑ زنجیروں میں باندھ کر سارجنٹ کی آنکھوں میں طنز کی آگ روشن ہو گئی اور وہ پُرلطف انداز میں مُسکرا کر بولا۔ "تمھارے ہاتھوں اور پیروں کو آزاد کر کے میں نے تمھیں سفر کرنے کی سہولت دے دی ہے لیکن اگر تم نے اپنی اس آزادی کا غلط استعمال کیا تو اس کے نتائج تمھارے حق میں ہولناک ثابت ہوں گے۔ اب تم اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو۔"

میں نے بڑے تحمل سے سارجنٹ کی یہ دھمکی سُنی اور ٹانگوں کو آہستہ آہستہ حرکت دے کر اپنے پاؤں زمین پر جما دیے اور اپنے وجود کو جھٹکا دے کر کھڑا ہو گیا۔ بدن کے گرد لپٹی ہُوئی زنجیریں اس قدر بھاری تھیں جیسے کوئی وزنی چٹان اُٹھا کر میرے کندھوں پر رکھ دی گئی ہو۔ جب میں گھسٹتی ہُوئی زنجیروں کے درمیان آہستگی سے قدم اُٹھاتا خیمے سے باہر آیا تو سارے قافلے کی نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ البتہ شالیار خان کی آنکھوں سے بے حسی کا دھواں اُٹھتا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کی خاموش آنکھیں مجھے حالات کے سامنے ڈٹ جانے پر اُکسا رہی تھیں۔

"دونوں قیدی قافلے کے آگے آگے چلیں گے اور سارے جوانوں کو حکم دیا جاتا ہے کہ ان میں سے کسی کو بھی فرار کی کوشش کرتا پائیں تو بے دریغ اپنی رائفل کی گولی اس کے جسم میں داخل کر دیں۔" سارجنٹ کی غضب ناک آواز میں درندوں جیسی غرّاہٹ تھی۔

میں نے اس کی دھمکی بڑے سکون سے سُنی اور گھوڑے پر سوار ہو گیا لیکن بھاری زنجیریں میرے بدن کو کاٹنے لگیں تو مجھے گھوڑے پر سفر کرنا مشکل نظر آنے لگا اور گھوڑے کی لگاموں پر میرے ہاتھ ڈھیلے پڑنے لگے۔ میں جونہی تن کر بیٹھنے کی کوشش کرتا بھاری زنجیروں کا حلقہ مجھے دوبارہ جھکنے پر مجبور کر دیتا۔ میری جسمانی تکلیف شالیار خان کی عقابی نظروں سے پوشیدہ نہ رہ سکی لیکن اس نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

میرے کندھے بوجھ سے جھکے جا رہے تھے لوہے کی بھاری ہُوئی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

زنجیریں میرے جسم کے ساتھ رگڑ کھاتی ہوئی جب مجھے زخمی کرنے لگیں تو خود اعتمادی کا احساس میرے ذہن میں جڑ پکڑنے لگا۔ رفتہ رفتہ یہ جسمانی تکلیف میرے ذہن سے خود بخود ہی محو ہونے لگی۔

سورج کا گولا موسم کی تبدیلی کی گواہی دیتا ہُوا بادلوں کی اوٹ میں پوشیدہ ہو گیا مگر میں نے اپنے گھوڑے کی رفتار کم نہیں کی اور سر لیے چھیلتی ہوئی تاریکی میں گھوڑا دوڑاتا رہا۔ اپنے عقب میں اُبھرنے والی گھوڑوں کی ٹاپوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس ناہموار علاقے کا سفر بڑی تیزی سے طے ہو رہا ہے۔ ایک وسیع چٹان عبور کرتے ہی ایک ڈھلان کی جانب اچانک راستہ گھوم گیا۔ جس تیزی سے میں گھوڑا دوڑاتا آ رہا تھا، ڈھلان پر چند قدم اُترتے ہی گھوڑے کا ایک پاؤں رپٹ گیا اور مجھے ایک پتھریلی چٹان پر گراتا ہُوا، قلابازی کھاتا مجھ سے دُور جا گرا۔

گرتے وقت میں نے اپنے ہاتھ پاؤں سمیٹ لیے تھے۔ میرے بدن کے گرد لپٹی ہوئی زنجیریں ایک بلند جھنکار کے ساتھ چٹان سے ٹکرائیں اور مجھے یوں محسوس ہُوا جیسے میری ساری ہی ہڈیاں کڑکڑا اُٹھی ہیں۔ اتنی دیر میں شالیار خان گھوڑے سے اُتر کر میرے قریب آ چکا تھا۔ مجھے لڑکھڑا کر اُٹھتے ہُوئے دیکھ کر بولا۔ "نوجوان زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟" اس نے ہاتھ بڑھا کر میری قمیص کے بٹن کھول دیے تاکہ میری اُلجھی ہوئی سانسیں درست ہو سکیں۔ مگر میرا سینہ زخموں سے بھرا دیکھ کر وہ چونک پڑا۔ میرا سارا جسم خون میں تر ہو چکا تھا۔

میں خاموشی سے ڈھلان میں اُترتا ہُوا اپنے گھوڑے کے قریب چلا گیا جو پتھروں کے درمیان قلابازی کھانے کے باوجود محفوظ تھا اور پسینے میں شرابور میرا انتظار کر رہا تھا۔ گھوڑے پر سوار ہوتے وقت میرے بدن سے لپٹی ہُوئی زنجیریں ایک بار پھر بلند آہنگ سے بج اُٹھیں تو میرا وجود ناقابلِ برداشت تکلیف کی لہروں کی لپیٹ میں آ گیا۔ زخموں سے اُٹھنے والی ٹیسیں اس قدر تکلیف دہ تھیں کہ میں وحشیانہ انداز میں اپنی گردن کو جھٹکے دینے پر مجبور ہو گیا۔ اس دوران میں شالیار خان اپنے گھوڑے پر سوار میرے برابر پہنچ چکا تھا۔

میرا حشر دیکھ کر قافلے کا ہر فرد محتاط ہو گیا تھا اس لیے کسی کو ڈھلان سے اُترتے وقت کوئی نقصان نہ پہنچا اور قافلہ خیریت سے گزر گیا۔ میں اور شالیار خان اپنے گھوڑے دوڑاتے ہُوئے قافلے کے آگے آگے چلتے رہے۔ زنجیروں سے پیدا ہونے والی رگڑ میرے زخموں پر قیامت ڈھا رہی تھی لیکن یہ عذاب جھیلنا ایک مجبوری تھی۔ اس لیے میں اسے برداشت کرتا رہا۔

خون کی دھاریں جسم کے ہر اس حصّے سے پھُوٹ رہی تھیں جو زنجیروں کے ساتھ رگڑ کھاتا جا رہا تھا۔ گریبان سے اُٹھتی ہوئی خون کی بُو نے میرے حواس پر ضربیں لگانا شروع کر دیں اور میرا مزاج آتشِ انتقام کی زیادتی سے بگڑنے لگا۔ معدے میں لگی آگ بھی بڑھ رہی تھی لیکن میرے حواس پوری طرح کام کر رہے تھے۔ ایسی تکلیفوں کے لیے ہی مجھے ماں رشم جان نے کُندن بنایا تھا۔

ابھی دریا کے کنارے ایک ناہموار راستے پر ہمارا سفر جاری تھا کہ بڑھتی ہُوئی تاریکی تیز بارش کا رُوپ دھار کر سامنے آ گئی۔ قافلہ رُکنے پر مجبور ہو گیا۔

سب سے پہلے خیمے نصب کر کے بارش سے بچنے کا انتظام کیا گیا پھر دو درختوں کے درمیان ایک ترپال باندھ کر اس کے نیچے الاؤ روشن کر دیا گیا۔ گھوڑے سے اُتر کر میں اپنے لیے مخصوص خیمے میں پہنچا اور بے دم ہو کر بستر پر گر پڑا۔ اس خیمے کے باہر دو مسلح آدمی موجود تھے۔

گزشتہ چوبیس گھنٹے سے میرا پیٹ خالی تھا۔ اُوپر سے سفر کی تکان اور زنجیروں سے پیدا ہونے والے زخموں سے اُٹھتی ٹیسوں نے چند لمحات کے لیے مجھے دُنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیا لیکن اس بے خبری کا وقت عارضی اور مختصر نکلا۔ ساتھ والے خیمے میں شالیار خان کی زنجیروں کی آواز سُن کر میری نیند اچاٹ ہو گئی۔ اپنے بابا کا خیال آیا تو میں یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ میں جوان اور طاقت ور ہونے کے باوجود ایک دن کی تکلیف سے اس قدر بے حال ہو رہا ہُوں۔ جس شخص کے سالہا سال بھاری زنجیروں کا

ایک پُراسرار مورتی کے حصول کے لئے ہونے والے خوفناک معرکے کا احوال

خبیث

انوار صدیقی کے پُراسرار قلم سے

5 حصوں میں مکمل سیٹ =/200 روپے

مکتبہ القریش سرکلر روڈ اردو بازار لاہور

فون 7668958

بوجھ اُٹھانے میں گزر گئے ہیں اس کی جسمانی تکلیف کا عالم کیا ہوگا اور اس کے دل و دماغ کیسے کیسے المناک لمحوں سے دوچار رہتے ہوں گے۔ اس کا جسم آزمائش کی کیسی کیسی کٹھن سُولیوں پر لٹکایا گیا ہوگا۔ مگر آفرین ہے کہ اس نے ایک بار بھی کسی کے سامنے اپنی تکلیف کا اظہار نہیں کیا۔ اس کی شخصیت یقیناً مجھ سے بلند اور طاقتور تھی جو سالوں تک فرنگیوں کے عذاب سہتی رہی مگر جھکنے پر آمادہ نہ ہو سکی۔

برتنوں کی کھنک سے احساس ہوا کر قافلے میں کھانا تقسیم کیا جا رہا ہے۔

بارش اور طوفان سے ماحول سیاہ تاریکی میں ڈوبا ہُوا تھا۔ اچانک زنجیروں کی جھنکار اپنے قریب محسوس کر کے میں نے نگاہ اُٹھا کر دیکھا تو شالیار خان قہوے کا ایک مگ اُٹھائے کھڑا تھا۔ اس کے بالوں سے بارش کے قطرے ٹپک رہے تھے اور لباس گیلا ہو کر بدن سے چپک رہا تھا۔

"نوجوان! گزشتہ چوبیس گھنٹے سے تمھارے حلق سے کوئی شے نیچے نہیں اُتری۔ بھوک اور سفر کی تکان اگرچہ تمھارے چہرے سے عیاں نہیں لیکن تم انسان ہو کوئی مشین نہیں ہو اس لیے قہوے کے چند گھونٹ پی لو۔ اس سے تمھیں خود کو بحال رکھنے میں مدد ملے گی۔" اس کا پتھریلا چہرہ نرمی کے آثار ظاہر کرنے لگا اور بھیگے ہُوئے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ مچلنے لگی۔

"شالیار خان! تمھارا ہمدردانہ رویہ مجھے بار بار اُلجھن میں ڈال رہا ہے۔" میں نے جواباً نرمی سے کہا۔ "کہیں ایسا تو نہیں کہ تم میرے ساتھ ہمدردی کا اظہار کر کے اپنے کسی نامعلوم جذبے کی تسکین کر رہے ہو... مگر اس بار میں تمھیں ناراض نہیں کروں گا۔ نہ جانے کیوں میرا جی چاہتا ہے کہ میں تمھارے اس خلوص کو قبول کر لوں۔"

یہ کہتے ہُوئے میں نے خود پر بہت جبر سے کام لیا ورنہ میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو رہا تھا۔ آخر وہ میرا باپ تھا اور میں نے اُسی کے لیے یہ سارے جتن کیے تھے۔

میرے جواب نے شالیار خان کی طبیعت میں حیرت انگیز انقلاب پیدا کر دیا۔ اس نے آگے بڑھ کر قہوے کا مگ میرے ہاتھوں میں تھما دیا اور سرگوشیوں میں کہا۔ "مجھے خوشی ہے کہ تم نے میری ہمدردی کا مقصد آسانی سے سمجھ لیا ہے۔ آج تمھاری قید کا پہلا دن تھا۔ میں پُرانا قیدی ہونے کی حیثیت سے جانتا ہُوں کہ جب پہلی بار کسی کو قیدی بنا کر زنجیروں سے جکڑا جاتا ہے تو اس کا جسم اور روح دونوں بے بسی کے خوفناک عذاب کی زد میں آ جاتے ہیں۔ اس عذاب کے سامنے بڑے بڑے طاقتور اور تندرست انسان گھبرا کر چلا اُٹھتے ہیں اور گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ تم نے میری بات مان کر اپنی جان کو اس بھیانک عذاب کی زد سے نکال لیا ہے۔"

میں جواباً مسکراتا رہا۔

"نہ جانے کیا بات ہے۔" اس نے سرگوشی کی۔ "کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا ہے جیسے تم میرے دشمن نہیں بلکہ اپنے ہو۔ تمھیں میری ذات سے گہری دلچسپی ہے اور..." اس نے جملہ اُدھورا چھوڑ دیا اور خالی خالی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

میں نے شالیار خان کے مگ سے دو گھونٹ لے کر اس کی بات پوری کر دی اور وہ باقی قہوہ پی کر ہتھیلی کی پشت سے منہ پونچھتا ہُوا میرے خیمے سے نکل گیا۔ میں دیر تک بے حرکت لیٹا رہا اور میرے کانوں میں میرے بابا کے الفاظ گونجتے رہے پھر نہ جانے کب میرا تھکن سے چُور چُور بدن دُنیا و مافیہا کی اُلجھنوں سے آزاد ہو کر گہری نیند میں ڈوب گیا۔ اس بار بھی رات کے کسی پہر اچانک میری آنکھ کھل گئی۔

شعور بیدار ہوتے ہی بارش کی تیز بوچھاڑ خیمے میں آتی محسوس ہُوئی۔ میں آہستگی سے اُٹھا اور زنجیروں کی ہلکی سی جھنکار بلند کرتا ہُوا خیمے کے اُٹھے ہُوئے پردے کو درست کرنے لگا۔ معاً سناٹے کو مجروح کرتی ہُوئی ایک عجیب اور ناقابلِ فہم آواز اُبھری اور سناٹے کے جگر میں اُتر گئی۔ اس آواز کے اُبھرتے ہی گھوڑے خوف کی حالت میں ہنہناتے ہُوئے زمین پر ٹاپیں مارنے لگے۔

گھوڑوں کی ٹاپوں کے شور میں ایک اُلّو کی مکروہ آواز بلند ہُوئی۔ اس کے بعد آس پاس کے خیموں سے باتوں کی آواز اُبھری گویا سب لوگ بیدار ہو گئے تھے۔ فوراً ہی سارجنٹ کی تیز آواز اپنے جوانوں کو ہوشیار رہنے کی تلقین کرتی ہُوئی سُنائی دی۔ میں نے خیمے کا پردہ اُٹھا کر دیکھا تو شالیار خان بھی بارش میں بھیگتا ہُوا خیمے سے نکل کر الاؤ کی طرف بڑھ رہا تھا۔

خشک لکڑیاں ڈال کر الاؤ کی آگ کو پہلے سے زیادہ تیز کر دیا گیا اور کچھ جوان بارش میں بھیگتے ہُوئے گھوڑوں کے خوفزدہ ہونے کی وجہ معلوم کرنے کے لیے آگے بڑھے تھے کہ اچانک ایک گھوڑا بڑے کربناک انداز میں ہنہنایا اور اُچھل کر ایک دھماکے سے زمین پر گر گیا۔ اس کے ساتھ ہی رائفل کی گولیوں کے دھماکے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سُنائی دیے اور خاموشی چھا گئی۔ اب بارش کی ٹپ ٹپ کے سوا کوئی آواز سُنائی نہیں دے رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ رائفل کے ان دو دھماکوں نے اس چیز کا خاتمہ کر دیا ہے جو گھوڑوں کو خوفزدہ کر رہی تھی۔

کچھ دیر بعد قدموں کی آوازیں دوبارہ سُنائی دیں اور کسی نے کہا۔ "سارجنٹ! میں نے اس موذی کا خاتمہ کر دیا ہے جس نے ہمارے ایک گھوڑے کو موت کی نیند سُلا دیا تھا۔ وہ ایک خطرناک سانپ تھا جس نے ہمارے ایک گھوڑے کو ڈس لیا ہے۔"

"مگر اُلّو کی آواز کا راز بے نقاب ہونا باقی ہے۔" سارجنٹ نے کہا۔

"اس طوفانی بارش میں کسی دشمن کی یلغار کے امکانات بہت کم ہیں۔" ایک ساتھی نے اعتراض کیا۔

"شالیار خان! تم بتاؤ کہ اس آواز کو سُن کر ہمیں کیا نتائج اخذ کرنے چاہییں؟" سارجنٹ کی آواز سُنائی دی۔

"میرا خیال ہے یہ آواز بے معنی نہیں ہے۔" اس نے جذبات سے عاری لہجے میں جواب دیا۔ "تمھیں اپنے جوانوں کو کسی خطرے سے نمٹنے کے لیے مستعد رکھنا چاہیے جو لوگ اس طوفانی بارش میں اپنی پیغام رسانی جاری رکھے ہُوئے ہیں، ان کے عزائم ہماری توقع سے بڑھ کر خطرناک بھی ثابت ہو سکتے ہیں۔"

شالیار خان کے اس ہولناک تبصرے پر قافلے میں ہلکی سی اضطراب کی لہر دوڑ گئی اور ہر شخص کچھ نہ کچھ بولنے لگا۔

میں نے خیمے کا پردہ گرا دیا اور پلٹ کر اپنے بستر پر آ بیٹھا۔

ابھی رات کا کافی سفر باقی تھا۔ میں بستر پر دراز ہو کر ملک سکندر کے ان آدمیوں کے بارے میں سوچتا رہا جنھیں میری گرفتاری کی خبر مل جاتی تو وہ یقیناً مجھے ان بھاری زنجیروں سے آزاد کرانے کی بھرپور کوشش کرتے۔ مگر یہ حالات کی ستم ظریفی تھی کہ اب میرے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں تھا جو اُن لوگوں تک میری گرفتاری کی خبر پہنچا تا۔

اچانک شپ شپ کی آوازوں کے ساتھ کوئی مجھے اپنے خیمے کے سامنے رُکتا محسوس ہُوا۔ خیمے کا پردہ ہٹاتے ہی سارجنٹ اور ریک کا بھیگا ہُوا چہرہ دکھائی دیا۔ دونوں خیمے میں آ کر اپنی برساتیاں اُتار کر انھیں نچوڑنے کے لیے بل دینے لگے۔ اس کام سے فارغ ہو کر سارجنٹ نے میری طرف دیکھتے ہُوئے کہا۔ "شہباز خان! تمھیں اسی بستر پر باندھا جائے گا۔ حالات سازگار نہیں ہیں اس لیے میں کوئی خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں۔"

میں نے سُلگتی ہُوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور تلخ انداز میں مسکراتا ہُوا بستر پر دراز ہو گیا۔ اس نے مجھے بیڑیاں پہنا دیں اور ایک زنجیر کو لپیٹ کر اس طرح باندھا کہ مجھے اپنی ٹانگوں میں خون کی گردش رُکتی محسوس ہونے لگی۔

"تمھارے ہاتھ اس لیے آزاد رکھے جا رہے ہیں کہ تم بڑھتی ہُوئی سردی سے اپنا جسم ڈھانپ کر محفوظ رکھ سکو لیکن اگر تم نے ان ہاتھوں کا غلط استعمال کیا ان کی آزادی بھی سلب کر دی جائے گی۔" سارجنٹ آرٹ نے بڑے مغرور انداز میں اپنا دھمکی آمیز حکم سُنایا۔

میں غصّے کی شدت سے دانت پیس کر رہ گیا۔

ان کے جاتے ہی میں نے اپنی ٹانگوں پر کمبل ڈالا اور انھیں اچھی طرح ڈھانپ لیا۔ میرے وجود پر زلزلے کی سی کیفیت طاری تھی۔

معاً رائفل کا ہولناک دھماکا میرے کانوں سے ٹکرایا۔ بارش کی ٹپ ٹپ کی آوازیں معدوم ہو چکی تھیں۔ مسلسل بارُودی دھماکوں سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ قافلے پر حملہ ہو چکا ہے اور باہر ایک خوفناک جنگ شروع ہو گئی ہے۔ خوفناک دھماکے مجھے اپنے قالب میں گونجتے محسوس ہونے لگے۔ میں اپنے بوڑھے باپ کی سلامتی کے بارے میں فکرمند تھا جو سارجنٹ کے ساتھیوں کے ساتھ باہر تھا۔

ایک جنگ میرے خیمے سے باہر قافلے پر ہولناک سائے ڈالے ہُوئے تھی اور دشمن قافلے پر موت کی آگ برسا رہا تھا۔ مگر ایک جنگ میرے اندر شروع ہو گئی تھی۔ میں زندگی کے مقتل میں بُری طرح زخمی ہو رہا تھا۔ اگر یہ ملک سکندر کا حملہ تھا تو میرے لیے فکر کی کوئی بات نہیں تھی لیکن اگر لٹیرے حملہ آور ہُوئے تھے تو اس طرح بندھے پڑے رہنے سے سوائے مرنے کے اور کچھ بھی ممکن نہ تھا۔ دفعتہً مجھے اپنے خیمے کے باہر کسی کی ہولناک چیخ سُنائی دی۔

رائفلوں کے دھماکوں میں پہلے سے کہیں زیادہ تیزی آ گئی تھی اور اب وقفے وقفے سے لوگوں کے چیخنے اور کراہنے کی دردناک آوازیں سُنائی دینے لگی تھیں۔

سارے قافلے میں زبردست بھگدڑ مچی ہُوئی تھی۔

اگر میری ٹانگیں آزاد ہوتیں تو میں اس منظر کو ضرور دیکھتا جس کا ہلکا سا خاکہ میرے ذہن میں موجود تھا۔ الاؤ کے قریب

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

زمین کا سینہ کوٹنے لگے اور پھر اپنی اس اچھل کود کے دوران اُنھوں نے رسّے تڑوا لیے اور اپنے استھان سے نکل کر وہ پڑاؤ میں افراتفری پیدا کرنے کا سبب بن گئے۔

وہ وحشیانہ انداز میں اِدھر اُدھر بھاگتے ہُوئے بالآخر اپنے سواروں کے لیے پورس کے ہاتھی ہی ثابت ہونے لگے۔ ان کی اس اندھا دھند بھاگ دوڑ نے قافلے کے دفاعی مورچوں کو گرا دیا۔ دو گھوڑے میرے خیمے کی طنابیں توڑتے ہُوئے آگے نکل گئے۔ میں شالیار خان کے ساتھ خیمے سے نکل آیا تھا اور ہم نے برستے ہُوئے شراروں سے بچنے کے لیے خود کو زمین پر گرا رکھا تھا۔

خوفزدہ گھوڑے پلٹ کر ہماری طرف آ رہے تھے۔ وہ گولوں کی فائرنگ کے سامنے جس وحشت کا مظاہرہ کر رہے تھے، یہ آلودہ کی سازش کا نتیجہ تھا۔ میں دل ہی دل میں دُعا کر رہا تھا کہ حملہ آور ملک سکندر کے ساتھی ہی ہوں۔

وحشت زدہ گھوڑوں کی ٹاپیں اپنے قریب سُن کر شالیار خان حلق کے بل چیخ پڑا: "نوجوان! سنبھل کر رہو۔ ورنہ ہم گولیوں سے بچ بھی گئے تو خوفزدہ گھوڑے ہمارے جسموں کے چیتھڑے اُڑا دیں گے۔"

"فکر نہ کرو۔ میں ہوشیار ہُوں۔" میں نے کہا۔

معاً گھوڑوں نے رُخ بدلا اور دوسری طرف دوڑتے چلے گئے۔ اسی لمحے ایک گولی ہمارے قریب ہی زمین میں دھنس گئی۔ پھر یکے بعد دیگرے کئی گولیاں ہم سے کچھ فاصلے پر گرے ہُوئے خیمے کے مختلف حصوں میں پیوست ہو گئیں۔ میں نے یکایک خود کو کروٹ لینے کے انداز میں ڈھلان کی طرف لڑھکا دیا اور اپنے ساتھ شالیار خان کو بھی لیتا ہُوا ڈھلان پر لڑھکتا چلا گیا۔ خیمے میں آگ لگ چکی تھی۔

ڈھلان میں آتے ہی ہم گولیوں سے محفوظ ہو گئے تو شالیار خان نے میرا ہاتھ ہٹا کر خود کو الگ کیا اور بولا: "میں رائفل لینے جا رہا ہُوں تم یہیں پڑے رہو۔"

میں نے ایک دم اس کا ہاتھ تھام کر اُسے آگے بڑھنے سے روک دیا اور کہا: "شالیار خان! برستی گولیاں کسی کا لحاظ نہیں کرتیں اور خود کو ہلاکت میں ڈالنا دانش مندی نہیں ہے۔"

شالیار خان کی سلگتی ہُوئی آنکھیں میرے چہرے پر جم گئیں لیکن وہ خاموش میرے قریب ہی پڑا رہا۔

ڈھلان میں آ جانے کے باعث ہم پتھراؤ کی حالت سے بے فکر ہو گئے تھے لیکن ابھی تک فائرنگ جاری تھی اور فضا میں دُودھیا اُجالا تیزی سے برفانی چوٹیوں پر اپنے قدم جما رہا تھا۔ اس پھیلتے ہُوئے اجالے کو دیکھ کر شالیار خان کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک عود کر آئی اور وہ مجھے متوجہ کرتے ہُوئے بولا۔

"میرا خیال ہے، صورتِ حال ہمارے حق میں بتدریج بہتر ہو رہی ہے۔ قافلے کے لوگوں کی مزاحمت برائے نام رہ گئی ہے حملہ آوروں کے قدم جمانے سے پہلے پہلے ہمیں خود کو مسلح کر لینا چاہیے! ایک دُشمن کے ختم ہوتے ہی ہمیں دوسرے دُشمن کا سامنا کرنا پڑے گا۔ جو ممکن ہے فرنگیوں سے زیادہ تنگ دل اور انتہا پسند ہو۔ کیا تم داؤد خان کی بستی کی طرف واپس چلنا پسند کرو گے؟ مجھے یقین ہے کہ وہ ہماری مدد کرنے کے لیے تیار ہو جائے گا۔"

"تمھاری تجویز بہت عمدہ ہے۔" میں نے نرمی سے جواب دیا۔ "مگر میں اس پر اس وقت تک عمل کرنے کے لیے تیار نہیں ہو سکتا۔ جب تک یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں نہ ہو جائے کہ حملہ آور کون ہیں۔"

میرے لہجے میں سکون کی جھلک پا کر شالیار خان کی آنکھوں سے اُلجھنیں جھانکنے لگیں۔

"نوجوان! تمھاری آواز میں جھلکتا ہُوا سکون مجھے چونکا رہا ہے۔" اس نے آواز دھیمی رکھتے ہُوئے کہا۔ "تم یہ کیوں معلوم کرنا چاہتے ہو کہ حملہ آور کون ہیں؟ وہ کوئی بھی ہوں، تمھارے دوست نہیں ہو سکتے۔ تم جس اعتماد کا شکار ہو اس کی بنیادیں بہت کمزور ہیں۔ جن لوگوں نے قافلے کی طاقت منتشر کر کے رکھ دی ہے۔ ان پر بھروسہ کر کے تم اپنی زندگی کی آخری غلطی کرو گے تم کیا سمجھتے ہو کہ تمھارے ساتھ میں بھی اپنی جان ہلاکت میں ڈال دوں اور کسی نئے دُشمن سے زندگی کی بھیک مانگنے پر مجبور ہو جاؤں؟"

میں ابھی جواب دینا ہی چاہتا تھا کہ ایک کرخت آواز سُن کر چونک پڑا۔ پلٹ کر اپنے عقب میں دیکھا تو چار اجنبی دکھائی دیے جن کی رائفلیں ہماری جانب اٹھی ہُوئی تھیں۔

"خبردار! اگر تم میں سے کسی نے حرکت کی تو چیتھڑے اُڑا دیں گے۔" ان میں سے ایک نے دھمکی دی۔

ہم بے حرکت ہو گئے۔

ان کے تیور ظاہر کر رہے تھے کہ اگر ہم نے مزاحمت کا ارادہ ظاہر کیا تو وہ رائفل کا گھوڑا دبانے میں دیر نہیں کریں گے۔

"اپنے ہاتھ سر سے بلند کر کے ہمارے آگے آگے چلو۔ ہمارا سردار تم سے ملنا چاہتا ہے۔" اسی نوجوان نے دوبارہ حکم دیا اور ہم

ہونے والی فائرنگ کے درمیان اُبھرنے والی چیخوں اور کراہوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ سارجنٹ آرتھر کے ساتھی رفتہ رفتہ جنگ ہار کر زندگی کی قید سے آزاد ہوتے جا رہے ہیں معلوم ہوتا تھا کہ حملہ آور کہیں آس پاس ہی موجود ہیں اور اس نے بارش رُکتے ہی دن نکلنے کا بھی انتظار نہیں کیا تھا اور ان طوفانی ہواؤں کے درمیان اس کی زبردست یلغار نے قافلے کے بہت سے لوگوں کو فرنگیوں کی ملازمت سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سبکدوش کر دیا ہے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ قافلے کے لوگ اگر اسی تیزی سے فائرنگ کا نشانہ بنتے رہے تو صبح کا اُجالا پھیلنے تک حملہ آور پڑاؤ کا صفایا کر چکا ہو گا۔ میرے خیالات کی بھٹکتی ہُوئی رَو ایک بار پھر شالیار خان کی طرف چلی گئی۔ اس کا خیال آتے ہی مجھے اس ہولناک جنگ کے نتائج پر گہری تشویش ہونے لگی۔ باہر سے جو چیخ سُنائی دی تھی اس سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ میرا نگران ہلاک ہو چکا ہے۔ ایسے میں مجھے خیمے سے نکل جانے میں کوئی دشواری نہ ہوتی لیکن میرا جسم زنجیروں سے بندھا ہُوا تھا اور مجھے کروٹ لینے میں بھی مشکل پیش آ رہی تھی۔

فضا میں رائفل کے ہولناک دھماکوں کا شور جاری تھا کہ اچانک سارے قافلے پر ایک نئی قیامت ٹوٹ پڑی۔ موت کی برستی ہُوئی آگ نے اچانک کسی گھوڑے کو اپنا نشانہ بنا کر دوسرے تمام گھوڑوں کو سخت خوفزدہ کر دیا تھا۔ گھوڑے اپنے ساتھی کو خون میں لت پت پا کر بے ہنگم آوازیں نکالتے ہوئے بے چینی سے پتھریلی زمین پر ٹاپیں مارتے ہُوئے ایک نئی قیامت کی علامتیں ظاہر کرنے لگے۔ تربیت یافتہ گھوڑے اس وقت تک خطرناک ثابت نہیں ہوتے تھے۔ جب تک موت کا دہشت ناک عفریت ان کے سروں پر منڈلا کر انھیں دہشت اور سراسیمگی میں مبتلا نہ کر دے۔

گھوڑوں کی مسلسل بلند ہوتی ہُوئی خوفزدہ آوازیں سُن کر میں پریشان ہو گیا کیونکہ بپھرے ہُوئے گھوڑے قافلے کو اس طرح اپنے سموں تلے روند سکتے تھے جیسے پورس کے ہاتھیوں نے اپنا ہی لشکر تباہ و برباد کر ڈالا تھا۔

خیمے کے قریب ہی پھر کسی کی چیخ اُبھری اور کسی کے گرنے کی آواز سُن کر میری آنکھیں فکر و تشویش کے انداز میں پھیلنے لگیں۔ وہ بار پھر حلق پھاڑ کر چیخا اور زندگی کے ہنگاموں سے دُور ابدی دُنیا کے سمندر میں ڈوب گیا۔

مجھے سارجنٹ کے ساتھیوں میں سے کسی کے مرنے کا غم نہیں تھا مگر شالیار خان کی شخصیت کا احاطہ کرتے ہُوئے میری تشویش بڑھ رہی تھی لیکن اچانک ہی وہ میرے خیمے میں آ گیا۔ اس کی زنجیروں کی جھنکار سُن کر میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ خون آلود تھا اور اس کا ایک ہاتھ زخمی تھا جس سے ابھی تک خون کی بوندیں ٹپک رہی تھیں۔

اس نے رائفل ایک طرف رکھ دی اور اپنے سینے پر بندھی ہُوئی کارتوسوں کی پیٹی سے چابی نکال کر میری جانب پھینکتے ہُوئے بولا: "نوجوان! سارجنٹ حملہ آوروں کی چلائی ہُوئی گولی سے زخمی ہو چکا ہے اور مورچوں پر باقی ماندہ جوان بھی زیادہ دیر مخالفوں کی فائرنگ کا دباؤ برداشت نہیں کر سکیں گے۔ اس لیے اپنے بچاؤ کی فکر کرو۔"

اس کے لہجے سے جھلکتی ہُوئی ہمدردی مجھے خوشی کے احساس سے سرشار کر گئی۔

"شالیار خان! موت کی برستی ہُوئی ہولناک آگ کے درمیان تمھیں میری یاد کیسے آ گئی؟" میں نے اس کی دی ہُوئی چابی سے بیڑی کا قفل کھول کر اپنی ایک ٹانگ آزاد کرتے ہُوئے سوال کیا۔

"تم مجھے اس لیے یاد آ گئے کہ میری موجودہ مہم کی کامیابی کا انحصار تمھاری ذات پر ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر میں تمھیں بچانے میں کامیاب ہو گیا تو تم قافلے کی منتشر طاقت کو دوبارہ یکجا کر سکتے ہو۔" اس کے لہجے میں زندگی سے بھرپور اعتماد جھلک رہا تھا۔ میں اپنی دوسری ٹانگ کو زنجیروں کی قید سے آزاد کرنے میں کامیاب ہو گیا تو اس نے میرے جسم کے گرد لپٹی ہُوئی زنجیروں کو دیکھ کر کہا: "یہی چابی ان زنجیروں کے قفل میں استعمال کر کے دیکھو ممکن ہے اس عذاب سے بھی چھٹکارا مل جائے۔"

میں نے قفل میں چابی گھما دی تو تالا کھٹاک کی آواز سے کھل گیا اور میرے جسم سے لپٹی ہُوئی زنجیروں کا حلقہ ڈھیلا پڑ گیا۔ قفل کھلتے ہی زنجیروں سے آزاد ہونے میں دیر نہیں لگی۔ تب میری نظر شالیار خان کے سینے پر جم گئی جہاں پڑی ہُوئی زنجیروں کے حلقے مجھے خوفناک آنکھوں کی طرح گھورتے محسوس ہوئے۔

"شالیار خان! تم نے یہ چابی ابھی تک خود کیوں نہیں استعمال کی؟" میں نے سوال کیا۔

"اب استعمال کروں گا۔" اس نے خشک ہونٹوں پر مسکراہٹ کی ایک خفیف سی لکیر نمودار کرتے ہُوئے جواب دیا۔

میں نے چابی اس کی طرف بڑھا دی۔

شالیار خان اپنی زنجیروں کے قفل کھول رہا تھا کہ ایک گھوڑا کہیں قریب ہی ہنہناتا سُنائی دیا۔۔۔ پھر کئی گھوڑے ٹاپوں سے

مانند بجھتے ہوئے شعلوں کے درمیان ڈھلان سے اوپر آ کر دوبارہ اپنے تباہ حال پڑاؤ کی طرف بڑھنے لگے۔

جلے ہوئے خیمے کے قریب سے گزرتے ہوئے ہم الاؤ کے نزدیک پہنچ گئے۔ چاروں نوجوان ہم سے چند قدم پیچھے چلتے ہوئے پڑاؤ کا گہری نظروں سے جائزہ لیتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔

الاؤ کے قریب ہی دو لاشیں دیکھ کر میں چونک پڑا۔ فرنگی سارجنٹ اپنی زندگی کی آخری جنگ ہار چکا تھا۔ الاؤ کے پاس ہی ایک درخت کے نیچے ... کی گولیوں سے چھلنی لاش نظر آ رہی تھی۔

میں ... کی لاش کو گھور کر دیکھتا رہا۔ اس کی رائفل اس کے مُردہ جسم کے نیچے دبی ہوئی تھی اور ایک فرنگی مینا رڈھے چکا تھا۔

سارے پڑاؤ پر عجیب سا سناٹا طاری تھا۔

اُبھرتے ہوئے سورج کا گولہ جب اپنی سنہری کرنیں نچھاور کرتا ہوا نمودار ہوا تو رات بھر کی جنگ کا پانسہ پلٹ چکا تھا۔ حملہ آوروں نے ایک ایک فرنگی پالتو کتے کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔

پڑاؤ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لاشیں ہی لاشیں بکھری ہوئی تھیں اور ان میں مُردہ گھوڑوں کی نعشیں بھی اپنے ہی خون کے تالاب میں ڈوبی نظر آ رہی تھیں۔

ہمارے پیچھے موجود مسلح نوجوانوں نے یوں رُک جانے پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ غالباً وہ بھی چاہتے تھے کہ ہم اپنے ساتھیوں کا انجام اچھی طرح دیکھ لیں۔ اچانک کچھ قدموں کی آواز سُن کر میں اس طرف دیکھنے لگا۔ کچھ لوگ رائفلیں تانے پڑاؤ کا محاصرہ کیے ہوئے تھے اور اب ان کا گھیرا تنگ ہوتا جا رہا تھا۔

"محراب خان!" حملے میں ایک حملہ آور نے آنے والے ساتھیوں کا استقبال کرتے ہوئے کہا۔ "فرنگی اپنے انجام کو پہنچ چکے ہیں اور سارے قافلے میں صرف یہ دونوں ہی زندہ بچے ہیں، کہیں تمھیں ... کی تلاش تو نہیں تھی؟"

محراب خان ایک موٹا تازہ، دراز قد جوان تھا۔ اس کی آنکھوں سے چیتے جیسی چمک جھانک رہی تھی۔

مجھ پر نظر ڈالتے ہی اس کی آنکھوں میں نرمی کے آثار نمودار ہو گئے۔ "اگر میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا رہیں تو میں تمھیں شہباز خان کہہ کر مخاطب کروں گا مگر تمھارے ساتھ کون ہے؟" سوال کرتے ہوئے اس کے ہونٹ مسکراہٹ کے انداز میں پھیل گئے تھے۔

"پہلے تم اپنے بارے میں بتاؤ کہ تم کون ہو اور مجھے کیسے جانتے ہو؟" میں نے اس کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

"خوب ... بہت خوب! تمھارے بارے میں جیسا سُنا تھا، تمھیں ویسا ہی پا رہا ہوں۔ لوگ کہتے ہیں کہ موت کا خوف بھی تمھارے لہجے میں کپکپاہٹ پیدا نہیں کرتا اور خطرات کو سامنے پا کر تمھاری قوت کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔ اگر یہ درست ہے تو مجھے اس بات کا موقع ملنا چاہیے کہ میں اپنی آنکھوں سے تمھاری طاقت کا ایک ہلکا سا مظاہرہ دیکھوں۔ کیا خیال ہے، دوستو؟"

محراب خان کا رویّہ مجھے اُلجھن میں ڈال رہا تھا۔ میں جواب دینے کے بجائے اسے سخت نظروں سے گھورنے لگا۔ میرے ہاتھ اب بھی سر سے بلند تھے۔

"اگر یہ فیصلہ ہو جائے کہ تمھارا تعلق کن لوگوں سے ہے تو میں تمھیں میدان میں اُترنے کی دعوت ضرور دوں گا۔ اگر تم ملک سکندر کے ساتھی ہو تو بتاؤ کہ اس نے تمھیں کیا ہدایات دی تھیں؟" یہ کہتے ہوئے میں نے آہستہ آہستہ اپنے ہاتھ گرا دیے اور شالیار خان کو بھی ایسا ہی کرنے کا اشارہ کیا۔

"محراب خان! شہباز درست کہتا ہے۔" ایک اور شخص نے آگے بڑھ کر مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ "اس مذاق کو طول دینے کی کوشش تمھارے حق میں خطرناک بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ کیا تمھیں ملک سکندر کی بات یاد نہیں رہی؟"

"مجھے ساری ہدایات اچھی طرح یاد ہیں ہاشم خان!" اس نے اپنے ساتھی کی سرزنش سُن کر جواب دیا اور ڈھٹائی سے ہنس پڑا۔ "میں یہ دیکھ رہا تھا کہ ملک سکندر نے جس نوجوان کی بہادری اور دلیری کا تذکرہ کرتے ہوئے زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے تھے۔ اس کے اعصاب کس قدر مضبوط ہیں مگر تمھاری مداخلت نے ساری تفریح غارت کر دی۔" اس کے لہجے میں ہلکی سی برہمی آ گئی۔

محراب خان! میں نے لہجے میں سختی پیدا کرتے ہوئے کہا۔ "تم نے میری صلاحیتوں کو آزمانے کے لیے غلط وقت کا انتخاب کیا۔ اگر مجھے اس بات کا یقین نہ ہوتا کہ تم ملک سکندر کے آدمی ہو اور میری مدد کے لیے آئے ہو تو اب تک تمھارے دل سے ساری حسرتیں نکل چکی ہوتیں اور تمھیں اس بات کا یقین آ چکا ہوتا کہ شہباز خان کے بارے میں گردش کرتی ہوئی باتیں اپنے اندر کتنی صداقت رکھتی ہیں۔"

محراب خان نادم نظر آنے لگا۔ سورج کی کرنیں سیدھی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھیں جن کی وجہ سے اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی خجالت کی ہلکی سی سُرخی نمایاں ہو رہی تھی۔

"ملک سکندر جاتے وقت تم لوگوں کی باگ ڈور کس کے ہاتھ میں دے گیا تھا؟" میں نے سوال کیا۔

سب لوگ مجھے چونک کر دیکھنے لگے پھر ان میں سے بیشتر کی نظریں محراب خان کے چہرے پر جا کر ٹھہر گئیں۔ ان کی یہ غیر شعوری حرکت مجھ پر یہ انکشاف کر گئی کہ حملہ آوروں کی سربراہی اس نوجوان کے ذمے ہے جو اس وقت میرے سامنے پشیمانی کا اظہار کر رہا ہے۔ میں دوستانہ انداز میں مسکرانے لگا۔

"ملک سکندر کی ہدایت کے مطابق اب ہمارے قافلے کی قیادت تم کرو گے۔ تمھاری رہائی کے بعد میری ذمے داری ختم ہو چکی ہے۔ اب میں تمھارے اشاروں پر عمل کروں گا۔"

اس کا یہ کہنا مجھے بے حد مضحکہ خیز لگا لیکن میں اُسے پسند کیے بغیر نہ رہ سکا۔

"تب پھر سب سے پہلے کام یہ کرو کہ بکھری ہوئی لاشیں اُٹھا کر کسی گڑھے میں دفن کر دو تاکہ ان کی موجودگی کا آخری نشان بھی ختم ہو جائے۔ اس کے بعد خوف زدہ گھوڑوں کو تلاش کرو۔ ان کاموں سے فراغت پا لو تو بکھرا ہوا سامان اٹھا کر ایک جگہ جمع کر دو۔"

محراب خان اپنے کچھ ساتھیوں کو لے کر پڑاؤ میں پھیل گیا اور لاشیں اٹھا اٹھا کر ٹیلے سے کچھ دور ایک گڑھے میں پھینکنے لگا ... پھر اس گڑھے کو پتھروں سے پاٹ دیا۔ اس کام سے فارغ ہوتے ہی اس نے کئی ساتھی آس پاس پھیلا دیے اور وہ ایک گھنٹے کی کوششوں کے بعد چار گھوڑے پکڑنے میں کامیاب ہو گئے۔ سامان ایک جگہ ڈھیر کرنے کے بعد وہ میرے قریب آ کر بولا۔

"میرے ساتھی بے حد تھکے ہوئے ہیں اور انھیں آرام اور غذا کی فوری ضرورت ہے۔ اگر تم مناسب سمجھو تو ہمارے ساتھ اس غار تک چلو جہاں ہم نے عارضی پڑاؤ ڈال رکھا ہے۔ وہ جگہ اس ٹیلے سے کہیں زیادہ آرام دہ ہے۔"

اس دوران میں دو آدمی میرے اور شالیار خان کے زخموں کی مرہم پٹی میں مصروف رہے تھے۔ زخم صاف ہو گئے اور ان پر مرہم لگ گیا تو جسمانی اذیت بڑی حد تک کم ہو گئی۔ میں نے شالیار خان کی طرف دیکھا۔ وہ مسلسل خاموش تھا۔

"محراب خان! مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ تم مستقبل قریب میں میرے بہت اچھے مشیر ثابت ہو سکتے ہو۔ اگر تمھاری حسِ ظرافت کو نظر انداز کر دیا جائے تو تمھارا مجموعی تاثر بہت شاندار ہو گا۔ تم اپنے کچھ ساتھیوں کو پڑاؤ کی طرف روانہ کر دو تاکہ وہ ہمارے وہاں پہنچنے تک کھانا تیار کریں۔ جب تک اسلحے سے لدی ہوئی گاڑیاں یہاں سے کسی محفوظ پناہ گاہ تک نہیں پہنچ جاتیں، اس ٹیلے کو تنہا چھوڑنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔" میں نے اپنا فیصلہ سُناتے ہوئے کہا جسے سبھی نے پسند کیا۔

محراب خان نے اپنے چار ساتھیوں کو اپنے پڑاؤ کی طرف روانہ کر دیا پھر ایک ساتھی کی طرف متوجہ ہو کر بولا: "عاقل خان! ان گاڑیوں کو کھینچنے کے لیے آٹھ گھوڑوں کی ضرورت ہو گی۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم فی الحال دو دو گھوڑے جوت کر اپنا کام چلا لو ... گھوڑے لے کر آنے میں کافی وقت لگے گا؟"

عاقل خان، محراب خان کا اشارہ پا کر گاڑیوں میں گھوڑے جوتنے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ ایک گاڑی نکال کر سامنے لے آیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد دونوں گاڑیاں آگے پیچھے چلتی ہوئی ڈھلانوں کی جانب سفر کرنے لگیں۔ دوسری گاڑی محراب خان نے خود سنبھال لی تھی اور گھوڑے ہانکتا ہوا ہمارے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ میں اپنے بابا کے ساتھ پہلی گاڑی میں بیٹھ گیا تھا۔

شالیار خان کا پتھریلا چہرہ ان گنت سلوٹیں نمودار کرتا ہوا گہری سوچ میں ڈوبا نظر آ رہا تھا۔ اس نے اس بدلی ہوئی صورت حال پر ابھی تک کسی تاثر کا اظہار نہیں کیا تھا حالانکہ بدلے ہوئے حالات اس کے لیے اُلجھن کا باعث ہونے چاہئیں تھے۔ میں نے بھی اسے چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا۔ اس وقت میری سب سے بڑی کوشش یہی تھی کہ ہم جلد از جلد اپنے نئے دوستوں کے پڑاؤ تک پہنچ جائیں۔

ایک چٹان کو عبور کرتے ہی ہم ایک میدان میں پہنچ گئے۔ یہ میدانی جگہ جھاڑیوں سے گھری ہوئی تھی۔ سامنے ایک چٹان کی دراڑوں سے دھواں نکل رہا تھا۔ یہ جگہ واقعی کسی مضبوط قلعے سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایک بے بس نوجوان کی حیرت انگیز داستان
جسے اپنی موت کا وقت معلوم ہو گیا تھا
مظلوم
یعقوب جمیل کے ہوشربا قلم سے
جس کا قارئین کو برسوں سے انتظار تھا
مکتبہ القریش سرکلر روڈ اردو بازار لاہور
فون 7668958

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

زیادہ محفوظ تھی۔ غار کافی کشادہ تھا جس کے ایک طرف الاؤ کے بھڑکتے ہوئے نیلگوں شعلوں پر پہاڑی بکرا بھونا جا رہا تھا۔

کھانے کے بعد قہوے کا دور چلا تو باتوں کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔

"محراب خان! تمھیں یہ کیسے پتہ چلا کہ قافلے میں میری حیثیت بدل چکی ہے اور میں قیادت سے محروم ہو کر ان کا قیدی بن چکا ہوں؟" آخر کار وہ بات میری زبان پر آ گئی جو بہت دیر سے دماغ کے بند کواڑوں پر دستک دے رہی تھی۔

محراب خان نے اپنی پیالی خالی کر کے زمین پر رکھتے ہوئے کہا: "مجھے کل کا سورج طلوع ہوتے ہی احساس ہو گیا تھا کہ فرنگیوں کے پڑاؤ میں کوئی ہنگامی تبدیلی آ چکی ہے۔ جیسے ہی تمھارا قافلہ داؤد خان کی بستی سے نکلا، ہمارے دو مخبر قافلے کے پیچھے لگ گئے تھے۔ جب تمھارا قافلہ ایک ٹیلے کی اوٹ سے گزر رہا تھا تو انھیں تم ایک قیدی کی حیثیت سے سفر کرتے نظر آ گئے۔ ملک سکندر نے ایک ادھیڑ عمر قیدی کی بھی نشان دہی کی تھی مگر جب ایک کی بجائے دو قیدی نظر آئے تو ایک مخبر نے ہمیں اطلاع دے دی۔ اس سے پہلے ہمارا ایک مخبر مارا جا چکا تھا۔ ہم سرِ شام ہی تمھیں قید سے رہائی دلا دیتے مگر تیز بارش کی وجہ سے مجبور ہو گئے پھر جونھی بارش رکی تو ہم نے دن کی روشنی کا بھی انتظار نہیں کیا اور حملے کا آغاز کر دیا۔ ابتدا ہی میں ہم نے خاصی کامیابی حاصل کر لی۔ اس کھلی جنگ کے دوران ہمیں اس بات کا خدشہ رہا کہ کہیں تم دونوں بھی گولیوں کی زد میں نہ آ جاؤ۔ ہم محتاط انداز میں پیش قدمی کرنے لگے حتیٰ کہ ہمارا ایک ساتھی پڑاؤ میں جا گھسا۔ اس کا اشارہ ملتے ہی ہمیں تم دونوں کے بارے میں پتہ چل گیا۔ بس پھر ہم نے گھیرا ڈال کر حملہ شدید کر دیا۔"

"لیکن یہ ایک دلچسپ اتفاق ہے کہ جب جنگ فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو رہی تھی تو گھوڑوں کی بھگدڑ کے دوران ہمارا خیمہ گر گیا۔ میں شالیار خان کے ساتھ قریبی ڈھلان پر کود گیا۔ اس وقت اگر ہمیں ایک لمحے کی بھی تاخیر ہو جاتی تو ہم تمھاری چلائی ہوئی گولیوں کا نشانہ بن جاتے۔ تم لوگوں نے اس خیمے پر اس شدت سے گولیاں برسائی تھیں کہ وہ ایک دم شعلوں کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔"

محراب خان کا مسکراتا ہوا چہرہ ایک دم سنجیدگی کا تراشا ہوا مجسمہ نظر آنے لگا۔

"اگر تمھیں ذرا سا بھی نقصان پہنچ جاتا تو ملک سکندر ہم سے نہ جانے کیا سلوک کرتا؟" وہ فکرمندی سے بڑبڑایا۔

"قدرت کے بھید کون جان سکتا ہے، محراب خان!" میں نے مسکرا کر کہا۔ "ابھی اس دنیا میں میرے حصے کا بہت سا کام باقی پڑا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ قدرت ابھی تک مجھے زندہ رہنے کے موقعے دیے جا رہی ہے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو شہباز خان!" اچانک ایک ادھیڑ عمر کے آدمی نے کہا تو میں نے چونک کر اس بوڑھے کی طرف دیکھا تو اس کی صورت آنکھوں کو آشنا محسوس ہوئی۔

"میں شاکر خان ہوں۔" اس نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ "تمھیں شاید یاد نہیں رہا۔ میں ملک سکندر کے قریبی دوستوں میں سے ہوں۔ ملک سکندر بہت دانا اور ہوشیار آدمی ہے۔ اس نے قافلے کی سربراہی محراب خان کو سونپنے کے بعد مجھے اور حسین خان کو اس قافلے کا نگران مقرر کیا تھا۔"

بوڑھا شاکر خان ہمارے قریب ہی بیٹھ گیا اور قافلے کے جوانوں کا جائزہ لیتے ہوئے اس کی نظر اچانک ہی شالیار خان کے چہرے پر جم گئی جو سر جھکائے کسی گہری سوچ میں ڈوبا نظر آ رہا تھا۔

"اگر میری نظر دھوکا نہیں کھا رہی تو تم شالیار خان ہی ہو نا؟" اس نے اپنے دائیں ہاتھ کی انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن تم دونوں باپ بیٹے اجنبیوں کی طرح کیوں بیٹھے ہو؟"

اس انکشاف نے قافلے کے تمام لوگوں کو حیرت میں ڈال دیا۔

شالیار خان بھی چونک پڑا۔ وہ چند لمحوں تک مضطرب نظر آیا پھر اٹھتے ہوئے چیخ کر بولا: "تم نے ابھی ابھی کیا کہا تھا؟" اس کے لہجے میں بڑھاپے کا کرب جاگ اٹھا۔

"کتنی عجیب بات ہے شالیار خان! تم ابھی تک اپنے جگر کے ٹکڑے کو بھی نہیں پہچان سکے؟" شاکر خان کے لہجے میں ہلکی سی ملامت تھی۔ "شاید فرنگیوں کی طویل قید نے تمھارے خون کی رنگت بھی تبدیل کر دی ہے۔"

شالیار خان ہکا بکا کبھی مجھے اور کبھی شاکر خان کو دیکھے جا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر تیزی سے رنگ آ رہے تھے اور جا رہے تھے وہ بری طرح ہانپنے لگا تھا۔

"تمھاری آنکھوں کا نور اور تمھارے بڑھاپے کا سہارا تمھاری آنکھوں کے سامنے موجود ہے اور تم ابھی تک اپنے خون کی پکار بھی نہیں سن سکے۔ یہ شہباز خان ہے!" اس نے اپنا ہاتھ میری طرف بلند کرتے ہوئے کہا۔ "یہی شہباز خان تمھارا بیٹا ہے۔ اسی نے تن تنہا ہولناک طوفان کا مقابلہ کرتے ہوئے تمھیں فرنگیوں کی قید سے آزاد کرایا ہے۔"

مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے میرے صبر و تحمل کی چٹان آہستہ آہستہ پگھل کر میری آنکھوں میں جمع ہوتی جا رہی ہو۔ میرا شیر دل باپ اس راز سے پردہ اٹھنے کے باوجود ابھی تک حیرت اور سناٹے کے عالم میں خاموش کھڑا تھا۔ اس کی خاموشی میرے لیے الجھن اور خوف کا سبب بن رہی تھی۔ مجھے یہ فکر دامن گیر ہونے لگی کہ کہیں اس پر شادیِ مرگ نہ طاری ہو جائے۔ کہیں اس کی ذہنی حالت پھر سے نہ بگڑنے لگے۔

میری نظریں اس کے چہرے سے ہٹ کر اس کے پیروں کی طرف جھک گئیں جو ہیجانی عالم میں ایک ہی جگہ حرکت کر رہے تھے میں نے آہستہ سے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا تو اپنے بابا سے آنکھیں چار ہوتے ہی مجھ پر رقت طاری ہونے لگی۔

اس کے ہونٹ آہستہ آہستہ لرز رہے تھے اور اس کی خون رنگ آنکھوں میں محبت اور شفقت کا بے کراں سمندر مچل رہا تھا... اپنے بابا کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے مجھے ایک عجیب سا سکون اور طمانیت محسوس ہوئی۔ دفعتاً اس نے میری جانب اپنے بازو پھیلائے تو میں تڑپتا ہوا اس کی محبت بھری آغوش میں سما گیا۔

دیر تک ہم ایک دوسرے سے لپٹے کھڑے رہے۔ میرے بابا کے آنسو میرے چہرے پر برس [illegible] مجھے محسوس ہوا جیسے برسوں کا دبا ہوا کرب اور چھلکتے ہوئے جذبات کی سوکھی ندی میں طغیانی آ گئی ہے۔

"میرے بہادر بیٹے!" میرے بوڑھے باپ نے محبت سے میرے شانے تھپکتے ہوئے کہا: "تم نے یہ راز اب تک کیوں چھپائے رکھا؟ اور فرنگی جنرل کے سامنے مجھ سے نفرت کا اظہار کرتے ہوئے اس مقدس رشتے کو دشمنی کا رنگ کیوں دیا تھا؟ مجھے بتاؤ کہ اس خون رنگ ڈرامے کو اس قدر طول دینے کی کیا ضرورت تھی؟"

وہ شدید ہیجانی کیفیت سے گزر رہا تھا اور میری حالت بھی اس سے مختلف نہیں تھی۔ اپنے باپ کے کشادہ سینے سے لپٹ کر میرے ضبط و تحمل کی ساری ہی دیواریں صرف ایک ریلے میں بہ گئیں۔

"مجھے بتاؤ میرے بچے! تم نے یہ سب کچھ کیوں کیا؟" میرا بوڑھا باپ اپنے سوالوں کا جواب پانے کے لیے مچل اٹھا۔ "جب تک مجھے ان سوالوں کا جواب نہیں ملے گا، میری روح خدشات کے ہولناک اندھیروں میں بھٹکتی رہے گی۔ تم نے اپنی زندگی [illegible] عذاب تنہا کیوں برداشت کیا؟ کیا تمھیں اپنے باپ کی محبت اور خون کی حرارت پر بھروسہ نہیں تھا؟"

اس کے لہجے میں چھپی ہوئی تڑپ نے مجھے اپنی زبان کھولنے پر مجبور کر دیا: "میں تمھارے اور اپنے درمیان اجنبیت کا رشتہ پیدا کرنے پر مجبور تھا، بابا!" میں نے اس کے شانے سے پیشانی رگڑتے ہوئے جواب دیا۔ "اگر میں اس دشمنی کا ڈھونگ نہ رچاتا تو جنرل ڈوگ جیسے عیار شخص کو یقین دلانا ناممکن ہو جاتا کہ میں فرنگیوں کا لوٹا ہوا خزانہ واپس لا سکتا ہوں۔ میں نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اس دشمنی کا اظہار کیا تو جنرل ڈوگ میری سابقہ خدمات کے پیشِ نظر مجھے اس مہم کا سربراہ مقرر کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ مجھے اعتراف ہے کہ دشمنی اور نفرت کا اظہار کرتے وقت میں اذیت ناک حالت کا شکار ہو جاتا تھا مگر اس بات سے خوف زدہ تھا کہ اگر وقت سے پہلے ہمارے رشتے کی بھنک کسی کے کانوں میں پڑ گئی تو میرا منصوبہ ناکام ہو جائے گا اور اس کے ساتھ ہی ہماری زندگیاں بھی کسی المناک حادثے کا شکار ہو جائیں گی۔ یقین کرو بابا!" میں نے بے ساختہ سسکیوں کو روکتے ہوئے بمشکل کہا۔ "تمھیں اپنے سامنے زنجیروں میں جکڑا ہوا پا کر میرے لیے خود کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ مجھے یہ بھی خطرہ تھا کہ کہیں اس راز سے پردہ اٹھتے ہی تمھاری ذہنی حالت دوبارہ نہ بگڑ جائے۔"

میری مجبوریاں سن کر میرے بابا نے اپنے بازوؤں کی گرفت مضبوط کر دی اور میری پیشانی پر شفقت کی مہر ثبت کرتے ہوئے بولا: "شہباز! میں جانتا ہوں کہ تم نے مجھے فرنگیوں کی قید سے رہائی دلانے کے لیے اپنی خواہش پر کیا کیا جبر کیے ہوں گے۔ مجھے معاف کر دینا میرے بچے۔ میں نے تم پر شک کیا تھا اور تمھیں غدار اور وطن فروش ہونے کے طعنے دیے تھے۔"

"خان بابا! میرا گناہ ان طعنوں سے کہیں بڑا ہے کیوں کہ میں تمھارے مقدس رشتے سے آگاہ ہونے کے باوجود دانستہ تمھاری توہین کرتا رہا ہوں۔ ایک اعلیٰ ظرف انسان کی طرح میری ان کوتاہیوں کو دل سے معاف کر دو، ورنہ میرے سکون کی دولت منتشر رہے گی اور میں مر جاؤں گا۔"

"ایسا نہ کہو میرے بچے! ایسا ہرگز نہیں ہوگا!" اولاد کی محبت اپنا رنگ دکھا رہی تھی۔ "اگر تم نے جوانی کے دنوں میں میرا ساتھ چھوڑ دیا تو میرے بڑھاپے کو [illegible] موت [illegible] اور میں دوبارہ غم و الم کے سمندر میں [illegible]

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

موت نہیں مانگ سکتا!"

اچانک کسی نے میرا کندھا تھپکتے ہوئے مجھے اپنے باپ کے سینے سے الگ ہونے کا اشارہ کیا اور کہا: "شہباز خان! باپ بیٹے کے ملاپ کا جذباتی دور گزر چکا ہے۔ تم دونوں نے قرب میں بھر کے اپنے دل کی بھڑاس نکال لی ہے۔"
یہ شاکر خان کی آواز تھی۔

"اب اطمینان سے بیٹھ کر۔۔۔ ایک دوسرے سے باتیں کرو۔"
یہ سنا تو ہو کر جذبات کا چڑھتا ہوا دریا شاید رخان کے حواس دوبارہ بحال ہونے میں کامیاب ہو جائے گا۔

میں محبت سے اپنے شیر دل باپ کا ہاتھ تھام کر الاؤ کے قریب بیٹھ گیا۔ میری آنکھوں سے ابھی تک سینے میں برسوں سے رکا ہوا وہ اشکوں کا سیلاب جاری تھا۔ زندگی میں پہلی بار محسوس ہوا تھا کہ باپ کی محبت کیا چیز ہوتی ہے؟ اور جدائی کی یہ خلیج پاٹنے کے بعد کوئی بیٹا کیسے احساسات سے دوچار ہوتا ہے۔ باپ کے سینے میں منہ چھپا کر میں جس سکون اور طمانیت سے آشنا ہوا تھا، جدائی کی طوالت کا کرب صرف ایک لمحے میں زائل ہو گیا تھا۔ میری آنکھیں اپنے شیر دل باپ کے چہرے کا طواف کرتی ہوئی عقیدت اور محبت کے موتی نچھاور کرتی ہوئی اپنے سینے میں برسوں سے جلتی ہوئی محرومی کی آگ کو سرد کر رہی تھیں۔

میرے بوڑھے باپ کا شستہ ہوا پتھریلا چہرہ، خوشیوں کا مخزن بن گیا تھا۔ اس کی آنکھوں سے جھلکتی ہوئی شفقت اور محبت کی کرن روشنی میرے آس پاس پھیلی ہوئی غمناک تاریکیاں دور کرتی رہی اور میں ایک ٹھوس حقیقت کی روشنی میں نہاتے ہوئے ان زخموں کو دھوتا رہا جو برسوں کا عذاب جھیلتے ہوئے میری روح پر لگے ہوئے تھے۔ خاموشی دل کی زبان بن کر احساسات کی ترجمانی کرتی محسوس ہو رہی تھی اور اس بات کا پہلی بار پتہ چلا کہ جذبات کا شدید ریلا زبانوں پر کس طرح خاموشی کی مہر ثبت کر دیتا ہے اور آنکھیں سراپا زبان کیسے بن جاتی ہیں۔

میں نے احساسات کے سمندر سے سر ابھار کر ماحول کا جائزہ لیا تو محراب خان ہمارے سامنے رکھی ہوئی پیالیوں میں گرم قہوہ انڈیل رہا تھا اور باقی لوگ ہمیں تنہا چھوڑ کر باہر جا چکے تھے۔

"شالیار خان! جب پہاڑ روتے ہیں تو قیامت کا منظر پیش کرتے ہیں۔ تم دونوں، باپ بیٹے، ایسے پہاڑوں سے مشابہت رکھتے ہو جو طوفان کا زور اپنے سینے پر برداشت کرتے ہیں اور جن کو ان کی ہلکی سی سسکاری بھی سنائی نہیں دیتی۔"

"ساری تعریفیں خدائے لازوال کے لیے وقف ہیں۔" میرے بابا نے ہاتھ اٹھا کر کہا: "انسان میں اچھی صفات جمع ہو جائیں تو وہ انسان کی سطح سے بلند ہو کر فرشتوں کی طرح معصوم اور پاک ہو جاتا ہے۔ خدائے قدوس نے ہمارے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لیے آج ہماری سرزمین پر فرنگیوں کی فوج مسلط کر دی ہے تاکہ ہم نیکی اور بدی میں تمیز کر سکیں اور اپنے شعور کی روشنی میں اس منزل کا تعین کر لیں جس کے ڈانڈے خدائے لازوال کی ذات سے جا ملتے ہیں۔ میں خدا کا لاکھ لاکھ شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے شہباز جیسے بیٹے کی صورت میں ایک ایسا گوہر عطا کر دیا ہے جو سچائی کے راستوں کا ایک دلیر سپاہی ہے۔ مجھے شروع ہی سے یقین تھا کہ یہ کسی بڑے باپ کا بیٹا ہے۔ اسے دیکھ کر پہلی نظر میں یوں معلوم ہوتا تھا جیسے دشمنوں کو نیست و نابود کیے بغیر اس کے انتقام کی آگ سرد نہیں ہو گی۔"

وہ سانس لینے کے لیے رکا اور میرے شانے پر اپنے ایک ہاتھ کا ہلکا دباؤ ڈالتے ہوئے بولا: "شہباز! تمہیں یاد ہو گا کہ تمہارا نام جاننے کے باوجود میں نے کبھی تمہارا نام لے کر نہیں پکارا تھا۔ تمہارا نام ہونٹوں پر آتے ہی میری زبان مفلوج ہونے لگتی تھی اور مجھے اپنے بیٹے کی یاد ستانے لگتی تھی۔ میں نے ہمیشہ تمہیں نوجوان کہہ کر پکارا تاکہ جذبات میرے اعصاب پر غالب نہ آ جائیں۔ میں سوچتا تھا کہ میرا بیٹا شہباز جوان ہو کر اپنے بوڑھے باپ کی تلاش میں نکل کھڑا ہو گا۔ مجھے بھروسہ تھا کہ اگر ملاحدہ نے اس سے زندگی نہیں چھین لی تو وہ مجھے تلاش کرنے کے لیے میدان عمل میں ضرور کود پڑے گا۔ خدا کا شکر ہے کہ میرے خیالات اور تصورات زندہ حقیقت بن کر میری آنکھوں کو جگمگا رہے ہیں اور میرا بیٹا میری توقع سے بھی زیادہ ہوش مند اور بہادر ثابت ہوا۔ میں اس پر جتنا بھی فخر کروں کم ہو گا۔"

یہ سن کر مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے جسم کا سارا خون سمٹ کر میرے چہرے پر جمع ہو رہا ہو۔

"شالیار خان! اپنے بیٹے پر تمہارا فخر بے جا نہیں ہے۔" شاکر خان نے تائید کرتے ہوئے کہا: "ہمارے لوگوں میں تمہارا نام ابھی تک بڑے ادب اور احترام سے لیا جاتا ہے۔ تم دونوں کی وجہ سے حریت پسندوں کے حوصلے مزید بلند اور پختہ ہوتے ہیں۔"

"شاکر خان! بابا کو آرام کی ضرورت ہے۔ میرا خیال ہے اب انھیں کچھ دیر لیٹ کر کمر سیدھی کر لینے دو۔"
شاکر خان خاموش ہو گیا۔

"مجھ سے زیادہ تو تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔" خان بابا نے ہونٹوں پر شفقت آمیز مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے کہا: "شاکر خان میرا پرانا جاننے والا ہے۔ اسے باتیں کرنے سے مت روکو۔ پچھلے دنوں تم نے عذاب سہتے ہوئے گزارے ہیں۔ اس لیے لیٹ جاؤ اور آرام کرو۔ جس شخص نے برسوں جاگتی آنکھوں کے ساتھ تیرہ و تاریک قید خانے میں صبح آزادی کی پھوٹنے والی کرنوں کا انتظار کیا ہو اس کے لیے ایک دن کی بے آرامی کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔"

میں خاموشی سے اٹھا اور ایک طرف لگے بستر پر دراز ہو گیا اور اپنے بابا کے بارے میں سوچتے ہوئے گہری نیند میں ڈوب گیا۔

جب دوبارہ میرا شعور بیدار ہوا تو غار سے باہر میدان میں سورج کی سنہری دھوپ اپنی چمک سے محروم ہو کر زردی اختیار کر رہی تھی۔ آنکھیں کھولتے ہی گوشت بھوننے کی خوشبو مجھے اپنے نتھنوں میں گھستی محسوس ہوئی اور اس کے ساتھ ہی لوگوں کے باتیں کرنے کی ملی جلی آوازیں میری سماعت سے ٹکرانے لگیں۔

میں انگڑائی لیتا ہوا اٹھا اور غار سے باہر آ گیا تو محراب خان مجھے میدان کی طرف جاتے دیکھ کر لپک کر آیا اور میرا راستہ روکتے ہوئے بولا۔

"ہمارے دو آدمی پہاڑ کی ایک چوٹی پر موجود ہیں۔ ان کی اطلاع کے مطابق جنوب سے گھڑسواروں کا ایک قافلہ تیزی سے اس راستے پر آ رہا ہے۔ ہمارے جاسوس ابھی ان لوگوں کو شناخت کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ تاہم میں نے اپنے آٹھ جوانوں میں اسلحہ تقسیم کر کے انھیں آنے والے گھڑسواروں پر گہری نظر رکھنے کا حکم دے دیا ہے۔ میں نے انھیں مختلف مورچوں پر متعین کر کے یہ ہدایت بھی کر دی ہے کہ اگر یہ گھڑسوار تصادم کی نیت رکھتے ہوں تو ان کا ایک بھی آدمی زندہ واپس نہیں جانا چاہیے اور اگر وہ لوگ راستہ بدل کر آگے نکل جاتے ہیں تو ان سے کوئی چھیڑ چھاڑ نہ کی جائے۔ اگر کوئی ترمیم یا اضافہ کرنا چاہتے ہو تو بتا دو کیونکہ اب اس قافلے کے سربراہ تم ہو! ہمارے قافلے کی طے کی ہوئی حکمت عملی کے مطابق ہمیں اس وقت تک [illegible] ہے جب تک ملک سکندر قافلے میں واپس نہیں آ جاتا۔"

"محراب خان!" میں نے مسکرا کر اس کے مضبوط شانے تھام لیے: "میں ایک بار یہ بات پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ تم بہت اچھے مشیر ثابت ہو سکتے ہو۔ تم نے جو پیش بندیاں کی ہیں، وہ تمھاری ذہانت کا بہترین ثبوت ہیں۔ اب تم ایسا کرو کہ اپنے آدمیوں کی تعداد بڑھا دو اور خود بھی انھی پہاڑوں میں پوشیدہ ہو جاؤ لیکن اپنے مورچے پر جانے سے پہلے تمام ساتھیوں کو صورت حال سے باخبر کر دو اور انھیں حکم دے دو کہ رائفل کے دھماکے سنتے ہی گھوڑوں پر سوار ہو جائیں اور دشمن پر ٹوٹ پڑیں۔"

محراب خان اثبات میں سر ہلاتا ہوا تیزی سے الاؤ کی طرف بڑھا اور اس کے گرد بیٹھے ہوئے ساتھیوں کو صورت حال سے باخبر کرنے لگا۔

اس کی باتیں سنتے ہی سب لوگ اٹھ کھڑے ہوئے اور رائفلیں سنبھالتے ہوئے اس طرف چل پڑے جہاں ان کے گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔ محراب خان نے کارتوسوں سے بھری ہوئی ایک پیٹی اور رائفل میرے بابا کو بھی تھما دی جسے ہاتھ میں لیتے ہی خان بابا کی آنکھوں میں ایک انوکھی چمک پیدا ہو گئی۔

جب میرا بابا چند ساتھیوں کو لے کر چٹانوں کے درمیان ایک راستے پر گم ہو کر نظروں سے اوجھل ہو گیا تو میں تیزی سے اسلحہ گاڑی کی طرف بڑھا اور دستی بموں کا ایک تھیلا نکال لیا۔ پھر ایک رائفل اور گولیوں سے بھری چمڑے کی ایک پیٹی اتار کر اپنی کمر کے گرد باندھ لی اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا ایک سیاہ گھوڑے کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے محبت سے گھوڑے کی پیٹھ تھپکی تو وہ اپنی وفاداری کا اظہار کرتے ہوئے آہستہ سے ہنہنایا اور سر جھکا کر زمین پر ٹاپیں مارنے لگا۔

کچھ ہی دیر میں اسے مانوس کر کے میں اس پر سوار ہو گیا۔ گھوڑا تیزی سے اس میدان کو پار کر کے گھاٹی پر پہنچ گیا، جس کے آس پاس پھیلے ہوئے ٹیلوں پر مجھے اپنے ساتھی نظر آ گئے اور کچھ آگے بڑھ کر ایک چٹان کی اوٹ میں مجھے اپنا بابا بھی نظر آ گیا۔ اس سے آنکھیں چار ہوتے ہی مجھے اس کی آنکھوں میں تشویش کے آثار نظر آئے جو مجھے محتاط رہنے اور آگے بڑھنے سے روک رہے تھے مگر میں نے اپنے خان بابا کی آنکھوں سے جھلکتی ہوئی تشویش کو شفقت پدری پر محمول کیا اور آگے ہی آگے بڑھتا رہا حتیٰ کہ ایک موڑ گھومتے ہی مجھے وہ گھڑسوار تیزی سے اپنی طرف آتے دکھائی دیے۔ میں نے ان کو دیکھتے ہی ایک چٹان کے پیچھے اپنا گھوڑا روک لیا اور تھیلا کھول کر اس میں سے دو دستی بم نکال لیے۔

گھڑسواروں کے انداز سے فوراً ہی اندازہ ہو گیا کہ آنے والے دوستانہ تیور نہیں رکھتے۔ موڑ گھومتے ہی ان کی رفتار میں کمی آ گئی اور ان کے چند ساتھی جو ہراول دستے کا کام دے رہے تھے، آس پاس پھیلی ہوئی چٹانوں کو عقابی نظروں سے گھورنے لگے۔

ابھی وہ اس مقام تک نہیں پہنچے تھے جہاں دستی بم کی تباہ کاری ان کے لیے کسی نقصان کا باعث بن سکتی تھی جارحانہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آہستہ آہستہ گھوڑے بڑھاتے ہوئے چٹانوں کے درمیان سے گزر کر میرے سامنے والی ایک چٹان کے قریب رُک گئے۔

"داور خان! مجھے تو یہاں کسی قافلے کے آثار نظر نہیں آتے۔" اُن میں سے ایک نے اپنے ساتھی کو مخاطب کر کے کہا۔

"میں نے انھیں اسی طرف آتے دیکھا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ رات بھر جنگ میں مصروف رہنے کے باعث ابھی تک انھی پہاڑوں کو مسکن بنائے ہوئے ہیں۔" داور خان نے جواب دیا اور اس راستے کو گھورنے لگا جو اسی میدان کی طرف جاتا تھا جہاں ہماری گاڑیاں موجود تھیں۔ "یہ دیکھو اسی راستے پر متعدد گھوڑوں کے قدموں کے تازہ نشان موجود ہیں۔ ہم اگر کوشش کریں تو انھیں اپنی کمین گاہ سے باہر آنے پر مجبور کر سکتے ہیں۔"

اچانک سواروں کا ایک دستہ اُن کے ساتھ آ کر مل گیا۔ تب میں نے دانتوں کی مدد سے دستی بم کی پن نکال کر اُسے سواروں کی طرف اُچھال دیا۔

ایک ہولناک دھماکا ہوا اور دُھوئیں کا ایک گہرا بادل ہمارے درمیان حائل ہو گیا۔ دشمن کو سنبھلنے کا موقع دیے بغیر میرا بایاں ہاتھ بلند ہوا اور ان کی چیخوں اور کراہوں میں اضافہ ہو گیا۔

دوسرے بم کا دھماکا ہوتے ہی دُشمن کے بہترین سواروں کا صفایا ہو چکا تھا۔ اُن کے پیچھے آنے والے سوار دُور ہی سے اپنے ساتھیوں کا انجام دیکھ کر پلٹے اور ڈھلانوں میں اُترتے ہوئے نظروں سے اوجھل ہونے لگے تب میں نے رائفل سنبھالی اور ان میں سے ایک کو نشانہ بنا دیا۔

وہ تعداد میں زیادہ ہو جانے لگتے تھے۔ بہرحال، دستی بم کے دھماکے نے انھیں پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔

میدان صاف دیکھتے ہی میں نے اپنا گھوڑا چٹان کی اوٹ سے نکالا اور اُسے دوڑاتا ہوا اُس سوار کے قریب پہنچ گیا جسے میں نے فرار ہونے سے روکنے کے لیے رائفل کا نشانہ بنایا تھا۔

وہ ایک [illegible] تیزی سے [illegible] رہا تھی۔ [illegible] زندگی [illegible] تلاش کرنے لگا۔

وہ زندہ تھا اور گولی لگنے کے باعث بے ہوش ہو گیا تھا۔ میں اس کے رخساروں کو تھپتھپا کر اُسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا تا کہ یہ معلوم کر سکوں کہ حملہ آور کون تھے اور کس نے انھیں ہمارے تعاقب میں روانہ کیا تھا۔ جب ہلکے پھلکے انداز میں گال تھپتھپانے سے کام نہ بنا تو میں نے اپنی انگلیوں میں سختی پیدا کر لی نتیجتاً رخساروں سے خون جاری ہوتے ہی اس نے نقاہت آمیز انداز میں ایک طویل سانس لیا اور آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھنے لگا۔

"تم کون ہو؟ اور تمھیں ہم پر حملہ کرنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی تھی؟" میں نے اُسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

میرا سوال سن کر اس کی آنکھوں میں موت کا خوف کروٹیں لینے لگا۔ وہ اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا۔

"میں لشکر خان کا بھائی ہوں اکبر خان!" اُس نے تکلیف کی شدت سے گھبرا کر ایک ہاتھ اپنے زخمی شانے پر رکھ لیا جیسے بہتے ہوئے خون کو روکنے کی کوشش کر رہا ہو۔

"تمھارے ساتھ آنے والے آدمیوں کی تعداد کیا ہے؟ یاد رکھو! اگر تم نے میرے سوالات کا صحیح جواب نہیں دیا تو میں تمھاری زندگی کے آخری لمحات بڑے دردناک بنا دوں گا۔"

میری دھمکی سن کر اس کے چہرے پر چھائی ہوئی موت کی زردی میں اضافہ ہو گیا اور اس کی آنکھیں دہشت کا اظہار کرتے ہوئے اس طرح پھیل گئیں جیسے اس کا آخری وقت قریب آ گیا ہو... اور اس نے موت کے عفریت کی آہٹ اپنے قالب میں محسوس کرنی شروع کر دی ہو۔

"جلدی جواب دو! تمھارے ساتھیوں کی تعداد کیا ہے؟" میں نے اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہناتے ہوئے اس کے رخساروں پر انگلیوں کا دباؤ سخت کر دیا۔

وہ تکلیف کی شدت سے چلانے لگا اور سر کے اشارے سے مجھے رُک جانے کے لیے کہا تو میں نے ہاتھ روک لیے اور اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔

"ہم... میں اپنے ساتھ بیس آدمی لے کر آیا تھا" اس نے رُک رُک کر جواب دیا۔ "قبیلے کے لوگوں نے مجھے تمھارا تعاقب کرنے سے منع کرتے ہوئے کہا تھا کہ تمھارے پاس کچھ ایسے ہتھیار بھی موجود ہیں جو ایک ہی دھماکے میں بیسیوں دشمنوں کو موت کے گھاٹ اُتار سکتے ہیں مگر میں نے ان کی بات

رد کر دی اور تمھارا تعاقب کرتا ہوا اپنی موت کو دعوت دینے پہنچا! میرا خیال تھا کہ میں آسانی سے تم لوگوں کو فریب دینے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ مگر مجھے کیا پتہ تھا کہ خود میری زندگی ہی مجھے فریب دے رہی ہے۔

"میں مرنے سے پہلے چند گھونٹ پانی پینا چاہتا ہوں تاکہ جانکنی کا یہ عالم ختم ہو جائے۔" اس نے اس انداز میں کہا جیسے آخری خواہش ظاہر کر رہا ہو۔ وہ تکلیف کی شدت سے بار بار زبان نکال کر اپنے ہونٹ چاٹنے لگا۔

میں نے پانی کی تلاش میں اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی تو مجھے ایک گڑھے میں بارش کا پانی نظر آ گیا۔ میں تیزی سے اُٹھا اور اپنی چادر کا ایک کونا گڑھے کے پانی میں بھگو کر لے آیا۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا میں نے چادر نچوڑ کر پانی کے چند قطرے اس کے حلق میں ٹپکائے تو اس کی آنکھوں میں ممنونیت کے آثار پیدا ہونے لگے۔

"تم نے مجھ پر یہ احسان کر کے مجھے مجبور کر دیا ہے کہ میں مرتے وقت تمھیں ایک ایسی بات سے آگاہ کر دوں جو مستقبل قریب میں تمھاری زندگی کے لیے ایک بہترین ضمانت بن سکتی ہے۔ میرے قبیلے کے بہت سے جوان وادی الماس کے قریب جھتے میں تمھارا انتظار کر رہے ہیں... وہاں سے تم اپنے قافلے کا ایک بھی آدمی بچا کر نہیں لے جا سکو گے۔ ان کی تعداد بہت زیادہ ہے اور سب کے سب انتقام کی آگ سرد کرنے کے لیے خفیہ مورچہ بندی کیے ہوئے ہیں۔"

وہ سانس لینے کے لیے ایک ساعت خاموش ہوا تو میں نے [illegible] ہاری حالت میں اپنی جگہ سے حرکت کرتے ہوئے کہا۔ "[illegible] وادی الماس کے جس جھتے میں ہمارا انتظار کر رہے ہیں، کیا اس کے علاوہ کوئی دُوسرا راستہ موجود نہیں، جہاں سے ہمارا قافلہ سلامتی سے آگے جا سکتا ہو؟"

"یہاں سے چھ کوس کے فاصلے پر ایک ٹیلہ موجود ہے جسے لوگ کالا کاس کا ٹیلہ کہتے ہیں۔ وہاں پر دریا کا پاٹ بہت تنگ ہو جاتا ہے۔ وہ ٹیلہ دُور سے دیکھنے پر یوں نظر آتا ہے جیسے کوئی صحرائی اونٹ اپنی لمبی گردن دریا کے کنارے ٹکائے کھڑا ہو... وہاں دریا کی گہرائی اس قدر کم ہے کہ تم اپنی گھوڑا گاڑیاں آسانی سے گزار سکتے ہو... لیکن یہ کام تمھیں رات کے اندھیرے میں کرنا ہوگا۔ یہی ایک ایسا راستہ ہے جو تمھارے قافلے کی سلامتی کا باعث بن سکتا ہے۔ ورنہ اسی راستے سے آگے بڑھتے رہے تو تمھیں گل خان کی بستی سے گزرنا پڑے گا۔ وہاں میرے ساتھی تمھاری گھات میں بیٹھے ہیں۔ میں نے غلطی کی جو ادھر نکل آیا۔ مجھے بھی اُن کے ساتھ ہی شامل ہو جانا چاہیے تھا۔"

وہ بولتے بولتے رُک گیا تو مجھے احساس ہوا کہ میرے ساتھی زخمی اکبر خان سے باتوں کے دوران آ کر میرے عقب میں کھڑے ہو گئے ہیں۔

اکبر خان بُری طرح کراہ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر پھیلتی ہوئی زردی سے معلوم ہوتا تھا کہ اب وہ لمحہ اس سے زیادہ دُور نہیں ہے جب اس کی سانسوں کا سلسلہ اچانک ٹوٹ جائے گا۔

"گل خان کی بستی یہاں سے کتنی دُور ہے اور وہاں پر ہمارے دشمنوں کی تعداد کتنی ہے؟"

"گل خان! ہمارا ہی ایک ساتھی ہے جو دریا پار کرنے والے قافلوں پر حملے کر کے انھیں لوٹ لیتا ہے۔ وہاں دو سو مسلح جوان تمھارا راستہ روکنے کے لیے تیار ہوں گے۔ جیسے ہی یہ خبر مل رہی ہے کہ تمھارے قافلے میں اس قدر اسلحہ موجود ہے جو اس کی سال بھر کی ضرورت پوری کرنے کے لیے کافی ہوگا، وہ بستی گل پہنچ رہا ہے۔ گل خان تمھارے ہتھیاروں پر قبضہ کر کے اس علاقے میں خود کو طاقتور بنانا چاہتا ہے۔ اگر تم نے میرے بتائے ہوئے راستے سے دریا عبور نہ کیا تو اُن کے خوابوں کی تعبیر تمھیں بڑی آسانی سے مل جائے گی۔" وہ خاموش ہو کر ایک بار پھر کراہنے لگا۔ بار بار اس کا ہاتھ کندھے کو دبا رہا تھا۔ تب میں نے دیکھا کہ گولی کندھے سے سینے کی طرف جھکی ہوئی حالت میں لگی ہے اور اب اس کا زندہ رہنا محال ہے۔ یکایک میرے ہاتھوں کو جنبش ہوئی اور رائفل کی گولی ایک ہولناک دھماکے کے ساتھ اس کے دل میں اُتر گئی۔

وہ گولی کھاتے ہی اُچھلا اور لمحے بھر میں بے حرکت ہو گیا۔

میں نے پلٹ کر اپنے ایک ساتھی کی طرف دیکھا اور کہا "اس کی تلاشی لے کر اسلحہ اپنے قبضے میں کر لو لاش اٹھا کر ڈھلان میں لڑھکا دو۔"

میں گھوڑے پر سوار ہو کر پڑاؤ کی طرف جانے والے راستے پر چل دیا... شاکر خان راستے میں ایک جگہ میرے بابا کے ساتھ اپنے گھوڑے پر بیٹھا دکھائی دیا۔ مجھ سے نظریں چار ہوتے ہی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ میرے بابا سے کہنے لگا "میں نے غلط نہیں کہا تھا۔ شاہ یار خان! تمھارا بیٹا صف شکن

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے... اور یقیناً خُدا کا غیبی ہاتھ اُس کی مدد کر رہا ہے۔ خُدا تمھاری عمر دراز کرے۔ نہ جانے تم کتنے مصیبت زدہ لوگوں کے لیے مسیحا بن کر آئے ہو!" آخری جملہ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا تو میں اس کے انکسار سے مُسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

میں نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور اُسے پڑاؤ کی طرف بڑھا دیا۔ میرے وہاں پہنچتے ہی محراب خان بھی اپنے ساتھیوں کو لے کر وہاں پہنچ گیا اور مُسکراتے ہوئے بولا: "دوست! تم نے وہ کام کر دکھایا ہے کہ بس مزا ہی آ گیا۔ مجھے حیرت ہے کہ یہ ہتھیار تمھارے فرنگی دوستوں نے کیوں استعمال نہیں کیا؟"

"اُنھیں ایک بہت بڑی مہم درپیش تھی۔ شاید اسی لیے بچا کر رکھنا چاہتے ہوں گے۔" میں نے جواب دیا۔

"ایسے اور کتنے ہتھیار تمھارے پاس موجود ہیں جو بیک وقت بہت سے دشمنوں کو موت کے گھاٹ اُتار سکتے ہیں؟"

اس نے سادگی سے پوچھا تو میرے حلق سے بے اختیار ایک قہقہہ اُبل پڑا... پھر میں نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

"میں ان ہتھیاروں کی صحیح تعداد بتا کر تمھیں قبل از وقت کسی خوش فہمی کا شکار نہیں کرنا چاہتا۔"

"تمھاری ہر بات منفرد ہے۔" وہ کھسیا کر ہنس پڑا۔

"محراب خان!" میں نے نرمی سے کہا: "کیا تم کاراکاس نامی ٹیلے کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟ میں وہیں سے دریا عبور کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔"

"اس ٹیلے کے بارے میں تم نے کہاں سے سُن لیا؟ بے شک وہاں سے گزرنے کا راستہ موجود ہے مگر اس راستے میں دلدل پھیلی ہوئی ہے جہاں ہمیں قدرتی خطروں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ہم گل خان کی بستی سے دریا پار کر کے وادیٔ فرغان میں جا پہنچیں گے۔ وہاں لکڑی کا ایک مضبوط پُل موجود ہے جسے استعمال کرنے کا کچھ معاوضہ وصول کر کے بستی کے لوگ قافلوں کو آگے جانے دیتے ہیں۔"

"تمھارا کہنا درست ہے لیکن اس میں ایک قباحت ہے۔ منصوری قبائل اور اس کے حامی قبیلوں کے مسلح لوگوں کی ایک بڑی تعداد ہمارے استقبال کے لیے وہاں پہلے سے موجود ہے۔ ہماری گاڑیوں میں موجود اسلحے کی افواہیں سُن سُن کر کرمت کے ان گنت تاجر گل خان کی بستی میں جمع ہو چکے ہیں اور ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔ یہ اسلحے سے لدی ہوئی گاڑیاں... دراصل آزادی کی جنگ لڑنے والے سپاہیوں کی امانت ہیں۔ اگر ان گاڑیوں پر لٹیروں اور قاتلوں کا قبضہ ہو گیا تو مخالف قبیلوں کا ایک ایک فرد موت کے گھاٹ اُتار دیں گے۔ میں دشمن سے ٹکرانے سے نہیں گھبراتا۔ مگر اسلحے سے لدی ہوئی گاڑیوں کو شیطان کی دسترس سے محفوظ رکھنے کے لیے تصادم سے گریز پر مجبور ہوں۔ میں نے یہ وضاحت اس لیے کر دی ہے کہ اس صورتِ حال سے سارے قافلے کو باخبر کر دو۔ رات کا اندھیرا ہمارے لیے قدرتی پردے کا کام دے گا اور ہم راتوں رات دریا پار کر کے کسی محفوظ مقام پر پہنچ جائیں گے۔"

محراب خان نے اثبات میں سر ہلایا اور الاؤ کے گرد جمع ہونے والے ساتھیوں کو حالات سے باخبر کرنے لگا۔

کھانے سے فراغت پاتے ہی میں نے محراب خان کو اشارے سے اپنے پاس بلایا اور گرد و پیش پر گہری نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"محراب خان! ہم لوگ آدھی رات کو چاند طلوع ہوتے ہی سفر کا آغاز کر دیں گے تاکہ اُجالا پھیلنے سے پہلے پہلے دریا پار کر کے کسی محفوظ مقام پر جا پہنچیں۔ اپنے کچھ ساتھی قافلے کی نگرانی پر مقرر کر دو اور انھیں یہ ہدایت کر دو کہ وہ اس راستے کا خاص خیال رکھیں جو گل خان کی بستی کی طرف جاتا ہے۔ ادھر سے ہی دشمن کی آمد متوقع ہے۔ زخم خوردہ دشمن زخمی بھیڑیے کی طرح ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ گل خان کی بستی میں انتظار کی طوالت سے اُکتا کر پیش قدمی کا فیصلہ کر بیٹھے۔"

محراب خان نے اثبات میں سر ہلا دیا اور غار سے نکل گیا۔

میں نے اس طرف دیکھنے لگا جہاں میرا شیر دل بابا دلبر خان کی کوئی بات بڑی توجہ سے سُن رہا تھا۔

"دلبر!" میں نے ایک ساتھی سے کہا: "اس باتونی بوڑھے کو الگ لے جا کر سمجھاؤ کہ میرے بابا کو تنہا چھوڑ دے تاکہ اُسے کچھ دیر کمر سیدھی کرنے کا موقع مل جائے۔"

دلبر خان نے مُسکراتے ہوئے کہا: "یہ بے ضرر بوڑھا تمھارے بابا سے گہری عقیدت رکھتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ اس کے ہٹانے سے تمھارا بابا ناراض ہو جائے۔ وہ خود بھی تو زیادہ سے زیادہ وقت اس کے ساتھ گزارنا چاہتا ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن تم شعور ترشاکر خان کو بھی ہونا چاہیے کہ وہ بابا کی جسمانی تکلیف کا احساس کرے اور انھیں

آرام کرنے کا موقع دے۔"

دلبر خان اُن دونوں کی طرف بڑھ گیا تو میں پڑاؤ کا ایک چکر لگاتا ہُوا میدانی حصے کے ایک خیمے میں آ گیا۔ کچھ دیر بعد بابا بھی وہیں آ گیا۔ غالباً دلبر خان، شاکر خان کو سمجھا بجھا کر وہاں سے ہٹانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ بابا آتے ہی بستر پر دراز ہو گیا اور میری طرف دیکھ کر مُسکرانے لگا۔

"میرا خیال ہے، اب صورتِ حال خاصی بدل گئی ہے اور قافلے کو خاصی دشواریاں پیش آ سکتی ہیں۔" بابا نے کہا۔

"ہاں لیکن قافلے کے تمام رکن جانباز ہیں اس لیے اللہ مالک ہے۔"

"اس مہم سے نمٹنے کے بعد مستقبل میں تمھارے کیا ارادے ہیں..."

"ایک سپاہی کا مستقبل اس کے علاوہ کیا ہو سکتا ہے بابا کہ وہ ایک جنگ سے نمٹ کر دوسری جنگ میں شریک ہو جائے..."

شالیار خان کا چہرہ اندرونی جوش و مسرت سے چمک اُٹھا۔ میں نے بستر پر دراز ہوتے ہی آنکھیں بند کر لیں اور پھر جلد ہی میری آنکھوں میں نیند اُتر آئی اور میں دُنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا۔

میں گہری نیند میں تھا کہ کسی کے جھنجوڑنے سے بیدار ہونا پڑا۔ آنکھیں کھول کر دیکھا تو محراب خان خیمے کے وسط میں کھڑا نظر آیا۔

"شہباز خان! چاند نکل آیا ہے اور قافلہ سفر کرنے کے لیے تیار ہے۔"

میں سر جھٹکتے ہوئے اُٹھا تو اپنے بابا کا خالی بستر دیکھ کر مجھے یہ اندازہ لگانے میں دیر نہ لگی کہ خطرات کو آس پاس منڈلاتے پا کر آج رات بھی وہ چند گھنٹے آرام کی نیند نہیں لے سکا۔

میں نے اپنے ہتھیار سنبھالے اور خیمے سے نکل آیا۔ میرے خیمے کے علاوہ سارا سامان باندھا جا چکا تھا۔ میں آہستگی سے قدم اُٹھاتا ہُوا اپنے گھوڑے کی طرف بڑھا۔ اتنی دیر میں چند جوانوں نے میرا خیمہ اُکھاڑا اور تہ کرنے میں مصروف ہو گئے۔

میں اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر اسلحے کی گاڑیوں کے قریب آ گیا جہاں شالیار خان بھی ایک طرف موجود تھا۔ اس کی سُرخ آنکھیں ایک غیر متزلزل عزم کا اظہار کر رہی تھیں۔ تھوڑی دیر صلاح مشورے کے بعد ہمارا قافلہ کاراکاس ٹیلے کی طرف چل پڑا۔

گھوڑوں کے قدموں سے اُبھرتی ہلکی آوازیں رات کے ہولناک سناٹے میں گونج رہی تھیں اور آدھی رات کا روشن چاند ہماری رہنمائی کر رہا تھا۔ سفر کی رفتار بے حد دھیمی اور سست تھی کیوں کہ راستہ غیر ہموار تھا اور تیز رفتاری خطرناک بھی ثابت ہو سکتی تھی۔

چاندنی میں چٹانی راستوں پر سفر کرتے ہوئے جہاں بھی کہیں کوئی سایا سا لہراتا تو اُسے محسوس کرتے ہی میرے عضلات ایک دم تن جاتے۔ آس پاس پھیلی بے ڈھنگی چٹانیں بھی مجھے اپنی دشمن نظر آ رہی تھیں۔

اب ہم عام راستے سے ہٹ کر دریا کے کنارے چل رہے تھے۔ چاندنی میں ہمیں وہ چٹان دُور سے ہی نظر آ گئی تھی جہاں سے ہمیں دریا پار کرنا تھا۔ محراب خان نے کاراکاس ٹیلے کی اوٹ میں اپنا گھوڑا روکتے ہوئے کہا: "شہباز خان! ہم نے اپنے سفر کا ایک مرحلہ طے کر لیا ہے۔ اب دوسرے مرحلے کے لیے مجھے تمھارا مشورہ درکار ہے۔ اگرچہ یہاں پانی بہت کم ہے لیکن یہ دلدلی علاقہ ہے۔ ممکن ہے یہاں خطرناک جانور بھی ہوں۔ اس لیے جب تک اُن سے نمٹنے کی حکمتِ عملی نہ طے کر لی جائے دریا میں گھوڑا ڈالنا مناسب نہ ہوگا۔" محراب خان کے لہجے میں گہری تشویش تھی۔

"تم دیکھو گے کہ اس خطرناک مرحلے کو بھی ہم بڑی آسانی سے طے کر لیں گے!" میں نے پُرسکون لہجے میں جواب دیا اور اپنے عقب میں آ کر رکنے والے ساتھیوں کی طرف دیکھنے لگا۔ "تم اپنے کچھ جوانوں کو لے کر یہیں ٹھہرو! میں ایک ضروری کام سے نمٹ کر آتا ہوں!" میں نے گھوڑے کا رُخ بدلا اور اُسے دوڑاتا ہُوا اسلحے کی گاڑیوں کے قریب پہنچ گیا۔

"دونوں گاڑیاں یہیں روک دو!" میں نے بُلند آواز میں کہا۔

دونوں گاڑیاں روک دی گئیں۔ ان کے رکتے ہی میں کود کر گھوڑے سے اُترا اور ایک گاڑی کے گرد بندھی ہوئی ترپال کھول کر ہٹا دی۔ اس وقت سب لوگوں کی نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ ترپال کا ایک کونا سرکاتے ہی مجھے دستی بموں کا وہ تھیلا مل گیا جس کی مجھے تلاش تھی۔ تھیلا نکال کر میں نے اپنی کمر کے گرد بندھی ہوئی چمڑے کی پیٹی سے باندھا اور پھر میرے ہاتھ اس مضبوط رسّے کے گچھے کو ٹٹولنے لگے جس سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ساتھ گاڑیاں باندھ کر میں اُنھیں دریا میں اُتارنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

میں نے دو موٹے رسّے نکال کر ایک ڈوری کی مدد سے اُنھیں دونوں بانسوں کے ساتھ باندھ دیا۔ اور یہی عمل میں نے دُوسری گاڑی کے ساتھ بھی کیا۔ اس کام سے نمٹنے کے بعد میں نے محراب خان کو آواز دے کر بُلایا۔

"محراب خان اب ان رسّوں کو دائیں بائیں چلنے والے گھوڑوں کے ساتھ باندھ کر دریا میں اُتر جاؤ۔"

جونہی گاڑیاں دریا میں اُتاری گئیں اور وہ قدم بہ قدم رینگتی ہُوئی آگے بڑھنے لگیں تو میں اس انتظام سے مطمئن ہو کر خود بھی اپنے گھوڑے کو سرعت سے تیزی سے ان سب کو پیچھے چھوڑتا ہُوا اُس دلدلی حصّے کی طرف بڑھنے لگا جس کے سبب میں ہر شخص تشویش کا شکار تھا۔

دلدلی حصّے میں سرکنڈے ہی سرکنڈے سر اُٹھائے کھڑے تھے ان کے درمیان آبی راستہ تھا جس سے ہمیں دریا عبور کرنا تھا۔ اگرچہ وہاں پانی زیادہ گہرا نہیں تھا لیکن دونوں طرف پھیلے ہُوئے سرکنڈوں سے کوئی نہ کوئی آفت نکل کر قافلے کے لیے نقصان کا باعث بن سکتی تھی۔

میں نے گھوڑا آگے رکھا۔

میری خواہش تھی کہ اس طویل آبی راستے پر میں تیزی سے آگے بڑھتا رہوں تاکہ کنارے تک پہنچنے سے پہلے پہلے عقب میں آنے والے قافلے کا راستہ صاف کر سکوں۔

میرے اور قافلے کے درمیان کئی گز کا فاصلہ پیدا ہو گیا تو میں نے گھوڑا روک کر دائیں بائیں دیکھا۔ سرکنڈوں میں مجھے سُرخ سُرخ آنکھیں دِکھائی دینے لگیں۔ یہ بے شمار آنکھیں دیکھ کر میرا ہاتھ تیزی سے دستی بموں والے تھیلے کی طرف بڑھ گیا۔

میں نے جائزہ لیا۔

تھیلے میں آٹھ دستی بم تھے۔

چند لمحے میں غور کرتا رہا۔۔۔ پھر میں نے باری باری تمام دستی بم نکالے اور اُنھیں دونوں طرف سرکنڈوں میں پھینک دیا۔ بڑے ہی خوفناک دھماکے ہُوئے۔ دُھواں ہی دُھواں پھیل گیا اور سرکنڈے پانی کے چھینٹوں کی طرح فضا میں منتشر ہو گئے۔

اطراف میں جیسے بھونچال سا آ گیا تھا۔

میں نے رائفل سنبھالی اور گھوڑے کو ایڑ لگا دی گھوڑا چھینٹے اُڑاتا ہُوا تیزی سے آگے بڑھنے لگا۔

میں گھوڑا دوڑاتا رہا حتّٰی کہ دریا کے پار جا پہنچا۔ دستی بموں کے دھماکوں کی وجہ سے سرکنڈوں میں موجود مگرمچھوں میں یقینی طور پر ہلچل مچ گئی ہوگی اور ان میں سے جو کوئی دکا بچ نکلا ہوگا وہ بھی مخالف سمت میں رینگ گیا ہوگا یہی وجہ تھی کہ قافلہ کا آخری سوار جب دریا کے کنارے پہنچا تو عقب میں آبی راستہ پُرسکون ہی نظر آ رہا تھا۔

"تم یہ دستی بم بڑی بے دردی سے استعمال کر رہے ہو شہباز۔" میرے بابا نے گھوڑا میرے قریب روکتے ہُوئے کہا۔

"پروا نہ کرو بابا۔ ہمیں جتنے بموں کی ضرورت پڑ سکتی ہے اس سے کہیں زیادہ گاڑیوں میں موجود ہیں۔" میں نے قہقہہ لگا کر کہا۔ "فرنگیوں نے اس سلسلے میں کم از کم مجھے اپنا شکر گزار ہونے کا موقع ضرور دیا ہے۔"

بابا شاید یہ سُن کر خاموش ہو گئے۔

جب ہم دریا کے پار پہنچے تو دُودھیا چاندنی اپنا اثر کھو چکی تھی اور گھوڑے تھکن سے چُور چُور ہو چکے تھے۔ دریا کے پانی نے تو کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا لیکن بھیگے ہُوئے جسموں پر تیز ہوا کے نشتر سُوئی کی طرح چبھنے لگ رہے تھے۔ ہر شخص ٹھٹھرا ٹھٹھرا سا لگ رہا تھا۔

تقریباً دو سو قدم کا فاصلہ طے کرنے کے بعد میں نے ایک چٹان کی آڑ میں قافلے کو ٹھہرنے کا حکم دیا تو سب نے اطمینان کی سانس لی۔ گھوڑے کی پیٹھ پر سفر کرتے ہُوئے سب لوگ موسم کی سختیوں کا شکار ہو رہے تھے۔ پڑاؤ ڈالتے ہی خشک لکڑیاں اکٹھی کر کے آگ جلائی گئی تو میں بھی الاؤ کے نزدیک آ گیا تاکہ آگ کی زندگی بخش حرارت سے جسم کے اکڑتے ہُوئے اعضا کو سکون دے سکوں۔

ناشتے سے فراغت حاصل کر کے کچھ لوگ آرام کرنے اپنے خیموں میں چلے گئے تو خان بابا نے مجھے مخاطب کر کے کہا "شہباز تم بھی کچھ دیر کے لیے اپنے خیمے میں چلے جاؤ اس وقت آرام کی، سب سے زیادہ تمھیں ضرورت ہے۔"

"خان بابا! یہ ایک باپ کی محبت ہے جو مجھے معمولی سی تکلیف میں بھی مبتلا نہیں دیکھ سکتی۔ ورنہ آرام کی سب سے زیادہ ضرورت تو تمھیں ہے جسے میں مسلسل کئی راتوں سے بیداری کی حالت میں دیکھ رہا ہوں۔۔۔ تم تھوڑے سے سردی کا شکار

کر دیا ہے۔ اب میں محراب خان سے بات چیت کر دوں تاکہ وادیٔ فرغان کے بارے میں کوئی لائحہ عمل طے کیا جا سکے۔"

"جیسے تمھاری مرضی۔" بابا نے مُسکرا کر کہا۔

"وادیٔ فرغان یہاں سے کتنی دُور رہ گئی ہے؟"

"صرف دس کوس کا فاصلہ ہوگا اگر ہم دوپہر کے بعد سفر کا آغاز کر دیں تو شام ہونے تک وہاں پہنچ جائیں گے۔"

"محراب خان! تمھارے جوان دوپہر تک سفر کے قابل ہو جائیں گے۔ مگر اب قافلے کی ترتیب میں تھوڑی سی تبدیلی کی ضرورت ہے۔" میں نے بابا کے چہرے سے نگاہ ہٹا کر محراب خان سے کہا۔ "میں اور خان بابا قافلے سے کافی فاصلے پر آگے آگے چلیں گے۔ تاکہ دُشمن ہمیں تنہا سمجھ کر ہمارے سامنے آ جائے۔ اس طرح ہم اُسے مغالطہ دے کر خود پر حملہ کرنے کی دعوت دیں گے۔ اور پھر جب وہ کھُل کر سامنے آ جائے گا تو باقی ساتھیوں کو اپنے ہاتھوں کی قوّت آزمانے کا موقع مل جائے گا۔ مگر تم اسی وقت مداخلت کرو گے جب تمھیں یہ یقین ہو جائے کہ ہم واقعی کسی خطرے سے دوچار ہو چکے ہیں۔ اگر اس کے برعکس عمل کیا گیا تو دُشمن کو اپنی مرضی کے مطابق لڑنے کا موقع مل جائے گا۔"

"تمھاری تجویز بہت عمدہ ہے۔" محراب خان تائید میں سر ہلاتے ہُوئے جواب دیا۔ "مگر اس میں ایک قباحت ہے اگر اُنھوں نے تمھیں دیکھتے ہی گولیاں برسانا شروع کر دیں تو کیا ہوگا؟"

اس کی سوالیہ نظریں میرے چہرے پر جم گئیں۔

"اس امکان کو رَد تو نہیں کیا جا سکتا ہے۔" میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "مگر امکان یہی ہے کہ وہ لوگ جب تک ہمیں بگولا سنگھ یا اس کے بیٹے دلیپ سنگھ کے سامنے پیش نہ کر دیں ہمیں قتل نہیں کریں گے اس طرح تم لوگ تعاقب کر کے ان کی کمین گاہ تک آسانی سے پہنچ سکو گے۔"

محراب خان دیر تک سر جھکائے میری باتوں پر غور کرتا رہا، پھر سر اُٹھاتے ہُوئے بولا۔ "کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ کچھ اور جوان بھی تمھارے ساتھ رہیں؟"

"دو آدمیوں کو سفر کرتے دیکھ کر اس کے جاسوس اپنے ساتھیوں کو کوئی اشارہ ضرور دیں گے اگر ہم نے ساتھیوں کی تعداد بڑھا دی تو وہ فوراً تصادم پر اُتر آئیں گے اور ہمیں آگے بڑھنے سے روکنے کی کوشش کریں گے اس طرح ممکن ہے بگولا سنگھ یا اس کے بیٹے تک پہنچنے کا ہمیں موقع ہی نہ ملے۔"

"یہ ترکیب معقول ہے۔" خان بابا نے اپنی رائے ظاہر کرتے ہُوئے کہا۔ "اس میں کسی خاص نقصان کا احتمال نہیں ہے اور کامیابی کے بھی خاصے امکانات ہیں۔ وہ ہمیں تنہا جان کر اپنے ساتھیوں کو اطلاع دینے کے بجائے خود گھیرنے کی کوشش کریں گے اور ہم بلا مزاحمت ان کی گرفت میں چلے جائیں گے۔۔۔ آدمیوں کی تعداد بڑھا دینے سے تمھارا منصوبہ ناکام ہو جائے گا۔ بگولا سنگھ کوئی معمولی آدمی نہیں ہے وہ ایک عرصے سے ان پہاڑوں پر قابض ہے براہِ راست تصادم سے وہ ہمارے ہاتھ نہیں آئے گا اور ہم ان پہاڑوں میں چکراتے رہ جائیں گے۔"

"ہم خود کو ایک نرم چارے کی طرح پیش کریں تو مجھے یقین ہے کہ اس کا کوئی نہ کوئی آدمی تمھیں ضرور پہچان لے گا اور ہمیں بلاتاخیر بگولا سنگھ کے سامنے پیش کر دے گا۔" میں نے کہا۔

"مجھے برسوں سے اسی وقت کا انتظار تھا۔" خان بابا نے ماضی کے دھندلکوں میں ڈوبتے ہُوئے جواب دیا۔ "وہ بھی بڑا ہی عجیب مرحلہ تھا جب اس نے مجھ سے سونا چھینا تھا۔ میں اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا تھا۔۔۔ پھر زندگی نے مجھے اتنی مہلت ہی نہیں دی کہ میں اس کی تلاش میں نکلتا۔" اس کے لہجے میں حسرت تھی اور آواز کا بھاری پن ان مجبوریوں کو ظاہر کرتا تھا جو اس کے لیے زنجیر بن گئی تھیں لیکن اس نے ماضی کی کوئی داستان نہیں سُنائی یُوں خاموش ہو گیا جیسے سب کچھ اپنے سینے میں دفن کر لیا ہو۔

"مجھے یقین ہے بابا تمھاری یہ دیرینہ آرزو پوری ہوگی۔" میں نے مُسکرا کر کہا تاکہ اس کے ذہن پر چھایا ہُوا غبار چھٹ جائے۔

وادیٔ فرغان میں داخلے کا لائحہ عمل طے ہو جانے کے بعد مجھے پہلی بار یاد آیا کہ بگولا سنگھ نے میرے بابا سے کن حالات میں سونا چھینا تھا۔ وادیٔ خوف میں پیش آنے والے واقعات میری نگاہوں کے سامنے گھومنے لگے۔ یہ واقعات میں نے اپنے بابا کی یادداشت میں پڑھے تھے اور آج بھی لفظ بہ لفظ مجھے یاد تھے۔

●

میری آنکھ کھُلی تو گھوڑوں کی ہنہناہٹ میرے کانوں سے ٹکرائی۔

"شہباز!" محراب خان کی آواز سُنائی دی۔ "قافلہ روانگی کے لیے تیار ہے میں نے تمھارے گھوڑے کی زین کس دی ہے۔"

میں ایک دم اُٹھا اور خیمے سے باہر آ گیا۔

شاید خان الاؤ کے قریب گھوڑے کی باگیں تھامے کھڑا تھا اور اس کی نظریں میرے خیمے پر جمی ہُوئی تھیں۔ مجھے دیکھ کر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لپیٹ دیا میں آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا ہوا اس گھوڑے کی طرف بڑھا جو اسٹور گاڑی کے قریب کھڑا تھا۔

تھوڑی ہی دیر بعد قافلہ روانہ ہو گیا۔

شام کے سائے گہرے ہو گئے تو قافلہ ایک سیاہ پہاڑ کے دامن میں رُک گیا۔ یہاں سے آگے گھوڑا گاڑیوں سے جانا تقریباً ناممکن نظر آتا تھا۔ بلندی کی سمت جاتے ہوئے راستے پر دیر تک میری آنکھیں جمی رہیں مگر کوئی ایسی قابلِ عمل تجویز میرے ذہن میں نہ آسکی جو اسلحے سے لدی ہوئی گاڑیوں کو چوٹی تک لے جانے میں معاونت کر سکتی۔۔۔ مجبوراً پہاڑ کے دامن میں ہی رُک جانا پڑا۔

"شہباز! میرا خیال ہے، ہمیں اب ان گاڑیوں سے نجات حاصل کرنا پڑے گی۔" خان بابا نے نرمی سے کہا "میرا خیال ہے، انھیں کسی محفوظ مقام پہ چھپا دیں اور کچھ جوان ان کی حفاظت کے لیے یہیں چھوڑ دیں۔ جتنے اسلحے کی ضرورت ہے، وہ تقسیم کر دیا جائے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ ان پہاڑوں کے ایک طرف نصف کوس کے فاصلے پر ایسے کئی قدرتی غار موجود ہیں جہاں یہ گاڑیاں برسوں تک لوگوں کی نظر سے محفوظ رہ سکتی ہیں۔"

"ٹھیک ہے!" میں نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

رات کا پہلا پہر ختم ہونے تک گاڑیوں سے فہرست کے مطابق اسلحہ اُتار کر ہم نے انھیں ایک ایسے غار میں پوشیدہ کر دیا جہاں کسی کا دھیان بھی نہیں جا سکتا تھا۔ دو جوانوں کو ان گاڑیوں کی حفاظت کے لیے مامور کر کے باقی قافلہ بلند راستے پر چل دیا۔

یہ رات کسی ہنگامے کے بغیر ہی گزر گئی۔

صبح کا دُھندلکا ابھی نمودار ہو رہا تھا کہ مجھے اپنے بابا کی لُہجہ دار آواز سُنائی دی "شہباز! ہمیں اب قافلے سے الگ ہو جانا چاہیے!"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا اور ہم قافلے سے رخصت ہو کر گھوڑے دوڑاتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ یہ علاقہ میرے بابا کا دیکھا ہوا تھا اس لیے ہمیں منزل کی طرف بڑھنے میں کوئی دشواری نہیں ہو سکی تھی۔ تقریباً دو گھنٹے کا طویل اور تھکا دینے والا سفر طے کر کے ہم ایک بلند چوٹی پر پہنچ گئے تو اچانک خان بابا نے اپنا گھوڑا روک کر مجھے خبردار کرتے ہوئے کہا "دشمن کی سرحد شروع ہو چکی ہے۔ اب ہمیں سُست رفتاری سے آگے بڑھنا ہوگا تاکہ دشمن کے جاسوس ہم دونوں کی موجودگی سے آگاہ نہ ہو سکیں۔"

ہم اس کُہستانی گھاٹی کو قدم بہ قدم طے کرنے لگے۔

تقریباً سو قدم کا فاصلہ طے کر کے ہم گھنے درختوں کے ایک جھنڈ میں داخل ہو گئے۔

شالیار خان شاہانہ وقار کے ساتھ اپنا گھوڑا دوڑاتا ہوا چنار درختوں کے جنگل میں گھس گیا تو میں نے جان بوجھ کر اپنا گھوڑا روکا اور پھر چند قدم کا فاصلہ دے کر اس کے پیچھے چلنے لگا۔ مجھے یہ خطرہ تھا کہ یہ جنگل کہیں ہمارے لیے خطرناک ثابت نہ ہو۔ درختوں کے اس گھنے جنگل میں داخل ہوتے ہی سورج کی روشنی ماند پڑ گئی تھی اور درختوں کے درمیان گزرتے ہوئے یوں محسوس ہونے لگا۔ جیسے ہم تاریکی کے سمندر میں چل رہے ہوں۔۔۔ مگر خان بابا ماحول کی ہولناکیوں سے بے پروا ابھی تک ایک ہی رفتار سے آگے بڑھتا جا رہا تھا جیسے وہ اس ہولناک اور تاریک جنگل کو پہلے بھی کبھی عبور کر چکا ہو۔

راستہ کہیں کہیں ایسی تاریکی میں ڈوب جاتا کہ مجھے خان بابا ایک دھندلے سائے کی طرح نظر آنے لگتا۔ پھر اچانک اس نے گھوڑا روکا اور کندھے سے رائفل اُتار کر دائیں جانب ایک درخت کی طرف گولی چلا دی۔ ایک زبردست دھماکا ہوا اور اژدھے کی خوف ناک پھنکار اُبھری۔ اور اس کی دو شاخہ زبان بجلی کے کوندے کی طرح لہراتی ہوئی ہمارے راستے میں آ کر ساکت ہو گئی۔

اژدھے کا خوف ناک وجود ہمارے راستے میں عمودی چٹان کی طرح ۔۔۔ خان بابا نے اژدھے پر زندگی کے تاریک ترین رائفل کی دوسری گولی بھی ضائع کر دی۔ ایک ہولناک دھماکے کے ساتھ اس کا بھاری بھرکم وجود ۔۔۔ ہوا اُچھلا اور درختوں کی شاخوں سے اُلجھ

للکار
اظہر کلیم
دو جلدوں میں
جلد اول =/150 جلد دوم =/150
مکتبہ القریش
سرکلر روڈ اردو بازار لاہور
فون 7668958

کر بے حرکت ہو گیا۔ اژدھے کی موت کا یقین ہوتے ہی خان بابا نے اپنے گھوڑے کو گھما کر راستہ چھوڑ دیا اور درختوں کی آڑ لیتا ہوا چل پڑا۔

ابھی چند گز کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ ایک خوف ناک شعلہ سنسناتا ہوا شالیار خان کے سر سے گزر کر ایک تناور درخت کے وسط میں پیوست ہو گیا۔ میں نے یکدم گھوڑے کی باگیں کھینچ لیں۔ خان بابا پلک جھپکتے ہی جھکا، گھوڑے کی گردن سے چمٹ گیا اور ایڑ لگاتا ہوا اس مقام سے آگے نکل گیا مگر میں نے اُسی جگہ رُک کر حرکت ہوتے ہوئے اُس سمت میں نگاہیں گاڑ دیں جدھر سے رائفل کے اُگلے ہوئے شعلے نے دُشمن کی نشان دہی کی تھی۔

میرا ہاتھ رائفل کے گھوڑے پر سختی سے جم گیا اور خطرے کا لاشعوری احساس شدت کے ساتھ اُبھر آیا۔ معاً رائفل کا دھماکا دوبارہ سُنائی دیا اور ایک گولی میرے سر سے بالشت بھر اُوپر شاخوں کو اُڑاتی ہوئی تاریکی کا حصہ بن گئی مگر میں اپنے نامعلوم دشمن کو مزید فائر کا موقع دیے بغیر حرکت میں آ چکا تھا۔ میں نے اپنے گھوڑے کو ایک قریبی تنے کی اوٹ میں کر لیا اور محتاط اندازے کے مطابق اُسی درخت کو اپنا نشانہ بنایا جہاں سے کسی رائفل کا شعلہ بلند ہوا تھا۔

میرے فائر کے جواب میں دوسری طرف سے پھر کسی نے مجھ پر موت کا دہانہ کھول دیا اور یکے بعد دیگرے کئی گولیاں اُس تنے میں آ کر پیوست ہو گئیں جس کے پیچھے میں موجود تھا۔ گولیوں کی بوچھار ایک سے زیادہ آدمیوں کی موجودگی ظاہر کر رہی تھیں اور میں جان چکا تھا کہ میرے نامعلوم دُشمن اُس درخت کی شاخوں میں پوشیدہ ہیں جسے میں پہلے ہی نشانہ بنا چکا تھا۔ گولیوں کی مخالف سمت سے آنے والی متواتر بوچھاڑ سے میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ میری گولی دُشمن کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکی لیکن میں خود بھی دُشمن کی برسائی ہوئی آگ سے محفوظ تھا۔ میں نے رائفل سیدھی کی اور دو فائر جھونک دیے۔ اِس بار رائفل کے خوف ناک شعلے نے ایک دُشمن کو چاٹ لیا۔۔۔ ایک دہشت ناک چیخ اُبھری۔ کوئی سرکس کے بازیگر کی طرح قلابازیاں کھاتا ہوا دھپ کی آواز کے ساتھ پتھریلی زمین پر گرا تو میرے حلق سے اطمینان کی گہری سانس نکل گئی۔ دھماکوں کی بازگشت سارے جنگل میں آوارہ رُوحوں کی طرح چیختی رہی اور سارا علاقہ میدانِ جنگ کا منظر پیش کرنے لگا۔ کہیں دُور گِدھوں کا ایک جوڑا اپنے پَروں کو سمیٹتا ہوا بلندیوں کی طرف پرواز کر گیا۔

میری رائفل نے دو اور شعلے اُگلے مگر بے کار گئے۔ دُشمن اب ہوشیار ہو گیا تھا۔ اُس نے شاید میری حکمتِ عملی بھانپ لی تھی۔ اس

نامور مصنف محمود احمد مودی
وہی تحریر اور وہی انداز
کے ساتھ، اپنے چاہنے والوں
کے لئے ایک نئی سوغات لئے
نجات
PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk
مکتبہ القریش
سرکلر روڈ اردو بازار لاہور
7668958

کی دو گولیاں یکے بعد دیگرے میرے سر کے اوپر شاخوں کو اڑاتی ہوئی گزر گئیں تو میں نے اس شاخ کو اپنا نشانہ بنا کر آخری گولی چلا دی جو کارگر رہی۔ دشمن ایک کریہہ چیخ کے ساتھ درختوں کی شاخوں سے الجھتا ہوا اندھیرے کے سمندر میں غائب ہو گیا۔ اس سے نمٹتے ہی میں نے گھوڑا آگے بڑھایا اور اندازاً اسی سمت چل پڑا جدھر تھوڑی دیر پہلے خان بابا گیا تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ گولیوں کی آوازیں خان بابا کی سماعت سے ضرور ٹکرائی ہوں گی اور میری طرف لپکتی ہوئی موت کی آگ دیکھ کر اسے سمجھ لینا چاہیے تھا کہ میں اپنے نامعلوم دشمنوں کے ساتھ جنگ میں الجھ چکا ہوں . . . پھر کیا وجہ ہے کہ اس نے پلٹ کر میری خبر نہیں لی؟ شاہ یار خان کوئی بزدل یا مصلحت کوش شخص نہیں تھا کہ اپنے بیٹے کو موت کی آگ میں تنہا چھوڑ کر اپنا دامن صاف بچا جاتا۔ اس کی خاموشی بلاشبہ کسی ہولناک حادثے کا پیش خیمہ ہے۔ اچانک دہشت کی ایک تیز لہر مجھے اپنے جسم کے رگ و پے میں سرایت کرتی محسوس ہوئی اور خطرات کے ان گنت عقارب مجھے اپنے جسم میں رینگتے محسوس ہونے لگے۔

میں گھوڑا دوڑاتا ہوا تیزی سے اس تاریک جنگل کو عبور کرنے لگا مگر دور دور تک مہیب سناٹے فرشِ راہ تھے۔ خاموشی اور تنہائی روح کے قالب میں اترتی جا رہی تھی۔ اپنے باپ سے جدائی کا روح فرسا احساس اجاگر ہوتے ہی میرے دل و دماغ مختلف الجھنوں کی آماجگاہ بن گئے۔ خیالات کی رفتار میرے گھوڑے کی رفتار سے کہیں زیادہ تیز تھی۔ میں اندھا دھند اپنا گھوڑا دوڑاتا ہوا دور نکل آیا مگر اپنے ہی گھوڑے کی ٹاپوں کی کھٹ کھٹ کے سوا کوئی اور صدا ایسی نہیں تھی جس پر کسی انسان کی موجودگی کا گمان کیا جا سکتا۔ تب اچانک ہی ایک خیال ذہن کی کسی تہہ سے ابھر کر پردۂ شعور سے متصادم ہوا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ میں خان بابا سے آگے نکل آیا ہوں اور وہ عقب میں میری تلاش میں سرگرداں ہو کر کسی انجانی سمت نکل گیا ہو۔ جدائی کا وقفہ جوں جوں طویل ہوتا جا رہا تھا میرے خدشات گہرے ہوتے جا رہے تھے۔

معاً میں گھوڑے کا رخ پھیر کر دوبارہ اسی راستے پر چل پڑا، جدھر سے آیا تھا۔ واپسی میں گھوڑے کی رفتار دھیمی رکھی تھی . . . تاکہ گرد و پیش کا مشاہدہ کرنے میں آسانی رہے مگر عجیب ماحول کی تاریکی اعصاب پر اثر انداز ہونے لگی تو میں نے گھوڑا روک کر وہ بیٹری نکالی جسے میں احتیاطاً اپنے ساتھ لے آیا تھا۔

تاریک راستے پر گزرتے ہوئے، گاہے بگاہے آس پاس روشنی ڈالتا جا رہا تھا۔ یہ روشنی مجھے بے نقاب کر سکتی تھی مگر میں اپنے باپ کو خطرے میں محسوس کرتے ہوئے، ذاتی تحفظ سے بے پروا ہو کر، اس کی تلاش جاری رکھے ہوئے تھا۔ شاہ یار خان کی طرف لپکنے والے ہر خطرے کو اپنے وجود میں سمیٹ لینا . . . میں اپنے فرض کی سب سے بڑی پکار سمجھتا تھا۔ دائیں جانب اچانک ایک خفیف سی آواز سن کر میں ٹھٹکا اور گھوڑے کی مہاریں کھینچ کر اسے آگے بڑھنے سے روک دیا۔ اچانک کچھ سائے اپنی طرف لپکتے پا کر میں نے سنبھلنے کی کوشش کی مگر مجھے دیر ہو چکی تھی۔ دشمن نے خوب صورت جانسا دے کر مجھ پر سیاہ جال پھینکا تھا اور میں بے خبری کے باعث اس میں الجھتا چلا گیا تھا۔

میں نے رسیوں کے اس مضبوط جال سے خود کو آزاد کرنے کی بھرپور کوشش کی مگر دشمن میرے اندازے سے کہیں زیادہ ہوشیار تھا، اس نے یک لخت زبردست جھٹکا دے کر جال کس دیا تو مجھے اپنے دونوں بازو کندھوں سے اکھڑتے محسوس ہونے لگے اور پھر آخری جھٹکے نے تو میرے دونوں ہاتھ سینے کے ساتھ باندھ کر مجھے بے بس کر دیا . . . اور پھر یہ جال آہستہ آہستہ جھٹکے کھاتا ہوا اوپر اٹھنے لگا۔ میرے پاؤں رکابوں سے نکل کر فضا میں جھولنے لگے اور جال کی مضبوط رسیاں میرے گوشت میں دھنسنے لگیں۔ سینے پر رسیوں کا دباؤ سخت ہونے کی وجہ سے مجھے اپنی سانسوں کی آمد و رفت میں رکاوٹ اور گھٹن کا احساس ہونے لگا۔ میں بے بسی کی حالت میں تلملاتا ہوا فضا میں ٹانگیں چلانے لگا۔ جسمانی تکلیف اپنے نقطۂ عروج پر تھی اور میں ابھی اس تکلیف سے گلوخلاصی کی کوئی واضح اور کارگر ترکیب سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک کسی کا خوف ناک قہقہہ، پگھلی ہوئی آگ کی طرح میرے کانوں کے پردے تک اترتا چلا گیا۔

"اگر کچھ دیر اور اسی طرح اپنے معلق وجود کو جھٹکے دیتے رہے تو یقیناً زندگی کی ہر تکلیف سے آزاد ہو جاؤ گے۔" میں اس کریہہ آواز کو سنتے ہی چونک گیا اور پاؤں روک لیے۔ کسی نے رواں پشتو میں مجھ پر زہریلا فقرہ کسا تھا جو میرے وجود کی گہرائیوں میں انتقام کے دہکتے انگارے بھر گیا۔

"تم کون ہو؟ سامنے آ کر بہادروں کی طرح بات کرو۔ یہ تو عورتوں کا شیوہ ہے کہ وہ ہمیشہ پس پردہ رہ کر بات کرتی ہیں۔ مردوں کو ان کا طریقہ اپنانا زیب نہیں دیتا۔" میں نے کرخت لہجے میں اسے غیرت دلائی۔

"ابھی! میں تمہاری یہ خواہش ضرور پوری کروں گا۔" استہزائیہ لہجے میں جواب دیا گیا . . . اس کے ساتھ ہی ایک طویل قامت آدمی درخت کی گھنی شاخوں سے نکل کر نیچے کود پڑا اور پھر اس نے فوراً ہی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایک مشعل روشن کر لی جس کی روشنی میں چند لمحے ہم دونوں گہری نظروں سے ایک دوسرے کا جائزہ لیتے رہے۔

"نوجوان! تم کون ہو اور مجھ بے قصور کو کس جرم میں گرفتار کیا گیا ہے؟" میں نے حالات کی نزاکت کے پیش نظر لہجے میں نرمی پیدا کرتے ہوئے سوال کیا۔

"کون کہتا ہے کہ تم بے قصور ہو؟" اس کے لہجے میں بلا کی درندگی تھی۔ "تم . . . تم قاتلوں کے اس خوف ناک گروہ کے سرغنہ ہو جس نے آس پاس کی بستیوں میں ایک ایسا کہرام برپا کر دیا ہے جس کی کوکھ سے جنم لینے والی دلدوز چیخیں اس سرزمین پر تاابد سنائی دیتی رہیں گی۔ تم اور تمہارے درندہ صفت ساتھیوں نے بستیاں اجاڑ کر، گھروں کو ویران کر دیا ہے۔ تباہی اور بربادی تمہاری ہم رکاب رہی ہے۔ میرے باپ اور اس کے عم زادوں کو بے دردی سے ہلاک کرنے کے بعد بھی تمہارا یہی اصرار ہے کہ تم بے قصور ہو؟"

غیظ و غضب کی زیادتی سے اس کے ہونٹوں سے سفید سفید جھاگ اڑنے لگے۔ اس کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ میرے لیے سزائے موت تجویز کر چکا ہے اور اپنے انتقام کی آگ سرد کرنے کے لیے اس نے مجھے مختلف مرحلوں میں ختم کرنے کا تہیہ کر رکھا ہے۔

"نوجوان! تم کسی بڑی غلط فہمی کا شکار ہو۔" میں نے لہجے کو پرسکون بناتے ہوئے جواب دیا۔ "میں نے تمہیں زندگی میں پہلی بار دیکھا ہے اور میری تم سے دور کی بھی دشمنی نہیں۔ تمہارا یک طرفہ فیصلہ میرے ساتھ سراسر زیادتی ہے۔"

میرا جواب سن کر اس کے حلق سے درندگی آمیز غراہٹیں بلند ہونے لگیں اور وہ غصے کی زیادتی سے چنگھاڑتا ہوا بولا۔ "افضل خان! اپنے وفادار ساتھیوں کو لے کر اپنی کمین گاہ سے نکل آؤ . . . سفاک قاتل گرفتار ہو چکا ہے لیکن ابھی تک یہ اپنے آپ کو معصوم و مسکین ظاہر کر رہا ہے۔"

دفعتاً بہت سے لوگ درختوں کی شاخیں ہٹاتے ہوئے دھم دھم کی آوازوں کے ساتھ کودتے ہوئے میرے اردگرد جمع ہونے لگے۔ کچھ ہی دیر بعد تقریباً دس آدمی میرا گھیراؤ کیے ہوئے تھے۔ تب ایک ٹھگنے قد کا بدمعاش صورت شخص آگے بڑھ کر میری ٹانگوں کو جھٹکے دیتے ہوئے اپنے نوجوان ساتھی سے مخاطب ہوا۔ "عاقل خان! میں تمہیں اپنے باپ کے قاتل کو پکڑنے پر مبارک باد دیتا ہوں۔" اس کے لہجے سے ہلکی سی خوشامد جھلک رہی تھی۔

"مگر یہ تو خود کو مظلوم ظاہر کر رہا ہے۔" عاقل خان نے تضحیک آمیز انداز میں کہا۔ "میرا خیال ہے جب تک مجرم اقبالِ جرم نہ کرے، اس وقت تک کوئی سزا تجویز کرنا انصاف کے منہ پر کالک ملنے کے مترادف ہے۔ افضل! ہاں، تم ایسے ضدی اور اڑیل آدمیوں کی زبان کھلوانے میں خاصی شہرت رکھتے ہو۔ کیا تم اس عیار شخص کی زبان کھلوانے میں بھی کامیاب ہو سکتے ہو؟"

"کیوں نہیں؟" افضل خان نے زہرخند سے جواب دیا۔ "مگر مجرم ذرا سخت جان معلوم ہوتا ہے۔ ہاں تو میرے بھولے قاتل! اب تم شروع ہو جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ میرا غصہ تمہارے جسم کا کوئی حصہ الگ کر دے۔" اس نے میری دونوں ٹانگیں تھام کر ایک زبردست جھٹکا دیا۔ جھٹکا کھاتے ہی میری ریڑھ کی ہڈی میں تکلیف کی لہر دوڑ گئی اور جسم کے گرد لپٹا ہوا جال مزید سخت ہو گیا۔ جال کی رسیاں گوشت میں دھنس کر ہڈیوں سے ٹکرانے لگیں۔

اچانک رائفل کا کندہ میرے کولہے کی ہڈی پر کاری ضرب لگاتا ہوا فضا میں لہرا کر جب بار بار یہی عمل دہرانے لگا تو مجھے اپنی آنکھوں کے سامنے ان گنت چنگاریاں سی اڑتی محسوس ہوئیں، جیسے درد کی تمام شدتیں سمٹ کر میری آنکھوں میں اتر آئی ہوں اور میری بصارت کے سامنے لاتعداد جگنوؤں نے دیوار کھڑی کر دی ہو۔ اس طرح میرے جسم کا ایک بھی حصہ ان کی مسلسل ضربوں سے محفوظ نہ رہ سکا۔

ان ہاتھوں کی مشقِ ستم ابھی جاری ہی تھی کہ اچانک رائفل کا خوف ناک دھماکا سن کر میرے دشمنوں کے ہاتھ رک گئے اور عاقل خان، جو اس گروہ کا سرغنہ معلوم ہوتا تھا، یہ دھماکا سنتے ہی بولا۔ "اسے درخت سے اتار کر غار میں لے چلو مگر پہلے اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دو تاکہ یہ کسی مددگار کو آواز دے کر ہماری نشاندہی نہ کر سکے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے مشعل بجھا دی۔

اس کی بات ختم ہوتے ہی ایک پھرتیلا نوجوان کسی چھپکلی کی طرح رینگتا ہوا درخت پر چڑھا اور ایک تیز دھار چھرے سے وہ رسہ کاٹ دیا جس کے سہارے میں بندھا ہوا لٹک رہا تھا۔ رسہ کٹتے ہی میں جال سے نکل کر پتھریلی زمین پر گر پڑا۔ میرے زمین پر گرتے ہی ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر ان میں سے کسی نے کپڑے کا ایک گولہ میرے حلق میں ٹھونس دیا اور پھر وہ بڑی بے دردی سے دھکیلتے ہوئے مجھے ایک جانب لے کر چل دیے۔ میں اس قدر الجھا ہوا تھا کہ مدافعت ممکن نہیں تھی۔

کچھ دیر اسی طرح درختوں کی شاخوں سے ڈھکے ہوئے راستے پر خاموشی سے سفر جاری رہا . . . پھر یہ تاریک جنگل بتدریج

ختم ہونے لگا اور ہم چھدرے درختوں کی ایک طویل قطار کے درمیان آگے بڑھنے لگے جہاں قدم قدم پر سورج کی زرتار کرنیں، درختوں کی سبز پتیوں سے چھن چھن کر زمین کے ننگے فرش پر لوٹ رہی تھیں۔ قدرے روشن راستے پر آجانے سے ڈھارس بندھی کہ شاید کوئی ایسا موقع مل جائے جو میرے دست بزنجیر حیات پژمردہ میں، تازگی کی ہلکی سی رمق ہی پیدا کردے تاکہ میں ایک بار پھر آزاد فضاؤں میں کوئی نغمۂ دلنواز چھیڑ سکوں... لیکن کوئی ایسا موقع نہ مل سکا۔ بالآخر ہم درختوں سے نکل کر قد آور گنجان جھاڑیوں کے درمیان چلتے ہوئے ایک بلند ٹیلے کے عقب میں پہنچ گئے جہاں ایک غار کا دہانہ تھا جو سرسری نظر ڈالنے سے دکھائی نہیں دے سکتا تھا۔

غار میں داخل ہوتے ہی گھوڑوں کی بلند اور بے ہنگم ہنہناہٹوں کی آوازوں نے ہمارا استقبال کیا اور دو طویل قامت آدمی غار کے اندرونی حصے سے نکل کر ہمارے سامنے آ گئے۔

"عاقل خان! یہ قیدی کون ہے؟ اور تم اپنی مہم کو ادھورا چھوڑ کر واپس کیوں چلے آئے ہو؟" اُن میں سے ایک نے بارعب آواز میں سوال کیا اور کینہ توز نظروں سے میرا جائزہ لینے لگا۔

"یہ شخص اُس قافلے کا ایک اہم فرد ہے، جس کی خاطر ہمیں اپنے پُرسکون خانگی ماحول سے نکل کر اس جنگل کو اپنا مسکن بنانے پر مجبور ہونا پڑا ہے۔" اس نے مجھے اُس کے سامنے دھکیلتے ہوئے جواب دیا۔

"مجھے شک ہے کہ یہ وہی شخص ہے جو میرے باپ لشکر خان اور اس کے بھائیوں کا قاتل ہے، جس کے بارے میں میں نے عہد کیا تھا کہ اس کے قاتلوں کو عبرت ناک موت ماروں گا۔"

"تم نے بہت اچھا کیا کہ اسے یہاں لے آئے۔" اُس نے اپنی گھنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے کہا "جبکہ اس نے اپنے دوسرے ساتھیوں کی نشاندہی کردی ہے۔"

یہ سنتے ہی، چشم زدن میں، مجھ پر یہ حقیقت عیاں ہو گئی کہ یہ لوگ کون ہیں؟ اور کیوں مجھے انتقامی کارروائی کا نشانہ بنانے پر تُلے ہوئے ہیں مگر میں تجاہلِ عارفانہ سے کام لیتے ہوئے خاموش رہنے پر مجبور تھا کیوں کہ ان درندوں نے مجھے قید کرکے میرے مُنہ میں کپڑے کا گولا ٹھونس دیا تھا تاکہ میری ہر صدائے احتجاج، زبان پر آنے سے قبل ہی گھٹ کر رہ جائے۔

"صنوبر خان یہ شخص اس قدر سخت جان ہے کہ دس آدمی مل کر اس کی زبان سے اپنے مطلب کی ایک بھی بات اُگلوانے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔" عاقل خان نے مجھ پر قہر آلود نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" صنوبر خان رعونت سے اپنا چٹیل سر ہلاتے ہوئے غرایا۔ "اس کے مُنہ سے کپڑا ہٹا دو تاکہ میں اندازہ لگا سکوں کہ اس کی زبان کیسے کھلوائی جا سکتی ہے۔"

میں تلملا کر رہ گیا۔

حلق سے کپڑے کا گولا نکلتے ہی میں نے چند طویل سانسیں لے کر اپنے سینے میں گھٹی ہوئی متعدد سانسوں کا بوجھ ہلکا کر دیا اور اپنے گم گشتہ حواس بحال کرتے ہوئے جم کر کھڑا ہو گیا پھر صنوبر خان کی شعلہ بار آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا: "تم لوگ ایک بے گناہ انسان کے ساتھ زیادتیاں کرکے قہر خداوندی کو دعوت دے رہے ہو۔ یاد رکھو، وقت آنے پر تمھیں اپنی ایک ایک حرکت کا جواب دینا پڑے گا۔ تمھارے ساتھیوں نے بلاوجہ مجھ پر تشدد کیا ہے اور میرے دل پر دشمنی کا سنگِ بنیاد نصب کیا ہے۔ میرے سینے میں آگ بھڑک اٹھی ہے جو شاید برفیلے پانی سے بھی نہ بجھ سکے۔ ابھی وقت ہے، مجھے آزاد کرکے اپنی زیادتیوں کی معافی مانگ لو، ورنہ یہ تاریک جنگل نہ صرف تمھارا بلکہ تمھارے تمام ساتھیوں کا مدفن ثابت ہو گا۔"

میرا بیان ختم ہوتے ہی سناٹا طاری ہو گیا۔

"نوجوان، میرا نام صنوبر خان ہے اور تمھیں بات کرتے وقت یہ خیال رکھنا چاہیے کہ اس وقت تمھاری حیثیت ایک اُفتادہ قیدی کی ہے، جسے میں کسی چیونٹی کی طرح مسل سکتا ہوں۔" صنوبر خان کے لہجے میں اس زخمی شیر کی دھاڑ مضمر تھی، جو کسی تناور درخت سے ٹکرا کر اپنے ہی زخموں کو چاٹنے پر مجبور ہو گیا ہو۔

"اگر تم میرے متعلق پہلے ہی کوئی فیصلہ کر چکے ہو تب میری لب کشائی فضول ہے۔" میں نے اُس کی دھمکیوں کو نظرانداز کرتے ہوئے جواب دیا۔

"یہ حقیقت ہے کہ تمھاری موت ناگزیر ہے۔" اُس کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ پھیل گئی۔ "مگر تمھیں صرف ایک فیصلہ کرنا ہے کہ کس صورت میں مرنا گوارا کرو گے؟ آسان موت یا سسک سسک کر دم توڑتی ہوئی اذیت ناک موت، جسے دیکھ کر فرشتۂ اجل بھی منہ پھیرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ فیصلہ تمھارے حُسنِ انتخاب پر ہے۔"

ان کے تیکھے تیور بتا رہے تھے کہ بات خالی دھمکیوں تک ہی محدود نہیں رہے گی۔ وہ واقعی میری موت کے درپے تھے اور مجھے تڑپا تڑپا کر ختم کر دینے پر تُلے ہوئے تھے۔ ان سب کی آنکھوں سے خون ٹپکتا سا تھا اور ان کی پُرشکن جبینوں سے یہی یوں ٹپک رہی تھی گویا وہ مجھے قسط وار مارنے کا ارادہ رکھتے ہوں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"صنوبر خان! تمھیں اختیار ہے کہ جو چاہے کہو اور جو چاہو کرو۔ کوئی تمھارا ہاتھ روکنے والا نہیں مگر یقین جانو، تم خود بھی جلد از جلد موت کے منہ میں چلے جاؤ گے۔ موت کی خاموش آہٹیں... تمھارے گرد حصار تنگ کر رہی ہیں کیوں کہ کچھ دیر بعد میرے جواں سال ساتھی، میری تلاش میں یہاں تک پہنچ جائیں گے۔" میرے لہجے کی سختی، کسی سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح اس کے حوصلوں کو متزلزل کرنے کے لیے کافی تھی۔

"عاقل خان! اس بدبخت کے پاؤں باندھ کر اُلٹا لٹکا دو اور ٹھٹھرے ہوئے پانی کے مشکیزے اس کے جسم پر انڈیل دو۔ شاید اس کے منتشر حواس ٹھکانے آ جائیں اور اسے اپنی حیثیت کا اندازہ ہو جائے۔ جب تک اس کی دھمکیوں کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا، کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا!"

ایک نوجوان مسکراتا ہوا آگے بڑھا اور میری دونوں ٹانگیں ایک موٹے اور مضبوط رسّے سے جکڑنے لگا پھر اُن میں سے تین آدمیوں نے مل کر میرے بھاری بھرکم وجود کو اپنے ہاتھوں میں سنبھالا اور اُٹھا کر غار سے باہر لے گئے پھر مجھے برگد کی ایک شاخ سے اُلٹا باندھ کر لٹکا دیا۔ جسم کا سارا خون نچڑ کر میرے چہرے پر جمع ہونے لگا اور مجھے اپنی آنکھیں حلقوں سے اُبلتی محسوس ہونے لگیں۔ عاقل خان اور اس کے ساتھی میری حالت پر قہقہے لگانے لگے۔ مثلاً عاقل خان نے پاؤں آگے بڑھا کر میرے جبڑے کو نشانہ بناتے ہوئے کہا: "صنوبر خان کے حکم کی تعمیل ہو۔ ٹھٹھرا ہوا پانی لایا جائے۔ یہ سخت جان دُشمن، معمولی سزا سے متاثر نہیں ہو گا۔ میرے کان اس کے حلق سے نکلنے والی سسکیاں اور کراہیں سننے کے لیے بے تاب ہیں۔"

عاقل خان کے لہجے سے نفرت اور حقارت پھوٹ رہی تھی مگر میں اس عالمِ بے بسی میں اُسے کیا جواب دیتا۔ اس کی ٹھوکر نے میرے جبڑے کی ہڈی کو ہلا ڈالا تھا جس کے نتیجے میں میری کھوپڑی میں پے در پے دھماکے ہونے لگے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اگر میں کچھ دیر اسی طرح اذیت کا شکار رہا تو ہوش و حواس کھو دوں گا لیکن وہ بے وقوف اس بات سے ناآشنا تھے کہ شہباز سسکنا اور کراہنا نہیں جانتا۔ ان کی یہ خواہش کبھی پوری نہیں ہو سکتی۔ وہ چاہتے ہیں یہ لوگ میرے جسم کی بوٹی بوٹی کیوں نہ کاٹ کر رکھ دیں۔ انھوں نے جس درندگی سے میرے جسم کو تشدد کا نشانہ بنایا تھا، اگر میری جگہ کوئی اور ہوتا تو اس کی زندگی کی ڈور کٹ چکی ہوتی اور اگر زندہ بچ بھی جاتا تو اس کی ساری مزاحمت یقیناً ختم ہو گئی ہوتی۔

وہ مجھے گھیرے کھڑے تھے اور میں صرف ان کی ٹانگیں دیکھ سکتا تھا۔ صنوبر خان کے آدمی میرے جسم پر یکے بعد دیگرے اپنے ہاتھوں کی بھرپور ضربیں لگا رہے تھے۔ دریں اثنا انھیں پانی کے ٹھنڈے مشکیزوں کا بھی بڑی بے چینی سے انتظار تھا تاکہ میری زندگی کے اوراق پر ظلم کی آخری داستان تحریر کی جا سکے... لیکن اچانک ہی ماحول میں تبدیلی رُونما ہوئی۔

کسی رائفل کی گرجیلی آواز نے سکوت کی سطحوں کو متزلزل کر دیا اور معاً ان کے متشدد ہاتھ، فالج زدہ ہو گئے اور اپنی سلامتی کی فکر میں اُن کی بے چین آنکھوں سے خوف جھانکنے لگا... پھر متعدد رائفلوں سے یک بارگی خارج ہونے والے دھماکوں نے تاریک جنگل کے سناٹوں میں کہرام برپا کر دیا۔ عاقل خان اور اس کے ساتھی ابھی گومگو کی حالت میں کھڑے تھے کہ غار کے دہانے سے صنوبر خان چند مسلح جوانوں کے ساتھ نمودار ہوا اور دور سے چیخا۔

"عاقل خان! ان دھماکوں کی وجہ معلوم کرو اور اگر ہمارے ساتھی اس جنگ میں اُلجھ ہی چکے ہیں تو ان کی مدد کرو مگر جنگ کے شعلوں میں کُود پڑنے سے قبل، اطمینان کر لینا کہ وہ دلیپ سنگھ کے ساتھی نہ ہوں۔ ہم بھولا سنگھ سے جنگ کرنے کے لیے اپنے گھروں سے نہیں نکلے بلکہ ہماری جنگ اُن لوگوں سے ہے جنھوں نے ہمارے قبیلے کے لوگوں کو بے دریغ قتل کیا ہے اور فرنگیوں کے مفادات کی حفاظت کرتے ہوئے اسلحے کی گاڑیاں کسی نامعلوم مقام کی طرف لے جا رہے ہیں۔ اگر دلیپ سنگھ سے ٹکراؤ ہو جائے تو اسے یہ سمجھانے کی کوشش کرنا کہ ہم ان کے ساتھ براہِ راست متصادم ہونے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔"

"کیا اس عفریت کو اسی حالت میں چھوڑ دیا جائے؟"

"تم اس کی فکر مت کرو۔" صنوبر خان نے کرخت لہجے میں کہا۔ "ابھی صنوبر خان کے بازوؤں میں اتنی طاقت ہے کہ ایک بندھے ہوئے آدمی کی حفاظت کر سکے۔"

عاقل خان اپنے ساتھیوں کو لے کر اس طرف چل دیا جدھر سے رائفل کے دھماکے سنائی دیے تھے۔ ان کے جاتے ہی صنوبر خان تنہا رہ گیا۔ وہ میرے قریب آ کر بولا: "اگر تم میرے چند سوالوں کا جواب دینے کو تیار ہو تو میں یہ رسّہ کاٹ کر تمھیں بیٹھنے کا موقع دے سکتا ہوں۔"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اُس نے آگے بڑھ کر درخت کی شاخ سے وہ رسّہ کھول دیا، جس سے میں لٹکا ہوا تھا۔ رسّہ کھلتے ہی میں سر کے بل زمین پر گرا۔ کچھ دیر میں اسی انداز میں گٹھری بنا زمین پر پڑا رہا تاکہ سانسوں کی آمد و رفت درست ہو جائے۔ میرے حواس دوبارہ معمول پر آئے تو صنوبر خان کا

چہرہ میری آنکھوں کے سامنے گھوم گیا، جو مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر اپنی رائفل کو سہارا بنائے، مکاری سے مسکرا رہا تھا۔ غصے کی ایک زبردست لہر مجھے اپنے وجود میں دوڑتی محسوس ہونے لگی۔ میں نے آہستہ آہستہ سر اٹھایا اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ "صنوبر خان! اگر تم میرے سینے کے گرد جکڑی ہوئی رسیوں کو ڈھیلا کر دو تو میں جلد ہی تمہارے سوالات کا جواب دینے کے قابل ہو جاؤں گا۔" میں نے بظاہر ہانپتے ہوئے کہا کیوں کہ اس حالت میں میرے لیے ہاتھ پاؤں ہلانا بھی ممکن نہ تھا۔

اس کے چہرے پر پھیلی سنجیدگی اور شیطنیت مزید گہری ہو گئی مگر وہ یک لخت فراخدلانہ انداز میں لب کشا ہوا۔ "مجھے حیرت ہے کہ تم اتنے تشدد کے باوجود اپنے مزاج میں تبدیلی پیدا نہیں کر سکے۔ ویسے میں اپنے سوالات کا صحیح جواب سننے کے لیے تمہاری بات مان لیتا ہوں لیکن اگر تم نے میری دی ہوئی رعایت کا کوئی ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تو مجھے تمہاری کھوپڑی میں سوراخ کرتے ہوئے قطعاً افسوس نہیں ہوگا۔"

میں نے اس دھمکی کو نہایت صبر اور استقامت کے ساتھ سنا۔ جب تک میرے سینے کے گرد لپٹی ہوئی رسیاں نہ کھول دی جاتیں، مجھے صبر و سکون ہی کا مظاہرہ کرنا چاہیے تھا۔ وہ بے پناہ خود اعتمادی کا شکار تھا۔ اس نے ایک لمبے پھل والے چاقو سے میری بندشیں کاٹ دیں۔ ان بندشوں کو کاٹنے سے اتنی گنجائش پیدا ہو گئی کہ میں رسیوں سے جکڑے ہوئے ہاتھوں کو معمولی سی حرکت دے سکتا تھا۔ میری کھوپڑی میں ابھی تک دھماکے ہو رہے تھے اور جسم کا جوڑ جوڑ درد کی ناقابلِ برداشت ٹیسوں کا عذاب سہہ رہا تھا۔

"اب تم سچ بول کر اپنی زندگی بچا سکتے ہو۔" صنوبر کے لہجے میں درشتی دوبارہ کروٹیں لینے لگی۔ "تمہارے دوسرے ساتھی کہاں ہیں؟ اور تمہارے ساتھیوں کی تعداد کتنی ہے؟ دروغ گوئی کو مصلحت کا نام دے کر میرا وقت برباد کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ میں جانتا ہوں کہ تم لوگوں نے کہاں سے دریا عبور کیا ہے اور تم لوگوں نے اپنی اسلحہ بھری گاڑیاں دریا سے گزارنے کے لیے کیا کیا جتن کیے ہیں۔ اگر تم لوگ سرکنڈوں میں آگ نہ لگا کر راستہ صاف نہ کرتے تو ہم اسی غلط فہمی کا شکار رہتے کہ تمہاری دوسری منزل گل خان کی بستی ہے جہاں سے تمہیں مجبوراً گزرنا ہوگا مگر تمہاری حماقت سے آگ کے شعلے اور دھواں تمہارے وجود کی نشاندہی کرنے کے لیے کافی تھا۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو اس جنگل میں یوں پھیلا دیا کہ تم شیر کے ہانکے کی طرح چلتے ہوئے میری رائفل کی زد پر آ جاؤ اور یوں میں تمہیں اپنی آنکھوں کے سامنے پا سکا ہوں۔" اس کی آنکھوں میں فاتحانہ چمک ابھر آئی۔

"صنوبر خان! میں نہیں جانتا کہ میرے قافلے کے لوگ اس وقت کہاں ہوں گے؟ میں اس جنگل میں اپنے ساتھیوں سے بچھڑ چکا ہوں اور ان کی تلاش میں بھٹک رہا تھا کہ عاقل خان نے جال پھینک کر مجھے اپنا قیدی بنا لیا۔" میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ "میں اس بات سے انکار نہیں کروں گا کہ میں ان بہادروں کے ٹولے کا ایک ادنیٰ فرد ہوں جس نے تمہارے قبیلے کی طاقت کا غرور زمین بوس کر دیا ہے مگر یہ جنگ تمہاری حماقت سے ہم پر مسلط ہوئی تھی اور اب میرے ساتھ جو سلوک ہو رہا ہے، اس سے یہ واضح ہو رہا ہے کہ تم لوگ ٹھگ اور لٹیرے تو ہو سکتے ہو، مردِ میدان اور بہادر ہرگز نہیں ہو سکتے۔"

میں نے بظاہر بے خیالی سے اپنے ہاتھوں کو حرکت دی تو میرا ایک ہاتھ اپنی گردن پر رینگنے لگا اور اس حصے کو چھونے لگا جہاں چھوٹی سی میان میں ایک خنجر موجود تھا۔ میں نے آہستہ آہستہ اپنا ہاتھ کھسکایا تاکہ خنجر کے دستے پر اپنی گرفت مضبوط کر سکوں۔ صنوبر خان، جو گہری محویت سے میری باتیں سن رہا تھا، اس نے میرے ہاتھوں کی اس جنبش کو کوئی اہمیت نہیں دی حتیٰ کہ خنجر کے دستے پر میرا ہاتھ مضبوطی سے جم گیا۔

۔۔ مگر ابھی عمل کا وقت نہیں آیا تھا۔ جب تک میرے ہاتھ پوری طرح آزاد نہ ہو جاتے، حملہ کرنے کی کوشش خطرناک بھی ثابت ہو سکتی تھی۔

"صنوبر خان! اگر مناسب سمجھو تو چند گھونٹ پانی پلا دو۔ میرے حلق میں کانٹے پڑ گئے ہیں اور مجھے بات کرنے میں دشواری پیش آ رہی ہے۔ میرا خیال ہے تم اتنے سنگدل بھی نہیں ہو کہ ایک دم توڑتے ہوئے دشمن کو آخری بار پانی بھی مہیا نہ کر سکو۔"

وہ ایک دم چونک کر میری طرف حیرت زدہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ "میں تمہاری اس خواہش کو رد نہیں کروں گا۔" اس کے مکروہ ہونٹوں پر سفاکی رقص کرنے لگی اور اپنی رائفل جھکتے ہوئے غار میں داخل ہو گیا۔

اس کے جاتے ہی میں نے خنجر نکالا اور تیزی سے اپنے دوسرے ہاتھ کی بندشیں کاٹنے لگا۔ بندشیں کھلتے ہی دونوں ہاتھ آزاد ہو گئے اور فرطِ انبساط سے میرا انگ انگ رقص کرنے لگا۔ اب میں نے پاؤں سے بندھا رسہ بھی کاٹنا شروع کر دیا۔ ابھی آدھا کام ہی پایۂ تکمیل تک پہنچا تھا کہ اچانک صنوبر خان کے قدموں کی آہٹ سن کر میں نے اپنے ہاتھوں کی حرکت روک دی۔ اس نے پانی کا برتن میرے ہونٹوں سے لگایا ہی تھا کہ میں ٹانگوں کا زور استعمال کر کے اس رسی کو توڑنے میں کامیاب ہو گیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رسی تڑاخ کی آواز کے ساتھ اچانک ٹوٹی تھی۔ صنوبر خان نے ہاتھ پیچھے کر کے اس آواز کو سمجھنے کی کوشش کی تھی کہ اچانک میرا خنجر والا ہاتھ حرکت میں آ گیا۔ تیز دھار خنجر کی نوک دستے تک اس کے دل میں اتر گئی۔ ایک لمحے کے لیے اس کی غصیلی آنکھوں میں حیرت کے آثار ابھرے اور ہمیشہ کے لیے اس کی پتھرائی ہوئی آنکھوں میں منجمد ہو کر رہ گئے۔ وہ تیورا کر پیچھے کی جانب جھکا اور گر کر زندگی کے ہر احساس سے بیگانہ ہو گیا۔

میں نے اپنے گرد لپٹا ہوا رسیوں کا جال الگ کیا اور اس کی لاش گھسیٹ کر وہاں سے چند قدم دور ڈال دی۔ فضا میں رائفل کی اکا دکا گونج سنائی دے رہی تھی۔ یہ آوازیں اس بات کی شاہد تھیں کہ جنگ کسی فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو چکی ہے اور اس کے شعلے سرد پڑنے والے ہیں۔ میں صنوبر خان کے ہاتھ سے گری ہوئی رائفل اٹھا کر غار میں داخل ہو گیا۔

صنوبر خان کے یوں مارے جانے سے میرے دل میں دہکتی ہوئی انتقام کی آگ ابھی سرد نہیں ہوئی تھی۔ غار میں بیس سے زائد گھوڑے موجود تھے، جنھیں میں نے گولی کا نشانہ بنا کر دشمنوں کی واپسی تک بے کار کر دیا اور پھر مجھے اسلحے کا وہ محفوظ ذخیرہ بھی مل گیا جسے میں نے آگ دکھا کر برباد کرنے میں تاخیر سے کام نہیں لیا تھا۔ میں نے چند لمحوں کے قلیل وقفے میں دشمن کا تمام سامانِ رسد اور اسلحے کا کثیر ذخیرہ تباہ کر دیا۔

غار میں ابھی گاڑھے دھوئیں کے بادل بل کھاتے ہوئے گھوم ہی رہے تھے کہ میں غار سے نکل کر ایک درخت پر چڑھا اور اس کی شاخوں میں پوشیدہ ہو کر بیٹھ گیا۔ اب مجھے ان درندہ صفت دشمنوں کا انتظار تھا جن کی لاشوں کو تڑپتا دیکھ کر میرے سینے میں موجزن انتقام کی آگ سرد ہو سکتی تھی۔

فضا میں رائفلوں کی بازگشت تھم چکی تھی۔

ایک بار پھر گہرا سکوت طاری ہو گیا تھا۔

انتظار کے لمحات طویل ہو رہے تھے کہ اچانک دوڑتے ہوئے قدموں کی مسلسل دھمک سن کر میں چوکنا ہو گیا اور رائفل کے گھوڑے پر میری انگلی کی گرفت مضبوط ہو گئی۔

سب سے آگے افضل خان اور عاقل خان غار کی جانب آتے دکھائی دیے۔۔ مگر غار سے گاڑھا گاڑھا دھواں لہراتے دیکھ کر وہ ٹھٹک گئے اور ایک دوسرے کو استفہامیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔

اتنی دیر میں، ان کے ساتھی بھی سراسیمگی کے عالم میں دوڑتے بھرتے آ گئے اور ساحرین کا جلا ہوا نقشہ دیکھ کر ان کے عقب میں رک گئے۔ میں شاخوں سے چھپا کتا ہوا، ان کی بدحالی اور چہروں پر جمی ہوئی شکست خوردگی کی گرد دیکھ کر سمجھ گیا کہ دشمن پسپا ہو کر اپنی کمین گاہ کی طرف پناہ لینے دوڑا آیا ہے۔۔۔ لیکن اب میں ان کا استقبال کرنے کے لیے تیار تھا۔

میں نے رائفل سیدھی کی اور افضل خان کی کھوپڑی کو نشانہ بنا کر گھوڑا دبا دیا۔ رائفل گرجی اور افضل خان کی متکبر کھوپڑی کے پرخچے اڑ گئے۔ افضل خان کے گرتے ہی، عاقل خان کا دہشت زدہ ہو جانا فطری امر تھا۔ وہ حواس باختہ ہو کر پیچھے ہٹتا ہوا، اپنے ساتھیوں سے جا ٹکرایا۔ میں نے اس کی ٹانگوں کو نشانہ بنا کر گولی چلا دی۔ گولی اس کی ران کی ہڈی توڑتی ہوئی نکل گئی۔

وہ چنگھاڑتا ہوا وہیں گر گیا اور رائفل اس کے ہاتھوں سے دور جا گری۔ اس کے تمام ساتھی خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹے اور ایک دوسرے کو گراتے ہوئے بھاگ کھڑے ہوئے۔

انھیں راہِ فرار اختیار کرتے دیکھ کر ان میں سے ایک کو میری رائفل اپنے نشانے کی زد میں لے چکی تھی۔

اس کی چیخ بڑی دردناک تھی۔۔۔

اس کی ہولناک چیخ اپنے بھاگتے ہوئے ساتھیوں کا تعاقب کرتی رہی مگر ان پر کچھ ایسی بوکھلاہٹ سوار ہو چکی تھی کہ انھوں نے پلٹ کر دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔ انھوں نے یہ معلوم کرنے کی بھی کوشش نہیں کی کہ ان کے دشمن تعداد میں کتنے ہیں اور غار سے دھواں اٹھنے کی وجوہ کیا ہیں؟ وہ اپنی جانیں بچاتے ہوئے اندھیرے میں روپوش ہو گئے۔

میری نظر عاقل خان کی زخمی ران پر مرکوز ہو گئی جس کا ایک ہاتھ آہستہ آہستہ حرکت کرتا ہوا اپنی رائفل کی طرف بڑھ رہا

شہباز
مصنف اظہر کلیم
دو حصوں میں
مکمل سیٹ =/100 روپے
مکتبہ القریش
سرکلر روڈ اردو بازار لاہور
فون 7668958

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھا۔ میں چند لمحے دلچسپی سے اُس کے رینگتے ہوئے جسم کی خفیف حرکات دیکھتا رہا... پھر جونہی اُس کی اُنگلیاں رائفل کے دستے سے چھُو گئیں، میری رائفل کے دہانے سے اچانک ایک شعلہ لپک کر سسکتے ہوئے دُشمن کی طرف لپکا۔

گولی اُس کی کلائی کی ہڈی توڑتی ہوئی نکل گئی۔

اس کے حلق سے جگر پاش چیخ نکل گئی۔ اب اس کا ایک بازو بھی بے کار ہو گیا تھا... پھر اس کے حلق سے پے در پے چیخیں خارج ہونے لگیں۔

مَیں نے درختوں کی شاخوں سے سر نکالا اور پاؤں لٹکا کر درخت سے نیچے کُود گیا... میرے کھانس کر متوجہ کرنے سے عاقل خان نے اپنا جھُکا ہُوا سر اُٹھایا اور مجھے دیکھتے ہی اس کے چہرے پر موت کی زردی پھیل گئی۔

"اجنبی! مجھے ابھی تک حیرت ہے کہ تم نے صنوبر خان جیسے آہنی آدمی پر کیسے قابو پا لیا اور اب تک مجھے کیوں زندہ رکھے ہُوئے ہو حالانکہ تمہاری آنکھوں سے اُبلتی ہُوئی نفرت بتاتی ہے کہ تم میری موت کا فیصلہ کر چکے ہو۔" اس نے درد سے کراہتے ہُوئے بمشکل کہا۔

"عاقل خان! تمھیں مُردہ دیکھے بغیر میرے انتقام کی آگ ٹھنڈی نہیں ہو گی، مگر میں تمھیں اتنی آسانی سے نہیں مرنے دوں گا جتنی آسانی سے صنوبر خان کو موت کے گھاٹ اُتارا تھا۔" میرے لہجے سے انتقام انتقام کی صدائیں اُبھر کر دُشمن کے سینے میں اُترتی چلی گئیں۔

اُس کی آنکھوں سے مایوسی کے آثار جھانکنے لگے اور وہ اپنی زبان خشک ہونٹوں پر پھیرتے ہُوئے بولا: "میرا قصہ تمام کر کے اپنی جان بچاؤ۔ بگولا سنگھ کے ساتھی سیدھے اِسی طرف آ رہے ہیں۔"

"دُشمن کا استقبال کرتے کرتے میرا تجربہ بہت وسیع ہو چکا ہے۔" میری نگاہ اس کے رینگتے ہُوئے ہاتھ کا مسلسل تعاقب کر رہی تھی، جو آہستہ آہستہ ہولسٹر میں اُڑسے ہُوئے ریوالور کی طرف بڑھ رہا تھا۔

"مگر وہ لوگ دُنیا کے سنگدل ترین گروہ سے تعلق رکھتے ہیں اور اس جنگل میں ایک عرصے سے اُن کی حکمرانی ہے۔ اُن کا سامنا ہونے پر تم اپنی جان واپس نہیں لے جا سکو گے۔" اس کا حرکت کرتا ہُوا ہاتھ ریوالور کے دستے کو چھُو کر وہیں رُک گیا... وہ مجھے باتوں میں اُلجھانے کی کوشش میں مصروف تھا مگر میری حقیقی

نظریں اُس کی ایک ایک حرکت کا جائزہ لے رہی تھیں پھر جیسے ہی اُس کی اُنگلیاں دوبارہ حرکت کرتی دِکھائی دیں، مَیں نے رائفل کا گھوڑا دبانے میں دیر نہیں کی۔

رائفل کے شعلے نے اس بار، اس کا بازو کہنی تک بے کار کر دیا۔ ہتھیلی کی ہڈی چُورچُور ہوتے ہی خون کا فوارہ اُبل پڑا اور اس کا لباس رنگین ہونے لگا۔ عاقل خان کے حلق سے پے در پے چیخیں اُبھریں اور وہ شدتِ درد سے کراہتا ہُوا دُہرا ہو گیا۔ اس کے زخموں سے بہتا ہُوا خون زمین پر پھیل کر، میرے انتقام کی داستان تحریر کرنے لگا۔

مَیں نے اُسے غفلت و نیم بے ہوشی کے سمندر میں غوطہ زن پا کر رائفل کا کُندا اس کے سینے پر اس زور سے مارا کہ وہ ہائے تکلیف کے، بے ہوشی سے ہوش کی طرف لوٹ آیا۔ اس کی سہمی تڑپتی ہُوئی کراہیں یکبارگی بلند ہو گئیں اور وہ سہمی ہُوئی نظروں سے مجھے یُوں دیکھنے لگا جیسے وہ میری جانب سے کسی رحم کا طالب ہو۔

اَب اُس میں سر اُٹھانے کی بھی سکت باقی نہیں رہ گئی تھی۔ اس کی سرکشی اور غرور خاک میں مل چکا تھا لیکن ابھی اس کی کتابِ زیست کا آخری باب شاید زیرِ تحریر تھا۔ جسے میرے علاوہ کوئی اور مکمل نہیں کر سکتا تھا۔ مَیں نے قسم کھائی تھی کہ اس کینہ صفت گرگِ آتشیں پر ہرگز رحم نہیں کھاؤں گا اور اُسے ایسی ہیبت ناک موت ماروں گا کہ اُس کی لاش دیکھ کر اس کے ساتھی سُورماؤں کی چیخیں نکل جائیں اور وہ مستقبل قریب میں کسی نہتے انسان پر تشدد کرنے کے خیال ہی سے کانپ جایا کریں۔

مَیں نے بالوں سے پکڑ کر اس کا سر اُٹھایا تو اُس کی آنکھوں کی روشنی مدھم پڑتی دِکھائی دی۔ اُس کی بُجھتی ہُوئی آنکھوں میں میرے لیے سارے جہان کی نفرتیں سمٹ آئی تھیں۔ اب اُسے یقین ہو چلا تھا کہ موت اُس سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہے۔ چنانچہ وہ اپنی نفرت کا اظہار کرنے میں بُخل سے کام نہیں لے رہا تھا۔

"ناپاک آدمی! تیری آنکھیں اَب مجھ پر اثر انداز نہیں ہو سکتیں۔" میرے لہجے میں درندگی اُبھر آئی۔ "میں اس وقت تک یہاں کھڑا رہوں گا جب تک تیری زندگی کا سُورج اپنے چہرے پر سیاہیاں ملتا ہُوا غروب نہیں ہو جاتا اور تیرے بھگوڑے ساتھی میرے فولادی ہاتھوں سے شکست و ریخت کا مزہ نہیں چکھ لیتے۔"

"مجھے... مجھم... مجھے... معا... ف... کر دو۔"

اُس نے اٹک اٹک کر کہا اور اپنی آنکھوں سے جھلکتی ہُوئی نفرت کی پردہ پوشی کرنے لگا۔

"تمھیں ضرور معاف کر دوں گا۔" مَیں نے سفاکانہ طرزِ تخاطب اختیار کر لیا۔ "مگر... اُس وقت، جب تمہاری نظروں کے سامنے تمہارا لاشہ میرے سامنے ماہیِ بے آب کی طرح تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہو جائے اور تیری گز بھر لمبی زبان، حلق سے باہر آ جائے گی۔"

"میرے سینے میں سوراخ کر دو۔ تمہارا انتقام مکمل ہو جائے گا۔" عاقل خان نے سخت جان ثابت ہونے کی کوشش کی۔

مَیں نے جواباً کچھ کہنے کے لیے مُنہ کھولا ہی تھا کہ سب اُگتے ہوئے گھوڑوں کی ٹاپیں سُن کر ارادہ ملتوی کر دیا۔ یہ آوازیں تیزی سے قریب آتی جا رہی تھیں۔ مَیں فیصلہ کُن انداز میں گھُوما اور عاقل خان کی کھوپڑی میں سوراخ بنانے کے لیے رائفل سے ایک گولی اندر خارج کرنا پڑی۔

وہ کوئی آواز نکالے بغیر ہی دوسری دُنیا کو سدھار گیا۔ گولی نے اس کی کھوپڑی کے پرخچے اُڑا کر بھیجا تک نکال دیا تھا۔ میں نے اپنے جانی دُشمن کے بکھرے ہُوئے وجود پر آخری نظر ڈالی اور رائفل سنبھالتا ہُوا دوبارہ اُسی درخت کی شاخوں میں پوشیدہ ہو گیا جہاں افضل خان اور عاقل خان کے آنے سے پہلے خود کو چھپائے بیٹھا تھا اور آنے والے گھُڑسواروں کا استقبال کرنے کے لیے پوری طرح مستعد ہو گیا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ گھُڑسوار عاقل خان کے ساتھی ہوں گے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جنگل میں پھیلی ہُوئی تاریکی میں اضافہ ہو رہا تھا اور یہ تاریکی میرے لیے قدرتی حصار کے رُوپ میں ڈھل سکتی تھی۔ گھوڑوں کی ٹاپوں میں تیزی آ گئی اور میں اُن کی دھمک اپنے قریب ہی محسوس کرنے لگا۔ میں نے آنکھیں پھاڑ کر ایک طرف نگاہ گاڑ دی۔ گھُڑسواروں کے دُھندلے ہیولے غار کے مقابل آ کر رُکنے لگے۔

غار سے ابھی تک دُھوئیں کے بادل اُٹھ رہے تھے اور گولا کی طرح چکراتا ہُوا سیاہ دُھواں، درختوں کی شاخوں پر منجمد نظر آ رہا تھا۔ اچانک ایک گھُڑسوار کی نظر عاقل خان اور افضل خان کی لاشوں پر پڑی تو وہ گلا پھاڑ کر چیخ اُٹھا: "غالب خان! تمہارا داماد عاقل خان بھی اس قاتل کا شکار ہو گیا ہے۔" اس نے اپنے ایک ساتھی کو عاقل خان کی عبرت ناک موت سے آگاہ کیا۔ "افسوس! ہمیں دیر ہو گئی... ایک تنہا دُشمن ہماری ہر شے تباہ و برباد کر گیا!"

"مَیں سب کچھ دیکھ رہا ہوں بابر خان۔" اس کی غُرّاہٹ میں درندوں جیسی غُرّاہٹ شامل تھی۔ "میری آنکھیں اس سے پہلے اس قتلِ عام کا منظر دیکھ چکی ہیں۔ وہ کسی تیندوے کی سی تیزی سے حرکت میں آتے ہیں اور آناً فاناً آگ اُگلنے والے ہتھیاروں سے ہر شے برباد کر دیتے ہیں۔" وہ گھوڑے سے اُتر کر عاقل خان کی لاش کے قریب رُک گیا اور جھُک کر اس کا جسم ٹٹولنے لگا۔

اپنے ساتھیوں کے بارے میں رائے سُن کر میرے ہونٹوں کے گوشے پھڑکنے لگے۔ وہ تعداد میں کثیر ہونے کے باوجود نفسیاتی طور پر مرعوب ہو چکے تھے۔

"بابر خان! وہ ابھی ہمارے آس پاس موجود ہے۔" غالب خان نے معاً اپنے ساتھیوں کو چونکاتے ہُوئے کہا۔ "عاقل کو مرے ہُوئے زیادہ دیر نہیں ہُوئی۔ اس کا جسم ابھی گرم ہے اور بہتا ہُوا خون اس بات کا ثبوت ہے کہ ہمارے آنے سے چند لمحے قبل ہی قاتل یہاں موجود تھا۔" اچانک وہ اُٹھا اور آس پاس کے درختوں پر تفتیشی نگاہ ڈالتا ہُوا بولا: "سب لوگ پھیل کر اُسے تلاش کرو اور نظر پڑتے ہی قتل کر دو۔ اگر ہم سب مل کر بھی ایک آدمی کو قتل نہ کر سکے تو اسلحے سے لدی ہُوئی گاڑیوں پر قبضہ کرنے کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو گا۔"

اس کی اس بات نے سب کو جیسے خوابِ غفلت سے چونکا دیا اور وہ مشینی انداز میں، حرکت میں آ گئے اور محتاط انداز میں آس پاس مجھے تلاش کرنے لگے۔ میں اُن کے منتشر ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ جیسے ہی وہ مختلف ٹولیوں میں بٹ کر میری جستجو میں روانہ ہوئے میں نے بھی حرکت میں آنے کا فیصلہ کر کے اپنی رائفل شاخوں میں اُلجھا کر رکھ دی اور دونوں ریوالور سنبھال کر مستعد ہو گیا۔

بوڑھا غالب خان اور اس کا ساتھی ریوالور کی زد میں تھے۔ مَیں نے غالب خان کے بازو کا نشانہ لے کر ٹریگر دبا دیا۔

ایک دھماکا ہُوا...

غالب خان کا بازو درمیان سے ٹوٹ کر لٹک گیا۔

ایک فلک شگاف چیخ اس کے حلق سے اُبھری... اور رائفل اس کے ہاتھ سے چھُوٹ کر دُور جا گری۔ وہ دُہرا ہو کر بے اختیار زمین پر جھُکتا چلا گیا۔

جب تک اس کا ساتھی اصل صورتِ حال کو پُوری طرح سمجھ پاتا، میرے ریوالور سے نکلنے والی دوسری گولی نے اُس کی پُشت میں سُوراخ کر دیا اور پھر دیکھتے دیکھتے اُس سوراخ سے خون اُبلنے لگا۔ وہ بھی ایک ہولناک چیخ بلند کرتا ہُوا مُنہ کے بل زمین پر گِرا اور زندگی کے سارے جھگڑے آن واحد میں چُکا گیا۔

اتنی دیر میں غالب خان اپنا بازو تڑوا کر سنبھل چُکا تھا اور اس کے ایک ہاتھ میں تھمے ہُوئے سیاہ ریوالور کی نال بجلی کی طرح لہرائی اور اُس نے قیاساً مجھ پر فائر جھونک دیا۔ گولی شاخوں کو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چھیدتی ہُوئی مجھ سے چند انچ دور ایک موٹے سے تنے میں پیوست ہو گئی۔ مَیں نے اُسے دوسرا فائر کرنے کا موقع دینے کی بجائے اُس کے ریوالور کی چمکتی نال کو نشانہ بنا کر ٹرائیگر دبا دیا۔

ایک بھیانک چیخ بلند ہُوئی۔

اس کے ساتھ ہی ریوالور اس کے ہاتھ نکل گیا اور وہ بڑے کرب کے عالم میں اپنا ہاتھ دبائے پیروں پر گھوم جانے پر مجبور ہو گیا۔

میں اس کے دونوں بازو بے کار کر چکا تھا مگر ابھی اُسے موت کی نیند نہیں سُلانا چاہتا تھا۔ اُس کو زندہ رکھ کر مَیں نے اُس کے ساتھیوں کو واپسی پر مجبور کر دیا۔

اُس کے حلق سے بُلند ہونے والی کراہیں سُن کر تین گھڑسوار تیزی سے گھوڑوں کو ایڑ لگاتے اور اندھا دُھند ہوائی فائرنگ کرتے نمودار ہُوئے۔

غالب خان کی دلدوز چیخوں سے متاثر ہو کر ایک جیالا نوجوان گھوڑے سے اُتر کر تیزی سے اس کی طرف جُھکا تھا کہ میرے ریوالور نے شعلہ اُگل دیا۔ . . وہ ایک دلدوز چیخ کے ساتھ غالب خان پر گر کر ساکت ہو گیا۔ اس کے گرتے ہی غالب خان کے چیخنے کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ شاید موت کو اپنے ارد گرد منڈلاتے دیکھ کر اس کی زبان گنگ ہو گئی ہو مگر ان میں سے ایک اپنا گھوڑا درخت کے تنے کی آڑ میں کرتے ہُوئے مجھ پر رائفل کا فائر کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ گولی شاخوں کو اُڑاتی ہُوئی میرے دائیں جانب کچھ فاصلے سے نکل گئی۔ اس وقت تک میرا دوسرا ہاتھ حرکت میں آ گیا۔

گولی اس کی گردن میں لگی۔ . .

وہ گھوڑے سے اُچھل کر مُنہ کے بَل گرا۔

سوار کے گرتے ہی اس کا گھوڑا بدک کر بھاگ نکلا۔ اس کا قِصّہ تمام ہوتے ہی مَیں سنجیدہ ہو کر ان بے گور و کفن لوگوں کی لاشوں کو بغور دیکھ رہا تھا جو چند گھنٹے پہلے ہلاکو اور چنگیز خان کی قبر پر لات مار رہے تھے۔

انھی ہنگامہ خیزیوں کے دوران ایک شخص یکے بعد دیگرے مجھ پر دو فائر جھونک چکا تھا اور اس کی دونوں گولیاں میرے بائیں جانب اُبھرے ہُوئے تنے میں آ کر لگی تھیں۔ حملہ آور خود کو تنے کی آڑ میں چھپائے ہُوئے تھا مگر اس کے گھوڑے کی پیٹھ مجھے نظر آ رہی تھی۔ میرے ریوالور نے متواتر دو شعلے اُگلے اور گھوڑا بھیانک آوازیں نکالتا ہُوا سوار سمیت اُچھلنے کُودنے لگا پھر وہ اپنے سوار کو پُشت سے گراتے ہی خود بھی چند قدم چل کر ڈھیر ہو گیا مگر اس کا سوار ابھی زندہ تھا اور اُسے میرے چھپنے کی جگہ کا اندازہ میرے ریوالور سے نکلنے والے شعلوں سے ہو گیا تھا۔ مَیں نے اندھیرے میں ایک جانب اچھلا سے چھلانگ لگائی اور اپنی رائفل تھام کر درخت سے نیچے آ گیا۔ بھا رائفل کی دو گولیاں وہیں آ کر لگیں، جہاں ایک ساعت پہلے مَیں موجود تھا۔ درخت کے تنے کی آڑ لیتا ہُوا مَیں ذرا جُھکا اور پھر پہلی فرصت میں نے ریوالور دوبارہ بھر لیا تب میں نے محتاط انداز سے اس درخت کو نشانہ بنایا جہاں مجھے اپنے دُشمن کی موجودگی کا شُبہ تھا۔

میری گولی کے جواب میں، حملہ آور اندھا دُھند اُس تنے پر فائرنگ کرنے لگا جسے مَیں نے اپنی ڈھال بنا رکھا تھا۔ اس کی تمام گولیاں آ آ کر اسی تنے میں پیوست ہوتی رہیں پھر اچانک کلِک کی ہلکی سی آواز نے، کارتوسوں کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔ مَیں نے دائیں طرف ذرا جُھک کر اس پر فیصلہ کُن فائر کیا جو کارگر ثابت ہُوا۔

ایک بھیانک چیخ اُبھری۔

. . . وہ اُلٹ کر پیچھے کی طرف گر گیا۔

اُس کے گرتے ہی مَیں نے دوسرا فائر کر کے اس کی زندگی کا آفتاب سرِ شام ہی غروب کر دیا۔

دفعتاً بکھری ہُوئی لاشوں کے درمیان ایک شکستہ ہُوا ہاتھ اندھیرے میں حرکت کرتا دکھائی دیا۔ اُسے زندہ پا کر میرے ہونٹ نفرت سے بھینچ گئے اور انتقام کے سرد ہوتے ہُوئے شعلے پھر بھڑک اُٹھے۔ . . غالب خان میں موجود زندگی کی رمق نے جلتی پر تیل کا کام کیا تھا۔

مَیں اپنے متعدد دُشمنوں کی لاشیں گرا کر انتقام کے یادگار مقبرے تعمیر کرتا چلا جا رہا تھا اور پتہ نہیں تھا کہ ابھی کتنی ہستیاں میری رائفل کی زد میں آ کر اپنی زندگی سے محروم ہو جائیں گی۔ کیا پتہ مَیں بھی کسی اَن دیکھی گولی کا نشانہ بن کر اپنی حیاتِ عزیز سے محروم ہو جاؤں اور میری اکڑی ہُوئی لاش پہ آنسو بہانے والا بھی کوئی نہ ہو۔ مَیں نے سوچا کہ انتقام کی کوکھ سے کتنے جہنم جنم لیتے ہوں گے۔ جب بھی میرے دل و دماغ میں انتقام انتقام کی آوازیں اُبھرنے لگتی ہیں اور مَیں دیوانہ وار کسی درندے کی طرح اپنے ہاتھوں کو حرکت دیتے ہُوئے دُشمن پر قضائے ناگہانی کی طرح ٹوٹ پڑتا ہُوں تو ہر طرف لاشیں ہی لاشیں بکھر جاتی ہیں۔ میرے خیالات کی رَو یک لخت منطقی دلائل کی طرف یکسوئی کے ساتھ محوِ سفر تھی لیکن اپنے آپ کو دُشمنوں کے گھیرے میں پا کر دوبارہ عالمِ عمل کی طرف لوٹ آیا۔ . .

فضا پر گہرا سکوت طاری تھا لیکن دفعتاً کچھ گھوڑوں کے بھاگنے کی آوازوں نے اس سکوت کو توڑ دیا۔

مَیں نے ایک مُردہ دُشمن کے گلے سے چمڑے کی گولیوں

سے بھری ہُوئی پیٹی اُتار کر اپنے کندھے پر لٹکا لی۔

چند قدم دور ایک درخت پر چڑھ کر گھنی شاخوں میں چھپ گیا اور گھوڑوں کی ٹاپوں پر اپنے کان لگا دیے۔

آنے والے دو آدمی تھے جو غالباً میری تلاش میں ناکام ہو کر غالب خان کو اطلاع دینے آئے تھے مگر غار کے سامنے اپنے متعدد ساتھیوں کی لاشیں دیکھ کر سراسیمگی کے عالم میں گھوڑے پیچھے ہٹا کر واپسی کے لیے پَر تول رہے تھے کہ میری رائفل کی نال نے ایک شعلہ اُگل دیا۔

ایک دھماکا ہُوا۔ . .

اس کے ساتھ ہی ایک مغرور کھوپڑی کے پرخچے اُڑ گئے اور اس کا گھوڑا خوف ناک انداز میں ہنہناتا ہُوا ایک جانب بھاگ اُٹھا۔ شاید وہ اپنے آقا کے دم توڑتے ہُوئے وجود سمیت کہیں رُوپوش ہو جانا چاہتا تھا۔ مَیں نے سوچا کہ انسانوں سے تو گھوڑا بہتر ہے جو آخری دم تک اپنے آقا کا ساتھ نہیں چھوڑتا۔

مَیں نے دوسرے آدمی کو سنبھلنے کا موقع نہ دیا۔

گولی اس کی پسلیاں پھاڑتی ہُوئی نکل گئی اور وہ دلخراش چیخ کے ساتھ گھوڑے سے گر کر زندگی کے ہنگاموں سے دُور چلا گیا، جہاں نہ کوئی دوست تھا اور نہ ہی دُشمن۔ . . صرف انسان کو اپنے اعمال کی ہمرکابی میں وقت گزارنا پڑتا ہے۔

دُشمن کی موت کا یقین ہوتے ہی مَیں نے درخت کے گھنے پتّوں کو ہٹا کر ماحول کا جائزہ لیا اور جب مجھے یقین ہو گیا کہ میدان صاف ہے تو میں درخت سے کُود گیا اور لپک کر دُشمن کے ایک گھوڑے کی لگام میں تھام لیں۔ گھوڑے نے ہنہنا کر اپنے کان ہلائے اور مسلسل ٹاپیں مارتے ہُوئے برہمی کا اظہار کیا جیسے وہ کسی اجنبی کو اپنے قریب آنے کی اجازت دینے سے گریز کر رہا ہو۔ مَیں نے پیار سے اُس کی گردن تھپکی اور اس کے سُرخ بالوں میں اُنگلیاں پھیرنے لگا تاکہ وہ بآسانی مجھے اپنی پیٹھ پر سوار ہونے کی اجازت دے دے پھر مَیں نے دیکھا کہ گھوڑا میرے اظہارِ محبت سے مطمئن ہے تو معاً میں نے رکاب میں اپنا پاؤں رکھا اور کُود کر اس پر سوار ہو گیا۔

اب یہاں زیادہ دیر رُکنا بے کار تھا اور پھر مجھے اپنے بابا کی بھی فکر تھی جسے مَیں جنگل کی تاریکی میں کھو چکا تھا۔ اگر اس کی سلامتی کا احساس مجھے پریشان نہ کر رہا ہوتا تو میں کچھ دیر اور یہاں رُک جاتا اور باقی ماندہ دُشمنوں سے بھی نمٹ کر ہی جاتا لیکن مَیں نے اتنے پر ہی اکتفا کیا۔ وقت کی سب سے بڑی پکار خیال کیا کیوں کہ اس طرح میں کسی وقت بھی اپنے بے شمار دُشمنوں کے نرغے میں دوبارہ پھنس سکتا تھا۔

جب مجھ پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ یہ لوگ اسلحہ گاڑیوں پر قبضہ جمانے کا ارادہ لے کر گھر سے نکلے تھے تو مَیں انھیں کس طرح آسانی سے معاف کر دیتا مگر اپنے محترم باپ کی سلامتی کا احساس اس قدر جاں گُسل اور اذیت کوش تھا کہ اس مقام کو جہاں تا حدِ نگاہ ظلم و بربریت کی داستانیں کروٹیں لے رہی تھیں، اسے تلاش کرنا مَیں نے اپنا فرض تصوّر کیا اور گھوڑا دوڑاتا ہُوا اندھیرے کی بڑھتی ہُوئی دُھند کو پار کرنے لگا۔

گھوڑا تاریکی کو چیرتا ہُوا، اپنے راستے میں آنے والی شاخوں اور جھاڑیوں سے لاتعلق، بے تحاشا بھاگ رہا تھا۔ اس کے دوڑنے کا انداز ظاہر کر رہا تھا کہ وہ راستے کے تاریک پیچ و خم سے بخوبی آشنا ہے اور یہ راستہ جس پر وہ برق رفتاری سے دوڑ رہا ہے اس کی ٹاپوں تلے روندا جا چکا ہے۔ میں نے عمداً اس کی راسیں ڈھیلی چھوڑ دیں۔

دن بھر کی مصروفیت، دُشمن کے تشدّد اور گھوڑے کی پیٹھ پر سفر کرتے ہُوئے مَیں جسمانی طور پر بے پناہ تکلیف محسوس کر رہا تھا۔ بھوک، پیاس، تھکن اور نیند نے یکبارگی میرے جسم پر غلبہ پانے کی تگ و دو شروع کر دی تھی، خصوصاً زخمی سینے پر قمیص، جو خون جم جانے کی وجہ سے زخموں سے چپک کر رہ گئی تھی، اس وقت بے حد اذیت اور دُشواری کا باعث بن رہی تھی اور مَیں باقی ماندہ قوتِ ارادی کے بَل بوتے پر افتاں خیزاں، کسی نامعلوم منزل کی طرف سفر کر رہا تھا۔

یہ میرے عزم و حوصلے کا امتحان تھا جس میں ابھی تک تو مجھے ناکامی کا مُنہ نہیں دیکھنا پڑا تھا اور میری جدوجہد کا غیر محسوس رشتہ جسم اور رُوح کا تعلق بحال رکھے ہُوئے تھا۔ میری جدوجہد آہستہ آہستہ میرے لیے اُمیدِ نو کا دَر وا کرنے لگی۔

گھنا جنگل پیچھے رہ گیا اور میں ایک ایسی گھاٹی سے گزرنے لگا، جہاں چھدرے درختوں کے اوپر ستاروں سے مزیّن نیلگوں آسمان نظر آنے لگا تھا مگر گھوڑے کی رفتار میں کمی نہیں آئی تھی۔ سر پر کھلا آسمان، جس پر جڑے ہُوئے خوش نما ستاروں کی رِیڑھ پھیل تا حدِ نگاہ پھیلتی چلی گئی تھی، میرے ہم سفر ہونے کا مژدہ جاں فزا سنا رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو کہ غم نہ کر، میرے اندر سمائی ہُوئی لاتعداد قندیلوں کا وجود تیرا ہم رکاب ہے۔ اس منظر کو اپنے سر پر موجود پا کر میرے سینے سے اطمینان کی ایک طویل سانس نکل گئی۔

گھٹے ہُوئے تاریک ماحول سے دُور ہو کر مجھے قدرتی طور پر سکون ملا تھا۔ ٹوٹے ہُوئے حوصلوں کی دیوار دوبارہ استوار ہُوئی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تو میرے بوڑھے باپ شاہ یار خان کا چہرہ تصور کے نئے جہان آباد کرنے لگا۔ اس کی جدائی کا احساس جس نے مجھے مجروح کر رکھا تھا، میرے سنبھلتے ہوئے حوصلوں کے پیچھے اُڑتا ہوا فکر و تشویش میں مبتلا کر گیا۔ نہ جانے اس کے ساتھ کیا افتاد پیش آئی تھی کہ وہ مجھے خطرے میں پاکر بھی میری طرف لوٹ کر ... نہیں آسکا تھا۔

خدشات ان گنت بچھوؤں کا رُوپ دھار کر میرے دل و دماغ میں ڈنک مار رہے تھے کہ گھوڑے کی رفتار آہستہ آہستہ سُست پڑنے لگی۔ شائیں شائیں کی بلند آوازیں میری سماعت کے پردوں کو چھیڑنے لگی تھیں۔ گھوڑا ایک آبشار کے کنارے ٹاپیں مارتا ہُوا دوبارہ ڈھلان کی جانب دوڑنے لگا۔

آبشار سے لگ بھگ پچاس قدم کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ دھوئیں کا ایک لہراتا ہُوا بادل سا مجھے آسمان کی طرف اُٹھتا دکھائی دیا اور گھوڑا اچانک رُک گیا۔

گھوڑا ایک ٹیلے کی اوٹ میں رُکا تھا، جہاں اسے باندھنے کے لیے ایک کھونٹی گڑی ہُوئی تھی۔ گھوڑے سے اُتر کر میں نے جونہی ٹیلے کی دوسری طرف دیکھا تو ایک سفید ریش بوڑھا موٹا سا کمبل اپنے گرد لپیٹے آگ کے شعلوں کے سامنے بیٹھا نظر آیا۔ اس کی وضع قطع دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ وہ کوئی ہندو سادھو ہے جس نے تارک الدنیا ہو کر، اس ویرانے کو اپنا مسکن بنا رکھا ہے اور شب و روز اپنے قلب کی کثافتیں دھونے میں مصروف ہے۔

گھوڑا زمین پر پاؤں مار کر ہنہنایا، جیسے اپنی آمد کی اطلاع دے رہا ہو۔ سادھو مراقبہ توڑ کر اُس ٹیلے کو گھورنے لگا، جہاں میں کھڑا تھا۔ اس کی شعلہ بار آنکھیں مجھے اپنے وجود میں کسی نشتر کی طرح اُترتی ہُوئی محسوس ہُوئیں اور میں پلکیں جھپکا کر رہ گیا۔

" تم ... تم کون ہو؟ شعلہ خان کہاں ہے؟"

اس کے چونکنے کی اداکاری نے مجھے شبہے میں مبتلا کر دیا تھا۔ سادھو ہونے کے باوجود اس کے لہجے میں اس قدر کرختگی کہاں سے آگئی؟ اس سوال کے اُبھرتے ہی میرے ذہن میں انجانے سے خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ ویسے بھی اس علاقے میں ہندو بہت کم تھے بخصوصاً سادھو تو کبھی دیکھنے میں نہیں آتے تھے۔ میں نے اپنی آواز میں التجا آمیز نرمی پیدا کرتے ہُوئے جواب دیا۔

" میں ایک بھٹکا ہُوا مسافر ہُوں، جو اپنے قبیلے سے بچھڑ کر جنگل میں لٹیروں کے ایک گروہ سے اُلجھ پڑا۔ انھوں نے مجھے پکڑ لیا اور میرا گھوڑا چھین کر مجھے مار مار کر نڈھال کرنے کے بعد نیم مُردہ حالت میں چھوڑ گئے۔ ہوش آنے کے بعد مجھے یہ گھوڑا ملا گیا تو میں اس پر سوار ہو کر یہاں تک پہنچ گیا۔"

میں نے بڑے مؤثر انداز میں سادھو کو اپنی داستان سُنائی تھی ... پھر میں اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا جو اس کے چہرے سے بہت مختلف نظر آرہی تھیں۔

" مگر یہ گھوڑا تو شعلہ خان کا ہے جو ایک قریبی بستی کا باشندہ ہے سوال یہ ہے کہ اگر گھوڑا تنہا تھا تو اس نے اپنے سوار کو کہاں کھو دیا ہے مجھے تمھاری داستان بناوٹی لگ رہی ہے۔ اس وفادار جانور نے تمھارا پول کھول دیا ہے۔ بتاؤ شعلہ خان کے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا ہے؟ میری ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے یہ وضاحت ضروری ہے۔" اس کی سوالیہ نظریں میرے چہرے پر جمی ہُوئی تھیں۔

میرے شبہے کو مزید تقویت پہنچی تو میں نے قدم بڑھاتے ہُوئے کہا: " میں جھوٹ نہیں بولتا۔ میرا خیال ہے کھوٹ تمھارے دل میں ہے جو میری سچی بات کو بھی جھوٹ ثابت کرنے پر تلے ہُوئے ہو ... تمھیں میری بات پر جھوٹ کا گمان کیوں کر ہُوا۔ تمھارے لب و لہجے کی سختی یہ ظاہر کر رہی ہے کہ تم وہ نہیں ہو جو نظر آرہے ہو۔ بتاؤ تم کون ہو، اور یہ ڈھونگ کیوں رچائے ہُوئے ہو۔ بولو ... ورنہ میری رائفل کی گولی تمھاری کھوپڑی میں سوراخ کر دے گی۔" میں نے رائفل کی نال اس کی پیشانی پر رکھ دی۔

مجھے موت کے فرشتے کے رُوپ میں اپنے سامنے پاکر اس کی آنکھوں کی جوت ماند پڑنے لگی اور چہرے پر موت کی زردیاں جھلک اُٹھیں۔ اس کا وجود ہولے ہولے لرزتا دکھائی دینے لگا۔ میں نے ایک ہاتھ بڑھا کر اس کی گنجان داڑھی نوچنے کی کوشش کی تو وہ شدتِ تکلیف سے چلّا اُٹھا۔ دراصل مجھے یہ غلط فہمی تھی کہ اس کی داڑھی مصنوعی ہے مگر میری توقع کے خلاف وہ اصلی نکلی۔ رائفل ابھی تک اس کی پیشانی سے لگی ہُوئی تھی اور اس کی دھندلائی ہُوئی رنجور آنکھیں میری اس حرکت کی شکایت کر رہی تھیں۔

" بتاؤ، تم کون ہو؟ تمھارا لہجہ بتاتا ہے کہ تم اس علاقے میں ایک طویل عرصے سے آباد ہو۔"

میری نظریں گھاس پھوس کی اس جھونپڑی کا جائزہ لے رہی تھیں جس کے سامنے وہ براجمان تھا۔

" میں شنکر ناتھ ہُوں۔" اس نے تھرتھر کانپتے ہُوئے کہا: " اور چالیس برس کا طویل عرصہ اس بات کا گواہ ہے کہ شنکر ناتھ نے بھگوان سے سچی لو لگائی ہے ... رائفل کی نال ہٹا لو، میں تمھارے لیے کسی خطرے کا باعث نہیں ہُوں گا۔ گجرا سنگھ، جو اس وادی کا بے تاج بادشاہ ہے، وہ میرا بہت احترام کرتا ہے۔ اگر تم نے مجھے کوئی نقصان

پہنچایا تو وہ دُنیا کے آخری حصے تک تمھارے تعاقب میں جانے سے گریز نہیں کرے گا۔"

" اس کا مطلب ہے کہ تمھاری جڑیں دُور تک پھیلی ہُوئی ہیں۔" میں نے رائفل کی نال ہٹاتے ہُوئے جواب دیا: " گجرا سنگھ جیسے ہزاروں لُٹیرے میری نظر میں ہَوا کے اُن جھونکوں کی مانند ہیں جو شاخِ گل کو تو ہلا سکتے ہیں، پہاڑوں کو چیرنے کا حوصلہ نہیں رکھتے ... تم نے اگر میرے چند سوالات کا تسلی بخش جواب نہ دیا تو تمھارا یہ استخوانی وجود ریزہ ریزہ کر دوں گا۔ عام حالات میں، میں ایک بے ضرر انسان ہُوں اور راستہ بھٹک کر ادھر آنکلا ہوں۔ شعلہ خان، جو میرے لیے قطعی اجنبی ہے، اس کا گھوڑا اتفاقاً مجھے تمھاری جھونپڑی کی طرف لے آیا ہے۔ میں دِن بھر کی تھکن، مسلسل سفر اور بھوک سے نڈھال ہو رہا ہُوں مگر کھانے کے لیے تمھیں تکلیف نہیں دوں گا۔"

" شانتی خاطر خواہ برآمد ہُوئے۔

بوڑھا شنکر ناتھ اپنا خوف حصول کر دوبارہ پُر اعتماد نظر آنے لگا اور اس کی پُرکشش آنکھوں میں بجھتی ہُوئی جوت دوبارہ روشن ہو گئی: " تمھاری باتوں نے میرا یقین بحال کر دیا ہے۔ تم چاہو تو میری کُٹیا کو پناہ گاہ کے طور پر استعمال میں لا سکتے ہو۔ میں تمھیں کھانے کے لیے کچھ پیش نہیں کر سکتا۔ اگر تمھیں اندھیرے میں شکار کرنے کا تجربہ ہے تو شکار کر کے اپنے پیٹ کی آگ بجھا سکتے ہو۔ اگر پیاس تنگ کر رہی ہے تو پانی کا بھرا ہُوا برتن وہ کونے میں رکھا ہے۔ پیاس بجھا کر ڈھلان تک اُتر جاؤ، وہاں جھاڑیوں میں بہت خرگوش ہیں۔"

میں نے بوڑھے شنکر ناتھ کی باتیں بڑی دل چسپی سے سُنیں اور مسکراتا ہُوا اس کونے میں چلا آیا، جہاں پانی کا برتن ایک مٹی کے پیالے سے ڈھکا ہُوا تھا۔ میں نے دو پیالے بھر کر اپنے حلق میں اُتار لیے اور شنکر ناتھ کو مخاطب کر کے کہا: " تم اپنے پیٹ کی آگ کیسے بجھاتے ہو؟ میں دیکھ رہا ہوں کہ تمھیں اپنے کھانے پینے کی کوئی فکر نہیں ہے۔"

وہ میرا سوال سُن کر بڑے عجیب انداز میں مسکرانے لگا اور اس کی آنکھیں اچانک کسی نادیدہ جذبے کے تحت چمک اُٹھیں: " جو لوگ بھگوان سے رشتہ جوڑ لیتے ہیں، بھگوان اُن پر اس طرح مہربان ہو جاتا ہے کہ وہ دُنیا کے سامنے اپنی کسی ضرورت کے محتاج نہیں رہتے۔ میری بھوک چمکنے سے پہلے میرے عقیدت مند کھانا لے آتے ہیں۔ گزشتہ چالیس سال سے مجھے ایک مرتبہ بھی بھوک مٹانے کے لیے کہیں جانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔" اس نے اپنے جینے کا راز بے نقاب کرتے ہُوئے کہا: " مگر تم ابھی تک یہاں کیوں رُکے ہُوئے ہو۔ جا کر اپنا کام کیوں نہیں کرتے؟"

میں مسکراتا ہُوا ڈھلان کی طرف چل پڑا۔

وہاں میں نے دو خرگوش شکار کیے اور انھیں ذبح کر کے اپنی رائفل کی نال سے باندھ کر دوبارہ اُسی جھونپڑے کی طرف چل پڑا۔ دُشمن کے گھر میں گھس کر یوں شکار کرنے میں جو لذت حاصل ہوتی ہے اس کا تصور صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اپنی زندگی میں غیر معمولی حالات سے دوچار ہو چکے ہُوں۔ بوڑھا شنکر مجھے ایک مفید اداکار دکھائی دیا تھا۔ اس کا تعاون اس کڑے وقت میں میرے لیے بہت سُود مند ثابت ہو سکتا تھا۔ میں ایک ٹیلے کے قریب ٹھہر کر اپنی سانسیں درست کرنے لگا کہ معاً میری نظر دو گھوڑوں پر پڑی جو مجھے اجنبی جان کر ہنہنانے لگے۔ یہ گھوڑے دیکھ کر میں یہی سمجھا کہ شنکر ناتھ کے معتقدین آئے ہُوں گے جو اس کے لیے کھانا لائے ہُوں گے۔

میں مخفی رہ کر اُن کی گفتگو سُن سکتا تھا، اس لیے میں ٹیلے کی اوٹ سے دبے پاؤں نکل کر کُٹیا کے قریب آگیا۔

الاؤ روشن تھا ...

اس کے بلند شعلے یوں لپک رہے تھے جیسے ان گنت بلائیں اپنے سُرخ اور نوکیلے پنجے اُچھال اُچھال کر کسی کو خوف زدہ کر رہی ہوں۔ شنکر ناتھ الاؤ کی اوٹ میں چلا گیا تھا اور وہیں اپنے مہمانوں کے ساتھ باتوں میں مصروف تھا۔ اچانک شنکر ناتھ کے ملاقاتی ایک سائے کی طرح جنبش کرتے ہُوئے میرے عقب میں آکر رُک گئے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو دو قبائلی نوجوانوں کو کینہ توز نگاہوں سے اپنی طرف گھورتے ہُوئے پایا۔ ان کے عقب میں موجود شنکر ناتھ بھی سنجیدہ نظر آرہا تھا ... مجھے ماحول میں انجانی سی تبدیلی کا احساس ہُوا مگر میں نے کسی تشویش یا سراسیمگی کا مظاہرہ نہیں کیا۔

میری اس لاتعلقی کا خاطر خواہ اثر ہُوا اور اُن کے چہروں کی سختی بتدریج کم ہونے لگی پھر وہ خاموشی سے آگے بڑھ گئے اور کسی خاص ردِ عمل کا اظہار کیے بغیر تیز تیز قدم اُٹھاتے ہُوئے ٹیلے کے عقب میں جا کر غائب ہو گئے۔ میری متجسس نگاہیں چکراتی ہُوئی اس طرف اُٹھیں جہاں مجھے شنکر ناتھ نظر آیا تھا مگر وہ جا چکا تھا۔

شنکر ناتھ کے ملاقاتی اپنی وضع قطع کے اعتبار سے مجھے اُن لوگوں کے ساتھی نظر آئے جن سے میں نے دن بھر جنگ و جدل کرتے ہُوئے گزارا تھا۔ جن کی بکھری ہُوئی لاشیں شاید کرگسوں کی غذا بن گئی ہوں یا پھر انھیں وہاں سے ہٹا کر سپردِ خاک کر دیا گیا ہوگا۔

اچانک فضا رائفل کے دھماکوں سے گونج اُٹھی۔

میں ایک دم اُٹھ گیا اور رائفل تھامتے ہُوئے میری اُنگلیاں سختی سے اس کے ٹرائیگر پر جم گئیں۔ قدموں کی آہٹ سُن کر میں نے

عقب میں دیکھا تو شنکر ناتھ کی چمکتی ہوئی آنکھیں دہشت کا شکار ہو کر پھیل گئی تھیں۔

"یہ کیسا ہنگامہ ہے؟" میں نے اس کے خوف زدہ چہرے پر نگاہ گاڑتے ہوئے سوال کیا۔ "اور تم کیوں بلاوجہ خوف سے کپکپا رہے ہو؟"

"بیٹے! گزشتہ چالیس برسوں میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی نے میری کٹیا کے آس پاس کبھی گولی چلائی ہو۔" اس کے لہجے میں تاسف اُبھر آیا تھا۔ "مگر آج... آج ایک درندے کی وجہ سے یہ علاقہ میدانِ جنگ میں تبدیل ہو گیا ہے۔"

"وہ کون ہے، جس کی آمد پر لوگ اپنے گھروں سے نکل کر اس ہولناک جنگ میں شریک ہونے پر مجبور ہو گئے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

فضا میں رائفلوں کی آوازیں ابھی جاری تھیں اور میں اس جنگ کا مشاہدہ کرنے کا تہیہ کر چکا تھا۔ قبل اس کے کہ میں جنگ کے ان شعلوں کی طرف قدم بڑھاتا، ضروری تھا کہ شنکر ناتھ سے معلومات حاصل کر لیتا۔ اب میرے ذہن میں یہ شبہ جاگزیں ہو چکا تھا کہ حالات اچانک نیا رُخ اختیار کرنے والے ہیں۔ میری نظریں ابھی تک اس بوڑھے چہرے پر جمی تھیں جو میرا سوال نظرانداز کر کے دھماکوں کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان دھماکوں میں شدت آتی جا رہی تھی۔

دفعتاً ایک خیال میرے ذہن میں پیدا ہوا اور دوسرے تمام خیالات یکسر غائب ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی میرے دل و دماغ میں اندیشوں کے جھکڑ سے چلنے لگے۔ چشم زدن میں ساری حقیقت مجھ پر ظاہر ہو گئی... شنکر ناتھ نے جسے درندے کے نام سے پکارا تھا، وہ میرا باپ شاہیار خان کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ وہی دشمنوں کے جمِ غفیر میں تن تنہا لڑ رہا تھا۔ اس خیال سے میرے سارے وجود میں کھلبلی مچ گئی اور بے اطمینانی اور اضطراب کی خوفناک لہر میرا سکون بہا لے گئی۔

میں نے دوبارہ سوال کیا کہ وہ درندہ کون ہے جس نے اس علاقے کا سکون غارت کر دیا ہے؟ اس کی مسلسل خاموشی نے مجھے ناگوار لہجہ اختیار کرنے پر مجبور کر دیا تو اس کی زبان خاموش نہ رہ سکی۔

"وہ ایک سفید بالوں والا دراز قد بڈھا ہے جو صبح سے اب تک چھ آدمیوں کا خون بہا چکا ہے اور ابھی نہ جانے کتنے لوگ اس کی بربریت کی بھینٹ چڑھیں گے۔"

اس کا جواب میری توقع کے مطابق تھا۔

اپنے شیر دل باپ کو شعلوں میں گھرا ہوا جان کر میں ایک دم اُٹھا اور دوڑتا ہوا گھوڑے کے پاس جا پہنچا۔ پھر اسے کھونٹی سے کھول کر اس پر سوار ہو گیا اور آبشار کی طرف چل دیا جہاں رائفلوں سے آگ کے شعلے خارج ہو ہو کر فضا میں تیرتے دکھائی دے رہے تھے۔

چاندنی میری معاون تھی اس لیے میدانِ کارزار تک پہنچنا میرے لیے مشکل ثابت نہ ہوا۔ آبشار کی موسیقی نواز شائیں شائیں سے چند قدم کے فاصلے پر ایک تناور درخت کی آڑ لے کر میں نے گھوڑا روک دیا اور شعلوں پر نگاہ مرکوز کر دی۔ کچھ لوگ مختلف سمتوں میں مورچہ بندی کیے ایک چٹان کو نشانہ بنا رہے تھے۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں دیر نہ لگی کہ یہ سب لوگ مل کر میرے بابا کو زندگی کی نعمتوں سے محروم کرنے کی سرتوڑ کوشش کر رہے ہیں اور شاہیار خان کسی آہنی دیوار کی طرح ان کی ہر کوشش کو ناکام بنا رہا ہے۔

میں نے گھوڑے کی پیٹھ تھپکی اور اُسے باندھ کر ایک ٹیلے کی آڑ لیتا ہوا بلندی پر آ گیا، جہاں سے وادی صاف نظر آ رہی تھی۔ اچانک ایک رائفل نے شعلہ اُگلا تو مجھے ایک پتھر کی اوٹ میں دشمن کا سر صاف نظر آ گیا۔

میں نے پھرتی سے رائفل سیدھی کی اور اس کا نشانہ لیتے ہوئے ٹرائیگر دبا دیا۔ گولی پتھروں میں چنگاریاں اُڑاتی ہوئی اس موذی کے سرِ پُرغرور میں گھس گئی اور وہ کوئی آواز نکالے بغیر ہی اُلٹ کر ساکت ہو گیا۔

اس کی موت کا یقین ہوتے ہی میری نگاہیں اپنا دوسرا ہدف تلاش کرنے کے لیے وادی کی ڈھلوانوں میں بھٹکنے لگیں۔ پھر جونہی ایک رائفل کی نال سے آگ کا شعلہ برآمد ہوا تو مجھے نال کا آدھا حصہ نظر آیا۔ میں نے اس نال ہی کو نشانہ بناتے ہوئے یکے بعد دیگرے دو فائر کر ڈالے۔

دل ہلا دینے والے دھماکے ہوئے۔

چنگاریاں اُڑیں... اور رائفل کی نال دائیں جانب جھک گئی۔

معاً ایک سنسناتی ہوئی گولی مجھ سے دو قدم کے فاصلے پر ایک پتھر کا کنارہ توڑتی ہوئی زمین میں دھنس گئی۔

میں پلٹ کر ایک پتھر کی آڑ میں ہو گیا۔ میرے ہٹتے ہی ایک گولی اسی جگہ آ کر لگی جہاں چند لمحے پہلے میں موجود تھا۔ گویا ان لوگوں نے میری موجودگی بھی محسوس کر لی۔

حسین چاندنی رات اور اس پر جا بجا چھوٹنے والی آتش بازی نے ماحول کو عجیب سا رنگ دے رکھا تھا۔ میں چونکہ ایسی صورتِ حال سے متعدد بار گزر چکا تھا لہٰذا رائفلوں سے خارج ہونے والے دھماکے میرے نزدیک پٹاخوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے تھے۔ میں ان سے خوب محظوظ ہو رہا تھا۔

میں نے اس طرف دیکھا جدھر سے مجھ پر دو فائر کیے گئے تھے۔ دشمن ایک چٹان کے پیچھے موجود تھا مگر میری نظریں اُسے تلاش کرنے میں ناکام رہی تھیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے جونہی چٹان کی اوٹ سے اپنا سر ذرا سا اُٹھایا، ایک گولی میرے بالوں کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ میں جھلاہٹ میں تابڑتوڑ فائر جھونکتا رہا مگر دشمن چٹان کے عقب میں ہونے کی وجہ سے میری گولیوں سے محفوظ رہا۔ میری ایک گولی بھی اُسے ہلکا سا نقصان نہیں پہنچا سکی تھی۔

یہ دیکھ کر میں نے وہ چٹان چھوڑ دی اور پتھروں کی اوٹ میں رینگتا ہوا دشمن کی پُشت پر پہنچ گیا۔ وہ ابھی تک اسی چٹان کو نشانہ بنائے ہوئے تھا جہاں میں کچھ دیر قبل بیٹھا ناکام کوششوں پر جھلاہٹ کا شکار ہو رہا تھا۔ میں نے اس کی پُشت پر گولی داغ دی۔

ایک دلدوز چیخ فضا میں ابھری اور اس کی پُشت میں بڑا سا سوراخ ہو گیا۔

اپنے دو دشمنوں کو کامیابی سے موت کے گھاٹ اُتار کر میں آگے بڑھ گیا اور چٹانوں سے نکل کر ایک بلند اور سایہ دار درخت کی آڑ میں جا پہنچا اور نیا شکار تلاش کرنے کے لیے اطراف و جوانب میں دیکھنے لگا۔ ابھی میں یہ فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ آئندہ کیا قدم اُٹھایا جائے، میری بدنصیبی یا ناعاقبت اندیشی تھی کہ معاً ایک سنسناتا ہوا پتھر میری پُشت پر آ کر اس زور سے لگا کہ میں کراہ اُٹھا اور میرے ہاتھ سے رائفل نکل گئی۔ پھر تو مجھ پر یوں پتھر برسنے لگے کہ میں سنبھل نہ سکا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے مجھے کسی کے حکم پر سنگسار کیا جا رہا ہو۔ ایک وزنی پتھر میری کھوپڑی میں آ کر لگا اور میں سر تھامے جھکتا چلا گیا۔ غفلت آمیز تاریکیاں جب دل و دماغ کو جکڑنے لگیں تو میں ہوش و خرد سے بیگانہ ہو گیا۔

★★

چہرے پر پڑنے والی پانی کی مسلسل دھار مجھے جلد ہی ہوش میں لے آئی۔ آنکھیں کھولتے ہی دیر تک گرد آلود دھند میری آنکھوں کے سامنے چھائی رہی۔ کچھ دیر بعد جب آنکھیں دیکھنے کے قابل ہوئیں تو میں نے چند رائفل بردار جوانوں کو چاروں طرف محاصرے کی صورت میں کھڑے پایا۔ میرا رسیوں سے جکڑا ہوا جسم پھوڑے کی طرح دُکھ رہا تھا۔ جسم کا کوئی بھی حصہ ایسا نہیں تھا جو دشمنوں کی سفاکانہ ضربوں سے محفوظ رہا ہو۔

ان لوگوں نے مجھے بڑ کے ایک درخت سے باندھ رکھا تھا۔ مجھے ہوش میں آتے دیکھ کر ایک فراخ سینے والے فربہ آدمی نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کر کے بلند لہجے میں کہا "تمہارا دشمن ہوش میں آ رہا ہے۔ اس کے سر پر تھوڑا سا پانی اور انڈیل دو تاکہ اس کے حواس پوری طرح قابو میں آ جائیں۔ ظالم کا بچہ بہت سخت جان معلوم ہوتا ہے۔ کل صبح سے اب تک یہ ہمارے بیس آدمی مار چکا ہے۔ اگر ہم اسے ہتھیار ڈالنے پر مجبور نہ کرتے تو نہ معلوم کتنے اور آدمیوں کو موت کے گھاٹ اُتار چکا ہوتا۔" اس کے لہجے میں نفرت و حقارت کے ساتھ ساتھ حیرتوں کی شدت بھی نمایاں تھی... کسی نے پانی کا ایک بھرا ہوا برتن لا کر میرے سر پر اُنڈیل دیا اور میں پوری طرح ہوش میں آ گیا۔

ہوش آتے ہی جسمانی درد اپنی شدتوں کے آخری نقطے کو چھونے لگا اور سینے میں مجھے اپنی بے ترتیب سانسیں گھٹتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ ابھی آفتاب عالمتاب پوری طرح طلوع نہیں ہوا تھا۔ دن کی سُرخی اُفق کے لامحدود کناروں میں پھیل کر آمدِ صبح کی نوید سنا رہی تھی۔ صبح کے اس دھندلکے میں وہ تمام لوگ مجھے موت کے ڈراؤنے ہیولے لگ رہے تھے، جو کسی جلاد کی صورت میں کھڑے کسی منصف کے آخری حکم کے منتظر تھے۔

مجھے پوری طرح ہوش میں دیکھ کر وہ کشادہ سینے والا آدمی رعونت سے قدم اُٹھاتا ہوا میرے قریب آ گیا اور اپنی موٹی انگلیوں سے میرا سر جھٹکتے ہوئے بولا "ضدی انسان! تجھے اس بات کا یقین کر لینا چاہیے کہ تیرا آخری وقت اب بہت قریب ہے۔ اگر تو ہمارے سوالوں کا جواب دینے کے لیے تیار ہو جائے تو تیری زندگی کا وقت طویل ہو سکتا ہے۔" اس کے لہجے میں نفرت، قوت اور رحم بھی واضح محسوس ہوتا تھا۔

میں تلملا کر رہ گیا اور نفرت و انتقام کے آتش فشاں سے اُبل کر بہنے والا گرم گرم لاوا مجھے جھلسانے لگا۔

وہ میری زبوں حالی سے لطف اندوز ہوتا ہوا دوبارہ لب کشا ہوا "اگر تم جلدی سے لدی ہوئی گاڑیوں کا پتہ بتا دو تو ہم اپنے ساتھیوں کا جانی نقصان بھول کر تمہاری خطا معاف کر دیں گے ورنہ ہم تمہیں جان سے تو نہیں ماریں گے البتہ ایسی خوف ناک اذیتیں دیں گے کہ تم موت کی بھیک مانگنے پر مجبور ہو جاؤ گے۔ ہم تمہاری زبان کھلوا کر رہیں گے اس لیے اپنا ایک آدھ ہاتھ تڑوانے کی حماقت نہ کرو۔ میں نے تمہیں گلوخلاصی کا ایک آسان طریقہ بتا دیا ہے۔ اگر تم نے ہماری پیش کش ٹھکرا دی تو آج کا سورج تمہارے خون کی سُرخی دیکھتا ہوا طلوع ہو گا۔ یاد رکھو! میرا نام رستم خان ہے۔ مجھے اس بات پر مجبور نہ کرنا کہ میں تمہارے دانتوں کو نوکیلے پتھر سے توڑ کر اپنے مطلب کی بات اُگلوانے کے لیے مجبور ہو جاؤں۔"

اس کی آواز سے جھلکتی ہوئی درندگی اس بات کی غمازی کر رہی تھی کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے اُسے کر گزرنے میں ذرا بھی تامل سے کام نہیں لے گا، بلکہ وہ آخری حدوں سے بھی تجاوز کر سکتا ہے۔ مگر میں نے اپنے چہرے سے کسی تاثر کا اظہار نہیں کیا۔ کہیں وہ یہ نہ سمجھ لے کہ میں اس کی چرب زبانی سے مرعوب ہو گیا ہوں۔

"میں ابھی تک یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ان گاڑیوں پر قبضہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کرنے کا دلکش خواب تمھیں کس عقل کے دشمن نے دکھایا ہے؟ خود کو موت کے جبڑوں میں پاکر بھی میرے اعتماد میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔

"اور تم بھی مجھے کوئی نا سمجھ آدمی نظر آتے ہو جو اپنے قبیلے کو تباہی کے کنارے پر پہنچانے کے درپے ہو۔ ان اسلحہ گاڑیوں پر قبضہ جمانے کا خواب محض ایک خواب ہی رہے گا۔ حقیقت کا روپ کبھی نہیں دھار سکتا کیوں کہ وہ گاڑیاں ان لوگوں کی تحویل میں پہنچ چکی ہیں، جو ان کے اصل حق دار ہیں۔ اب یہ گاڑیاں دلیپ سنگھ کی تحویل میں ہیں۔ اگر ہمت ہو تو جا کر اس سے چھین لو۔" میں نے مضحکہ اُڑانے والے انداز میں کہا اور مسکرانے لگا۔

یہ سُن کر ان کے تیور بدلنے لگے اور ان کے چہروں پر چڑھی ہوئی مصنوعی گرد جھڑ گئی تو ان کی درندگی پھر عود کر آئی۔ رستم خان جو مجھ سے کسی کارآمد جواب کی توقع کر رہا تھا، خونخوار درندے کی طرح دھاڑنے لگا۔

"ذلیل! تو اوّل درجے کا مکّار ہے اور اپنی کذب بیانی سے میری آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کر رہا ہے۔ تیرے آدمی ہر وقت ہماری نظروں کے سامنے رہے ہیں۔ تُو نے وہ گاڑیاں اُسی رات کہیں چھپا دی تھیں جب تُو اور تیرے ساتھی سرکنڈوں میں آگ لگا کر دریا پار کر گئے تھے۔ اس کے بعد وہ گاڑیاں کہاں غائب ہو گئیں؟ انھیں زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا؟ اگر دلیپ سنگھ کے آدمی وہ گاڑیاں حاصل کر لیتے تو ہمارے آدمیوں کو ہر حال میں خبر ہو جاتی۔"

اس نے میری حق اور باطل کی آمیزش سے گھڑی ہوئی کہانی کی دھجیاں اُڑاتے ہوئے میرے بائیں گال پر اپنا دایاں ہاتھ رسید کر دیا۔ چوٹ شدید تھی اور میں اس کے لیے تیار نہیں تھا۔

میرا منہ خون سے بھر گیا۔۔۔

میری زبان دانتوں تلے آکر کٹ گئی تھی۔

"بول! نابکار۔ جواب دے۔ وہ گاڑیاں تُو نے کہاں چھپائی ہیں؟"

اس نے اس قدر سختی سے میرے سر کے بالوں کو جھٹکا دیا کہ کئی بال ٹوٹ کر اس کی مُٹھی میں آ پہنچ گئے۔

شدتِ درد سے مجھے اپنے سر سے چنگاریاں اُٹھتی محسوس ہونے لگیں اور آنکھوں کے سامنے دُھند کی چادر حائل ہو گئی۔

"جنگلو خان! آگ بھڑکا کر اس مردود کو کچھ دیر کے لیے اُلٹا لٹکا دو تاکہ اس کے ہوش ٹھکانے آجائیں اور یہ سچ کا راستہ اختیار کرنے پر مجبور ہو جائے۔"

دشمنوں کے آگے رحم کی بھیک مانگنا میرے خمیر میں شامل نہیں تھا۔ میں خاموش رہا اور نفرت کی نگاہ سے اُسے گھورتا رہا جو خشک لکڑیاں جمع کر رہا تھا تاکہ رستم خان کی دھمکی کو عملی جامہ پہنایا جا سکے۔

"بہادر خان! آگ جلنے تک تم اس کی کھوپڑی شکنجے میں کس دو اور بل دے کر دیکھو، ممکن ہے ہماری بات اس کی سمجھ میں آجائے۔" رستم خان نے میری ٹانگوں پر ٹھوکر رسید کرتے ہوئے اپنے ایک ساتھی سے کہا اور دو قدم ہٹ کر ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔

اُن کے اس توہین آمیز سلوک نے میرے وجود میں انتقام کے انگارے بھر دیے۔ میں نے سختی سے اپنے ہونٹوں کو بھینچ لیا تاکہ تشدد کے دوران میرے حلق سے کوئی آواز نہ نکلنے پائے۔

جب سورج کی کرنیں پہاڑوں کی بلند و بالا برفانی چوٹیوں سے نیچے رینگتی دکھائی دیں تو ہر طرف پھیلی ہوئی دھند آہستہ آہستہ صاف ہونے لگی۔ میرا جسم جگہ جگہ سے گھائل تھا اور لباس پر سُرخ دھبوں کا چھڑکاؤ محسوس ہوتا تھا۔ میں قطعی طور پر تنہا اور بے بس تھا۔ رائفل تو سنگ باری کے دوران ہی ہاتھوں سے نکل گئی تھی مگر دشمنوں کی قید میں آکر میں اپنے دونوں ریوالور اور زہر میں بجھے ہوئے خنجر سے بھی محروم ہو چکا تھا۔

بہادر خان نے مجھے زیادہ دیر سوچنے کا موقع نہیں دیا۔ وہ ایک موٹا رسّا لے کر میری طرف بڑھا اور میرے سر کے گرد باندھ کر اُسے بل دینے لگا۔ درد کی ایک تیز لہر میری کھوپڑی سے اُتر کر سارے وجود میں سرایت کر گئی۔ مجھے اپنی کھوپڑی چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں منقسم ہوتی محسوس ہوئی۔ بہادر خان آہستہ آہستہ شکنجے کو کستا گیا۔ میرے کانوں میں شائیں شائیں کی آوازوں کے ساتھ آنکھوں کے سامنے سیاہ دائرے بھی تیرنے لگے اور مجھے یوں لگا جیسے میں دوبارہ حواس کھو کر تاریکی کے عمیق کنویں میں غرق ہو رہا ہوں۔ معلوم نہیں کتنی ساعتیں اسی عالم میں گزر گئیں پھر تڑاخ کی ایک آواز نے دوبارہ میرے شعور میں تلاطم بپا کر دیا۔ کسی نے میرے منہ پر زوردار تھپڑ رسید کیا تھا۔

میں نے آنکھیں کھول دیں۔ رستم خان کا کرخت چہرہ دکھائی دیا۔ اس کی آنکھوں میں کوندتی ہوئی نفرت کی بجلیاں میرے وجود کو چاٹ رہی تھیں۔ اس کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ پاکر میں نے بوجھل آنکھیں بند کر لیں اور بکھرے ہوئے حواس یکجا کرنے لگا۔ اس نے بال کھینچ کر میرے سر کو ایک جھٹکا دیا تو مجھے جسم و جان کے سارے رشتے تیزی سے منقطع ہوتے محسوس ہونے لگے۔ موت کا عفریت زندگی کی ساری فصیلوں کو گراتا ہوا جس سرعت سے مجھ پر غلبہ پا رہا تھا اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ میری زندگی کا سورج غروب ہونے میں صرف چند ساعتیں باقی رہ گئی ہیں۔

"اجنبی احمق! اب بھی وقت ہے۔ تیری جان بچائی جا سکتی ہے اگر تو اپنی ضد چھوڑ کر اس جگہ کی نشان دہی کر دے

جہاں اسلحے سے لدی ہوئی گاڑیاں چھپائی گئی ہیں تو ہم تیری زندگی کی ضمانت دینے کو تیار ہیں ورنہ رستم خان کا غصہ تیرے وجود پر بجلی بن کر ٹوٹ پڑے گا اور تجھے اس سے بڑے عذاب جھیلنے کے لیے تیار رہنا ہو گا۔"

اس نے تحقیر آمیز لہجے میں مجھ سے کئی سوالات کر ڈالے لیکن مجھے خاموش پاکر جنگلو خان کی طرف دیکھنے لگا جس نے سوکھی گھاس کے ذریعے لکڑیوں کے ڈھیر میں آگ لگا دی تھی اور درخت کی ایک مضبوط شاخ کے ساتھ ایک موٹا سا رسّا بلند کر دیا تھا تاکہ مجھے آگ پر لٹکایا جا سکے۔

حالات نے اس تیزی سے بار بار ناقابلِ فہم رُخ اختیار کیے تھے کہ میرے حواس معطل ہو کر رہ گئے تھے لیکن جس خطرناک اور سنگین مرحلے پر میں اس وقت کھڑا تھا اس کی اذیت ناکی اور رُوح فرسائی شدید اور ناقابلِ برداشت تھی۔ میں تمام تر حوصلوں کے باوجود چکرا کر رہ گیا۔ نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن کے مصداق میری حیاتِ ہنگامہ خیز کے تمام اوراق برگِ متحمل کی طرح کبھی فضا میں بکھرنے لگتے کبھی انھیں سمیٹ کر پھر ترتیب سے جما دیا جاتا اور زندگی معمول پر آجاتی۔

میں نے جس مقصد کے لیے ان اسلحہ گاڑیوں کی حفاظت کی تھی وہ میری ایک جان سے بہت قیمتی اور ارفع تھا۔ وہ اسلحہ تو صبحِ آزادی کے جیالوں کی امانت تھا، میں اسے ان قزاق۔۔۔ اور غارت گرِ انسانیت قسم کے لٹیروں کے حوالے کیسے کر دیتا؟ جو اسے اپنے ہم وطنوں کا عرصۂ حیات تنگ کرنے کے لیے حاصل کرنا چاہتے تھے۔ انھیں نہ وطن سے محبت تھی اور نہ وطن پرستوں سے بلکہ وہ تو وطن فروشوں کے ہاتھ مضبوط کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ اپنے حال اور مستقبل سے لاتعلق ہو کر اُسی سمت چل پڑے تھے جو غلامی کی رہنمائی کرتا ہے۔ میرے ذہن سے موت کا خوف محو ہو گیا۔۔۔ میں نے سختی سے ہونٹ بھینچ لیے اور بہادر خان کو نفرت آلود نظروں سے گھورنے لگا۔ اگر جذبہ صادق ہو تو نارِ نمرود بھی سرد ہونے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ جذبوں کی کڑی دھوپ میں تپ کر ہی انسان کندن بنتا ہے ورنہ آگ کا تو کام ہی جلانا ہے، وہ ضرور جھلسائے گی۔۔۔ لیکن جذبۂ صادق اور عشقِ بے خرد، حُسن کا ایک ایسا بُت تراش دیتے ہیں کہ بھڑکتے ہوئے شعلے بھی پھول بن جاتے ہیں۔

"تمھاری خاموشی اور آنکھوں سے جھانکتی ہوئی نفرت اس بات کا ثبوت ہیں کہ تمھیں اپنی ذلت آمیز موت کا یقین ہو گیا ہے مگر اس کے باوجود بھی تمھارے جسم میں مزاحمت کی رمق باقی ہے۔۔۔ یاد رکھو، ابھی چند لمحے بعد ہی تیری یہ باقی ماندہ مدافعت بھی زائل ہو جائے گی اور مرنے کے بعد تیرا جسم اس قدر خوف ناک ہو جائے گا کہ مُردار خور بھی تیرے قریب آنے سے خوف کھائیں گے۔"

اس کی دھمکی آمیز باتیں پگھلے ہوئے سیسے کی طرح میرے کانوں میں اُتر رہی تھیں۔

"میں تمھاری ہر بات کا جواب دے چکا ہوں بہادر خان!" میرے لہجے میں زخمی چیتے کی سی درندگی پیدا ہو گئی۔ "میں کہہ چکا ہوں کہ اسلحے کی گاڑیاں دلیپ سنگھ کی تحویل میں ہیں، تمھیں میرا اعتبار آجانا چاہیے تھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ تم میری بات جھٹلانے کا تہیہ کر چکے ہو۔ ایسے میں، میں تمھاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟"

"بکواس بند کرو اور بتاؤ وہ گاڑیاں کہاں ہیں؟" وہ غصے سے بل کھا کر غرّایا۔

"چونکہ میرا جواب تمھیں پسند نہیں آیا اس لیے مجھے بے بس کر کے تم مجھ پر تشدد کی انتہا کرنا چاہتے ہو۔ اب کوئی اور ستم آزمانے کا ارادہ ہے تو تم اپنا عمل شوق سے جاری رکھ سکتے ہو کیوں کہ میں گڑگڑا کر زندگی کی بھیک مانگنے سے عزت کی موت مرجانا بہتر سمجھتا ہوں۔۔۔ آنے والے لمحے یہ ثابت کر دیں گے کہ میں جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔ مجھے احساس ہے کہ تمھارا وقت قیمتی ہے اور تم نے مستقبل کے جتنے بھی سہانے خواب دیکھے ہیں وہ میرا جواب سُن کر فنا کے گھاٹ اُتر چکے ہوں گے لیکن میں نے تمھیں حقیقت بتا دی ہے۔"

میری باتوں نے اسے اُلجھن میں ڈال دیا۔

"بہادر خان کیا سوچ رہے ہو۔ اپنے نام کی کچھ لاج رکھو!" میں نے کہا۔ "اگر اپنی اور اپنے قبیلے کی بہتری عزیز ہے تو۔۔۔ ان گاڑیوں کو بھول جاؤ اور مجھے موت کے حوالے کر کے واپس چلے جاؤ۔ ورنہ حالات ایسی بھیانک کروٹ بدلیں گے کہ یہ ویرانہ تا حشر تمھاری تباہی اور بربادی پر نوحہ کناں اور ادھر سے گزرنے والا ہر مسافر اس وادی کو دیکھ کر خوف سے کانپ اُٹھے گا۔"

"۔۔۔ نامراد! میری خاموشی کسی خوف کا نتیجہ نہیں ہے۔" وہ جنونی انداز میں اُٹھا اور اس نے میرے منہ پر ایک گھونسہ جڑ دیا۔ "تیری باتوں نے یہ احساس تازہ کر دیا ہے کہ تیرے ساتھی بھی کم خطرناک نہیں ہو سکتے۔ مجھے تیرے دلائل اور شاطرانہ خیالات کی ضرورت نہیں مجھے تو اُن لوگوں کی فکر ہے جن کے قبضے میں وہ گاڑیاں ہیں؟

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہر کوشش میں ناکامی کے احساس نے اس پر دیوانگی طاری کر دی اور اس نے مجھ پر لاتوں، گھونسوں اور تھپڑوں کی بارش کر دی۔

"ابھی تیرے جسم میں بہت طاقت ہے جسے میں مار مار کر نکال دوں گا۔"

غصّے کی شدت سے اُس کے مُنہ سے سفید سفید جھاگ اُڑنے لگے تھے۔

"جنگو خان!" وہ اپنے خونخوار ساتھی کو مخاطب کر کے بولا۔ "اس کی مُشکیں باندھ کر مُنہ میں کپڑا ٹھونس دو تاکہ اس کی قینچی کی طرح چلتی ہوئی زبان جھوٹ کا سہارا لینے سے باز آ جائے۔"

جنگو خان نے کپڑے کا ایک گولا میرے حلق میں ٹھونس کر اوپر سے ایک کپڑا باندھ دیا اور مجھے درخت کے تنے سے کھول کر اُس شاخ کے نیچے لے آئے جہاں الاؤ روشن کیا گیا تھا۔ پاؤں سے شاخ سے جھولتی ہوئی رسّی سے بندھنے کے بعد میں نے جونہی اپنے وجود کو سیدھا کیا تو آگ کے تیز شعلے میرے سر کے بالوں کو چاٹنے لگے۔ بالوں کے جلنے کی بو نتھنوں میں گھستی چلی گئی۔ میرا بدن پسینے میں نہا گیا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور خود کو کسی جھولے کی مانند جھلانا شروع کر دیا۔ آگ سے بچنے کی یہ کوشش دیکھ کر بہادر خان اور اُس کے ساتھی وحشیانہ قہقہے لگانے لگے۔ پھر بہادر خان ایک نئے ولولے کے ساتھ میری طرف بڑھا اور میرے جسم کو تھام کر حرکت کرنے سے روک دیا۔ آگ کی ایک تیز لہر میرے چہرے کو گرماتی ہوئی گزر گئی۔ اب مجھے یقین ہونے لگا کہ میں چراغِ سحری کی مانند بجھا ہی چاہتا ہوں۔ ابھی ایک جھونکا آئے گا اور چراغِ زیست کی ڈوبتی ہوئی دھڑکن کو بجھا کر نکل جائے گا۔ ... لیکن ابھی چراغِ زیست کپکپا کر دم توڑنے ہی والا تھا کہ اچانک دُور کہیں رائفل کا ایک دھماکا گونجا اور میرے قریب موجود تماشائی بہادر خان مُنہ کے بل بھڑکتے ہوئے شعلوں میں گر گیا۔

اس کا چہرہ جھلس کر بھیانک ہو گیا اور اس کی چیخوں سے ماحول کانپنے لگا۔ گولی نے فوری اثر دکھایا ورنہ ان چیخوں کا سلسلہ نہ جانے کب تک جاری رہتا۔

دفعتاً رائفل ایک بار پھر گرجی اور اُس کے شعلے نے میرے ایک اور دشمن کو چاٹ لیا۔ حملہ آور نے بروقت یہ اقدام کیا تھا۔ اگر چند لمحے اسی طرح شعلوں کی لپیٹ میں گزر جاتے تو میری لاش بھی بہادر خان کی طرح جل رہی ہوتی اور میری داستانِ حیات کا آخری باب بھی تکمیل پا چکا ہوتا۔ میں حملہ آور کے بارے میں سوچنے لگا جس کی آگ اُگلتی رائفل میرے لیے مژدۂ نجات ثابت ہو رہی تھی۔ یقین میرے دل میں نجانے کیوں جڑ پکڑتا جا رہا تھا کہ اس وقت

میری زندگی کی بچی کھچی سانسیں میرے شیر دل باپ کی ہمت و شجاعت کی رہینِ منت ہیں۔ ورنہ اس علاقے میں دُور دُور کوئی ایسا شخص نہیں ہو سکتا تھا جو محض میری جان بچانے کے لیے ایک منظم گروہ سے ٹکرا جاتا۔

میرے دشمن جو اپنی آنکھوں کے سامنے مجھے مُردہ دیکھنے کے خواہشمند تھے اپنے دو بہترین ساتھیوں سے محروم ہو کر سنبھل گئے اور حملہ آور کی فائرنگ کا جواب دینے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے آبشار کے اردگرد کا علاقہ جا بجا خون کی رنگین لکیروں سے سُرخ ہونے لگا۔ دشمن جو کچھ دیر قبل دندناتا پھر رہا تھا اب صرف مدافعانہ جنگ پر مجبور تھا۔

منصوری قبیلے کے چار جوان ایک ایک کر کے موت کی آغوش میں جا سوئے تھے۔ ان کی وحشیانہ فائرنگ جاری تھی کہ ایک احساس مجھے بے چین کر گیا۔ یہ بات کُھل گئی تھی کہ حملہ آور ایک ہی آدمی ہے جو اپنے سے دس گنا زائد بھیڑیوں سے اپنی طاقت کا لوہا منوانا چاہتا ہے لیکن وہ آخر کب تک ان درندوں سے لڑتا رہے گا؟

رفتہ رفتہ رائفل کے دھماکوں میں کمی آنے لگی اور جلاد فطرت دشمن نے مزید دو آدمی گنوا بیٹھا... پھر وہ بوکھلاہٹ کے عالم میں میدان چھوڑ کر بھاگنے لگا۔ دشمن کا فرار میرے لیے خوش آیند تھا۔ میرا رسّیوں سے جکڑا ہوا جسم اُلٹا لٹکا ہوا تھا اور میری آنکھیں اُس مسیحا کو دیکھنے کے لیے فرشِ راہ تھیں جس نے میری ہستی پر منڈلاتے ہوئے موت کے اَن گنت سایوں کو دُور کر دیا تھا۔

یکایک گہرا سکوت چھا گیا... ایسا سکوت جو کسی مُردے کو سپردِ خاک کرنے کے بعد قبرستان پر مسلط رہتا ہے۔

میری دھڑکنیں اتنی کمزور پڑ گئیں کہ اب موت کی آہٹیں اپنے وجود سے قریب تر محسوس کرنے لگا تھا۔ معاً ان آہٹوں پر میرے مسیحا کے قدموں کی چاپ بھاری پڑنے لگی۔ کسی کے بھاری بھاری سانسوں کی آواز میری سماعت سے ٹکرانے لگی... لیکن قریب آ جانے پر بھی میں اُس کا چہرہ نہ دیکھ سکا۔ البتہ لباس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ میرے شیر دل باپ کے علاوہ کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ اس نے رسّی کاٹ کر مجھے سنبھالا اور کسی کھلونے کی طرح اُٹھا کر سیدھا کھڑا کر دیا۔

اگلے ہی لمحے ہم دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئے تھے۔ اُس کا سارا لباس دھول میں اَٹا ہُوا تھا اور اس کے سنگلاخ چہرے پر حلقوں کے اندر سے جھانکتی ہوئی آنکھوں کی سُرخی بڑھ کر اُسے اور بھی بارعب ظاہر کر رہی تھی۔ اُس نے رائفل پھینک کر پہلے میرے مُنہ

پر بندھی ہوئی پٹی اُتاری، میرے حلق میں بے دردی سے ٹھونسا ہوا کپڑا نکالا اور پھر میرے ہاتھوں کو آزاد کرتے ہوئے بولا۔ "خُدا کا شکر ہے کہ تم مجھے عین وقت پر نظر آ گئے ورنہ شاید دشمنوں سے اُلجھے بغیر ہی آگے بڑھ جاتا۔ بہرحال یہ تمہاری غلطی تھی کہ تم نے میرے تعاقب میں آنے کے بجائے دشمنوں سے براہِ راست اُلجھنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس طرح انھیں تم کو گھیرے میں لے کر تشدد کرنے کا موقع مل گیا۔" اس کے لہجے میں پدری شفقت تھی جو مجھے اُس کے سامنے شرمسار کر گئی۔

میں ہانپتا ہُوا ایک پتھر پر بیٹھ گیا اور ایک طویل سانس لیتے ہُوئے اپنے شیر دل باپ کو دیکھتا رہا اور اُس کے بگڑے ہوئے حلیے پر غور کرتا رہا۔ دریں اثنا خان بابا بڑے چوکنے انداز سے آس پاس کے ٹیلوں کا جائزہ لیتا رہا۔ اُس کے سخت چہرے پر سنجیدگی کی دبیز تہ چڑھ گئی تھی جس کی وجہ سے اس کا چہرہ اور بھی خوفناک نظر آ رہا تھا۔

"اس آبشار سے لگ بھگ ایک فرلانگ دُور ایک ایسا غار ہے جہاں ہم چھپ کر راستے کی نگرانی کرتے ہُوئے اپنی تھکن بھی دُور کر سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے، گزشتہ چوبیس گھنٹوں کا عرصہ لامتناہی پریشانیوں میں گزرا ہو گا۔ تمہاری آنکھوں سے اُٹھتا ہُوا دھواں تمہارے احساس کی ترجمانی کر رہا ہے۔ تمھیں غالباً مجھ سے شکایت ہے کہ میں اندھا دھند آگے بڑھنے کی بجائے پلٹ کر تمہاری مدد کے لیے کیوں نہیں آیا؟" اس کے سخت چہرے پر ہلکی سی لکیر کھنچ گئی جو اس بات کی دلیل تھی کہ اس کے پاس اس بات کا معقول جواز موجود ہے کہ وہ میری مدد کے لیے کیوں نہیں پہنچ سکا تھا۔

میں نے اس کی باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا بلکہ اشارہ پاتے ہی اُٹھا اور ڈگمگاتے قدموں سے اس کے ساتھ چل پڑا۔ معاً مجھے ٹنکرناتھ یاد آ گیا جس کی کُٹیا یہاں سے تھوڑی ہی دُور تھی۔ اگر ہم اس کُٹیا کو اپنی عارضی قیام گاہ بنا لیں تو ہمارے تھکے ہوئے جسم چند گھڑیاں آرام سے گزار سکتے ہیں اور پھر باتوں باتوں میں اس کے کسی معتقد سے بھولا سنگھ کے خفیہ مسکن کا پتہ آسانی سے مل سکتا ہے مگر میں نے خود ہی اس خیال کو مسترد کر دیا اور چمکتی ہوئی دھوپ میں اپنے بابا کے ساتھ آبشار پر آ گیا۔ آبشار کا شفاف پانی دیکھ کر اپنے بدن پر کانٹوں کا احساس ہُوا تو میں نے کہا۔ "بابا! میں اپنا کچھ وقت آبشار کے بہتے پانی میں گزار لوں تو میری حالت بہتر ہو جائے گی۔"

"یہاں سے چند میل آگے راستہ خطرناک ہو گا۔" اس نے آبشار سے گرتے ہوئے پانی پر اپنی نظریں جما کر جواب دیا۔ "پانی تمھیں وہاں بھی میسر آ جائے گا جہاں ہم جا رہے ہیں۔ ایسے کام خطرے کی حدود پار کرنے کے بعد ہی انجام دیے جاتے ہیں۔ یہ ایک عام گزرگاہ ہے اور اس وقت ہمارے آس پاس دشمن بھی چھپے ہوئے ہیں۔ زخم خوردہ دشمن کو اس بات

کا موقع نہیں ملنا چاہیے کہ وہ ہمیں غفلت میں پا کر گولیوں کی بوچھاڑ کرے اور ہم بھولا سنگھ سے پنجہ آزمائی کرنے کی آرزو دل میں لیے اس دُنیا سے سدھار جائیں۔"

میں نے اپنے باپ کے سنجیدہ چہرے کو دیکھا اور پھر طویل سانس لیتا ہُوا آگے بڑھنے لگا۔ اب ہم آبشار کے کنارے چھوٹے ٹیلوں کے درمیان چلتے ہُوئے گھنی جھاڑیوں کو ہٹاتے ہُوئے گزر رہے تھے۔ جھاڑیاں ختم ہوتے ہی ایک بلند پہاڑ کی طرف بڑھنے لگے۔

پہاڑ شروع ہوتے ہی قدآور جھاڑیوں کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا تھا جن پر سبز بیلوں نے اپنا جال بُن رکھا تھا۔ ان بیلوں میں سُرخ سُرخ پھل اس قدر دلکش لگ رہے تھے جیسے پورا پہاڑ دہک اُٹھا ہو۔ خان بابا محتاط قدم اُٹھاتا ہُوا ان جھاڑیوں کے ساتھ ساتھ تھوڑی دیر چلتا رہا پھر ایک خاردار جھاڑی کی شاخوں کو اُٹھایا تو اس کے پیچھے ایک تاریک خلا موجود تھا۔ اُس نے ماحول پر سرسری نگاہ ڈالی اور مجھے پیچھے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے اس تاریک خلا میں گھُستا چلا گیا۔

غار اندر سے کافی کشادہ اور ہوادار تھا۔ ایک کونے میں الاؤ روشن تھا اور قریب ہی میرے باپ کا مختصر سامان پڑا ہُوا تھا... مگر اُس کا گھوڑا کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ اپنے باپ کا گھوڑا غائب پا کر مجھے اپنا گھوڑا یاد آ گیا جسے میں نے اپنی گرفتاری کے دوران میں کھو دیا تھا۔ میں نے ایک نظر اپنے خون آلود لباس کی طرف دیکھا تو مجھے اپنے آپ سے گھِن آنے لگی جو خون جمنے کے باعث قمیص جگہ جگہ سے زخموں سے چپک کر رہ گئی تھی... میں نے الاؤ کے پاس پتھریلے فرش پر دراز ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔ تھکن اور بھوک نے مجھے نڈھال کر دیا تھا۔

"شہباز!" اچانک خان بابا کی کرخت آواز اُبھری۔

میں نے آنکھیں کھول دیں۔

"اپنا لباس اُتار کر یہ چادر بدن پر لپیٹ لو اور سیدھے لیٹ جاؤ تاکہ میں تمہارے زخموں پر مرہم لگا دوں۔ جب تک یہ لباس تمہارے بدن پر موجود رہے گا تم سکون کا سانس بھی نہیں لے سکتے۔"

میں نے جسم سے چپکا ہُوا لباس اُتار کر بابا کی دی ہوئی چادر اپنے بدن کے گرد لپیٹ لی اور سیدھا لیٹ گیا تاکہ بابا میرے سینے کے زخموں پر مرہم لگا سکیں۔ شانیار خان نے اپنے سامان سے ایک شیشی نکالی اور انگلی ڈال کر مرہم نکالتے ہُوئے بولا۔ "اسحق کی گاڑیوں کی شہرت آس پاس کی بستیوں میں دُور تک پھیل گئی ہے جسے دیکھو ان گاڑیوں پر قبضہ جمانے کا خواب دیکھتے ہُوئے اپنے گھر سے نکل کر تصوری

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لاتعداد پُراسرار اور سنسنی خیز داستانوں کے خالق

PVL

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY

www.pdfbooksfree.pk

خط وکتابت کے لئے

مکتبہ القریش سرکلر روڈ، اُردو بازار، لاہور۲

قبیلے کے لوگوں کے ساتھ آملا ہے" اُس نے زہر بھرے لہجے میں بجھے بجھاتے ہوئے کہا۔

میں تلخی سے مسکرانے لگا۔

"کل سے اب تک ایسے چالیس آدمیوں کو دیکھ چکا ہوں جن کو طرح طرح کے لالچ دے کر اس جنگ میں شریک کیا گیا ہے۔ ان میں بہت سے لوگوں کو میں نے ہمیشہ کے لیے بیکار کر دیا ہے مگر پھر بھی دشمنوں کی تعداد میں کمی نہیں آئی۔ کیا تمہارے ساتھی سلامتی کے ساتھ آبشار تک پہنچ جائیں گے۔ ہمیں اُن کی مدد کے لیے دوبارہ اسی تاریک جنگل کا سفر کرنا پڑے گا؟"

"خان بابا!" میں نے کچھ دیر حالات پر غور کرتے ہوئے جواب دیا۔ "حالات اس قدر سنگین صورتِ حال اختیار کر چکے ہیں کہ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا، ہمارا تعاقب کرتے ہوئے محراب خان اور اُس کے ساتھیوں کے ساتھ کیا گزری ہو گی اور وہ اُس وقت کس حال میں اور کہاں ہوں گے۔ محراب خان ایک بیدار مغز اور ہوشیار آدمی ہے جو قافلے کو سلامتی سے اس مقام تک لے آئے گا، مگر زیادہ امکان یہی ہے کہ وہ دشمنوں سے جھڑپ کے بعد بھی درمیان ہی میں کہیں رُکے ہوئے ہیں اور صورتِ حال بہتر ہونے کے بعد ہی آگے بڑھیں گے۔"

میری فکر انگیز باتوں کو سُن کر خان بابا سوچ میں پڑ گیا اور اُس کے ہاتھوں کی حرکت میرے سینے کو چھوتی ہوئی ایک جگہ ٹھہر گئی۔

"خان بابا!" میں نے اُسے خاموش پاکر کہا۔ "وہ ایسی کون سی اہم بات تھی جس نے تمہیں مسلسل آگے بڑھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ہر رائفل کی گونج تمہارے کانوں تک ضرور پہنچی ہو گی پھر کیا وجہ تھی کہ تم واپس آنے کی بجائے تیزی سے آگے بڑھتے چلے گئے تھے تم سے جُدا ہونے کے بعد میں نے یہ چوبیس گھنٹے بڑی اذیت میں گزارے ہیں۔ تم پلٹ کر آ جاتے تو صورتِ حال بہت مختلف ہوتی اور ہمیں اب جو مشکل درپیش ہے کم از کم وہ تو ہرگز سامنے نہ آتی۔ ہم خطرات میں گھرے ہوئے ہیں اور ہمارے ساتھ ان لوگوں کی زندگیاں بھی داؤ پر لگی ہوئی ہیں جو اس وقت تمہارے لیے اُلجھن کا باعث بنی ہوئی ہیں۔"

میری طرف دیکھتے ہوئے وہ اچانک اپنی جگہ سے اُٹھ گیا اور خشک دودھ کا ایک ڈبہ اُٹھا لایا جو اُس نے ساتھیوں سے علیحدگی کے وقت احتیاطاً اپنے ساتھ رکھ لیا تھا۔ "میرا خیال ہے پہلے کچھ پیٹ کا ایندھن تیار کر لیا جائے۔"

بھنے چھلکے کھانے کے دوران دیر تک خاموشی طاری رہی۔ میرے شیر دل باپ کے گرد میں اَٹے ہوئے چہرے پر عجیب سا سکوت چھایا ہوا تھا جس نے مجھے بے چین کر دیا۔ میں نے پہلو بدلتے ہوئے کھانا ختم کیا۔ پھر پانی کی چھاگل ہونٹوں سے لگالی اور بہت سا پانی اپنے حلق میں اُنڈیلنے کے بعد کہا۔

"خان بابا! تم نے ابھی تک میرے سوال کا جواب نہیں دیا کہ تمہیں آخر کیا مجبوری پیش آگئی تھی جس نے تمہیں میری ذات کو نظر انداز کرتے ہوئے مجھ سے الگ رہنے پر مجبور کر دیا۔ شاید تم نے میری رائفل کی گونج نہیں سُنی تھی اور اگر سُن لی تھی تو وہ کون سا محرک تھا جس نے تمہیں اپنے بیٹے کی مدد کرنے سے باز رکھا؟"

خان بابا جو میری باتوں کو غور و توجہ سے سُن رہا تھا میرے فکر انگیز خیالات سُن کر اپنے پتھریلے چہرے پر تلخ مسکراہٹ بکھیر کر رہ گیا۔

"میں تم سے بمشکل ایک سو قدم آگے تھا کہ مجھے عقب سے تمہاری رائفل کی آواز سُنائی دی تھی۔" خان بابا نے جواب دیا۔ "مگر جونہی خطرے کا احساس ہوا، میں نے واپسی کا ارادہ کیا لیکن گھوڑا اچانک بدک گیا اور راستے کے وسط میں کھدے ہوئے ایک اندھے کنوئیں میں گر گیا۔" وہ سانس لینے کے لیے کچھ دیر رُکا اور کہنے لگا۔ "اسی دوران رائفل میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور میں کنوئیں کی تہہ میں پہنچ گیا۔ گھوڑا گرتے ہی اپنی گردن تڑوا بیٹھا اور میرا ساتھ چھوڑ کر ساکت ہو گیا۔ اس خشک کنوئیں سے عجیب سی بدبو اُٹھ رہی تھی جس نے میرے لیے سانس لینا بھی محال کر دیا تھا۔ بھوک، تھکن اور دماغ نے میرے اعصاب پر اثر کرنا شروع کر دیا اور میں کچھ دیر کے لیے اپنے حواس سے عاری ہو گیا جب حواس بحال ہوئے تو پتہ چلا کہ میں کس خطرناک اور پیچیدہ صورتِ حال سے دوچار ہو چکا ہوں اور دن کی روشنی جو گھنے درختوں کی موجودگی سے پہلے ہی تاریکی کا روپ دھار چکی تھی، اندھے کنوئیں میں گرنے کے بعد مجھ پر اس طرح اثر انداز ہوئی کہ میری آنکھیں کچھ دیکھنے کے قابل ہی نہ رہیں۔ رائفل میں پہلے ہی کھو چکا تھا مگر میرے دونوں ریوالور موجود تھے۔ میں نے پے در پے ہوائی فائرنگ کر کے تمہیں اپنی موجودگی سے آگاہ کرنا چاہا مگر میری ہر کوشش ناکامی سے دوچار رہی اور ریوالوروں سے اُٹھنے والی تمام آوازیں صدائے بازگشت سے زیادہ ثابت نہ ہو سکیں۔ حالات نے اچانک ایسی کروٹ بدلی تھی کہ وہ تاریک کنواں مجھے اپنی آخری آرام گاہ نظر آنے لگا۔ تمہاری اور اپنی جان کی فکر کے علاوہ سب سے بڑی فکر اس بات کی تھی جس کے لیے ہم جنگل چھاننے پر مجبور ہو گئے تھے۔ یہ تمام افکار میرے وجود پر اس شدت سے حملہ آور ہوئے کہ میں بوکھلا گیا۔ بہرحال میں نے کسی نہ کسی طرح اپنے منتشر حواس کو سمیٹا اور اپنی نظریں اُوپر اُٹھائیں جہاں درختوں نے شاخوں کا جال کنوئیں پر پھیلا دیا تھا۔ معاً میرے دماغ میں ایک قابلِ عمل تجویز اس سرعت سے چمکی کہ میرا دل خوشی سے جھوم اُٹھا۔ یہ کام

آخر جب بہت جانکاہ اور وقت طلب تھا مگر میں اپنے اندر آہنی عزم لیے اُٹھا اور کنویں کی چکنائی ہوئی دیواروں کے ساتھ گھومتا ہوا مُردہ گھوڑے تک پہنچ گیا۔ میں نے مُردہ گھوڑے سے کاٹھی کھول کر الگ کر لی اور ایک رسّہ نکال کر اُس کے سرے پر پھندا ڈال کر اپنے بازوؤں کا زور لگاتے ہوئے اُوپر اُچھال دیا۔ کئی تھکا دینے والی کوششوں کے بعد بالآخر پھندا ایک مضبوط شاخ کو اپنی لپیٹ میں لینے میں کامیاب ہو گیا۔ میں نے پھندے کو جھٹکا مار کر اندازہ کر لیا کہ وہ مضبوطی سے جم گیا اور درخت کی شاخ میرے بھاری بھرکم وجود کا بوجھ برداشت کر سکتی ہے۔ تب میں نے اس کے نچلے سرے پر گھوڑے سے اُتارا ہُوا سامان باندھا اور رسّی کا سہارا لے کر باہر آنے میں کامیاب ہو گیا۔ میں نے کنویں میں لٹکتی ہوئی رسّی کو اُوپر کھینچا اور سامان سے ٹارچ تلاش کر کے اپنی رائفل تلاش کرنے لگا جو ایک گھنے درخت کی جڑوں میں اُلجھی ہوئی تھی۔ ابھی رائفل تھام کر ٹارچ سے اس کا جائزہ لے رہا تھا کہ ایک سنسناتی ہوئی گولی میرے کندھے کو چھوتی گزر گئی۔ میں نے فوراً ٹارچ بجھا دی اور بھاگ کر ایک درخت کی آڑ میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ پھر اسی سمت فائر جھونک دیا جدھر سے رائفل کا شعلہ میری جانب لپکا تھا۔ دشمن کافی ہوشیار تھا۔ گولی بیکار گئی اور پھر اُس نے غصّے میں آ کر یکے بعد دیگرے دو فائر کیے جو اس تنے میں آ کر لگے جس کے عقب میں، میں اپنی رائفل تانے کھڑا تھا۔ ان تابڑ توڑ حملوں نے دشمن کی نشان دہی کر دی۔ میں نے تنے کی آڑ سے نکل کر اُس شاخ کو نشانہ بنایا جہاں وہ چھپ کر میری طرف فائرنگ کر رہا تھا۔ گولی کارگر رہی۔ کسی کے کراہنے کی آواز سنائی دی جیسے کوئی دم توڑ رہا ہو پھر ماحول پر مکمل خاموشی چھا گئی۔

"میں نے اپنے ایک دشمن کو خاموش کرنے کے بعد ابھی اطمینان کی سانس بھی نہیں لی تھی کہ ایک اور حملہ آور نے میری رائفل کو نشانہ بنا دیا۔ گولی دھماکے کے ساتھ میری رائفل کی نال سے ٹکرائی اور بندوق اپنے پیچھے چند چنگاریاں چھوڑتی ہوئی میرے ہاتھ سے نکل گئی۔

"تب میں نے شدید غصّے کی حالت میں اپنے دونوں ریوالور نکال لیے اور اندھادُھند فائرنگ شروع کر دی۔ ایک دلدوز چیخ اُبھری اور کسی کے نیچے گرنے کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ مجھے یُوں لگا جیسے زمین ایک اور دشمن سے پاک ہو گئی ہو۔ میرے ریوالور سے نکلنے والے شعلوں نے میرے ایک اور دشمن کو زمین بوس کر دیا۔۔۔ پھر چاروں طرف خاموشی مسلط ہو گئی۔ اگر کوئی رینگنے والا کیڑا بھی اپنی جگہ سے حرکت کرتا تو خزاں رسیدہ خشک پتّوں کی وجہ سے اس کی سرسراہٹ صاف سنائی دیتی۔ میں نے ٹارچ کی مدھم روشنی میں اپنے مُردہ دشمن کی رائفل تلاش کی اور گولیوں کی پیٹی اُتار کر جنگل عبور کر کے آبشار کے قریب کھلے راستے پر آنے میں کامیاب ہو گیا۔

"مگر یہاں بھی کچھ لوگ میرے منتظر تھے جنھوں نے مجھ پر اپنی رائفلوں کے دہانے کھول دیے تو میں نے اس سے پہلے ہی ندی کے گہرے پانیوں میں چھلانگ لگا دی۔

"کنارے پر پہنچ کر مجھے رائفل حاصل کرنے میں کامیابی ہوئی اور میں نے مع اپنے سامان کے دوبارہ ہتھیاروں پر قبضہ کر لیا۔ یہاں پہنچ کر دوبارہ معرکہ آرائی ہوئی۔ دونوں طرف سے بندوقیں شعلے اُگلتی رہیں اور فضا میں چاروں طرف بارود کی بُو پھیل گئی۔ دشمن کے چار ساتھیوں کو گولیوں کا نشانہ بنا کر، بقیہ لوگوں پر اپنی برتری کی دھاک بٹھاتا ہوا میں اطراف کا بغور جائزہ لینے لگا۔ اس طرح دشمن اپنے چھ آدمی گنوا کر پسپا ہونے پر مجبور ہوا اور میں آگے بڑھ گیا۔"

خان بابا اپنی رُوداد سُنا چکا تو مجھے شنکر ناتھ کے وہ الفاظ یاد آئے جو اُس نے اپنے ملاقاتیوں کو رخصت کرتے ہوئے کہے تھے کہ ایک سفید بالوں والا بھیڑیا جانے کہاں سے آ گیا ہے۔ وہ اب تک چھ جوانوں کو گولیوں کا نشانہ بنا چکا ہے۔ جب تک وہ زندہ ہے معلوم نہیں اور کتنے لوگ اُس کا نشانہ بنیں گے۔ خان بابا کی داستان سُن کر یہ احساس خود بخود اُجاگر ہو رہا تھا کہ ہم دونوں باپ بیٹے خاص طور پر منصوری قبیلے کی توجہ کا مرکز بن چکے ہیں اور وہ لوگ ہر قیمت پر ہماری زندگیوں کا سُورج غروب کر دینے پر تُلے ہوئے ہیں۔

میرا زخمی بدن بے حد تکلیف دے رہا تھا۔ میں تھکن سے بے حال ہو کر پتھریلے فرش پر دراز ہو گیا اور آنکھیں موند کر اپنے اُن جیالے ساتھیوں کے بارے میں سوچنے لگا جو ہم سے بچھڑ کر تن تنہا منصوری قبیلے کی متحدہ قوت سے برسرِ پیکار تھے اور اردگرد موت کی بھیانک آہٹوں کے باوجود بڑی بے جگری سے اپنے مؤقف پر ڈٹے ہوئے تھے۔ مجھے پھر بوڑھا شنکر ناتھ یاد آ گیا تو میں نے تمام خیالات کو پس پشت ڈالتے ہوئے اپنے بابا سے مخاطب ہو کر کہا۔ "بابا جان! کیا تم شنکر ناتھ نامی کسی سادھو کو جانتے ہو؟ وہ یہاں سے کچھ فاصلے پر ایک گھاس پھونس کی کُٹیا میں رہتا ہے اور اس کے خورد و نوش کی تمام ذمّے داری بگولا سنگھ نے اپنے ساتھیوں کو سونپ رکھی ہے۔ وہ یہ بھی دعوا رکھتا ہے کہ گزشتہ چالیس برس سے اس خوفناک جنگل کا باسی ہے اور بگولا سنگھ سمیت تمام لوگ اس کا احترام کرتے ہیں۔ میرے خیال میں اب وقت آ گیا ہے کہ ہم منصوبے میں چند تبدیلیاں کر لیں جو ہمارے لیے بے حد مفید ثابت ہو سکتی ہیں۔"

خان بابا نے مُڑ کر میری طرف دیکھا اور الاؤ میں لکڑی کے ٹکڑے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوئے شعلوں کو کریدتے ہوئے کہا۔ "جب تک ہمارے وفادار ساتھی یہ خوفناک جنگل پار کر کے آبشار کے قریب آ کر کسی محفوظ جگہ پڑاؤ نہیں ڈالتے اس وقت تک کسی منصوبے پر عمل کرنا ممکن نہیں۔ اب تم چند گھڑیاں آرام کر لو اور میں آبشار کے کنارے کسی ٹیلے کی اوٹ لیتے ہوئے راستے کی نگرانی کرتا ہوں۔ ہمیں اسی جگہ اپنے ساتھیوں کا انتظار کرنا ہو گا ورنہ۔"

اچانک رائفل کے خوفناک دھماکوں کی آوازیں سُن کر خان بابا نے اپنا جُملہ ادھورا ہی چھوڑ دیا اور رائفل تھام کر غار کے دہانے کی طرف دوڑتا چلا گیا۔ متعدد رائفلوں کی حشر خیز گونج سے میرے ذہن میں میدانِ جنگ کا نقشہ ایک بار پھر گھوم گیا۔ یہ آوازیں سُن کر فطری طور پر میری اُنگلیاں حرکت کرتی ہوئی اپنے ہتھیاروں کی جانب بڑھنے لگی تھیں۔ میں میدانِ جنگ کا کھلاڑی تھا اس لیے اس غار کے گھٹن آلود ماحول میں میری طبیعت کو کیسے سکون مل سکتا تھا۔ میری متلاشی نظریں خان بابا کے سامان کا جائزہ لینے لگیں مگر ایک شکاری چاقو کے علاوہ کوئی ہتھیار میسّر نہ آ سکا۔ تب مجھے خیال آیا کہ اگر میں تھوڑی سی ہمّت کروں اور اُسی جگہ پر پہنچ جاؤں جہاں مجھے تشدّد کا نشانہ بنایا گیا تھا تو وہاں لاشوں سے پٹا ہُوا میدان میرے لیے ہتھیاروں کی کمی آسانی سے پُوری کر سکتا ہے۔ میں غار کے دہانے سے نکل کر جھاڑیوں کی اوٹ میں چلتا ہُوا آبشار کے کنارے آ گیا جہاں سے وہ جگہ کچھ ہی فاصلے پر تھی جہاں مُردہ دشمن کے چھوڑے ہُوئے ہتھیار ملنے کی توقع تھی۔ دریں اثنا فائرنگ مسلسل ہوتی رہی۔ لگتا تھا دو متحارب گروہ آپس میں برسرِ پیکار ہیں اور جس انداز میں دونوں جانب سے گولیوں کا تبادلہ ہو رہا تھا اُس سے تو معلوم ہوتا تھا کہ جنگ کا اختتام بہت قریب ہے۔

آبشار سے اس میدان تک پہنچنے میں کچھ وقت لگا اور پھر بہادر خاں کی جلی ہُوئی لاش کے قریب مجھے چنگلو خاں کی لاش بھی مل گئی جس کے گلے میں گولیوں سے بھری چمڑے کی ایک پیٹی موجود تھی اور رائفل بھی شعلوں کی زد سے محفوظ تھی۔

میری محنت رائیگاں نہیں گئی۔ گولیوں کی پیٹی میں نے اپنے کندھے پر لٹکائی اور رائفل دوبارہ بھرنے کے بعد جب میں اپنے مرکز کی طرف بڑھا تو اس رائفل کی وجہ سے میرے حوصلے بڑھ گئے تھے۔ ہتھیار سنبھالتے ہُوئے میں آبشار کے پاس ایک ٹیلے کی اوٹ میں رُک گیا اور اس سمت نگاہ گاڑ دی جدھر سے خوفناک دھماکے مسلسل ہو رہے تھے۔

چند لمحے گہری توجہ سے ان آوازوں کو سُنتا رہا پھر میں ٹیلے کی اوٹ سے نکل کر محتاط قدم اُٹھاتا ہُوا آگے بڑھا اور ایک ایسی جگہ آ گیا جہاں ڈھلان میں دو گروہوں کے درمیان گولیوں کا تبادلہ ہو رہا تھا۔ ڈھلان پر اُترتے ہُوئے رائفلوں کے شعلے فضا میں رقص کرتے دُور ہی سے نظر آ رہے تھے مگر ابھی اُس ہولناک منظر کے سامنے ایک بڑا سا پتھر حائل تھا۔ جُونہی میرے قدم ٹیلے کو عبور کر کے ڈھلان کی طرف بڑھے آنکھوں کے سامنے ایک تباہ حال قافلے کا منظر آ گیا۔

قافلے کی دو گاڑیوں کو آگ لگی ہوئی تھی اور جلتی گاڑیوں کے آس پاس بکھری ہوئی لاشیں دیکھ کر کچھ دیر تک تو میں سکتے کے عالم میں منجمد سا کھڑا ہو گیا۔ میرے پاؤں یک لخت زمین سے چپک گئے اور میں سامنے پھیلی انسانیت سوز تباہی دیکھ کر دل مسوس کر رہ گیا۔ نہ جانے کتنی ساعتیں اسی عالم میں گزر گئیں اور میں اس قافلے کے بچے کھچے آثار دیکھتا رہا۔ جہاں تباہیاں اپنے دامن میں انگارے بھر کر چاروں طرف رقص کر رہی تھیں جن پر انسانیت لاش بن کر ابدی نیند سو رہی تھی۔ ایسی نیند جس سے اُسے تاحشر کوئی بیدار کرنے والا نہیں آئے گا۔

ابھی میں اس قافلے کی خستہ حالی اور تباہی پر غور ہی کر رہا تھا کہ اچانک دُور ایک رائفل گرج اُٹھی پھر بجلی کی تیزی کے ساتھ ایک شعلہ اپنی جانب آتا دکھائی دیا۔ شعلہ دیکھتے ہی مجھے ہوش آ گیا اور میں پھرتی سے وہیں دُبک گیا۔

میں بال بال بچ گیا تھا۔ گولی میرے شانے سے مَس ہوتے ہُوئے ایک پتھر میں جا لگی اور چنگاریاں سی منتشر ہو گئیں مگر میں قطعی محفوظ رہا۔ اب میں ایک بڑے سے پتھر کی اوٹ میں بیٹھ چکا تھا۔ اور رائفل سیدھی کر کے نشیب کا جائزہ لینے لگا۔ اچانک پھر کسی رائفل کا دِل ہلا دینے والا دھماکا ہُوا اور گولی بائیں جانب کافی فاصلے سے سنسناتی ہُوئی نکل گئی۔

دھوپ میں چمکتی ہُوئی رائفل کی ایک نال پر نظر پڑتے ہی میں نے دو فائر کیے اور رائفل کی چمک غائب ہو گئی۔ غالباً میرا نشانہ ٹھیک ہی بیٹھا تھا مگر اب مجھ پر مسلسل گولیاں برسنے لگی تھیں۔ دشمن میری طرف شعلے برساتا رہا لیکن میں نے اُنھیں تین طرف سے یُوں اُلجھائے رکھا جیسے میں تنہا نہیں ہُوں بلکہ میرے ساتھ چند ساتھی بھی موجود ہیں۔

میں باری باری ، تینوں طرف فائرنگ کرتا رہا۔ پتھر کی اوٹ میں ہونے کی وجہ سے میں حملہ آوروں کی زد سے باہر تھا۔ بالآخر وہ حملہ آور میری گردش کرتی ہُوئی نظروں سے محفوظ نہ رہ سکے جو ایک پتھر کی اوٹ میں بیٹھے مجھ پر موت کا دہانہ کھولے ہُوئے تھے۔ میں نے رائفل کا گھوڑا دبا دیا۔ رائفل گرجتے ہی اُن کے سر پتھروں میں منتشر ہو گئے اور اُن کے بھاری بھرکم وجود ڈھلان میں دُور تک لڑھک کر

جھاڑیوں میں اُلجھ گئے۔

اپنے دو دشمنوں کو بیک وقت موت کی تاریک سرزمین کی طرف روانہ کرتے ہوئے مجھے دلی مسرت ہوئی تھی۔ حملہ آور کے دو ساتھی گرتے ہی اُن کی فائرنگ میں شدت آگئی مگر میں بلندی پر ہونے کی وجہ سے اُن کی شدید اور پیہم حملوں کی زد میں نہیں آرہا تھا۔ معاً ایک پتھر کی اوٹ میں مجھے کسی کے پاؤں رینگتے ہوئے نظر آگئے۔ غالباً کوئی ایک چپے دار گھاٹی کو عبور کرکے عقب سے مجھے نشانہ بنانا چاہتا تھا۔ میں نے اُس کی ٹانگوں کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ رائفل گرجتے ہی اس کا وجود فضا میں اُچھل کر نوکیلے پتھروں کے درمیان لڑھکتا ہوا ایک ٹیلے پر پہنچ کر ساکت ہو گیا۔ مجھے یقین تھا کہ اس قدر بلندی سے لڑھکنے کے بعد اس کی لاش ناقابلِ شناخت ہو چکی ہوگی۔ اچانک مجھے اپنے عقب میں ہلکی سی آہٹ سنائی دی۔ میں ایک دم پلٹ کر زمین سے چپک گیا اور رائفل کا رُخ اس طرف کر دیا جہاں آہٹ کا گمان ہوا تھا۔ مگر خان بابا کی سفید داڑھی دیکھ کر میری رائفل خود بخود جھک گئی۔

میں پلٹ کر دوبارہ نشیب میں دیکھنے لگا جہاں متعدد دشمن ہنوز موجود تھے مگر اس وقت معاً کوئی میرے بوڑھے باپ کو دیکھ کر اپنی رائفل داغ چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ دشمن اپنے ناپاک عزائم میں کامیاب ہو جاتا، خان بابا نے پھرتی سے خود کو ایک جانب گرا دیا اور ایک پتھر کی اوٹ میں ہو گیا۔ یہ پھرتی ہی کام آئی تھی ورنہ گولی انہیں نقصان پہنچا سکتی تھی۔ اس نے سنبھلتے ہی گولی چلا کر اپنے حملہ آور کا حساب چکا دیا۔ میں ایک ساعت تو اپنے باپ کو فخریہ نگاہ سے دیکھتا رہا پھر ان لٹیروں کی طرف متوجہ ہو گیا جن کی موجودگی سے ہم اپنے مقصد کے حصول میں بڑی دقت محسوس کر رہے تھے۔ یہ وہی لٹیرے تھے جن کے ہاتھوں ایک قافلہ تباہی کے دہانے پر پہنچ کر تہس نہس ہو چکا تھا۔ اپنے بابا کی دلیری کو خراجِ تحسین پیش کرنے کا وقت نہیں تھا لیکن یہ ایک لمحہ میرے لیے یادگار حیثیت اختیار کر گیا۔

شاہیار خان نے یکے بعد دیگرے پانچ لٹیروں کو کیفرِ کردار تک پہنچا دیا۔ اپنے پانچ آدمی گنوا کر مدمقابل دشمن پر اچانک خاموشی چھا گئی اور ہر طرف موت کا سا سکوت محسوس ہونے لگا۔

یہ بوجھل خاموشی دیر تک طاری رہی اور محاذ حریف پر موت کا سا سناٹا منڈلاتا رہا۔ میں نے آہستہ آہستہ اپنا سر اُٹھایا اور ان جلی ہوئی خاک آلود گاڑیوں پر نگاہ دوڑائی جن میں جُتے ہوئے گھوڑے آگ کی لپیٹ میں آ کر زندگیوں سے محروم ہو گئے تھے اور ان کی لاشوں سے تعفن اور چراند اُٹھ اُٹھ کر فضا کو مسموم کر رہی تھی کہیں کہیں گاڑیوں کے چوبی تختوں سے کثیف دھواں بھی بل کھاتا ہوا اُٹھ رہا تھا جیسے وہ دست بدعا ہو کر ربِ کائنات سے اس ظلم و بربریت کے خلاف دروازۂ رحمت کھٹکھٹانے جا رہا ہو۔ اس پر مستزاد یہ کہ چاروں طرف بکھری ہوئی انسانی لاشیں دیکھ کر گدھ بھی منڈلانے لگے تھے تاکہ ان کا گوشت نوچ نوچ کر اپنے پیٹ کی آگ بجھا سکیں لیکن مجھے اس بات پر حیرت تھی کہ ان سفاکوں کو آخر بے گناہ لوگوں کو مار کر کیا حاصل ہوا۔

"شہباز بیٹے! ابھی چند لمحے رُک جاؤ مجھے یہ سناٹا غیر فطری محسوس ہو رہا ہے۔ ممکن ہے دشمن اس بات کا انتظار کر رہا ہو کہ ہم فاتحانہ شان سے آگے بڑھیں تو اُن کی گولیوں کا شکار ہو جائیں۔"

میں نے ایک نظر اپنے باپ کے سنجیدہ چہرے پر ڈالی اور دوبارہ پتھر کی اوٹ میں بیٹھ کر موت کا بے آواز حزنیہ گیت گاتی ہوئی خاموشی کا حصہ بن گیا۔

چاروں طرف موت کی سی خاموشی مسلط تھی کہ اچانک ایک کرب ناک چیخ اُبھر کر سکوت کو توڑ گئی۔ یوں لگا جیسے زندگی کے بچے کھچے آثار اب بھی اپنی کم مائیگی اور خستگی پر مرثیہ خواں ہیں... پھر وقفے وقفے سے کسی کے کراہنے کی آوازیں میرے دل کی گہرائیوں میں وحشت چلی گئیں۔ ایک لمحے کے لیے تو میں تڑپ کر ہی رہ گیا تھا۔

آوازیں قدرے مدھم تھیں لیکن نسوانیت عیاں ہو کر حقیقتِ حال کا اظہار کر رہی تھی جب مجھے یقین ہو گیا کہ یہ کسی زخمی عورت ہی کی آوازیں ہیں تو میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ میں بے چین ہو کر پتھر کی اوٹ سے نکلا اور چٹانوں کے درمیان چلتا ہوا قد آور جھاڑیوں کے ایک جھنڈ کے قریب رُک گیا اور محتاط نظروں سے اس زخمی عورت کو تلاش کرنے لگا۔

نسوانی کراہ اچانک ہی پھر اُبھری جیسے اس عورت نے موت کی آخری ہچکی لی ہو۔ اگرچہ میرے جسم پر اس وقت مکمل لباس نہیں تھا جو میرے وجود کو ان جھاڑیوں کے سوئیوں جیسے کانٹوں سے محفوظ رکھتا مگر ایک مرتی ہوئی بے بس عورت کا احساس اتنا شدید تھا کہ میں ہر دُکھ سے بے نیاز ہو کر جھاڑیوں میں گھس گیا اور پھر چند قدم کے فاصلے پر ایک منظر دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

ایک ادھیڑ عمر کی عورت اپنے مُردہ بچے کو تھامے زندگی کی آخری حد عبور کر چکی تھی۔ رائفل کی گولی نے اس کے پیٹ میں ایک کشادہ شگاف ڈال دیا تھا جس سے خون بہہ بہہ کر چٹانی زمین پر جم چکا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں شیر خوار بچے کی لاش دبی ہوئی تھی جس کی ننھی سی پیشانی میں بھی ایک بڑا سوراخ نظر آ رہا تھا۔ یہ انسانیت سوز

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

منظر دیکھ کر میری آنکھوں میں خون اُتر آیا اور میں دل و دماغ میں اُٹھتی ہوئی نفرت اور انتقام کی آندھیوں سے بے تاب ہو گیا۔

"ہمیں وادی میں اُتر کر تلاش کا کام جاری رکھنا چاہیے۔" پیچھے عقب سے خان بابا کی گرج دار آواز سنائی دی۔ "ہو سکتا ہے قافلے کا کوئی زندہ فرد مل جائے اور پتہ چل جائے کہ یہ لوگ کون تھے۔"

خان بابا کا اشارہ پا کر میں جھاڑیوں سے نکل کر ڈھلان سے اُترنے لگا۔ شاہیار خان میرے ساتھ چل رہا تھا۔

ڈھلان میں اُتر کر ہم دھواں اُڑاتی ہوئی گاڑیوں کے قریب پہنچ کر رُک گئے اور بے گور و کفن لاشوں کے چہرے اُلٹ پلٹ کر اُنہیں پہچاننے کی کوشش کرنے لگے... مگر ہر چہرہ ہمارے لیے اجنبی تھا۔

آس پاس کا سارا علاقہ چھان مارا مگر کہیں بھی زندہ انسان کی موجودگی کے آثار نہیں ملے۔

"خان بابا! اگر ہم کوشش کریں تو اُن کے گھوڑے ضرور تلاش کر سکتے ہیں۔" میں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے اظہارِ خیال کیا۔

"تمہارا خیال درست ہے، شہباز۔" خان بابا کی خون چھلکاتی آنکھیں میرے چہرے پر جم گئیں۔ "مگر گھوڑے بدک کر نہ جانے کس طرف نکل گئے ہوں۔ ہم گھوڑوں کی خاطر اپنی جانیں داؤ پر نہیں لگا سکتے۔ حالات سے مجھے یقین ہوتا جا رہا ہے کہ منصوری قبائل کے افراد بدحواس ہو کر بھاگنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ ویسے بھی ہم نے انہیں اس قدر نقصان پہنچایا ہے جس کی تلافی وہ صرف فاتحہ خوانی ہی سے کر سکتے ہیں۔ ہم نے اُن افراد کو چن چن کر ہلاک کیا ہے جو کسی قبیلے کی ریڑھ کی ہڈی کہلاتے ہیں جب ستون ہی منہدم ہو جائے تو عمارت کیسے قائم رہ سکتی ہے۔ بہرحال میں نہیں چاہتا کہ کوئی نیا خطرہ پال کر اصل معاملے کو پھر ادھورا چھوڑ دیں۔ تم چونکہ کافی تھک چکے ہو اس لیے آرام ضرور کر لو۔"

"میرے اعصاب بہت مضبوط ہیں بابا۔ آخر ہوں کس عظیم باپ کا بیٹا۔" میں نے فخر سے سینہ پھُلاتے ہوئے جواب دیا۔

"ابھی میرا طاقتور جسم ایسی بے شمار اذیتیں برداشت کرنے کی سکت رکھتا ہے مگر میں اس بات سے اتفاق کرتا ہوں کہ ایک تھکا ہوا جسم اس پھرتی کا مظاہرہ کرنے کے قابل نہیں جس کی ایک تازہ دم انسان سے توقع کی جا سکتی ہے۔" میں نے مزید کہا۔

خان بابا نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا اور ایک مُردہ لٹیرے کے گلے سے کارتوسوں کی پیٹی اُتار کر اپنے کندھوں پر لٹکا لی۔ ہم اپنے عارضی مستقر کی طرف چل دیے۔

بابا نے خشک شاخیں جمع کر کے الاؤ میں ڈال دیں تاکہ الاؤ کے شعلے مدھم پڑ کے بجھ نہ جائیں۔ آگ بھڑک کر جب تیز شعلے اُگلنے لگی تو میں غار سے باہر آ گیا اور اپنا خون آلود لباس صاف کرنے لگا۔ دھبے پوری طرح تو صاف نہیں ہو سکے تاہم شلوار اور قمیص اس قابل ضرور ہو گئیں کہ انہیں استعمال کیا جا سکتا تھا۔

میں اس ندی میں اُتر گیا جو آبشار سے کچھ فاصلے پر قدرتی انداز میں بنی ہوئی تھی... لیکن مجھے زیادہ پُرسکون ٹھنڈے پانی سے لطف اندوز ہونے کا موقع نہیں مل سکا کیونکہ میں نے جیسے ہی ڈبکی لگا کر سر اُبھارا متعدد گھوڑوں کی ٹاپیں میری سماعت سے ٹکرانے لگی تھیں۔

میں کنارے پر پہنچا اور جلدی جلدی سوتی چادر اپنے گرد لپیٹ کر رائفل تھام لی... پھر میں نے مستعدی سے اپنا گیلا لباس بھی سمیٹ لیا تاکہ میری موجودگی کا کوئی نشان باقی نہ رہ جائے۔

گھوڑوں کی محتاط انداز میں پڑتی ہوئی ٹاپیں برابر میرے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ ہر ساعت میرے کان اُن آہٹوں پر لگے ہوئے تھے اور آنکھیں ندی کے اس کنارے پر مرکوز تھیں جدھر سے اُن کی آمد متوقع تھی۔

معاً کچھ گھوڑے بے ہنگم آوازوں میں ہنہنا اُٹھے اور دو گھڑسوار ایک گھاٹی پر نمودار ہو کر ندی کی طرف جھانکنے لگا۔

میں نے ایک دم رائفل سیدھی کی اور پتھر کی اوٹ میں ہو کر اُن کی حرکات و سکنات کا جائزہ لینے لگا۔ میں نے اُن سواروں کو پہچاننے کی کوشش کی مگر فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکا۔

اچانک اُن کے عقب میں ایک اور سوار نمودار ہوا تو اُس کی لہراتی ہوئی سفید داڑھی دیکھ کر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

یہ بوڑھا شاکر خان تھا۔

میں ہوائی فائر کرتا ہوا اپنے مورچے سے نکل کر سامنے آ گیا۔ اور رائفل فضا میں لہراتے ہوئے اپنی موجودگی ظاہر کرنے لگا۔

فائر کی آواز گونجتے ہی مجھے اپنے عقب میں دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔

"خان بابا! ہمارے ساتھی آ گئے!" میں نے ایک فلک شگاف نعرہ لگاتے ہوئے کہا۔

میرے تمام ساتھی غار تک جلد ہی پہنچ گئے۔

کافی دیر تک ہم سے جُدا رہ کر اُن لوگوں کی عجیب حالت ہو رہی تھی۔ سبھی ایک دوسرے کو اپنے جذبات اور اپنی معلومات سے آگاہ کرنے لگے گویا خوشیوں کا چاند ایک بار پھر اپنی تمام تر رعنائیاں بکھیرتا ہوا، ہمارے من آنگن میں اپنی حسین چاندنی نچھاور کرنے لگا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کھانے کے بعد جب قہوے کا دور چلا تو ذہنوں کو کریدتے ہوئے متعدد سوالات نوکِ زبان پر آ گئے اور باتوں کا لامتناہی سلسلہ چل نکلا۔ ان کی سرگزشت بہت مختصر لیکن لرزہ خیز تھی وہ تاریک اور گھنے جنگل سے گزرتے ہوئے آبشار کی طرف آنے والے راستے سے بھٹک گئے تھے۔ ایک جگہ دشمن سے خونریز تصادم بھی ہوا لیکن ان کے حوصلوں کے سامنے دشمن پسپا ہو گئے اور کئی لاشیں چھوڑ کر فرار ہو گئے... پھر جب میں نے اپنی رُوداد سُنائی تو وہ سبھی یوں خاموش ہو کر سُننے لگے جیسے میں ان کی کوئی پسندیدہ کہانی سُنا رہا ہوں۔

حیدر خان نے میرے زخموں پر مرہم کا لیپ کیا تو مجھے کافی سکون ملا۔

"محراب خان اپنے جیالوں کو مشورہ دو کہ وہ کچھ دیر آرام کر لیں۔ آج کی رات ہم اسی جگہ گزار کر کل کوئی اقدام کریں گے... مگر اس دوران دو آدمی غار کے دہانے پر پہرہ دے اور راستے پر نظر رکھیں۔ زخمی دشمن پینترہ بدل کر واپس بھی آ سکتا ہے۔"

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔

محراب خان اور اس کے ساتھیوں کو سلامت پا کر میرے دل سے بہت بڑا بوجھ ہٹ گیا۔ ایک طویل اور تھکا دینے والی جدوجہد کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ میرے سرفروش ساتھی موت کو شکست دینے میں کامیاب و کامران ہو کر مجھ سے دوبارہ آ ملے تھے۔

میں گہری نیند میں تھا کہ اچانک کسی کے بھاری ہاتھوں نے مجھے زور سے جھنجھوڑ کر بیدار کر دیا۔ آنکھیں کھول کر دیکھا تو خان بابا میرے قریب کھڑا تھا۔ میں نے آنکھیں ملتے ہوئے ماحول کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ سارے ساتھی بیدار ہو چکے ہیں۔

کھانے سے فارغ ہوتے ہی میں نے ساتھیوں کو تیار رہنے کا حکم دیا اور غار سے نکل کر ندی کے کنارے آ گیا۔

صبح کا دودھیا اُجالا آہستہ آہستہ زمین پر قبضہ جما رہا تھا۔ سارا علاقہ سحر زدہ سا نظر آنے لگا۔ ہر طرف خاموشی درختوں کے درمیان چاروں طرف پھیلی ہوئی ہلکی ہلکی روشنی اتنی پُراسرار رنگ کی تھی جیسے ہم کسی طلسمی ماحول میں پہنچ گئے ہوں۔ تیزی سے سرکتے ہوئے انجان لمحے اپنا اثر دکھانے لگے تو یوں لگا جیسے دل میں کامرانی اور کامیابی کا احساس خود بخود ہی کروٹیں لینے لگا ہو... اور میرا وجود جھکولے کھاتا ہوا پستیوں سے بلندی کی طرف پرواز کرنے لگا ہو...

سرحدوں کے دائرے پھیلتے رہے مگر حالات کی سختیوں کو سامنے رکھتے ہوئے نئی ابھی منصوبہ قابلِ عمل نظر آ رہا تھا۔

جس کے تحت ہم آبشار تک آ گئے تھے اس سلسلے میں خان بابا کا تجربہ کارآمد ثابت ہو سکتا تھا۔ میں غار کی طرف جانے کے ارادے سے پلٹ رہا تھا کہ محراب خان مسکراتا ہوا سامنے آ گیا۔

"شہباز خان!" وہ دور ہی سے بلند آواز میں بولا۔ "سب لوگ اس انتظار میں ہیں کہ تم کب تک پڑاؤ اُٹھانے کا فیصلہ کرتے ہو۔ چند روز کی رفاقت میں تم نے اپنی بہترین صلاحیتوں کو استعمال کر کے سب پر یہ واضح کر دیا ہے کہ تمہارے فیصلے نہایت مفید اور کارآمد ہوتے ہیں۔"

یہ ستائشی کلمات سُن کر میرے دل میں کسی جذبے نے سر نہیں اُبھارا۔ بس ایک ناگوار سا سکوت دیر تک مجھے جکڑے رہا۔

"میں اپنے محترم باپ کی موجودگی میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔ یہ فیصلہ صرف خان بابا ہی کریں گے کہ ہمارا اگلا قدم کیا ہو گا۔" میں نے جواب دیا اور محراب خان کے ساتھ غار میں داخل ہو گیا۔

غار کے دہانے سے گزرتے ہوئے مجھے اپنے ساتھیوں کی تنقیدی نگاہوں کا نشانہ بننا پڑا۔ اُن کی گھورتی ہوئی خاموش نظریں میرے احساس پر گراں بار پڑا پنے تیکھے نقوش چھوڑنے لگیں... مگر میں نے چہرے سے دلی کیفیات کا اظہار نہیں ہونے دیا اور خان بابا کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"خان بابا! شنکر ناتھ نامی سادھو ہمارے لیے ایک کارآمد مہرہ ثابت ہو سکتا ہے۔" میں نے ایک نئی تجویز پیش کرتے ہوئے کہا۔ "اگر ہم اس کی نگرانی کریں اور اُن لوگوں پر نظر رکھیں جو اس کے لیے کھانے پینے کی اشیا لاتے ہیں اور غالباً بگولا سنگھ کے پُرانے دوست ہیں تو وہ لوگ ہمارے لیے مفید معلومات کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔ اُنھیں گرفتار کر کے بگولا سنگھ کا ٹھکانا معلوم کیا جا سکتا ہے اس میں ہمارا کچھ وقت ضرور صرف ہو گا مگر یہ چند گھنٹوں کی تاخیر ہمیں بہت سی اُلجھنوں سے محفوظ رکھ سکتی ہے۔"

"تمھاری یہ تجویز بظاہر مفید اور قابلِ عمل ہے لیکن میرے نزدیک اس میں ذرا سا سقم یہ ہے کہ بگولا سنگھ اور اس کے گرگے ہماری اس کارروائی سے پہلے ہی چوکس اور منظم ہو جائیں گے اور انھیں ہمارے خلاف قدم اُٹھانے کا موقع مل جائے گا۔ ہم اُن پر اچانک ہی ٹوٹ پڑنا چاہتے ہیں تاکہ اُنھیں سنبھلنے کا تھوڑا سا بھی موقع نہ مل سکے۔ ہمارا دشمن چند اجنبی لوگوں کی آمد سے آگاہ تو ہو سکتا ہے مگر ہمارے قافلے کی قوت ابھی اس کی نظروں سے مخفی ہو گی اس کی بنا پر اقفیت ہی ہمارے لیے نیک فال ثابت ہو سکتی ہے ابھی تک ہم دو افراد ہی کھل کر سامنے آئے ہیں اب یکایک ہماری تعداد میں

اضافہ اُنھیں چونکنے پر مجبور کر دے گا۔" خان بابا نے وضاحت کی۔

"ٹھیک ہے بابا! میں اپنی تجویز واپس لیتا ہوں مگر ایک تبدیلی ضرور ہو گی۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "محراب خان کو اپنے ساتھیوں کی قوت ہمارے تین اطراف میں پھیلا کر چلنا ہو گا۔ تعاقب اس قدر ہوشیاری اور مستعدی سے ہونا چاہیے کہ جب رائفل دو مرتبہ گرجے تو انھیں سمجھ لینا چاہیے مداخلت کا وقت آ پہنچا ہے ورنہ احتیاط اور خاموشی سے تعاقب جاری رکھیں۔"

"دو گھوڑے تم دونوں کے لیے مخصوص کر دیے گئے ہیں اور ان کی خرجیوں کو ہر طرح کے سامان سے لیس کر دیا گیا ہے۔" محراب خان نے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور خان بابا کو اُٹھنے کا اشارہ کیا روانہ ہوتے ہوئے میں اپنا خنجر ساتھ لینا نہیں بھولا جسے میں نے اپنی پنڈلی سے باندھ کر چھپا لیا تھا۔

بلاشبہ یار خان انگڑائی لیتا ہوا اُٹھا اور تن کر کھڑا ہو گیا۔

تازہ دم گھوڑے غار کے دہانے پر موجود تھے جن پر سوار ہو کر... ہم آگے بڑھنے والی عام گزرگاہ کو نظرانداز کرتے ہوئے ایک بلند و بالا گھاٹی کو عبور کرنے کے بعد ایک ایسے نشیب میں آ گئے جس کے چاروں طرف پتھروں کے درمیان خودرو پودوں کی بہتات تھی۔ جیسے قدرت نے بھورے لباس پر سُرخ و سبز پیوند لگا کر رفوگری کی ہو۔

دفعتاً ایک سیاہ ناگ پہاڑی پگڈنڈی کی طرح بل کھاتا ہوا گھوڑے کے سامنے سے گزرا تو گھوڑا رُک جانے پر مجبور ہو گیا... لیکن سانپ پیچ و خم کھاتا ہوا... گزر گیا۔ میں نے گھوڑا آگے بڑھایا ہم ایک ایسے علاقے میں پہنچ گئے جہاں درخت اپنے سروں پر سبز پتوں کے چھاتے سجائے دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ خان بابا جو مجھ سے آگے چل رہا تھا مجھے اپنے عقب میں آنے کا اشارہ کر کے جنگل میں مسلسل آگے کی طرف بڑھتا رہا۔ گھوڑے نہایت تیک اور محتاط انداز میں ٹاپیں مارتے ہوئے رفتہ رفتہ منزل کے قریب ہوتے جا رہے تھے، چھتنار درختوں کے درمیان چلتے ہوئے یہ سحر انگیز سناٹے کا احساس ماحول کی ہولناکیوں میں اضافہ کر رہا تھا

جیسے جیسے ہم آگے بڑھتے گئے، درخت، پودے اور ان کے گرد لپٹی ہوئی بیلیں ہمہ اقسام بیلیں اجنبیت کا احساس دلاتی رہیں۔ درختوں کے درمیان سفر کرتے ہوئے تقریباً پچاس قدم کے فاصلے پر ہمیں ایک ہولناک منظر دیکھ کر خان بابا نے گھوڑا روک لیا اور مجھے گھوڑے سے اُترنے کا اشارہ کرتے ہوئے خود بھی گھوڑے سے اُتر گیا۔ وہ بڑی آہستگی سے قدم اُٹھاتا آگے بڑھنے لگا۔

ہمارے سامنے تین فرنگیوں کی سڑی ہوئی لاشیں درخت کی ایک شاخ سے جھول کر اپنی بے بسی کی دردناک داستان سُنا رہی تھیں انھیں نامعلوم افراد نے پھانسی پر لٹکا دیا تھا۔ لاشوں کی زبوں حالی سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کافی عرصے سے اسی طرح لٹکی ہوئی راہ گیروں کے لیے سامانِ عبرت اور توجہ کا مرکز بنی رہی ہوں گی ان لاشوں سے اندازہ لگانا دشوار نہ تھا کہ ہمارا دشمن اب زیادہ دور نہیں ہے۔

فرنگیوں کی ان لاشوں کو دیکھ کر بدبو سے گھبرا کر بابا نے اپنے مُنہ پر کپڑا رکھ لیا تھا۔

"شہباز خان! لگتا ہے دشمن آس پاس موجود ہے۔" خان بابا نے آس پاس نظر دوڑاتے ہوئے سرگوشی کی۔

اسی لمحے مجھے ایک درخت کی شاخوں کے درمیان ایک آدمی کا ہیولا نظر آیا۔

"کوئی شخص آہستہ آہستہ شاخوں سے اپنا منہ نکال رہا ہے اور فیصلہ کن گھڑی قریب آ گئی ہے۔" خان بابا نے سرگوشی میں بتایا۔

اگلے ہی لمحے کوئی کود کر ہمارے سامنے آ گیا اور کرخت آواز میں دھاڑا۔ "اگر کسی نے بھی اپنی جگہ سے جنبش کی تو گولی اس کے سینے میں سوراخ کر دے گی۔ رائفلیں پھینک کر ایک طرف کھڑے ہو جاؤ۔"

ہم رائفلیں پھینک کر فرنگیوں کی لاشوں سے دُور ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔ اس دوران میں بہت سے ڈاکو اپنے چہروں پر سیاہ ڈھاٹے جمائے ہمیں نرغے میں لے چکے تھے۔ ایک درندہ صورت نوجوان آگے بڑھا۔ اور ہمارے قریب آ کر رُک گیا۔ اس نے اپنا ریوالور میری دائیں پسلیوں پر رکھتے ہوئے غرّا کر کہا۔ "تم لوگ کون ہو؟ اور یہاں کس نیت سے آئے ہو...؟"

"ہم دوست ہیں۔" شاہ یار خان نے لہجے میں وقار پیدا کرتے ہوئے کہا۔ "اور ان مہذب درندوں کی لاشیں دیکھ کر رُک گئے تھے... مگر تم لوگ کون ہو؟ اور تم نے ہمیں کیوں گھیرے میں لے لیا ہے؟"

خان بابا کا جواب سُن کر اس نوجوان نے تیز لہجے میں کہا۔ "مقصد بیان کرو... ورنہ زندگی سے محروم ہو جاؤ گے۔"

اس کی دھمکی سُن کر خان بابا کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ "جب تک ہمیں یہ معلوم نہ ہو جائے کہ ہمارا مخاطب کون ہے ہم یہاں آنے کا مقصد بیان نہیں کر سکتے۔"

"میں بگولا سنگھ کا بیٹا دلیپ سنگھ ہوں۔" نوجوان نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

غراتے ہوئے کہا: "اب اگر تم نے اپنے متعلق بتانے میں ذرا بھی تاخیر کی تو سینہ گولیوں سے چھلنی کر دیا جائے گا۔"

"نوجوان تمہاری باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ تم ہاتھ سے کام لینے کی بجائے زبان کا استعمال زیادہ کرنے کے بہت عادی ہو۔" بابا نے پُرسکون انداز میں جواب دیا۔ "میں خان بابا ہوں۔ تمہارے باپ بگولا سنگھ سے میری ملاقات برسوں پہلے دادی خوف میں ہو چکی ہے اور میں اُس سے ملنے کی خواہش لے کر اس وادی میں نکل آیا ہوں۔ مجھے اپنے باپ کے پاس لے چلو...؟"

"تمہیں اتنے برسوں بعد میرے باپ سے کیا کام پڑ گیا جس کے لیے تم اتنی دُور بھٹک کر نکل آئے ہو؟" دلیپ سنگھ کے لہجے میں اب پہلے جیسی سختی نہیں رہی تھی۔

"نوجوان! مجھے سب کے سامنے مجبور نہ کرو کہ میں وہ بات اُگل دوں جو بگولا سنگھ کے علاوہ کسی اور کو نہیں بتائی جا سکتی۔ معاملہ اہم ہے اور تاخیر کسی بڑے نقصان کا باعث بن سکتی ہے۔ ہمیں اپنے باپ کے سامنے پیش کرنے میں اس قدر تردد کیوں ہے؟ ہمارے ہتھیار تو تم پہلے ہی چھین چکے ہو؟"

"میرا باپ اپنی زندگی کے آخری ایام گزار رہا ہے۔ ہم اُس کی پُرسکون زندگی میں خلل انداز ہو کر اُس کا عتاب مول نہیں لینا چاہتے۔ اس لیے تمہیں اپنے آنے کا مقصد بیان کرنا پڑے گا۔ اب میں ہی گروہ کا سردار ہوں۔"

"دلیپ سنگھ! اگر تم یہ چاہتے ہو کہ تمہارا باپ ہماری موجودگی سے آگاہ ہو کر بابا جی جس نہ کرے تو تمہیں ہمارا کہنا مان لینا چاہیے۔ وہ بستر پر اس بات پر بضد تھا کہ بگولا سنگھ سے اس کی ملاقات نہایت ضروری ہے۔"

دلیپ سنگھ خان بابا کی باتیں سن کر سوچ میں ڈوب گیا پھر اچانک اس نے خان بابا کا ایسی نظروں سے جائزہ لیا جیسے وہ اپنی آنکھوں سے اُس کی دلی کیفیات اور احساسات کا عکس اپنے قلب پر کندہ کر رہا ہو۔

"ارجن سنگھ ان کی تلاشی لے کر انہیں نہتا کر دو تاکہ ان کی بندوقیں بھی کر دی جائے ہمارے بس کے لیے میں تحکم پیدا ہو گیا۔"

ایک نوجوان آگے بڑھا اور میری تلاشی لیتے ہوئے اس نے میرے دونوں ریوالور بھی اپنے قبضے میں کر لیے پھر بابا کی تلاشی لے کر اس نے ہمیں گھوڑوں پر بٹھا دیا اور ہاتھ پشت پر باندھ دیے۔

دلیپ سنگھ نے فیصلہ کن انداز اختیار کرتے ہوئے کہا "تم انہیں لے کر شمال کی طرف چلو۔ میں کچھ ضروری کام نمٹا کر تمہیں راستہ میں آن ملوں گا۔"

ارجن سنگھ ہمیں اپنے چھ جوانوں کے گھیرے میں لے کر ایک طرف چل دیا۔

جامہ تلاشی کے دوران میری پنڈلی سے بندھا ہوا خنجر دشمن کی نظروں میں نہیں آسکا تھا اگرچہ میرے دونوں ہاتھ پشت کی جانب بندھے ہوئے تھے مگر وقت آنے پر میں اپنی پنڈلی سے بندھا ہوا خنجر بڑی آسانی سے نکال سکتا تھا۔

گھوڑے تیزی سے نامعلوم منزل کی طرف بڑھتے رہے۔ راستہ خاموشی سے کٹ گیا اور کوئی ناخوشگوار واقعہ بھی پیش نہیں آیا۔ رات کی سیاہی دن کے اُجالے پر آہستہ آہستہ غالب آنے لگی۔ معاً ایک ٹیلے کی اوٹ سے ہوائی فائر کی گونج سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی کسی نے سر اُبھار کر ہماری طرف تجسس سے دیکھا لیکن ارجن سنگھ کو پہچان کر مسکرانے لگا۔ اگلے ہی لمحے وہ جلدی سے گھوڑوں کی باگیں تھامتا ہوا ایک غار کی طرف چل دیا۔

ہم جوں جوں آگے بڑھتے چلے گئے غار اندر سے کشادہ ہوتا چلا گیا۔ غار میں مخصوص فاصلوں پر مشعلیں روشن تھیں۔ غار تھا یا فصیل بند آفت۔ کافی دیر بعد ہم ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں ایک طرف لکڑی کا چوڑا تخت بچھا ہوا تھا اس پر ایک سفید چادر بچھی ہوئی تھی ہمیں یہاں ٹھہرانے کی بجائے وہ لٹیرا گھوڑوں سمیت آگے بڑھتا رہا۔ اچانک بہت سے گھوڑوں کی ہنہناہٹ سن کر میں نے اندازہ لگایا کہ ہمارا رُخ اصطبل کی طرف ہے۔ تھوڑی دیر بعد میرے اندازے کی تصدیق بھی ہو گئی اور اچانک ہی دو مسلح آدمی ہمارے سامنے آ گئے وہ ہمیں گھوڑوں سے اُتار کر غار میں بنے ہوئے ایک کمرے میں لے آئے جہاں پہلے سے دو آدمی موجود تھے اور گھاس کے فرش پر کھانے کے چند برتن رکھے ہوئے تھے۔

"سندر سنگھ ان دونوں کو کچھ دیر کے لیے کھول دو تاکہ یہ پیٹ بھر سکیں۔"

کمرے میں موجود آدمیوں میں سے ایک نے بے غرور انداز میں ہمارا استقبال کیا اور ہمارے ہاتھ کھول دیے کھانے کے برتن ہماری طرف سرکا دیے گئے۔ خان بابا نے میری طرف گہری نظروں سے دیکھا پھر ہاتھ بڑھا کر کھانا شروع کر دیا۔ کھانے سے فراغت پاتے ہی ہمارے دونوں ہاتھ دوبارہ پشت پر باندھ دیے گئے اور وہ لوگ ہمیں چھوڑ کر غار سے نکل گئے۔

"شہباز... " خان بابا نے مدھم لہجے میں کہا "میرا خیال ہے کچھ دیر آرام کر لیا جائے اس کے بعد نہ جانے کب مہلت ملے گی؟"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا اور دیوار کے قریب نیم دراز ہو کر آنکھیں بند کر لیں لیکن تھوڑی ہی دیر بعد چند آہٹیں میری سماعت پر گراں گزریں تو میری نیند کھل گئی۔ دلیپ سنگھ چند آدمیوں کے ساتھ غار کے دہانے پر رُک کر چند لمحے گہری نظروں سے ہمارا جائزہ لیتا رہا پھر بولا "بابا تم لوگوں سے ملنے کے لیے تیار ہیں۔" اس کے لہجے میں سرد مہری تھی۔

ہم دونوں مسلح ڈاکوؤں میں گھرے اس جگہ پہنچے جہاں ایک بڑے تخت پر نیم دراز ایک سفید ریش بوڑھا ہماری طرف ٹکٹکی لگائے دیکھ رہا تھا اور دو نوعمر داسیاں ہاتھوں سے اس کے پاؤں دبا رہی تھیں۔

خان بابا کے چہرے پر نظر پڑتے ہی ایک نیا رنگ اُس کے شاطر چہرے پر آ کر گزر گیا۔ جو میری نظروں سے پوشیدہ نہ رہ سکا اس نے سر کے اشارہ سے ہم دونوں کو ایک خالی تخت پر بیٹھ جانے کا اشارہ کیا اور نشے میں ڈوبی سُرخ آنکھوں سے گھورتے ہوئے کسی بھیڑیے کی طرح غراتے ہوئے بولا "تم لوگ کون ہو اور مجھ سے کیوں ملنا چاہتے تھے؟"

ہمارے بیٹھتے ہی دلیپ سنگھ میرے بائیں جانب کھڑا ہو گیا وہ ہمارے چہروں پر اپنے باپ کے سوال کا جواب تلاش کرنے لگا میری نظریں ان لوگوں کا جائزہ لے رہی تھیں جو ہمارے گرد خاصی تعداد میں موجود تھے۔

"بگولا سنگھ ماضی کے آئینے میں جھانک کر دیکھو تو تمہیں مجھ سے یہ سوال کرنے کی ضرورت نہیں رہے گی کہ ہم کون ہیں اور ہم نے کس مقصد کے تحت یہاں تک سفر کیا ہے؟" خان بابا نے گرج دار آواز میں جواب دیا تو دلیپ سنگھ کے ساتھی چونک پڑے اور بوڑھا ڈاکو گہری نظروں سے ہماری طرف دیکھتے ہوئے سوچ میں پڑ گیا۔

یہی وقت حرکت میں آ جانے کا تھا چنانچہ میں نے اپنے دائیں ہاتھ کو خفیف سی جنبش دے کر آہستہ آہستہ خنجر کے دستے تک کھسکایا۔ میں نے اس نادر وقت سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے خنجر کی تیز دھار سے وہ رسی کاٹنے لگا جس نے میرے ہاتھوں کو پشت پر جکڑ رکھا تھا۔ رسی کٹ گئی اور میں مناسب موقعے کے لیے ہمہ تن انتظار ہو گیا۔

"بڑھاپے نے میری یادداشت چھین لی ہے۔" بگولا سنگھ کے لہجے میں اُلجھن تھی۔ "تم خود ہی اپنا تعارف کیوں نہیں کرا دیتے؟"

خان بابا نے جواب دینے کے لیے منہ کھولا ہی تھا... کہ اچانک باہر متعدد رائفلیں ایک ساتھ گرجنے لگیں۔ بگولا سنگھ غصے سے بل کھاتا ہوا تخت سے اٹھ گیا اور ریوالور نکال کر خان بابا کو زد میں لے لیا۔ "کچھ لوگ باہر جا کر دیکھیں یہ کیسا ہنگامہ ہے؟"

اس کی دھاڑ سن کر لٹیروں کا ہجوم کائی کی طرح پھٹ گیا اور داسیاں خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹ گئیں۔ مگر دلیپ سنگھ بدستور میرے قریب استادہ رہا۔ میں نے ایک نظر اِدھر اُدھر دیکھا پھر بجلی کی سی تیزی سے میرا دایاں ہاتھ حرکت میں آ گیا میں نے خنجر کی نوک دلیپ سنگھ کی گردن پر رکھ دی اور چہرے پر سختی اور درندگی پیدا کرتے ہوئے دھاڑا۔

"بگولا سنگھ ریوالور پھینک دو ورنہ میرا خنجر دلیپ سنگھ کا گلا کاٹ دے گا۔"

بگولا سنگھ اپنے بیٹے کو خطرے میں دیکھ کر غصے سے کانپنے لگا۔

"بابا ریوالور نہ پھینکنا ورنہ یہ میرے ساتھ ساتھ آپ کو بھی قتل کر دیں گے۔" دلیپ سنگھ اچانک چیخ اٹھا تو میں نے خنجر کا دباؤ بڑھاتے ہوئے اُسے خاموش رہنے کا حکم دیا۔

"بگولا سنگھ اگر تم نے ریوالور پھینکنے میں تاخیر کی تو میرا خنجر تمہارے جوان بیٹے کی زندگی کا چراغ گل کر دے گا۔" میرے لہجے میں ہیبت اور چٹانوں کی سی سختی آ گئی میری دھمکی سن کر وہ مذبذب میں پڑ گیا مگر ریوالور پر اس کی گرفت اب بھی برقرار تھی اب اتنا وقت نہیں تھا کہ میں بار بار دھمکیاں دیتا رہتا، میرا ہاتھ حرکت میں آ گیا اور خنجر کی نوک دلیپ سنگھ کی شہ رگ کاٹتی ہوئی دوسری طرف نکل گئی۔ میں نے پھرتی سے خون آلود خنجر دلیپ سنگھ کی گردن سے کھینچا تو وہ ریت کے تودے کی طرح زمین بوس ہو کر ہمیشہ کے لیے ساکت ہو گیا اس کے گرتے ہی بگولا سنگھ کے حلق سے ایک دل خراش چیخ اُبھری اور وہ لڑکھڑاتا ہوا تخت سے اُتر آیا میں نے آگے بڑھ کر ہاتھ میں دبا ہوا ریوالور نکال لیا اور اس کا ایک ہاتھ اٹھا کر زندگی کے آثار تلاش کرنے چاہے مگر وہ بیٹے کی موت کا صدمہ سہتے زندگی کے سارے جھگڑوں سے چُکا لیا تھا۔

میں نے اپنے بوڑھے باپ کے جکڑے ہوئے دونوں ہاتھ آزاد کر دیے اور خوف سے تھرتھر کانپتی ہوئی داسیوں کی طرف دیکھنے لگا۔ اس دوران میں رائفلوں کے گونجنے کا قیامت خیز شور اپنے عروج پر تھا۔ خان بابا خاصا پُرسکون نظر آنے لگا۔

اچانک بگولا سنگھ کے ان ساتھیوں کے قدموں کی آوازیں سنائی دینے لگیں جو دھماکوں کی وجہ معلوم کرنے گئے تھے۔ ثنا یار

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خان نے دلیپ سنگھ کی گری ہوئی رائفل اٹھائی اور تیزی سے گھوم گیا۔ رائفل کی گرج کے ساتھ ہی ایک چیخ ابھری اور آگے آنے والا دنیا کے جھنجھٹوں سے نجات پا گیا۔ ان کی پیش قدمی رک گئی مگر ہمارے ساتھی ان کی پشت پر بھی پہنچ چکے تھے۔ انھوں نے کچھ اور ڈیروں کو زمین چاٹنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی محراب خان کا مسکراتا ہوا چہرہ ہمارے سامنے آگیا۔ بگولا سنگھ اور اس کے بیٹے کی لاشیں دیکھ کر اس کی آنکھوں سے حیرت جھانکنے لگی۔ "میرا خیال تھا کہ مقابلہ سخت ہوگا مگر یہاں تو معلوم ہوتا ہے یہ مرنے کے لیے تیار ہی بیٹھے تھے۔ بگولا سنگھ کے مرنے کی خبر سنتے ہی اس کے ساتھی ہتھیار پھینک کر ہمارے سامنے آگئے اور ہم سے جان کی امان چاہنے لگے۔ ادھر چل کر دیکھو تو تمھیں ڈاکوؤں کی ایک قطار دکھائی دے گی۔" اس کے لہجے میں گہرا جوش موجیں مار رہا تھا۔

خان بابا تیزی سے اس طرف بڑھ گئے جدھر محراب خان نے اشارہ کیا تھا۔ قیدیوں کا ذکر سنتے ہی وہ یوں چونک پڑا تھا جیسے کوئی بھولی بسری بات اچانک ہی یاد آگئی ہو۔

غار کے اس حصے میں تیس کے قریب قیدی موجود تھے۔ محراب خان کے ساتھی ہمارے پہنچنے تک انھیں نہتے کر کے مشکیں باندھ رہے تھے۔

خان بابا نے انھیں گھورتے ہوئے کہا "تمھیں ایک صورت میں امان مل سکتی ہے کہ بگولا سنگھ کے خزانے تک ہماری رہنمائی کرو اور آئندہ کے لیے شریفانہ زندگی گزارنے کی قسم کھاؤ۔"

موت کا خوف ان کی طاقت سلب کر چکا تھا۔ وہ اپنی زندگیاں بچانے کے لیے ہماری تمام شرطیں بخوشی ماننے پر آمادہ ہو گئے۔

"خان میں تمھیں بگولا سنگھ کے خزانے تک پہنچا سکتا ہوں۔"

ان میں سے ایک ادھیڑ عمر کا ڈاکو بولا۔

میں نے فوراً اسے آزاد کر دیا اور کہا "چلو... جلدی چلو، بتاؤ وہ خزانہ کہاں ہے؟"

وہ بید کے پتے کی طرح لرزتا ہوا آگے بڑھا اور اس حصے میں پہنچ گیا جہاں بگولا سنگھ اور اس کے بیٹے کی لاشیں پڑی تھیں۔ وہ ایک چبوترے کے سامنے رک گیا پھر جھک کر پتھر کی بھاری سلیں اٹھا کر راستہ صاف کرنے لگا۔ چار سلیں اٹھاتے ہی نیچے جانے والا زینہ نمودار ہو گیا تو وہ خوشامدانہ انداز میں مسکراتے ہوئے بولا "یہاں سب کچھ موجود ہے۔"

"ابھی تمھارا کام ختم نہیں ہوا۔" میں نے اس کا شانہ تھام کر آگے دھکیلتے ہوئے کہا "چلو اندر چلو۔"

وہ جھجکتا ہوا آگے بڑھا اور آہستہ روی سے سیڑھیاں اترتا ہوا تہ خانے کے فرش پر پہنچ گیا۔ اس نے کونے میں ایک کوٹھری کی طرف اشارہ کیا جس کا دروازہ باہر سے بند تھا۔ "سب کچھ وہاں رکھا ہوا ہے۔"

شالیار خان نے کوٹھری کا دروازہ کھول دیا اور اندر جھانکنے لگا۔ اندر سونے چاندی کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ چھوٹے بڑے ظروف بکھرے پڑے تھے اور ان کے درمیان چمڑے کے دو تھیلے بھی موجود تھے۔ خان بابا ان تھیلوں کو دیکھتے ہی لپکا اور ان کا منہ کھول کر چمک دار سکوں کو گھورنے لگا۔

دو روز بعد ہم نے دریا کے کنارے غاروں میں چھپی ہوئی اسلحے کی گاڑیاں نکالیں اور انھیں دریا کی طرف لے آئے اور ملک سکندر کا انتظار کرنے لگے جسے میں نے پیغام بھجوا دیا تھا۔ ملک سکندر کے آتے ہی میں نے گاڑیاں اس کے حوالے کر دیں اور خان بابا نے وہ طلائی سکے بھی حریت پسندوں کی نذر کر دیے جو جان کی بازی لگا کر فرنگیوں کے ناپاک قدم اس سرزمین سے نکال پھینکنے کے لیے جدوجہد کر رہے تھے اور صبح آزادی کی پہلی سی کرن نمودار ہونے کے انتظار میں ان کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں لیکن امید جو انسان کو زندہ رہنے کا سبق سکھاتی ہے، اس نے ان کے حوصلوں کو جوان رکھا تھا۔

ہمارا واپسی کا سفر جاری تھا کہ سامنے ایک دوراہا آگیا۔ ان میں سے ایک راستہ شوری کی طرف جاتا تھا۔ ہم نے ملک سکندر سے اجازت چاہی اور گھوڑے دوڑاتے ہوئے اپنے راستے پر روانہ ہو گئے۔

Scanned By: Azam & Ali

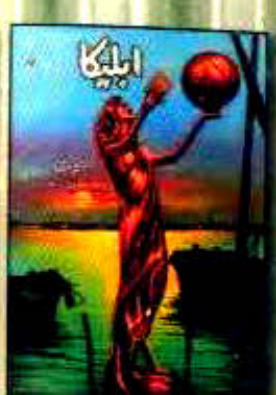

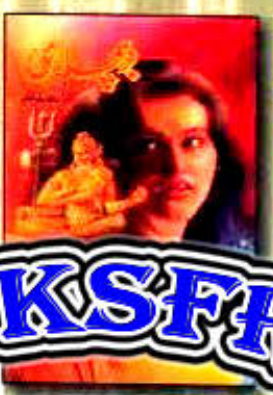

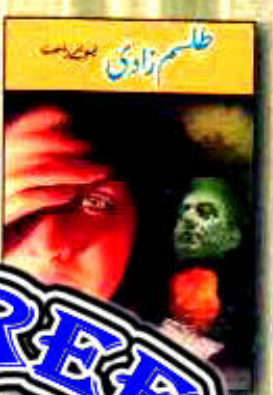

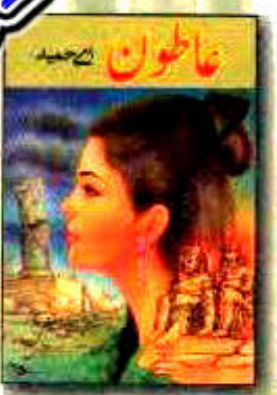

خوبصورت اور مقبول کتابیں
(7 جلدیں) قیمت: 2000.00 روپے
درخشاں
(2 حصے) قیمت: 90.00 روپے
دہشت گرد
(4 حصے) قیمت: 180.00 روپے
(12 حصے) قیمت: 600.00 روپے
(5 حصے) قیمت: 250.00 روپے
(2 جلدیں) قیمت: 300.00 روپے
طلسم زادی
300.00 روپے
(مکمل) قیمت: 150.00 روپے
خبیث
(5 حصے) قیمت:
قیمت: 650.00
PDFBOOKSFREE.PK
(2 جلدیں) قیمت: 300.00 روپے
(مکمل) قیمت: 400.00 روپے
(2 جلدیں) قیمت: 300.00 روپے
(4 جلدیں) قیمت: 600.00 روپے
(2 حصے) قیمت: 108.00 روپے
نجات
(مکمل) قیمت: 150.00 روپے
(مکمل) قیمت: 150.00 روپے
(مکمل) قیمت: 150.00 روپے
گنگا کے پجاری ناگ
(2 جلدیں) قیمت: 350.00 روپے
(2 حصے) قیمت: 103.00
مکتبہ القریش
سرکلر روڈ، اُردو بازار لاہور۔2 پاکستان
فون: 7231595-7668958